

چندرا دیوی



انکسپیریشن

اس کا نام بھگوان داس تھا۔

لیکن اس کے ملنے، جاننے والے اور واقف کار اسے شیطان داس کہتے تھے۔ مگر وہ غلط نہیں کہتے تھے۔

وہ بھگوان داس سے شیطان کیسے بنا.....؟ کیوں بنا.....؟ کس نے اسے شیطان بنایا اور کیوں بنایا.....؟ کیا دنیا میں شیطان کم تھے جو ایک اور شیطان پیدا ہو گیا تھا۔
کیا شیطان بننے میں اس کا اپنا قصور تھا۔

اس نے شیطان کی خصلت، فطرت اور بد اعمالیوں کو خیرہ بنا کر اپنے جسم اور آتما میں کوٹ کوٹ کر بھر لیا تھا۔

ہندوستان میں ان دنوں جو بڑے بڑے شیطان تھے یہ ان میں سرفہرست تھا۔
اسے شیطان بنانے میں اس کا اپنا کوئی دوش نہیں تھا۔ اسے کس نے شیطان بنایا یہ بتاتے ہیں۔

جب وہ پیدا ہوا تھا وہ گھرانہ غریب تھا۔ ماں کی دلی تمنائھی کہ اس کی پہلی اولاد زینہ ہو۔ بھگوان نے سن لی تھی۔

اس کی ماں بہت خوب صورت تھی۔ شادی کے دو برس بعد وہ پیدا ہوا تھا۔ ایک بچے کی ماں بننے کے چار برس بعد وہ اور حسین اور پرکشش اور پر شباب گداز کی ہو گئی۔ روز بہ روز نوجوان دوشیزہ کی طرح ہوتی گئی۔ غریب تھی..... غریب کی جو روٹھی..... ایسی عورت رستے کا مال ہوتی ہے۔ جس نے بھی ڈالی بری نظر ڈالی۔ گزارہ تنگ دہتی سے ہوتا تھا۔ قرض بھی لینا پڑتا تھا۔ اس کا پتی ریلوے اسٹیشن پر قلی تھا۔ گزارہ بہ مشکل ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ باپ بیٹی کو سلا کر خود بھوکے سو جاتی تھی۔

پڑوسی اور محلے کی لڑکیاں، عورتیں اور مرد بھی حیران تھے کہ اس کی ماں شانتی اس غربت، تنگ دہتی اور احساس محرومی کے باوجود اتنی سندر اور پرکشش کیوں ہے۔

جب وہ مہاجن کی دکان پر قرض پر سودا سلف لینے گئی تھی تو گرمیوں کی چل چلاتی دھوپ تھی۔ گہرا سناٹا طاری تھا۔ وہ ایک نمبر عیاش اور شیطان تھا۔ گاہک عورتوں اور لڑکیوں کی مجبور یوں سے بھی خوب فائدہ اٹھاتا تھا۔ دوپہر کے سنانے میں اس کی ماں شانتی کو دیکھ کر اس کی رال ٹپک پڑی۔

مہاجن نے سودا لینے کے لئے اسے اندر بلایا اور دروازہ بند کر لیا۔ پھر اس نے تجوری کا منہ کھول دیا جو نوٹوں کی گڈیوں اور زیورات سے بھری ہوئی تھی۔
 ”شانختی.....!“ وہ بڑے نرم لہجے میں بولا۔ ”تو میری یہ دولت دیکھ رہی ہے۔ لاکھوں کی ہے۔“

”لیکن میں کیا کروں تیری دولت دیکھ کر.....“ شانختی نے جواب دیا۔ ”تو مجھے سودا دے دے..... میں بیس دنوں بعد تیری پائی پائی لوٹا دوں گی..... میرا پتی دس دنوں سے بیمار ہے۔ وہ کام پر نہ جا سکا۔ کل سے جائے گا۔“
 ”میں یہ ساری دولت تیرے قدموں میں ڈال دیتا چاہتا ہوں.....“ اس نے شانختی کی آنکھوں میں جھانکا۔

”مجھے تیری دولت نہیں چاہئے..... صرف دو سو روپے کا سودا چاہئے۔“ شانختی نے جواب دیا۔
 ”مجھے تیری دولت لے کر کرنا کیا ہے۔“
 ”میری دولت سے تیرے دن پلٹ جائیں گے..... میں تجھے رانی بنا کر رکھوں گا۔“ وہ بولا۔
 ”تو یہ کیوں بھول رہا ہے کہ میں ایک بیوی، ماں اور عورت ہوں۔ میرا سہاگ سلامت ہے۔ چار برس کا بچہ بھی ہے۔“

”دیکھ تیرا پتی تجھے اور تیرے بیٹے کو دو وقت کا کھانا نہیں کھلا پاتا ہے۔ تیرے پاس ڈھنگ کے دو جوڑے بھی نہیں ہیں..... اور تجھے ڈر ہے نہ گھر میں رکھا ہوا ہے۔ تو عیش کرے گی۔“
 ”یہ تیری بھول ہے کہ میں اسے چھوڑ کر تیرے پاس آ جاؤں گی..... وہ جو بھی ہے جیسا بھی ہے..... میرا پتی اور سہاگ ہے۔“

”ارے جب تو بیوہ ہو جائے گی تب تجھے میں سہارا دوں گا۔ تجھے اپنی پتی بنالوں گا۔“ وہ عاشقانہ انداز سے بولا۔

”میں ابھی کیوں بیوہ ہونے اور پتی کے مرنے کی آرزو کروں..... بھگوان مجھے اٹھالے میرے پتی کو سلامت رکھے۔“ اس نے کہا۔

”تجھے بھگوان نہیں..... میں بیوہ کروں گا۔“ وہ تسخر سے بولا۔ ”اس تلاش شخص کے ساتھ زندگی گزار کر کیوں اپنی نوجوانی، یہ شباب بدن..... اور زندگی تباہ کرے گی۔ میرے آدی کل ہی اسے ٹرین کے نیچے پھینک دیں گے.....“

شانختی کا پارہ چڑھ گیا۔ پھر اس نے مہاجن کے پاس جا کر اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا اور تھوک دیا..... اس کا تھوکتا تھا کہ وہ اس تذلیل اور تضحیک پر آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے

شانختی کو دبوچ لیا۔ شانختی نے ناخنوں سے اس کا چہرہ لہو لہان کر دیا اور اس کی آنکھ پھوڑ دی۔ پھر اس نے شور مچا دیا کہ اسے قتل کیا جا رہا ہے۔ شانختی اسے دھکا دے کر عقبی راستے سے نکل گئی۔
 گھر پہنچ کر اس نے اپنی سائیس اور کپڑے درست کئے۔ اس نے اپنے پتی کو بتایا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں۔

پولیس اس کے گھر میں گھس آئی۔ باپ، ماں اور بیٹے کو حوالات لے جا کر بند کر دیا کہ شانختی اور اس کے پتی نے مل کر مہاجن کے گھر پر ڈاکہ مارا۔ ایک لاکھ روپے اور سونے کے زیورات تجوری سے نکال لئے۔ شانختی اور اس کے پتی نے اس الزام سے انکار کیا..... باپ اور بیٹے کے سامنے تھانے دار، سب انسپکٹر اور باقی عملہ منہ پر ٹیپ لگا کر شانختی کو وحشی درعدوں کی طرح بھڑکتے رہے۔ پھر صبح شانختی درعدگی کے بیچٹ چڑھ گئی اور اس کا پتی صدمے سے مر گیا۔ پولیس نے اسے خودکشی کا کیس قرار دے کر اپنی جان بچائی۔ بھگوان تھانے سے کسی نہ کسی طرح سویرے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے محلے میں اس کے پتا کا ایک دوست تھا۔ اس کے پاس گیا۔ اس نے روتے ہوئے سارا قصہ سنایا۔ اس کے باپ کا دوست رکھتا تھا جو تھا وہ بھی غریب آدی تھا۔ اس ننھے چشم دید کی گواہی کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ رکھتا تھا پولیس سے کہاں لڑتا.....؟ رکھتا تھا کہ خود دو وقت پیٹ بھر کے کھانا مشکل تھا اس لئے اسے آشرم میں داخل کر دیا۔ اس آشرم میں بڑے کورگہ دھندے ہوتے تھے۔ بیگار کمپ میں بھیج دیا گیا۔ آٹھ برس تک وہ وہاں قید رہا۔ اس نے دو تین مرتبہ فرار ہونے کی کوشش کی تھی جو اسے بڑی مہنگی پڑی تھی۔ اس کے جسم پر کوڑے برسائے گئے تھے کہ دوسرے لڑکوں کو عبرت حاصل ہو۔ پھر ایک دن چھ لڑکے وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئے تو وہ بھی ان میں شامل تھا۔ وہ سب ممبئی آ گئے۔ پھر وہ زیر زمین دنیا میں چلا گیا جہاں اسے پیشہ ور مجرم بنادیا گیا۔

زیر زمین دنیا سے بہت راس آئی تھی۔ لڑکیوں کو اغوا کرنا اور ان کے ساتھ زیادتی کرنا اور اس کی بات نہ ماننے پر انہیں ایذا نہیں دینا..... اس نے کسی پر ترس نہیں کیا تھا..... اس نے اجرتی بد معاش بن کر کئی زندگیاں تباہ کر ڈالیں گھر اجاڑ دیئے۔

اس نے اپنی وجاہت سے قدم قدم پر ہر طرح سے فائدہ اٹھایا۔ دولت مند عورتیں اس کا سودا کرتی تھیں اور وہ انہیں بلیک میل کر کے ان کے لئے ایک طرح سے فرشتہ اجل بن جاتا تھا۔ سایہ اجل بن کر ان کی زندگیاں حرام کر دیا کرتا تھا تا کہ خوب دولت کما سکے۔

ایک عورت جو بیوہ ہونے کے بعد اپنے پتی کے اثاثوں کی مالک بن گئی تھی اس کی ازدواجی زندگی اسے وہ مسرت نہ دے سکے تھی جس کے لئے ہر عورت ترستی ہے۔ اس میں سارا قصور اس کا اپنا

تھا جو اس نے محض دولت اور خواب ناک زندگی کے لئے اپنی عمر سے تیس برس کی عمر سے بڑے شخص سے شادی کر لی تھی۔ اسے شادی کے بعد معلوم ہوا کہ دنیا میں زندگی صرف دولت کے بل بوتے پر نہیں گزاری جاتی ہے لیکن اس بوڑھے شخص نے اسے ایسا قید کر لیا تھا کہ وہ اس کے شکنجے سے نکل نہیں سکتی تھی۔ یہاں کی دوسری شادی تھی۔ پہلی شادی سات برس تک چلی تھی۔ وہ ایک عام سا آدمی تھا۔ وہ ایک شخص کو قتل کر بیٹھی تھی جس نے اسے امریکہ ساتھ لے جانے کے لئے ایک برس تک فریب دے کر کھینٹا رہا تھا۔ اس قتل کا دوسرا اپنی نہ صرف عینی گواہ تھا بلکہ اس کے پاس تصویر بھی تھی۔ وہ بے پناہ حسین تھی۔ پھر اس نے پہلے شوہر کو بھی ایک حادثے میں قتل کر دیا تھا تاکہ بلیک میلر سے شادی کر سکے۔ حالاں کہ وہ فرار ہو کر کسی پڑوسی ملک میں جاسکتی تھی۔ چوں کہ بلیک میلر کو دولت کی نہیں اس کی ضرورت تھی اس نے شادی کر لی۔ اس بوڑھے نے سات برس تک اسے بھن بھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ اس کی موت کی خواہاں تھی۔ اسے ایک بار موقع ملا تو اس نے اس سنہرے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ موت کا سایہ بن کر اسے راستے سے ہٹا دیا۔ پولیس قاتل کا سراغ نہ لگا سکی۔

پھر وہ اپنے بچے کے اثاثوں کی مالک بن گئی۔

اس کی ملاقات بھگوان داس سے ایک ہوٹل کی تقریب میں ہوئی تھی۔ دونوں پہلی ہی ملاقات میں ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ بھگوان داس اس سے عمر میں دس برس چھوٹا تھا۔ ایسا وجہ تھا کہ وہ اس پر مرئی تھی۔ اسے ایسا مرد خواب میں بھی نہیں مل سکتا تھا۔ دوسری طرف بھگوان داس کو ایسی حسین عورت اور دولت کی ضرورت تھی۔ پھر وہ دونوں جیون ساتھی بن گئے۔

دو برس کے بعد بھگوان داس نے اسے سلو پوزن دینے لگا جس سے اس کے پیروں میں درد رہنے لگا۔ وہ محذور ہوتی چلی گئی۔ جس سے اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔ اس عورت کو بھگوان داس پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنے سارے اثاثے اس کے نام کر دیئے۔ تو بھگوان داس نے اسے ختم کر دیا۔

پھر وہ بھگوان داس سے شیطان بن گیا، بے حس، بے ضمیر اور بے دھرم ہی نہیں بلکہ سنگ دل، سفاک اور بد مزاج اور شقی القلب اور محذور ہو گیا تھا۔ رحم کھانا تو جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کے نزدیک آدمی حقیر اور کٹرے کوڑوں سے بھی حقیر تھا۔ اس کے نزدیک کوئی لڑکی اس قابل نہ تھی کہ اس کی عزت محفوظ رہنے دی جائے۔ اس کی بد اعمالیوں کی فہرست بڑی لمبی تھی۔ اس نے اپنے ضمیر کا گلا کب کا گھونٹ دیا تھا۔ اس نے بڑی بے دلی اور سفاکی سے اپنے دشمنوں کو اور ان کی بیوی بچوں کو ایذا نہیں دیں۔ عورتوں کی پاک دامنی کی دھجیاں بکھیر دیں لیکن کبھی اسے کوئی احساس اور ذرہ برابر بھی دکھ اور پچھتاوا نہیں ہوا تھا۔

اس کی بیوی کی جو رہائش تھی وہ تین ہزار گز کے رقبے پر بنی ہوئی کوٹھی تھی جو ایک طرح سے کسی

محل سے کم نہیں تھی۔ یہ کوٹھی اس کے پہلے بچے نے تقسیم ہند سے قبل ایک انگریز لارڈ سے خریدی تھی جو فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ گواس شہر میں ایک سے ایک جدید ترین طرز کی اعلیٰ اور پر شکوہ اور وسیع و عریض کوٹھیاں موجود تھیں لیکن اس کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ بیوی کی موت کے وقت وہ کروڑ پتی تھا۔ لیکن اب وہ ارب پتی بن گیا تھا۔ اس کی دولت میں جو بے پناہ اضافہ ہوا اور ہو رہا تھا وہ اس کے کالے اور پراسرار دھندے تھے۔ چوں کہ وہ دولت مند تھے اس لئے نہ صرف وی آئی پی تھا بلکہ بڑا بااثر، طاقت اور بارسوخ بھی بن گیا تھا۔

پانچ برس قبل اس کی زندگی میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا جو اس کے وجود کا زخم بن گیا تھا۔ اس کے ہاں ایک پندرہ برس کی عمر کی لڑکی ملازمہ تھی۔ انتہائی حسین تھی۔ جتنی حسین تھی اتنی ہی پرکشش بھی۔ اس کی متغنی ہو چکی تھی۔ آئندہ برس اس کی شادی ہونے والی تھی۔ بھگوان داس نے اس کی عزت تباہ کرنے کی کوشش کی تو اس لڑکی نے نہ صرف ناخنوں سے اس کا چہرہ لہو لہان کر دیا بلکہ اس کی ایک آنکھ بھی پھوڑ دی۔ پھر اس لڑکی نے ہسپتال کا بیڈ لیٹ اپ اس کے سر پر دے مارا جس سے اس کا سر پھٹ گیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس واقعہ کی اس وقت کانوں کان کوٹھی میں کسی کو خبر نہ ہو سکی۔ کیوں کہ کوٹھی میں گنتی کے دو ایک ملازمین کے ساتھ رہتا تھا۔ وہ نیچے کہیں تھے۔ لڑکی بہت ہوشیار، ذہین تھی۔ ممبئی کے ماحول میں پلی بڑھی تھی۔ فلمیں بہت دیکھتی تھی۔ پہلے تو اس نے دروازہ بند کیا۔ پھر اپنا لباس فرش سے اٹھا کر پہنا۔ پھر اس نے الماری کی تجوری سے دس لاکھ کی رقم۔۔۔۔۔ پر ہاتھ صاف کیا۔ پھر وہ عقی رات سے باہر آئی۔ گھر پہنچ کر اپنے ماں باپ کو سارا قصہ سنایا۔ پھر وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رات کے اند میرے میں کول کتا جانے والی ٹرین میں سوار ہو گئے۔

دوسرے دن دوپہر کے وقت جب بھگوان داس کو ہوش آیا وہ کمرے میں تھا۔ کسی ملازم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس کی خواب گاہ میں جھانکے۔ نہ ہی کسی ملازم کے علم میں یہ واقعہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا مالک ایک لہبانی مون منار ہے۔ اس نے کسی نہ کسی طرح گھنٹی بجائی۔ وہ دس دن تک اسپتال میں زیر علاج رہا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اس کے سر میں اندرونی چوٹ نہیں آئی تھی۔ لیکن اس لڑکی نے اس کی آنکھ پھوڑ کر نہ صرف اسے اندھا کر دیا تھا بلکہ اس کے چہرے کا جغرافیہ بھی بگاڑ دیا تھا۔ اسے حیرت اور غصہ اس بات کا تھا کہ شکار اسے شکار کر گیا تھا۔ آج تک کوئی لڑکی خواب گاہ میں اپنی عزت بچا کر گئی تھی اور نہ عزت کی اور نہ ہی حملہ آور ہوئی۔ اس دھان پان کی چار فٹ کی لڑکی نے نہ صرف اپنی عزت بچالی بلکہ اس کا چہرہ بدنما اور خوف ناک بنا دیا تھا جس نے اس کی وجاہت اور دراز قامت کو خاک میں ملا دیا تھا۔

اس کے پاس نہ تو لڑکی کی کوئی تصویر تھی نہ کسی رشتہ دار کا نام و پتہ۔

اسے نہ تو اپنی بد صورتی کا احساس اور نہ ہی اس بات کی کوئی پروا رہی تھی کہ لوگ اسے دیکھ کر نفرت اور حقارت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ اب وہ ہراس نوجوان، کنواری اور حسین لڑکیوں سے انتقام لینے لگا تھا۔ جسے وہ اپنی خواب گاہ میں منگواتا تھا۔

ایک صبح وہ اپنی خواب گاہ میں تھا۔ اس کا دروازہ بند تھا۔ دروازے پر مخصوص انداز سے اور نہایت آہستی سے باہر سے دستک ہوئی۔ پھر دروازہ بے آواز اور آہستگی سے کھلا۔ اس نے پیش کے عالم میں دروازے کی جانب مڑ کر دیکھا۔ مہی پال کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ وہ اپنے مالک کی خصلت، فطرت اور تند خوئی اور ڈانٹ ڈپٹ کا برسوں سے عادی تھا۔ یہ واحد ملازم جو بھگوان داس کے عتاب کا نشانہ نہیں بناتا تھا۔ کیوں کہ وہ دودن پہلے ہی اپنے گھر گیا ہوا تھا۔ اس لیے عرصے میں بھگوان داس دو ایک بڑے شہروں میں کچھ عرصہ گزار چکا تھا۔ مہی پال اس کی ہر جگہ خدمت کرتا رہا۔ لیکن آج بھگوان داس نے جس انداز سے گھورا تھا اس سے مہی پال کو اندازہ ہوا کہ اس کے مالک کی کھوپڑی بہت گرم ہے۔ لیکن اس کا گھورنا اسے بے مقصد نہیں تھا۔ اس میں کوئی جذبہ کارفرما محسوس ہوا تھا۔

کیا تمہیں اس بات کا اندازہ اور احساس نہیں کہ تم نے آنے میں بہت دیر کی ہے۔“ وہ ترش روئی سے بولا۔ ”کیوں اور کس لئے؟“ میں صبح بیدار ہوتے ہی تمہارے انتظار میں خوار ہو رہا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میرے لئے انتظار برداشت نہیں ہوتا ہے۔ نہ ہی میں اس کا عادی ہوں۔ میں تمہیں یہ بات بتا دوں کہ اگر تمہیں میری ملازمت کرنی ہے تو تم پروقت کی پابندی لازمی ہے۔ اگر نہیں کر سکتے تو تم ابھی اور اسی وقت ملازمت چھوڑ کر دفع ہو سکتے ہو۔“

”مالک.....! مجھے اس کی بڑی ندامت ہے کہ آپ کو میرے انتظار میں کوفت اور اذیت ہوئی ہے جس کے لئے میں معافی چاہتا ہوں۔“ اس نے ندامت بھرے لہجے میں کہا اور اس نے اپنے مالک کی لمبی چوڑی سرزنش سنی تو اسے بہت غصہ آیا۔ لیکن اس نے اپنا غصہ دبایا۔ کیوں کہ یہ بات ایسی نہ تھی جو اس کے مالک نے اسے بری طرح جھاڑ دیا تھا۔ مالک چون کہ خزانہ اور غیبی قسم کا تھا۔ انتہائی بد مزاج..... وہ اس سے ڈرتا بھی بہت تھا۔ تاہم اس نے ہمت کر کے کہا۔ ”لیکن مالک.....! کل رات آپ سے اجازت لے کر جاتے وقت کہہ گیا تھا کہ میں آج صبح نو بجے تک پہنچوں گا۔ ابھی صرف سو سات بجے ہیں۔ میں قبل از وقت آ گیا ہوں۔ اگر آپ فرمادیتے تو میں شام میں جاتا ہی نہیں..... میں رک جاتا۔“

مہی پال کا لب و لہجہ نہایت عاجزانہ تھا۔ بھگوان داس نے اسے تین برس قبل ملازم رکھا تھا۔ اسے اپنا خاص آدمی بنایا ہوا تھا۔ مہی پال ایک دور اندیش۔ قیافہ شناس اور ذہین آدمی تھا۔ صرف اس

نے ایک ہفتہ ہی میں اندازہ کر لیا تھا کہ وہ کس طبیعت اور خصال کا ہے۔ ایک نمبر کا شیطان ہے۔ وہ بھگوان داس کی ذاتی زندگی سے واقف بھی تھا۔ وہ یہ بات جانتا تھا کہ بھگوان داس کو کسی بات میں اختلاف اور مخالفت قطعی پسند نہیں ہے۔ وہ خوشامد پسند ہے۔ ہاں میں ہاں ملانے والے کو اہمیت اور عزت بھی دیتا ہے۔ اس سے پہلے دو ایک ملازمین نے اس کی کسی بات کی مخالفت کی تھی۔ جب کہ مخالفت جائز تھی۔ لیکن اس نے ان ملازمین کو چار گھنٹوں تک الٹا لٹا رکھا اور ان کی پشت پر چاچک بھی برسائے۔ آج اسے اپنے مالک کی خوشامد اور ہاں میں ہاں ملانے کا سہرا موقع ملا تھا۔ وہ اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

”مالک.....!“ اس نے نہایت انکاری سے کہا۔ ”ایک ہفت روزہ میگزین کا نمائندہ آپ سے ملاقات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ صرف کچھ دیر کے لئے..... آپ اجازت دیں تو میں اسے نشست گاہ میں لے جا کر بٹھا دوں۔“

”میگزین کا نمائندہ.....؟“ بھگوان داس نے نہایت حقارت سے کہا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں کبھی پریس کے کسی بھی عہدے کے شخص سے نہیں ملتا۔ نہ مجھے انٹرویو دینے اور تصویریں کھینچوانے کا کوئی شوق ہے۔ نہ ہی میں شہرت کا بھوکا ہوں۔ یہ بات اس شہر کا پریس جانتا ہے۔ اس کے باوجود وہ کیوں آیا ہے؟ وہ مجھ سے ملنا کس لئے چاہتا ہے؟ آخر وہ ہے کون؟“

”وہ ویلکی ٹائمز کا نمائندہ ہے۔“ مہی پال نے اسے بتایا۔

”میں کسی نمائندے سے ملاقات نہیں کرتا اور نہ ہی کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہیں پرائیویٹ سیکریٹری کے فرائض اور ذمے داریاں سونپ رکھی ہیں۔ اس کے باوجود تم اس سے ملاقات پر مصر ہو.....؟ کیا تم نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کس سلسلے میں مجھ سے ملنے کے لئے اتنے سویرے آدھکا ہے.....؟“

”میں نے اس سے معلوم کیا تو اس نے بتایا کہ“ آپ سے مسرت چندر کے بارے میں کچھ باتیں معلوم کرنا چاہتا ہے۔“ مہی پال نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔ ”میں نے اس لئے آپ سے ملانے کا وعدہ کر لیا۔“

”مسرت چندر.....؟“ بھگوان داس چونکا۔ پھر اس نے قہر آلود نظروں سے گھورا۔ پھر وہ خشونت بھرے لہجے میں کہا۔ ”مسرت چندر کے بارے میں اسے کس نے اطلاع دی.....؟ وہ تمہی ہو گئے..... نمک حرام..... تم نے ہی اسے بتایا ہو گا۔ اسے بتانے کی ضرورت کیا تھی.....؟“ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

”جب میں کچھ دیر پہلے آیا تو اسے باہر ٹپکتے ہوئے پایا تھا۔ یہاں آنے تک مجھے کوئی نہیں

”مہی پال نے کہا۔

”اب جب کہ تم نے ملاقات کرانے کا وعدہ کر لیا ہے تو اسے میرے کمرے میں بھیج دو۔“ وہ سخت لہجے میں تھکسانہ انداز سے بولا۔ بھگوان داس نے اس لئے اس اخباری نمائندے سے ملاقات کے لئے آمادگی ظاہر کی تھی کہ یہ پریس کے نمائندے بہت ہی خطرناک ہوتے ہیں۔ اگر وہ اس نمائندے سے ملنے سے انکار کر دیتا تو اس کی شامت آ جاتی۔ اس کے متعلق جھوٹی چکی باتیں اخبار میں شائع کر دیتا۔ وہ پریس سے بڑا خائف رہتا تھا۔ وہ روزنامہ ہو یا ہفت روزہ..... چندرہ روزہ یا ماہنامہ..... سبھی اسے سانپ لگتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک اخبار نے اس کی ایک تصویر چھاپی تھی۔ جس میں وہ ساحل سمندر پر اس شہر کی بدنام زمانہ کال گرل کی کمر میں ہاتھ ڈالے کھڑا ہوا تھا۔ اس کال گرل نے جو لباس پہنا ہوا تھا وہ لباس کم دجیاں معلوم ہوتا تھا۔ اس تصویر اور مختصری خبر کی سرخی نے اسے بڑا بدنام کیا۔ وہ حیران تھا کہ یہ تصویر کیسے اور کہاں سے اتار لی گئی تھی؟ وہ اس روز کے بعد سے بڑا محتاط ہو گیا تھا۔

وہ اس واقعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ مہی پال اس پریس کے نمائندے کو لے کر کمرے میں آیا۔

”اب تم جا سکتے ہو..... یہاں تمہاری موجودگی غیر ضروری ہے۔“ بھگوان داس نے مہی پال سے کرخت لہجے میں کہا تو مہی پال کمرے سے نکل گیا۔ ویسے وہ خود بھی رکنا اور ان کی باتیں سننا نہیں چاہتا تھا۔

”لو یہ سگریٹ پیو.....“ اس نے سونے کا بنا ہوا سگریٹ کیس تپائی پر سے اس کی جانب اس انداز سے پھینک دیا جیسے کوئی شخص ایک ہڈی کا ٹکڑا کسی کتے کے سامنے پھینک دیتا ہو۔“ یہ سگریٹ امریکہ میں صرف مخصوص لوگوں کے لئے بنائے جاتے ہیں اور عام آدمی کی رسائی اور دسترس سے دور ہیں۔ ایسے نفیس سگریٹ تم نے خواب میں بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔“

”شکر یہ مسٹر بھگوان داس۔“ سریش نے سرد لہری سے جواب دیا۔ بھگوان داس نے جس انداز سے اسے سگریٹ پیش کیا تھا اس میں اس نے بڑی ذلت اور توہین محسوس کی تھی۔ تاہم وہ ضبط کر گیا۔ ”میں ایک عام سا آدمی ہوں۔ اپنی اوقات پہچانتا ہوں۔ میں ایسا سگریٹ پیتا ہوں جو تمام سگریٹوں سے سستا ہے۔ اس لئے بھی کہ ان اعلیٰ قسم کے سگریٹ جو میں نے دو ایک مرتبہ پئے ان میں، میں نے کبھی لطف اور ذائقہ محسوس نہیں کیا۔“

”اچھا تو تم کیوں اور کس لئے مجھ سے ملنے آئے ہو.....؟“ سریش کے جواب نے اسے

اندھری اندر تپا دیا تھا۔ اس نے سریش کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ ”آخر اس قدر سویرے آنے کی ضرورت کیا تھی؟“

”مسٹر بھگوان داس..... یہاں کچھ دنوں سے ایک پراسرار، سنسنی خیز اور عجیب و غریب کہانی..... یعنی یہ کہ مسرت چندر پھر دکھائی دینے لگا ہے..... اس کہانی نے بڑی دہشت کی فضا پیدا کی ہوئی ہے۔“

”بالکل جھوٹی کہانی..... بے سرو پا افسانہ..... بے بنیاد قصہ..... تم جانتے ہو کہ ہمارے لوگوں کو فرصت ہی فرصت ہے۔ اس لئے وہ ایسی داستانیں گھڑتے رہتے ہیں۔“ بھگوان داس نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ ”لیکن اس سے کہانی کی بابت تمہیں کس نے بتایا؟ اور تم نے یقین کر لیا؟“

”مجھے یہ بات انتہائی معتبر ذرائع سے معلوم ہوئی ہے۔“ سریش نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”اس حقیقت کو جھٹلانا نہیں جا سکتا۔“ سریش نے توقف کر کے گہرا سانس لیا۔ بھگوان داس نے جس انداز سے اس بات کی نفی کی تھی اس نے سریش کا تجسس اور دلچسپی بڑھا دی۔ پھر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”اور ہماری معلومات یہ ہیں کہ پونا کا مسرت چندر جو بنگالی ہے ایک مرتبہ یہاں کے گرد و نواح میں دیکھا گیا..... اور پھر ایک روز آپ کے کمرے میں داخل ہوتے اور باہر نکلتے ہوئے بھی دیکھا گیا۔“

”یہ بالکل من گھڑت قصہ ہے..... سراسر جھوٹ ہے.....“ بھگوان داس نے چڑ کر تیز لہجے میں بولا۔ ”اس کا کوئی سرچر نہیں ہے..... ان وہمی اور احمق ہندوستانی ملازمین کو جو تو ہم پرست واقع ہوئے ہیں ہر جگہ بھوت ہی بھوت نظر آتے ہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ گنتی ترقی کر چکی ہے اور کر رہی ہے۔ لیکن ان کے اعصاب پر بھوت سوار ہیں۔“

”اس بات میں کسی قدر صداقت ہوگی۔“ سریش نے کہا۔ ”کسی کو کیا پڑی کہ وہ مبالغے سے کام لے؟“

”ہاں..... یہ بات سچ ہے کہ ایک رات میں نے اپنی خواب گاہ کا ایک دروازہ کھلا ہوا پایا تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ میں نے بے دھیانی میں اسے کھلا چھوڑ دیا ہو..... اور پھر کسی وجہ سے اسے بند کرنے کا خیال نہ آیا ہو۔ آخر کسی شخص نے تمہیں یہ بات بتائی.....؟ مجھے اس کے بارے میں بتاؤ تاکہ میں اس سے معلوم کر سکوں؟“

”ہمیں یہ اطلاعات تین ذرائع سے معلوم ہوئی ہیں۔“ سریش نے اندھیرے میں تیر چلاتے ہوئے کہا۔ ”اور ہر اطلاع ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہے۔ ان میں تضاد نہیں ہے اور نہ

ہی مبالغہ معلوم ہوتا ہے..... مسٹر بھگوان داس..... اس اطلاع کے پس پشت ایسی کوئی بات ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا ہے.....“

”ایک بھوت کا کسی قدیم رہائش گاہ سے تعلق رکھنا غلط معلوم نہیں ہوتا ہے۔“ سریش نے اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر فوراً ہی کہا۔ ”ہوتا ہے کہ بہت بڑا مکان جو کسی حویلی کی طرح ہے..... جس کے بہت سارے کمرے ویران، خالی اور سنسان ہوں تو پھر بھوت پریت اور چڑیلیں بھی رہنے لگتی ہیں۔ آپ کی کوٹھی نہایت عالی شان سہی لیکن ان تمام کمروں میں کوئی نہیں رہتا..... صرف ایک خواب گاہ آپ کے استعمال میں ہے۔ ملازمین اور شاید آپ کا ملازم خاص جو ایک طرح سے سیکریٹری ہے وہ بھی سروٹ کوارٹر میں رہتا ہے۔“

”میں بھوت پریت اور چڑیلوں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا۔“ بھگوان داس نے کہا۔ ”اگر ان کا وجود ہوتا تو وہ ظاہر ہو جاتیں..... آپ کو جو اطلاعات ملی ہیں۔ من گھڑٹ قصہ کہانیاں اور جو افواہیں ہیں وہ میری جائیداد کو گرانے کے لئے ہیں۔ میں پریشان، خوف زدہ اور ہراساں ہو کر اپنی جائیداد ادا کرنے پونے بیچ دوں..... اور پھر میرے مالی نقصان کے لئے میرے دشمنوں نے میرے خلاف منصوبہ بنایا ہوا ہے۔ لیکن میں ان کی حسرت اور سازش پوری ہونے نہیں دوں گا۔“

”مسرت چندر کے بھوت کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا..... ہو سکتا ہے کہ وہ بھوت اس علاقے میں سنسنی خیز وارداتیں شروع کر دے..... ایسی صورت میں تمام اخبارات مسرت چندر سے متعلق خبریں شائع کریں گے۔“ وہ مسکرایا۔ ”آپ جانتے ہیں کہ اخبارات میں ایسی خبریں چھپتی ہیں جن میں پراسراریت اور سنسنی خیزی ہو تو شوق سے اخبار خرید کر پڑھتے ہیں۔ ان کا تجسس اور دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔ آپ اس پہلو پر غور فرمائیں۔“

”مجھے ان باتوں کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں..... سنسنی خیز خبریں چھپتی ہیں تو میری بلا سے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ تو اس کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ تھی۔ ”آپ مجھے ڈرائیں نہیں..... اگر کسی بھوت نے میری کوٹھی میں قدم رکھا تو اس کی گردن..... مرغی کی گردن کی طرح مروڑ کر رکھ دوں گا۔“

تھوڑی دیر بعد..... سریش اس ارب پتی سے ملاقات کر کے زینہ اتر رہا تھا تو اس شخص کے پارے میں کوئی رائے قائم کرنے کے لئے سنجیدہ ہو رہا تھا۔ وہ کسی نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

سریش اب تک بہت سارے بڑے بڑے دولت مندوں سے مل چکا تھا لیکن بھگوان داس

ان کے برعکس تھا۔ وہ ان مال دار اور معززین میں سے نہ تھا جو ہائی سوسائٹی میں اٹھتے بیٹھتے ہیں اور شو بزنس کی دنیا میں فن کاروں خصوصاً اداکاروں سے میل جول بڑھاتے ہیں اور انہیں بستر کی زینت بناتے ہیں۔ کالی راتوں میں کالا دھن لٹاتے ہیں۔ گو کہ اس نے پلاسٹک سرجری کروا کر اپنا چہرہ قدرے بہتر کر لیا تھا۔ کراہیت نہیں ہوتی تھی لیکن اپنے چہرے کی خباثت دور نہ کر سکا تھا۔

بہر حال بھگوان داس سے تسلی بخش جواب نہ پا کر سریش کمرے سے باہر نکل آیا۔ تب اس نے مہی پال کو ایک شخص سے بات چیت کرتے ہوئے پایادہ سفید باریش فحش تھا۔ اس کا قد لکھتا ہوا تھا۔ اس کے چہرے مہرے اور وضع قطع سے وہ خوش حال محنت کش دکھائی دیا تھا۔ اس نے سریش کو باہر آنا دیکھا۔ ہاتھ سے ٹھہرنے کا اشارہ کیا۔ پھر مہی پال نے اس اجنبی شخص سے کہا۔ ”مسٹر چندر دیگر..... آپ کو علم ہے کہ مالک اس وقت اپنی خواب گاہ میں ہوتے ہیں۔ وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“

جب وہ شخص اندر جا کر برآمدے سے ہوتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا تو مہی پال..... سریش کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

”مسٹر سریش.....! میرے مالک نے آپ کو مسرت چندر کے بارے میں کیا کیا بتایا؟“

”بھگوان داس نے اس اطلاع کو سرے سے ہی غلط بتایا۔ وہ کسی طور بھوت کے وجود کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ مہی پال.....! سچ بتاؤ..... کیا واقعی اس بھوت کی کوئی حقیقت ہے..... یا صرف فسانہ ہے؟“

مہی پال اس کی بات سن کر چند لمحوں تک خاموش رہا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

”معلوم نہیں آپ کہاں سے یہ دور کی کوڑی لائے ہیں..... میں اس سلسلے میں تمہیں کچھ بتا نہیں سکتا..... شاید رات کے اندھیرے میں ٹیرس پر کسی نے ایک ہیولا سا دیکھا تھا..... کسی کا کہنا ہے کہ ایک عورت کا سایہ تھا جو لباس سے آزاد تھی..... کسی کا کہنا ہے کہ اس سایہ کے خدو خال بھوت کے سے تھے..... میرے مالک کا یہ کہنا ہے کہ میں نے آپ کو کسی بھوت کے بارے میں بتایا..... مجھے ان کی سرزنش سننی پڑی۔“

”بھوت کے متعلق جو کہانیاں زد عام ہیں اس میں سچائی معلوم ہوتی ہے..... جب کوئی افواہ اڑتی ہے..... من گھڑٹ باتیں ہوتی ہیں وہ کسی نہ کسی بنیاد پر ہوتی ہیں۔“ سریش نے کہا۔ ”کیا تم یہ بات بڑی سچائی اور بغیر کسی خوف کے بتا سکتے ہو کہ بھوت کو کوٹھی کے ٹیرس اور دیواروں کے آس پاس

واقعی منڈلاتے دیکھا تھا اور ہاں تم نے اس کے گلے میں زنجیریں بھی پڑی ہوئی دیکھی تھیں.....؟“
 مہی پال نے نفی میں سر ہلادیا..... ”مسٹر سریش.....! اس کے متعلق میں کوئی حتمی بات بتانے سے قاصر ہوں۔“ کیا کوئی لڑکی تھی جو بیس پر کمرے سے نکل کر تازہ ہوا کھانے اور تھکن دور کرنے آئی تھی؟“ سریش نے سوال کیا۔

”اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا.....؟ کسی عورت کی موجودگی کے بارے میں کہنا بہتان ہے۔“ مہی پال بات گول کر گیا۔

”اچھا یہ کون ہے جو تمہارے مالک سے ملنے اصرار کیا ہے؟“ سریش نے کہا۔

”اس کا نام چندر نگر ہے..... وہ میرے مالک کے دیرینہ شناساؤں میں سے ہے۔ مالک سے ملنے آکر آتا رہتا ہے۔“

دوسرے سریش جب ہوٹل اشوکا میں داخل ہوا تو اس نے ایک مختصر سی پارٹی کو ڈاننگ ہال میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ وہ آدمی تھے اور ان کے ساتھ نو خیز عمر کی ایک بے حد حسین لڑکی تھی..... ان دونوں آدمیوں میں ایک تو کافی لانا اور بلا پتلا تھا۔ اس کے سر کے سفید بالوں میں ایک بال بھی کالا نہ تھا..... اس کے بشرے سے غم اور تفکرات کے تاثرات ظاہر تھے جیسے وہ کسی بڑے گہرے صدمے سے دوچار ہوا ہے۔ اس کی آنکھوں میں سے بھی غم جھانکتا لگتا تھا۔

دوسرا فرد جو تھا..... وہ نہایت نفیس اور شائستہ قسم کا تھا..... چاق و چوبند اور خوش رو جوان تھا۔ وہ خوش پوشاک تھا۔ اس کے لباس سے اندازہ ہوتا تھا وہ لباس کے معاملے میں بڑا باذوق ہے۔ اسے لباس پسند کرنے اور پنپنے کا سلیقہ آتا ہے۔ ڈاننگ ہال میں جو لڑکیاں اور عورتیں موجود تھیں نہ صرف ان کی توجہ کا مرکز تھا بلکہ مردوں کا بھی.....

لیکن سریش تو اس وقت اس بت غماز کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اس کے متناسب جسم، نشیب و فراز اور قیامت خیز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ایسی پرکشش اور اٹھان کی نو جوان لڑکیاں بہت کم دکھائی دیتی تھیں۔

”آپ کے خیال میں یہ حسین اور نو جوان لڑکی بہت زیادہ پرکشش نہیں ہے؟“ سریش نے اپنے ساتھی دشوانا تھ سے کہا اور اس لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ ”پورے ڈاننگ ہال میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے۔“

”ہاں.....“ دشوانا تھ نے اس لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ ”آپ نے اس کی صحیح تعریف کی ہے۔ میرے خیال میں ایسی لڑکیوں کو دیکھ کر گیت کار..... کو تا کہتے ہیں۔“

”میرے خیال میں یہ لڑکی اس لائق ہے کہ اس کی رنگین تصویر کسی میگزین کے سرورق کی زینت بنے..... ایسی حسین لڑکیاں میری نظروں سے بہت کم گزری ہیں۔ یہ لڑکی ایسی مہ پارہ ہے کہ برسوں تک ذہن پر چھائی رہے۔“

”لیکن یہ لڑکی ہے کون؟“ دشوانا تھ نے سریش کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”کیا آپ اس سے واقف ہیں؟“

”جی ہاں..... اس لڑکی کا نام شمیٹا ہے..... مس شمیٹا نارائن..... اس کے ساتھ جو عمر رسیدہ شخص ہے اس کا نام نارائن ورما ہے..... یہ بنگالی نژاد ہے۔ لیکن کئی برس اس نے امریکہ میں گزارے ہیں..... اس نے امریکہ جا کر وسطی امریکہ میں ایک زمین خرید کر کھیتی باڑی کا کام شروع کیا۔ بنگال میں اس کے آباؤ اجداد کا پیشہ بھی زراعت کا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کی زمینوں پر تیل نکل آیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک معمولی آدمی دولت مند بن گیا..... پھر وہ امریکہ سے ہندوستان آ کر اس نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ چوں کہ اس کے پاس بے پناہ دولت ہے..... اس کے ساتھ جو فیشن ایبل نو جوان ہے اس کا نام نریندر راہے۔ میں اسے اس شہر کے ٹائٹ کلبوں اور ہوٹلوں میں دیکھتا ہوں۔ جیسے اس کی کمزوری..... جنون اور شوق اپنی شامیں ہوٹلوں میں گزارتا ہے۔ اس کے علاوہ بڑے کلبوں کا ممبر بھی ہے۔ بعض لوگ ہوٹلوں کی جو تک کا نام دیتے ہیں۔ وہ زندگی کا بہت لطف اٹھاتا ہے۔“

وہ تینوں ان کی میز سے قریب والی میز پر آ بیٹھے۔ شمیٹا کو قریب سے اور غور سے دیکھا۔ اس اثناء میں اس نے مہی پال کو گزرتے دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ بھگوان داس ہوٹل میں آ کر ٹھہرا ہوا ہے۔ اس کا ایک کمر اس ہوٹل میں بک تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت اسی ہوٹل میں گزارتا ہے۔ ”یہ لڑکی واقعی بہت حسین ہے۔“ دشوانا تھ نے سرگوشی میں کہا۔ ”اسے تو کسی فلم کی ہیروئن ہونا چاہئے۔“

دشوانا تھ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا۔ سریش اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی میز سے اٹھ کر نارائن داس کی میز کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اس سے ہاتھ ملانے کے لئے سریش اپنا ہاتھ بڑھا چکا تھا۔ پھر نارائن داس سے رسی گفتگو کر کے اپنی میز پر آ گیا۔

”مسٹر دشوانا تھ.....!“ سریش نے کہا۔ ”لج کے بعد مسٹر نارائن داس مجھے اپنے ہمراہ کچھ دیر کے لئے اپنے کمرے تک لے جانا چاہتے ہیں۔“ اس کے لہجے میں معذرت خواہانہ انداز آ گیا۔ ”شاید وہ مجھ سے کسی سلسلے میں کچھ بے حد ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں..... کیا باتیں.....؟ انہوں نے اشارے کنایے میں بتایا نہیں..... بہر حال آپ سے اجازت چاہوں گا۔“

”آپ ان کے ہمراہ جاسکتے ہیں..... مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“ دشوانا تھ نے مسکرا کر کہا۔

کھانے کے دوران دوسرے اسٹیفن جیمز کی نگاہوں نے دشوانا تھ کے چہرے پر مرکوز ہو کر انہیں اپنی گرفت میں لے لیا..... یہ بڑی بڑی خوب صورت سیاہ آنکھیں ان میں شک و شبہات اور تحیر سا ابھرا آیا..... اس کے دل کے کسی کونے میں یہ خیال کسی سانپ کی طرح سرسرا کر لگا کہ وہ اس شخص سے کہیں پہلے بھی مل چکی ہے..... لیکن کہاں.....! کس مقام اور کس ماحول میں.....؟ ذہن پر بہت زور دینے کے باوجود اسے یاد نہ آیا۔

سریش نے اب اپنی گفتگو کا رخ بدل کر ایک ایسے نئے موضوع کی طرف موڑ دیا جو اس وقت اس کے لئے نہ صرف سب سے زیادہ دلچسپ تھا بلکہ کسی قدر سنسنی خیز بھی تھا۔ بوریت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”مسٹر دشوانا تھ.....! کیا آپ نے اپنی سیاسی مصروفیت کے دوران کبھی کسی بھوت وغیرہ کو دیکھا.....؟“ سریش نے سوال کیا۔ میں نے سنا ہے کہ سیاسی لوگوں کو اکثر بھوت پریت نظر آتے ہیں۔ کیا یہ سچ ہے؟“

”جی نہیں.....“ دشوانا تھ نے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ ”بچپن میں دادی اور نانی سے بھوتوں کے قصے کہانیاں سنتا تھا۔ اس کے بعد بھی بہت سارے قصے سنے..... صرف کہانیاں ہی کہانیاں..... لوگ کہتے تھے اور آج اس جدید سائنسی دور میں بھی کہا جاتا ہے کہ بھوتوں اور چڑیلوں کا وجود ہے۔ اس کے باوجود نہ تو کبھی کوئی بھوت دیکھا اور نہ ہی چڑیل..... ویسے میری دلی خواہش ہے کہ بھوت یا چڑیل کو دیکھوں.....“

”کیا آپ بھگوان داس سے کچھ واقفیت رکھتے ہیں.....؟ اس سے کبھی ملے ہیں؟“ سریش نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”وہی بھگوان داس جس کے بارے میں طرح طرح کی عجیب و غریب کہانیاں مشہور ہیں.....؟“ دشوانا تھ نے جواب دیا۔ ”جی ہاں میں اسے بہت قریب سے جانتا ہوں..... اس شخص نے ایک کروڑ پتی عورت سے شادی کی اور اس کے مرنے کے بعد ارب پتی بن گیا..... اس کی بیوی کے پہلے شوہر نے ایک انگریز کی قدیم کوٹھی خریدی تھی۔ یہ کوٹھی محل نما ہے۔“

”جی ہاں..... میں اس بھگوان داس کے بارے میں کہہ رہا تھا۔“ سریش نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں نے سنا ہے کہ اس کی یہ کوٹھی جو اس نام سے مشہور ہے اس میں مسرت چندر نام کا ایک خوف ناک بھوت رہتا ہے..... مگر بھگوان داس کو اس بھوت سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ ڈر خوف.....“

حالاں کہ اس کے کئی گھریلو ملازمین نے اس عجیب و غریب سبز پوش بھوت کو اپنی آنکھوں سے اس کی خواب گاہ میں داخل ہوتے دیکھا ہے..... اور پھر یہ کیا عجیب سی بات نہیں ہے کہ اس کی کوٹھی سبز رنگ کی ہے اور بھوت بھی سبز رنگ کا ہے۔ یہ بات بے حد دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔“

”ہاں ہے تو عجیب اور بے حد دلچسپ بات.....“ دشوانا تھ نے کہا۔ ”اس کوٹھی کے بھوت کے بارے میں شاید من گھڑت قصے کہانیاں مشہور کی گئی ہوں گی۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں ذرا سی بات کا ہنگامہ بنا دیا جاتا ہے۔“

”اگر اور لوگوں نے بھوت کو دیکھا ہوتا تو شاید اسے مبالغہ کہا جاتا۔“ سریش نے کہا۔ ”چوں کہ اس کے گھریلو ملازمین نے بھوت دیکھا ہے اس لئے اس بات کی سچائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔“

پھر سریش نے اس سبز کوٹھی کے سبز بھوت کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے بتانا شروع کیا کہ اس کے دوستوں اور دیگر بہت لوگوں نے سن رکھی تھیں اور انہوں نے اسے بتایا تھا۔ یہ باتیں ایسی تھیں کہ انہیں جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

”یہ نہایت ہی عجیب و غریب اور دلچسپ قصہ ہے۔“ دشوانا تھ نے اس کی زبان سے تفصیل سننے کے بعد کہا۔ ”میں اس کوٹھی کے متعلق بہت ساری باتوں سے واقف ہوں اور پھر بھگوان داس کے بارے میں بھی کئی باتوں کو اچھی طرح سے جانتا ہوں۔“

”تو آپ بھگوان داس کے بارے میں بہت ساری باتیں جانتے ہیں؟“ سریش نے چونک کر تجسس سے پوچھا۔

دشوانا تھ نے صرف اثبات میں اپنا سر ہلادیا۔ زبان سے ایک لفظ بھی ادا نہیں کیا۔ جیسے وہ ہلچل مٹانے کے موڈ میں نہ ہو۔

اس لمحے نارائن داس اور ان کے ساتھ جو لڑکی اور لڑکا تھا وہ اپنی میز سے اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھے..... دشوانا تھ نے ویٹر کو بلا کر اس سے مل لانے کے لئے کہا۔ جب وہ مل لے آیا تو دشوانا تھ نے مل کی رقم ادا کی اور پھر وہ دونوں بھی بیرونی دروازے کی طرف میزوں کے درمیان سے ہوتے ہوئے بڑھے۔

”مجھے اس وقت ایک ضروری ذاتی نوعیت کا فون کرنا ہے۔“ دشوانا تھ نے کہا۔ ”نارائن داس لے پاس کیا آپ زیادہ دیر تک رکیں گے۔ وہ شاید آپ سے کوئی مفصل بات کرنا چاہتے ہوں گے۔“

”جی نہیں.....“ سریش نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے فوراً ہی جواب دیا۔ ”وہ بہت مصروف“

”یہ میری پیاری بیٹی شمیٹا ہے جو آپ سے ملنا چاہتی تھی۔“ نارائن داس نے کہا۔ ”اس لئے آپ کو زحمت دی۔ نارائن داس نے ان کی فستیں سنبھالنے کے بعد بیٹی کی طرف دیکھا اور کہا۔“

”جو بات کہنی ہے کھل کر اور صاف صاف کہو۔“

”مسٹر سریش.....! بات یہ ہے کہ میں آج کل یہاں ایک پراسرار طور پر گم شدہ خاتون کا سراغ لگانے میں مصروف ہوں جو اب سے بارہ برس قبل ممی میں رہا کرتی تھی۔“ حسین و جمیل شمیٹا نے قدرے جھجکتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ”اس خاتون کا نام مسز بیلا رام ہے۔ وہ میوری کے علاقے میں رہتی تھی..... میں نے اس جگہ خود جا کر اپنے طور پر تحقیق بھی کی ہے۔ لیکن اس وقت وہاں کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو اس عورت کو جانتا ہو۔ مجھے کسی طرح بھی اس کا پتا نہ چل سکا۔ لیکن اتفاق سے ایک خط میرے ہاتھ لگ گیا۔“

شمیٹا بتاتے بتاتے یک لخت خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد پھر اس نے اپنی گفتگو شروع کی۔

”دراصل وہ خط کسی دوسرے شخص کو مطلع کرنے کے لئے لکھا گیا تھا مگر محض ایک اتفاق تھا جو وہ خط میرے ہاتھ لگ گیا..... جس شخص نے خط لکھا تھا اس نے مسز بیلا کی جائے رہائش کو کسی دوسرے پر ظاہر نہ کرنے کی تاکید کی ہوئی تھی..... اس راز داری کا سبب میرے علم میں آ گیا کیوں کہ مذکورہ خط لکھنے کے دو ایک ہفتوں کے بعد مسز بیلا پراسرار طور پر لا پتہ ہو گئی۔“

”کیا آپ نے ان کی گمشدگی کا کوئی اشتہار شائع کرایا تھا؟“ سریش نے سوال کیا۔

”اشتہار سے آپ کو معلوم ہو جاتا۔“

”جی ہاں.....“ شمیٹا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں نے ایک بار نہیں دو تین مرتبہ اخبارات میں اشتہارات شائع کرایا تھا..... میں اس سلسلے میں ہر ممکن اقدام کر چکی ہوں..... پولیس کئی برس سے اس گمشدہ خاتون کا سراغ لگانے میں مصروف ہے۔ معلوم نہیں وہ کہاں غائب ہو گئی۔ کیا آپ ان شریعتی کا سراغ لگانے میں کوشش کریں گے؟“

”مس شمیٹا.....! مجھے افسوس ہے کہ اس سلسلے میں..... میں شاید ہی آپ کی کوئی مدد کر سکوں۔“ سریش نے نفی میں سر ہلادیا۔ ”اس لئے کہ یہ ایک ایسی تھی ہے جو بے حد الجھی ہوئی ہے۔ یہ بے حد پراسرار گمشدگی ہے۔ اس لئے میں کسی قسم کی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔“

”میں آپ کی بات سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں اور میں نے ایسا ہی خیال شمیٹا بیٹی پر ظاہر کیا تھا۔“ نارائن داس نے درمیان میں دخل دیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اسے سمجھایا بھی تھا۔ لیکن میری بیٹی کا یہ خیال ہے کہ.....“

آ دی ہیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ مجھ سے کس سلسلے میں بات کریں گے۔ میرے خیال میں جو بات بھی ہوگی۔ وہ مختصر ہی ہوگی۔“

سریش لفٹ سے اس منزل پر آ گیا جس منزل پر نارائن داس کا کمر تھا۔ اس منزل پر بھگوان داس کا بھی کمر تھا۔ نارائن داس اپنے کمرے میں سریش کے بے چینی سے منتظر تھے۔ اس وقت نریندا بظاہر جا کا تھا۔ اس کمرے میں صرف دو افراد نارائن داس اور اس کی نہایت حسین و جمیل نازک اندام بیٹی شمیٹا موجود تھی۔

جس وقت سریش نے دروازے پر دستک دی تھی اس وقت وہ یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ نارائن داس نے اسے کیوں اور کس لئے اور کس ضروری کام سے بلایا ہے بلکہ وہ بھگوان داس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کا ذہن ایک ابھرتی ہوئی نئی اداکارہ نیناوتی کی طرف گیا جس نے ایک فلم میں انتہائی ہوش ربا اور بولڈ مناظر کا رقص کر کے تماش بینوں کو پاگل کر دیا تھا اور پھر وہ کالی راتوں سے خوب فائدہ اٹھا رہی تھی۔ اس فلم نے اس کی سیاہ راتوں کی آمدنی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ دروازہ کھلا۔ شمیٹا اس کی نظروں کے سامنے کھڑی تھی۔ سریش کو اس وقت وہ اور بھی سندر لگی۔ اس نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھا دیا۔ اس کے سڈول، گداز اور خوب صورت اور نرم و نازک ہاتھ کے لطیف لمس نے سریش کے بدن میں فرحت و دوا دی۔

”آئیے مسٹر سریش!“ شمیٹا نے اس کی آنکھوں میں اپنائیت کے انداز سے جھانکا اور اس کی مترنم آواز کمرے میں گونج گئی۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا ہی انتظار ہو رہا تھا۔“

”آئیے مسٹر سریش.....!“ نارائن داس نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ سریش نے محسوس کیا کہ ان کی آواز میں اداسی پائی جاتی ہے اور ایک عجیب سا کرب بھی ہے۔ پھر انہوں نے اٹھ کر سریش سے مصافحہ کیا۔

اس دوران شمیٹا دروازہ بند کر کے آئی تو انہوں نے شمیٹا سے کہا۔ ”میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ مسٹر سریش ایک بہت بڑے مشہور و معروف اخبار کے کرائم رپورٹر بھی ہیں..... سیاسی خبریں بھی کورتج کرتے ہیں۔ بڑے باصلاحیت ہیں..... اور ایک کرائم رپورٹر کسی سراغ رساں اور ہم جو سے کم نہیں ہوتا ہے۔ یہ تمہارے بہت کام آ سکتے ہیں۔“

شمیٹا کے سرخ گداز لبوں پر دل کش تبسم بکھر گیا اور اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔“ شمیٹا بولی۔ ”ہماری ہر کسی کی تعریف بلا وجہ نہیں کرتے ہیں۔“

نارائن داس نے اپنا جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ دفعتاً باہر راہ داری سے کسی کے غصے سے گرجنے کی آواز سنائی دی اور پھر فوراً ہی کسی کے فرش پر گرنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز دھماکہ سے قدرے مشابہ تھی۔

سریش فوراً ہی کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ پھر اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ اسے ایک عجیب اور ناقابل یقین تماشا نظر آیا۔ وہ باریش شخص چندر میگزین سے اٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑ رہا تھا۔ اس کے سامنے جو کرا تھا اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بھگوان داس اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس وقت بھگوان داس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں انگاروں کی طرح دھکتی ہوئی لگ رہی تھیں۔

”تم اپنی اس گھٹیا اور ذلیل حرکت پر پچھتاؤ گے بھگوان داس.....!“ چندر میگزین نے کانپتی ہوئی آواز میں اسے دھمکی دی۔

”میں کہتا ہوں تم فوراً میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ..... اور باہر چلے جاؤ۔“ بھگوان داس دروازے میں کھڑے کھڑے گرجا۔ ”اب اگر تم کبھی یہاں آئے تو یاد رکھنا میں تمہیں کھڑکی سے اٹھا کر نیچے پھینک دوں گا۔“

”لیکن یہ بات اچھی طرح یاد رکھو بھگوان داس.....!“ چندر میگزین غضب ناک ہو کر بولا۔ ”تمہیں اپنی اس حرکت کی قیمت ادا کرنی ہوگی..... اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا یہ تمہاری بھول ہے۔ تم نے میرے ساتھ بدسلوکی کر کے اپنے پیروں پر کھڑائی ماری ہے..... تمہیں میرے بارے میں کوئی اندازہ نہیں ہے کہ..... میں کیا چیز ہوں۔“

”تم جو کر سکتے ہو کر کے اپنی دلی حسرت پوری کر لینا..... تم میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتے ہو.....“

بھگوان داس دھمکی دے کر کمرے میں گھس گیا اور ساتھ ہی اس نے زور اور غصے سے دروازہ بند کر دیا۔

جیسے ہی دروازہ بند ہوا سریش لپک کر چندر میگزین کے پاس پہنچا جو اس وقت آہستہ آہستہ لنگڑاتا ہوا لفٹ کی طرف جا رہا تھا۔

”مسٹر چندر میگزین.....!“ سریش نے اس کے سامنے جا کر اسے ہمدردانہ لہجے میں مخاطب کیا۔ ”آخر بات کیا ہوئی.....؟ بھگوان داس شاید آپ کے دوستوں میں سے ہیں..... انہوں نے آپ کے ساتھ گری ہوئی حرکت کس لئے کی؟“

سریش کا ہمدردانہ لہجہ سن کر وہ چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے اپنے گھٹنوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

”ابھی تو میں آپ کو کوئی بات بتا نہیں سکتا۔ لیکن جلد ہی آپ کو تمام باتیں معلوم ہو جائیں گی..... آپ چوں کہ پریس کے آدمی ہیں..... آپ کے لئے ان باتوں میں ایک سنسنی خیز مسالہ موجود ہے جو آپ کے کام کا ہے۔“

چندر میگزین لفٹ میں سوار ہو کر نیچے چلا گیا۔ سریش نے نارائن داس کے کمرے میں آ کر واقعہ سنایا۔ پھر اس نے کہا۔

”مسٹر نارائن داس.....! کیا آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے اجازت دیں گے کہ میں اس شخص سے کچھ دلچسپ اور اہم باتیں معلوم کر کے آؤں..... وہ ابھی نیچے ہی ہے۔ اس کے پیروں میں شاید موج آگئی ہے۔ وہ تھوڑی دیر میں ہی جانے گا۔“

”کیا بھگوان داس نے اسے دھکے مار کر اپنے کمرے سے نکالا تھا؟“ شیمپا نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس وقت اس کے حسین چہرے پر کچھ نفرت اور ناگواری کے تاثرات ابھرائے.....

”جی ہاں..... مس!“ سریش نے جواب دیا۔ پھر اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا آپ بھگوان داس سے واقف ہیں؟“

”واقف تو نہیں ہوں..... لیکن میں نے اس ظالم اور سفاک شخص کے بارے میں بہت ساری باتیں سنی ہوئی ہیں۔“ وہ اپنی نفرت کو دباتے ہوئے بولی۔ ”لوگ اس کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے ہیں۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔“ سریش نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”بھگوان داس کی تعریف میں نے کسی کی بھی زبان سے نہیں سنی..... جس نے بھی اس کے متعلق جو کچھ کہا اس کی رائے اچھی نہیں تھی۔ چوں کہ وہ دولت مند ہے۔ اس لئے اس کے تمام عیوب کو لوگ نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ کسی کے خلاف کوئی غلط حرکت کرتا ہے تو کوئی بھی اس کے خلاف کوئی رد عمل نہیں کرتا ہے۔ صرف اس لئے کہ وہ طاقت ور اور بااثر ہے۔ اس لئے اس سے ہر کوئی ڈرتا اور خوف کھاتا ہے۔“

”واقفی بھگوان داس دولت کے گھمنڈ اور طاقت کے نشے میں حد سے گر گیا ہے۔“ شیمپا نے ملامت کے انداز میں کہا۔

سریش ان لوگوں سے رخصت ہو کر نیچے آیا۔ اس کا خیال تھا کہ چندر میگزین چلا گیا ہوگا۔ وہ گیا نہیں تھا۔ ہال میں موجود تھا اور غصہ سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور سینے میں سانپ دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔ سریش اس کے پاس جا کر خاموش کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر

میں چندرگیر نے اپنے غصے، جذبات اور سانسوں پر قابو پالیا۔

”ہاں مسٹر.....! آپ کا نام کیا ہے.....؟ میں آپ کا نام بھول رہا ہوں..... لیکن یہ تو جانتا ہوں کہ آپ کسی اخبار کے کرائم رپورٹر ہیں..... بھگوان داس نے یہ بات غلط نہیں کہی کہ میں اپنی پنشن سے ہاتھ دھو سکتا ہوں..... اس کے ہاتھ بڑے لمبے ہیں..... لیکن مجھے اس کی دھمکی کا کوئی خوف نہیں اور میں ہر قسم کے خطرات مول لینے کے لئے تیار ہوں..... اچھا آپ جلدی سے اپنا نام تو بتائیں؟“

”مجھے سریش کمار کہتے ہیں.....؟“ سریش نے اپنا تعارف کرایا۔ ”میں واقعی کرائم رپورٹر ہوں۔“

”آپ مجھے بروقت ملے ہیں..... آپ سے بہتر اور مناسب آدمی کون ہو سکتا ہے جسے تمام باتیں بتائی جائیں..... لیکن یہ جگہ باتیں بتانے کی نہیں ہیں..... اس لئے کہ بھگوان داس کے پالتو کتے یہاں موجود ہوں گے..... اگر آپ غریب خانے پر آنے کی زحمت کریں تو میں آپ کو بڑی تفصیل سے آگاہ کروں گا..... آپ میرا ہاتھ نوٹ کر لیں.....“ اس نے اپنا ہاتھ بتایا۔ سریش نے فوراً ہی اس کا ہاتھ نوٹ کر لیا۔

”میں پہلی فرصت میں آپ کے دولت کدے پر حاضر ہو جاؤں گا.....“ سریش کمار نے کہا۔ ”آپ اطمینان رکھیں۔“

”میں آپ کو جو کچھ بتاؤں گا اس کی اشاعت سے چاروں طرف سنسنی پھیل جائے گی..... اور پھر آپ کی شہرت میں بھی اضافہ ہوگا۔“ چندرگیر کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک کوئنگئی۔

”اگر ایسی بات ہے تو پھر آپ مجھے بتائیں کہ میں کب اور کس دن اور کس وقت آپ سے ملاقات کروں؟“ سریش نے پوچھا۔

”شبہ کام میں دیر کرنا ٹھیک نہیں..... میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ آج ہی میرے غریب خانے پر تشریف لائیں..... میں یہ چاہتا ہوں کہ کل ہی میرا بیان اخبار میں چھپ جائے اور تھمکے بجائے..... میں اس حرام زادے سے ایسا انتقام لینا چاہتا ہوں کہ..... یہ ریڈیل شخص بے نقاب ہو جائے۔ لوگ اس کا اصل مکروہ اور گھناؤنا چہرہ دیکھ لیں..... اس کی نام نہاد عزت خاک میں مل کر رہ جائے۔“ چندرگیر نے جواب دیا۔ ”آپ ایسا کریں۔ تین گھنٹے کے بعد آجائیں۔ میں آپ کا گھر پر منتظر ہوں گا۔ آپ زیادہ دیر نہ کریں۔“

اتنا کہہ کر چندرگیر داخلی دروازے کی طرف بڑھ گیا اس نے سریش کے جواب کا انتظار بھی نہیں کیا۔

سریش زینے کی طرف بڑھتے ہوئے رک گیا۔ کیوں کہ اس کی نگاہ معاذ شواناتھ پر پڑی جو اس ہال میں ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ جا کر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ کس وقت ہال میں آئے سریش کو علم نہ ہو سکا تھا۔

”مسٹر سریش.....! کیا بات ہے۔“ شواناتھ نے پوچھا۔ ”یہ شخص اس قدر خوف زدہ بلکہ دہشت زدہ کیوں لگ رہا تھا..... اس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ وہ اس طرح سے سہا ہوا تھا جیسے موت اس کے سامنے کھڑی ہوئی ہو۔“

”ابھی..... یعنی تھوڑی دیر پہلے بھگوان داس نے اس کو اپنے کمرے سے باہر راہ داری میں پھینک دیا تھا۔“ سریش نے بتایا۔ ”اور اس نے بھگوان داس کے خلاف ایک انتہائی سنسنی خیز بیان دینے کا وعدہ کیا ہے۔“

سریش کی بات سن کر شواناتھ بے اختیار مسکرا دیئے۔ کچھ دیر بعد وہ شواناتھ کے ساتھ اوپر آیا تو حسیا اس وقت اپنے کمرے میں در دوسر کے باعث جا چکی تھی۔ پھر وہ شواناتھ سے رخصت ہو کر ہوٹل سے باہر آیا۔

چندرگیر نے جو بتا دیا تھا وہ لمبی مسافت پر تھا۔ سریش کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ وہ لوکل ٹرین اور بس سے وہاں پہنچے۔ چوں کہ اس کے پاس وقت کافی تھا اس لئے وہ بس سے اس دور افتادہ بستی میں پہنچا۔ یہ بستی ابھی زیر تعمیر تھی۔ گو کہ بہت سے مکانات بنے ہوئے تھے۔ لیکن چندرگیر کا جہاں گھر تھا وہاں جانے کے لئے کچی سڑک تھی اور کمیت اور میدان بھی تھے۔ جھاڑیاں بھی تھیں۔ چندرگیر کالج بس اسٹاپ سے خاصی دور اور سڑک سے خاصا ہٹ کر بھی تھا۔ خاردار باڑھ اور جھاڑیوں کے عقب میں ایک چھوٹا سا قدیم طرز کا مکان تھا۔ اس کی چھت کھیریل کی تھی جس پر مختلف قسم کی سرسبز بیلین چڑھی ہوئی تھیں۔ مکان کے سامنے ایک مختصر سالان بھی تھا۔ لیکن عقب میں خاصا بڑا باغیچہ تھا۔ جس میں نیم اور آم کے بیڑ تھے جو خاصے گھنے اور بڑے تھے۔ جن کے سائے مکان پر پھیلے ہوئے تھے۔

سریش نے مکان کے احاطے میں داخل ہو کر دروازے پر دستک دی۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ جب کہ دروازہ بھڑا ہوا سا تھا۔ خاصی بڑی جھری سی تھی۔ اس نے دوبارہ دستک دی تو پہلے کی نسبت دراز در سے دی۔ تب بھی اسے اندر سے کوئی جواب آیا اور نہ آہٹ ہوئی..... تیسری مرتبہ اس نے چندرگیر کا نام لے کر زور سے پکارا۔ جب بھی اندر خاموشی تھی تو اس نے دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے اور پھر آواز دی۔ اس کی آواز اندر گونج کر رہ گئی۔

پھر وہ سڑک پر واپس آیا..... اور آس پاس کسی کو تلاش کرنے لگا۔ پڑوس میں کوئی مکان نہ تھا۔

جو پڑوسی سے معلوم کرتا پھر اسے اتفاقاً مخالف سمت سے ایک عورت آتی دکھائی دی جو شاید آس پاس ہی کہیں رہتی ہوگی۔ وہ چہرے مہرے اور وضع قطع سے ملازمہ دکھائی دیتی تھی۔ جب وہ قریب آئی تو سریش نے پوچھا۔

”اس مکان میں چندرگیر صاحب رہتے ہیں.....! میں نے آواز دی۔ دستک بھی دی۔“

”جی ہاں..... یہ انہی کا مکان ہے اور وہ تقریباً سارا دن ہی گھر پر رہتے ہیں۔“ عورت نے جواب دیا۔

”لیکن شاید وہ اس وقت گھر پر موجود نہیں ہیں.....؟ کیوں کہ مجھے دو تین مرتبہ دستک دینے اور آواز دینے پر جواب نہیں ملا۔ جب کہ دروازہ کھلا ہوا بھی ہے..... کیا کوئی اور بھی اس مکان میں ساآھر رہتا ہے؟“

”جی نہیں جناب.....! وہ تنہا رہتے ہیں..... شاید وہ کسی کام یا خریداری کے لئے کالونی کی مارکیٹ میں گئے ہوں گے۔ لگت ہے کہ آپ بہت دور سے ان سے ملنے آئے ہیں۔ جب وہ محلے میں یا بازار میں جاتے ہیں تو دروازہ کھلا چھوڑ جاتے ہیں۔“

سریش کو اس عورت کا مشورہ مناسب معلوم ہوا۔ چوں کہ اس وقت بارش کے آثار تھے۔ بوند ابارعی ہونے لگی تھی۔ سریش سڑک سے نہایت تیزی کے ساتھ احاطہ میں داخل ہوا اور پھر مکان کے اندر تیزی سے گھس گیا۔ پھر اس نے اپنے آپ کو نہایت آراستہ نشست گاہ میں پایا۔ یہ اس کی خواب گاہ بھی لگ رہی تھی۔ ایک طرف لمبا چوڑا پلنگ تھا جس پر صاف ستھرا اور آرام دہ بستر تھا۔ وہ اس کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ آتش دان کے کارنس پر ایک بڑے اور خوب صورت فریم میں ایک تصویر تھی۔ ایک نوجوان مرد کی..... سریش نے پہچان لیا کہ یہ چندرگیر کے نوجوانی کی تصویر ہے..... یہ تصویر کسی ادارے کے یونی فارم میں کھینچائی ہوئی تھی۔ وہ کس ادارے کا یونی فارم ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آسکا۔ کیوں کہ اس نے اب تک ایسی یونی فارم کبھی نہیں دیکھی تھی۔ بہر حال وہ اس یونی فارم میں خوب سچ رہا تھا۔ اس لئے بھی کہ نوجوان اور وجیہ تھا۔

سریش کچھ دیر تک کمرے میں بیٹھا کھڑکی سے باغیچے کے مناظر دیکھتا رہا۔ بوند ابارعی بند ہو چکی تھی۔ محاسن کی نگاہ ایک جگہ پر پڑی تو وہ اس طرح سے اچھل پڑا جیسے برقی جھٹکا لگا ہو۔ ایک لان کا قطعہ جو جھاڑیوں کے گرد تھا کسی ایک شخص کا تیر باہر نکلا ہوا تھا..... اور وہ پاؤں بالکل بے حس و حرکت تھا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور کمرے سے تیزی سے دوڑتا ہوا باہر پہنچا۔

پھر وہ لان عبور کر کے اس جھاڑی تک گیا..... اس نے وہاں اپنی آنکھوں سے جو ہول ناک

منظر دیکھا اس سے چند لمحات کے لئے خود سراسیمہ اور حواس باختہ ہو گیا اور اس کے سارے بدن پر دہشت بھلی کی روکی طرح دوڑ گئی۔

چندرگیر چاروں شانے چت جھاڑی پر الجھا ہوا پڑا تھا..... اس کی آنکھیں ادھ کلی تھیں..... اس کے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں سختی سے بھینچی ہوئی تھیں..... اس کی قمیص میں اوپر سے دل کے پاس ایک بہت بڑا سا تیز جو سبز رنگ کا تھا جس کے سرے پر سبز، چمکیلے پر موجود تھے۔ تیز تقریباً نصف اندر کی جانب دھنسا ہوا تھا۔

سریش نے جبکہ کر چندرگیر کی نبض ٹٹولی لیکن اس شخص میں زندگی کی دق تک نہ تھی۔ ہاتھ بے حد سرد ہو رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی آس پاس کا جائزہ لیا۔ چندرگیر گارڈن لکڑی کے باڑے کے ذریعے ان کھیتوں سے جدا ہو گیا تھا جن میں کہ چندرگیر کی لاش کو چھینک دینے کی کوشش کی گئی تھی..... لیکن اس کا ایک پاؤں باغیچے میں لگی ہوئی اس کھنی جھاڑی میں سے باہر نکلا رہ گیا تھا..... سریش کا خیال تھا کہ چندرگیر کی موت تیر سے فوراً واقع ہو گئی۔ اسے شاید مدد کے لئے پکارنے کی مہلت بھی نہیں ملی ہوگی۔

وہ اس لکڑی کے باڑے کو ایک جست میں پھاند گیا اور پھر کچھ تلاش کرنے لگا۔

باڑے سے صرف دس قدم کے فاصلے پر ایک بہت بڑا گھنا آم کا درخت موجود تھا..... اس تیر کے عین نشانے کی سیدھ میں معلوم ہوتا تھا..... پھر سریش نے اس درخت کے ارد گرد ایک ایک انچ زمین کا مشاہدہ کرنا شروع کیا۔ لیکن یہاں قدموں کے نشان نہ مل سکے۔ آم کا وہ درخت سڑک سے بخوبی دکھائی دیتا تھا۔ اس نے درخت کی شاخوں پر غائر نظریں ڈالیں..... اور پھر ایک لٹکتی ہوئی بچی شاخ کو پکڑ کر اوپر چڑھ گیا۔

پھر وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے چندرگیر کی لاش زمین پر پڑی نظر آتی تھی۔ اسے خود بخود اس بات کا بڑی آسانی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ درخت کی اس شاخ سے تیر چلایا گیا تھا۔ وہ بیڑ کافی شاداب، گھنا اور مضبوط تھا اور کوئی بھی چڑھ کر خود کو دوسروں کی نظروں سے پوشیدہ رکھ سکتا تھا۔

اسے یک لخت خیال آیا کہ تیر چلانے والا خواہ کوئی ہو اپنا کام پورا کر لینے کے بعد یقیناً زمین پر اترا ہوگا..... اس نے اپنے پیروں کے نشانات بھی وہاں چھوڑے ہوں گے..... لہذا وہ پھر ان نشانات کی کھوج کے لئے کود پڑا..... اس مرتبہ اسے اپنی کوششوں کا صلہ مل گیا۔ ٹھیک اسی شاخ کے نیچے جس پر سریش بیٹھا ہوا تھا..... اس نے دیکھا کہ تیر چلانے والے کے دونوں پیر کے نشانات بہت صاف اور گہرے ہیں۔ انہیں زمین پر پڑے نظر آتا تھا..... اور پھر انہیں جلدی میں لٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے..... شاید اسے خیال نہ رہا ہو.....؟ کیا ایسا ممکن ہے۔

قاتل نے اپنے پاؤں کے دو واضح نشانات کے علاوہ وہاں اس سے بھی کہیں زیادہ ایک اہم چھوڑ دی تھی جس پر فوری اہم چیز طور پر سریش کی نگاہ پڑ نہ سکی تھی..... لیکن بعد میں وہ اسے اتفاقاً پا گیا تھا..... یہ ایک تیر تھا..... ویسا ہی جیسا کہ چند دیگر کے جسم میں پیوست تھا..... بزرگ کا نہایت تیز اور نوکیلا تیر جس کے سرے پر بزر چکیلے پر لگے ہوئے تھے۔ نہایت ہی خوف ناک اور زہریلا.....

☆.....☆.....☆

مہی پال ایک تانگہ میں بیٹھ کر رات کو ٹھیک نو بجے گرین ولا کوٹھی کے سامنے پہنچا۔ تانگے والے کو کرایہ ادا کیا۔ پھر وہ اس پر شکوہ عمارت کے اندر داخل ہوا۔ وہ لفٹ سے بھی جا سکتا تھا۔ لیکن اس لئے نہیں گیا کہ بعض اوقات کسی فنی خرابی کے باعث لفٹ خراب ہو جاتی تھی۔ گوکہ لفٹ کی وجہ سے بند ہو جانے پر الارم بج جاتا تھا۔ لیکن اس کی درستگی میں کبھی کبھی بیس منٹ لگ جاتے تھے۔ وہ دو تین مرتبہ پھنس چکا تھا۔

مہی پال زینے کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا تیسری منزل پر پہنچا۔ پھر کمرانبر تین سو تین کے قریب جا کر ٹھک کے رک گیا۔ کیوں کہ اس کا دروازہ بند تھا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے ایک چابی نکالی اور تالے کے سوراخ میں گھسا کر دروازہ کھول دیا۔

دروازہ کھلنے کے بعد وہ اندر گھسا اور اس نے دروازہ جیسے ہی بند کیا سامنے والے کمرے سے ایک لڑکی آئی۔ اس کے ہونٹوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔

لڑکی نے سگریٹ کو اگلیوں میں دبا کر ایک لمبا کش لیا اور اس کی طرف بڑھی۔

”اچھا..... تم آئے ہو.....؟“ لڑکی کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ جیسے اسے مہی پال کی آمد کا یقین نہ آیا ہو اور اسے سخت اچھا ہوا ہو۔

مہی پال نے دروازے سے ہٹ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اور قریب کرتے ہوئے بولا۔

”آخیر تمہیں میرے اس وقت آنے پر اس قدر تعجب کس لئے ہو رہا ہے؟“

”اس لئے کہ میں نے انٹے سے ڈبل روٹی لانے ملازمہ کو بازار بھیجا ہوا ہے..... ابھی ابھی تو وہ گئی..... دروازہ کھلنے کی آواز سن کر مجھے حیرت ہوئی کہ اتنی جلدی واپس کیوں آگئی.....؟ کہیں پیسے لے جانا بھول تو نہیں گئی۔“

وہ دونوں ایک چھوٹے سے مگر نہایت خوب صورت سبے ہوئے کمرے میں آ گئے۔

”تم کل رات میں کہاں تھے.....؟ میرا خیال تھا کہ رات بے کھانے پر آؤ گے.....؟ وہ اس کے بازوؤں کی گرفت سے نلک کر بولی۔ پھر وہ میز کی طرف بڑھ گئی۔

”مجھے آج صبح ہی جل بدری پر شاد کا ایک خط ملا ہے۔“ لڑکی کو یکا یک یاد آیا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور میز میں سے میلا لفافہ نکال لائی۔

”میں اس خط کو پڑھنا تو درکنار ہاتھ تک لگانا پسند نہیں کروں گا۔“ مہی پال کا کڑوا سا منہ بن گیا۔ ”میرے لئے جیل کی کسی بھی چیز کو ہاتھ لگانا ایسا ہی ہے جیسے کوڑھ کے مریض کو..... مجھے وہاں کی ہر چیز سے سخت نفرت ہے۔“

”یہ کہو کہ تمہاری قسمت کی دیوی نے تمہاری مدد کی..... ورنہ تم آج بھی وہیں کے مہمان ہوتے۔“ لڑکی نے شوفی سے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا..... پھر اس نے سگریٹ کا ٹوٹا ایش ٹرے میں مسل کر دوسری سگریٹ جلا کر ہونٹوں سے پیوست کر لی۔ پھر اس کا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”بدری پر شاد نے خط میں لکھا ہے کہ اس کیس کی میعاد ختم ہونے میں اب صرف چھ ماہ رہ گئے ہیں..... اس نے خط میں دریافت کیا ہے کہ اب آئندہ تمہارا کیا پروگرام ہے۔ وہ جیل میں بڑے اونچے لوگوں سے تربیت حاصل کر رہا ہے..... اب وہ کسی استاد سے کم نہیں ہے۔“

”میں نے کہا تھا کہ اب مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ مہی پال سرد مہری سے بولا۔

”تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ اب تم ایک کرڈ پٹی آدمی ہو مہی پال؟“

”تم اسحق لڑکی ہو..... جو ہر وقت خواب دیکھتی ہیں۔“ وہ جمن جھلا کر بولا۔ ”خواب دیکھنا بند کرو۔ خواب بڑے دعا باز ہوتے ہیں۔ بڑے فریب دیتے ہیں۔“

”چلو..... اچھا تم نہیں..... لیکن بھگوان داس تو ہے..... بلکہ اسے ارب پتی کہنا زیادہ مناسب ہوگا.....“ وہ بول پڑی۔ پھر اس کے سرخ گداز ہونٹوں پر دل کش تبسم ابھر آیا۔ ”تم اس کے پاس ایک بڑی رقم پر ہاتھ مار کر لا سکتے ہو۔“

”جب بھی کوئی سنہرا موقع ہاتھ مارنے کا ملتا ہے اسے جانے نہیں دیتا ہوں۔ اس لئے کہ مواقع بار بار نہیں ملتے ہیں.....“ مہی پال نے کہا۔ ”اس وقت اچھی خاصی رقم پر ہاتھ صاف کر کے ساتھ لایا ہوں..... میں کبھی بھی خالی ہاتھ یا ناکام نہیں رہا ہوں۔“

اتنا کہہ کر اس نے اپنا ایک ہاتھ اپنی جیب میں اڑس لیا اور پھر کھڑکی کے پاس جا کر اپنا چہرہ سامنے کی طرف کر لیا تاکہ اس پر اجالا نہ پڑ سکے۔ پھر اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”بھگوان داس کی سبز کھجی میں کوئی پچاس ساٹھ لاکھ سے کم موجود نہ ہوں گے.....“ مہی پال نے کہا۔

”اگر بھگوان داس کو تمہاری اس حرکت کا پتہ چل گیا تو پھر اسے کتنا دکھ ہوگا..... شاید وہ تمہاری

اس حرکت کی بڑی سزا دے۔ شاید زندہ نہ چھوڑے۔“ لڑکی نے خیال ظاہر کیا۔ ”وہ اپنے دامن کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا ہے بلکہ معاف کرنا جانتا ہی نہیں ہے۔ تم یہ بات مجھ سے اچھی طرح جانتے ہو۔“

”لیکن وہ بات بھی تو جانتا ہے کہ میں ایک عادی مجرم ہوں اور اس سے میری کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں ہے۔“ مہی پال نے بتایا۔

”اچھا..... یہ بتاؤ کہ سرت چندر بھوت کا کیا معاملہ ہے۔“

لڑکی نے اس کے بازوؤں سے نکل کر کمرے کا دروازہ بھیڑتے ہوئے پوچھا۔ کیوں کہ ملازمہ کے قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ اٹھ کر ڈبل روٹی لے کر واپس آ چکی تھی۔ وہ اس موضوع پر ملازمہ کے سامنے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”تم نے اس سبز بھوت کے بارے میں کسی سے سنا تھا؟ اس نے پوچھا۔

”کسی نے تو نہیں بتایا..... البتہ میں نے آج صبح ہی اخبار میں پڑھا تھا۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”اس میں لکھا ہوا تھا کہ ایک سبز بھوت..... بھگوان داس کی سبز کوشی میں نظر آتا ہے۔ کیا یہ سچ ہے.....؟“

”میں نے اسے کبھی سبز کوشی میں نہیں دیکھا۔“ مہی پال نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جواب دیا۔ ”شاید کسی ملازم نے اسے دیکھا ہو تو دیکھا..... بھگوان داس نے مجھے بتایا کہ رات کو کسی نے اس کی خواب گاہ کا دروازہ کھولا تھا۔“

”کہیں وہ تم تو نہیں تھے جس نے رات کو دروازہ کھولا؟“ لڑکی شوخی سے بولی۔

”نہیں.....“ مہی پال نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”آدھی رات کے وقت مجھے اس کا دروازہ کھولنے کی ایسی کوئی خاص ضرورت نہ تھی..... کیوں کہ میں کوشی کے تمام حصوں اور گوشوں سے بخوبی واقف ہوں اور.....“ ہو سکتا ہے کہ کوئی لڑکی ہو جو پو پھننے کے وقت اس کی خواب گاہ سے نکل کر گئی ہو اور جاتے جاتے دروازہ بند کرنا بھول گئی ہو..... بھگوان داس اس وقت سو رہا ہوگا۔ وہ تو رنگ رلیاں منانے لڑکیاں اور عورتیں ہوٹل کے علاوہ سبز کوشی بھی تو لاتا رہتا ہے۔ شاید کسی نے اندھیرے میں ہولاد دیکھ کر اسے بھوت سمجھ لیا ہو.....“

”نہیں..... وہ کوشی میں شاید ہی کسی لڑکی یا عورت کو لاتا ہے.....“ مہی پال نے جواب دیا۔ ”جب اس علاقے کے لوگ کہہ رہے ہیں کہ انہوں نے سبز بھوت دیکھا ہے تو یقیناً ہوگا..... میں نے اس کے متعلق بہت ساری کہانیاں سنی ہیں۔ ایک کہانی تو یہ ہے کہ ایک لڑکی رات کے سے اپنی بلی کو تلاش کرنے لگی۔ جب وہ گھر کے عقب میں جھاڑی کے پاس آئی تو ٹھٹھک کے رک گئی..... اس نے

ایک بہت ہی خوب صورت سبز رنگ کی بلی دیکھی۔ وہ اسے گود میں اٹھانے بڑھی..... اس نے اس وقت جو کچھ دیکھا وہ ناقابل یقین اور دہشت انگیز تھا۔ وہ بری طرح ڈر کر سہم گئی..... کیوں کہ وہ بلی ایک سبز رنگ کے گاڑھے دھوئیں میں غائب ہو گئی۔ جب دھواں چھٹا تو اس نے ایک سبز رنگ کے بھوت کو دیکھا جو تقریباً چھ فٹ قد کا تھا۔ وہ بھوت کو دیکھتے ہی خوف و ڈر سے بے ہوش ہو گئی۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک خوب صورت بچے ہوئے کمرے میں پایا۔ اس میں ایک بہت بڑی مسہری اور اس پر نہایت شان دار، آرام دہ اور گداز بستر دیکھا۔ بستر پر چادر کی بجائے قالین بچھا ہوا تھا جو سبز رنگ کا تھا۔ نہ صرف مسہری اور بستر بلکہ کمرے کی ہر چیز سبز تھی.....“ کرامک رہا تھا لیکن بھول کہیں نہ تھے۔

اس کے سامنے ایک بہت ہی خوب صورت اور وسیعہ اور دراز قد نو جوان مرد کھڑا ہوا تھا..... اس میں اتنی جاذبیت اور کشش تھی کہ کچھ دیر کے لئے وہ اپنے آپ کو بھول گئی..... اس کا دل بھی دھڑکنا بھول گیا۔ وہ محرزہ کی کھڑی اسے دیکھتی رہی..... اس جوان کے طلسم نے اسے جیسے جکڑ لیا تھا۔

چند لمحوں کے بعد وہ چونکی اور اسے وہ واقعہ یاد آ گیا۔ اس نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا تم سبز بھوت ہو؟“

اس سبز بھوت کے بارے میں اس علاقے کے لوگ جانتے تھے۔ اس کے متعلق جو کہانیاں اور داستانیں زد عام تھیں ان کی سچائی کا یقین تھا۔ لڑکی نے اس وقت اپنے اعصاب پر قابو پایا ہوا تھا۔

”ہاں..... میں سبز بھوت ہوں.....“ اس نے لڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔ ”تم مجھ سے ڈرو نہیں..... میرے بہت سارے روپ ہیں..... میں ہر جان دار کے روپ میں آ سکتا ہوں۔ یہ بات میرے لئے کچھ مشکل نہیں ہے۔“

”مجھے..... مجھے.....“ لڑکی ایک ایک کر بولی۔ ”تم مجھے بھگوان کے لئے میرے گھر لے جا کر چھوڑ دو..... میرے گھر والے مجھے نہ پا کر بہت پریشان ہو رہے ہوں گے..... کہیں وہ مجھ پر شک نہ کریں کہ میں کسی لڑکے سے ملنے گئی ہوئی ہوں۔ وہ لوگ بڑے شکی مزاج کے ہیں..... مجھے جان سے بھی مار سکتے ہیں..... میرا بھائی تو بہت ظالم اور سنگ دل ہے۔“

”تم اپنے گھر والوں کی چٹا نہ کرو۔“ سبز بھوت نے لڑکی کو دلاسا دیا۔ ”انہیں تمہاری غیر موجودگی کی کوئی خبر نہیں ہے..... میں نے اپنے منتر کے زور سے ان سب کو گہری نیند سلا دیا ہے۔ وہ سو رہے۔“

”تت..... تت.....“ تم مجھے یہاں کیوں اور کس لئے لائے ہو۔“ لڑکی نے پکارتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے میرے گھر لے جا کر چھوڑ دو۔“

”اس لئے لایا ہوں کہ تم سے پیار کی باتیں کروں تمہارا قرب حاصل کروں۔“
 ”نہیں..... نہیں.....“ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر ہڈیانی لہجے میں بولی۔ ”تم میرے قریب مت آنا..... مجھے ہاتھ نہیں لگانا..... میں اپنی جان دے دوں گی لیکن اپنی عزت و آبرو تمہارے حوالے نہیں کروں گی.....“

”میری جان.....! بات یہ ہے کہ تم بہت حسین ہو..... کسی کو مل کالی کی طرح..... بزرگ میری کمزوری ہیں..... تمہاری آنکھیں جو بڑی بڑی ہیں وہ سبز ہیں.....“ سبز رنگت نے تمہاری آنکھوں کا حسن بڑھا دیا ہے..... اور پھر میرا دل تم پر آ گیا ہے..... میں اس لئے تمہیں یہاں لایا ہوں..... عزت و آبرو کی بات مت کرو.....“

اس نے لڑکی کا ہاتھ تھام لیا تو لڑکی کا سارا ڈر اور خوف..... نفرت اور غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

بھوت نے اس پر کوئی ایسا منتر پڑھ کر بھونک دیا گیا تھا کہ اس نے کوئی جزا مت اور دفاع نہیں کیا..... وہ سبز بھوت کی جھولی میں کسی کے پھل کی طرح گر پڑی۔

”لیکن مجھے اس لڑکی کی کہانی کا یقین نہیں آیا ہے.....“ لڑکی نے مہی پال سے کہا۔
 ”وہ کس لئے؟“ مہی پال نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا ایک بھوت ایسا نہیں کر سکتا؟“

”اس لئے کہ اس لڑکی نے اپنے محبوب کو رات اپنے کمرے میں بلا کر اس کے ساتھ جشن منایا.....“ لڑکی بولی۔ ”اس کی بھابی نے دیکھ لیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کچھ مرد اس کی بھابی کا کوئی آشنا ہو..... رات اندھیرے میں وہ اس کی بھابی کے کمرے کے بجائے اس کے کمرے میں چلا گیا ہو..... بہر حال دال میں کچھ کالا ہے۔ کوئی بھوت ایسا نہیں کر سکتا.....؟“

”تمہارا قیاس درست ہے..... اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا.....“ مہی پال نے کہا۔
 ”سبز بھوت کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلائی جا رہی ہو..... لیکن کچھ ایسے واقعات پیش آچکے ہیں کہ انہیں جھٹلایا نہیں جاسکتا..... دو تین قتل کی جو وارداتیں ہوئی ہیں وہ سبز بھوت کے کارن..... کیوں کہ نہ تو آلہ قتل ملا..... اور نہ ہی قاتل کا کوئی سراغ ملا..... کسی کے نہ قتل کا سبب معلوم ہوا..... سبز بھوت نے جن جن لوگوں کو موت کا نشانہ بنایا وہ کوئی اچھے لوگ نہ تھے..... موت کا رقص جاری ہے..... دو ایک دن قبل ایک سادھو مہاراج جا گزرے تھے۔ ان سے لوگوں نے سبز بھوت کے بارے میں پتا کر معلوم کیا کہ یہ سبز بھوت کون ہے.....؟ سادھو مہاراج نے بتایا کہ کوئی ایک سو چالیس برس قبل بستی میں ایک خاندان آ کر آباد ہوا تھا..... ماں باپ کی ایک ہی اولاد تھا..... وہ اتنا

خوب صورت اور وجہ نوجوان تھا کہ لڑکیاں اور عورتیں اس کے حصول کے لئے تڑپ جاتی تھیں..... وہ ایک سیاہ کار تھا..... اس نے دو تین گھرانوں کی لڑکیوں اور عورتوں کی عزت تباہ کی تھی۔ پھر ان کے گھر کے مردوں نے مل کر اس لڑکے کو دیرانے میں لے جا کر کلہاڑیوں اور ڈنڈوں سے ہلاک کر دیا..... وہ بدروح تب سے نہ صرف اس خاندان کے نوجوان مردوں کو قتل کرتا آ رہا ہے بلکہ لڑکیوں کی عزت و آبرو بھی لوٹا آ رہا ہے۔ بلکہ جوان شادی شدہ عورتوں کو بھی..... چوں کہ اسے کالی ماتا کی آئینہ بادی حاصل ہے اس لئے وہ کئی قسم کے منتر بھی جانتا ہے۔“
 ”ایک مرتبہ میری ملازمہ نے سبز بھوت کے بارے میں اور اس کے متعلق جو داستانیں منسوب ہیں وہ سنائی تھیں..... لیکن میں نے اس کی کسی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ لیکن آج صبح اخبار میں اس کے متعلق پڑھا تو یقین کرنا پڑا..... یہ سبز بھوت بہت خطرناک معلوم ہوتا ہے۔“ لڑکی نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

”میں تم سے اس موضوع پر بات کرنے نہیں آیا ہوں۔“ مہی پال نے کہا۔ ”سبز بھوت سے ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کی کوئی بات نہیں..... کیوں کہ ہمارا اس سے کوئی جھگڑا ہے اور نہ ہی کوئی پر خاش..... ہمیں اس سے کیا لینا دینا ہے۔“

”یہ سبز بھوت شاید راسپو تین کی روح تو نہیں..... جو رنگ رلیاں مناتا پھر رہا ہے۔“ لڑکی ہنس کر بولی۔ ”تم اس کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟“ تم سے شاید کوئی کلی اور پھول محفوظ نہ رہتا۔“

مہی پال نے اس لڑکی کی شاخ گل جیسی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے قریب کر لیا..... چند لمحوں تک اس کے چہرے پر جھکا دیا۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔ ”تم جیسی لڑکیاں ہر مرد کو راسپو تین بنا دیتی ہیں۔“

”اچھا راسپو تین صاحب..... یہ فرمائیں کہ آپ اتنی جلدی کیوں اور کس لئے آئے؟ رات کھانے پر کیوں نہ آئے؟“ اور پھر تم جو بھگوان داس کی کوٹھی میں سبز بھوت بنے ہوئے ہو اس سے کیا کچھ حاصل ہو رہا ہے؟“ لڑکی نے شوخی سے کہا۔ ”اور ہاں تم نے گزشتہ ملاقات میں فولادی سیف کا ذکر کیا تھا..... کیا سبز بھوت یہ کام نہیں کر سکتا.....؟“

”فولادی سیف تک تو میں جس وقت چاہے پہنچ سکتا ہوں..... لیکن یہ میرے کام اور میرے بس کی بات نہیں ہے..... میں تمہارا کام کو انجام نہیں دے سکتا..... اس کے لئے کسی ماہر کی ضرورت ہے۔“ مہی پال نے کہا۔

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ سبز بھوت کی خدمات حاصل کی جائیں اور اسے کمیشن کی پیش کش

کی جائے۔“ لڑکی نے شوخی سے کہا۔ ”اس سے بہتر اور ماہر کوئی نہیں مل سکتا۔“

”یہ وقت مذاق کا نہیں ہے لیکن ایسا ہو جائے تو سارا کام چند لمحوں کا ہوگا۔“ مہی پال نے کہا۔ ”سوال یہ ہے کہ اس سے رابطہ کہاں اور کیسے کیا جاسکتا ہے.....؟ اور پھر بطور کمیشن وہ رقم یا کوئی چیز لے کر کیا کرے گا.....؟ اس کے کس کام کی.....؟ کاش.....! ایسا ہو سکتا.....؟ یہاں کوئی ایسا نہیں ہے جس کے ذریعے سے ہم سبز بھوت سے رابطہ قائم کر سکیں۔“

”اس کا کمیشن..... لڑکیاں اور عورتیں ہیں جو فراہم کی جاسکتی ہیں.....“ لڑکی بولی۔ ”وہ ان کا رسیا ہے۔“

اگر اس نے تمہیں بھی بطور کمیشن مانگا تو میں کیا اس کی خدمت میں پیش کر دوں.....؟“ مہی پال بولا۔ ”کیا تم تیار ہو جاؤ گی؟“

”کچھ پانے کے لئے..... کچھ کھانا بھی پڑتا ہے.....“ لڑکی کہنے لگی۔ ”وہی میں اس وقت سامنے نہیں رہوں گی جب تم اس سے معاملہ طے کرو گے..... بائی دے دے..... اگر اس نے میرے بارے میں معلوم کر لیا تو پھر اس کی بات ماننے میں حرج ہی کیا..... صرف ایک رات کی تو بات ہوگی۔ یہ کڑوا گھونٹ ہم دونوں ہی پی لیں گے۔“

”سوال یہ ہے کہ اس سے رابطے کی صورت کیا ہو سکتی ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔“ مہی پال نے الجھ کر کہا۔

”میرے ذہن میں ایک تدبیر آ رہی ہے..... لڑکی نے کہا۔ ”میں شہر میں دو تین بڑے پائے کے ماہر سفلی موجود ہیں۔ وہ بدروحوں، بھوتوں اور چڑیلوں کو بھی بلاتے ہیں اور بلا سکتے ہیں..... کیوں نہ ان کی خدمات حاصل کی جائیں۔ کسی ایک سے کہا جائے گا کہ وہ سبز بھوت سے بات کرادے.....“

”تمہاری تجویز تو بہت اچھی ہے لیکن اس میں ایک قباحت ہے۔“ مہی پال نے کہا۔ اس وقت وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی کو سبز بھوت دس دنوں کے لئے مانگ لے گا تو وہ بہ خوشی اس کو دان کر دے گا۔

”وہ کیا.....؟“ لڑکی نے سوالیہ نظروں سے گھورا۔

”یہ سفلی علوم کے ماہر ایک طرح سے برنس مین اور بلیک میلر ہوتے ہیں۔“ مہی پال بولا۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کسی اور بدروح یا پھر سبز بھوت کی مدد سے خود سیف میں جھاڑو پھیر دیں۔ ان کی نیت میں فتور پیدا ہو جائے گا۔ ہم کف افسوس ملتے رہ جائیں گے..... یہ کسی بھی لحاظ سے قابل بھروسہ نہیں ہیں۔“

”لیکن میں تمہارے اس خیال کو سمجھ نہ سکی..... انہیں یہ بات بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ ہم کس لئے سبز بھوت کی خدمات حاصل کرنا چاہتے ہیں..... ہم اصل بات اپنے کسی ٹھکانے پر بلا کر اعتماد میں لے سکتے ہیں..... کیا تمہارے ذہن میں کوئی بہت بڑا منصوبہ ہے.....؟“ اس نے مہی پال کے چہرے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ ”مہی پال.....! جب تم اس طرح کے چونچلے کرتے ہو تو مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں آتا..... کیا بھگوان داس کا فولادی سیف توڑنے کے لئے مجھے وہاں جانا پڑے گا؟“

مہی پال نے اس لڑکی کو اپنے بازوؤں کے حصار میں قید کر کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”سوئزر لینڈ دنیا کا ایک حسین ترین خطہ ہے..... پر فضا..... کوئی ملک اس کی خوب صورتی میں ثانی نہیں ہے..... اگر دولت ہو تو آدمی شہزادے کی طرح زندگی بسر کر سکتا ہے..... اس کے سیف میں جو غیر ملکی کرنسی ہے اس کے سود پر وہاں کے بینک اتنا کچھ دیں گے کہ ہم ہر ماہ پر تعیش زندگی گزار سکتے ہیں..... فوتن.....! سچ کہتا ہوں کہ سبز کوٹھی کا ایک سر بستہ راز ایسا قیمتی ہے کہ اگر میں اسے فروخت کرتا ہوں تو میں لاکھ پاؤنڈ نہایت آسانی سے حاصل کر سکتا ہوں۔ اور.....“

درمیان میں فوتن بولی۔ ”یہ ہندوستان ہے۔ یہاں کون پاؤنڈ دے گا.....؟“ ”ایک ہندوستانی اسمگلر ہے..... وہ اس کی خریداری میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کے پاس غیر ملکی کرنسی ہے۔“

”میرے پاس ایک ایسی جادو کی سیاحی کے قلم ہیں جس سے دستخط کرنے سے ایک دن کے بعد سیاسی اڑ جاتی ہے..... میرے خیال میں یہ جادو کے قلم میں ہزار میں با آسانی فروخت ہو جائیں گے۔“

مہی پال پر اسرار خفیہ زبان میں بات چیت کرنے کا شائق تھا۔ اس لئے وہ اپنی بیوی سے گھٹنوں اسی زبان میں بات کرتا رہتا تھا۔

”تمہارے پاس ایسے کتنے قلم ہیں.....؟“ اس کی بیوی نے دریافت کیا۔ ”اصل بات سیاحی کی ہے..... میرے پاس وہ جادوئی سیاحی کی اتنی بڑی بوتل ہے کہ ایک ہزار قلم میں وہ جادوئی سیاحی بھری جاسکتی ہے.....“

☆.....☆.....☆

بوڑھی عورت زار و قطار رو رہی تھی۔ وہ اپنے گھر میں اکیلی تھی۔ مہمان، رشتہ دار اور محلے والے اسے دلا سادے کرتھیا چھوڑ کر جا چکے تھے۔ اس کی اس مصیبت کی گھڑی میں اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں تھا۔ آخر کون کب تک اس کی دل جوئی کرتا..... اس کے آنسوؤں کو پونچھتا..... رات

خاصی ہو چکی تھی..... وہ دوسرے غش کھا چکی تھی۔ ایک گھڑی بے ہوش رہی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد پھر رونے لگی تھی۔ اس کے کمرے میں جو عورتیں تھیں وہ ایک ایک کر کے مختلف بہانوں سے کھسک گئی تھیں۔ گھر کے دونوں کمروں میں ابٹن اور پھولوں کی جو خوشبوئیں سرشام سے تھیں وہ ابھی مہکار رہی تھیں۔ بوڑھی عورت کا دل جل رہا تھا..... سینہ کٹ رہا تھا۔ دل کے زخموں سے رستا ہوا وہ آپ بی رہی تھی۔ کمرے کے گہرے سکوت میں اس کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔

”ماتا جی.....!“ ایک نہایت شیریں من موئی آواز کمرے میں گونجی جس میں بے پناہ ہمدردی کا دریا موج زن تھا۔ اس آواز میں ایسا سحر تھا..... ایسی اپنائیت تھی کہ وہ اس کے من کی گہرائیوں میں اتر گئی۔ اس عورت کو ایسا محسوس ہوا کہ اس آواز نے اس کے دکھا اور زخم کو مند مل کر دیا ہے۔

اس نے یہ آواز کبھی نہیں سنی تھی۔ گو کہ یہ آواز نامانوس سی تھی لیکن اسے ایسا لگا تھا کہ برسوں سے نہیں صدیوں سے سنجیدہ ہے۔ اس بوڑھی عورت نے چہرے سے پلو اٹھا کر دیکھا۔

اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ اس کے سامنے سفید براق ساڑی اور بلاؤز میں ایک عورت بڑے وقار اور تمکنت سے کسی مہارانی کی طرح کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر نہ صرف ہلاکی طمانیت تھی بلکہ شفقت بھی تھی..... اس کی بڑی بڑی بہت ہی خوب صورت آنکھوں کی گہرائیوں میں محبت کی چمک تھی۔

اسے ایسا لگا جیسے کوئی دیوی آکاش سے اتر آئی ہو۔ وہ اسے دیکھ کر اپنا رونا اور غم بھول گئی تھی۔ اس نے اپنی ساری زندگی میں جتنی بھی دیویوں کی خوب صورت مورتیاں دیکھی تھیں وہ ان سب سے کہیں حسین تھی۔

وہ بوڑھی عورت اس سے پہلے اس حسین عورت سے کوئی سوال کرتی..... اس نے بوڑھی عورت سے پوچھا۔

”ماتا جی..... کیا بات ہے.....؟ آپ اس قدر زار و قطار کس لئے رورہی ہیں.....؟“

”کیا آپ کو معلوم نہیں بیٹی.....!“ مجھ پر کیا گزری ہے.....“ اس بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

”نہیں.....“ اس عورت نے اپنا خوش نما سر نفی کے انداز میں ہلایا۔ ”میں ادھر سے گزر رہی تھی تو آپ کی سسکیاں سنیں تو میرا سینہ کٹ گیا..... میں کسی دکھیااری عورت کو روکنا ہوا نہیں دیکھ سکتی اور نہ ہی اس کی سسکیاں سن سکتی ہوں..... میں اس لئے آئی ہوں کہ معلوم کروں کہ آپ کیوں رورہی ہیں.....؟“

”کیا بتاؤں بیٹی.....! مجھ پر بجلی آن گری ہے.....“ وہ عورت اپنا سینہ دباتی ہوئی بولی۔ ”میری

بیٹی پونم کا آج بیاہ ہوا تھا۔ رخصتی سے تھوڑی دیر پہلے بھگوان داس کے آدمی آئے اور اسلحہ کے زور پر اسے اٹھا کر لے گئے.....“

”وہ آپ کی بیٹی کو کس لئے اٹھا کر لے گئے.....؟“ اس حسین عورت نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”اس لئے کہ میں نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور اس کی شادی اس کے منگیت پر ساد سے کر دی۔“ بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

”آپ نے اس کی کون سی بات ماننے سے انکار کر دیا.....؟ کیا وہ آپ کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا تھا.....؟“

وہ میری بیٹی کو اپنی داشتہ بنا کر رکھنا چاہتا تھا..... اس نے کہا تھا کہ ہر ماہ دو ہزار روپے دوں گا..... میں ایک عزت دار غریب عورت..... اس کی بات کیسے مانتی..... یہ بات ایک طوائف ہی مان سکتی ہے۔“

”کیا براتیوں، مہمانوں اور بستی کے لوگوں نے کوئی مزاحمت نہیں کی..... بھگوان داس کے بد معاشوں کو مار نہیں بھگایا..... پولیس کو اس اغوا کی رپورٹ نہیں کی..... اور اسے لے جانے دیا.....؟“ حسین عورت نے حیرت سے کہا۔

”کیسے مزاحمت کرتے اور ان سے لڑتے.....“ بوڑھی عورت کہنے لگی۔ ”ایک تو وہ بد معاش بندوقوں سے مسلح تھے اور پولیس ان کی مدد کے لئے آئی تھی..... بھگوان داس کے خاص آدمی بھی پالنے پولیس میں یہ رپورٹ درج کرائی تھی کہ میں نے دس ہزار روپے لے کر اپنی بیٹی کی شادی بھگوان داس سے کرنے کا وعدہ کیا تھا..... اس سے شادی کرنے کے بجائے کسی اور سے طے کر دی..... پولیس نے دو لہا اور اس کے گھر والوں کو تھانے لے جا کر حوالات میں بند کر دیا.....“

”ماتا جی.....! آپ کسی بات کی چٹنا نہ کریں۔“ حسین عورت نے دلاسا دیا۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا..... آپ کی بیٹی کو میں بھگوان داس کی کوٹھی سے نکال لاؤں گی اور اس کے پتی کے حوالے کر دوں گی وہ اور اس کے گھر والے بھی رہا ہو جائیں گے.....“

”کب.....؟ آج کی رات بھگوان داس اس کی عزت سے کھیلے گا.....؟“ بوڑھی عورت نے کہا۔

”آج ہی رات اور تھوڑی دیر بعد..... آپ مجھ پر بسواس رکھیں..... ایٹھور نے چاہا تو اس پر آج نہیں آئے گی۔“

”یہ ناممکن ہے.....“ بوڑھی عورت بولی۔ ”آپ بھگوان داس کا بال تک بچا نہیں کر سکتیں۔“

”وہ کیوں.....؟“

”اس لئے کہ بھگوان داس نہ صرف طاقت ور بلکہ با اثر ہے..... وہ پولیس کو مٹھی میں رکھتا ہے..... وہ ایک قاتل اور سفاک ترین شخص ہے..... آپ تو ایک عورت ہیں۔ اس سے کیا مقابلہ کر سکیں گی۔“

”آپ شانتی رکھیں..... صرف ایک گھنٹہ کی مہلت دیں۔ آپ کی بیٹی، داماد اور اس کے گھر والے آپ کے ہاں موجود ہوں گے۔ میں دس بھگوان داسوں اور پولیس والوں کو با آسانی زیر کر سکتی اور عبرت ناک سبق دے سکتی ہوں..... کوئی میرا بال تک بچا نہیں کر سکتا.....“

”آپ ہیں کون.....؟“ بوڑھی عورت حیرت سے بولی۔

”چندرا دیوی.....“

”چندرا دیوی.....؟“ وہ حیرت اور خوشی سے سرشار ہو کر بولی۔ ایک بارگی اس کا چہرہ دکھ اٹھا اور آنکھیں چپکے لگیں۔

”واقعی..... کہیں میں سپنا تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔“

”کیا آپ مجھے جانتی ہیں.....؟“ چندرا دیوی نے دلکش مسکراہٹ سے پوچھا۔

”ہاں.....“ بوڑھی عورت نے سر ہلادیا۔ ”میں نے ایک عورت سے آپ کے متعلق بہت کچھ سنا تھا..... اس وقت میں روتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ..... ایٹھو میری مدد کر..... میری بیٹی کی آبرو اس درندے سے بچالے..... کاش! چندرا دیوی میری مدد کو آجائے۔ اس کا ٹھکانہ معلوم ہوتا تو میں اس کے پاس چلی جاتی۔ ایٹھو نے مجھ دھکی عورت کی سن لی۔ آپ آگئیں۔“

”یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”میں بھگوان داس کی کٹھی پر جا رہی ہوں تاکہ آپ کی بیٹی کی آبرو کو اس درندے سے بچا کر اور اسے نکال لاؤں..... آپ میرا اور اپنی بیٹی کا انتظار کریں۔“

اتنا کہہ کر چندرا دیوی جس طرح اندرائی تھی اسی طرح چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

بھگوان داس کی سبز کٹھی کے ایک کمرے میں جو اس کی خواب گاہ تھی پونم اپنے ہاتھ میں ایک خوف ناک خنجر لئے کھڑی تھی۔

چندرا دیوی نے پونم کو دیکھا..... وہ غیر معمولی حسین ہی نہیں بلکہ بلا کی پرکشش بھی تھی۔ عروسی لباس میں اس کا حسن دوچند ہو گیا تھا۔ وہ نفرت اور غصے سے کانپ رہی تھی۔ غصے نے اسے اور حسین بنادیا تھا۔ وہ بھگوان داس کی نظروں کی گرفت میں تھی۔ بھگوان داس کے رو برو کھڑا ہوا تھا۔ پونم

کے ہاتھ میں خنجر دیکھ کر اس کے چہرے پر ڈر اور خوف بالکل بھی نہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں شیطیت ناز رہی تھی۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

”سنو..... میری رانی.....! یہ خنجر تمہاری عزت و آبرو بچا نہیں سکتا..... ابھی یہی پال تیزاب کی بوتل لے کر آ رہا ہے۔ میں تمہارے چہرے پر تیزاب پھینک دوں گا اگر تم نے میری بات نہیں مانی..... تم اپنی ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ دو..... یہ خنجر تمہارے خوب صورت، پھول سے نازک اور مرمر میں ہاتھ میں سج نہیں رہا ہے..... یہ بات تم اچھی طرح سوچ لو..... جان لو..... تم یہاں سے کسی قیمت پر اپنی عزت بچا کر نہیں جاسکتی ہو..... تم میرے بستر کی زینت بنو گی..... یقین کرو..... تم یہاں سے بھی جانا نہیں چاہو گی..... تم نے میرے ساتھ بہت بدتمیزی کی ہے..... میرے چہرے پر خراشیں ڈال دی ہیں..... میرے چہرے پر تھوکا ہے..... اب میں تم سے کہتا ہوں کہ سیدی طرح میری بات مان لو اور میری آغوش میں آ جاؤ۔“

”میں کوئی بد چلن اور بدکار نہیں ہوں جو تم میری آبرو کو ملیا میٹ کرنا چاہتے ہو..... تمہارا ہاتھ لگانا تو درکنار قریب آنے بھی نہیں دوں گی..... تم مجھے تیزاب کی دھمکیاں مت دو..... مجھے یہاں سے جانے دو..... میں اپنے پتی کے پاس جانا چاہتی ہوں..... ہر قیمت پر جاؤں گی اور جا کر رہوں گی..... تم کیا! مجھے دنیا کی کوئی طاقت جانے سے روک نہیں سکتی۔ کاش میرے بس میں ہوتا کہ اس خنجر سے تمہارے وجود کے کٹڑے کٹڑے کر دوں۔ شاید میں ایسا کروں بھی.....“

”اگر تم اتنی حسین نہ ہوتیں تو میں تمہاری یہ بکواس اور گالیاں نہیں سنتا..... چوں کہ میں تمہیں اپنے بستر کی زینت بنانا چاہتا ہوں اس لئے ضبط سے کام لے رہا ہوں.....“

”میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔“ پونم نے فضا میں خنجر لہرایا۔ ”ورنہ میں اسے تمہارے سینے میں اتار دوں گی.....“

معا دروازے پر دستک ہوئی۔ بھگوان داس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ”آ جاؤ..... دروازہ کھلا ہوا ہے۔“

دروازہ کھل گیا..... مہی پال ایک بڑی بوتل جو تیزاب سے بھری ہوئی تھی لئے اندر داخل ہوا.....

”مالک.....!“ مہی پال نے استہزائیہ لہجہ میں کہا۔ ”گتا ہے کہ چھو کری راستے پر نہیں آئی..... اور..... یہ خنجر اس کے ہاتھ کیسے لگ گیا.....؟ یہ تو بہت برا ہوا..... یہ خنجر کی وجہ سے ابھی تک ہاتھ نہیں آئی ہے۔“

”میں نے اسے ڈرانے دھمکانے کے لئے الماری سے نکالا تھا۔“ بھگوان داس نے جواب

دیا۔ ”یہ بڑی مکار، چالاک اور ہوشیار لڑکی ہے۔۔۔۔۔ وہ یہ کہہ کر میری طرف بڑھی کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔۔۔۔۔ اب میں تمہاری باندی ہوں۔۔۔۔۔ اس نے میرے پاس آ کر میرے چہرے پر جھکتے ہوئے چشم زدن میں خنجر میرے ہاتھ سے چھین لیا۔۔۔۔۔ جس کی مجھے توقع نہ تھی۔۔۔۔۔ یہ مجھے اب تک بہت ساری گالیاں اور دھمکیاں دے چکی ہے۔ اس نے نہ صرف میرا منہ نوچ لیا بلکہ میرے چہرے پر تھوکا بھی ہے۔“

”اس کی یہ جرأت۔۔۔۔۔؟“ مہی پال تھیر زوہ ہو کر بولا۔ ”اور آپ اب تک خاموش رہیں۔“

”خنجر کی وجہ سے شیرنی ہو رہی ہے۔۔۔۔۔“ بھگوان داس نے کہا۔

”پونم۔۔۔۔۔!“ مہی پال نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”میں کہتا ہوں۔۔۔۔۔ خنجر پھینک دو۔ ورنہ تمہاری خیر نہیں ہوگی۔“

”تم دونوں مجھے جانے دو۔۔۔۔۔ ورنہ میں تم دونوں کو قتل کر دوں گی۔“ پونم نے غضب ناک ہو کر کہا۔ ”مجھ پر قابو پانا اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہے ہو۔۔۔۔۔ میں مرجاؤں گی لیکن تمہارے گھناؤنے ارادے پورے ہونے نہیں دوں گی۔“

”اس بوتل میں تیزاب بھرا ہوا ہے۔۔۔۔۔“ مہی پال نے بوتل اس کی نظروں کے سامنے نچاتے ہوئے کہا۔ ”یہ تم نے خنجر نہیں پھینکا تو پھر میں یہ تیزاب تمہارے چہرے، ہاتھ اور جسم پر پھینک دوں گا۔۔۔۔۔ تیزاب کیا بلا ہوتی ہے تم جانتی ہو۔۔۔۔۔ اس کی جلن ناقابل برداشت اور بڑی دردناک ہوتی ہے۔۔۔۔۔ تمہارے چہرے اور جسم کی جلد بری طرح جھلس جائے گی۔ تمہارا چہرہ اس قدر کراہیت انگیز ہو جائے گا کہ کوئی تمہاری طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرے گا۔ تمہارا یہ حسن جس پر تم اس قدر نازاں ہو رہی ہو خاک میں مل جائے گا۔۔۔۔۔“

”میں تم دونوں کو موت کی بھیٹ چڑھانے کی کوشش کروں گی۔۔۔۔۔ اگر میں نا کام ہوگئی تو اس خنجر سے خودکشی کر لوں گی۔“

پونم فوراً ہی بھگوان داس پر حملہ آور ہوئی۔ لیکن اس کی ساڑی کا قال پیردوں میں الجھ گیا تو وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن بری طرح لڑکھڑا گئی اور اس کے ہاتھ سے خنجر چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ مہی پال نے لپک کر وہ خنجر اٹھا لیا۔ بھگوان داس نے اسے سنبھلنے کی مہلت نہیں دی اور لپک کر پونم کو دبوچ لیا۔

”مجھے چھوڑ دو۔۔۔۔۔ جانے دو۔۔۔۔۔“ پونم ہڈیانی لہجے میں چیخی۔ اس کے بازوؤں کی گرفت سے نکلنے کی جدوجہد کرنے لگی۔ بھگوان داس کا قد چھ فٹ سے زیادہ تھا۔ بھاری بھر کم ڈیل ڈول کا تھا۔ پونم اس کے بازوؤں کی گرفت میں نضحی پچی لگ رہی تھی۔ کسی پرندے کی طرح پھڑپھڑا رہی تھی جو

جال میں پھنسنے کے بعد آزادی کے لئے پھڑپھڑاتا ہے۔

خواب گاہ میں جو سنگ مرمر کا ستون تھا پونم کو اس سے باندھ دیا گیا۔ پھر بھگوان داس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”میری رانی! اب بتاؤ۔۔۔۔۔ کیا کیا جائے تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔؟ آخر بازی پلٹ گئی نا۔۔۔۔۔ کیا اب تمہاری عزت بچ سکتی ہے؟“

”کیوں نہیں۔۔۔۔۔“ پونم نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میرا بھگوان میری مدد کرے گا۔۔۔۔۔“

”کون بھگوان۔۔۔۔۔؟“ بھگوان داس بڑے زور کا قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”تم آکاش والے بھگوان کی بات کر رہی ہو۔۔۔۔۔ وہ میرے معاملات میں دخل نہیں دے گا۔“

بھگوان داس نے اس کی ساڑی اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو پونم نے نفرت، غصے اور حقارت سے اس کے منہ پر تھوک دیا۔

بھگوان داس غصہ ہونے کے بجائے مسکرایا اور اس نے آستین سے منہ صاف کیا۔ پھر اس نے تیز لہجے میں کہا۔

”میں تم سے اس حرکت کا بدلہ ضرور لوں گا۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ حسین رات بد مزگی میں گزرے۔۔۔۔۔ تم اپنی اس حرکت سے اپنی عزت بچا نہیں سکتی ہو۔۔۔۔۔ میں اور وحشی ہو جاؤں گا۔۔۔۔۔ جذباتی بن کر تمہیں بھنبھوڑ دوں گا۔۔۔۔۔ تم میری زیادتی کو آخری سانس تک بھلا نہ سکو گی۔“

”تم شیطان اور حرام کی اولاد ہو۔۔۔۔۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم نے اپنی ماں اور بہن سے بھی کالا کیا ہے۔۔۔۔۔“ پونم برس پڑی۔

”ایک بات یاد رکھنا۔۔۔۔۔ تم نے میری عزت برباد کی تو تمہارا خون پی جاؤں گی۔“

”تم لاکھ کچھ کہہ لو میری جان! میں تمہیں بخشے والا نہیں ہوں۔۔۔۔۔ تم جو گالیاں بک رہی ہو اس کی سزا یہ ہے کہ تم سے ساری رات جی بھلانے کے بعد اپنے ملازم مہی پال کے سپرد کر دوں گا۔ وہ سارا دن تمہیں خوش کرتا رہے گا۔“

پونم کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے جان لیا تھا کہ اس کی عزت بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ ان دونوں کا شکار ہو جائے گی۔ اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ انہیں فریب دے کر یہاں سے فرار ہو جائے۔ اس کے ذہن میں ایک تدبیر آئی تو وہ بولی۔

”بھگوان داس۔۔۔۔۔! تم جیت گئے۔۔۔۔۔ میں ہار گئی۔ مجھے شاکر دو۔ میری ایک شرط ہے اسے پوری کرو تو تمہاری ہر بات مانوں گی۔“

”کیا شرط ہے میری جان.....!“ بھگوان داس نے خوش ہو کر اس کی حسین آنکھوں میں جھانکا۔ ”میں ضرور پوری کروں گا۔“

”میں تین دن تک تمہیں ہر طرح سے خوش کروں گی..... تمہاری سیوا کروں گی۔ پھر تم مجھے جانے دو گے۔“ پونم بولی۔

”یہ تم نے عقل مندی کی بات کی نا.....“ بھگوان داس نے کہا۔ ”مجھے تمہاری یہ شرط منظور ہے۔ مجھے خوش کرو گی تو فائدے میں رہو گی۔“

”میں رات دن صرف اور صرف تمہارے سنگ رہوں گی..... لیکن تم مجھے دن میں اس حرامی کے حوالے نہیں کرو گے..... کیوں کہ اس نے راستے میں میرے ساتھ غلط حرکت کی اور تمہارے خلاف بھڑکایا تھا۔“ پونم نے کہا۔

”ٹھیک..... اب تو میں تین دن تک تمہیں لمحہ لمحہ ساتھ ہی رکھوں گا..... ایک پل کے لئے بھی جدا نہیں کروں گا۔“ بھگوان داس نے کہا۔ ”تمہیں ساتھ لائے ہوتے اس نے کیا حرکت کی تمہارے ساتھ.....؟ میرے خلاف کیا بھڑکایا.....“

اس نے مجھے یہاں لاتے ہوئے میرے ساتھ دست درازی کی۔“ خوب من مانیاں کرتا رہا..... اس نے حد سے تجاوز کرنا چاہا تھا..... میرے شور مچانے اور دھمکی دینے پر بازرہا..... اس نے کہا کہ میرا مالک بہت ہی حرامی ہے۔ وہ تم سے دل بہلانے کے بعد..... دل بھر جانے کے بعد قتل کر دے گا۔ تم ایسا کرنا کہ اسے اتنی شراب پلانا کہ وہ مدہوش ہو جائے..... پھر کمرے سے نکل کر مجھے آواز دینا..... میں آ جاؤں گا..... اسے بے ہوش کر کے تجوری میں سے اس کی ساری دولت نکال کر ہم دونوں بھاگ جائیں گے..... ہندوستان بہت بڑا ملک ہے..... تجوری میں اتنی دولت ہے کہ ہم سو برس تک ٹھاٹ کی زندگی بسر کر سکتے ہیں..... بس تمہیں اپنی شادی، شوہر اور ماں کو بھولنا ہوگا.....“

”مہی پال.....! نمک حرام..... میں کیساں رہا ہوں..... تو نے اس کے ساتھ دست درازی اور من مانیاں.....“

”مالک..... یہ جھوٹ بول رہی ہے۔“ مہی پال نے درمیان میں جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔ ”آپ کی یہ امانت تھی..... کیا میں نے کبھی کسی لڑکی یا عورت کو اغوا کر کے لاتے ہوئے ایسی حرکت کی ہے..... یہ مکار عورت ہے اس کی باتوں پر نہ جائیں۔“

”میرے چہرے پر جو سرخ سرخ نشان ہیں کیا وہ اس کی حرکتوں کی چٹلی نہیں کھا رہے ہیں.....؟“ پونم نے اپنا چہرہ اس کے سامنے کر دیا۔ راستے میں مجسموں نے اس کے چہرے اور بانہوں کو کاٹا تھا۔ اس کے گورے چہرے پر نشانات آ گئے تھے۔

”اور تم میری دولت اور اس لڑکی کو لے کر بھاگنے کا فیصلہ بنا چکے تھے.....؟ کیوں بے حرام کے پلے۔“ بھگوان داس دہاڑا۔

”یہ بھی جھوٹ ہے مالک.....! میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں..... آپ کی تجوری کھولنا مجھے کہاں آتا ہے۔“ مہی پال گڑ گڑایا۔

”میں صبح تمہاری خبر لوں گا۔“ بھگوان داس پھر دہاڑا۔ ”چلو..... جلدی سے اس لڑکی کی مشکلیں کھول دو اور کمرے سے نکل جاؤ.....“

مہی پال بچ دتا ب کھانا ہوا پونم کی طرف بڑھا۔ مہی پال نے جیسے ہی اس کی مشکلیں کھول دیں۔ پونم نے ایک لالت اس کے جسم کے سب سے نازک حصے پر رسید کی۔ وہ ایک چیخ مار کر فرش پر گرا۔ درد اور تکلیف سے تڑپنے لگا۔ پھر اس نے بھگوان داس کے قریب جا کر اسے زور سے دھکا دے کر گرائی۔ بھگوان داس نے اسے پکڑ کر دو بچ لیا۔

”ذلیل..... کمینی.....! کیا تو سمجھتی ہے کہ ہمیں بے وقوف بنا کر بھاگ جائے گی.....“ بھگوان داس نے کہا۔ ”مہی پال..... جلدی سے اٹھ..... اس کے پڑے پھاڑ دے اور کمرے سے چلا جا..... دیکھ..... میں اس کے ساتھ کیا کرتا ہوں.....“

مہی پال جلدی سنجل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کیوں کہ ضرب اتنی کاری نہیں تھی۔ جب اس نے پونم کا لباس اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ایک آواز گونجی۔ ”خبردار.....! جو تم نے اسے بے لباس کیا تو..... میں تم دونوں کا خون کا خون پی جاؤں گا؟“

ان تینوں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا تو ان کے جسموں پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ ایک انتہائی خوف ناک شکل کی چیل کھڑی تھی..... خون خوار آنکھیں..... جوانکاروں کی طرح دھبہ رہی تھیں.....

پونم تو بے ہوش ہو کر بھگوان داس کے ہاتھوں کی گرفت سے نکل کر فرش پر گر پڑی..... بھگوان داس اور مہی پال چونکہ مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ بے رحم، سفاک اور شقی القلب تھے اس لئے وہ دل مضبوط کئے اس خوف ناک چیل کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی رگوں میں لہو نمجہ ہو گیا تھا۔ انہوں نے چیلوں کے بارے میں سنا تو تھا کہ وہ ایسی ہوتی ہیں..... ویسی ہوتی ہیں..... بہت خوف ناک اور بد شکل بھی ہوتی ہیں۔

”ت..... تم..... کون ہو.....؟“ مہی پال ہکلا یا۔ ”اس کی آواز حلق میں گولے کی طرح اٹک رہی تھی۔“

”میں چیلوں کی مہارانی ہوں.....“ اس کی آواز نہایت بھونڈی اور خوف ناک اور

بے سری تھی۔

”ت..... تم..... ک..... کس لئے آئی ہو.....!“ بھگوان داس نے اپنی طاقت اور حواس مجتمع کر کے پوچھا۔

”اس لڑکی اور تمہاری ساری دولت کو لے جانے کے لئے.....“ چڑیل نے مکلی تجوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

”کس لئے..... کس لئے لے جانا چاہتی ہو.....؟“ بھگوان داس نے ہمت کر کے سوال کیا۔ ”ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟“

”کس لئے..... وہ خون خوار نظروں سے ٹھورتی ہوئی بولی۔ ”اس لئے کہ یہ دلہن ہے اور اس کی شادی کسی اور سے ہو چکی ہے اور اسے اغوا کر کے لایا گیا ہے تاکہ تم اس کے ساتھ زیادتی کرو..... تم نے اس غریب پر کتنا بڑا انیائے کیا ہے..... میں تمہاری ساری دولت لے جا کر سزا دیتا چاہتی ہوں..... یہ ساری دولت..... کالا دھن ہے۔“

”تم چاہو تو اس لڑکی کو لے جاؤ..... لیکن میری دولت مت لے جانا۔ یہ میری برسوں کی محنت کی کمائی ہے۔“ بھگوان داس نے کہا۔

”محنت کی کمائی ہے.....“ چڑیل تہقہ مار کر کہی۔ ”جھوٹ بولتے ہو..... تمہاری اس کوٹھی کے تہہ خانے میں دس کروڑ مالیت کی ہیر و من مو جو د ہے..... آج ایک گھنٹے کے بعد تمہاری کوٹھی پر ایک نہایت ایمان دار اور دیانت دار پولیس انسپکٹر چھاپہ مارنے والا ہے..... آج صبح تم نہ صرف حوالات میں ہو گے بلکہ تلاش شخص..... تم جیسے پانی کی مٹی سزا ہے.....“

”تم لڑکی کو لے جاؤ۔ میری دولت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا.....“

بھگوان داس اپنی تجوری کی طرف بڑھا تو اس چڑیل نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ بھگوان داس لٹو کی طرح گھوم گیا۔ تھپڑ اتنا زوردار تھا کہ وہ ایک دم سے بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ یہ دیکھ کر مہی پال اس قدر خوف زدہ ہوا کہ دروازے کی طرف لپکا..... چڑیل نے اس کی ٹانگ پکڑ کر اسے فضا میں بلند کیا۔ دو ایک بار چکر دینے کے بعد اسے فرش پر دے مارا..... وہ بھی بے ہوش ہو کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

پونم نے محسوس کیا کہ کوئی اسے جگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس نے بیدار ہو کر دیکھا تو اس پر ایک بہت ہی خوب صورت اور جوان عورت جھکی ہوئی تھی۔ وہ کسی دیوی کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ ایک دم سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی..... اس نے کمرے میں نظریں دوڑائیں..... اسے وہ چڑیل دکھائی نہیں دی جسے دیکھ کر وہ بے ہوش ہو گئی تھی.....

”آپ..... آپ..... کون ہیں.....؟“ پونم حیر زدہ لہجے میں بولی۔ ”وہ چڑیل..... کہاں ہے.....؟“

”میں تمہاری مدد کرنے اور تمہیں یہاں سے نکال کر لے جانے آئی ہوں..... اٹھو.....“ چندرا دیوی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ ”وہ چڑیل نہیں ہے..... میں نے اسے بھگا دیا۔ چلو گھر چلتے ہیں..... تمہاری ماں انتظار کر رہی ہے۔“

”لیکن بھگوان داس اور اس کے آدمی جانے نہیں دیں گے.....“ وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ”وہ دیکھو.....“ چندرا دیوی نے اس جانب اشارہ کیا جہاں بھگوان داس اور مہی پال بے ہوش پڑے تھے۔ ”یہ بہت دیر تک بے ہوش رہیں گے۔ اس کے ملازمین اپنے کمرے میں سو رہے ہیں.....“

پونم فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی، اس نے اپنا لباس اور بال درست کئے۔ چندرا دیوی نے ایک گٹھری کی طرف اشارہ کیا۔

”پونم..... اسے اٹھا لو.....“

پونم نے حیرت سے اس گٹھری کی طرف دیکھا۔ ”یہ کیا ہے.....؟ یہ گٹھری میری تو نہیں ہے۔“

”ہاں..... یہ گٹھری تمہاری نہیں ہے۔ لیکن اب تم اس گٹھری کی مالک ہو۔ اب یہ صرف تمہاری ملکیت ہے۔“ چندرا دیوی نے کہا۔

”اس گٹھری میں ہے کیا.....؟“ پونم نے گٹھری کی طرف تجسس بھری نظروں سے دیکھا۔

”اس میں بھگوان داس کی وہ ساری دولت ہے جو اس کی تجوری میں تھی۔“ چندرا دیوی نے تجوری کی طرف اشارہ کیا۔

پونم نے تجوری کی طرف دیکھا۔ وہ خالی پڑی تھی۔ اس کی درازوں میں کوئی چیز بھی نہیں تھی۔

”لیکن..... بھگوان داس پولیس میں میرے خلاف چوری کی رپورٹ درج کرادے گا.....“

پونم خوف زدہ ہو کر بولی۔

”تمہارے نہیں..... میرے خلاف.....“ چندرا دیوی مسکرائی۔ ”پولیس اس کی بات کا یقین نہیں کرے گی۔ ایک چڑیل اس کی ساری دولت لے کر اور تجوری میں جھاڑو پھیر کر چلی گئی..... اور پھر تمہارے متعلق کچھ نہیں بتائے گا کہ اس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے تمہیں اغوا کیا تھا..... وہ چڑیل اس کی دولت اور اس لڑکی کو لے گئی۔ چوں کہ پولیس اسے گرفتار کر کے اور اس نے جو نشیات تہہ خانہ میں موجود ہے اسے ضبط کر لیا جائے گا۔ اور بھگوان داس اپنا نامی توازن کھو بیٹھے گا۔ بہکی بہکی باتیں کرے گا..... مہی پال کی کسی بھی بات کا یقین نہیں کیا جائے گا۔ کیوں کہ ان کے پاس کوئی ثبوت

اور گواہ نہیں ہے۔۔۔۔۔“

”اتنی ساری دولت ہم غریبوں کے پاس دیکھ کر کیا لوگ شک نہیں کریں گے۔۔۔۔۔؟“ پونم بولی۔ ”کہیں یہ دولت ہمیں کسی مصیبت میں نہ ڈال دے۔۔۔۔۔ غریب ہونا بڑا جرم ہے۔ مجھے یہ دولت نہیں چاہئے۔۔۔۔۔“

”شاباش۔۔۔۔۔ پونم۔۔۔۔۔!“ چندرا دیوی نے اس کے خیال اور جذبے کو سراہا۔ ”مجھے بہت خوشی ہوئی کہ تم میں دولت کی ہوس بالکل بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ میں تمہیں اس میں سے بیس ہزار روپے دوں گی۔ اسے اپنی ماں کو دے دینا۔ اس کے علاوہ دس ہزار کی رقم جس سے وہ قرض ادا کر سکے جو اس نے تمہاری شادی پر لیا ہوا ہے۔ چلو اب چلتے ہیں۔“

چندرا دیوی نے وہ بھاری گٹھری اس طرح سے اٹھالی جیسے بہت ہی ہلکی پھلکی ہو۔ پھر وہ کوٹھی سے باہر آئیں۔ کوٹھی کے ملازمین میں سے کسی نے انہیں نہیں دیکھا۔ وہ بے خبر اور گہری نیند سو رہے تھے۔ اس واقعہ کی بھنک تک نہ پڑی۔ ان دونوں نے بہت دور اندھیرے میں تیز روشنیاں دیکھیں۔ بہت ساری گاڑیاں کوٹھی کی سمت تیزی سے آ رہی تھیں۔

”یہ گاڑیاں اس وقت کیوں آ رہی ہیں؟“ پونم نے چندرا دیوی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ”یہ کیسی گاڑیاں ہیں؟“ ”یہ پولیس کی گاڑیاں ہیں جو بھگوان داس کی کوٹھی پر چھاپہ مار کر غشیات برآمد کرنے آ رہی ہیں۔“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔

”پولیس کے محکمے میں ایک نیا انسپکٹر تعینات ہوا ہے۔ قانون کی بالادستی کے لئے وہ کسی اثر و رسوخ اور سفارش کو خاطر میں نہیں لاتا ہے۔ میں نے فون پر معجزی کی تھی۔ اب یہ سمجھو کہ بھگوان داس اور اس کا دست راست مہی پال دس بارہ برسوں کے لئے جیل کی ہوا کھانے گئے۔۔۔۔۔ ان کی کہانی ختم۔۔۔۔۔ جب بھگوان داس جیل سے رہا ہو کر آئے گا تو وہ ایک بھکاری سے بھی بدتر ہوگا۔ وہ سڑکوں اور بازاروں میں بھیک مانگ کر گزر رادقات کرے گا۔“

”ایسا ہی ہو۔۔۔۔۔ پونم بولی۔“ ”اچھا یہ بتائیں کہ وہ جیل کون تھی؟ کیا آپ نے اسے دیکھا تھا؟“ ”وہ جیل کون تھی۔۔۔۔۔؟ وہ میں تھی۔۔۔۔۔“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔ پھر اس کے ہونٹ مسکرا پئے گئے۔

”آپ۔۔۔۔۔؟“ پونم بری طرح چوکی اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے جسم پر جھرجھری سی آگئی۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں آپ اس قدر حسین ہیں۔۔۔۔۔ وہ جیل آپ کیسے ہو سکتی ہیں؟ میں نے

اپنی زندگی میں ایسی بد صورت اور خوف ناک صورت نہیں دیکھی۔۔۔۔۔ کیا چڑیلیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔۔۔۔۔؟ اس کا تصور کر کے میری جان نکلی جا رہی ہے۔“

”دراصل یہ نظروں کا دھوکا تھا۔۔۔۔۔“ چندرا نے کہا۔ ”میں ایک ایسا منتر جانتی ہوں جس سے جس روپ بہروپ میں آنا چاہوں آ سکتی ہوں۔ میں کچھ دیر پہلے جب تمہارے گھر کے پاس سے گزر رہی تھی تب میں نے تمہاری ماں کی سسکیاں سنیں۔ اس لئے میں ادھر آئی کہ اس منتر سے فائدہ اٹھا کر تمہیں بھگوان داس کے ہاتھوں عزت لٹنے اور اس کی قید سے نکالنے آئی۔“

”کیا آپ کو اس بات کا علم ہے کہ پولیس نے جھوٹے الزام میں میرے پتی، ساس سر، دیور اور نندوں کو حالات میں بند کر دیا۔“ پونم بولی۔ ”بھگوان داس نے میرے سرال والوں کو پھنسا دیا۔۔۔۔۔ آپ ان سب کو رہا کر دیا سکتی ہیں۔۔۔۔۔؟“

”کیوں نہیں۔۔۔۔۔“ چندرا دیوی نے اس کے گھر کے باہر رک کر گٹھری میں سے بیس ہزار کی رقم نکال دی۔ ”اب تم اپنی ماں کے پاس جاؤ۔۔۔۔۔ صبح دس بجے تک تمہارا پتی اور سرال کے لوگ تمہارے ہاں پہنچ جائیں گے۔ پھر رخصت ہو کر اپنی سرال چلی جانا۔“

اتنا کہہ کر چندرا دیوی جانے کے لئے مڑی تو وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ”مجھے بڑی عداوت ہے کہ میں نے آپ کا نام نہیں پوچھا۔۔۔۔۔ آپ میری محسنہ ہیں۔“ ”تمہیں میرے بارے میں تمہاری ماں بتا دے گی۔ تم جلدی سے اندر جاؤ۔ تمہاری ماں نے رورو کر برا حال کیا ہوا ہے۔“

☆.....☆.....☆

صبح دس بجے پولیس انسپکٹر تھانے میں بڑی رعونت کے انداز سے بیٹھا۔۔۔۔۔ پونم کے پتی اشوک سے کہہ رہا تھا۔

”تم بیس ہزار کا بندوبست کر دو تو تم سب کو حالات سے رہائی مل سکتی ہے۔۔۔۔۔ اگر تم نے رقم کا بندوبست نہیں کیا تو تمہیں قتل کے الزام میں پھنسا دوں گا۔۔۔۔۔ اور ہاں۔۔۔۔۔ تمہاری دلہن پونم۔۔۔۔۔ اب کسی قیمت پر بھی تمہیں نہیں مل سکتی۔ لیکن۔۔۔۔۔ اس صورت میں مل جائے کہ بھگوان داس کا دل اس سے کھیلے کھیلے بھر جائے۔ اب تم کیا کہتے ہو۔۔۔۔۔؟ بیس ہزار کا بندوبست کرو گے یا۔۔۔۔۔“

اس سے پہلے اشوک کچھ کہتا اس کے کمرے میں ایک حسین نوجوان عورت ایک عمر رسیدہ وکیل کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ ان دونوں نے انسپکٹر کی بات سن لی تھی۔ انسپکٹر کی نظر پہلے اس حسین عورت پر پڑی تھی جسے دیکھتے ہی وہ مسحور ہو گیا تھا پھر جیسے ہی اس کی نظر وکیل پر پڑی اس کی سٹی کم ہو گئی۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور اس نے سلوٹ کیا۔

”سر.....! آپ یہاں کیسے.....؟“ وہ گھگھیا کر بولا۔ ”آپ نے کیسے زحمت کی۔ مجھے فون پر حکم دیا ہوتا میں حاضر ہو جاتا۔“

وکیل ہری چند پرکاش..... اس شہر کا سب سے بڑا نامور اور معروف وکیل تھا۔ اس کا عدلیہ بڑا احترام اور ادب کرتی تھی۔ وہ مشورے کے لئے بھی ایک بڑی رقم لیتا تھا۔

”ہم اشوک اور اس کے گھر والوں کی رہائی کے لئے آئے ہیں.....“ عورت نے بڑے تیز و تند لہجے میں کہا۔ ”تم نے ابھی ابھی اس نوجوان سے جو کچھ کہا ہے اسے میں نے ٹیپ کر لیا ہے..... یہ دیکھو.....“

عورت نے پرس سے جیبی سائز کا ٹیپ ریکارڈر نکالا اسے ریوائنڈ کیا۔ پھر پلے کا بٹن آن کیا..... اور اس کی آواز فضا میں گونجی..... انسپکٹر کا چہرہ زرد پڑ گیا اور سفید پڑتا چلا گیا۔

”یہ تم نے غیر قانونی طور پر انہیں حوالات میں کیوں بند کیا ہوا ہے.....“ عورت نے تیز لہجے میں کہا۔ ”میں وکیل صاحب کی سیکریٹری ہوں۔ ان کا جرم کیا ہے.....؟ کس جرم کی پاداش میں گرفتار کیا گیا.....؟“

”بھگوان داس نے رپورٹ کی تھی کہ پونم نامی لڑکی نے اس کی کوٹھی سے دس ہزار کی رقم چرائی ہے۔“ انسپکٹر مردہ لہجے میں بولا۔

”پونم کہاں ہے.....؟ بھگوان داس نے کیا ایف آئی آر کٹوائی تھی.....؟“ عورت نے دریافت کیا۔

”پونم..... پونم.....“ انسپکٹر ٹپٹایا..... ”پونم کو بھگوان داس کے آدمی لے گئے..... بھگوان داس صرف زبانی رپورٹ اپنے آدمی مہی پال کے ذریعے کروائی..... اسے رجسٹر پر لکھا نہیں گیا ہے۔“

”پونم نے چوری کی اور تم نے اس کے پتی..... ساس سر، مندا اور دیور کو گرفتار کر لیا.....؟ کس خوشی میں.....؟“

”یہ بھگوان داس کا حکم تھا۔ میں اس کی سرتابی کیسے کر سکتا تھا..... مجھے مجبوراً اس کا حکم ماننا پڑا.....“ وہ گھبرا کے بولا۔

”اشوک.....!“ وہ عورت دولہا کی طرف گھوم کر بولی۔ ”آپ بتائیں کہ واقعہ کیا ہے؟“ اشوک نے مختصر الفاظ میں ساری کہانی سنائی۔ جب وہ تمام بتا چکا تو وکیل نے پہلی بار زبان کھولی۔

”انسپکٹر.....! اب تم نہ صرف ملازمت سے ہاتھ دھولو گے بلکہ اعانت جرم کے الزام

میں..... انہیں جس بے جا میں رکھنے اور رشوت طلب کرنے کے جرم میں جیل کی ہوا کھاؤ گے..... میں تمہیں برسوں کے لئے جیل میں سزا دوں گا.....“ وکیل نے کرخٹ لہجے میں کہا۔ ”تمہارا جرم قابل معافی نہیں ہے..... انہیں ابھی اور اسی وقت رہا کرو۔ ورنہ.....“

”مجھے شاکر دیجئے سر!“ انسپکٹر گڑگڑایا۔ اس کی ساری اکڑنوں نکل چکی تھی۔ ”میں ابھی آپ کا حکم بجالاتا ہوں۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ..... بھگوان داس نے تمہیں کتنی رشوت دی تھی؟“ وکیل نے غرا کر پوچھا۔

”میں ہزار روپے.....“ انسپکٹر کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”وہ بیس ہزار..... اور اپنے پاس سے بیس ہزار روپے..... ابھی اور اسی وقت ملا کر اشوک کو دے دو..... اسی صورت میں تمہیں نجات مل سکتی ہے..... ورنہ تمہاری شامت آ جائے گی۔“ وکیل دھاڑا۔

”بھگوان داس نے جو بیس ہزار کی رقم دی ہے۔ وہ تو دے دوں گا..... لیکن میرے پاس اتنی بڑی رقم کہاں ہے..... میں صرف دو ایک ہزار روپے پیش کر سکتا ہوں۔“ انسپکٹر نے ہونٹوں کی طرح جواب دیا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو انسپکٹر.....“ عورت نے بگڑ کر برہمی سے کہا۔ ”تم بہت ہی بدنام ہو..... ذلیل اور کینے ہو..... ایک نمبر کے راشی ہو۔ اس کے علاوہ عیاش اور ادا باش بھی ہو..... جیسا کہ ہمارے علم میں ہے کہ تمہاری روزانہ کی آمدنی دو تین ہزار روپے ہے..... یقین نہیں آتا کہ تمہارے پاس دو ہزار سے زیادہ کی رقم نہیں ہے..... تم ایک طرح سے جھوٹے مکار اور دھوکے باز بھی ہو..... اچھا لاؤ بائیس ہزار روپے ہی دے دو۔ ابھی اور اسی وقت..... ہم تمہیں مہلت نہیں دے سکتے۔ ایک گھنٹے کی بھی.....“

کوئی اور عورت ہوتی اور وکیل ہری چند پرکاش کی سیکریٹری نہ ہوتی تو انسپکٹر اس کا حشر نشر کر کے رکھ دیتا۔ اس عورت نے جو تذلیل اور تضحیک کی تھی وہ اس کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ وہ اس عورت کا بال بیکا اس لئے نہیں کر سکتا تھا کہ اس عورت نے اس کی گفتگو ٹیپ کی ہوئی تھی جو اسے جیل پہنچا سکتی تھی۔ وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ آج تک کسی نے اس کی ایسی بے عزتی نہیں کی تھی۔

اس نے اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے ہوئے جیب سے الماری کی چابی نکالی۔ الماری اس کی کرسی کی پشت پر تھی۔ اس نے الماری کا پٹ کھولا۔ ایک دراز کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وکیل نے گرجتے ہوئے کہا۔ ”تم ہٹ جاؤ۔ ہم اس الماری کی تلاشی لیں گے.....“

پھر وکیل نے دوسرے لمحے آگے بڑھ کر انسپکٹر کو ایک طرف ہٹایا اور دراز کھول کر دیکھا تو اس میں تین چار چھوٹے بڑے پھولے ہوئے لفافے تھے۔ وکیل نے انہیں تیزی سے ایک ایک کر کے اٹھایا تو انسپکٹر اچھل پڑا۔ ”نہیں..... نہیں..... آپ سارے لفافے نہیں کھول سکتے؟“

”اپنی جگہ خاموش کھڑے رہو.....“ وکیل نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”ان لفافوں میں جو رقم ہے۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ تمہارے پاس کل کتنی رقم ہے..... تم کتنے سچے ہو..... جھوٹے ہو..... تم نے کوئی حرکت کی تو ہم سے برا کوئی نہ ہوگا.....“

عورت نے لفافے سے رقم نکالی۔ اب اس نے انہیں گنا..... وہ ایک لاکھ دس ہزار کی رقم تھی..... ادھر انسپکٹر کی حالت بڑی غیر ہو رہی تھی۔ وکیل نے وہ رقم واپس اسی لفافے میں رکھی..... صرف چالیس ہزار کی رقم نکال کر باقی رقم انسپکٹر کو واپس کر دی تو انسپکٹر کی جان میں جان آئی۔ پھر اس نے اشوک اور اس کے گھر والوں کو آزاد کر دیا۔

وکیل نے ان لوگوں کو دین میں بٹھایا۔ پھر انہیں لا کر پونم کے گھر پر چھوڑ دیا۔ چالیس ہزار کی رقم اشوک کے حوالے کر دی۔ پھر وہ ایک لمحہ کے لئے بھی رکے نہیں اور نہ ہی انہوں نے دولہا اور اس کے گھر والوں کو اتنی مہلت دی کہ وہ ان کا شکریہ ادا کر سکیں۔ وکیل، اس عورت اور دولہا والوں کے جانے کے بعد بہت دیر تک سر تھاٹے بیٹھا تھا۔ لفافے میز پر رکھے ہوئے تھے۔ اس نے رقم لفافے میں سے نکالی، لیکن وہ یہ دیکھ کر اچھل پڑا کہ تمام نوٹ کورے کاغذ بن چکے تھے۔ اب وہ روی تھے۔

پونم کے گھر پر اشوک اور اس کے گھر والوں کو اتارنے کے بعد وکیل نے کچھ دور جا کر وین روکی۔ سر سے سفید بالوں کی وگ نکالی اور اپنا میک اپ اتار دیا۔ کوٹ نکال کر پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ پھر وہ دونوں ایک شان دار قسم کے ریٹورنٹ میں آ گئے۔ انہوں نے ابھی تک ناشتا نہیں کیا تھا اور انہیں بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔

ناشتے کا آرڈر دینے کے بعد چندرا دیوی نے کہا۔ ”نرنجن.....! مجھے امید نہ تھی کہ تم اتنی زبردست اداکاری کرو گے..... میں دل میں عیش عیش کر رہی..... انسپکٹر دھوکا کھا گیا.....“ چندرا دیوی نے توقف کر کے پرس میں سے لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا تو نرنجن نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”یہ وکیل صاحب.....! یہ آپ کی فیس ہے۔ ساٹھ ہزار روپے.....“

”تم نے انسپکٹر کے لفافوں میں رکھی رقم کو کورے کاغذ میں تبدیل کر دیا.....“ نرنجن بولا۔ ”وہ حیرت اور غصے سے پاگل ہو گیا ہوگا..... چوں کہ یہ کارنامہ تمہارا ہے..... کیوں نہ نفٹی نفٹی کر لیا جائے۔“

”تم بہت اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔“ چندرا دیوی نے کہا۔

”تم یہ رقم رکھ لو۔ اسے پتی پر خرچ کر دینا..... میرے لئے اس خوشی کی دولت سے بڑھ کر کیا دولت ہو سکتی ہے کہ بھگوان داس کی کہانی ختم ہوئی۔ پونم کو اس کا سہاگ مل گیا..... اس خبیث سے لوگوں کو نجات مل گئی۔“

☆.....☆.....☆

چندرا دیوی کون تھی.....؟ کیا وہ ایک دیوی تھی.....؟

چندرا دیوی..... ایک طرح سے دیوی ہی تھی..... ایٹور نے اس سنسار میں اسے اس لئے جنم دیا تھا کہ وہ انسانیت کی خدمت کرے..... وہ نہ صرف ستائی ہوئی، پریشان حال اور زیادتی کا نشانہ بننے والی لڑکیوں اور عورتوں کے کام آتی تھی بلکہ مظلوموں اور ضرورت مندوں کی بھی ہر طرح سے مدد کرتی تھی۔

وہ پراسرار، نادیدہ قوتوں اور سفلی علوم پر بھی دسترس رکھتی تھی۔ ان سے دکھی عورتوں کی مدد کا کام لیتی تھی..... اس کے علاوہ اس نے جوڈو کرائے..... تلواریں ہر طرح کی نشاۃ بازی میں مہارت اسلحہ کا استعمال بھی جانتی تھی۔ حالانکہ اسے اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کیوں کہ اپنے جادو منتر سے بہت کچھ کر سکتی تھی۔ وہ ایک عام سی عورت تھی..... ایٹور نے اسے دیویوں جیسا بنایا تھا..... اس نے کئی لڑکیوں اور عورتوں کی مدد کی تھی جس سے اس کی شہرت تھی۔ اس کی شہرت اس لئے محدود تھی کہ وہ اس کی بھوک اور خواہش مند تھی۔ وہ غیر محسوس انداز سے ہر کسی کے کام آتی تھی۔ اسے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ اس کا باپ ایک ارب پتی تھا۔ اس کی موت کے بعد وہ تنہا اس کی مالک اور وارث تھی۔ وہ قانون کی بھی مدد کرتی رہتی تھی..... شیطانی قوتیں نہ تو اس کا بال بیکا کر سکتی تھیں اور نہ ہی اس پر حاوی ہو سکتی تھیں۔ وہ ہر کسی روپ بہروپ، لمحے میں بھر سکتی تھی۔ ایٹور نے اسے اتنی شہرت دی تھی کہ ایسی کسی کے پاس نہ تھی۔ اسے آئینہ بادل حاصل تھی ایٹور کی.....

ایٹور نے اس کے شہ کام سے متاثر ہو کر اس کے کارن اسے ایک عظیم ترین دیوی بنادیا تھا۔ جب وہ سولہ برس کی تھی اور ایک کالج میں زیر تعلیم تھی تب وہ روزانہ بھوکوں کو کھانا کھلاتی تھی۔ ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد کرتی تھی۔ اس کا باپ دولت مند آدمی تھا۔ دولت مندوں اور ان کی اولاد کے دل بہت تنگ ہوتے ہیں۔ ان کے دل کے کسی کوئی میں کسی کی مدد کرنے اور کام آنے کا کوئی جذبہ نہیں ہوتا..... لیکن چندرا دیوی ان کے برعکس تھی..... وہ جتنی حسین تھی اس کا دل اس سے کہیں بڑا اور خوب صورت تھا۔ وہ کسی کو بھی دکھی اور پریشان حال نہیں دیکھ سکتی تھی۔

ایک روز وہ اپنے کالج کی سہیلیوں کے ساتھ پکنک منانے نیلی جھیل پر گئی ہوئی تھی۔ یہ نیلی جھیل اس لئے اس نام سے مشہور تھی کہ اس کا پانی گہرا نیلا اور بہت ہی میٹھا بھی تھا۔ یہ شہر سے دور

ایک سرسبز و شاداب علاقے میں..... قدرت کے حسین نظاروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ اکیلی ہی اس علاقے کی سیر کو نکل گئی۔ کیوں کہ اس کی سہیلیاں ناچنے گانے اور تاش کھیلنے میں مگن تھیں۔ کچھ لڑکیاں بڑی آزادی سے جھیل میں تیر اور نہار ہی تھیں۔ کوئی غیر عورت اور مرد نہیں تھا جو انہیں دیکھتا۔ یہاں پر چھٹیوں کے دنوں میں لوگ پکنک منانے آتے تھے۔ آج کا دن چھٹی کا نہیں تھا۔ اس لئے کوئی اور پارٹی نہیں آئی تھی۔ وہ یہاں پہلی بار نہیں آئی تھی۔ کوئی تیسری مرتبہ آئی تھی۔ اسے یہ جھیل اور پکنک اسپاٹ بہت پسند تھا۔

وہ کوئی نصف میل اندر آ گئی تھی۔ اس نے دفعتاً ایک دل خراش نسوانی چیخ سنی۔

”بچاؤ..... بچاؤ..... کوئی ہے..... بھگوان کے لئے میری مدد کرو.....“

”چندرا دیوی یہ سمجھی کہ کوئی درندہ صفت بد معاش کسی عورت کو اس نیت سے اٹھالایا ہے کہ اس کی عزت کو بے رحمی سے پامال کر دے۔ اسلحے کے زور پر اس کی عزت کو برباد کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ عورت مدد کے لئے پکار رہی ہے..... شاید ایک نہیں دو تین بد معاش ہوں گے۔ اکیلی عورت ہے..... اگر ایک بد معاش ہوتا تو شاید وہ عورت مدد کے لئے نہیں چلاتی۔ اکیلی اس درندے سے مقابلہ کر کے عزت بچا لیتی..... لیکن عورت تو بڑی کمزور اور نازک ہوتی ہے۔ ایک مرد کا مقابلہ کیسے کر سکتی ہے۔

وہ تیزی سے آواز کی سمت لپکی۔ دوسرے لمحے رک گئی۔ اس کے دل کے کسی کونے میں ایک نادیہ آواز کہہ رہی تھی..... ”چندرا تم اس عورت کی مدد کے لئے نہ جاؤ..... ہندوستان میں روزانہ نہ جانے کتنی لڑکیاں اور عورتیں درندگی کا نشانہ بن جاتی ہیں..... اس عورت کو ایک نہیں دو تین مرد اٹھا کر لائے ہوں گے..... اور پھر تم کمزور ناتواں اور گداز بدن کی ہو۔ وہ درندے تمہارے عزت کے درپے ہو جائیں گے۔ پھر تمہیں بھی اپنی عزت سے محروم ہونا پڑے گا..... تم نہتی لڑکی ہو۔ ان درندوں سے کیسے مقابلہ کر دو گی.....؟ تمہیں اس عورت کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے۔“

پھر اس عورت کی دل خراش چیخ سنائی دی۔ وہ مدد کے لئے پکار رہی تھی..... اس سے رہا نہیں گیا۔ چندرا نے ہر قیمت پر اس عورت کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ معاں کی نظر ایک لاشی پر پڑی جو ایک درخت کے نیچے پڑی تھی۔ اس نے وہ لاشی اٹھالی اور سرعت سے اس آواز کی سمت لپکی۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ اس نے جو منظر دیکھا وہ انتہائی خوف ناک اور دل دہلا دینے والا تھا۔ جس نے اس کی رگوں میں لہو منجمد کر دیا۔ وہ ساکت و جامد کھڑی ہو گئی۔ سانس لینا بھی بھول گئی۔

اس سے چند گز کے فاصلے پر ایک جوان عورت درخت کے نیچے تنے سے کھڑی کانپ رہی تھی۔ اس کا چہرہ دھلی سفید چادر کی طرح ہو رہا تھا..... آنکھوں سے خوف و دہشت جھانک رہی تھی۔ اس کا جسم بید کی طرح لرزاں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے وہ غش کھا کر گر سکتی ہے۔ وہ چوں کہ مضبوط اعصاب کی عورت تھی اس لئے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا۔

اس عورت سے دو گز کے فاصلے پر ایک خوف ناک، بہت ہی لمبا، موٹا اور سیاہ رنگ کا ناگ پھن اٹھائے ہوئے۔ اپنی دو شاخہ زبان بار بار نکال رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے وہ اس عورت کو ڈس لے گا۔ عورت کے فرار کی راہ مسدود تھی۔

چندرا کو فوراً ہی ہوش آیا۔ اس نے خود کو سنبھالا۔ اس ناگ سے مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ یہ لاشی اس ناگ کے مقابلے میں کچھ نہ تھی۔ یہ ناگ کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔ اس پر حملہ کرنے کی صورت میں وہ مشتعل ہو کر ڈس لیتا..... چوں کہ اس نے عورت کو بچانے کا تہیہ کیا ہوا تھا اس لئے اس نے اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ وہ عورت کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

”بہن.....! میں اس ناگ پر حملہ کرتی ہوں..... آپ فوراً ہی یہاں سے بھاگ جائیں۔ دیر نہ کریں۔“

وہ فضا میں لہراتی ہوئی ناگ کی طرف بڑھی۔ وہ عورت اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس نے جیسے ہی ناگ کے قریب پہنچ کر اس کے پھن پر حملہ کرنے کے لئے لاشی فضا میں لہرائی وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گری..... اسے ایسا لگا جیسے کسی نادیہ طاقت نے اس کے ہاتھ سے لاشی چھین کر پھینک دی ہو۔ وہ دہشت زدہ ہو گئی۔

پھر اس نے جو کچھ دیکھا وہ صرف عجیب و غریب بلکہ ناقابل یقین بھی تھا۔ ایک دم سے وہ ناگ گہرے دھوئیں میں تبدیل ہو گیا۔ پھر یہ دھواں ایک انسانی ہیولے میں تبدیل ہوتا چلا گیا۔ چند لمحوں کے بعد ایک عمر رسیدہ بارش اور صحت مند جسم کا آدمی کھڑا تھا۔ جس کے چہرے پر ملاحیت، شفقت اور ایک عجیب سی تمکنت تھی۔

”شاباش..... بہادر عظیم لڑکی.....!“ اس شخص نے نہایت محبت بھرے لہجے میں اسے داد دیتے اور سراہتے ہوئے مخاطب کیا۔ ”ہم نے تمہاری آزمائش کی تھی..... ہم صدیوں سے تم جیسی لڑکی کی تلاش میں تھے..... ان گنت لڑکیوں کی ہم نے آزمائش کی اور ان کا امتحان لیا لیکن وہ ہماری کسوٹی پر پوری نہ اتر سکیں..... ہم جانتے تھے کہ تمہارے سینے میں جو نازک سادل دھڑکتا ہے۔ وہ تم سے کہیں خوب صورت ہے..... جذبوں اور ایثار سے بھرا دل ہے..... اس عورت سے تمہارا کوئی رشتہ ناتا نہیں تھا..... کوئی سبندہ نہیں تھا..... لیکن تم نے اس کی زندگی بچانے کے لئے

اس نے پونم کی جو عزت و آبرو بچائی۔ اس کا سہاگ اور نئی حسین زندگی کو تباہ و برباد ہونے نہیں دیا۔ خصوصاً وہ لڑکیوں اور عورتوں کے بہت کام آتی تھی۔ جہاں اس کے کان میں بھٹک پڑی کہ..... ظلم ہو رہا ہے وہ فوراً وہاں پہنچ جاتی تھی۔ لمحے کی دیر نہ کرتی تھی۔ کسی کی مدد کر کے اس کی آتما کو جو خوشی اور کیف دے دیتا تھا اسے وہ خود ہی جانتی تھی۔

☆.....☆.....☆

کرن پور کے لوگوں کا خیال تھا کہ سدھیر کو جس نے بھی قتل کیا، وہ کوئی درندہ صفت ہے پدمنی اور اس کی دولت کے حصول کے لئے کیا ہے..... سدھیر کو ہٹانے اور پدمنی کو بیوہ کرنے سے یہ ہوگا کہ پدمنی اپنی بھری جوانی گزارنے کے لئے جلد ہی جیون ساسی کا انتخاب کرے گی..... قاتل کو اپنے اوپر بڑا اعتماد ہے کہ پدمنی اس کا ہاتھ تھام لے گی۔

لیکن عام لوگوں کا یہ خیال غلط ثابت ہوا..... سدھیر کے قتل کے الزام میں سر دجا کو گرفتار کر لیا گیا..... اس پر یہ الزام تھا کہ وہ سدھیر کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی اور سدھیر سے اس کے تعلقات تھے اور وہ سدھیر سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ اس نے سدھیر سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ ”وہ پدمنی کو طلاق دے کر نجات حاصل کر لے..... اگر پدمنی طلاق کے لئے تیار نہ ہوئی پھر اس سے نجات پانے کے لئے ایک ہی طریقہ ہے کہ راستے سے ہٹا دیا جائے۔ اس طرح سے اس کی دولت بھی ہاتھ لگ جائے گی.....“ جس کے لئے سدھیر تیار نہ ہوا تو پھر جوش رقابت میں اس نے سدھیر کو قتل کر دیا۔

سر دجا نے پولیس کو جو بیان دیا تھا..... اعتراف کیا تھا وہ یہ تھا کہ..... اسے سدھیر سے بے پناہ محبت تھی اور اس سے تعلقات بھی تھے..... یہ جاننے، دیکھتے اور سنتے ہوئے بھی کہ سدھیر کے نہ صرف لڑکیوں بلکہ کچھ شادی شدہ عورتوں سے بھی تعلقات ہیں..... جن جن لڑکیوں اور عورتوں سے سدھیر کے تعلقات تھے ان میں وہ سب سے زیادہ حسین اور پرکشش تھی۔ سدھیر اسے بے پناہ چاہتی بھی تھی..... اس نے سدھیر سے کہا تھا کہ اس کی شادی ہو جانے پر بھی وہ تعلقات قائم رکھے گی۔ لیکن ایک عورت ہونے کے ناتے وہ پدمنی اور اس کے درمیان دیوار بننا چاہے گی۔ چوں کہ وہ محبت کرتی ہے۔ لہذا وہ محبت کا یہ سفر جاری رکھے گی..... اس کے دل میں پدمنی کے خلاف نفرت نہیں ہے۔ نہ وہ اس کی ازدواجی زندگی تباہ کرنا چاہتی ہے..... وہ چوں کہ سدھیر کو ٹوٹ کر چاہتی تھی، لہذا سدھیر کو قتل کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سدھیر کو کسی اور نے قتل کیا ہوگا۔

لیکن پدمنی کا کہنا تھا کہ سدھیر کو سر دجا نے ہی قتل کیا ہے۔ اس نے ان دونوں کو دو ایک

اپنی جان کی فکر اور پروا نہیں کی..... ایک خوف ناک اور خطر ناک اور زہریلے ناگ سے بچانے کی کوشش کی..... تم بہت عظیم اور اس لائق ہو کہ تمہاری پرستش کی جائے۔

ہمیں صدیوں سے ایک ایسی لڑکی کی تلاش تھی جسے ہم دیوی بنا سکیں..... کس لئے.....؟ اس لئے کہ دنیا میں غلاقت، ظلم و ستم اور عفریت روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے..... اس کی کوئی حد نہیں رہی..... انسانیت سبک رہی ہے..... آدمی بہت پریشان، خوف زدہ ہے..... اس کی مدد کے لئے دنیا میں کوئی نہیں ہے..... شیطان کے ہاتھ بہت لمبے اور طاقت ور ہوتے جا رہے ہیں..... اس لئے ہم نے سوچا کہ ایک ایسی لڑکی یا عورت میں دیویوں والی ایسی شکتی دی جائے، جو دوسروں کے کام آئے، جو اس کا مقابلہ کر سکے اور اس شکتی سے کام لے، دوسروں کو تحفظ فراہم کرے تاکہ انسانیت دم نہ توڑ دے.....“

پھر اس نے توقف کر کے سوال کیا۔ ”تمہارا نام کیا ہے پتری؟“

”چندرا کرن.....“ وہ بڑی محویت سے اس کی باتیں سن رہی تھی چونک کر بولی۔

”تم آج سے چندرا کرن نہیں ہو..... بلکہ چندرا دیوی ہو..... ہم تمہیں نہ صرف چندرا دیوی کا نام دے رہے ہیں بلکہ تمہیں شکتی دان بنا رہے ہیں..... چندرا دیوی تمہاری ذات اور طاقت ناقابلِ تسخیر ہے..... ہم تمہیں شکتی کی تمام خصوصیات سے سرفراز کر رہے ہیں۔ سنسار میں جو بھی بلائیں اور شیطانی قوتیں ہیں..... جو ناپیدہ اور پراسرار طاقتیں اور سفلی علوم وہ تمہاری تابع ہوں گی..... وہ تمہیں ذرا برابر بھی نقصان نہیں پہنچا سکیں گی..... تمہارا بال تک بیکا نہیں ہوگا..... تم میں جو شکتی ہے وہ کسی بلا، شیطان اور عفریت میں موجود نہیں..... ہم نے تمہارے سینے کو ایسے متروں سے بھر دیا کہ تم ان سے جو بھی کام لینا چاہو لے سکتی ہو..... وہ تمام متروں تمہیں آپ ہی آپ یاد ہو جائیں گے.....“

پھر وہ عورت اور وہ ہستی ایک دم سے اس کی نظروں سے غائب ہو گئے۔ وہ جان نہ سکی..... پوچھ نہ سکی کہ وہ کون ہیں.....؟ ایک عجیب سی خوش گوار حیرت اس کے وجود میں بجلی کی لہروں کی طرح پھیلنے اور سنسنائے لگی۔

اس روز سے وہ چندرا کرن سے چندرا دیوی بن گئی..... اس نے اپنی صلاحیت، متروں اور قوت کو بدی کے خلاف آزمایا۔ وہ ایک دیوی بن گئی اور انسانیت اور اس کی سلامتی کو اس نے اپنا مشن بنا لیا۔ بلاؤں نے..... پراسرار اور طاقتور قوتیں اس کی راہ میں آئیں..... لیکن اس نے ہر موڑ پر اس میں ناکام بنایا اور مقابلے میں انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی۔ وہ قدم قدم پر سرخ رو ہوتی رہی..... کوئی بلا اور شیطان اس پر قابو نہ پاسکا۔

مرتبہ غلاظت کے دلدل میں دھنسا ہوا دیکھا تھا۔ اس نے اس لئے رنگے ہاتھوں پکڑا اور لعن طعن نہیں کیا تھا کہ اس طرح سدھیر بدک جاتا..... وہ سدھیر سے بے پناہ محبت کرتی تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ سدھیر کو کھودے اور اس سے سدا کے لئے محروم ہو جائے۔ اس نے بڑے ضبط سے کام لیا تھا۔ وہ سدھیر کو سمجھانا چاہتی تھی کہ وہ سروجا سے تعلقات نہ رکھے۔ وہ کوئی اچھی لڑکی نہیں ہے۔ اس کے بہت سارے لوگوں سے میل جول ہیں۔ جس روز سدھیر کا قتل ہوا اس سے دودن قبل سدھیر..... سروجا سے محبت کرنے اور تعلقات قائم رکھنے پر بڑا ایشیاں تھا..... سدھیر نے اس سے بہت معافی مانگی اور کہا تھا کہ..... سروجا اسے اپنی بیوی کے قتل پر اکسار ہی ہے۔ قتل کا منصوبہ بھی بنا رہی ہے..... چوں کہ سدھیر نے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے سروجا برداشت نہ کر سکی۔ اس نے غصے میں آ کر سدھیر کو موت کا نشانہ بنا دیا۔ اگر سروجا کو گرفتار نہ کر لیا جاتا تو اسے بھی قتل کر دیا جاتا۔

اخباری نمائندہ سریش نے جیل میں سروجا سے ملاقات کی تھی..... سروجا نے اسے ہر طرح سے یقین دلایا کہ وہ سدھیر کی قاتل نہیں ہے۔ وہ بے گناہ ہے۔ ہاں اس کا یہ جرم ضرور ہے کہ وہ سدھیر سے محبت کرتی تھی۔ چوں کہ محبت اور جنگ میں ہر چیز جازز ہے لہذا اس نے خود کو سدھیر پر ٹھہرا کر دیا تھا بلکہ سدھیر نے خود اس کی محبت کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔

سریش..... چندرا دیوی سے ملا..... چندرا دیوی نے اس کی باتیں بڑے غور سے سنیں۔ اس نے محسوس کیا کہ سروجا کو وہ بے گناہ اور معصوم سمجھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سروجا کو سزا نہ ہو۔ اسے انصاف ملے..... چندرا دیوی..... سروجا سے بھی ملی..... اس نے سریش کو ایک رٹ ٹورنٹ میں لٹچ پر بلایا تھا کہ اسے ایک سنسنی خیز اور تھراٹھیز کہانی سنائے۔ جس سے اسے اور اس کے اخبار کو شہرت ملے..... قانون کوئی غلط فیصلہ نہ کر سکے۔ بے گناہ سزا نہ پائے۔

☆.....☆.....☆

سدھیر کو بچپن سے ہی سیر و سیاحت کا شوق نہیں بلکہ جنون تھا..... وہ ساری دنیا کی سیاحت کرنا چاہتا تھا۔ ایک معمولی باپ کا بیٹا تھا۔ ساری دنیا تو دور کی بات تھی ہندوستان کے دو ایک بڑے شہروں کی سیاحت بھی کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے باپ کے ایک دوست نے سدھیر کو مشورہ دیا کہ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد وہ کسی جہاز راں کمپنی میں ملازمت کر لے..... اس طرح اس کی دلی تمنا اور خواب پورا ہو جائے گا۔ یہی ایک سیدھا اور آسان راستہ ہے۔

سدھیر نے یہ بات گرہ میں باندھ لی..... سدھیر نہ صرف وجیہہ اور دراز قد تھا بلکہ بہت ہی

خوب صورت تھا۔ گاؤں میں لوگ اسے سدھیر کے بجائے راج کمار کہتے تھے۔ نو جوانی کی دہلیز پر اس نے قدم رکھا تو وہ اور خوب صورت ہو گیا تھا۔ اسے ایک جہاز راں کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ اس طرح وہ سات برس ملک اور اپنی بہتی سے غیر حاضر رہا۔ اس نے جی بھر کے سیاحت کی۔ اس نے ساری دنیا کے خطے اور گوشے گوشے تک دیکھ لئے۔ چپے چپے جہان مارا۔ اسے اپنے ملک لوٹنے کی فکر اس لئے نہیں تھی کہ اس کے والدین سورگ باش ہو چکے تھے۔ بھائی بہن کوئی نہ تھے۔ پھر اسے وطن کی یاد ستانے لگی تو چلا آیا۔ اس کا اپنا آبائی مکان بھی تھا۔ اس کی چابی وہ پتاجی کے دوست اور پڑوسی مہندرا تھہ کو دے آیا تھا۔

ان سات برسوں میں بے فکری، آسودگی، فراغت..... عمدہ غذا، شراب اور آب و ہوانے اس کی خوب صورتی، جاذبیت اور کشش میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔ وہ اٹھائیس برس کا ہو چکا تھا۔ جب وہ آیا اس کی وجاہت دیکھ کر شادی شدہ عورتوں کے سینے دھک سے رہ گئے اور کنواری لڑکیوں کے دل دھڑکنا بھول گئے۔ وہ اس کے خواب دیکھنے لگیں۔

اس کی شخصیت میں وہ سب خوبیاں موجود تھیں جو ایک لڑکی کے تصوراتی محبوب میں ہوتی ہیں۔ اگر لڑکی سنجیدہ مزاج اور بالغ نظر ہو تو اس کے ذہن میں مثالی جیون ساتھی کا پیکر بھی ایسا ہی ہوتا ہے..... لڑکیاں تو نو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی زندگی کے ہم سفر اور سہاگ راتوں کے حسین اور رنگین خواب دیکھنے لگتی ہیں۔ اس میں ان کا نہیں ان کی جوانی کا خمار کا ہوتا ہے۔ یہ نو جوانی بڑی ظالم اور سفاک ہوتی ہے۔ دل میں انجانی آرزوئیں مچنے اور تڑپنے لگتی ہیں۔ ان کا دل کرتا ہے کہ کوئی جوان مرد انہیں اپنے دل میں بسالے۔ ان کے کانوں میں محبت کا رس ٹپکتا رہے..... پھر وہ اتنی دور چلی جائے کہ اسے واپس کا ہوش نہ رہے..... یہ خواب اور نو جوانی ہی ہوتی ہے جو انہیں بہکا دیتی ہے۔ وہ کسی کپے پھل کی طرح جھولی میں گر جاتی ہیں۔ اس وقت انہیں کچھ بھائی نہیں دیتا ہے۔ بہت کچھ کھونے کے بعد ہوش آتا ہے۔

سدھیر نہ صرف صحت مند تھا..... تعلیم یافتہ اور مہذب تھا..... خوش پوشاک جس سے اس کی دلکش شخصیت میں ایک عجیب سا نکھار..... اس کا دراز قد اور وجاہت سونے پر سہاگر تھے..... اس کا مستقبل بہت تابناک تھا..... وہ واپس کیا آیا پوری بستی میں سنسنی پھیل گئی۔ اس کے چہرے ہونے لگے۔

بستی والوں کے لئے سدھیر کوئی اجنبی نہیں تھا..... اور سدھیر کو دام میں پھانسنے کے لئے کسی نہ کسی حیلے بھاننے سے تقریبات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس میں والدین ایک اچھے داماد کے حصول کی امید میں بیٹیوں کی تعریف اور توصیفی مکالموں کے ساتھ اس امید پر سدھیر سے

متعارف کراتے تھے کہ شاید سدھیران کی طرف متوجہ ہو جائے اور وہ انہیں پسند کر لے۔
لڑکیاں تین قسم کی تھیں..... ایک تو شرمائی لجائی اور سکڑی سمٹی سی کہ شاید سدھیر کو ان کی حیا متاثر کر دے۔

دوسری لباس اور اپنی نیم عریانی سے سدھیر کو چارہ ڈالتی تھیں..... ان کا لباس اس قدر رنگ و چست اور بدن سے جو تک کی طرح چمٹا ہوتا تھا کہ وہ بے لباس سی دکھائی دیتی تھی..... ان کے جسم کے دلاؤ ویز خطوط اور عضو بے نیام تلوار کی مانند ہوتے تھے..... ان لڑکیوں کا خیال تھا کہ آج کے مرد نہ صرف گوری رنگت..... چہرے کی خوب صورتی ہی کو نہیں بلکہ خدو خال کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں..... یہ بات غلط بھی نہ تھی..... لڑکیوں کے ہجیان خیز جسمانی نشیب و فراز ایسا جادو ہے جو مردوں کو اسیر بنا دیتا ہے..... بازاروں، سرراہ اور تقریبات میں مردوں اور جوان لڑکوں کا ان کا بدن ندیدوں اور بھوکے بھیڑیوں کی طرح گھورتا یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ جسمانی کشش دلوں پر بجلی گراتی ہے۔

تیسری قسم زیادہ ہمت اور بے باک قسم کی بولڈ لڑکیاں براہ راست ہی سدھیر سے بغیر کسی وسیلے کے بغیر ضرورت سے زیادہ بے تکلفی تک کے سارے مراحل طے کر لیتی تھیں..... سدھیر چوں کہ امریکہ اور یورپ کی خاک چھان چکا تھا۔ وہاں کے معاشرے ماحول اور تہذیب سے قریب تھا..... وہاں کی لڑکیاں دلی اور جسمانی معاملات میں پہل کرتی تھیں۔ وہاں یہ کوئی معیوب بات نہ تھی..... تنہائی کے مواقع پر وہ کسی لڑکی سے من مانی کرتا تو وہ تعرض کرنے کے بجائے خود سپردگی سے پیش آتی تھیں..... سدھیر نے ایسی دو ایک لڑکیوں کو فتح بھی کر لیا تھا۔ ان سے کوئی معاملہ طے کئے بغیر.....

بستی کی ایک لڑکی کی شادی تھی۔ مہندی کی تقریب میں اسے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ دلہن کی ماں نے سدھیر سے پوچھا۔

”اب تک تم بہت ساری لڑکیوں کو دیکھ چکے، مل اور بات کر چکے ہو..... کیا کوئی لڑکی پسند آئی تمہیں.....؟“

سدھیر کا شادی کر کے گھر بسانے کا ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ سنجیدہ ہوا تھا..... یورپ میں اکثر شادی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑتے..... وہاں شادی کے بغیر بھی میاں بیوی کی طرح زندگی گزاری جاتی تھی..... وہ یہاں شادی کرنے نہیں آیا تھا..... اس لئے آیا تھا کہ مکان فروخت کر کے اور بستی کی کچھ لڑکیوں اور عورتوں سے دل بہلا کر واپس چلا جائے۔ بقیہ زندگی وہاں گزار دے..... عورت کی لت اسے اس بستی کی ایک شادی شدہ عورت شانتی نے لگا لی تھی۔ شانتی

نے نہ جانے اس پر کیا جادو کیا..... ایسا اسیر بنایا تھا کہ وہ لڑکیوں کو بھول گیا۔ ملازمت پر جانے تک وہ اسی کا ہو کر رہا..... اس کے نزدیک شانتی بڑی دکھی عورت تھی۔ اس کا شوہر ظالم و جاہر قسم کا تھا۔

اب وہ اپنی ساری زندگی ہندوستان سے باہر گزار دینا چاہتا تھا۔ اس لئے کہ وہاں کی زندگی بڑی حسین، خواب ناک اور ہر طرح سے رنگین تھی۔ سب سے بڑھ کر ہر قیود سے آزاد..... وہ یہاں رہ کر شادی کر کے بچے پیدا کر کے جھنجھٹ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ سمبندھ نہیں تھا بلکہ زنداں تھا..... اس نے کسی پر یہ خیالات ظاہر نہیں کئے تھے۔ کیوں کہ وہ لڑکیوں اور عورتوں کو فریب میں رکھ کر اور سبز باغ دکھا کر جی بھر کے کھیل کر ایک دن گدھے کے سینگ کی طرح غائب ہو جانا چاہتا تھا۔

وہ آٹھ برس کے بعد اپنے وطن واپس آیا تو اس نے دیکھا اور محسوس کیا کہ..... یہاں کے معاشرے میں بڑی تیزی سے تبدیلیاں آگئی ہیں..... کل اور آج کی لڑکیوں میں بڑا فرق آ گیا ہے..... آج ہندوستان کی لڑکیاں اور عورتیں اندھا دھند بھاگ رہی ہیں۔ سراب کے پیچھے..... اسے یہاں کی لڑکیاں اور عورتیں بہت پسند تھیں..... سانولی سلونی..... نمکین..... گندی رنگت اور روغنی جلد کی..... گوری رنگت سے اس کا دل بھر گیا تھا..... وہ وہاں بھی گوری لڑکیوں کے بجائے ایسی لڑکیوں پر توجہ دیتا تھا۔ اکثر ایسی لڑکیاں حالات سے سمجھوتا کر کے زندگی گزار رہی تھیں۔

”ابھی تک کوئی پسند نہیں آئی اور نہ ہی ناپسند..... سبھی لڑکیاں اچھی اور خوب صورت ہیں.....“ اس نے جواب دیا۔

”پھر مسئلہ کیا ہے.....؟“ دلہن کی ماں نے کہا۔ ”اس طرح تو تم کبھی کوئی لڑکی پسند ہی نہ کر سکو۔ درمیان میں ٹکے رہو گے۔“

”مسلکہ یہ ہے کہ میرے لئے انتخاب مشکل ہو رہا ہے..... کوشش کروں گا کہ جلد ہی کسی لڑکی کا انتخاب کر لوں.....“

”میری بیٹی کی ایک سہیلی ہے..... وہ بہت ہی حسین ہے..... بستی میں کوئی لڑکی کسی بھی لحاظ سے اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔“

دلہن کی ماں نے کہا۔ ”وہ ابھی آنے والی ہے..... اسے دیکھتے ہی تم فوراً ہی پسند کر لو گے..... اتفاق سے اس نے آج تک کسی لڑکے اور رشتے کو پسند نہیں کیا..... شاید وہ تمہیں پسند کر لے.....“

دلہن کی ماں نے اپنی بات ختم نہیں کی تھی کہ ایک لڑکی اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ اس لڑکی کی

جانب اشارہ کرتی ہوئی بولی۔ ”لودیکھو وہ لڑکی آگئی۔“
وہ لڑکی دلہن کی ماں کے پاس آ کر رکی اور اس نے نمسکار کیا تو وہ بولی۔ ”سدھیر اس سے ملو۔۔۔۔۔ یہ پدمنی ہے۔“

سدھیر اسے دیکھتے ہی اس پر ریشہ طغی ہو گیا۔۔۔۔۔ وہ یہ کہہ کر لڑکی کا داغ خراب کرنا نہیں چاہتا تھا کہ۔۔۔۔۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی حسین و جمیل لڑکی نہیں دیکھی۔۔۔۔۔ حقیقتاً اس نے اتنی حسین لڑکی نہیں تھی۔ بستی میں اور اس تقریب میں جتنی لڑکیاں موجود تھیں وہ ان سب سے زیادہ حسین تھی۔۔۔۔۔ جتنی حسین تھی اتنی ہی پرکشش بھی۔۔۔۔۔

”تم نے پدمنی کو پہچانا نہیں۔۔۔۔۔؟“ دلہن کی ماں حیرت سے بولی۔ ”تم اسے اس طرح دیکھ رہے ہو جیسے اس سے تمہاری پہلی ملاقات ہو۔۔۔۔۔ جب کہ پدمنی نے تمہیں پہچان لیا ہے۔۔۔۔۔ میں تمہیں یہ بتا دوں کہ یہ تمہاری بچپن کی دوست ہے۔۔۔۔۔ تم اس کے ساتھ کھیلے رہے ہو۔۔۔۔۔ عجیب سی بات یہ ہے کہ پدمنی کو پہچان نہ سکے۔۔۔۔۔“

وہ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ کیوں کہ کچھ مہمان اندر داخل ہو رہے تھے۔ دلہن کی ماں کو ان کی سواگت کرنی تھی۔۔۔۔۔ سدھیر حیرت سے اس لڑکی کو دیکھتا رہا۔ جسے اس نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔۔۔۔۔ وہ کوئی بیس تیس برس بعد تو نہیں آیا تھا۔۔۔۔۔ آٹھ برس بعد آیا تھا۔۔۔۔۔ چالیس برس کے بعد بھی آتا تو اسے پہلی ہی نظر میں پہچان لیتا۔۔۔۔۔ کیوں کہ یہ غیر معمولی حسین تھی۔۔۔۔۔ ایسی حسین لڑکیاں ذہن پر چھا جاتی ہیں تو وہ کبھی نہیں اترتیں۔۔۔۔۔ اور پھر بچپن میں وہ اس کا دوست اور ساتھی رہ چکا تھا۔۔۔۔۔ بستی میں پدمنی نام کی دو تین لڑکیاں تھیں۔۔۔۔۔ اس تعارف نے اسے عجیب سی الجھن میں ڈال دیا تھا۔

سدھیر کو اپنی یادداشت اور قوت حافظہ پر بھروسہ تھا۔۔۔۔۔ وہ اپنی بستی کے کسی فرد کو نئی بھولا تھا۔۔۔۔۔ بستی کے لوگ ایک خاندان کی طرح تھے۔۔۔۔۔ ہر کسی کے دکھ درد میں کام آتے تھے اور خوشیوں میں شریک ہوتے تھے۔

پدمنی اس کی الجھن اور حیرانی پر زیر لب مسکرا رہی تھی اور اس کی حسین بڑی بڑی آنکھوں میں ایک چمک سی کوئد رہی تھی۔ اس کے رخساروں کے گلابی پن میں حیا کا رنگ گھل گیا تو وہ اور حسین دکھائی دینے لگی۔۔۔۔۔ پھر اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں شرارت عود آئی۔ وہ اس بات کی منتظر تھی کہ سدھیر اپنی شکست کا اعتراف کرے۔۔۔۔۔ سدھیر نے بڑی کوشش کی۔۔۔۔۔ ذہن کے تمام دریچے کھول کر یادداشت کے نہاں خانوں میں جھانک لیا۔۔۔۔۔ انہیں کھنگال لیا۔ آخر کار اسے اپنی ہار ماننا پڑی۔

”میرے لئے بڑی شرم کی بات ہے کہ میری دوست کا حسین چہرہ یاد نہیں آ رہا ہے جو بچپن کی ساتھی۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ میری یادداشت قابل اعتماد نہیں رہی۔۔۔۔۔“ سدھیر نے نفرت سے کہا۔ ”تم نے مجھے پہچان لیا۔۔۔۔۔“

”آٹھ برس۔۔۔۔۔ صرف آٹھ برس۔۔۔۔۔ یہ کوئی زیادہ لمبا عرصہ نہیں ہوتا ہے۔“ پدمنی شوخی سے بولی۔ ”آٹھ برس پہلے کی بات ہے یاد کرو جب تم جہاز راں کمپنی میں ملازمت کے لئے گئے تھے۔۔۔۔۔ اس سے پہلے میں تمہارے گھر کے قریب ہی رہتی تھی۔۔۔۔۔ اور کوئی پانچ برس تک ہم دونوں ہم جماعت بھی رہے ہیں۔۔۔۔۔ ساتھ اسکول بھی جاتے تھے۔

”پدمنی۔۔۔۔۔!“ سدھیر حیرت سے اچھل پڑا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ ”تم۔۔۔۔۔ پدمنی ہو۔۔۔۔۔؟ وہی پدمنی جسے ہم۔۔۔۔۔“

وہ کہتے کہتے یک لخت رک گیا۔ کیوں کہ بچپن کی ایک بات اس کی زبان پر آتے آتے رہ گئی۔ اس کے کہنے سے دل آزاری ہوتی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ رک کیوں گئے۔۔۔۔۔“ پدمنی دل کش انداز سے مسکرائی۔ ”میں وہی پدمنی ہوں جسے تم نے کالی چڑیل کا نام دیا تھا۔۔۔۔۔ پدمنی چڑیل۔۔۔۔۔ تمہارا دیا ہوا نام میرے نام کا جزو بن گیا تھا۔۔۔۔۔“

سدھیر اس قدر بھونچکا ہوا کہ کچھ بول نہ سکا۔ لحوں تک اس پر سکتہ طاری رہا۔۔۔۔۔ وہ باوجود کوشش کہ یہ بھی نہ کہہ سکا کہ وہ بچپن کی بات تھی۔ مذاق تھا۔۔۔۔۔ حماقت تھی۔۔۔۔۔ اور اس حوالے سے وہ سخت شرمندہ ہے۔

سدھیر کو یہ بات بہت اچھی طرح سے یاد تھی کہ کلاس میں پدمنی کو کوئی پسند نہیں کرتا تھا اس لئے کہ وہ سب سے بد صورت تھی۔ اس بد صورتی کے باعث لڑکے اس سے دور بھاگتے تھے اور بات تک کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔۔۔۔۔ یوں تو اس کے کئی نام تھے۔۔۔۔۔ کوی۔۔۔۔۔ جمنی۔۔۔۔۔ کلو۔۔۔۔۔ کلوہی۔۔۔۔۔ لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے چڑیل کہے۔۔۔۔۔ جب اس نے پدمنی کا نام کالی چڑیل رکھا تو وہ صرف چڑیل کے نام سے مشہور ہو گئی۔۔۔۔۔ کیوں کہ چڑیل کالی ہی ہوتی تھی۔۔۔۔۔ کلاس میں پدمنی نام کی دو لڑکیاں اور بھی تھیں۔۔۔۔۔ وہ خاصی خوب صورت تھیں اس لئے پدمنی کو باقاعدہ چڑیل کے نام سے پکارا جانے لگا۔

آخر ایک روز اس کی ہم جماعت لڑکی نے حیرت سے کہا۔ ”پدمنی۔۔۔۔۔! جب تمہیں چڑیل کہہ کر پکارا جاتا ہے تو کیا غصہ نہیں آتا۔۔۔۔۔؟ تم بالکل چڑتی نہیں ہو۔۔۔۔۔ بلکہ ہنسی رہتی ہو۔۔۔۔۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو ان کی خبر لیتی۔۔۔۔۔“

پدمنی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ اسے مکان کی چھت پر لے آئی۔ چھت پر ایک خواب تھی۔ یہاں کوئی نہ تھا۔ یہ گوشہ تنہائی بہت پرسکون تھا۔ دونوں سکون اور اطمینان اور بے تکلفی سے باتیں کر سکتے تھے۔

”پدمنی..... جب میں ملازمت پر گیا تھا تم ایک نوخیز عمر کی لڑکی تھیں.....“ اس نے پدمنی کا ہاتھ تھام کر صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

”میں اس وقت پندرہ برس کی عمر کی تھی اور دس برسوں کے بعد نوخیز نظر آتی ہوں تو اس میں حیرانی کی کون سی بات ہے.....؟“ وہ شوخی سے کہنے لگی۔ ”تمہیں حیرانی تو اس بات پر ہونی چاہئے کہ میرے لمبے لمبے دانت کیا ہوئے..... میرے چہرے کے بد نما داغ کہاں گئے.....؟ میری ایک دم سیاہ رنگت..... دودھیا رنگت کیسے ہو گئی.....؟ میری صورت میں دو بڑی خوشگوار تہیلیاں کیسے آ گئیں..... میں خوش گوار اس لئے کہہ رہی ہوں کہ یہ سوال خود تم نے کیا ہے..... یعنی یہ کہ میں چڑیل سے پری کیسے بن گئی.....؟“

”اب مجھے اپنے سوال کے جواب کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔“ سدھیر نے کہا۔ ”اس لئے کہ اب تم ایک لاجواب شے ہو.....“

”نہیں..... سدھیر.....! میں اپنی خوب صورتی کا معمر حل کرنا اور تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ اپنا چہرہ اور رنگت کیسے بدل لی؟“ پدمنی سامنے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”میں یہ بات آخری سانس تک نہیں بھول سکتی کہ مجھے میری بد صورتی کا احساس دلانے والے پہلے شخص تم تھے اور اس انقلاب کے ذمے دار سب سے زیادہ تم ہو.....“ وہ اصل بات چھپانے لگی۔ اصل بات وہ کسی کو بتانا اور اسے اعتماد میں لینا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کہے جا رہی تھی۔ ”زندگی کوئی فلم نہیں ہے جس میں کوئی رحم دل جادوگر کسی بد شکل لڑکی کو جادو کے زور سے حسین بنادے اور اس بد نصیب کے دن پھر جائیں..... میں بد صورت تھی..... کوئی عورت بد صورتی پسند نہیں کرتی ہے۔ اسے اپنی توہن اور ذلت سمجھتی ہے..... مجھے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر خوف آتا تھا..... لوگ جو مجھے دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے اور جیسے ہی ان کی نظر میرے چہرے پر پڑتی تھی اور ان کے چہرے اور آنکھوں میں میری بد صورتی سے جو تاثرات ابھرتے تھے انہیں دیکھ کر میرے دل پر آرے چل جاتے تھے..... مجھے کسی جادوگر کے خواب میں بھی ملنے کی امید نہیں تھی..... یوں تو وہ بھی زندہ رہتے ہیں جو خوب صورت نہیں ہوتے..... کوئی اور مجھے بد صورتی کا طعنہ دیتا تو میں اس کا سر پھاڑ دیتی۔ تمہیں اور ہم جماعت لڑکوں اور لڑکیوں کو برداشت کرتی تھی..... مگر میں اپنی تقدیر پر صابر و شاکر رہتی اور اس صورت کے ساتھ زندگی گزارتی جو مجھے ایثار نے میرے نصیب میں عطا کی تھی..... کہتے ہیں کہ حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے.....

”بات یہ ہے بھلا.....!“ پدمنی نے جواب دیا تھا۔ ”کتوں کا کام بھونکنا ہے..... کتے بھونکتے ہیں..... کارواں بڑھتا ہی جاتا ہے..... آخر یہ کتے کب تک بھونکتے رہیں گے..... میں اس لئے نہیں چڑتی اور نہ غصے میں آتی ہوں کہ یہ بھونکتے بھونکتے خاموش ہو جائیں گے۔“

یہ حقیقت ہے کہ چڑنے والے کو زیادہ چڑایا جاتا ہے۔ تنگ کیا جاتا ہے۔ آخر کار ایک دن ان لوگوں نے اسے چڑیل کہنا بند کر دیا۔

ان لوگوں کو اس بات کا علم ہو گیا تھا..... پدمنی انہیں کتوں کی مانند سمجھتی ہے۔

یہ کم سے کم دس برس پہلے کی بات تھی..... سدھیر حیران تھا کہ ان دس برسوں میں اتنا بڑا انقلاب کیسے آ گیا..... پدمنی کی رنگت تو بے کی طرح تھی..... گہری کالی کلوٹی..... وقت نے ایک انتہائی بد صورت لڑکی کو کس طرح اس قدر حسین بنادیا..... صرف اس کے بال..... پلکیں اور آنکھیں کالی تھیں..... شباب کا حسن تو اپنی جگہ تھا لیکن صورت میں تبدیلی ناقابل یقین تھی.....

اسے وہ دن یاد تھے جب پدمنی کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ اسے چوم لے..... جب وہ ملازمت پر جا رہا تھا۔ رات کے وقت پدمنی اس کے گھر میں گھس آئی تھی اور خود سپردگی کی حالت میں اس کے چہرے پر چھ سات منٹ تک جھکی رہی..... اس کی خواہش تھی کہ سدھیر حد سے تجاوز کر جائے..... جب کہ وہ آزادی کی حالت میں تھی..... وہ لمحات اس کے لئے بڑے کرب ناک تھے..... اس نے کس طرح پدمنی سے نجات پائی یہ اس کا دل جانتا تھا..... لیکن آج وہ برعکس تھی..... پدمنی کی خوب صورتی ایک معمرہ تھا۔ وہ اسے حل کرنا چاہتا تھا۔

”تم کلاس میں مجھے سب سے زیادہ پریشان کرتے..... چھیڑتے اور میرے بال کھینچتے تھے۔“ پدمنی بولی۔ ”تمہیں یاد ہے.....؟“

”شاید اس لئے تمہارے بال اتنے لمبے اور خوب صورت ہو گئے ہیں.....“ سدھیر چونکا اور خفت سے ہنس کر بولا۔ ”میں تو بھگوان کی کارگیری پر حیران ہوں کہ جس نے تمہاری کسی نیکی سے متاثر ہو کر اس کے کارن ایک چڑیل سے پری بنادیا..... تمہیں حسن کی ایسی دولت سے مالا مال کر دیا جس پر تم جتنا نازاں کرو گے.....“

سدھیر نے دیکھا کہ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ بڑھتا جا رہا ہے۔ پدمنی مہمانوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ اس نے کہا۔

”پدمنی.....! باتیں کرنے کے لئے مجھے یہ جگہ مناسب نہیں لگتی ہے..... کیوں کہ یہاں بہت سے لوگ اجنبی ہیں..... ہم بچپن کے دوست ہیں اور مجھے دس برس پرانی باتیں کرنی ہیں.....؟ آؤ ہم گوشہ تنہائی تلاش کرتے ہیں.....“

لیکن تم تو حسین صورت کے قائل تھے..... چنانچہ میں نے اپنی صورت اور رنگت بدل لی..... یہ ممکن تھا کہ صورت بدلے بغیر بھی کوئی مجھے پسند کر لیتا..... جوانی کے خمار اور جو بن نے میری بد صورتی میں قدرے کمی کردی اور میرے جسم کو اتنا ہیجان خیز بنا دیا کہ مردوں کے دلوں پر بجلی گر جاتی تھی۔ لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ مجھے کوئی اور پسند کرے۔ کیوں کہ میں اس دنیا میں صرف تمہیں پسند کرتی تھی..... لیکن تم نے مجھے بد صورت سمجھ کر اپنے قریب آنے نہیں دیا بلکہ مجھے نفرت اور حقارت سے ٹھکراتے رہے..... اور تم نے مجھے دھتکار دیا۔“

سدھیر خاموشی سے اس کی باتیں سنتا حیرت زدہ اور پشیمان بیٹھا رہا۔ ”وہ میری نادانی تھی.....“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”واقعی تمہاری نادانی تھی جو ایک ایسی شادی شدہ عورت کے جال میں پھنس گئے تھے جس کا پتی ناکارہ ہو چکا تھا.....“ پدمی کہنے لگی۔ ”اس نے تمہیں ایسا اسیر بنالیا تھا کہ اس کا جال توڑ کر نکل نہیں سکتے تھے..... ملازمت کی وجہ سے تم کو جانا پڑ گیا تھا..... صرف ایک ہی نہیں بلکہ میرے والدین کو میری بد صورتی کا شدید احساس تھا میں ان کے لئے ایک رستا ہوا پھوڑا تھی..... میرا باپ مجھ سے زیادہ میری بڑی بہن کو بہت چاہتا تھا۔ اس کے رویے میں فرق اتنا نمایاں تھا کہ میں چھپ چھپ کر پھوٹ پھوٹ کر روتی تھی اور سوچتی تھی کہ میری بد صورتی میں کیا میرا اپنا دوش ہے.....؟ کیا میں نے بد صورتی کہیں سے مول لی ہے..... یہ بھگوان میں کیسا بے رحم اور ظالم ہے۔ اس نے مجھے اتنا بد صورت پیدا کیوں کیا.....؟ اسے کیا تکلیف اور ضرورت تھی.....؟ میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہوتا تھا..... بس میں اپنے نصیب کو دوش دیتی..... کربھی کیا سکتی تھی..... میری بہن ایک حادثے میں چل بسی یہ تم بھی جاننے ہو..... میری ماں میں میرے لئے مانتا موجود ہی نہیں تھی..... وہ کہتی تھی کہ میں اس کی بیٹی ہی نہیں لگتی۔“

میرے باپ نے یہ کہہ کر اس کا خوف دور کر دیا کہ یہ بد صورت لڑکی اس کے باپ کی سزا ہے۔ جب بھی وہ کسی بڑے شہر کا روبرو بار کے سلسلے میں جاتا ہے تو برائی کے دلدل میں گھس جاتا ہے۔ شاید ماں کا یہ خیال تھا کہ چون کہ وہ بہت حسین ہے۔ پہلی بیٹی بھی اس کی طرح حسین ہے۔ دوسری اولاد دیرینہ جو ہوگی وہ اس کی طرح ہوگی..... میں بد صورت پیدا ہوئی تو اس کا ارمان خاک میں مل گیا۔ وہ مجھ سے بہت خار کھاتی اور جلتی بھی تھی۔ تمہارے جانے کے بعد میں تعلیم سے فارغ ہوئی تو میرے والدین کا ڈی کے ایک حادثے میں دنیا سے پدھار گئے۔

مجھے لاکھوں کی جائیداد اور رقم بھی مل گئی۔ میرے پاس بے پناہ دولت تھی لیکن خوب صورتی نہ تھی۔ میرے نزدیک اصل دولت خوب صورتی تھی..... بد صورتی میرے لئے ایک عذاب اور اذیت

تھی۔ بلکہ موت تھی..... کسی نے بتایا کہ..... لندن میں ایسے بیوٹی سیلون اور سرجری متعدد ماہرین ہیں جو مجھے خوب صورت بنا سکتے ہیں۔ میں نے مزید تعلیم حاصل کرنے کا خیال دل سے نکال دیا۔ پھر میں لندن چلی گئی..... چہرے کی کامیاب سرجری کے بعد ایک بیوٹی سیلون والوں نے میرے جسم کی رنگت بھی بدل دی اور چہرے کی گوری رنگت کردی۔ یہ کسی معجزے سے کم نہ تھا..... اب یہ بتاؤ کہ کیا اب میں تمہارے قائل قبول ہوں..... کیا میں پیدا ہوئی حسین لڑکی نہیں لگتی ہوں.....؟ اب میرا بدن بھی گورا اور پرکشش ہے۔“

”تم واقعی بلا کی حسین اور قیامت ہو گئی ہو.....“ سدھیر نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر قریب کر لیا۔ پھر ایک طویل بوسے کے بعد اس نے پدمی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم نے یہ سب کچھ میری خاطر کیا ہے تو دنیا میں میرے لئے تم سے حسین عورت کوئی نہیں ہے۔ مجھے اپنی زیادتیوں کا احساس ہے..... اور میں اپنی مہر زیادتی کا ازالہ کر دوں گا.....“

☆.....☆.....☆

پدمی کو اس بات سے بڑی خوشی تھی کہ..... سدھیر نے اس کی ہر بات کا یقین کر لیا تھا اور اس سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

اس نے جو خوب صورتی اور گوری رنگت حاصل کی تھی اس کی اصل کہانی اور تھی اور ایک راز تھا جو اس سے صرف ایک شخص واقف تھا۔

پدمی جب جوان جوڑوں کو دیکھتی اور ایسے نظارے بھی جو اس کے دل کو برماتے..... جب میاں بیوی اور بستی کی لڑکیوں کو دیرانوں اور تنہائیوں میں لڑکوں کے ساتھ ہم آغوش اور جذبات کی رو میں دیکھتی تو اس کے جذبات بھڑک اٹھتے تھے..... اس کا دل بھی کرتا تھا کہ کوئی مرد یا لڑکا اسے اپنے بازوؤں میں قید کر لے اور اس کے ارمان پورے کر دے..... کوئی اس کے قریب آنے کو تیار نہ ہوتا تھا..... جب کہ وہ انہیں رقم کا لالچ بھی دیتی تھی۔

پھر ایک روز ایسا ہوا کہ فلم کی کہانی کی طرح ایک جادوگر اس کی زندگی میں آیا۔ وہ رحم دل نہ تھا بلکہ کاروباری تھا۔ دید بھی تھا۔ ہوا یہ تھا کہ بستی کے عقب میں جھیل تھی۔ وہ نہانے کے لئے گئی۔ جھیل پر اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ کوئی ہوتا بھی تو اس کے لئے فرق کیا پڑتا..... اس نے اپنے کپڑے اتار کر خشک جگہ پر ایک پتھر کے نیچے جا پھری۔ بڑی دیر تک آزادی اور سکون اور اطمینان سے نہاتی اور تیرتی رہی..... پھر تھک کر وہ پانی سے نکل آئی۔ تب اس نے ایک دراز قد، خوب صورت اور وجہہ مرد کو اس کی سمت آتے دیکھا..... وہ اسے کچھ عجیب و غریب سا لگا۔ کیوں کہ اس کا حلیہ عام مردوں سے مختلف تھا۔ وہ ڈری اور سبھی نہیں..... وہ بے خونی سے کھڑی اس کے قریب آنے کا انتظار کرتی

رہی..... اس کا یہ خیال تھا کہ وہ مرد اسے اکیلی اور فطری حالت میں پا کر خود پر قابو نہ پاسکے گا..... اس کی دیرینہ خواہش اور آرزو پوری ہو جائے گی۔

مرد اس کے سامنے آ کر کھڑا ہوا تو اس خیال اور خوشی سے اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ وہ کسی باز کی طرح اس پر بھٹ پڑے گا۔ صرف اس کا چہرہ بد صورت تھا..... بدن تو نہیں تھا..... گداز جسم جس کے انگ انگ سے مستی ابلی پڑی تھی..... اور پھر یہاں تنہائی تھی۔ خاموشی تھی اور کسی کے آنے کا کوئی امکان نہیں تھا..... نہ ہی اس نے اپنے آپ کو چھپانے اور بھاگ جانے کی کوئی کوشش کی تھی۔ ایک منٹ..... دو منٹ..... پھر دس منٹ گزر گئے..... پدمنی کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے صدیاں گزر رہی ہوں۔

اس مرد نے نہ تو اسے دبوچا..... اور نہ ہی قابو میں کر کے بے بس کیا تھا۔

بس ایک تماشائی..... گاہک..... خریدار کی طرح کھڑا اسے گہری نظروں سے گھورتا اور پر سے نیچے تک اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی تصویر یا مجسمہ دیکھ رہا ہو۔ نظروں میں اس کے خدو خال جذب کر رہا ہو۔

پھر وہ پدمنی کے اور قریب آیا۔ پھر اس کی گیمیر آواز نے گہرے سکوت کی دیوار کو گرا دیا۔

”تمہارا نام پدمنی ہے.....؟“

”ہاں.....“ پدمنی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس اجنبی کی زبان سے اپنا نام سن کر اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔

”تم اس ہستی کی سب سے بد صورت..... بے کشش اور بد نصیب لڑکی ہو.....؟“ اجنبی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”ہاں.....“ پدمنی کو کوئی دکھ اور دل آزاری نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ وہ اس کی عادی ہو چکی تھی۔

”تم اس وقت یہ سوچ رہی ہو کہ میں تمہیں قابو میں کر کے بے بس کر دوں گا.....“

”ہاں.....“ پدمنی نے اعتراف کیا۔ ”لیکن تم نے اس بات کا اعزازہ کیسے لگایا.....؟“

”ایسے کہ تم مجھے اپنی طرف آتا دیکھ کر خوف زدہ، سر اسیمہ اور ہراساں نہیں ہوئیں..... جب کہ تم بے لباس ہو..... تمہارا بدن پانی سے شرابور ہو رہا ہے..... تم نے نہ تو اپنے آپ کو چھپایا اور نہ بھاگنے کی کوشش کی..... جب کہ یہاں تنہائی ہے اور ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے..... یہ جانتے ہوئے کہ تمہیں اس حالت میں دیکھ کر ایک مرد بہک سکتا ہے..... درندہ بن سکتا ہے..... تم یہ چاہتی ہونا کہ تمہاری آرزو میں پوری کر دوں۔“

”ہاں..... ہاں.....“ پدمنی نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ ”پھر تم مجھے کھڑے کیوں تک رہے ہو..... میری تو ہین کیوں کر رہے ہو؟“

”ایسا کس لئے چاہتی ہو.....؟“ اس نے پدمنی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تمہاری زندگی میں کوئی مرد نہیں آیا.....؟“

”اس لئے چاہتی ہوں کہ..... میری زندگی میں کوئی مرد نہیں آیا..... صرف میرا چہرہ ہی بد نما ہے..... جسم تو نہیں..... میں نے جب کبھی کسی مرد اور لڑکے کو اپنے آپ کو پیش کیا اس نے مجھے دھکا کر دیا..... میری تو ہین کر دی..... عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے اپنی تو ہین نہیں..... میری احساس محرومی رات دن مجھے کسی زہریلی ناگن کی طرح ڈستی رہتی ہے.....“

”تم نے بڑی سچائی سے اپنے بارے میں بتا دیا.....“ اجنبی نے کہا۔ ”تم ایک صاف گو اور سچی لڑکی ہو.....؟“

”لیکن تم ہو کون.....؟ تم میرا نام اور میرے بارے میں سب کچھ کیسے جانتے ہو..... میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہی ہوں..... کیا تمہیں کسی نے میرے بارے میں اس قدر تفصیل سے بتایا ہے.....“ پدمنی حیرت سے بولی۔

”میں ایک جادوگر ہوں.....“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نے تمہیں جان لیا۔ ایک کتاب کی طرح پڑھ لیا۔“

”تم جادوگر ہو.....“ پدمنی حیرت اور خوشی سے اچھل پڑی۔ ”کیا تم مجھے جادو کے زور سے خوبصورت بنا سکتے ہو.....؟“

”کیوں نہیں..... میں دنیا میں واحد جادوگر ہوں جو بد صورت کو خوب صورت، بوڑھی عورت کو نوجوان لڑکی..... بوڑھے مرد کو نوجوان..... انہیں ایسی شکتی، توانائی اور جاہت دیتا ہوں کہ وہ کبھی اس سے محروم نہیں ہوتے ہیں..... جب بوڑھی عورتیں نوجوان دو شیزہ بنتی ہیں تو ان کی جوانی ہی سدا بہار نہیں ہوتی ہے بلکہ جسم میں بھی بے پناہ پرکشش بن جاتا..... خوب صورت کو بھی بد صورت بناتا ہوں..... مجھے ہر چیز پر ملکہ حاصل ہے.....“

”تو پھر..... مجھے بھی خوب صورت بنا دو..... اتنی حسین اور پرکشش کہ جوان مرد لڑکے میرے حصول کے لئے ترپیں۔“ وہ بولی۔

”لیکن میری ایک شرط ہے.....“ جادوگر نے کاروباری لہجے میں کہا۔ ”اسے پوری کرو گی تو پھر میں تمہاری خواہش پوری کر دوں گا۔“

”میں تمہاری شرط پوری کرنے کو تیار ہوں.....؟“ پدمنی نے کہا۔ ”کیا تمہیں اس کے عوض رقم

”رقم..... ایک لاکھ سے کم نہیں لوں گا۔“ جادوگر کہنے لگا۔ ”یہ عمل دس سے بارہ دنوں کا ہے..... جس روز سے اس عمل کا آغاز ہوگا اس روز سے عمل ختم ہونے تک تمہیں میرے ساتھ رہنا اور مجھے ہر طرح سے خوش کرتے رہنا ہوگا..... کسی بات سے انکار نہیں کروگی..... یہ بات اچھی طرح سے سوچ لو..... یہ کڑی شرط ہے۔“

”میں ایک لاکھ دے دوں گی..... دس روز کیا..... بیس روز تک تمہیں ہر طرح سے خوش کرتی رہوں گی۔“ پدمنی نے کہا۔ ”لیکن اتنے دن کس لئے.....؟ جادو کے زور لمحے میں مجھے ٹھیک نہیں کر سکتے کیا.....“

”جادو کے زور سے تمہیں حسین ابھی اور اسی وقت بنا سکتا ہوں..... لیکن وہ دیر پا نہیں ہوتا ہے..... نہ ہوگا..... میں صرف جادو گر ہی نہیں بلکہ دید بھی ہوں..... میں ایک مرہم تیار کروں گا..... اس مرہم کی تم پر دن میں چار مرتبہ دس بارہ دن تک مالش کروں گا..... نہ صرف چہرے بلکہ پورے جسم پر..... اس کے علاوہ میں منٹروں کی جاپ بھی کروں گا..... پھر تمہارا حسن عارضی نہیں ہوگا..... تمہارے چہرے کے خدو خال اور اس کی رنگت اور جسم کی رنگت اور تناسب ساخت قیامت خیز بنانے کے لئے یہ عمل کرنا ہوتا ہے۔“

”مجھے منظور ہے۔“ پدمنی نے خوش ہو کر اس کا شکریہ ادا کیا..... جادوگر فلموں کے جادوگر کی طرح رحم دل تھا..... اس نے نہ تو کوئی تعرض کیا اور نہ ہی دھکا مارا..... مایوس بھی نہیں کیا..... تین دن کے بعد اس نے بستی والوں سے کہا کہ..... وہ چہرے کی سرجری اور رنگ گورا کرنے کے لئے لندن جا رہی ہے۔ پھر وہ جادوگر کے ساتھ اس کی بستی میں آ گئی۔ پہلے روز جب جادوگر نے اس کے چہرے اور پورے جسم پر جڑی بوٹیوں سے بنے ہوئے مرہم سے مالش کی تو..... پدمنی نے ذرا سافرق محسوس کیا۔ اس کے چہرے کی بد صورتی میں قدرے کمی ہوئی تھی۔

آئینے میں پدمنی نے اپنا چہرہ دیکھ کر خوش ہو کر پوچھا۔ ”یہ کس چیز کا مرہم ہے.....؟ کیا یہ جادوئی مرہم ہے.....؟“

”ہاں یہ طلسماتی مرہم ہے..... اس میں نایاب قسم کی جڑی بوٹیاں ہیں جو صرف آسام کے جنگلات میں پائی جاتی ہیں..... مصر کے جادوگر وہاں کی بوڑھی عورتوں کو غسل دیتے وقت یہ مرہم ملا دیتے تھے جس سے وہ نوجوان، سدا بہار اور کتواری دوشیزاؤں کی مثل ہو جاتی تھیں۔ مرہم کی مالش سے جسم پر کشش اور خوب صورت ہو جاتا تھا۔“

پدمنی دس بارہ دنوں کے بجائے بیس دن تک جادوگر کے ہاں رہی..... دس دنوں میں وہ

انتہائی حسین اور پرکشش ہو گئی تھی..... بد صورت، بے کش اور چڑیل کی مثل پدمنی کا وجود نہیں رہا تھا..... ایک پری جیسی پدمنی وجود میں آ گئی تھی۔ وہ جب تک یہی علاج کرواتی رہی۔ اس نے جادوگر کو بہت خوش کیا.....

جب وہ اپنی بستی میں آئی تو..... پوری بستی اسے دیکھ کر چوک پڑی..... کبھی حیران تھے۔ ان کے لئے ناقابل یقین بات تھی کہ گوری کیسے ہو گئی؟..... چہرے کی سرجری تو عام بات تھی جس سے چہرے کی بد صورتی دور ہو جاتی تھی..... لیکن گوری رنگت.....؟ اس نے بستی والوں کو بتایا کہ لندن میں رنگ گورا کرنے والی بیوی سیلون بھی ہیں۔ پیسہ ہو تو دنیا میں ہر چیز ممکن ہے۔

وہ مرد اور لڑکے جو اس سے بات بھی نہیں کرتے تھے اور اس کی شکل دیکھتے ہی دور بھاگتے اور کتر اجاتے اور دھکار دیتے تھے اب شہد کی مکھوں کی طرح بھن بھانے لگے تھے لیکن انہیں قریب آنے بھی نہیں دینی تھی اور انہیں دھکار دینی تھی۔

☆.....☆.....☆

کوئی ایک ہفتہ بعد شادی بڑی دھوم دھام اور رواجی انداز سے ہوئی..... سدھیر شادی سے دو دن پہلے تک اس الجھن میں مبتلا رہتا تھا کہ پدہنی اس قدر سے گوری کیسے ہوگئی..... چہرے کی سرجری اب کوئی بڑا کام یا مہارت کی بات نہیں رہی تھی..... لیکن دو دو دھیا رنگت دنیا کی کوئی بھی بیوٹی پارلر نہیں دے سکتی تھی..... پھر اس نے سوچا کہ وہ اس قدر حیران، پریشان اور الجھن میں مبتلا کیا ہے، اسے آم کھانے سے مطلب ہونا چاہئے جوڑ گفنے سے نہیں..... پدہنی دہن کے روپ میں اس قدر حسین ہوگئی تھی جو دیکھتا عیش عیش کر اٹھتا..... وہ لڑکے اور مرد اسے دہن کے روپ میں دیکھ کر بچھتا رہے تھے کہ انہوں نے اس سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا۔ پدہنی نے دل کھول کر خرچ کیا تھا..... سینکڑوں غریبوں کو تین دنوں تک تین وقت کھانا کھلایا تھا۔

پھر وہ دونوں مہنی مہنہ منانے کے لئے پرمسرت سفر پر شملہ روانہ ہوئے..... سدھیر کے لئے زندگی ایک مسلسل کام بآبی تھی اور خوشی کا احساس اور عورت اس کے لئے اجنبی نہیں تھی..... مگر پد منی کے لئے زندگی کا یہ دور پہلی بار حقیقی خوشیاں لے کر آیا تھا..... جادوگر کے ساتھ اس نے جو حقیقت گزارا تھا اس نے ایسی سچی خوشی محسوس نہیں کی تھی جو سدھیر کی رفاقت میں اسے ملی تھی۔

جادوگر نے اسے نہ تو دھوکا دیا اور بے وقوف بنایا..... جو وعدہ کیا وہ پورا کیا تھا..... اس کا ماضی محرومیوں اور ناکامیوں..... نا تمام مسرتوں اور خواہشات کے فریب کے سوا کچھ نہ تھا..... وہ حیران تھی کہ صورت اور رنگت میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آ سکتی ہے..... اندر سے اب بھی وہی تھی..... لیکن اس کا ظاہری حسن مستقبل کی خوشیوں کا ضامن بن گیا تھا اور اسے یقین آ گیا تھا کہ زندگی کی ہر خوشی

ہر پہلا حق ان کا ہے جو زیادہ خوب صورت اور بے پناہ کشش کے مالک ہوں۔

پدمنی کو ابتداء ہی سے پڑھنے کا شوق تھا..... اس لئے کہ کتابوں کی دنیا کے لوگ بہت اچھے تھے جو اس کی بد صورتی کا مذاق نہیں اڑاتے تھے زور کردار کے حسن کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ وہ رومانوی ناولوں سے بے زار ہو گئی تھی۔ اس لئے نہیں پڑھتی تھی یا اس نے پڑھنا بند کر دیا تھا اس میں محبت و جذبات کی افراتفری اور حسین ملاپ کی کہانیاں ہوتی تھیں جو اس کی احساس محرومی میں اضافہ کرتی تھیں..... اس نے خوف ناک، براسرار..... اورائی اور جن بھوتوں کی کہانیاں اور ناولوں کا سہرا لے لیا تھا۔ یہ کہانیاں اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ سوچتی..... ”کاش! وہ جادوگر کی ہوتی۔“ سدھیر کی فطرت اور اس کا ذوق و شوق اس کے برعکس تھا۔ کیوں کہ دنیا میں اسے چاہنے والے اتنے تھے کہ اس کا سارا وقت محفلوں میں گزر جاتا تھا اس کی مردانہ وجاہت کی دلکشی کے باعث لڑکیاں اس پر مرتی تھیں اور اس کے قرب کو ترستی تھیں۔ وہ انہیں پڑھتا تھا۔ چنانچہ اسے کتابیں پڑھنے کی نہ فرصت تھی اور نہ ضرورت..... سر و جا ان لڑکیوں میں سے تھی جن سے وہ بے حد متاثر تھا..... پدمنی کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی..... اس کے کاروبار سے ہونے والی آمدنی اس کی سالانہ تنخواہ سے کہیں زیادہ تھی۔

سدھیر نے وقت گزاری کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ وہ ایک لانچ مینی چل کر دو مہینے کے لئے کرائے پر لے لیتے ہیں اور سمندر کی سیر کا لطف اٹھاتے ہوئے دہائی تک ہوا آتے ہیں..... لیکن پدمنی کو پانی سے بہت ڈر لگتا تھا چنانچہ وہ سمندری سفر کے لئے تیار نہ ہوئی..... پھر اس نے کہ کیوں نہ ہوائی جہاز سے جاپان کی سیر و سیاحت کر آئیں..... پدمنی ہوائی حادثات سے بہت ڈرتی تھی۔ اس لئے اس نے ہوائی سفر سے بھی انکار کر دیا تھا۔ البتہ ٹرین کے سفر کے لئے تیار تھی۔

ہنی مون سے واپس گھر لوٹتے وقت سدھیر کو یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ..... پدمنی کے ماں باپ نے زندگی میں بیٹی کو محبت نہ دے کر اس کے ساتھ جو انصافی کی تھی انہوں نے اس کی تلخیوں کو ردی تھی اس کے لئے حویلی چھوڑ گئے تھے۔ جس میں ایک درجن ہی سبائی خواب گاہیں اور عیش و عشرت کے تمام لوازمات تھے۔ گھر کے عقب میں ایک بہت بڑا گیراج تھا جس میں بیک وقت چار شان دار گاڑیاں کھڑی تھیں..... شادی کے ایک ماہ بعد پدمنی نے اپنے شوہر کو شاہانہ طرز کی ایک مرسدیز پیش کی تھی وہ الگ تھی..... سدھیر چوں کہ انجینئر تھا چنانچہ اس نے گیراج کے ایک حصے میں اپنی ورکشاپ قائم کر لی اور تمام گاڑیوں کی مرمت اور دیکھ بھال خود کرنے لگا..... آخر کوئی نہ کوئی مصروفیت تو ہونی تھی۔

ہنی مون سے واپس آنے کے بعد جو دعوتوں کا سلسلہ شروع کیا تھا وہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہا

کا..... آئے دن حویلی کے سبزہ زار پر جشن کا سا گمان ہوتا تھا..... خود پدمنی..... ٹھیکیل، دراز قد..... وجہہ اسماٹ اور دل کش شخصیت کے مالک شوہر کو بڑے فخر سے لئے پھرتی تھی اور ہر ایک سے پر زور انداز سے تعارف کراتی تھی..... اور اس وقت یوں پیش کرتی تھی، جیسے سدھیر کوئی نادر روزگار شے ہو، جسے بڑی دشواریوں کے بعد پدمنی نے بڑی قیمت ادا کر کے حاصل کیا ہو..... یہ بات غلط بھی نہیں تھی.....

یہ سلسلہ زیادہ عرصے نہ چل سکا اور خود پدمنی بھی ان سے بے زار ہو گئی۔ چنانچہ سدھیر نے اسے سمجھایا کہ دینی یا سنگاپور ہوا آتے ہیں۔ آخر کار روزانہ سینکڑوں لوگ ہوائی جہاز سے سفر کرتے ہیں..... حادثات کا کیا ہے..... وہ کہیں بھی کسی بھی صورت سے ہو سکتے ہیں اور ہورہے ہیں..... یوں بھی آج کل ہوائی حادثات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پدمنی نے اس کی یہ بات ٹال دی۔ یہ کہہ کر آئندہ سال ہر صورت میں چلیں گے۔

یوں سدھیر کے لئے آہستہ آہستہ بے زاری اور بیکاری کے مسائل پیدا ہو گئے۔ وہ شہر کے ایک محدود حصے کی شناسائی سے اکسا گیا۔ اس کے لئے پدمنی کی بات دینی طور پر قبول کرنا مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا گیا کہ فکر کی کیا بات ہے..... کھاؤ، پیو اور عیش کرو..... اس نے بہتی کی بہت ساری جوان عورتوں سے بھی خوب جی بہلایا جن کے شوہر روزگار کے سلسلے میں ملک سے باہر تھے۔ ان سے اس کا جی بھر گیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس کی رواں دواں زندگی اچانک مفلوج ہو گئی ہے۔

چار مہینے بعد سدھیر اس نتیجے پر پہنچا کہ جذبات کی رو میں بہہ کر اس نے انتہائی احقانہ فیصلہ کیا تھا۔ اپنے پیروں پر کھپاڑی ماری تھی۔ اب اسے جہاز کی زندگی یاد آنے لگی جہاں ان گنت دوست تھے۔ تفریح تھی۔ پھرے ہوئے سمندر کے سنسنی خیز سفر تھے۔ جو اجنبی ملکوں کے کسی ساحل پر تمام ہوتے تھے تو سارے شہر کا حسن سمٹ کر ان کی آغوش میں آنے کے لئے بے چین ملتا تھا اور کبھی ایک شب کی مقامی عورت لڑکی سے رفاقت ایک حسین یاد بن کر دل کے گوشے میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتی تھی۔ مگر اب زندگی کسی ساٹھ صحرائی ماند تھی۔ سدھیر کو اپنی زندگی میں خلا محسوس ہونے لگا۔ وہ خلا جسے پدمنی کی محبت بھی پر نہ کر سکی اور کبھی نہیں سکتی تھی۔

ایک رات جب وہ سرجا سے مل کر گھر واپس آیا تو پدمنی کتاب پڑھتے ہوئے سو گئی تھی۔ جیسے ہی اس کی نظر پدمنی کے چہرے پر پڑی تو وہ چونک پڑا۔ پدمنی کا حسن اسے مصنوعی لگا۔ وہ جیسے اسے سابقہ حالت میں نظر آنے لگی۔ چڑیل لگ رہی تھی۔

سدھیر کو احساس ہوا کہ پدمنی اسے اس لئے چڑیل کی طرح دکھائی دے رہی ہے کہ وہ اس

سے بیزار ہو گیا ہے۔ جیسے اب اس کی زندگی سپاٹ ہوا کی مانند تھی۔ پدمنی نے اسے خرید لیا تھا۔ بالکل اس طرح جس طرح کوئی کسی چیز کو خرید کر اپنے تصرف میں لاتا ہے، جیسے دل چاہتا ہے استعمال کرتا ہے۔ کیا وہ بھی اس کھلونے کی طرح نہیں ہے جس سے پدمنی کھیل رہی ہے؟

اب اسے پدمنی کا حسن مصنوعی نظر آنے لگا۔۔۔۔۔ پدمنی کا چہرہ جو بہت خوب صورت دکھائی دیتا تھا مصنوعی نظر آنے لگا۔۔۔۔۔ پلاسٹک کے پھول کی طرح حسین اور دل کش ضرور تھا۔۔۔۔۔ بے حد رنگین اور جاذب نظر۔۔۔۔۔ مگر پلاسٹک کے پھولوں میں زندگی نہیں ہوتی اور خوشبو نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ پدمنی نے اپنی دولت سے بد صورتی پر پلاسٹک کا خوبصورت خول چڑھالیا تھا اور کیمیکل سے اپنا چہرہ اور جسم کی رنگت سفید کر لی تھی۔۔۔۔۔ لیکن اس نفرت فریب حسین نقاب کے پیچھے سے سدھیر کو وہ بد صورت چہرہ جھانکتا دکھائی دینے لگا تھا جو اصل چہرہ تھا۔ اس کے خیال میں پدمنی نے ایک خوب صورت نقاب پہن کر اسے بے وقوف بنایا اور اس ذلت کا انتقام لیا تھا جو برسوں پہلے اس نے پدمنی کو چڑیل کا خطاب دے کر پدمنی کے مقدر میں لکھ دیا تھا۔۔۔۔۔ جسے وہ چڑیل کہتا تھا وہی پری کا بھی بدل کر اسے اپنا غلام بنانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور اب وہ پوری طرح اس چڑیل کے قبضے میں تھا اسے اس بات کی ہوا بھی نہیں لگی تھی یہ سب کچھ ایک جادوگر کے کارن تھا۔

یہ محبت نہیں تھی پرانا قرض تھا جو اسے معہ سودا کرنا پڑ رہا تھا۔۔۔۔۔ پہلے اس کے لئے ہر حسین اور مغرور لڑکی اس کے لئے چیلنج بن جاتی تھی اور وہ اس کے غرور کو شکست دے کر اپنے آپ کو سکندر اعظم کہتا تھا۔۔۔۔۔ فتح کی یہ سنسنی خیز مسرت ہی زندگی کی تمام جدوجہد کا حاصل تھا۔ اپنی حماقت کی وجہ سے وہ خود اس زندگی سے دستبردار ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ اب وہ ایک شادی شدہ مرد تھا جس کے لئے اپنی بیوی کے سوا کسی کے حسن کا اعتراف کرنا بھی گناہ کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ جو کبھی کبھی منہ کا ڈانٹہ بدلتا تھا اب سروجا کے باعث کم ہو گیا تھا اور بے حد محتاط۔۔۔۔۔ یہ احتیاط اس کے لئے کسی اذیت سے کم نہیں تھی۔

وہ عین عالم شباب میں اپنے آپ کو بوڑھا محسوس کرنے لگا تھا۔۔۔۔۔ دنیا کی تمام خوب صورتی جیسے اس کے لئے شجر ممنوع ہو گئی تھی۔ شاید پدمنی کے لاشعور میں اب بھی یہ خوف پوشیدہ تھا کہ دنیا کی کوئی عورت جس کا حقیقی حسن اس کے مصنوعی حسن سے زیادہ طاقت ور ہوگا۔۔۔۔۔ سدھیر کو اس سے چھین لے گی۔ چنانچہ وہ اس پر کڑی نگاہ رکھتی تھی۔ اس لیے کہ مرد کی فطرت ناگ کی طرح ہوتی ہے جو مومچ پاتے ہی ڈس لیتا ہے۔ اسے احساس اور اندازہ تھا کہ اس پر نہ صرف کنواری لڑکیاں بلکہ شادی شدہ عورتیں بھی مرتی ہیں اور اس کے حصول کی متمنی رہتی ہیں۔۔۔۔۔

پدمنی نے اسے ایک شاندار اور نئی گاڑی لے کر دی ہوئی تھی۔ جب وہ گاڑی لیکر باہر نکلتا تو

پدمنی کسی نہ کسی بہانے اس کے ساتھ بیٹھ جاتی تھی۔۔۔۔۔ سدھیر کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ گاڑی کو آندھی طوفان کی طرح دوڑائے۔ یہ اس کی جوانی اور ولولہ انگیز فطرت کا تقاضا تھا کہ پہاڑوں جیسی بلند یوں کو سر کرے اور گھنٹوں کا فاصلہ منٹوں میں طے کرے۔۔۔۔۔ وہ فضا کی وسعتوں میں پرواز کرے اور وہ لاحقہ دسمندروں کی تیزی چاہتا تھا۔۔۔۔۔ مگر اس کے چاہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کیوں کہ لگام پدمنی کے ہاتھوں میں تھی۔۔۔۔۔ وہ اسے گاڑی میں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے زیادہ چلانے نہیں دیتی تھی۔ وہ اسپورٹس کلب کا ممبر بننا چاہتا تھا۔ مگر پدمنی اپنے بچی کو ایسے جان لیوا اور خطرناک شوق کی اجازت دے کر بیوہ ہونا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن حقیقت بالکل اس کے مختلف تھی۔ کیوں کہ اسپورٹس کلب میں اعلیٰ گھرانوں کی ایسی لڑکیاں بھی آتی تھیں۔۔۔۔۔ جو حسن کی سرکشی سے سرشار اور خطرات سے کھیلنے والی لڑکیاں جن کا عزم و حوصلہ بلندی میں ہمالیہ سے اونچا تھا اور جو یہ سمجھتی تھیں کہ ناممکن کچھ نہیں ہے۔

سدھیر خود کشی کے چکر میں پڑ سکتا تھا۔۔۔۔۔ کسی ایسی لڑکی کے جس کی فطرت کے تقاضے اس کی اپنی فطرت سے ہم آہنگ ہو۔ اور پھر ان لڑکیوں کا کوئی کردار نہیں تھا۔ ان میں بے راہ روی بہت زیادہ تھی۔ ان کے نزدیک دوست لڑکے بدلنا ایسا ہی تھا جیسے گاڑی کا بدلنا۔۔۔۔۔ وہ کسی کے پھل کی مانند ہوتی تھیں۔ سدھیر جیسے مردان کی کمزوری اور وہ ان کی جھولی میں فک پڑنے کے لئے بے تاب۔۔۔۔۔ وہ اسے چھین سکتی تھیں۔ اس لئے پدمنی نے اسے ممبر بننے نہیں دیا۔ کیوں کہ یہ سدھیر کو کھودینے کے مترادف تھا۔

وہ ابھی سے ان لوگوں میں شامل ہونا نہیں چاہتا تھا جو موٹے شیشوں اور سیاہ فریم والی عینک سے اپنی صورت پر سنجیدگی اور متانت طاری کر کے اپنی عمر سے دس برس بڑے دکھائی دیتے ہیں۔ بہت احتیاط سے مسکراتے ہیں اور بہت کم بولتے ہیں اور ہر کام گھڑی دیکھ کر کرتے ہیں۔۔۔۔۔ وقت مقررہ کی میٹنگ میں شریک ہوتے ہیں۔ کاروباری مسائل پر بحث کرتے ہیں۔ صرف کاروباری دورے کرتے ہیں۔ کاروباری قسم کے ڈر دیتے ہیں اور جن کے لئے حسن و شباب بھی ایک اقتصادی مسئلہ ہوتا ہے۔ بیوی سے زیادہ نو جوان پرسنل سیکریٹری میں دل چسپی لیتے ہیں۔۔۔۔۔ پر یہ پرسنل سیکریٹری۔۔۔۔۔ سیکریٹری کم محبو بہ اور غیر قانونی جتنی ہوتی ہے۔

سروجا کی عمر انیس برس کی تھی اور وہ نہ صرف بے حد حسین بلکہ بہت پرکشش بھی تھی۔ وہ اچھے کردار کی مالک نہ تھی اور نہ اس کی سیرت قابل تعریف تھی۔۔۔۔۔ وہ سدھیر سے پہلے بہت سے لوگوں کو دیوانہ بنا کر چھوڑ چکی تھی۔ لیکن اس کا حسن ایٹم بم کی طرح تباہ کن قوت تھا اور اس کا حسن عقل کو ماذب اور نگاہوں کو خیرہ کر دیتا تھا۔۔۔۔۔ وہ اپنے حلقہ اثر میں ہر مرد کی تمنائیں اور وہ اس کے حصول کے

”خوب صورت.....؟“ سدھر ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ اس کا چہرہ تو پلاسٹک کا ہے، تم ہی بتاؤ سروجا.....! کوئی اس چہرے سے پیار کیسے کر سکتا ہے.....؟ جب بھی میں نے اس کے چہرے اور ہونٹوں پر اسے ہونٹ رکھے کوئی لمس لذت اور کیف محسوس نہیں ہوا۔ ایسا لگا وہ سروادرے جان سا

سدھیر شراب کے نشے میں بہک رہا تھا اور سروجا کی آغوش میں منہ چھپائے رو رہا تھا.....

سال بھر کا غم، دکھ درد اور کرب ان آنسوؤں میں ڈھل کر بہہ رہا تھا..... اور سرو جاسے تھپک تھپک کر تسلی دے رہی تھی۔ پیار سے اور محبت بھری باتوں سے اس پر ہنسا اور ہورہی تھی..... آدھی رات کے بعد وہ غماز سے آسودگی کے احساس سے سرشار ہو کر گہری نیند میں گم ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

چندرا دیوی نے اتنی کہانی سنانے کے بعد سریش سے کہا۔ ”باقی کہانی میں پدمنی کے سامنے سناؤں گی..... پولیس انسپکٹر کو اس کے گھر لے جا کر..... سرو جاسے گناہ ہے..... پدمنی نے سدھیر کو قتل کیا ہے.....“

”اس کے قتل کا ثبوت.....؟ کیا پولیس آپ کی بات کا یقین کر لے گی؟“ سریش نے پوچھا۔ ثبوت کی ضرورت نہیں پڑے گی..... کیوں کہ میری زبانی کہانی سن کر پدمنی اپنے جرم کا اقرار کر لے گی.....“

جب سریش اور چندرا دیوی پولیس انسپکٹر رنجیت کمار کو لے کر حویلی پہنچے۔ اس وقت پدمنی کسی نئے ساتھی مرد کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پولیس انسپکٹر رنجیت کمار نے سریش کمار کا تعارف کرایا۔

”آپ کرائم رپورٹر ہیں۔ جو اپنے اخبار سچ جھوٹ کی طرف سے آئے ہیں۔ ان کے اخبار میں جرائم کی کہانیاں، حقائق اور سچی کہانیاں چھپتی ہیں..... یہ بتایا جاتا ہے کہ ایک قتل کے پس پردہ سچ کیا ہے؟..... جھوٹ کیا ہے؟..... اصل مجرم کون ہے؟..... ان کے خیال میں سرو جاسے گناہ ہے..... سدھیر کو قتل سرو جاسے نہیں آپ نے کیا ہے۔“

”لیکن اس کا ثبوت کیا ہے؟.....“ پدمنی نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”میرے نوکروں نے جو گواہ ہیں انہوں نے گواہی دی تھی کہ سرو جاسے قتل کیا..... اس کے باوجود آپ مجھے اپنے پتی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرنے آئے ہیں..... سرو جاسے جیل میں ہے۔ اب جو عدالت میں اس کی پیشی ہوگی اس میں اسے سزا سنائی جانے والی بھی ہے.....“

”ثبوت..... ہے“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”یہ میں آپ کو ثبوت پیش کرتی ہوں۔ آپ میری بات غور سے سنیں۔“

چندرا دیوی نے کہا اور اسے کہانی وہاں تک سنائی جو اس نے سریش کو سنائی تھی۔ پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

”جس جادوگر نے آپ کا رنگ روپ بدلا تھا اس نے آپ کو ایک منتر بھی بتایا تھا کہ کس طرح خوب صورتی برقرار رکھی جاسکتی ہے۔ جادو کا اثر سدا قائم نہیں رہتا ہے اور اسے برقرار رکھنے کے لئے

منتروں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس جادوگر نے جو حسن و روپ اور شباب جادو سے دیا اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ صرف پانچ برسوں کے لئے ہے۔ اسے دوبارہ بحال کرنے پر مجھ سے رابطہ کرنا ہوگا..... اور پھر جس مرد سے تعلق ہو اس کا خون کبھی کبھی پی لینا چاہئے تاکہ یہ حسن و روپ برقرار رہے..... سو مرتبہ خون پینے سے دس برس تک یہ حسن و روپ برقرار رہ سکتا ہے..... اور آپ جذبات کی رو میں سدھیر کو بے خود پا کر اس کا خون پیتی رہیں اور صرف.....“

”یہ سب جھوٹ ہے..... بکو اس ہے..... بے سر دیا کہانی ہے..... اس بات کا کوئی ثبوت نہیں..... کسی جادوگر کا وجود نہیں ہے..... اگر ایسا جادو کے زور پر ہوتا تو کوئی لڑکی بد صورت اور کوئی لڑکی بوڑھی نہ ہوتی.....؟ میں نے لندن جا کر سرجری کروائی اور ایک بہت بڑے بیوٹی سیلون سے اپنی کالی رنگت گوری رنگت میں تبدیل کی.....“ وہ ہڈیانی لہجے میں درمیان میں بولی تھی۔

”آپ جھوٹ بول رہی ہیں..... آپ لندن نہیں گئی تھیں۔ ممبئی جا کر جادوگر سے رابطہ کیا تھا۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”اس جادوگر نے ناصر بہت بڑی رقم آپ سے وصول کی بلکہ بیس دنوں تک فائدہ اٹھایا تھا..... کیا یہ غلط بات ہے؟“

”جی ہاں..... یہ من گھڑت ہے۔“ وہ برہمی سے بولی۔ ”کیا آپ مجھے بلیک میل کر رہی ہیں۔ انسپکٹر آپ بھی ان سے ملے ہوئے ہیں..... یہ کس نے کہہ دیا میں لندن نہیں گئی تھی..... وہاں سے علاج کر کے نہیں لوٹی.....“

”اچھا آپ لندن گئی تھیں.....؟“ چندرا دیوی مسکرائی۔ ”آپ کا پاسپورٹ بھی بنا ہوا نہیں ہے..... آپ بغیر پاسپورٹ کے لندن کیسے چلی گئیں.....؟ آپ کو زحمت ہوگی۔ اگر آپ اپنے پاسپورٹ کے ورژن کرا دیں۔“

”پاسپورٹ.....؟“ پدمنی بظنیں جھانکنے لگی۔ ”وہ چوری ہو گیا۔ ہندوستان کے ایئرپورٹ سے ریلوے اسٹیشن جاتے ہوئے۔“

”آپ نے اس پاسپورٹ کے چوری ہونے کی ایف آئی آر کوائی.....؟“ انسپکٹر نے کہا۔ ”جی نہیں.....“ پدمنی نے جواب دیا۔

”وہ کس لئے.....؟“ انسپکٹر نے کہا۔ ”کیا آپ نہیں جانتی ہیں کہ پاسپورٹ گم ہونے یا چوری ہونے پر رپورٹ درج کرنا ضروری ہوتا ہے..... رپورٹ درج نہ کرنا ایک طرح سے جرم ہوتا ہے۔“

”اس لئے کہ گھر آ کر دیکھا تو پاسپورٹ دتی بیک میں نہیں تھا..... میرا خیال تھا کہ وہ یا تو گم ہو گیا..... یا پھر چوری..... یا گھر میں کہیں رکھ کر بھول گئی ہوں..... میں ایک دو دن میں تلاش

کر کے آپ کو تھانے میں لا کر دکھا دوں گی۔“

”اس کی زحمت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔“ چند رادیوی نے کہا۔ ”کیوں کہ آپ جیل کی ہوا اور روٹی کھانے والی ہیں۔ کیوں کہ سدھیر کی پر تشدد موت نے آپ کو مجرم بنا دیا ہے۔ اور پھر آپ سابقہ حالت میں آجائیں گی۔ بہر حال میں کہانی مکمل کر لوں۔ پھر آپ تیرہ کریں یا اپنے وکیل کو طلب کر لیں۔ میں بتانا چاہتی ہوں کہ آپ نے سدھیر کو کس طرح سے قتل کیا۔ کیوں کیا۔؟ کاش! آپ نے یہ حماقت نہ کی ہوتی۔ سدھیر کو زندگی سے نکال دیا ہوتا۔ اس صورت میں کوئی اور مرد مل جاتا۔ رنگ روپ بھی برقرار رہتا۔ ایک حسین زندگی آپ کے چہلوں میں ہوتی۔

جب آپ سدھیر سے رخصت ہو کر سہیلی کے ہاں گئی ہوئی تھیں تین دنوں کے لئے جب آپ کی ملازمہ سرسوتی نے بتایا کہ سروجا اور آپ نے حویلی کے ایک گوشے کے کمرے میں تین دنوں تک خوب رنگ رلیاں منائیں۔ آپ کی ملازمہ رتمی جسے سدھیر نے اعتماد میں لیا ہوا تھا۔ اس کی مٹھی گرم کی تھی کہ وہ مالگن کو ان تین دن اور تین راتوں کے بارے میں کچھ نہیں بتائے گی اور پھر اس بیس برس کی شادی شدہ ملازمہ کے ساتھ سدھیر دو ایک مرتبہ وقت گزار چکا تھا۔ سدھیر کی یہ بات سن کر اسے بہت دکھ ہوا۔ کیوں کہ اس کا یہ خیال تھا کہ یہ تین دن اور تین راتیں اس کے ساتھ گزارے گا اور اسے بڑی رقم بھی دے گا۔ اس نے آپ کے واپس آنے کے بعد اپنی مالگن یعنی آپ سے رقم لینے کے بعد اسے ان تین دن رات کا فسانہ سنا دیا۔ نہ صرف رازداری کا وجہ لیا بلکہ اعتماد میں بھی لیا۔ آپ کو اس بات کا یقین نہیں آیا۔ لیکن آپ خود اپنی نظروں سے ان دونوں کو ساتھ دیکھنا چاہتی تھیں۔ آپ سروجا کی سہیلی بھی تھیں۔ سروجا کے حسن کی حشر سامانیاں آپ سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ پھر آپ نے اس سے کہا کہ سدھیر مجھے ایک سہیلی نے بلایا ہے۔ وہ میری طلب گار ہے۔ پھر آپ دوسرے دن حویلی آئیں۔ سرسوتی نے حویلی کا دروازہ کھول دیا۔ اس رات سدھیر اور سروجا جذبات کی دنیا میں گم تھے۔ آپ نے دوسرے کمرے سے اسے فون کیا۔ آپ کی حویلی میں تین ٹیلی فون سیٹ ہیں۔ سدھیر چوں کہ نشے میں تھا اس لئے اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ فون کہاں سے کیا گیا ہے اور نہ جان سکتا تھا۔ آپ نے فون کے بعد والی گفتگو جو سدھیر نے کی تھی سی لی۔ سلسلہ منقطع کرنے کے بعد آپ نے کمرے کی چھت پر جا کر روشن دان سے اس کمرے میں جھانکا۔ ان دونوں کی حالت دیکھ کر طیش آیا۔ جی میں آیا کہ کیوں نہ ابھی اور اسی وقت ان دونوں کو شوٹ کر دوں۔ لیکن آپ نے ضبط کیا۔ سوچا کہ اس صورت میں آپ قانون کے ہتھے چڑھ جائیں گی۔ آپ جیل جانا نہیں چاہتی تھیں۔ زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھیں۔ آپ کے پاس دولت تھی۔ خوب

صورتی تھی۔ پر شباب جسم تھا۔ آپ چاہتی تھیں کہ سانپ بھی مر جائے۔ لائچی بھی نہ ٹوٹے۔ پھر آپ کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ آپ سدھیر کو قتل کرنا چاہتی تھیں اور قاتلہ سروجا کو بنانے کا۔ تاکہ دونوں کو سزا مل سکے۔ پھر آپ جادوگر سے ملیں۔ جادوگر نے دو دن تک آپ سے جی بہلانے کے بعد آپ کو ایک منتر بتایا جس سے آپ دس گھنٹے تک سروجا کے روپ میں رہ سکتی تھیں۔ آپ تیسرے دن حویلی رات کے وقت پہنچیں۔ اس بات کی ہوا نہ تو سرسوتی کو لگی اور نہ ہی کسی اور ملازم کو۔ اس وقت وہ دونوں جذبات کے عالم سے نکل کر ایک دوسرے سے ہم آغوش تھے۔ سدھیر پر گہری مدھوشی تھی۔ اسے کسی بات کا ہوش نہ تھا۔ آپ نے سروجا کو بیدار کیا۔ وہ آپ کو دیکھ کر ہشت زدہ ہو گئی۔ آپ نے اس سے کہا تم کپڑے پہن کر میرے ساتھ آؤ۔ میں تم سے کچھ نہیں کہوں گی۔ اس لئے کہ سارا دوش میرے پتی کا ہے۔ جب سروجا نے کپڑے پہن لئے تو اسے حویلی کے عقبی حصے میں لے کر آئیں اور دروازہ کھول دیا۔ اس کے جانے کے بعد پھر اپنے کمرے میں آئیں۔

سدھیر کو آپ تشدد کا نشانہ بنانا چاہتی تھیں۔ سدھیر کو نیند کی حالت میں یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی بھیا تک خواب دیکھ رہا ہو۔ رات کا گہرا اندھیرا باقی تھا۔ اسے گہری نیند میں ڈوبنے سے پہلے یہ یاد تھا کہ سروجا بے سدھ پڑی تھی۔ تن کی عریانی سے بے نیاز اور سارے خطرات سے جیسے بے خبر۔ لیکن اب تو اس کے لئے منظر ہی اور تھا۔ آپ اس کے سامنے کھڑی ہوئی تھیں۔

آپ کو دیکھتے ہی اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے پہلو کی طرف دیکھا۔ سروجا نہیں تھی۔ پھر آپ نے اسے کلوروفارم میں بیگا رومال سوگھٹھا کر بے ہوش کر دیا۔ جب سدھیر کو ہوش آیا تو اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے۔ انتہائی مضبوطی سے۔ منہ پریٹپ چپکا ہوا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے حرکت تو کیا جنبش تک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ حیران اور دہشت زدہ تھا کہ سروجا کہاں چلی گئی۔

”کیا تم اپنی محبوبہ کو تلاش کر رہے ہو سدھیر۔؟“ پدمنی نے استہزاء سے لہجے میں کہا۔ ”تمہاری محبوبہ تمہاری مدد کرنے کے بجائے بھاگ چکی ہے۔ اب وہ کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی کیوں کہ وہ جان چکی ہے کہ تم میرے ہاتھوں سے بچ نہ سکو گے۔ یہ بات تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ تمہیں جس طرح لڑکیوں اور عورتوں کی کوئی کمی نہیں ہے اسے بھی لڑکوں اور مردوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ یہ بات بھی جانتی ہے کہ وہ خاموش رہے گی اور زبان بند رکھے گی کہ تو فائدہ میں رہے گی۔ لیکن وہ تمہارے قتل کے الزام میں دھری جائے گی۔“ پھر آپ نے اس کے منہ سے ٹیپ ہٹا دیا تو سدھیر نے کہا۔ ”یہ باتیں چھوڑو اور بتاؤ کہ تم چاہتی کیا ہو۔؟“ اس نے یہ بات بڑی دقت سے

کبھی تھی۔ خوف و دہشت سے اس کی آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔ آپ نے اسے جواب دیا۔۔۔۔۔
 ”اب تک تو میں تمہیں چاہتی تھی اور تم میری دولت کو۔۔۔۔۔ لیکن اب تم کسی کو چاہنے لگے ہو۔ اس لئے
 میں تمہیں قتل کر دینا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ تمہیں قتل کرنے سے مجھ پر آج تک نہیں آئے گی۔۔۔۔۔ اس لئے
 کہ میں یہاں سے سو میل دور ہوں۔ سروجا پھنس جائے گی۔۔۔۔۔ میں تمہارے قتل کے بعد یہاں آ کر
 یہ بیان دوں گی کہ سروجا کے اور تمہارے تعلقات تھے۔ وہ تم سے شادی کرنا چاہتی تھی تم نے انکار کیا
 تو نفرت اور غصے سے اسے قتل کر دیا۔ چوں کہ میں موجود نہیں تھی اس لئے میں اس کے ہاتھوں قتل
 ہونے سے بچ گئی۔۔۔۔۔ کیوں سدھیر یہ بیان چل جائے گا۔۔۔۔۔؟“ سدھیر کا جسم خوف سے مفلوج
 ہو گیا۔۔۔۔۔ پھر آپ نے اس سے کہا کہ ”مجھے تمہارے مرنے کا بہت افسوس ہوگا۔۔۔۔۔“ تو سدھیر نے یہ
 بات سن کر کہا کہ۔۔۔۔۔ ”میں اپنی غلطی اور بددیانتی تسلیم کرتا ہوں۔ تم مجھے طلاق دے دو۔۔۔۔۔ اور معاف
 کر دو۔۔۔۔۔“

”طلاق۔۔۔۔۔؟“ آپ نے طنز یہ لہجہ میں کہا کہ۔۔۔۔۔ ”طلاق۔۔۔۔۔ تمہاری خواہشات کی تکمیل کا
 نام ہے۔۔۔۔۔ تم آزادی چاہتے ہو تاکہ اپنی فتوحات کا سلسلہ جاری رکھو۔۔۔۔۔ میں تمہیں کسی قیمت پر
 معاف نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ میں نے تمہیں وہ سب کچھ دیا جو ایک عورت دے سکتی ہے۔۔۔۔۔ محبت۔۔۔۔۔
 وفاداری۔۔۔۔۔ گھر کا تمام آرام۔۔۔۔۔ جذبات کی رو میں، میں نے تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کیا۔
 جب بھی تم نے میری طلب محسوس کی میں حاضر تھی۔۔۔۔۔ میں جانتی تھی کہ میں دولت سے ایک سے
 ایک خوب صورت مرد خرید سکتی ہوں۔۔۔۔۔ میں سمجھتی تھی کہ تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو۔ لیکن میری
 یہ خوش فہمی بہت جلد دور ہو گئی۔ تم نے اپنے رویے اور لڑکیوں اور عورتوں اور سروجا سے تعلقات۔۔۔۔۔
 میری ملازمہ سرسوتی کو داغ دار کر کے ظاہر کر دیا کہ درحقیقت تم میری دولت کے اسیر ہو۔۔۔۔۔ میری
 صورت سے نہیں۔۔۔۔۔ جادوگر کو تم اور اپنا جسم پیش کر کے میں نے رنگ و روپ بدل لیا۔ دنیا کو یہ تاثر
 دیا کہ پلاسٹک سرجری اور بیوٹی سیلون کا کارنامہ ہے۔۔۔۔۔ میں یہ بھول گئی کہ صورت تو ایٹور دیتا ہے۔
 یہ اس کی نعمت ہے۔ پھر دنیا کے تم ایسے لوگ زندگی کی مسرتوں پر اجارہ کیوں رکھتے ہیں۔۔۔۔۔ میرا چہرہ
 برا تھا تو کیا ہوا۔۔۔۔۔ میرے جذبات تو وہی تھے جو کسی خوب صورت عورت کے ہوتے ہیں۔ لیکن
 خوب صورت لوگوں کی دنیا نے مجھے احساس محرومی کے سوا کیا دیا۔۔۔۔۔ تم نے سروجا سے کہا تھا۔۔۔۔۔ ”کہ
 میں ایک چڑیل ہوں۔“ میں تمہیں چڑیل بن کر دکھاؤں گی۔۔۔۔۔ جادوگر نے مجھ سے کہا تھا کہ میں
 مردوں کا خون پیتی رہوں گی تو میرا حسن برقرار رہے گا۔۔۔۔۔“

سدھیر نے محسوس کیا کہ پدمنی نے غلط نہیں کہا۔ واقعی۔۔۔۔۔ وہ ایک چڑیل ہے۔ پھر آپ
 نے لمحاتی توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھی۔ تم سمجھتے تھے کہ میں اندھی ہوں۔ لیکن میں تمام

حالات سے باخبر تھی۔۔۔۔۔ مجھے پل پل کی خبر پہنچانے والے بہت سے خیر خواہ تھے۔ لیکن میں نے
 ان کی بات کو جھوٹا سمجھا۔۔۔۔۔ پھر ان کی بات کو صداقت کو آ زمانے کے لئے باہر رہی۔ انہوں نے سچ
 ہی بتایا تھا۔۔۔۔۔ پھر آپ نے اتنا کہہ کر اس کے منہ پر ٹیپ چپکا دی۔۔۔۔۔ آپ ادھر یعنی حویلی کی طرف
 آتے ہوئے سروجا کا ایک جوڑا اس کے گھر سے لے کر آئی ہوئی تھیں۔ جسے آپ نے پہن لیا۔۔۔۔۔
 یعنی سروجا کے ہاں۔۔۔۔۔ اپنا لباس وہیں چھوڑ دیا تاکہ واپسی میں پہن لیں۔

پھر آپ دوسرے کمرے سے ایک خنجر لے آئیں اس خنجر کی نوک سے گلے کے نیچے بہت
 ہی چھوٹا سا شکاف ڈالا۔ اس میں سے خون رسنے لگا تو آپ نے اس پر اپنے ہونٹ رکھ
 دیئے۔۔۔۔۔ اور خون پینے لگیں۔ سدھیر درد سے تڑپتا رہا۔ لیکن اس کا منہ بند تھا۔ اس کے منہ سے
 کوئی آواز، کراہ اور چیخ نکل سکی اور نہ نکل سکتی تھی، آپ نے خون پیا۔۔۔۔۔ چوں کہ جادوگر کے
 منترؤں کا اثر تھا اس لئے آپ کو خون میں ایک عجیب سا ذائقہ لذت محسوس ہوئی۔ دراصل
 جادوگر آپ کو اپنا اسیر بنا کر رکھنا اور کھیلنے رہنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے انسانوں کے خون پینے
 کا جنون اور اس میں لذت پیدا کر رہا تھا۔ آپ نے ایک پیاسی کی طرح خون پیا۔ پھر آپ نے
 سیدھے کھڑے ہو کر سدھیر سے کہا کہ میں تمہیں شوٹ کر سکتی ہوں۔ اس طرح قتل نہیں کروں
 گی۔ بڑی بے رحمی۔۔۔۔۔ بے دردی اور درندگی اور سفاکی سے قتل کروں گی۔ عبرت کا نشان بناؤں
 گی تاکہ عورت کا انتقام کیا ہوتا ہے جان سکو۔ پھر آپ نے خنجر سے اس کے سارے جسم پر پے
 در پے وار کئے۔۔۔۔۔ شکاف ڈالے۔۔۔۔۔ خون کے فوارے ابل پڑے۔۔۔۔۔ اس وقت آپ کی ہنسی
 ایک چڑیل کی سی تھی اور آپ چڑیل لگ رہی تھیں۔ جب سدھیر نے تڑپ تڑپ کے جان
 دے دی تب آپ نے خنجر اس کے سینے میں پیوست کر دیا اور کمرے سے نکلیں۔ اتفاق سے اسی
 وقت سرسوتی بھی کمرے سے نکلی۔

اس وقت آپ نے سروجا کا روپ دھار لیا تھا۔ آپ کے لباس پر جا بجا تازہ خون کے
 دھبے تھے۔ خون دیکھ کر سرسوتی نے پوچھا۔۔۔۔۔ تم نے کس کو قتل کیا۔ آپ نے جواب دیا سدھیر
 کو۔۔۔۔۔ سرسوتی نے چیخا شروع کیا۔ آپ کی چیخیں سن کر ملازمین نکل آئے اور وہ آپ کو دیکھنے
 لگے تو سرسوتی نے ان لوگوں سے کہا کہ سروجانے مالک کو قتل کر دیا ہے۔ پھر آپ فوراً ہی سروجا
 کے گھر کی طرف دوڑیں۔ اس وقت سروجا گہری نیند میں غرق تھی۔ آپ نے اس کے گھر کے
 عقب کی جھاڑیوں میں خون آلود لباس پھینکا اور اپنا لباس پہنا۔۔۔۔۔ آپ نے اپنی گاڑی جو نصف
 فرلانگ پر کھڑی کی تھی اس میں بیٹھ کر چلی گئیں۔

چند رادیوی نے جیسے ہی کہانی ختم کی پدمنی کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ لیکن

اندری اندر بھونچکی سی ہوئی تھی..... وہ حیران اور پریشان تھی کہ یہ کہانی اس عورت کے علم میں کیسے آئی.....؟ اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہ تھا۔ سدھیر مر گیا تھا۔ وہ زندہ نہ تھا..... اس نے جس طرح سدھیر کو قتل کیا اور سرو جا کو اس کے قتل میں پھنسا دیا اس کے سوا کوئی نہ جانتا تھا۔ کوئی عینی گواہ نہ تھا..... اس کی عقل دنگ تھی..... اس کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو وہ بے ہوش ہو جاتی..... وہ مضبوط اعصاب کی مالک تھی۔ اس نے خود کو سنبھال لیا۔ لیکن وہ یہ بات جانتی تھی کہ ثبوت کے بغیر پولیس اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتی تھی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور استہزاء سے لہجے میں بولی۔

”بہت شاندار..... پراسرار، سنسنی خیز..... حیرت انگیز اور دلچسپ..... جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی خطرناک لرزہ خیز..... معلوم نہیں یہ کہانی کس نے لکھی.....؟ کیا سرو جانے.....؟ ہاں وہی لکھ سکتی ہے..... ایسی دس کہانیاں لکھی جاسکتی ہیں..... اس پر بڑی اچھی فلم بنائی جاسکتی ہے.....؟ انسپکٹر صاحب.....! کیا آپ اس کہانی کی بنیاد پر مجھے گرفتار کریں گے.....؟ میرا خیال ہے کہ ہرگز نہیں..... قانون ثبوت مانگتا ہے..... ثبوت پیش کیجئے.....“

”ایک ثبوت ہے.....“ چندرا دیوی مسکرا دی۔ ”یوں تو آپ نے بڑی زبردست منصوبہ بندی کی تھی۔ آپ کی ذہانت کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے..... ایک قاتل کتنا ہی بے عیب اور بھرپور منصوبہ بندی کیوں نہ کر لے وہ ایک بات بھول جاتا ہے کہ اس سے کہیں نہ کہیں کوئی فاش غلطی اور بھول ہو جاتی ہے..... یہ ایک گچی کہانی ہے..... جس جادوگر نے آپ کو رنگ روپ اور حسن دیا وہ زیر حراست ہے..... اس نے بڑا جادو منتر کیا کہ وہ حوالات سے غائب ہو جائے لیکن میں نے اس کا جادو چلنے نہیں دیا..... نہ صرف اسے بے بس کر دیا بلکہ اسے جادوئی صلاحیت سے محروم کر دیا۔ اس کا برین واش کر دیا۔ اب وہ ایک عام سا آدمی ہے۔ وہ جادو منتر بھول چکا ہے۔ اب وہ اپنی زندگی بھیک مانگ کر یا محنت مزدوری کر کے گزارے گا..... ہاں تو ثبوت کی بات ہو رہی تھی..... ثبوت آ لہ قتل ہے..... اس پر نشانات سرو جا کی اگلیوں کے نہیں آپ کے ہیں..... لہذا آپ کو اپنے شوہر کے قتل کے الزام میں قید کیا جا رہا ہے اور سرو جا کو رہا.....“

پدمی کو ایک دم سے یاد آیا کہ اس سے کتنی بڑی بھول ہوئی..... اس نے اپنا سر پیٹ لیا..... اب کیا ہو سکتا تھا۔ فرار کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں..... اور وہ اس بات پر حیران تھی کہ اس عورت نے یہ سب کیسے اور کس طرح سے معلوم کیا.....؟ کیا یہ عورت کوئی جادوگرنی ہے.....؟ اس نے چندرا دیوی سے سوال کیا۔

”کیا آپ کوئی جادوگرنی ہیں جو آپ نے یہ سب کچھ معلوم کر لیا.....؟“ پدمی نے حیرت

زرد لہجے میں پوچھا۔

”ان کا تعارف کرانا یاد نہیں رہا..... آپ چندرا دیوی ہیں..... آپ نے ان کے بارے میں سنا ہوگا کہ.....“

سریش نے جواب دیا اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ کیوں کہ پدمی چندرا دیوی کا نام سنتے ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔ بے ہوش ہونے سے پہلے ایک پل کے ہزارویں حصے میں پدمی نے سوچا اور اسے چندرا دیوی کے بارے میں یاد آیا۔ اس نے چندرا دیوی کی بہت تعریف سنی تھی۔ وہ پوشیدہ، پراسرار اور ہر قسم کی صلاحیتوں کی مالک ہے۔ اس کے سامنے شیطان اور بڑے بڑے کالا جادو کے ماہر بھی دم نہیں مار سکتے..... وہ انسانیت خصوصاً عورتوں کی مدد کے لئے کوشاں رہتی ہے۔ اس نے چندرا دیوی سے مل کر درخواست کی کہ وہ اسے حسین بنادے۔ وہ اس کی ہر قیمت ادا کرنے کو تیار ہے..... چندرا دیوی نے اسے سمجھایا تھا کہ وہ اتنی بد صورت نہیں ہے جیسا کہ وہ سمجھتی ہے عورت کا اصل حسن اس کی سیرت میں ہوتا ہے..... وہ اسے جادو کے زور سے حسین بنانے کے لئے تیار نہ ہوئی اور معذرت کر لی تھی..... چندرا دیوی پل بھر میں ماضی اور حال معلوم کر لیتی ہے..... اس لئے چندرا دیوی نے اس کا ماضی اور حال آشکار کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

چندرا اپنے فلیٹ میں ٹی وی دیکھ رہی تھی اور چائے بھی پی رہی تھی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ اطلاعی ٹھنڈی گنگنائی تو اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک نوجوان اور حسین لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی اور اس کی بڑی بڑی خوب صورت سیاہ آنکھوں سے غم جھانک رہا تھا۔ جو گہرے بادلوں کی طرح تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے برس سکتے ہیں۔ وہ اپنے نازک اور خوب صورت ہونٹ دانتوں سے کاٹ کر آنسوؤں کو روک رہی تھی۔

”مجھے مسٹر سریش کمار نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔“ وہ بولی تو اس کی آواز گلے میں رندھ رہی تھی۔ ”میرا نام نندا کمار ہے۔“

”اندرا آ جاؤ نندا کمار.....!“ چندرا نے ایک طرف ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا۔ چندرا دیوی کے محبت بھرے لہجے نے اسے بے حد متاثر کیا تھا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ چندرا دیوی اتنے محبت بھرے انداز سے اس کا سواگت کرے گی جبکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ ان کے درمیان کوئی سبب نہ تھا۔ سریش نے جیسا چندرا دیوی کے بارے میں کہا تھا وہ غلط نہ تھا۔

”میں بڑی دکھی عورت ہوں دیوی جی.....!“ نندا کمار کی آواز بھرا سی گئی۔ ”میں آپ کے

کوئی ایک برس کا عرصہ ہوا میری ماں مجھے اس دنیا میں چھوڑ کر سدا کے لئے سدھا گئی۔ میری ماں بہت حسین تھی۔ چالیس برس کی عمر میں بھی وہ بہت حسین دکھائی دیتی تھی۔ میرے پتا کی کا جس وقت دیہانت ہوا تھا۔ اس وقت میری عمر سولہ برس کی تھی، ماں کو چوں کہ میری کفالت اور گزارے کے لئے مرد کے سہارے کی ضرورت تھی۔ پتا کی کی موت کے بعد ماں نے ایک جگہ ملازمت کی تو اس کمپنی کے منیجر نے ایک سفلی علوم کے ماہر سے مل کر ایک پڑیالی جس میں سفوف تھا۔ اس سفوف کو کسی بھی مشروب میں ملا کر کوئی مرد یا عورت پینے سے پلانے والے کا غلام بن جاتا تھا۔ وہ میری ماں کے حسن پر مرعوب تھا۔ پہلے تو اس نے میری ماں سے کہا کہ وہ خفیہ شادی کر لے تو ہر ماہ تین ہزار روپے دیتا رہے گا۔ میری ماں نے کہہ دیا کہ اس کا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ وہ اپنی بیٹی کی پرورش کرنا چاہتی ہے، تعلیم مکمل ہونے کے بعد شادی کر دے گی، پھر اس نے کسی بہانے سے میری ماں کو اپنے فلیٹ پر بلایا۔ اس نے میری ماں کو ایک ہزار کی رقم دے کر کہا کہ وہ اسے خوش کر کے یہ رقم لے جاسکتی ہے۔ میری ماں نے اسے جواب دیا کہ ایک ہزار کی رقم دس ہزار روپے بھی دو تو میں تمہیں خوش نہیں کروں گی۔ ماں کا خیال تھا کہ چوں کہ فلیٹ میں دونوں تباہ ہیں۔ شاید نیجر جبر و زبردستی سے اپنا دتی کا مرتکب ہو۔ میری ماں کو اس نے دھوکے سے بلایا تھا۔ ماں بہت خوف زدہ تھی۔ نیجر اس کی عزت تباہ کرنے پر تل جاتا تو وہ اپنی عزت بچا نہیں سکتی تھی۔ فیجر نے میری ماں سے کہا کہ ”میں تمہیں آزار نہ پہنچاتا تھا۔ واقعی تم ایک شریف باعزت عورت ہو۔ میں تمہیں ترقی دے کر تمہاری تنخواہ میں اضافہ کروں گا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی، کوئی عورت تمہاری جگہ ہوتی تو وہ دو تین سو روپے میں اپنی عزت بچھا کر کوئی تیار ہو جاتی۔ اسی خوشی میں تم چائے بنا کر پلاؤ۔“

میری ماں اس کے فلیٹ کے کچن سے چائے بنا کر لے آئی۔ پھر اس نے میری ماں سے پانی لانے کے لئے کہا۔ جب وہ پانی لانے گئی تو اس نے ماں کی چائے میں وہ سفوف گھول دیا۔ جب وہ چائے پی کر جانے لگی۔ فیجر نے اسے دبوچ لیا اور اس کے چہرے پر جھک گیا۔ ماں نے کوئی مداخلت اور تعرض نہیں کیا۔ کیوں کہ اس سفوف نے اپنا اثر دکھا دیا تھا۔ اس نے فائدہ اٹھانے کے بعد ماں کی نامناسب تصویریں اتار لیں۔ ماں چوں کہ بے سدھ اور بے جان اور غشی کی سی حالت میں تھی۔ سب کچھ دیکھ رہی اور محسوس کر رہی تھی اس لئے وہ اسے کسی بات سے روک نہ سکی۔ اس نے ماں کو چار گھنٹے تک رکھا اور کھلونے کی طرح کھیلتا رہا۔ وہ بے بسی رہی۔ اس نے ماں کو تین ہزار کی رقم دے کر کہا۔ ”وہ اس کی ہر بات مانے گی۔ فیکٹری سے چھٹی پا کر روزانہ تین گھنٹے کے لئے اس کے اس فلیٹ پر آیا کرے گی۔ اپنی بیٹی کو یہ بتائے گی کہ وہ اوور ٹائم کی وجہ سے گھر دیر سے آیا کرے گی۔“

پاس بڑی آٹھ لے کر آئی ہوں۔“

”میرے پاس دکھی لوگ ہی آتے ہیں۔“ چندرا نے دروازہ بند کر کے اس کا ہاتھ بڑی اپنائیت سے تھام لیا۔ پھر اسے نشست گاہ میں لا کر صوفے پر بٹھا دیا۔ ”میں کسی کو ناامید اور مایوس نہیں کرتی ہوں۔ تم بیٹھو۔۔۔۔۔ میں ابھی آتی ہوں۔“

چندرا دیوی نشست گاہ سے نکل گئی تو نندا کماری نے سوچا۔۔۔۔۔ ”کتنی حسین ہے چندرا دیوی۔۔۔۔۔ جتنی حسین ہے اس کا دل بھی اندر سے اتنا ہی خوب صورت ہے۔ اس کے لہجے میں کتنا امرت بھرا ہوا ہے۔۔۔۔۔ یہ واقعی دیوی ہے۔۔۔۔۔ کتنی سادگی ہے۔۔۔۔۔ اس دیوی میں۔۔۔۔۔ لیکن یہ اس کا مسئلہ کیسے حل کرے گی۔ اس کا مسئلہ حل کرنا اس کے بس کی بات نہیں لگتی ہے۔“

وہ چندرا دیوی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔۔۔۔۔ چندرا ایک ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹرے میں دو کپ چائے اور نمکو سے بھری پلیٹ تھی۔ وہ ٹرے تپائی پر رکھ کر اور اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر بولی۔

”نندا! میں اس وقت چائے پی رہی تھی۔ تم بھی چائے پیو۔ اسی دوران تم بڑے اطمینان سے بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے۔۔۔۔۔؟ میرا خیال ہے کہ تمہارا مسئلہ بے حد پراسرار اور گھمبیر ہے۔۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”جی دیوی جی۔۔۔۔۔“ اس نے حیرت سے اثبات میں سر ہلایا۔ ”یہ آپ نے میرا مسئلہ سننے بغیر کیسے اندازہ کیا؟“

”اگر یہ مسئلہ اس قدر پراسرار اور گھمبیر نہ ہوتا تو مسٹر سریش کمار تمہیں میرے پاس نہ بھیجتے خود ہی حل کر دیتے۔۔۔۔۔“

”جی۔۔۔۔۔ یہی بات ہے۔“ اس نے سر ہلا کر اعتراف کیا۔ ”میں ان کے مشورے پر آپ کے پاس آئی ہوں۔“

”مجھے پوری تفصیل بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے؟“ چندرا نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔ ”کوئی بات نہیں چھپانا۔۔۔۔۔ مجھے اپنا ہمز اور سہیلی سمجھنا۔ جھجک بالکل بھی نہیں۔۔۔۔۔ کیوں کہ سچائی سے تمام باتیں بتانے سے تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ تم اطمینان رکھو۔“ چندرا نے اسے دلاسا دیا۔

”پریشان اور فکر مند نہ ہو۔۔۔۔۔ انشور نے چاہا تو تمہاری مشکل دور ہو جائے گی۔“

”میں آپ سے کوئی بات بھی نہیں چھپاؤں گی۔ وہ تمام باتیں بھی بتاؤں گی جو میں کسی سے نہیں کہہ سکتی۔۔۔۔۔ اپنی عزیز سے عزیز ترین سہیلی سے بھی۔۔۔۔۔ ہمز دوست سے بھی۔۔۔۔۔ اب آپ کہانی سنیں۔

رومان کے نام پر دکھائے جاتے تھے وہ جذبات کو بھڑکاتے تھے۔ اصل بات یہ تھی کہ میرے اندر شرم دیا ختم ہو گئی تھی۔

میں نے ماں کی شادی کے بعد سے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ میں غیر محسوس انداز سے دلچسپی لے رہا ہے۔ پھر اس بات کا بھی اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے یہ شادی مجھ سے رسائی کے لئے کی ہے۔ گو کہ اس نے کبھی میرے ساتھ ایسی کوئی نامناسب یا ناشائستہ حرکت نہیں کی تھی لیکن اس کی آنکھوں سے دل کا میل صاف نظر آتا تھا۔ پھر ماں کی حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی۔ پھر ایک دن ماں مجھے اس سنار میں اکیلا چھوڑ گئی۔ میرے باپ نے مجھے بہت تسلی دی۔

کوئی ایک ماہ گزر جانے کے بعد ایک رات وہ میرے کمرے میں آ گیا۔ وہ سوتیلا باپ مجھے شیطان نظر آیا تھا۔ میری ماں نے ٹھیک کہا تھا کہ..... ”جوانی اور حسن عورت کے لئے ایک عذاب ہوتا ہے۔“ مجھے ہر صورت میں اپنی عزت بچانی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ ”میں نے تمہیں کبھی اپنا ہاپ نہیں سمجھا۔ تم نے میری ماں سے شادی کی تو پھر اخیال تھا کہ تم میرے قریب آ جاؤ گے اور تنہائی میں ہم دونوں فائدہ اٹھائیں گے۔ کتنی مرتبہ ایسے مواقع آئے کہ ماں گھنٹوں کے لئے باہر گئی..... اور پھر تم ماں کو روز رات کو نیند کا آنکیشن لگاتے تھے لیکن پھر بھی میرے کمرے میں نہیں آئے۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہارے ساتھ شملہ جا کر کئی موناؤں.....“

وہ میری باتوں کے قریب میں آ گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ”اس نے یہ شادی مجھ تک رسائی کے لئے کی تھی۔ جب تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تو میری حالت عجیب ہو گئی تھی۔ میں اس لئے تمہارے کمرے میں نہیں آیا اور تنہائی سے فائدہ نہیں اٹھایا کہ شاید تم میری اس حرکت کو پسند نہ کرو۔“

وہ حد سے تجاوز کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے موقع نہیں دیا..... دوسرے دن صبح جب وہ کلینک گیا تو میں نے اپنے چند جوڑے دستی بیک میں رکھے۔ ماں کے زیورات اور اس کی رقم لے کر ایک شادی شدہ سہیلی کے ہاں پہنچی۔ قسمت کی دیوی مہربان تھی۔ میری وہ سہیلی تین دن بعد اپنے چتی اور بچوں کے ساتھ تین برسوں کے لئے لندن جا رہی تھی۔ وہ مجھے اپنا فلیٹ اس وقت تک کے لئے رہائش کے لئے دے گئی۔

میں چوں کہ گرجیشن کر چکی تھی اس لئے میں نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی۔ میرے پاس اتنے زیورات تھے کہ وہ شادی میں کام آ سکتے تھے۔ ماں کی جو رقم پس انداز کی ہوئی تھی وہ زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ برس چل سکتی تھی۔ میں نوکری تلاش کرتے ہوئے سخت پریشان ہو گئی تھی۔ مہری خوب ضرورتی اور جسم میری سفارش تھا۔ ملازمت میرے لئے مشروط ہو گئی تھی کہ میں انہیں خوش کروں۔ یہ بات مجھے کسی قیمت پر منظور نہ تھی۔ اتفاق سے میرے ہاتھی کے ایک بچپن کے دوست

اس نے ماں کو موبائل کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویریں دکھائیں۔ اس نے دھمکی دی کہ اگر اس نے آنے سے انکار کیا تو وہ ان کے پرنٹ بنوا کر لوگوں میں تقسیم کر دے گا..... ماں رقم لے کر گھر آئی اور ساری رات رونے کے بجائے یہ سوچتی رہی کہ اس کا موبائل کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے محلے میں ایک بوڑھی عورت رومارتی تھی۔ سفلی علم جانتی تھی، ٹونے اور گنڈوں کا کام کرتی تھی۔ ماں نے اسے اعتماد میں لے کر بتایا اور کہا کہ اسے نیجر سے نجات کا راستہ بتائے..... اس عورت نے ماں کو مشورہ دیا کہ نیجر کو ہر طرح سے خوش کرو۔ اس پر یہ ظاہر کرو کہ اس سے محبت ہو گئی ہے..... اگر وہ شرابی ہے اور شراب پیتا ہے یا چائے، دودھ تو اس پر تین الفاظ یہ منتر پھونک دو۔ اس پر تین گھنٹے تک کے لئے غشی طاری ہو جائے گی۔ پھر تم اس کے موبائل فون میں ایسی گڑبڑ کرو کہ وہ تصویریں ضائع ہو جائیں۔ اگر تمہیں نہیں آتا ہے تو اس کا موبائل فون پانی سے بھری بالٹی میں ڈال دینا..... پھر میری ماں نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح اس بوڑھی جادوگرنی کی وجہ سے اس نیجر سے نجات مل گئی۔

اتفاق سے اس کے دوسرے دن میری ماں کو ایک گارنٹن فیکٹری میں ملازمت مل گئی۔ ایک ماہ کے بعد ماں نے وہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔ وہاں کا سپروائزر میری ماں کو تنگ اور ہراساں کرنے لگا۔ اس سے من مانی کرتا تھا..... پھر ایک اور اتفاق یہ ہوا کہ میرے محلے میں ایک جوان ڈاکٹر نے اپنا دوا خانہ کھولا۔ ماں ایک روز اس سے دوا لینے گئی تو وہ ان پر مرثا۔ پھر اس نے شادی کی پیشکش کر دی۔ اس نے ماں کو بتایا کہ دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔ نہ ماں باپ اور نہ بھائی بہن اور قریبی رشتہ دار..... اس کی عمر ماں کی عمر سے کم تھی۔ تین چار برس چھوٹا تھا..... ماں نے مجھ سے کہا کہ اس سے شادی کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے..... ماں نے مجھ سے ایک بات کہی تھی کہ ”خوب صورتی اور جوانی عورت کو اس نہیں آتی ہے۔ قدم قدم پر درندے اسے چیر پھاڑنے کے لئے ہوتے ہیں..... تم اپنی جوانی اور خوب صورتی کی حفاظت کرنا اور سپنوں کے پیچھے اندھا دھند مت دوڑنا.....“

پھر میری ماں نے اس سے شادی کر لی۔ دو برس پلک جھپکتے گزر گئے۔ میری ماں بیمار رہنے لگی۔ میں نے ایک بات محسوس کی تھی کہ میرے سوتیلے باپ کی آنکھوں میں میل ہے۔ وہ غیر محسوس انداز سے میرے قریب آ رہا ہے۔ میں نے سوچا تو اس میں مجھے اپنا ہی دوش نظر آیا۔ کیوں کہ ایک تو میں ایسا لباس پہنتی تھی جس میں جسم کی نمائش زیادہ ہوتی تھی۔ رات کے وقت کپڑے بدلتے وقت دروازہ بند نہیں کرتی تھی صرف پردہ کھینچ دیتی..... باہر سے میری حرکات و سکنات تیز روشنی کے باعث نظر آتی تھی۔ میرا سوتیلا باپ یہ سب کچھ دیکھتا تھا۔ اس کے علاوہ ٹی وی دیکھتے وقت اس بات کا خیال نہیں کرتی تھی کہ میرا سوتیلا باپ بھی موجود ہے۔ انگریزی چینلوں کے فلموں میں جو اخلاق سوز مناظر

جمعہ کے روز میں نے جو رقم جمع کرائی تھی وہ تین لاکھ اکیس ہزار سات سو تھی۔ اس لگانے کو میں نے مضبوطی سے پکڑ کر رکھا ہوا تھا لیکن وہ فحش اگرچہ آج بھی میرے ساتھ تھا لیکن اس نے کچھ نہیں کیا۔ شاید اس لئے بھی لفٹ میں ہم دونوں کے علاوہ چار افراد اور بھی تھے۔ شاید وہ اس دن کے انتظار میں تھا کہ میں اکیلی ہوں تو مجھے بے ہوش کر کے لفافہ چھین کر بھاگ سکے۔

یہ ایک عجیب و غریب سا اتفاق تھا کہ اس روز کے بعد دوسرے دن لہٹ میں ملا تھا۔ ہم دونوں کی نظریں ایک دوسرے میں پیوست ہوئیں تو میری دونوں مرتبہ بھی وہی کیفیت ہوئی جو پہلی بار ہوئی تھی۔ لہٹ میں مجھ سے بھی کہیں حسین اور جاذب نظر لڑکیاں موجود تھیں اس کا صرف اور صرف میری طرف متوجہ ہونا اور مجھے ایک ٹک دیکھنا اور نظروں کی گرفت میں میرا چہرہ اور سراپا رکھنا حیران کن بات تھیں میں حسین ہوں اتنی بھی حسین نہیں کہ مرد میرے سوا کسی اور کو نہ دیکھیں..... جوانی کے خمار نے مجھے حسین بنا دیا تھا کسی اور لڑکے اور مرد نے مجھے کسی اسی طرح دیکھا اور نہ میری طرف پیش

اگرچہ جمعہ کو کچھ بھی نہیں ہوا تھا..... لیکن میں چھٹی کے دونوں دن اس شخص کے بارے میں سوچتی رہی کہ یہ شخص اچھا آدمی نہیں ہے۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہو چلا تھا کہ وہ شخص چور ہے اور موقع کا متلاشی ہے اگر وہ مجھ پر مرنا تھا تو مجھ سے روابطہ بڑھا سکتا تھا۔ دوستی کے لئے پیش قدمی کرتا اور میں انکار نہ کرتی اور اسے اپنا دوست بنا لیتی۔ اور پھر وہ پنا تازہ کر کے مجھے اس لئے اسیر بنا رہا ہے کہ لفافہ چھیننے وقت میں کوئی مزاحمت نہ کر سکوں حقیقت یہ تھی کہ اگر لفٹ میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ ہوتا یا کسی بھی جگہ تنہا ہوتے تو وہ جو چاہے میرے ساتھ کر سکتا تھا۔ میں اس کے قابو میں آ کر بے بس ہو جاتی۔ اس کی آنکھوں کا جادو مجھے مسحور کئے دیتا تھا۔ لفٹ سے باہر اور دفتر آنے کے بعد میں محسوس کرتی تھی اس کے سحر سے نکل آئی ہوں۔ لیکن اسے ناپسند نہیں کر سکتی تھی اس نے میرے دل میں جگہ بنائی تھی۔

ایک مرتبہ میں نے سوچا بھی تھا کہ احتیاط کے طور پر میں اپنے میجر دیش کمار کو مطلع کر دوں کہ کچھ دنوں سے ایک مشکوک آدمی کو لفٹ میں روزانہ دیکھ رہی ہوں..... پھر یہ سوچ کر خاموش رہ گئی کہ کہیں وہ مجھے بے وقوف قرار نہ دے دیں یا اتنی سی اطلاع پر سرزنش نہ کر دیں وہ بد مزاج شخص تھے۔ ہر کسی کے سامنے بے عزتی کر دیتے تھے۔ پھر مجھے یہ خیال بھی آیا کہ مجھے یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے کمپنی نے میرے لئے اب تک کون سی بھلائی کی ہے میں اتنی محنت اور جانفشانی سے سارا کام کرتی آرہی ہوں لیکن میری تنخواہ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا جب کہ کمپنی کی آمدنی میں بے پناہ اضافہ روز بروز ہوتا جا رہا ہے اس کے سارے پراجیکٹ منافع بخش جا رہے ہیں..... میں اس شش و پنج میں مبتلا تھی کہ ایک خیال نامعلوم کہاں سے میرے ذہن کے بند درپچوں میں گھس آیا تو میں چونک پڑی۔

بالفرض ڈاکہ پڑ جائے..... اور وہ شخص رگم لے کر فرار ہو جائے اور بالفرض..... یہ رقم کسی طرح میرے پاس واپس آ جائے تو کیسا رہے گا.....؟ کمپنی کو تو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کیوں کہ کمپنی کو انشورنس کمپنی سے اتنی ہی رقم مل جائے گی اور کمپنی کے پاس رقم کروڑوں سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ آٹے میں نمک کے برابر ہوگی..... اس میں چور کا بھی کوئی نقصان نہیں..... نہ وہ رقم کا حق دار ہے اور نہ اسے ملے گی..... لیکن میں اتنی رقم کی حق دار ہوں..... اگر مجھے مل جائے تو..... اس رقم سے میں کیا نہیں کر سکتی..... دنیا دیکھ سکتی ہوں..... خوب صورت اور دیدہ زیب ملبوسات خرید سکتی..... اور پھر میری شامیں حسین اور رنگین ہو سکتی ہیں..... ہوٹل اور ڈنر کسی بھی اچھے اور بڑے ہوٹل میں لے سکتی ہوں۔ میری احساس محرومیاں ختم ہو جائیں گی..... بھگوان کرے وہ شخص چور اچکا اور ڈکیت نہ ہو اور میں اس کے ساتھ شامیں گزاروں۔

اتوار کی رات میں نے بڑے غور و خوض کے ساتھ اپنا منصوبہ ترتیب دیا۔ میں نے اپنی کمپنی کی رقم کے حصول کا بے عیب منصوبہ بنالیا میں نے اس کا ہر پہلو سے بار بار جائزہ لیا..... مجھے تو اس میں کوئی عیب اور جھول نظر نہ آیا۔

وہ شخص مجھے پیر اور منگل کو نظر نہیں آیا..... شاید یہ میرا وہم تھا اور اس شخص نے مجھے لوٹنے کا کوئی ارادہ نہیں کیا تھا۔ بدھ کے دن بھی وہ نظر نہیں آیا۔ حالانکہ میں نے کھانے کے وقت کے دوران اسے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا بھی تھا۔ اس عمارت میں اگر وہ ہو تو نظر آ جائے..... پھر میں نے سوچا کہ اس نے مجھے پنا تازہ کر کے پھانسا چاہا تھا۔ لیکن میں اس کے سحر میں نہیں پھنسی۔ وہ یہ سوچ کر مایوس ہو گیا ہوگا کہ اس کا جادو مجھ پر چل نہیں سکا۔ اس لئے وہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ شاید کسی اور لڑکی کو شکار کر رہا ہو۔ میں نے سوچا کہ اس شخص کے بارے میں، میں نے جو محسوس کیا اور کہا وہ میرا واہمہ تھا۔ میں نے جو ایک چھوٹا سا منصوبہ بنایا تھا اس کو ختم کرنے کے بارے میں سوچنے لگی۔ تاہم مجھے اس بات پر دکھ و افسوس اور پچھتاوا ہو رہا تھا کہ میں نے اس کی طرف پیش قدمی کیوں نہیں کی۔ جمعرات کو پندرہ تاریخ تھی۔ مجھے یہ بات معلوم تھی کہ پہلی اور پندرہ تاریخ کو اقساط کی رقم بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ڈھائی بجے کے قریب مسٹر دیش کمار اپنے کمرے سے نکل کر کیشیئر کے کمرے میں آئے اور انہوں نے اس سے دریافت کیا۔

”مس رامی..... اس وقت تک کتنی رقم جمع ہو چکی ہے؟“

رامی ایک چھوٹی سی خوب صورت گڑیا سی لڑکی اس میں بڑی جاذبیت تھی۔ اس کا مرمیں شاخ گل جیسا لپک دار بدن گداز سا بھرا ہوا۔ اس میں بڑی سادگی اور چہرے پر بلا کی معصومیت جسے میں روز دفتر آ کر چوم لیتی تھی اور وہ سرخ ہو جاتی تھی۔ دفتر میں اتنی حسین لڑکی کوئی اور نہ تھی۔

رامی نے جلدی سے حساب کیا اور بولی۔ ”سر! کیش تو تین لاکھ ساٹھ ہزار کے قریب ہے..... اور چیک جو کمپنیوں کے ہیں وہ سات لاکھ روپے کے ہیں..... تین پے آرڈر تین لاکھ روپے کے ہیں۔“

”مس ننڈا کمار!.....! میرا خیال ہے کہ تم فوراً ہی یہ ساری رقم، چیک اور پے آرڈر بینک میں لے جا کر جمع کرادو۔ کیوں کہ سپلائرز اور کچھ فرموں کو کل کی تاریخ میں چیک ایشو کئے گئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک دن کی تاخیر سے چیک باؤنس ہو جائیں۔“

میں نے سر کے اشارے سے اثبات میں جواب دیا اور اپنا بڑا سا تھیلہ نامہ پرس اٹھالیا جو میں نے کچھ دنوں قبل ہی خریدا تھا۔ رامی نے جلدی جلدی نوٹوں کی گڈیاں گن کر موٹے مضبوط اور بھرے رنگ کے لفافے میں چیک اور پے آرڈر سمیت رکھ دیئے۔ پھر اس نے لفافہ میری طرف

بڑھا دیا پھر اس نے رقم کی ایک ڈپازٹ سلف بھر کے میری طرف بڑھادی۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا۔

میں نے لفافہ پرس میں رکھا تو وہ اندر نہ ہوسکا اور میں آفس سے نکل کھڑی ہوئی۔ پھر راہ داری سے گزرتی ہوئی میں لفٹ تک آ گئی۔ میں اپنے معمولات اور دفتر میں زیادہ کام کی وجہ سے اس شخص کو بھول چکی تھی۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس کا جادو اثر کیا تھا۔ راتوں کو نہ تو اس کی یاد آتی تھی اور نہ ہی اس کا تصور نظروں میں ابھرتا تھا۔ میں جیسے ہی لفٹ میں قدم رکھ رہی تھی نہ جانے کہیں سے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آیا اور لفٹ میں گھس گیا۔ اسے دیکھتے ہی میرا سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ لفٹ میں اس کے علاوہ صرف ایک بوڑھی عورت تھی جو بظاہر میری کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی نہ اس سے کسی حفاظت کی توقع کی جاسکتی تھی میں نے لفافے کو سینے سے قریب کر لیا بلکہ لگا لیا۔

لفٹ تیزی سے نیچے جا رہی تھی۔ اور وہ میزائن فلور پر بھی نہیں رکی۔ پہلی منزل پر لفٹ رکی تو اس کے دروازے کھل گئے۔ باہر گیلری میں خاصی گہما گہمی تھی۔ میں نے مسکرا کر پہلے بوڑھی عورت کو جانے کا راستہ دے دیا۔ اس کے بعد میں باہر نکلنے لگی تو اس شخص نے تیزی سے آگے بڑھ کر میرے منہ پر ایک گھونسا دے مارا اور میری آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔

یہ واقعہ اتنی تیزی سے پیش آیا تھا کہ اس کا میرے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میں فرش پر چاروں شانے چت پڑی ہوئی تھی۔ اجنبی شخص میرے ہاتھ سے پرس کی بجائے بھورا لفافہ چھین کر سرعت سے برق رفتاری سے بھاگ چکا تھا۔ بوڑھی عورت نے چیخا چلا نا شروع کر دیا اور کچھ ہاتھ مجھے سہارا دے رہے تھے۔ ”آپ کیسی ہیں.....؟“ مجھے لوگوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے بولنے کی کوشش کی لیکن اندھیرا میری آنکھوں کے سامنے گہرے سیاہ بادلوں کی طرح تیر رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرا جڑا ٹوٹ گیا ہو۔ چند لمحوں کے بعد میں بولنے اور دیکھنے کے قابل ہوئی۔

”میرے پیسے..... وہ..... میرے پیسے لے گیا.....“ میں نے ہزبانی لہجے میں کہا۔
”آپ فکر نہ کریں..... لوگ اسے پکڑ لیں گے.....“ کچھ آوازوں نے مجھے دلاسا دیا۔ ”وہ بچ کر نہیں جاسکتا.....“

میں نے جڑے پر ہاتھ رکھا سخت درد ہو رہا تھا۔ پرس میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اسے مضبوطی سے تھام لیا کہ کوئی اسے بھی چھین کر نہ لے جائے پھر جیسے ہی لوگوں نے مجھے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں سہارا دیا میں ان کی مدد سے کھڑی ہو گئی۔ پھر میں نے لوگوں کو بتایا۔

”وہ بینک میں جمع کرانے کی ساری رقم وغیرہ لے گیا ہے..... دفتر کی رقم تھی وہ.....“
اس دوران عمارت کے باہر جو گشتی پولیس والا پہرے پر ہوتا تھا اسے کسی نے بلا لیا تھا۔
”آپ ٹھیک ہیں نا..... کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی.....؟“ سپاہی نے بڑی نرمی سے پوچھا۔
”اس نے میرے منہ پر گھونسا مارا تھا..... لیکن میرے خیال میں جیڑا ٹوٹا نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”وہ شخص بھاگ گیا ہے..... آپ چھتا نہ کریں لیکن ہم اسے گرفتار کر لیں گے۔“ سپاہی نے بھی مجھے دلاسا دیا۔ اس کا حلیہ بتائیں۔
”دراز قد..... مضبوط کاٹھ..... سیاہ گھنی بھنوں..... سیاہ بال..... عمر تقریباً چھتیس برس کی ہوگی۔“ میں نے اسے بتایا۔

”مس آپ نے کبھی اسے اس سے پہلے دیکھا ہے.....؟“ اس نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”نہیں.....“ میں نے اسے فوراً جواب دیا۔ اسے کیا بتاتی کہ دو تین مرتبہ دیکھ چکی ہوں۔ جب اسے پہلی بار دیکھا اور اس کے بعد جب بھی دیکھا وہ ہر بار مجھ پر جادو کرتا رہا۔ محور کر کے اسیر بناتا رہا۔ یہ تفصیل میرے لئے مصیبت کھڑی کر دیتی۔

وہ یہ سب کچھ اپنی نوٹ بک میں لکھ رہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”کتنی رقم تھی.....؟“
”خاصی بڑی رقم تھی..... اس کا اندراج ڈپازٹ سلف میں تھا۔“ میں نے انجان بن کر کہا۔
میں کسی وجہ سے ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ ہمارے گرد بھٹرج جمع ہو چکی تھی۔ ان میں مرد اور عورتیں بھی تھیں۔

”میرے خیال میں ہم آپ کے دفتر چلتے ہیں.....“ اس نے کہا۔
رہزنی کا حال سنتے ہی مسٹر دنیش کمار کی حالت بری ہو گئی تھی۔ انہوں نے سپاہی سے یا مجھ سے پوچھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی کہ میری حالت کیسی ہے۔ وہ افسوس کر رہے تھے کہ ان سے یہ کیسے غلطی ہوئی۔ وہ پشیمان اور بدحواس سے ہو رہے تھے۔

”ہیڈ آفس میں لوگ کیا کہیں گے کہ میں یہاں معاملات سنبھالنے کے قابل نہیں ہوں..... وہ مجھ سے یہ بھی پوچھیں گے کہ اتنی بڑی رقم میں نے اکیلی لڑکی کو جمع کرنے کے لئے کیوں دی.....؟ اب بتاؤ۔ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں.....؟“

”لیکن اس میں تو میرا کوئی قصور نہیں ہے..... اس نے اچانک ہی بڑی تیزی سے حملہ کیا تھا..... اور پھر وہ دیو قامت تھا..... یہ آپ کے سوچنے کی بات تھی۔ شہر میں روزانہ درجنوں ایسی

وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔“

میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا تھا..... میرا جڑا سوچنے لگا تھا اور مسٹر دیش کمار کا رویہ دیکھ کر مجھے ان پر ذرہ برابر بھی رحم نہیں آیا تھا۔ میں یہ بات جانتی تھی کہ مسٹر دیش کمار کو اور مجھے کمپنی مورد الزام ٹھہراتی نہیں..... کیوں کہ ایسے واقعات کم و بیش شہر میں پیش آتے ہیں۔ پولیس کا آدمی نقصان کی صحیح رقم کے اعداد و شمار لے گیا تھا..... میری ساتھی راگھی مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی اور مجھے تسلی دی۔ پھر اس نے نیم گرم پانی سے میری سکانی کر دی اور اس نے میرے متاثرہ جڑے پر اپنے ہونٹ رکھے تو مجھے بڑی راحت محسوس ہوئی۔ اس کے ہونٹوں کے لمس نے میرا درد بہت کم کر دیا۔ پھر اس نے کافی منگوا کر پلائی اور درد دور کرنے کی گولی بھی دی۔

جب یہ سارا معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا اور میں کمرے میں اکیلی رہ گئی تو میں نہ چاہتے ہوئے اپنا بڑا پرس کھول کر دیکھا تو اس میں وہ بھورا لفافہ تھا جس میں رقم چپک اور پے آرڈر تھے۔ میرا دل جموم اٹھا تھا۔ یہ لفافہ حفاظت سے رکھا ہوا تھا۔ میں نے یہ لفافہ پہلے سے تیار کر رکھا ہوا تھا۔ جب راگھی مجھے لفافہ دینے کے بعد مسٹر دیش کمار کو اطلاع دینے گئی ہوئی تھی تب میں نے رقم والا لفافہ پرس میں رکھ لیا تھا اور جس وقت چور کو قلعی لفافے میں ردی کے ٹکڑے ملیں گے تو تب اس کی شکل دیکھنے کے قابل ہوگی۔ میں نے چشم تصور میں اس کی شکل دیکھی جو غصے سے چند رنگی طرح ہو رہی تھی..... آج اس کا جادو الٹ ہو کر اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

میں نے وہ شام اپنے گھر پر ہی گزاری۔ میرا چہرہ دکھ رہا تھا اور میں بازار سے درد کی اور خواب آور گولیاں لے آئی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ رات جڑا بہت درد کرے گا اور میں سکون سے سونہ سکوں گی۔ میں نے رقم کو گنا اور پھر پلاسٹک میں لپیٹ کر ٹوائٹ ٹینک میں بڑی حفاظت سے چھپا دیا۔ کیوں کہ گھر میں اس کے سوا کوئی اور جگہ ایسی نہ تھی جہاں میں رقم چھپا کر رکھتی۔ یہ جگہ مجھے سب سے زیادہ محفوظ نظر آئی تھی اور میں یہ بات جانتی تھی کہ جتنے زیادہ عرصے تک میں رقم خرچ نہ کروں یہ زیادہ بہتر ہے۔ یہ بات ضرور تھی کہ ممکن ہو کہ چور پولیس کے ہتھے چڑھ جائے اور لفافے میں کاغذ کے ٹکڑوں کا بارے میں بتا دے..... لیکن اس کی بات پر کوئی یقین نہیں کرے گا..... مجھے اس بات کا پورا یقین تھا گاڑا رکھی یا کسی نے مجھے لفافے تبدیل کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ روزانہ کی ریہرسل کرنے سے مجھے کافی مہارت ہو گئی تھی اور پھر میں نے تمام چپک اور پے آرڈر رنڈاؤ تیل کر دیئے۔ پیر کے دن میں نے آفس نہ جانے کا فیصلہ کر لیا..... میں نے فیبر مسٹر دیش کمار کو فون کر کے کہہ دیا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ جڑے پر درم آ گیا ہے اور درد میں کوئی افاقہ نہیں ہے۔ یوں میری طبیعت بہتر تھی۔ جڑے کی سوجن پہلے سے بہتر تھی بلکہ کافی حد تک ختم ہو چکی تھی۔ میں

ابھی باہر جانے کا سوچ رہی تھی کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔

میری سیکلی کا فلیٹ نہایت آراستہ و پیراستہ تھا اس میں انٹرکام بھی تھا۔ میں نے انٹرکام پر پوچھا۔ ”کون.....؟“

”مس نندا کماری.....! پولیس..... ہمیں آپ سے مزید چند سوالات پوچھنے ہیں۔“

میں نے بند بابا کر صدر دروازے کا لاک کھول دیا۔ چند لمحوں کے بعد دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ میں نے بغیر کسی پس و پیش کے دروازہ کھول دیا۔ پھر میں نے دروازہ بند کرنے کی بڑی کوشش کی تھی۔ لیکن گھنٹی بھنوس والا شخص بہت ہوشیار تھا۔ اس نے بجلی کی سی سرعت سے اپنا پاؤں دروازے میں پھنسا دیا..... میں نے چیخنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے مجھے دبوچ کر میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”خاموش.....“ وہ غرایا۔ ”اگر تم نے شور مچایا..... اس مرتبہ میں تمہارے دونوں جڑے توڑ دوں گا۔“

میں نے خود کو چھڑانے کی بڑی جدوجہد کی اور کئی جگہ اس کے ہاتھوں پر کاٹ کھایا۔ لیکن وہ تندرست تو انا اور دروازہ شخص تھا۔ اس لئے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس نے میری گردن اور جڑوں پر بوسوں کی بارش کر دی تھی۔

”مجھے وہ رقم چاہئے، میں وہ رقم حاصل کرنے آیا ہوں..... اور میں ہر قیمت پر حاصل کر کے جاؤں گا۔“ اس کا لہجہ کرخت تھا۔ اس نے بڑی سختی سے میرا ہاتھ مروڑ رکھا تھا۔ شدید تکلیف سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

پھر اس نے مجھے اچھی طرح سے چومنے کے بعد تیزی سے دھکا دیا۔ میں سیدھی صوفے پر جا پڑی۔ میرے ہاتھ میں شدید تکلیف تھی..... میں ابھی سنبھلنے بھی نہیں پائی تھی کہ اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو نظر آیا۔ میری چیخ حلق میں گھٹ گئی۔

”میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا..... لیکن اگر تم اس طرح ضد کرتی رہیں تو میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوگا کہ..... میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ کچھ حاصل کئے بغیر..... پولیس سے بھاگتا پھروں۔ تمہیں معلوم ہے کہ لفافے میں کوئی رقم نہیں تھی.....“

”حیرت کی بات ہے کہ لفافے میں رقم نہیں تھی.....؟“ میں نے انجان بن کر متعجب لہجے میں کہا۔ ”لیکن لفافے میں رقم میں نہیں بلکہ کیشیر لڑکی رکھتی ہے اور میں اسے لے جا کر بینک میں جمع کرادی تھی ہوں..... کیشیر لڑکی میرے ساتھ کام کرتی ہے۔“

”بیکار باتوں سے کوئی فائدہ نہیں..... تم مجھے یہ بتاؤ کہ وہ رقم تم نے کہاں چھپائی ہے؟“ چاقو

ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ چوکنٹا تھا۔ لیکن اس کے لہجے میں قدرے نرمی پیدا ہو گئی تھی۔ ”وہ رقم تم لے اڑی ہو۔۔۔۔۔“

میں نے پچھلے ہفتے میں تمہیں لفٹ میں دیکھا تھا۔ لیکن میں نے یہ بات پولیس کو نہیں بتائی۔۔۔۔۔ میں نے کہا۔

”کیوں نہیں بتائی۔۔۔۔۔؟“ وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

”پتا نہیں کیوں۔۔۔۔۔؟“ میں نے جواب دیا۔ ایک لمحے کے لئے خیال آیا کہ اس سے کہوں کہ تم نے مجھے پتانا نہ کرنے کے مجھے محور کر دیا اور اپنا اسیر بنالیا تھا۔ تم مجھے تین دن تک یاد آتے رہے تھے۔ میں تمہیں پسوں میں دیکھتی رہی تھی۔ رنگین اور انجانے سننے۔ لیکن اب چوں کہ اس سے شدید قسم کی نفرت محسوس ہو رہی تھی اور میں اس سے نظریں چار رہی تھی کہ کہیں وہ مجھے پتانا نہ کر دے۔ ”میں پتانا ہوں کس لئے۔۔۔۔۔“ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ”اس لئے کہ تم اس رقم پر ہاتھ صاف کرنا چاہتی تھیں۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔ ”تم نے آخر مجھے کیوں چنا۔۔۔۔۔؟“

”میں نے تمہیں ایک لفٹ میں دیکھا تھا اور تمہارے ہاتھ میں ایک پھولا ہوا لفافہ تھا جسے لے کر تم بینک میں گئی تھیں۔۔۔۔۔ لیکن اب یہ گفتگو ختم کرو۔ میں تم سے انٹرویو کرنے نہیں آیا ہوں۔ یہ بتاؤ کہ رقم کہاں ہے۔“ اس نے قدرے سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”مجھے معلوم نہیں۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ کسی دوسری لڑکی نے لفافہ بدل دیا ہو اور مجھے ہوا تک نہیں لگی۔“ میں بولی۔

”کس لئے۔۔۔۔۔؟ کیا اس لئے کہ بینک میں کاغذ کے گلوے جمع کرائے جاسکیں۔۔۔۔۔ دیکھو لڑکی۔۔۔۔۔ فضول وقت ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔۔۔۔۔ جلدی سے بتاؤ کہ رقم کہاں ہے؟“ اس نے تیز و تند لہجے میں کہا۔ ”میں تمہاری بکواس سننا نہیں چاہتا۔“

”میں یہ بات جاننی اور سمجھتی تھی کہ میرے سامنے دو راستے ہیں۔۔۔۔۔ میں اسے رقم دے کر اپنے خوابوں کو چکنا چور ہونے دوں اور وہ مجھے قتل کرنے کا خطرہ مول لے۔ کیوں کہ وہ مجھے اس طرح سے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔۔۔۔۔ اور اگر میں نے اسے ایک مرتبہ رقم دے دی تو پھر میں پولیس کو بتانے کے قابل نہیں رہوں گی۔ لیکن اچانک ذہن میں ایک تیسرا خیال بھی آیا۔

”اگر میں تمہیں اس رقم سے بھی زیادہ رقم فراہم کر دوں تو کیا تم مجھے یہ رقم رکھنے دو گے۔۔۔۔۔؟“ میں نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

”زیادہ سے تمہاری کیا مراد ہے۔۔۔۔۔؟ اس نے میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

”اگر میں زیادہ رقم بینک میں جمع کرانے کے لئے جاؤں۔۔۔۔۔ اور پھر میں بھاگ کھڑی ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”دو ایک دن میں کمپنی ایک اعلیٰ رہائشی اپارٹمنٹ کمرشل ایریا میں بنانے والی ہے۔ یہ پروجیکٹ بہت بڑا ہے۔ لوگ ٹوٹ پڑیں گے۔ رقم بھی روزانہ بہت زیادہ جمع ہوگی۔۔۔۔۔ ابھی اس کا اشتہار بنایا جا رہا ہے جو اخبارات اور ٹی وی پر مشہور کیا جائے گا؟“

”اور میں پولیس کو پیچھے لگا لوں۔۔۔۔۔“ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تم یہ چاہتی ہو کہ میں جیل کی ہوا کھاؤں۔ میں جیل جانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔“

”میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔ ”میں نے یہ منصوبہ بہت سوچ بچار سے بنایا اور اس کے لئے اپنی جان بھی خطرے میں ڈال دی۔ اس لئے کہ مجھے رقم کی اشد ضرورت تھی۔ اگر میں تمہیں یہ رقم دے دوں تو میرے پاس کیا رہے گا؟“

”تم بہت بڑی بے وقوف ہو۔۔۔۔۔“ وہ تیز لہجے میں بولا۔ ”پولیس تمہیں ذرا سی دیر میں پکڑ لے گی۔ کیا جیل جانے کی تمنا ہے۔“

”میں تمہیں ایک شان دار پیشکش کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ تم میری فکر نہ کرو۔ میں پولیس کے ہتھے نہیں چڑھوں گی۔ تم چاہو تو اسے قبول کر لو۔“

”تم کبھی جاؤ۔۔۔۔۔ میں سن رہا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”لیکن مجھے نہ معلوم کیوں تمہاری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے۔“

میں سچ کہہ رہی ہوں کہ تمہیں اس سے بھی زیادہ رقم لا دوں گی۔ اس شرط پر کہ تم مجھے یہ رقم رکھنے دو گے۔۔۔۔۔؟“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”کب۔۔۔۔۔؟“ اس نے بے یقینی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔

”اگلے پیر کو۔۔۔۔۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس پروجیکٹ کا اشتہار اتوار کے روز اخبارات میں شائع ہوگا اور ٹی وی پر بھی آئے گا۔۔۔۔۔ پیر کو صبح پچیس بج کرانے کے لئے لوگوں کی قطاریں لگ جائیں گی۔“

اس کی ہچکچاہٹ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ ”لیکن میں تم پر بھروسہ کرنے سے قاصر ہوں۔“ اس نے کہا۔

”تم مجھ پر بھروسہ کرو یا نہ کرو۔۔۔۔۔؟ لیکن میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔۔۔۔۔؟ اگر میں پولیس کو کچھ بتاتی ہوں تو میرا اس میں شامل ہونا ضروری ہے اور پھر میرے پاس سے ساری رقم چلی جائے گی۔۔۔۔۔

”نہیں..... نہیں..... تم نہیں ٹھہر سکتے.....“ میں نے محسوس کیا کہ میری آواز کھوکھلی سی ہے اور اس سے آمادگی سی ظاہر ہو رہی ہے..... میں خود بھی چاہتی تھی کہ وہ ٹھہر جائے۔ اس لئے کہ اس نے ہادیسی ایسا کر دیا تھا۔ لیکن میں اسے رسمی انداز اور کم زوری آواز میں منع کر رہی تھی۔ ”کیوں نہیں ٹھہر سکتا.....؟“ اس نے میرے چہرے پر نکھرے ہوئے بالوں کو ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب سے محفوظ جگہ ہے۔ کم از کم پولیس یہاں نہیں آ سکتی۔“

اس کی یہ بات بالکل ٹھیک تھی۔ میں اس کے بازوؤں کے حصار سے نکل کر بال اور لباس درست کرتی ہوئی بولی۔

”تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے..... لیکن اگر کوئی ملنے والا آ گیا اور اس نے تمہیں دیکھ لیا تو وہ کیا سوچے گا.....؟“

”اس میں فکر اور پریشانی کی کیا بات ہے..... تم کہہ سکتی ہو کہ بیمار ہوا اور میرے کزن میری غیریت معلوم کرنے آئے ہیں۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

جب مجھے اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ ٹھہرنا چاہتا ہے تو میری گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ صرف اس خیال سے کہ راکھی کہیں مجھے دیکھنے نہ آ جائے۔ وہ شاید رتنا اور کملا کے ساتھ آئے۔ وہ مجھے ایک غیر مرد کے ساتھ دیکھ کر شک کرے گی..... اور پھر یہ خوف بھی دامن گیر تھا کہ معلوم نہیں وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے..... مجھے مار کر بھاگ جائے۔ کیوں کہ یہ رقم بھی خاصی بڑی ہے۔ لیکن مجھ پر اس نے جو پٹانا ناز کیا ہوا تھا شاید اس کی وجہ سے رفتہ رفتہ میں نے اپنی گھبراہٹ پر قابو لیا تھا۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ یہ اچھا آدمی ہے۔ اگر اسے رقم لے کر بھاگنا ہوتا تو کب کا بھاگ چکا ہوتا۔

میری سہیلی جو مجھے تین برسوں کے لئے یہ فلیٹ دے گئی تھی وہ بڑی خوش حال تھی۔ اس کا فلیٹ نہ صرف خوب صورت بلکہ نہایت آراستہ و پیرا سہ تھا۔ کچن میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی..... فرنیچر میں بھی میز، دہسکی اور سوڈے کی بوتلیں بھی تھیں۔ میں نے دو کپ کریم کافی بنائی۔ میں نے کریم لال رکھی ہوئی تھی۔ میں رات کے وقت کریم کافی ہی پیتی تھی۔

ایک گھنٹہ بعد کھانے کا وقت ہوا تو وہ میرے لئے دو کلب سینڈویچز اور کوئلڈ ڈرنکس بھی لے آیا۔ ہم دونوں نے سیر ہو کر کھایا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی کہانی سناتے رہے..... اس نام دسویں کمار تھا۔ وہ کافی عرصہ فوج میں رہا تھا جب اس کی کشمیر میں تعیناتی کی گئی تو وہ مجاہدین کے خوف سے نہیں گیا تھا۔ اس لئے اسے ملازمت سے نکال دیا گیا۔ وہ دو ایک برس سے چھوٹی موٹی کامیابیوں سے کام چلا رہا تھا۔ جب کبھی بھی اس نے اونچا ہاتھ مارنے کی کوشش کی تو پکڑا گیا۔ وہ تین

وہ چاہے تمہیں دوں یا نہیں دوں..... بات ایک سی ہے.....“

”اگر ایسی بات ہے تو وہ رقم مجھے دکھاؤ.....“ اس نے چاقو بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔

”تم اسے لے لو گے.....“ میں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ”اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم رقم لے کر بھاگ نہیں جاؤ گے؟“

”اب جب کہ میں تم پر بھروسہ کر رہا ہوں تو تمہیں بھی مجھ پر بھروسہ کرنا چاہئے۔“ اس نے چاقو والی جیب تھپ تھپائی۔ ”میں اس کے زور پر بھی تمہیں رقم دکھانے پر مجبور کر سکتا ہوں۔ لیکن ایسا اس لئے نہیں کر رہا ہوں کہ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہو گیا ہے۔“

میرے پاس کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ وہ چاقو کے زور پر..... میرا گلا گھونٹ کر یا بے ہوش کر کے تلاشی لے کر رقم برآمد کر سکتا تھا۔ اس شخص پر بھروسہ کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا..... میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے پٹانا ناز کر رہا ہے۔ میں آہستہ آہستہ اس کی اسیر ہو رہی ہوں۔ مائل ہو رہی ہوں..... میرا دل اس پر بھروسہ کرنے کی ترغیب دے رہا ہے۔

”یاد رکھنا.....“ میں نے کہا۔ ”میں اور بھی بڑی رقم حاصل کر سکتی ہوں..... اگر تم مجھے دھوکا دے کر اور چاقو کے زور پر یہ رقم لے گئے تو بڑی رقم سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ وہ رقم میں تمہیں دینے سے رعبی۔ میرے وارے نیارے ہو جائیں گے۔“

”میں سمجھتا ہوں.....“ وہ بولا۔ ”میں بے وقوف نہیں ہوں جو بڑی رقم سے محروم ہو جاؤں۔“

مجھے بڑی رقم کی اشد ضرورت ہے۔“

اگر وہ مجھے پٹانا ناز نہیں کرتا اور میرے پاس آ کر مجھ پر کچھ پڑھ کر نہیں پھونکتا تو میں اسے رقم نہیں دکھاتی..... میں کھ پتلی سی بن گئی۔ وہ میرے چہرے پر ٹھوڑی دیر تک جھکا اور میری آنکھوں میں جھانکتا تو میں نے بے اختیار ہو کر ٹینک میں چھپائی ہوئی رقم نکال کر اسے دکھا دی..... میں نے اس رقم کو چھپانے سے پہلے اس میں سے کچھ رقم نکال لی تھی۔

وہ حیران سا ہو کر بولا۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اس قدر ذہین ہو..... اگر میں تین دن تک بھی کھو جتا رہتا تو رقم نہیں ملتی اور نہ میرے وہم و گمان میں یہ بات آ سکتی تھی کہ تم نے رقم یہاں چھپائی ہوئی ہے۔“

پھر اس نے خوش ہو کر مجھے بے اختیار بازوؤں میں بھر لیا۔ بڑی دیر تک میرے چہرے پر دیوانگی سے جھکارا۔

”میرا خیال ہے کہ..... اس رقم کی حفاظت کے لئے میں تمہارے ساتھ ٹھہر جاؤں۔“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

مرتبہ جیل بھی جا چکا تھا۔ میں نے اسے اپنی کہانی بھی سنائی۔ اپنی ماں اور سوتیلے باپ کے بارے میں بھی جواں کے مرنے کے بعد عزت کا دشمن ہو گیا تھا۔ تنہا زندگی کے بارے میں بھی..... اس فلیٹ کے بارے میں جسے اس نے میرا سمجھا ہوا تھا..... میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ اس کی طرح مجھے بھی بڑی رقم کی اشد ضرورت ہے اس رقم سے کیا کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ شادی کر کے گھر بسانے کی بڑی آرزو ہے۔

ہم دونوں نے رات کے کھانے تک ٹی وی پر فلم دیکھی۔ جب رات زیادہ ہو گئی تو ہم سونے کے لئے لیٹ گئے۔ میرا خیال تھا کہ میرے ساتھ بستر پر سونے گا۔ لیکن وہ بڑے صوفے پر دروازہ ہو گیا۔ ڈبل بیڈ تھا۔ اگر وہ ساتھ لیٹ جاتا تو میں تعرض نہ کرتی اور خود سپردگی سے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتی..... میرا خیال یہ تھا کہ شاید وہ مجھے گہری نیند میں غرق دیکھ کر بستر پر آ جائے گا۔ میری دوسرے کچھ کھلی تھی۔ ایک تو رات کے تین بجے اور صبح چھ بجے..... میں نے اسے گہری نیند میں غرق دیکھا۔ میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ وہ رات کو رقم لے کر فرار ہو جائے گا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ مجھے اس پر اعتماد ہو چکا تھا۔

دوسری صبح ہم دونوں ایک دوسرے سے کافی حد تک مانوس ہو چکے تھے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ بھی شروع ہو چکی تھی۔ بے تکلفی اپنی حدود کو چھونے لگی۔ اس کی من بانیاں اور میری شوخیاں بھی شدت اختیار کر گئی تھیں اور میں بڑی تیزی سے اس شخص کو پسند کرنے لگی تھی۔ اس کی وجہ اس کا مجھے پناہ ناز کرنا تھا۔ وہ مجھے پناہ ناز نہ کرتا تو شاید میں اس کے ساتھ بہکتی اور چپکتی نہیں۔

”پیر کے دن تمہیں اندازہ ہے کتنی رقم حاصل ہو جائے گی.....؟“ اس نے پیار سے میرا رخسار تھپ تھپاتے ہوئے پوچھا۔

”میرے خیال میں دس لاکھ سے زیادہ ہی ہوگی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اس لئے کہ اس کی بنگ ایک لاکھ کی ہے۔“

”تمہارے فیئر مسٹرنش کمار کو اس بات کا علم ہوگا کہ تم رقم لے کر جا چکی ہو.....؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میرے خیال میں منگل کی صبح کو..... جب میں کام پر نہیں جاؤں گی..... پیر کے دن جب میں بینک میں رقم جمع کرانے جاؤں گی تو سیدھی یہاں آ جاؤں گی..... اور پہلے کی رقم ملا کر ہم لوگوں کے پاس ساڑھے تیرہ لاکھ کی رقم ہو جائے گی۔“

”ہمارے پاس کیا مطلب.....؟“ اس نے قدرے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تم میرے ساتھ تو نہیں جا سکتیں.....؟“

”وہ کیوں.....؟“ اس کی بات سن کر میرا سینہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔

”اس لئے کہ میں کچھ اچھا آدمی نہیں ہوں..... اور میں تمہارا جوڑ کسی بھی لحاظ سے نہیں ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”میرے خیال میں..... میں بھی کچھ دنوں سے کچھ اچھی نہیں رہی ہوں۔“ میں نے اس کے گلے میں بانہیں حائل کر کے کہا۔

رات کو ہم دونوں نے مل کر پروگرام بنایا۔ اس نے کہا کہ ”ہم پیر کی شام ہی ہوائی جہاز سے لکھتہ جا کر وہاں سے نیپال چلے جائیں گے وہاں ہنی مون منانے کے بعد..... یعنی بیس دن بعد لکھتہ آئیں گے..... وہیں ایجنٹ ایک دن میں انٹرنیشنل پاسپورٹ بنوادے گا پھر ہم وہاں سے ہانگ کانگ چلے جائیں گے پھر جاپان..... زندگی وہیں گزاریں گے۔“

پروگرام ترتیب دینے کے بعد اس خوشی میں ہم دونوں نے اس رات خوب جشن منایا۔

پیر کے دن جب میں نے دفتر میں قدم رکھا تو مسٹرنش کمار نے مسکرا کر میرا سواگت کیا اور اس انداز سے میری خیریت دریافت کی۔ ذرا ہی دیر کے بعد دفتر کی مصروفیات شروع ہو گئیں۔

راکھی نے مجھے کسی مرد کی طرح اپنی آغوش میں لے کر چوم لیا اور بولی۔

”نندا.....! آج تم بے حد حسین اور غضب کی لگ رہی ہو اور تمہارے چہرے پر گہرا آرام کیا ہے.....“

میں اسے کیا بتاتی کہ مجھے تم سے جدا ہونے کا بڑا ملال ہے..... آج کا دن اور ملاقات آخری ہے..... کیا کروں بے پایاں خوشی اور تابناک مستقبل کے لئے میں بہت بڑا قدم اٹھانے پر مجبور ہوں۔

کبھی نے جو نیا پراجیکٹ شروع کیا اور اسے اخبارات میں تشہیر کیا تھا جس کے کارن بڑا اچھا رسپانس ملا تھا۔ صبح دفتر کھلنے کے بعد قطاریں لگنے شروع ہو گئی تھیں تین بجے کے قریب راکھی نے جمع شدہ رقم کا حساب لگایا اور بتایا کہ تیس لاکھ کی رقم جمع ہوئی تھی۔ بارہ لاکھ رقم موجود ہے۔ اٹھارہ لاکھ کی رقم ہیڈ آفس کے کیشیئر بلراج آ کر لے گئے۔

راکھی نے مجھے بتایا تھا کہ میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا ہے اس کے کارن کوئی بھی بینک جا کر رقم جمع کرانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ سرڈیش کمار نے مجھ سے کہا کہ ”تم آج ہی بینک جا کر رقم جمع لانا۔ گھبرانا نہیں..... چند روز تک میں تمہارے ساتھ بینک چلوں گا۔“ اس لئے کہ تھوڑی بہت مخالفت ضروری ہے۔ میں تمہاری جان خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا۔“

”لیکن میرے خیال میں یہ ضروری نہیں ہے اور نہ ہی میں خوف زدہ اور پریشان ہوں۔“

میں نے انہیں یقین دلایا یہ اتنی جلدی چور کا دوبارہ حملہ کرنا بہت مشکل ہے۔ تاہم میں پہلے سے زیادہ محتاط رہوں گی۔ چوں کہ اس وقت میں محتاط نہ تھی اور اس رہ زن نے اچانک اور غیر متوقع حملہ کیا تھا اس لئے نہ تو میں مزاحمت کر سکی اور نہ دفاع..... چشم زدن میں سب کچھ ہو گیا۔“

میں ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ راکھی یا کسی اور لڑکی کو میرے سنگ نہ کر دیں۔ ایسا ہوا تو سارا پروگرام چوٹ ہو جائے گا۔ انہوں نے کہا۔

”ہاں..... تم ٹھیک کہہ رہی ہو..... لیکن وہ یا کوئی اور چور موقع کی تلاش میں ہو سکتا ہے۔ خطرہ مول لینے سے کوئی فائدہ نہیں..... میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔ اس لئے بھی کہ اس چور کے بڑی رقم حاصل کرنے کے بعد حوصلے بلند ہو گئے ہوں گے۔“

ہم دونوں خاموشی سے لفٹ کا انتظار کرنے لگے..... میرا دماغ خیالوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ میں بڑی تیزی سے سوچ رہی تھی کہ دھونی گاڑی لئے میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ جب میں وقت پر نہیں پہنچوں گی تو وہ سوچے گا کہ میں نے اسے دھوکا دیا اور مظلوم نہیں میرا کیا جبر نشر کرے گا..... میں دوسری طرف تیزی سے ایسی کوئی تدبیر سوچ رہی تھی کہ..... مسٹر دیش کمار سے جان چھڑوا کر بھاگ لو..... ورنہ زندگی میں کبھی ایسا سنہری موقع پھر نصیب نہیں ہوگا۔

لفٹ خالی تھی، ہم دونوں خاموشی سے پہلی منزل تک سفر کرتے رہے، پہلی منزل پر لفٹ رک گئی اور پھر میری نظر B پر پڑی۔ عام طور پر بلند و بالا عمارتوں میں ایک تہہ خانہ ہوتا ہے جس کے ذریعے عمارت سے باہر جاسکتے ہیں میرے دماغ میں جو بھی یہ خیال آیا اور وہ لفٹ سے باہر نکلے میں نے B کا بٹن دبا دیا۔

”مند اکماری.....“ دیش کمار زور سے چلائے۔

لیکن لفٹ تیزی سے نیچے سفر کرتی چلی گئی۔ میں نیچے پہنچ کر تیزی سے دوڑتی چلی گئی۔ تہہ خانہ خالی تھا اور چند لمحوں کے بعد میں اس جگہ پہنچ گئی جہاں دھونی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ دھونی نے مجھے تیزی سے آتے دیکھ کر فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔

”غیر مسٹر دیش کمار بینک تک میرے ساتھ ہی آئے تھے۔“ میں نے ہانپتے ہوئے کہا اور تیزی سے دھڑکتے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ ”میں بڑی مشکل سے انہیں دھوکا دے کر آئی ہوں.....“

”پھر تو وہ عقل مند آدمی ہیں.....“ دھونی نے تسخیر بھرے لہجے میں کہا۔

”پہلے نہیں تھا لیکن اب ہو گیا ہے۔“ میں خار کھا کر بولی۔

”کتنی رقم ہے.....؟“ دھونی نے پوچھا۔

”پورے بارہ لاکھ روپے ہیں.....“ میں نے دوسرا لفافہ..... سیٹ پر پہلے لفافے کے برابر

رکھتے ہوئے جواب دیا۔

پھر میں نے سانس قابو میں آنے کے بعد پوچھا۔ ”ہم کہاں جا رہے ہیں.....!“

”مجھے یہاں سے کافی دور ایک غیر معروف اچھے ہوٹل کا پتا ہے جہاں ہم رات گزاریں گے۔“ دھونی بولا۔

”لیکن پولیس مجھے تلاش کر رہی ہوگی؟“

”یقیناً.....“

چونکہ میں تمہارے ساتھ ہوں اس لئے مجھے کسی چیز کی کوئی فکر اور پریشانی نہیں ہے۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں پانچ بجے ہوٹل پہنچ گئے تھے۔ دھونی نے رات گزارنے کے لئے ایک ڈبل بیڈ کمرہ بک کر لیا تھا..... میں ہوا میں اڑ رہی تھی یہ خوشی مجھے پہلی بار ملی تھی۔ میں ہوٹل میں چاروں طرف گھومتی پھرتی..... کچھ دیر تک سوسنگ بل پر نظارہ کرتی رہی۔ واپس آئی تو دھونی رسیور رکھ رہا تھا۔

تم کس سے باتیں کر رہے تھے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”کسی سے نہیں..... میں نے کچھ کھانے کے لئے منگوایا تھا..... اس سے پہلے ہم کیوں نہ کچھ پی لیں؟“

اس نے اپنے دتی بیگ سے دسکی کی بوتل نکالی۔ میز پر دو گلاس رکھے ہوئے تھے۔ اس نے دو پیگ تیار کئے..... ”اس کامیابی کی خوشی میں یہ جام.....“ اس نے مجھے بازوؤں میں بھر لیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے مجھے اپنے بازوؤں کے حصار سے نکال کر ایک جام اٹھایا اس خوشی میں تمہیں اپنے ہاتھ سے پلاؤں گا۔“

پھر اس نے میرے ہونٹوں سے جام لگا دیا..... دو تین گھونٹ پیتے ہی مجھ پر غشی سی طاری ہونے لگی۔ میرا سینہ جلنے لگا۔ ”یہ کیسی دسکی ہے؟“

”یہ طلسماتی دسکی ہے.....“ اس نے گلاس میز پر رکھ کر مجھے اٹھایا اور بڑے صوفے پر لٹا دیا۔

”میری حالت ایسی تھی کہ میں نہ تو بول سکتی تھی اور نہ چیخ سکتی تھی..... البتہ دیکھ اور محسوس کر سکتی تھی۔ میری زبان جیسے مفلوج ہو گئی تھی کچھ دیر بعد اطلاعی گھنٹی بجی..... دھونی نے دروازہ کھولا تو دروازے پر راکھی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ جیسے ہی اندر آئی۔ دھونی نے دروازہ بند کر کے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ راکھی نے کہا ”مبارک ہو دھونی! منصوبہ کامیاب رہا..... یہ کب تک اس حالت میں رہے گی؟“

”پورے تین گھنٹے.....“ دھونی نے جواب دیا۔

مجھ پر کوئی بجلی سی آن گری تھی۔ مجھ میں اتنی سکت کہاں تھی کہ اٹھ کر بیٹھ سکوں۔ بول سکوں..... پھر ان دونوں نے میری موجودگی کے باوجود اس کام یابی کا جشن بڑے والہانہ انداز سے منایا۔ دونوں حیوان بنے رہے..... راہی اندر سے مکار..... چڑیل اور کمینہ ہوگی۔ مجھے اندازہ نہ تھا..... جب وہ دونوں غلاطت کے دلدل سے نکلے میں تاریکیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔

جب میں ہوش میں آئی تو وہ دونوں کمرے میں موجود نہ تھے..... بستران کے گزرے ہوئے لمحات کا فسانہ سنا رہا تھا۔ بستر کی ہر چیز بے ترتیب تھی۔ جب میں نے ان دونوں کو غلاطت کے دلدل میں دھنسا دیکھا تو میرا خون کھول رہا تھا لیکن میں تماشائی بنی ہوئی تھی کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی وہ دونوں رقم سمیت غائب تھے۔ میں نے سوچا کہ پولیس کو فون کر کے بتا دوں..... لیکن کچھ سوچ کر میں نے ارادہ بدل دیا۔

میں مسٹر سریش کمار کے دفتر گئی۔ انہیں مختصر طور پر بتایا اور ان سے کہا کہ ”پولیس سے میری سفارش کر دیں۔ میں اپنا جرم تسلیم کرتی ہوں۔ لیکن ساتھ ساتھ میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ جیل نہ جاؤں۔ میں پولیس سے ہر طرح کا تعاون کرنے کو تیار ہوں.....“

راہی اس کی مجبور تھی۔ میں نے انہیں غلاطت کے دلدل میں جو باتیں کرتے سنا وہ یہ تھی کہ وہ یہاں سے بنگور جا کر نام بدل کر بہرپ بدلتے رہیں گے راہی بھی دفتر سے بیس لاکھ کی رقم لے کر آئی تھی..... دھونی پولیس کو قتل، تین لڑکیوں کی آبرویزی اور بینک ڈکیتی میں مطلوب ہے۔ اس نے چھ ماہ پیشتر اپنے دوستاچیوں کے ساتھ مل کر ایک بینک کو لوٹا تھا۔ دو کروڑ کی رقم ہاتھ لگی تھی۔ اس نے اپنے ان دونوں ساتھیوں کو قتل کر دیا تھا جو بینک لوٹنے میں اس کے ساتھ شامل تھے..... سریش کمار نے مجھے مشورہ دیا کہ میں آپ سے رابطہ کروں۔ اس لئے میں آئی ہوں۔“

چندرا دیوی نے اس کی کہانی سن کر کہا۔ ”نندا کماری.....! تم نے پوری سچائی سے اپنی کہانی سنا دی۔ اس بات سے مجھے خوشی ہوئی کہ تم نے ذرا بھی مبالغے سے کام نہیں لیا اور کوئی بات بھی نہیں چھپائی۔ اچھا یہ بتاؤ۔ اب تم کیا چاہتی ہو.....؟“

”میں یہ چاہتی ہوں کہ کمپنی کی رقم واپس دلادوں، دھونی اور راہی کو سزا ہو جائے۔“ نندا نے جواب دیا۔ ”میں دھونی اور راہی سے انتقام لینا چاہتی ہوں..... کیا ایسا ممکن ہے کہ ساری رقم واپس مل جائے..... میں نے یہ بھی سنا ہے کہ حکومت نے دھونی کی گرفتاری پر دس لاکھ کا انعام مقرر کیا ہوا ہے.....“

”کیا تم دس لاکھ روپے کا انعام حاصل کرنا چاہتی ہو.....؟“ چندرا نے سوال کیا۔

”مجھے انعام سے کوئی دل چسپی نہیں ہے..... میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ میرا پاپ دھل

جائے اور جیل نہ جاؤں۔“ وہ بولی۔

”شاباش..... مجھے تمہارے اس خیال اور جذبے سے بڑی خوشی ہوئی۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”تمہیں نہ صرف صاف کر دیا جائے گا بلکہ انعام بھی مل جائے گا..... لگتا ہے کہ تم نے اس واقعہ سے بہت سبق سیکھا ہے۔“

چندرا دیوی اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی مورتی تھی جو خالص سونے کی دکھائی دیتی تھی۔ جب اس نے نندا کماری کی طرف بڑھائی تو نندا کماری نے حیرت سے دیکھتے ہوئے اسے تمام لیا۔ وہ بہت بھاری تھی اس کی آنکھوں میں دو ہیرے چمک رہے تھے۔ اس کی پیشانی پر مرغی کے انڈے کے سائز کا ایک نہایت آب دار ہیرا نصب تھا۔ اس کے کانوں میں دو صاف و شفاف بہت ہی خوب صورت موتی دک رہے تھے۔ اس کے ہاتھوں کی تمام انگلیوں میں ہیروں کی جڑاؤ انگلیٹھیاں جگ مگار ہی تھیں۔ اس کے مونہی چہرے اور ہونٹوں پر ایک دل کش اور نہایت پیاری سی دل میں اتر جانے والی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ یہ کسی دیوی کی مورتی تھی۔ نندا کماری نے زندگی میں کبھی ایسی مورتی نہیں دیکھی تھی۔

”یہ تو بہت ہی قیمتی اور نادر اور نایاب مورتی لگ رہی ہے۔“ نندا کماری بولی۔ ”یہ کیا کسی راج کماری کی مورتی ہے؟“

”یہ مورتی بنارس کے ایک بزمندر میں رکھی ہوئی تھی یہ ہزار برس پہلے کی ایک راج کماری کی مورتی ہے۔“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔ ”یہ مورتی پانچ کروڑ مالیت کی ہے۔ اس کے تمام ہیرے کروڑوں کی مالیت کے ہیں۔ سونے کی بنی ہوئی ہے۔“

”میں اس مورتی کو لے کر کیا کروں.....؟“ نندا کماری نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔ ”یہ آپ کے پاس کیسے آئی.....؟“

”تم اس مورتی کو لے کر دھونی کے پاس جاؤ گی.....“ چندرا دیوی بولی۔ ”وہاں جا کر اس کا کمال دیکھنا..... اس مورتی کے کارن تم قانون کے تھے چڑھنے سے بچ جاؤ گی..... وہ دونوں گرفتار ہو جائیں گے..... یہ مورتی کہاں سے آئی میرے پاس، میں تم کو بتاؤں گی نہیں..... بہر حال یہ ایک راز ہے جو ان کی گرفتاری کے وقت پر ظاہر ہوگا۔“

”یہ اتنی قیمتی مورتی ہے..... کیا دھونی مجھے اس کے حصول کے لئے قتل نہیں کر دے گا؟ یا پھر مار مار کر بے ہوش کر کے اسے لے کر بھاگ جائے گا..... میں ایک نازک اور کم زور عورت ہوں۔ اس کا مقابلہ کیسے کر سکوں گی.....“

”تم بے فکر رہو..... نہ تو تمہارا بال بیکا ہوگا اور نہ تم پر کوئی آنچ آئے گی۔“ چندرا دیوی نے

اسے دلا سادیا۔

”کیا میں نے آپ کو بتایا نہیں کہ دھونی مال اور راکھی سمیت کسی دوسرے شہر فرار ہو گیا ہے۔“
وہ بولی۔ ”مجھے اس کے متعلق کچھ علم نہیں کہ وہ کہاں گیا.....؟“ اس کا ہتا چلانا میرے لئے ناممکن
سا ہے۔“

”وہ کہیں نہیں گیا بلکہ ایک دور دراز مقام پر ایک دیرانے میں بنے ہوئے مکان میں روپوش
ہے جہاں اس نے سارا مال جمع کیا ہوا ہے۔“ چندرا اسے بتانے لگی۔ ”وہ حالات کے ٹھنڈا ہونے
کے بعد وہاں سے جائے گا۔ راکھی بھی اس کے ہمراہ ہے۔ اس نے راکھی کو کھلونا اور مہرہ بنایا ہوا ہے۔
راکھی کو وہ فرار ہونے تک ساتھ رکھے گا۔ پھر اسے قتل کر کے احاطے میں درخت کے نیچے جوڑ دیا ہے۔
اس میں اس کی لاش دفن کر کے فرار ہو جائے گا۔ راکھی اس کے فریب میں آگئی ہے اور وہ استغنی
دے کر اس کے ساتھ ہی ہے۔ میں تمہیں وہاں لے جاؤں گی۔ تم اس مورتی کے کارن اسے
زیر کر لو گی۔“

”یہ سب کچھ آپ کو کیوں کر..... کیسے..... اور کس طرح معلوم ہوا.....؟“ ندانے حیرت
اور تجسس سے کہا۔ ”جب آپ اتنا کچھ جانتی ہیں تو اسے قانون کے حوالے کیوں نہیں کئے دیتی ہیں۔
وہ ایک مفروضہ قاتل، ذکیت اور بزن بھی ہے۔“

”چوں کہ تم میری ذات سے واقف نہیں ہو اس لئے یہ بات کہہ رہی ہو.....؟ چندرا نے اسے
سمجھانے کے انداز سے کہا۔ ”تمہیں آم کھانے سے مطلب ہونا چاہئے..... پڑ گئے سے نہیں.....
چوں کہ مجھے تمہارے باپ دھلوانے اور قانون سے بچانا ہے اس لئے میں تم سے کام لے رہی
ہوں..... میرے ایک ٹیلی فون کرنے کی دیر ہے۔“ پولیس چھاپہ مار کر دونوں کو گرفتار کر لے گی.....
میں راکھی کو بھی بچانا چاہتی ہوں۔ کیوں کہ اس نے راکھی کو بلیک میل کر کے اپنا دست راز بنا کر اس
کی عزت اور زندگی تباہ کر دی ہے..... تم یہ مورتی لے کر جاؤ گی۔ اس کے مکان کے احاطے میں
دو خون خوار بھوکے کتے جن کی خوراک انسانی گوشت ہے پہرے اور اس کی حفاظت پر مامور ہیں
..... کسی کے داخل ہونے کی صورت میں اسے منٹوں میں چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔“
”لیکن ایسی صورت میں..... میں مکان کے اندر کیسے داخل ہو سکتی ہو.....؟“ ندانے ہم
کر کہا۔

”یہ مورتی تمہاری حفاظت کرے گی؟“ چندرا نے کہا۔ ”جب تم یہ مورتی ان دونوں کتوں
کو دکھاؤ گی تو اس میں سے شعاعیں نکل کر انہیں نہ صرف چپ کرادے گی بلکہ بے ہوش بھی کر دے
گی۔ پھر تمہیں مکان کے اندر داخل ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔“

تھوڑی دیر کے بعد دونوں ساتھ نکلیں، اس وقت رات ہو چکی تھی۔ چندرا دیوی نے گاڑی
مکان سے اتنی دور کھڑی کر دی کہ انجن کی آواز دھونی کو سنائی نہ دی۔ پھر وہ مکان کے عقبی دروازے
تک آئی..... دروازہ بند تھا..... چندرا نے دروازے پر ہاتھ رکھا تو وہ کھل گیا۔ اس کے کہنے
پر نندا کماری نے پرس میں سے مورتی نکال کر اسے مضبوطی سے تھام لیا۔ چندرا دیوی نے اسے
اندرا داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ اس نے دھڑکتے دل سے قدم رکھا تو چندرا دیوی نے دروازے کے
دونوں پٹ بند کر دیئے۔

احاطے میں گپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن اس مورتی میں جو ہیرے
نصب تھے ان کی روشنی نے تاریکی کا سینہ چیر دیا تھا..... اس کے کچھ دونوں خوں خوار کتے ایک سمت سے
نکل کر اس کی طرف لپکے۔ وہ بری طرح سہم گئی۔ دہشت زدہ سی ہو کر رہ گئی پھر اس نے فوراً ہی سنبھل
کر مورتی کا رخ ان کی طرف کر دیا۔ اس کی آنکھوں سے شعاعیں نکل کر ان دونوں کتوں پر پڑیں
تو وہ فوراً ہی بے ہوش ہو گئے اور مرے ہوئے جانوروں کی طرح زمین پر پڑے تھے۔

نندا کماری کی جان میں جان آئی۔ اس کے سینے میں سانسوں کا تلاطم جو پچھلے کھار ہا تھا اس
میں رفتہ رفتہ کمی آنے لگی۔ پھر وہ اس سمت بڑھی جس کمرے کی کھڑکی سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ یہ کمرہ
خواب گاہ تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں بڑی سی میز تھی۔ اس پر نوٹوں کی گڈیاں بڑے قریبے
اور سلیٹے سے لگی ہوئی تھیں۔ اس میں اس کی رقم بھی شامل تھی۔ اس کے علاوہ سونے کے زیورات بھی
تھے۔ ایک ریوالتور چاقو بھی تھا..... راکھی اور دھونی سامنے بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

دھونی نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ ”آج کے اخبارات میں نہ صرف میری اور نندا
کماری کی روپوشی کی خبر ہے بلکہ تمہاری بھی..... پولیس ہم تینوں کی گرفتاری کے لئے چھاپے مارتی
پھر رہی ہے۔“

”تم نے یہ جو دو کروڑ کی رقم بینک سے لوٹی اور مختلف جگہوں سے ڈاکے مار کر اسی لاکھ روپے
حاصل کئے۔“ راکھی کہنے لگی۔

”دھونی جان.....! یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے دوسا تھیوں کو کس لئے قتل کیا.....؟ جب کہ انہوں
نے تمہارا ساتھ دیا۔ وہ بڑے اچھے ساتھی تھے..... وہ زندہ ہوتے تو کیا تمہارا اور ساتھ نہ دیتے.....
؟ رقم میں اور اضافہ نہ ہوتا۔“

”ایک تو وہ بڑے خطرناک اور پیشہ ور مجرم تھے اور جیل سے مفروضہ بھی..... وہ مجھ سے پچاس
فیصد حصہ مانگ رہے تھے..... بلکہ ان کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ مجھے قتل کر کے پورا مال ہضم
کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے میں نے انہیں راستے سے ہٹا دیا۔“

”میری ایک دو باتیں سنو دھونی؟“ راکھی کہنے لگی۔ ”میں تم سے کوئی حصہ نہیں مانگتی۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ تم نے میری ان کے ساتھ جو قابل اعتراض حالت میں فلم بنا کر مجھے اس بات پر بلیک میل کیا کہ میں تمہارا ساتھ دوں..... اس کے علاوہ میں نے تمہارے کہنے پر نندا کماری کے دل میں دولت کا لالچ پیدا کیا کہ وہ رقم ہضم کر لے..... میں نے اسے غیر محسوس انداز سے ڈکیتی کی واردات پر اکسایا اور اس کا رہی اور تم سفلی علوم کے ماہر جو سنوف لاکر دیتے رہے تھے میں اسے چائے میں ملا کر پلاتی رہی..... میری ان کوششوں سے وہ آمادہ ہو گئی..... اور پھر میں نے بیس لاکھ کی رقم تمہیں دفتر سے لاکر دی..... اس لئے کہ تم نے مجھے مجبور کیا اور دھمکی دی کہ اگر میں نے رقم نہیں لاکر دی تو فلم اور تصویریں پولیس کو دے دوں گا۔“

”سنو..... میرا جو مشن تھا وہ پورا ہو گیا ہے۔“ دھونی نے کہا۔ ”یہ کل تین کروڑ ساٹھ لاکھ کی رقم ہے اور چالیس لاکھ کے زیورات ہیں۔ میں کل صبح ہوتے ہی بہرہ ور بدل کر کلکتہ چلا جاؤں گا۔ وہاں سے نیپال..... نیپال جانے سے پہلے اس رقم کو غیر ملکی کرنسی میں تبدیل کر دوں گا۔ یہ زیورات بھی فروخت کر دوں گا، دھنی جاکر زندگی گزاروں گا۔“

”کیا مطلب.....؟“ راکھی نے حیرانگی سے کہا۔ ”کیا تم مجھے نہیں لے جاؤ گے.....؟“

”مطلب یہ ہے کہ میں تم سے اتنا کھیل چکا ہوں کہ اب تم میں کوئی دل کشی محسوس نہیں کر رہا ہوں۔ تم سے میرا جی بھر چکا ہے۔“ وہ بولا..... ”میں جاتے جاتے تمہیں وہ فلم اور تصویریں دیتا جاؤں گا۔ تاکہ.....“

”لیکن پولیس مجھے بیس لاکھ کی رقم.....“

راکھی کا پورا جملہ اس نے نہیں سنا۔ وہ تیزی سے مکان کے اندر داخل ہو کر اس دروازہ پر پہنچی تو دھونی کہہ رہا تھا۔

”تم کسی بات کی چٹا نہ کرو..... میں تمہیں اس دنیا سے نجات دلا دوں گا تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بچے بانسری۔“

”کیا مطلب.....؟“ راکھی نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”میں بتاتی ہوں کہ کیا مطلب ہے.....“ نندا کماری نے کہا۔

”یہ تمہیں موت کے منہ میں دھکیل کر اس احاطے میں جو گڑھا ہے اس میں دفن کر دینا چاہتا ہے.....“

نندا کماری کی آواز سنتے ہی دونوں اپنی اپنی جگہ سے اس طرح اچھل پڑے جیسے انہیں کرنٹ لگا ہو۔

ان دونوں کو اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا، مندا کماری کو دیکھ کر راکھی کو خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی تھی۔ اس کے دل کو تقویت ہوئی تھی۔ ڈھارس سی بندھی تھی کیوں کہ دھونی اب اسے قتل کر کے تمام رقم سمیت دھنی فرار ہو جانا چاہتا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ دھونی سے کس طرح چھٹکارا پا کر اپنی زندگی بچا سکتی ہے..... اگر باہر خون خوار کتے نہ ہوتے تو وہ کسی نہ کسی طرح دھونی کو بے ہوش کر کے قتل جاتی..... ان کتوں کو دیکھ کر اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ دھونی نے اسے یہ بتا کر اور دہشت زدہ بھی کر دیا تھا ان کی مرغوب ترین غذا انسانی گوشت ہے۔ وہ چند لمحوں میں ایک سالم آدمی کو چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔

مندا کماری اس کے لئے اس لمحہ اوتار سے کم نہ تھی۔ اسے اس بات کا دکھ اور تاسف اور ہچکچاتا تھا کہ اس نے مندا کماری کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ وہ بڑی شرمندہ اور اپنے کئے پر نادم تھی۔

لیکن مندا کماری کس طرح سے اندر آ گئی.....؟ کتوں نے کیسے اسے اندر گھسنے دیا.....؟ اور پھر اسے یہاں کا پتا کیسے چلا.....؟ دھونی نے اس کے سوا کسی کو بھی نہیں بتایا تھا۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں یلغار کرنے لگے۔

دھونی ایک لمحے کے لئے بھونچکا سا ہو گیا..... اس کے ذہن میں بھی وہی خیالات جنم لے رہے تھے جو راکھی کے ذہن میں جنم لے رہے تھے..... اس کے خون خوار آدم خور کتوں نے مندا کماری کو کیسے اندر گھسنے دے دیا۔ اس کے سوا کوئی بھی شخص اندر گھس نہیں سکتا تھا..... اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز امر یہ تھا کہ اس جگہ کا پتا مندا کماری کو کیسے چلا.....؟

”دھونی.....!“ راکھی نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا..... ”ابھی تم نے جو کچھ کہا وہ سچ ہے.....؟ مندا کماری جو کہہ رہی ہے..... کیا وہ بھی سچ ہے.....؟ پلیز! دھونی..... سچ بتاؤ۔“

”میں تم سے مذاق کر رہا تھا میری جان راکھی.....!“ وہ راکھی کو بازوؤں کے حصار میں بھر کے کہا۔

”جو بات مذاق مذاق میں کہی جاتی ہے اس کے پیچھے سچائی ہوتی ہے۔“ مندا کماری بولی۔

تم اس حرام زادے، ذلیل اور کینے اور کتے کی باتوں میں نہ آنا..... ایسا لگتا ہے کہ یہ حرام کی اولاد ہے۔“

دھونی کو اس لمحے ایسا محسوس ہوا کہ مندا کماری نے اسے ساری دنیا کے سامنے نہ صرف ذلیل و خوار کر دیا ہے بلکہ اس کے منہ پر تھوک دیا ہے..... جو تارا ہے..... وہ راکھی کو بازوؤں سے نکال کر مندا کماری سے بولا۔

”میں پہلے تمہارا انٹرویو لے لوں..... یہ بتاؤ کہ تم کتوں سے سچ کر اندر کیسے آ گئی ہو.....؟“

”تمہارے کتے..... خون خوار اور آدم خور..... انسانی خون اور گوشت کے پیاسے اور بھوکے.....؟“ مندا کماری ہنس کر بولی۔

”وہ مجھے دیکھتے ہی ہینگی بلی بن گئے..... میں نے انہیں بے جان کر دیا ہے۔ اب ان میں زندگی نہیں رہی.....“

”تم جھوٹ بول رہی ہو..... ایسا نہیں ہو سکتا.....؟“ وہ دہاڑا ”ان کتوں پر میرے سوا کوئی قابو نہیں پاسکتا.....؟“

”اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے تو کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر برآمدے میں دیکھ لو۔“ مندا کماری نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”تمہیں میرے جھوٹ اور سچ کا پتا چل جائے گا۔“

دھونی نے اس کھڑکی کے پاس جا کر جو برآمدے میں کھلتی تھی اس کے پٹ کھول کر باہر جھانکا..... اس نے دیکھا کہ اس کے دونوں پالتو کتے واقعی بے جان پڑے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ

وہ دنیا سدا حار چکے ہیں۔

”تم نے کیا کیا جو وہ ختم ہو چکے ہیں.....“ دھونی نے اس کی طرف مڑ کے دیکھا۔ ”کیا انہیں گوشت میں زہر ملا کر کھلا دیا؟ اگر تم نے ایسا کیا ہے تو میں تمہیں کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“

اس کا چہرہ تھمتھا اٹھا۔

”یہ اس وقت کی بات ہے جب تم قانون کے ہاتھوں سے بچ جاؤ.....“ مندا کماری بولی۔

پہلے اپنی خیر مناد.....“

”یہاں کا پتہ تمہیں کس نے بتایا.....؟“ وہ غرایا۔ ”راکھی اس لئے بتا نہیں سکتی کہ وہ میرے

پاس اس وقت سے ہے جب سے اسے لایا ہوں..... اس کے پاس موبائل فون نہیں ہے..... اور

یہاں بھی کوئی فون نہیں ہے.....“

”میں تمہاری بوسہ دیتی ہوئی پہنچی ہوں تاکہ اپنا خصہ وصول کروں۔“ مندا کماری نے جواب

دیا۔ ”اس لئے کہ اسے کمپنی کو واپس کر دوں..... بلکہ ساری دولت قانون کے حوالے کر دوں اور تمہیں

بھی..... اس لئے کہ تم قاتل ہو..... اور راکھی کو بھی قتل کرنا چاہتے ہو..... میں نے تمہاری ساری

گفتگو کھڑکی کے باہر کھڑے ہو کر سن چکی ہوں۔“

”ویل ڈن..... مندا کماری.....!“ وہ قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسا ”تم نے یہاں آ کر

میری مشکل حل کر دی..... تم نے راکھی کے بارے میں بالکل سچ کہا ہے کہ میں واقعی راکھی کو قتل

کر کے احاطے میں جو گڑھا ہے اس میں دفن کرنے والا تھا..... لیکن اب اس گڑھے کو دو لاشوں سے

بھرنا ہوگا..... یہ رقم جو ٹیبل پر رکھی ہوئی ہے اس میں سے ایک کوڑی بھی کوئی نہیں لے جاسکتا.....

نہ میں تمہیں دوں گا..... اور پھر موت کے منہ میں جانے والے کس طرح سے یہ دولت لے جاسکتے ہیں۔“

”سنو..... حرام زادے.....!“ مندا کماری تنگی سے بولی۔ ”میں اس لئے آئی ہوں کہ یہ

ساری دولت اور تمہیں قانون کے حوالے کر دوں..... تم نے مجھے اور راکھی کو اپنے سفلی علم سے خوب

بے وقوف بنایا۔ اب تم جیل جانے کے لئے تیار ہو جاؤ.....“

دھونی کی نظر ابھی تک مندا کماری کے ہاتھوں پر نہیں پڑی تھی۔ جیسے ہی اس نے مورتی

کو دیکھا اور اچھل پڑا۔

”یہ مورتی.....؟“ وہ حیر زدہ لہجے میں بولا۔ ”اس میں تو ہیرے جڑے ہوئے ہیں..... تم کس

لئے لائی ہو..... یہ سو نے کی بنی ہوئی ہے..... اس کی مالیت کروڑوں کی ہوگی..... کیا تم اسے بتاؤ

کے کسی مندر سے لائی ہو.....؟“

”میں یہ مورتی تمہارے ہاتھ فروخت کرنے لائی تھی..... تم نے جو راکھی سے باتیں کیں،

مجھے اور اس غریب کو جو فریب دیا اس نے دل توڑ دیا..... راکھی کا بھی دل ٹوٹ گیا۔ تم سے ایسی امید

ہرگز ہرگز نہیں تھی۔“

”لاؤ..... یہ مورتی مجھے دے دو.....“ دھونی نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”اب یہ تمہارے کسی

کام کی نہیں ہے۔“ اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

”نہیں..... میں تمہیں کسی صورت میں نہیں دوں گی..... چلو راکھی.....! ہم یہاں سے چلتے

ہیں..... کیا تم اس بات کے لئے تیار ہو کہ یہ رقم اور اس کتے کو قانون کے حوالے کر دوں..... کیا تم

میرا ساتھ دو گی.....؟“

”ہاں بہن.....!“ دھونی کو زور سے دھکا دیا تو وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا فرش

پر گر پڑا۔ ”میں تمہارا ساتھ دوں گی۔ چلو..... ہم یہاں سے نکل کر کسی قریبی پولیس اسٹیشن چلتے

ہیں..... اور.....“

دھونی فوراً ہی سنبھل کر کھڑا ہو گیا اور اس نے جیب سے ریوالور نکال کر ان دونوں کو نشانے کی

زد میں لے لیا۔

”خبردار.....! جو تم نے یہاں سے جانے کی کوشش کی.....؟ یہ مورتی مجھے دے دو..... اور

اگر مورتی نہیں دی تو پھر بھی میں تم دونوں کو خون میں نہلا دوں گا.....“

اسی وقت چند رادیوی اندر داخل ہوئی..... دھونی اسے دیکھ کر چونکا اور حیرت سے پوچھا۔

”تم کون ہو..... کیا تم بھی مندا کماری کے ساتھ آئی ہو.....؟“

”ہاں میں..... مندا کماری کے ساتھ آئی ہوں۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”خبردار..... تم نے جو گولی چلائی اور ان دونوں کی جان لینے کی کوشش کی..... اس لئے کہ تم بھلائی سرکاری مہمان بننے والے ہو۔“

تم بن بلائی مہمان ہو لیکن ہو غضب کی.....“ دھونی انگلیوں میں ریوا لور نچاتے ہوئے چندرا دیوی کو گرسنہ نگاہوں سے گھورنے لگا۔ ”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہیں مہمان بنناؤں..... تم سے جی بھر کے جی بھلاؤں..... بائی دے دے تم ایسی حسین شے ہو کہ تم سے برسوں میں بھی دل نہ پہلے..... پہلے میں یہ راستے کے پتھر تو ہٹا دوں تاکہ ہم آزادی سے جشن مناتے رہیں..... اور ہاں..... یہ سندرا اور قیمتی مورتی تو دے دو.....“ اس نے مندا کماری سے کہا۔

”صرف ایک شرط پر یہ مورتی تمہیں دان کی جاسکتی ہے۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”ویسے تم جو سہتا دیکھ رہے ہو وہ پورا نہیں ہوگا لیکن جیل میں پھانسی پر چڑھنے تک میرا سہتا دیکھتے رہنا۔ یہ تمہاری قسمت میں لکھا ہے۔“

”یہ تم نے جیل..... جیل..... کی کیا رٹ لگا رکھی ہے؟“ وہ تمسخر سے بولا۔ ”میں سنے نہیں دیکھتا۔ میں حقیقت کی دنیا میں رہنے والا شخص ہوں..... میں تمہارا سہتا جو دیکھ رہا ہوں اسے پورا کر کے یہاں سے چلا جاؤں گا..... مندا کماری مرنے سے پہلے یہ مورتی مجھے دے دو..... اس لئے کہ تم اسے پر لوک میں لے جانے سے رہیں۔“

”کچھ دیر کی بات ہے کہ کون پر لوک جاتا ہے۔ یا جیل جاتا ہے معلوم ہو جائے گا۔“ مندا کماری بولی۔

”میں کہتا ہوں کہ بکواس مت کرو..... باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔“ وہ دھاڑا..... ”میں نہیں چاہتا کہ وقت ضائع ہو..... میں تمہاری اس حسین ساتھی سے دل بھلانا چاہتا ہوں..... اور تمہاری اور راکھی کی سادھی بھی تو بنانی ہے۔“

اس شبہ کام میں دیر کیوں کر رہے ہو گولی کیوں نہیں چلا دیتے.....؟“ راکھی بولی۔ ”صرف دھمکیاں دینے پر اکتفا کر رہے ہو؟“

”بات یہ ہے راکھی.....!“ چندرا دیوی ہنس کر بولی۔ ”اصل میں اس ریوا لور میں ایک گولی بھی نہیں ہے اس لئے یہ خالی خولی دھمکیاں دے رہا ہے..... گولیاں ہوتیں تو اب تک چلا چکا ہوتا۔“ ”یہ تمہیں کیسے نظر آ گیا کہ اس میں گولی نہیں ہے.....“ دھونی نے استہزاء سے لہجہ میں کہا۔ ”یہ دیکھو..... میں مندا کماری کو پہلے نشانہ بناتا ہوں..... پھر راکھی کو..... میں اپنا ریوا لور ہر وقت لوڈ رکھتا ہوں۔“

اس نے یکے بعد دیگرے تین مرتبہ لیلی دہائی..... فضا میں ٹھس ٹھس کی آواز گونج کر رہ گئی..... وہ حیران رہ گیا۔ اسے جیسے یقین نہیں آیا..... اس نے پھر یکے بعد دیگرے تین مرتبہ لیلی دہائی۔ ایک گولی بھی نہیں نکلی۔

پھر وہ بیچ و تاب کھاتا ہوا راکھی سے بولا۔ ”کتی..... حرام زادی..... یہ تیری حرکت ہوگی۔ جب میں واش روم میں تھا تب تو نے میرے ریوا لور سے گولیاں نکالی ہوں گی..... لاؤ مجھے گولیاں دے۔ ورنہ تجھے چر کر رکھ دوں گا۔“

”مجھے پہلے ہی تمہاری باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم مجھے دھوکا دے کر دولت لے کر فرار ہو جاؤ گے۔“ راکھی کہنے لگی۔ ”جب میں نے سوچا کہ ریوا لور پر کیوں نہ قبضہ کر لوں اور تمہیں واش روم میں بند کر کے رقم لے کر بھاگ جاؤں..... پھر میں نے سوچا کہ اتنی بڑی رقم اکیلی لے کر کہاں جاؤں..... قانون کی گرفت سے کیسے بچوں گی..... کیوں نہ یہ رقم پولیس کے حوالے کر دوں..... لیکن تم نے سبز باغ دکھانے شروع کئے میرے لئے اس کے سوا چارہ نہیں رہا تھا کہ تمہارے ساتھ رہوں..... میں نے گولیاں نہیں نکالیں۔“

”پھر گولیاں گئیں کہاں.....؟“ وہ پاگلوں کی طرح بولا۔ ”تو جھوٹ بول رہی ہے..... میں کہتا ہوں گولیاں دے..... ورنہ.....“

”اول تو میرے پاس گولیاں نہیں ہیں..... اگر ہوتیں بھی تو نہ دیتی..... کیا مرنے کے لئے دیتی.....؟“ راکھی بات کاٹ کر بولی۔

”گولیاں میرے پاس ہیں.....“ چندرا دیوی نے اپنی مٹھی کھولی۔ اس کی مٹھی میں چھ گولیاں دبی ہوئی تھیں۔

”یہ تمہارے پاس کہاں سے اور کیسے آئیں.....؟“ وہ بھونچکا سا ہو کر بولا۔ ”پھر وہ تیزی سے چندرا دیوی کی طرح لپکا تاکہ اس کے ہاتھ سے ریوا لور چھین لے۔ راکھی نے اس کی ٹانگوں میں اپنی ٹانگ اڑادی تو وہ منہ کے بل گرا۔ ریوا لور اس کے ہاتھ سے جھوٹ کر فرار پر اور راکھی کے قدموں کے پاس گرا۔ راکھی نے پھرتی سے ریوا لور اٹھا کر مندا کماری کی طرف اچھال دیا۔

جب وہ سنسبھل کر اٹھ کھڑا ہوا تو اس نے دیکھا کہ ریوا لور راکھی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اسے نال کی زد میں لئے کھڑی ہے۔

”اب بازی تمہارے ہاتھ سے نکل چکی ہے.....“ چندرا دیوی نے اس کے پاس جا کر اس کے سینے پر ریوا لور کی نال رکھ دی۔ ”کیوں نہ تمہیں آکاش پر بھیج دیں..... تمہاری دولت جو تم نے لوٹی ہوئی ہے وہ ہم تینوں آپس میں بانٹ لیں۔“

دھونی نے جواب دینے کی بجائے جھپٹ کر چندرا دیوی کے ہاتھ سے ریوالتور چھین لیا۔ اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ فرش پر تو نہیں گری البتہ دیوار سے جا لگی۔ لیکن وہ بڑے سکون اور اطمینان سے کھڑی رہی۔

اب بازی کس کے ہاتھ میں ہے..... دھونی استہزائیہ لہجے میں بولا اور اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ”میرا خیال ہے کہ ڈرامے کا کلائمکس ہونا چاہئے..... پہلے میں مندا کو..... پھر راکھی کو..... پھر تمہیں خواب گاہ میں لے جاؤں گا۔“ چندرا دیوی مسکرا دی..... اس نے ریوالتور کی طرف دیکھا دھونی اس وقت مندا کمار کی کونشانہ بنارہا تھا۔ تب ایک دم سے اس کے ہاتھ سے ریوالتور چھوٹ کر فرش پر گرا۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے اس کے ہاتھ میں ریوالتور انگارہ بن گیا ہو..... اس کی ہتیلی اور انگلیاں جھلس اٹھی تھیں۔ اس نے خوف زدہ ہو کر پھٹی پھٹی نظروں سے ریوالتور کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے دھونی.....!“ چندرا دیوی نے انجان بن کر کہا۔ ”تم نے گولی نہیں چلائی۔ ریوالتور پھینک دیا..... کیا تم ان دونوں کو شوٹ کر کے میرے ساتھ دل کے ارمان پورے نہیں کرو گے.....؟“

اس نے ہاتھ جھٹکتے اور سہلاتے ہوئے چندرا دیوی کی طرف دیکھا۔ پھر اس نے اپنا دواہمہ سمجھ کر ریوالتور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پھر اسے چھو کر فوراً اٹھالیا۔ وہ انگارے کی طرح دھک رہا تھا۔ پھر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

چندرا دیوی نے آگے بڑھ کر ریوالتور اٹھالیا۔ ”حیرت کی بات ہے کہ تم اپنے ریوالتور سے دہشت زدہ ہو گئے.....؟“ پھر وہ بولی۔ ”تم نے اپنا ارادہ ملتوی کیوں کر دیا.....؟ یہ لو..... اسے سنبھالو..... ان دونوں کو اپنے راستے سے ہٹا دو.....؟“

چندرا دیوی نے ریوالتور اس کی طرف اچھال دیا۔ دھونی نے یہ دیکھ کر چندرا دیوی کو کچھ نہیں ہوا۔ اس نے ریوالتور کو پکڑ لیا۔ اسے ایسا لگا جیسے اس کے ہاتھ میں انگارہ آ گیا ہو۔ اس کا ہاتھ پھر جھلس گیا۔ اس نے ریوالتور پھینک دیا پھر وہ کراہتا ہوا باورچی خانہ کی طرف بھاگا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں سبزی کاٹنے کی چھری تھی۔

”تم یہ چھری کیوں اور کس لئے لائے ہو.....؟“ چندرا دیوی نے ہنس کر پوچھا۔ ”یہاں سبزی ترکاری تو نہیں ہے.....؟“

”اس لئے کہ ان دونوں کو مولیٰ گاجر کی طرح کاٹ دوں.....“ اس نے جواب دیا۔ ”معلوم نہیں..... یہ ریوالتور کیسے گرم ہو گیا..... اس نے میرا ہاتھ جھلسا دیا..... ایسا کبھی نہیں ہوا..... معلوم نہیں..... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟“

”جادو ہو رہا ہے.....“ چندرا دیوی بولی۔ ”اب تم قانون کے ہاتھوں سے نہیں بچ سکتے.....“

”یہ جادو نہیں..... میں کسی جادو واد کو نہیں مانتا.....“ وہ رعونت سے بولا..... ”قانون میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا.....“

”میں بتاؤں یہ جادو ہے.....؟“ چندرا دیوی بولی۔ ”اب تم جادو کا کمال دیکھو۔“

چندرا دیوی نے ایک متر پڑھ کر اس پر پھونکا..... اس کے ہاتھ میں جو چھری تھی وہ ایک دم سانپ بن گئی۔ دھونی نے اپنے ہاتھ میں چھری کی بجائے سانپ جو دیکھا تو وہ خوف و دہشت سے اچھل پڑا اس نے سانپ کو فرش پر پھینک دیا۔ اس کی سٹی گم ہو گئی۔ سانپ فرش پر کرتے ہی چھری بن گیا۔ اس کے ادا سان خطا ہو گئے تھے۔

”میرا خیال ہے کہ اب تم اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو.....“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”تم قانون سے جیت نہیں سکتے.....“

”میں ساری رقم لے کر ابھی اور اسی وقت یہاں سے جا رہا ہوں تم تینوں کو قتل کر کے۔“ وہ حواس باختہ ہو کر بولا۔ ”تم شعبہ بازی دکھا رہی ہو..... مجھ پر قانون ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ لیوں کہ اس کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے.....“ اس نے چھری کو لات مار کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر اس نے الماری پر رکھا ہوا لٹچی کیس اٹھایا اور میز پر رکھی ہوئی لوٹوں کی گڈیاں اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ پھر ایک دم سے ٹھک کر رک گیا۔ دہشت زدہ ہو کر اچھلا..... وہ لوٹوں کی گڈیاں چھوٹے چھوٹے سانپ بن کر کلبلا رہے تھے۔

”میری رقم..... زیورات..... تم نے انہیں سانپ بنادیا.....“ وہ چندرا دیوی کی طرف بڑھا۔ ”میں تمہیں جان سے مار دوں گا۔“ چندرا نے ایک متر پڑھ کر پھونکا تو وہ بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا۔ اس نے بڑی جدوجہد اور کوشش کی کسی نہ کسی طرح چندرا دیوی کا گلا دبوچ لے۔ وہ جنبش بھی نہ کر سکا۔ چندرا دیوی نے کہا۔

”اس صورتی میں ٹیپ ریکارڈ، اور ٹرانسمیٹر اور کیمرہ نصب ہے۔ تمہاری ساری گفتگو نہ صرف اس صورتی میں موجود ٹیپ میں ریکارڈ ہیں بلکہ پولیس اسٹیشن میں ٹیپ ہو گئی ہے۔ اس لئے علاوہ تمہاری شکل تک محفوظ کر لی گئی ہے۔ اور پولیس آ رہی ہے..... تھوڑی دیر کی بات ہے وہ یہاں پہنچنے والی ہے۔ لہذا تمہارا کھیل ختم..... راکھی اور مندا کمار کی تم دونوں مل کر اس لٹچی میں تمام رقم اور زیورات رکھ دو..... اس نے جو کچھ کیا اسے بھگتنا ہے۔“

”لیکن یہ تو سانپ بنے ہوئے ہیں۔“ مندا کمار بولی۔ ”کہیں یہ ہمیں ڈس نہ لیں۔“

ہکاڑ دیا۔ وہ سخت مشتعل ہو رہی تھی۔ چندرا دیوی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ اسے دھونی کے سامنے سے ہٹا دیا۔

”اتنا کافی ہے۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”اس کا چہرہ کئی دنوں تک درد کرتا رہے گا۔ وہ مارا اور زلت کبھی نہیں بھولے گا۔“

”اب کیا میں بھی اس سے اپنا بدلہ لے سکتی ہوں۔“ راکھی نے درد سے کراہتے اور ڈرتے ہوئے دھونی کی طرف دیکھتے ہوئے چندرا دیوی سے کہا۔ ”اس نے نہ صرف مندا کماری کی نامناسب تصویر بھی بنائیں بلکہ میری بھی..... تاکہ بلیک میل کر کے کٹھ پتلی بنا سکے..... محبت کے نام پر فریب دیا..... پھر ساری دولت لے کر اکیلا فرار ہونے کے لئے قتل کرنا چاہتا تھا..... رات میں نے موقع پا کر اپنی اور مندا کماری کی تصویریں الماری سے نکالیں اور نذر آتش کر دیں۔ لیکن اس سے انتقام کی جو حسرت دل میں ہے اسے پوری کرنا چاہتی ہوں..... کیا مجھے اجازت ہے.....؟“

”کیوں نہیں.....“ چندرا نے اس کا گال تھپ تھپایا ”لیکن اسے قتل کرنے یا قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دوں گی۔“

”میں صرف اس کے منہ پر تھوکوں گی.....؟“ راکھی نے یہ کہہ کر دھونی کے منہ پر دو مرتبہ تھوک دیا وہ تھلا کر رہ گیا۔

دور سے پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آواز سنائی دی۔ چندرا دیوی نے دھونی کو مورتی دکھاتے ہوئے کہا۔

”یہ نقلی مورتی ہے..... سونے کی نہیں ہے..... نہ یہ ہیرے ہیں بلکہ کیمرے کی آنکھ ہیں۔“ پھر اس نے توقف کر کے مورتی کی پشت پر سے ڈھکن ہٹا کر اس میں سے ٹرانسمیٹر اور ٹیپ ریکارڈ نکال کر دکھایا ”تم نے اپنی زبان سے جو کچھ کہا تھا وہ تمہارے لئے پھندا بن گیا ہے..... کاش! تم نے اچھے کام کئے ہوتے..... زندگی بھی اچھی گزرتی۔“

اسی وقت دروازہ کھلا، پولیس انسپکٹر اپنے سپاہیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ چندرا دیوی نے اسے جادو سے آزاد کر دیا تھا دھونی پولیس کو دیکھتے ہی غش کھا گیا۔

اگر پولیس اسٹیشن میں دھونی کی گفتگو ٹیپ نہ ہوئی ہوتی تو پھر مندا کماری اور راکھی کے لئے مصیبت کھڑی ہو جاتی۔ چندرا دیوی کی الیکٹرانک مورتی نے کام دکھایا تھا جس سے دھونی کیلر کردار کو پہنچا تھا۔ راکھی اور مندا کماری کو پانچ پانچ لاکھ روپے انعام ملا تھا۔ چندرا دیوی نے اس کا رتا سے کا سہرا ان دونوں کے سر باندھ دیا۔ اس نے مندا کماری اور راکھی کو سمجھایا تھا کہ وہ

ڈر لگ رہا ہے۔“

”ڈر نہیں.....“ چندرا دیوی بولی۔ ”تم دونوں جیسے ہی کسی سانپ کو پکڑو گی وہ نوٹوں کی گڈی اور زیور بن جائے گا..... اگر اس شیطان نے ہاتھ لگایا تو وہ سانپ بن جائیں گے۔“

راکھی اور مندا کماری نے جیسے ہی ڈرتے ڈرتے دوسانپوں کو پکڑا وہ نوٹوں کی گڈی بن گئیں۔ ان کے دل سے خوف نکل گیا۔ وہ ہنس پڑیں۔ پھر انہوں نے جلدی جلدی رقم اور زیورات اٹپچی میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔

”مندا کماری اور راکھی.....!“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”اس سے تمہیں کسی بات کا بدلہ لینا ہے؟“

”ہاں..... مجھے لینا ہے.....“ مندا کماری بولی۔ ”اس نے مجھے بہت بری طرح منہ پر گھونسا مارا تھا وہ میں نہیں بھول سکتی۔“

”تم اس کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتی ہو.....؟“ چندرا نے پوچھا۔ ”دل میں جو حسرت ہے وہ پوری کر لو۔“

”میں چاہتی ہوں کہ جوتی سے اس کے منہ پر اتنا ماروں کہ یہ مرتے دم تک نہ بھول سکے؟“ مندا کماری نے دھونی کو نفرت غصے اور حقارت سے گھورتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں کس طرح سے ماروں.....؟ وہ مزاحمت کرے گا اور مجھے مارے گا۔“

”یہ نہ تو اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا ہے، نہ مزاحمت اور نہ ہاتھ پیروں کو حرکت دے سکتا ہے۔ میں نے اس کی ساری طاقت سلب کر دی ہے..... البتہ وہ ہر قسم کے مار کی تکلیف اور درد محسوس کرے گا۔“

مندا کماری بے خونی سے اس کی طرف بڑھی۔ پیر سے جوتی نکال کر وہ دھونی سے نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

”ذلیل..... کتے..... سور..... تو نے مجھے محبت کے نام پر بے وقوف بنایا..... رقم کے حصول کے لئے مجھے کس بری طرح مارا تھا۔“

اب بول..... کتے کے بچے..... تو نے سب کو دھوکا دیا۔ مجھے کھلونا بنائے رکھا..... اپنے ساتھیوں کو قتل کیا..... کیا فائدہ ہوا.....؟ کاش.....! میں تجھے قتل کر سکتی.....؟ لیکن میں تجھے قتل نہیں کروں گی..... اس لئے کہ تو فوراً مر جائے گا..... البتہ تیری ایسی درگت بناؤ گی کہ تو مرتے دم تک میری مار کی اذیت سہتا رہے گا۔“

پھر مندا کماری نے اس کے منہ پر جوتی برسانا شروع کی۔ اس کے چہرے کا جغرافیہ

”اس کالے سانپ کے بارے میں آپ کو کیسے علم ہوا.....؟ کیا آپ کو کسی نے بتایا.....؟“

”ہاں.....“ چند رادیوی نے بتایا کہ کل ایک سپیرا میرے پاس آیا تھا..... اس نے بتایا کہ یہ کالا سانپ جو تقریباً دس فٹ لمبا ہے اس نے نہ صرف ہری پورا اور آس پاس کی بستیوں کے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے بلکہ سپیروں کی بستی کے لوگوں کو بھی..... وہ اب تک کئی ناگنوں کو بھی لے گیا ہے..... اس کے ٹھکانے کا کچھ پتا نہیں..... وہ صرف چاندنی راتوں میں آتا ہے..... اس نے ہماری زندگی اجیرن بنا رکھی ہے..... وہ ایک ایسا سانپ ہے جو انسانی بہروپ بھی بدلتا ہے..... دھوکا اور فریب دینے کے لئے مردوں، نوجوان اور حسین لڑکیوں کا بہروپ بھر لیتا ہے..... دراصل وہ کسی ناگ دیوتا کے زیر اثر ہے۔ اس ناگ دیوتا کی آتما نے اسے کھ پتلی بنا رکھا ہے۔ اس کی ہتھکی کا ہم سپیرے مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں..... اسے تو صرف آپ ہی قابو میں کر کے اس کا خاتمہ کر سکتی ہیں..... اس سے نجات دلا سکتی ہیں۔ اس نے کہا۔

”یہ کالا سانپ کہاں سے آیا اور اس کی کہانی کب سے شروع ہوئی.....؟“

شریش نے

پوچھا۔

اسے پیاس لگی تھی اور پھر اسے اس بات کا بھی کوئی خیال اور احساس نہ رہا کہ اس چلچلاتی مہوے میں اس کی نوخیز بیٹی پیاس سے نڈھال ہو رہی ہوگی۔ اسے دو ایک گھونٹ پانی پینے دے.....

☆.....☆.....☆

”سبق.....؟“ چند راویوں نے کہا۔ ”جب لڑکیوں پر جوانی آتی ہے تو بہت سے چپے دیکھے لگتی ہیں..... ایسی لڑکیاں کسی بھی واقعہ، کہانیوں اور نصیحتوں سے سبق حاصل نہیں کرتی ہیں چوں کہ ان کے دل و دماغ پر بہت کچھ پانے کا ایک جنون سا ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں اس وقت تک ہوش نہیں آتا ہے جب تک ٹھوکر نہ لگ جائے۔ جب ٹھوکر لگتی ہے تو ان کے پاس آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں ہوتا ہے۔ اخبارات میں آئے دن بڑی عبرت ناک کہانیاں چھپتی رہتی ہیں تب بھی وہ ہوش کے ناخن نہیں لیتی ہیں۔ حیرت اور دکھ اس بات کا ہے کہ بیش تر تعلیم یافتہ لڑکیاں جو کہتی ہیں کہ اپنے آپ پر بہت زیادہ اعتماد ہے وہی سب سے پہلے غلامت کے اس دلدل میں جا گرتی ہیں۔“

”بات یہ ہے کہ میں کچھ دیر بعد ہری پور جارہی ہوں۔“ چندرا دیوی نے کہا۔
 ”کیا تمہارے پاس وقت ہے چلنے کے لئے.....؟“
 ”میرے پاس وقت ہو یا نہ ہو.....“ سریش کمار نے جواب دیا ”آپ کس لئے جارہی ہیں.....؟ کیا کوئی مشن ہے.....؟“

”ہری پور میں ایک کالے سانپ نے کوئی دو ماہ سے اس بستی اور قرب و جوار کی بستی کے لوگوں کو خوف و ہراس میں مبتلا کر رکھا ہے۔“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔ ”اس نے وہاں کئی لوگوں کو ڈس لیا ہے۔ بڑے بڑے سپیرے بھی اسے قابو میں نہ کر سکے..... کچھ بوڑھے اور پرانے سپیروں کا کہنا ہے کہ اس سانپ میں کسی ناگ دیوتا کی آتما حلول کر گئی ہے اس لئے وہ قابو میں نہیں آ رہا ہے۔ اس لئے میں اس سے وہاں کے لوگوں کو نجات دلانے جا رہی ہوں۔“

لیکن وہ اس کی مہلت دینے پر بھی تیار نہیں تھا..... جیسے اس کے لئے پل بھر بھی بے حد قیمتی ہے جان سے کہیں عزیز..... راستے میں نارنگیوں کے درختوں کی بھرا مٹی جن سے خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ اس کی بیٹی نے باپ سے کہا کہ اسے سخت پیاس لگی ہے۔ اسے صرف ایک نارنگی توڑنے دے یا خود توڑ کر دے دے..... باپ نے اس سے کہا کہ اس وقت ایک ایک لمحہ اس قدر قیمتی ہے کہ وہ اسے نارنگی توڑنے اور پانی پینے میں ضائع کرنا نہیں چاہتا ہے۔ واپسی میں اسے ایک نہیں دو درجن نارنگیاں توڑ کر دے گا۔

بیٹی کا پیاس سے برا حال ہو رہا تھا۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے چلتے چلتے باپ سے کہا۔
 ”بابا! تم اس طرح سے ہری پور بھاگے جا رہے ہو جیسے موت ہمارے پیچھے لگی ہوئی ہو.....؟“
 ”نہیں..... موت نہیں..... اگر موت تعاقب میں ہوتی تو میں کچھ دیر کے لئے رک جاتا.....“
 لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ جس قدر جلدی ہو سکے ہری پور پہنچ جاؤں کیوں کہ اس بستی کے سب سے بڑے زمیندار کی بیوہ منداکئی اپنی اکلوتی بیٹی کا بیاہ رہا ہے۔“
 سپیرے کی بیٹی..... باپ کی بات سن کر خاموش ہو گئی۔ بیاہ کی خبر سن کر اس کی ہموک پیاس ختم ہو گئی۔ اس خیال سے کہ جب کسی بڑے گھر میں شادی بیاہ کی تقریب ہوتی تھی کھانے کو نہ صرف بہت اچھا بلکہ بہت زیادہ کھانا بھی ملتا تھا۔ اس کے علاوہ اتنا کھانا گھر لے جانے دیا جاتا تھا کہ وہ ایک دن آرام سے کھایا جاسکے۔ پھر وہ باپ کے ساتھ تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

لیکن اصل بات اور حقیقت یہ نہیں تھی۔ سپیرے نے ایک مدت سے من میں رکھا تھا کہ منداکئی نے ہمارے سب سے بڑے مندر میں جا کر دیوی رتنا کی مورتی کے قدموں میں بیٹھ کر یہ منت مانی ہوئی تھی کہ جس دن اس کی بیٹی کی شادی ہوگی وہ سات غریب لڑکیوں کا جہیز اپنی گرہ سے دے کر ان کا بیاہ کر دے گی..... کون جانتا ہے کہ اس امید پر سپیرے نے یہ سوچا کہ شاید ان خوش قسمت لڑکیوں میں سے اس کی بھی بیٹی ہو..... اس نے کس بے چینی کرب ناک اذیت اور انتظار سے یہ دن کاٹے یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اسی لئے بھی وہ برق رفتاری سے جا رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ بہت سارے لوگ پہنچ جائیں اور اس کی بیٹی جہیز سے محروم رہ جائے۔

آج وہ اس لئے اپنی نو جوان بیٹی کو ساتھ لئے ہری پور جا رہا تھا کہ شاید اس کی غریبی منداکئی زمیندار کی نظر میں مسخ جائے اور اس کی بیٹی کی بے بس نو جوانی دیکھ کر اس کا دل مسخ جائے..... اور پھر اسے اتنا کچھ مل جائے کہ وہ اپنی بیٹی کے جہیز کا سامان کر سکے کیوں کہ جہیز نہ ہونے کے سبب لڑکی باپ کے سینے پر چٹان بن جاتی ہے..... جب لڑکی پیدا ہوتی ہے تو باپ کے وجود پر پھوڑا بن جاتی ہے۔ یہ پھوڑا اس وقت تک دکھتا رہتا ہے جب تک بیٹی کی شادی نہ ہو جائے ایک آس، امید

اور پہنٹا لئے جا رہا تھا۔ ہر آدمی پہنٹا دیکھتا ہے لیکن اس کے سینے جدا جدا ہوتے ہیں۔
 ماضی کے دنوں میں سپیروں کی دنیا میں لڑکیوں کے جہیز میں کوئی انوکھا قسم کا سانپ ہوتا تھا اور بس..... جتنا اچھا اور انوکھا اور نایاب قسم کا سانپ کوئی سپیرا اپنی بیٹی کے جہیز میں دے سکے اسے اتنا ہی اچھا داماد مل جاتا تھا۔ جب کسی سپیرے کی بیٹی نو جوانی کی دہلیز کی جانب بڑھنے لگتی تو اس کا باپ ایسے سانپ بیٹی کے جہیز میں دینے کے لئے کسی انوکھی قسم، نایاب اور کسی اعلیٰ نسل کے سانپ کی تلاش میں نکل جاتا..... ایسے سانپ کا حصول اتنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ ہر وہ سپیرا جس کی لڑکیاں ہوتی تھیں وہ ایسے سانپ کی تلاش میں جنگلوں اور ویرانوں میں بھٹکتا رہتا تھا جہاں سانپ، ناگئیں، اژدھے اور ناگ پائے جاتے تھے۔ جس سپیرے اور اس کی بیٹی کی قسمت ہوتی تھی مطلوبہ سانپ مل جاتا تھا۔ ان سپیروں کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ لڑکی جیسے ہی نو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے اس چٹان جیسے بوجھ کو سینے سے اتار پیسکے اور سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرے۔ چین کی بانسری بجاتا رہے۔ ہونے والا داماد لڑکی کے جہیز میں اس لئے سانپ کا طلب گار ہوتا تھا کہ سانپ ہی تو سپیروں کی روزی کا ٹھیکرا ہوتا ہے جس سپیرے کے پاس جتنا انوکھا اور نایاب قسم کا سانپ ہوتا تھا اس کی آمدنی اتنی ہی اچھی ہوتی تھی۔

وقت جیسے جیسے تیزی سے بدلتا جا رہا تھا..... ایسی بستی کے لوگوں کو دیکھ دیکھ کر جن میں عیسے نہیں رہتے تھے۔ ان کے رسم و رواج..... سپیروں کی دنیا سے الگ ہوتے تھے..... پھر سپیروں کو بھی سوچنا پڑا۔ کیوں کہ بعض اوقات ایسے سانپ نہیں ملتے جن کی تلاش میں برسوں بیت جاتے تھے۔ لڑکیاں نو جوانی کی دہلیز پھلانگ کر شباب کی حدود میں قدم رکھتی تھیں۔ اور پھر شباب کی آخری منزل بھی آ جاتی تھی..... پھر اس کی شادی ایسے سپیرے سے ہو جاتی تھی جس کی بیوی بچے چھوڑ مر چکی ہے یا اس سے عمر میں بیس، پچیس برس بڑا ہے۔ ایسے مرد سپیرے مجبوری کی بنا پر مرد والی کنوار یوں سے شادی کر لیتے تھے نو جوان سپیروں کو نو جوان اور حسین اور پر شباب لڑکیاں متاثر تو کرتی تھیں لیکن وہ جہیز میں سانپ لئے بغیر اسے اپناتے نہیں تھے۔

سپیروں کی برادری نے وقت حالات اور قرب و جوار کی بستیوں اور نئے زمانے کے پیش نظر اپنی کینچلی بدل ڈالی تھی۔ اور وہ بھی سانپ کی جگہ سونے چاندی کے ٹکڑوں کو اپنی بیٹیوں کی سب سے بڑی سفارش سمجھنے لگتے تھے۔ اس میں اتنی کشش اور طاقت اور جادو تھا کہ داماد لاکھ کی بد صورتی اور واجبی صورت بھی نظر انداز کر دیتا تھا۔ گو کہ سپیروں کے لئے ان کا حصول

اتنا آسان نہ ہوتا تھا لیکن سانپ کے مقابلے میں آسان تھا۔ وہ کوڑی کوڑی جمع کرتے تھے۔ سپیر اس وقت بھی یہی سوچ رہا تھا اور اس ناگ کا بچن بھی دیکھتا جا رہا تھا جو اس چھوٹی سی پٹاری کے سوراخ سے سر نکالے ہوا میں لہرا رہا تھا جو اس کی بیٹی کے سر پر کھی تھی دیکھنے والے مشکل سے اندازہ کر سکتے تھے کہ وہ کالا ناگ زیادہ زہریلا ہے یا اس لڑکی کی جوانی جو اس کے پھٹے ہوئے چھتروں سے دست گریاں ہو رہی تھی.....

آخر کار سپیر اسوچنے سوچنے اور خواب دیکھتا بستی میں جا پہنچا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور بستی کے دو ایک لوگوں سے معلوم بھی کر لیا کہ مندا کنی کی بیٹی کی بیاہ کی خبر بھی ہے اس کے ناتواں جسم میں تازگی پیدا ہو گئی۔ میلوں کی مسافت سے جسم میں جو کمزوری اور ٹھنکن پیدا ہوئی تھی وہ اتر گئی۔ اس کی جگہ توانائی اور ایک عجیب سی فرحت دوڑ گئی ہے وہ اور اس کی بیٹی پانی پیتے ہی ایک دم سے اس طرح تازہ دم ہو گئے جیسے انہوں نے پانی نہیں امرت پیا ہو۔ یہ سب کچھ خوشی کے کارن تھا۔ اس کی مرجھائی ہوئی آوازوں کا کنول از سر نو کھل گیا مندا کنی کی حویلی اب زیادہ دور نہیں تھی۔ لیکن وہ پہلے سے زیادہ تیز چلنے لگا تھا جیسے حویلی میلوں کی مسافت پر ہو۔ اس کی بھرپور نو جوان بیٹی اس کے قدم سے قدم ملا کر چلنے میں تھکن محسوس کرنے لگی۔

کم سن بچے کالے ناگ کو پٹاری سے جھانکتے دیکھ کر اور جوان لڑکے سپیرے کی بیٹی کے شانوں پر اس کے سیاہ بال لہراتے دیکھ کر سانپوں کا تماشا دیکھنے سپیرے کے ہمراہ ہوئے۔ جب تک مندا کنی کے مکان پر پہنچے جو ایک چھوٹی سی حویلی نما تھا اس کے ساتھ لوگوں کی بھیڑ چلنے لگی۔ اس بھیڑ میں جو قدم قدم پر اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کی وجہ صرف کالا ناگ نہیں تھا لڑکی کی جوانی تھی جو ایک حسین زہریلی ناگن سے کہیں غضب کی دکھائی دیتی تھی۔

سپیرے نے مندا کنی کی حویلی کے دروازے پر پہنچ کر اپنے سر سے سانپوں کی پٹاری اتاری۔ اس کی بیٹی نے بھی اپنے سر سے کالے ناگ والی پٹاری اتار کر زمین پر رکھ دی اور فرحت محسوس کرنے لگی۔

سپیرے نے بین بجانا شروع کی اور دونوں پٹاریوں کے ڈھکن کھول دیئے۔ قسم قسم کے سانپ پٹاریوں سے باہر نکل آئے۔ بچے سانپ دیکھ کر سہم گئے۔ خوف اور دہشت ان کے چہروں اور آنکھوں سے عیاں ہونے لگی۔ وہ سکڑ اور سمٹ کر ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر تماشا دیکھنے لگے۔ تجسس تھا جس نے انہیں ساکت و جامد کر دیا تھا۔ گاؤں کے کڑیل جوان بھی جولاڑے مرنے کو زندگی کا سب سے سہانا کھیل سمجھتے تھے ان

بے زبان کیڑوں سے دودو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ پھر سپیرے کی نو جوان بیٹی حسین اور سرکش اٹھان کی نہ ہوتی تو شاید وہ لوٹ جاتے۔

مگر نہ جانے سپیرے کی بین میں کیا جادو تھا کہ کوئی بھی سانپ اس لکیر سے باہر نہ نکلتا تھا جو اس نے بین کی نوک سے اپنے ارد گرد کھینچ دی تھی۔ کوئی نہیں کہتا اور نہ ہی سمجھ سکتا تھا کہ سپیرے اور اس کی بیٹی کے مرمریں، سڈول اور گداز بدن میں کیا طلسم ہے کہ کوئی بھی ان کی طرف کانٹے کو نہیں بڑھتا تھا۔

بین کی آواز سنی تو حویلی کی لڑکیاں بھی دوڑ کر باہر نکل آئیں۔

منداکنی کی بیٹی بھی جمرو کے میں کھڑی ہو کر سانپوں کا تماشا دیکھنے لگی۔

یوں تو گاؤں والوں کے لئے سانپوں کا تماشا ایک پرانی چیز تھی چوں کہ ان کے لئے کوئی تفریح نہ تھی اور وقت گزاری کا سامان نہ تھا..... اور پھر بہت کم سپیرے ادھر کا رخ کرتے تھے۔ یہ سپیرا بہت دنوں بعد آیا تھا۔ اکیلا نہیں آیا تھا بلکہ اس کے ساتھ ایک بھرپور نو جوان لڑکی تھی۔ سپیرے آتے تو ان کے ساتھ کوئی عورت نہ ہوتی تھی، لیکن یہ سپیرا ایسی لڑکی کو لے آیا تھا ہر قسم کے کاشاؤں سے کہیں دلچسپ، رنگین اور سنہرے رنگ کی طرح تھی..... مگر اس سے ہٹ کر آج اس سپیرے کی بین سے کچھ ایسی مدھ بھری تائیں نکل رہی تھیں اور اس کے سانپ جھوم رہے تھے کہ گاؤں والے بھی دنگ رہ گئے۔ یہ سپیرا ان کے لئے نیا نہیں تھا۔ وہ کئی بار آ کر کھیل دکھا کر گیا تھا۔ لیکن انہوں نے کب ایسا تماشا دیکھا تھا کوئی بھی سپیرا نہ دکھا سکا تھا۔ ان ناچتے ہوئے سانپوں پر نازک اندام اور شاخ گل جیسی رقاصاؤں کا گمان ہو رہا تھا۔ ان کے رقص میں ایک عجیب سی دل کشی تھی۔

منداکنی نے جب دروازے پر لوگوں کا شور سنا تو وہ حیران اور پریشان حویلی کی ایک کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

سپیرے نے حویلی کی کھڑکیوں میں سے صورتوں کو جھانکتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ ان میں زمیندارنی مندا کنی ضرور موجود ہوگی۔

سپیرا بین اپنے پھلائے منہ سے الگ کر کے پرارتھا کرنے لگا۔

”منداکنی..... مندا کنی تیری خیر..... مندا کنی کی بچی کا سہاگ بنا رہے..... آج غریب سپیرا منہ مانگا انعام لے کر جائے گا۔“

منداکنی بیٹی کی شادی رچا رہی تھی..... اس کے بچی کی دولت جو اس نے مرنے سے پہلے اتنی چھوڑی تھی کہ دو پشتیں کام آ سکتی تھیں..... دل کھول کر لٹا رہی تھی..... اس نے دس روپے کا ایک نوٹ بچی کے سر پر سے نچاؤ کر کے کھڑکی سے نیچے پھینک دیا۔

سپیرے نے جو اس کا نوٹ دیکھا تو اسے اٹھایا نہیں..... وہ چلا اٹھا۔

”آج سپیرا دان لینے نہیں آیا..... مندا کنی..... کو اس کی منت یاد دلانے آیا ہے جو اس نے بنارس کے سب سے بڑے مندر میں کی تھی..... اور تو دہلی میں بھی بہت بڑی درگاہ میں جا کر مانگی تھی..... مندا کنی.....! تیری بچی جیتی رہے..... تو نے یہ منت کی تھی بھگوان اور خدا سے کہ جس دن تیری بیٹی کی شادی ہوگی تو اس دن ان سات غریب لڑکیاں اس دن کے انتظار میں کنواری بیٹھی ان کی شادی کا بار اٹھائے گی..... ان میں میری ایک بچی بھی ہے.....“

سپیرے نے بین کے اشارے سے بیٹی کو آگے بڑھنے کے لئے کہا۔

سپیرے کی بیٹی دو تین قدم آگے بڑھ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ برسات کی چڑھی ہوئی ندی اپنے دونوں کناروں سے اچھل کر بہنے لگی..... مندا کنی کو ایسا لگا کہ ساون کی رت کی بجلی آسمان پر اپنا پر تپ دکھا کر زمین پر اترا آئی ہے..... مندا کنی سحر زدہ سی ہو کر اس سپیرے کی بیٹی کو پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتی اور اسے دل میں سر ہلاتی رہی۔

مندا کنی کو اپنی منت یاد آگئی۔ وہ کچھ پشیمان اور تادم سی ہوئی کہ بیٹی کی بیاہ کی خوشی میں وہ اس وعدے کو بھول گئی..... جو اس نے ایسٹور اور خدا سے کیا تھا..... سپیرے نے اسے یاد دلایا کہ اس پر بڑی کرپا کی تھی۔

پھر اس نے ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کی۔ وہ دوڑی دوڑی اندر گئی اور ایک تھیلی جس میں دو ہزار کی رقم چھوٹے بڑے نوٹوں سے بھری ہوئی تھی لے کر سیڑھیوں سے نیچے اترا آئی۔ اس کی سانس بری طرح پھول رہی تھی۔

اس نے سانسوں پر قابو پا کر دروازے کی دہلیز پر کھڑے ہو کر اس نے سپیرے کی بیٹی کو پکارا..... ”ادھر آ بیٹی.....!“

سپیرا..... مندا کنی کے ہاتھ میں تھیلی دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا۔ اس نے بیٹی کو پکارا۔
”سانپوں کی رانی..... آگے بڑھ کر اپنی جھولی پھیلا دے..... مندا کنی کی جانی کو ایس دے۔“

سپیرے کی بیٹی کا چہرہ بھی کسی ایسے اُن جانے جذبے کی حرارت سے تھما اٹھا جسے اس نے آپ کبھی کسی بھی خوشی کے موقع پر محسوس نہ کیا تھا۔ وہ اس جذبے اور خوشی کو کہنے سے قاصر تھی جس نے ابھی ابھی جنم لیا تھا۔

اس کے نازک بدن پر ایک کپڑی سی طاری ہو گئی..... اور وہ اپنے آپ کو سنبھالتی ہوئی مندا کنی کی طرف بڑھی۔

اس نے مندا کنی کے سامنے پہنچ کر اپنے پیٹے ہوئے کرتے کا دامن پھیلا دیا اور مندا کنی کو محبت بھری نظروں سے دیکھا۔

مندا کنی نے روپوں سے بھری تھیلی سپیرے کی بیٹی کی جھولی میں ڈال دی۔
سپیرے نے ایک موہوم سی تمنا اس آسانی سے پوری ہوتی ہوئی دیکھ کر کسی عجیب جذبے سے متاثر ہو کر چلا اٹھا۔

”آہا..... آہا..... مندا کنی.....! تو نے اپنی منت کی لاج رکھ لی..... اور سپیرے کی بیٹی کا کاج سنوار دیا..... لے سپیرے کی بیٹی بھی آج تیری بیٹی کو وہ مالک دیتی ہے جو راجہ بادشاہ بھی نہیں دے سکتے.....“

پھر وہ آگے بڑھا..... اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک ہی جھٹکے میں وہ دھاگہ توڑ ڈالا جو اس کی بیٹی کی گردن سے لٹک رہا تھا اور جس میں سفید رنگ کا ایک چھوٹا سا سفید چمکیلا منکا پرویا تھا..... پھر سپیرے نے دھاگے سے منکا نکال کر مندا کنی کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ پھر اس نے کہا۔

”مندا کنی.....! یہ منکا اپنی بیٹی کے ہار میں پرودے اور اس سے کہہ دے کہ وہ یہ ہار رات دن پہنے رہا کرے..... سانپ کسی بھی رنگ و روپ کا کیوں نہ ہو..... کتنا ہی زہریلا اور خطرناک کیوں نہ ہو..... اس کے پاس آنے نہیں پائے گا۔“

مندا کنی نے سپیرے کا منکا اپنی مٹھی میں لے لیا۔ سپیرے نے اسے پھر ایس دی۔
”مندا کنی.....! تیرا کلیجہ ہمیشہ ٹھنڈا رہے..... اور تو من کی مرادیں پائے..... تیری بیٹی کا سہاگ ہمارے۔“

یہ کہہ کر سپیرا اور اس کی بیٹی اپنی اپنی پٹاری سر پر رکھ کر اور مندا کنی کے دان سے اپنی جھولی بھر کر جنگل کو لوٹ گئے۔

ادھر سانپ کا کھیل ختم ہوا تو پھر چوہلی میں ڈھول بجنے لگے۔ بستی کی لڑکیاں مندا کنی کی بیٹی کا سہاگ گانے لگیں..... اور مندا کنی بیٹی کی رخصتی کا سامان کرنے لگی..... اسے یہ سب کچھ کسی سہانے سنے کی طرح لگا تھا۔

مندا کنی..... نے ایک لمحے کے لئے کانپ کر سوچا کہ یہ سپیرا اس کے لئے کسی میچا سے کم نہیں تھا جس نے آ کر اسے اس کی منت یاد دلائی تھی..... اگر وہ نہ آتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا.....؟ ایسٹور ناراض ہو جاتا..... اسے سات لڑکیوں کی شادی کے اخراجات اٹھانے تھے..... اس نے ایک لڑکی کی شادی کے لئے رقم دے دی تھی..... اب باقی چھ لڑکیاں رہ جاتی تھیں..... اس نے سوچا کہ اس کی بیٹی کی شادی کے دوسرے دن چھ بہت ہی غریب لڑکیوں کو تلاش کر کے ان کی شادی کرادے گی۔

ادھر دولہا کے گھر میں بھی شادی کی بڑی دھوم دھام تھی۔ ایک جشن کا سماں بندھا ہوا تھا۔ ہری پور اس کی بستی کے ساتھ ہی تھا۔ کرشن کمار اپنی بستی کا سب سے بڑا زمیندار تھا۔ اپنے جوان بیٹے کی شادی کے چاؤ میں اپنے آپ میں سماتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی ایسی خوش محسوس نہیں کی تھی جو وہ آج اور اس وقت محسوس کر رہا تھا۔

ایک طرف تو اسے اپنے بیٹے کی شادی کی خوشی تھی تو دوسری طرف بہن کے دھن کا لالچ..... اس کے دل میں ریا کاری اور منافقت بھری ہوئی تھی۔ وہ اس بات کے احساس سے کل سے اس کا بیٹا اپنے ہی باپ کی زمین کا وارث ہی نہیں بلکہ اپنی دلہن کے باپ کی ساری املاک کا بھی قانونی مالک بن جائے گا۔ اور پھر پورے اس علاقے کے تمام زمینداروں سے زیادہ املاک اس کے پاس ہوگی۔ لڑکے کے باپ کو اندازہ تھا کہ ہونے والی بہو کے باپ نے ترکہ میں کتنی املاک چھوڑی ہے۔ ایک طرح سے آدمی سے زیادہ ہری پور کی املاک اس گھرانے کی تھی۔ وہ دو تین برسوں سے اس املاک کو حریصانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اس بات کا انتظار تھا کہ مندا کنی کی بیٹی سیانی ہو جائے۔ سیانی ہونے کی دیر ہے وہ اپنے لڑکے کا رشتہ بھیج دے گا۔ ہوا بھی یہی تھا۔ جیسے اسے خبر ملی کہ مندا کنی کی بیٹی بلوغت کو پہنچ چکی ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کا رشتہ بھیج دیا۔ مندا کنی نے یہ رشتہ قبول کر لیا۔ وہ اپنی بیٹی کی بلوغت سے قبل بتارس اور دہلی جا کر منت مانگی تھی..... بیٹی کے سیانی ہوتے ہی رشتہ آیا تو وہ خوش ہو گئی تھی کیوں کہ یہ بڑے زمین دار گھرانے کا تھا۔ لڑکا اس کا دیکھا بھلا تھا۔ جوڑی بھی بہت اچھی تھی..... لیکن اسے اپنے ہونے والے سہمی کی نیت کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ تاہم اس نے شادی کے لئے دو برس کا وقت لیا تھا تا کہ اس کی بیٹی میٹرک کر لے۔

بوڑھے زمین دار کی رگوں میں زندگی اور غرور کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اس کا بیٹا بھی بہت سی لالچی، کینہ پرور اور حریص طبیعت کا مالک تھا..... بوڑھے زمین دار کے ہاں دور دور سے مہمان آئے ہوئے تھے۔ میزبان ان کی خاطر تواضع میں روپیہ پانی کی طرح بہا رہا تھا اب اسے دولت کی کیا پروا تھی۔ مندا کنی کی سونے چاندی سے بھری ہوئی تجوریوں کی کنجیاں اس کے حوالے ہونے والی تھیں۔ مندا کنی کی بیٹی جب پانچ برس کی تھی اس کی شادی کے لئے اس کے باپ نے بیٹی کے نام سے بینک میں بیس لاکھ ڈالٹ کرادیے تھے جو اس کی شادی کے لئے تھے۔ سات برسوں میں وہ رقم پھل پھول کر جیسے بڑی ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ تجوریوں میں سونے اور چاندی کے زیورات ایک کروڑ سے زیادہ مالیت کے..... بینک بیلنس تیس لاکھ اور تجوری میں دس بارہ لاکھ ہر وقت موجود ہوتے تھے۔ مندا کنی نے جو سود پر بڑی کمپنیوں کو جو رقم دی ہوئی تھی اس سے ماہانہ آمدنی لاکھ کی تھی..... یہ ساری تفصیلات مجھے کہانی سنانے والے سپیرے نے بتائی تھیں۔ میں نے اس کا ذریعہ

اس سے نہیں پوچھا..... لیکن اپنے تئیں معلوم کیا۔ یہ سب کچھ سچ تھا۔ مبالغہ نہیں تھا۔ براتی برات کے ساتھ جانے کی تیاریاں کر رہے تھے..... بوڑھے داڑھی میں خضاب لگا رہے تھے..... جوان سروں کے پٹے سلوار ہے تھے..... بچوں کی مائیں اپنے اپنے بچوں کے لئے قیمتی سے قیمتی چمکیلے کپڑوں کی تلاش میں تھیں۔ لڑکیوں پر سولہ گنگھار کا جنون تھا۔ لڑکیوں اور عورتوں کے لئے لباس کا انتخاب مسئلہ بنا ہوا تھا۔

حویلی کے سامنے جو میدان تھا اس میں باجے کی گرد گج اور حویلی میں ڈھولک کی تھاپ کا وہ شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کان کے پردے پھٹ جائیں گے..... بارہ برس سے لے کر سولہ برس کی لڑکیاں ناچ رہی تھیں۔ تھرک رہی تھیں اور ساتھ ساتھ فلمی نغمے گاری تھیں۔

دولہا کو جس گھوڑے پر سوار ہو کر برات کے ساتھ جانا تھا۔ اسے سونے اور چاندی کے زیورات سے آراستہ کیا جا رہا تھا۔ گاؤں کے بھانڈے دولہا کے باپ دادا کا شجرہ یاد کر رہے تھے تاکہ لڑکی والوں کو سنا سکیں۔

بھانڈے نئی نقلیں تیار کر رہے تھے تاکہ محفل کو زعفران بنایا جاسکے۔ بیٹھے چاول اور تورمہ دولہا کے باپ نے اس بہتات سے تقسیم کیا تھا کہ انسانوں کا کیا ذکر..... ذیل اور کوئے تک بھی بچے کچے کلڑے بھی دسترخوان پر نظر اٹھا کر دیکھتے نہ تھے۔ بستی میں کسی نے بھی اپنی زندگی میں اتنا پیٹ بھر کے کھانا نہ ہوگا۔ جب ان کا پیٹ بھر گیا تو وہ زمین دار کو لکھ لٹ راجا کہنے لگے اور بھول گئے کہ کل تک وہ اسے خزانے کا سانپ کہا کرتے تھے۔

دولہا کی ماں دلہن کی بیج سہاگ کے عطر سے سجاری تھی کمرہ اب مہک رہا تھا جیسے طرح طرح کے پھولوں کی وادی ہو۔ یہ عطر خاص طور پر لکھنؤ سے منگوائے گئے تھے۔ اس قدر بیش قیمت تھے کہ ایک عام آدمی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کی خوشبو راہ داری تک میں پھیل گئی تھی جو گزرنے والے کو معطر معطر کئے دیتی تھی۔

ڈونیاں سہرا گاری تھیں۔ وہ ہر شادی اور منگنی اور مہندی..... اور جب کسی کے ہاں لڑکا جنم لیتا تو خوب جشن منایا جاتا تھا تو یہ ڈونیاں گاتی تھیں..... لیکن آج وہ جس جوش و خروش سے لہک لہک کر گاری تھی کبھی انہوں نے اس طرح سے نہیں گایا تھا..... زمین دارنی نے ان سے کہا تھا کہ وہ جتنا اچھا گائیں گی انہیں اتنا ہی زیادہ انعام اکرام دیا جائے گا۔

لیکن دولہا کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ کیوں کہ دو دن ہوئے وہ دلہن کے لئے نادر تھے اور منہ اٹھائی میں بیش قیمت اور بہت ہی عمدہ نمونے کی انگوٹھی خریدنے گاڑی میں سوار ہو کر پونا شہر چلا

گیا تھا۔ وہ جاتے جاتے کہہ گیا تھا کہ اگر اسے پسند کے تحفے نہیں ملے تو وہ ممبئی شہر بھی جاسکتا ہے۔ لیکن وہ اب تک نہیں لوٹا تھا۔ ان تحائف کی خریداری کے لئے اس نے ماں سے جتنی رقم مانگی تھی ماں نے بلا چوں و چرا دے دی۔ ماں سے جتنی رقم بھی وہ لینا چاہتا تھا اس نے لے لی تھی..... اور پھر اپنے باپ سے تنہائی میں مل کر ادھر ادھر کے بہانے کر کے جو کچھ مانگا باپ نے بغیر کسی حجت..... کیوں..... کیا.....؟ کہے بغیر دے دیا۔ جب کہ ماں باپ حیران تھے کہ وہ اتنی رقم کس لئے لے جا رہا ہے.....؟ ماں اور باپ کی محبت بیٹے کے بیاہ کے دن اندھی ہو جاتی ہے ان دونوں کو اندازہ تھا کہ بیٹے نے ان سے جو رقم وصول کی ہے۔ اس میں بیس بیاہ با آسانی رچائے جاسکتے ہیں۔ جوان بیٹے کی ضد اور پھر بہو کے لئے تحفے لانے کا بہانہ.....؟ وہ سب کچھ سمجھ کر بھی نہیں سمجھے..... اور سب کچھ دیکھ کر بھی کچھ نہ سمجھے۔

زمین دار کے بیٹے نے شہر پہنچے ہی حسن کے بازار کی سب سے بڑی دکان کا رخ کیا۔ گاہک جوان تھا۔ اس کی جیبیں چھوٹے بڑے نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں۔ دکان کے دروازے کھل گئے۔ وہ وقت اور یہ وقت..... نہ اسے خبر ہوئی کہ سورج کب نکلے اور کب ڈوبا..... اور نہ ہی اسے یہ بات یاد رہی کہ وہ اپنے ماں باپ سے کیا کہہ کر آیا تھا۔

اس وقت اس کی برات اسے دولہا بنا کر دلہن کے گھر لے جانے کی تیاری کر رہی تھی..... اور اسے اس بات کا بالکل بھی خیال نہ تھا کہ ایک مصوم لڑکی کیسی کیسی آرزوؤں پر اپنا دل بہلا رہی ہوگی.....؟ کیسے کیسے اُن جانے سپنوں میں کھوئی شرماء اور لچاری ہوگی..... ان کے کارن اس کا دل کیسے دھڑک رہا ہوگا.....؟ اس کے ارمالوں اور ان سپنوں کا خون ہو گیا ہوگا جب سے وہ دیکھ رہی ہے جب اس نے نوجوانی کی دلہیز پر قدم رکھا ہوگا..... اور پھر آج کی رات کے انتظار میں کن کن بہانوں سے رینگتے وقت کو جلدی جلدی بیت جانے پر مجبور کر رہی ہوگی.....؟

وہ ایک فلمی رقاصہ تھی جس کے لچر، بے ہودہ اور تن عریانی کے رقصوں نے فلموں میں دھوم مچائی ہوئی تھی۔ نوجوان لڑکے اور مرد اس کے ہوش ربا رقص ہی نہیں اس کے تن کے بھی دیوانے تھے۔ اس کے جسمانی نشیب و فراز اور سبک بدن پاگل کئے دیتے تھے۔ وہ کسی فاحشہ سے کم نہیں تھی۔ طوائف سے بھی بدتر تھی۔ اپنی راتیں کالی کرتی تھی۔

مٹوالے زمین دار کو اپنی دکان کے مال کا گاہک دیکھ کر اور اس بات کا اندازہ کر کے گاہک میں مال خریدنے کی ہمت بھی ہے۔ مال اس کی بہت بڑی کم زوری بھی ہے۔ حسن کے بازار کے تجربہ کار تاجرا اپنے مال کے گاہک کی خود فراموشی اور بڑھانے کے لئے بڑے آزمانے ہوئے نسخے استعمال کر رہے تھے۔ ایسے مرنے اس دور میں بہت ہی کم جال میں پھنستے تھے۔

انہوں نے حسین رقامہ کو سارے اسرار و رموز سمجھا رکھے تھے۔ یوں تو وہ بہت کچھ جانتی تھی اسے بہت سارے گراتے تھے۔ ایک مرد کو خوش کرنے کے لئے اُن جانے راستے کی ہر حد پھلانگ لیتی تھی۔ اس نے کبھی بھی کسی بھی بات سے انکار نہیں کیا۔ یہی اس کی کامیابی کا راز تھا۔

زمین دار کا بیٹا تو اپنے ہوش کوز ہر کے گھونٹ پلا پلا کر اپنے آپ سے بیگانہ ہو چکا تھا۔ مگر اس کا ڈرائیور اس مکان کی ڈیوڑی کی سیڑھیوں پر بیٹھایہ سوچ رہا تھا کہ..... بیٹا جس باپ کی تمناؤں کا اس طرح خون کر رہا ہے وہ آج اپنی برادری کو کیسے منہ دکھائے گا.....؟ جس ماں نے بیٹے کا مہینے بھر سے اس امید پر رکھا ہے آج اس کے سر پر سہرا بندھا دیکھے گی..... اگر دولہا وقت پر گھر نہ گیا تو برأت..... دولہا کے بغیر..... دلہن کے گھر جاتے دیکھ کر وہ کیا سمجھ نہ کر گزرے گی.....؟ پھر اس سے رہا نہ گیا۔ وہ اس گھر کا نمک برسوں سے کھا رہا تھا۔ وہ بے چین ہو کر اٹھا..... ایک حسرت بھر کر سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔

پھر اس نے اوپر کی منزل کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔ اگر دروازہ نہ کھلتا تو وہ دروازہ توڑ اور اکھاڑ کر رکھ دیتا..... دروازہ کھلا..... گھر والوں نے اسے روکنے کی لاکھ کوشش کی..... مگر وفادار نوکر اپنے مالک کو بے بس دیکھ کر کر مالک سے زیادہ طاقت ور اور سرکش بن گیا۔ وہ اس وقت کسی زخمی شیر کی طرح غضب ناک ہو رہا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر زمین دار کے بیٹے کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ زمین دار کا بیٹا شراب کے نشے سے زیادہ ایک نوجوان عورت کے حسن کے نشے سے بے ہوش پڑا تھا۔ وہ یہ جھکا محسوس نہ کر سکا۔ ڈرائیور نے سر پیٹ لیا۔

”ظالمو! تم نے یہ کیا کیا.....؟ تم نے اتنا بھی نہ سوچا کہ آج اس کے بیاہ کا دن ہے..... ہستی میں باپ بیٹے کے انتظار میں گھڑیاں گن رہا ہوگا..... ماں حویلی کی کھڑکی سے جھانک جھانک کر بیٹے کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔ وہاں بیٹے کی شادی رچی ہوئی ہے۔“ حسن کے بازار کے بوڑھے، تجربہ کار اور جہاں دیدہ تاجر نے کھل کھلا کر ہنستے ہوئے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”یہاں بھی تو شادی رچی ہوئی ہے..... تمہارا مالک یہاں شادی کرنے تو آیا تھا.....؟“ پھر اس نے اپنی بیٹی کی طرف جس کے زانو پر زمین دار کا بیٹا سر رکھے سو رہا تھا اشارہ کرتے ہوئے مشتعل ہو کر کہا۔

”یہ لڑکی بھی تو کسی ماں باپ کی بیٹی ہے..... اس کے بیاہ کا دن بھی تو تمہارے مالک نے ہی مقرر کیا تھا..... اور پھر وہ وقت پر آ پہنچا..... اس نے اپنی بات کی لاج رکھی..... اور جو قیمت ہم نے

طلب کی تھی وہ اس نے ادا کر دی..... یہ سچ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی برات نہیں آئی..... وہ سونے چاندی کے زیوروں سے سجے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر نہیں آیا..... اس کے آگے آگے گاجے باجے کا کوئی دھوم دھڑکا نہ تھا..... اس کے سر پر پھولوں کا سہرا بھی نہ تھا..... اس کے بدن پر زری اور ریشم کا لباس بھی نہ تھا..... مگر اس سے کیا ہوتا ہے..... یہ تو سب تمہارے بنائے رسم و رواج ہیں..... اصل چیز تو یہ ہے جو تم دیکھ رہے ہو..... دو جوان دل آپس میں مل گئے..... دوندیاں آپس میں مل کر بہنے لگیں.....“

ڈرائیور کو بوڑھے تاجر کی یہ منطق نہ سمجھ سکی۔ یہ بات اس کے علم میں تھی کہ یہ فلمی رقاصہ اپنے ماں باپ کے گھر آ کر راتیں کالی کرتی ہے۔

وہ اگر کچھ سمجھا تو بس یہی کہ اس کے مالک کو اس وقت اس کی بستی میں ہونا چاہئے..... جہاں اس کا بوڑھا باپ اور بے چین ماں جن کا اس نے اتنے دنوں تک نمک کھایا بیٹے کے انتظار میں ہیں۔ یہ فلسفہ نہیں چلے گا..... یہ بے غیرت، ذلیل اور بے ضمیر ماں باپ ہیں جو اپنی بیٹی سے جسم فروشی کراتے ہیں..... انہیں کسی کی عزت اور احساسات سے کیا غرض.....؟

اس نے بڑھ کر بوڑھے باپ کے سینے پر ایک لات رسید کی..... بوڑھا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

پھر اس نے پورے زور سے اس جوان لڑکی کو دکھ کادے کر پلنگ پر گر دیا جو اس کے مالک پر اپنی ملکیت جمائے بیٹھی تھی۔

اور پھر اس وقت اس کا مالک جو اس وقت بھی ہوش میں نہ تھا اپنے کندھے پر لاد کر چلا اور بیڑھیوں سے اتر کر گاؤں کی طرف بڑھا۔

دکان کے نوکر چاکروں اور پہرہ دار نے گاؤں کو یوں ہاتھ سے جانے دیا تو شور مچانے لگے۔ مگر دیکھتے ہی رہے ڈرائیور کو اپنے مالک کو گاڑی میں لٹا کر ہوا ہو گیا۔ کسی کے ذہن میں نہ آیا کہ اس کا تعاقب کیا جاسکے۔

بوڑھے باپ نے ہوش میں آ کر سنبھل کر بیٹی کی طرف دیکھا اور اسے دلا سہہ دیتے ہوئے کہا۔

”تم فکر اور صدمہ کیوں کر رہی ہو..... اس کی ساری دولت تو ہمارے پاس ہے۔ تم نے دو راتوں کی پائی پائی وصول کر لی ہے.....؟“

بیٹی نے میز کی طرف دیکھا اور ہزبائی لہجے میں چیخ کر بولی۔

”ذلیل ڈرائیور..... میرا پرس بھی لیتا گیا جس میں نہ صرف اس کے مالک کی رقم اور اس کے

ماوہ تین راتوں کی کمائی اور بھی تھی..... وہ مفت میں عیش کر کے اور قیمتی شراب بھی مفت میں اٹا کر گیا..... کاش! میں نے پرس میز پر رکھا نہ ہوتا.....؟“

☆.....☆.....☆

گاڑی تیز رفتاری سے پونہ سے سفر کرتی ہوئی بستی میں پہنچی اور حویلی کے دروازے پر آ پہنچی..... ڈرائیور نے اپنی زندگی میں اس قدر تیز رفتاری سے گاڑی نہیں چلائی تھی۔ یہ تیز رفتاری ہائی خطرناک تھی اور کسی بھی حادثے کا سبب بن سکتی تھی۔ راستے میں دو تین مرتبہ حادثہ ہوتے رہتے گیا۔ لیکن اس کی پروا کئے بغیر گاڑی چلاتا رہا۔ چالیس برس سے گاڑی چلاتے چلاتے اس میں اتنی مہارت اور تجربہ پیدا ہو چکا تھا کہ وہ ہر قسم کے حادثات سے گاڑی کو محفوظ رکھ سکتا تھا۔

اس نے گاڑی حویلی کے دروازے پر قاتحانہ انداز سے روکی اور اس کی آنکھیں قسم قسم کے امانتوں سے چمکھاراپا کر چمک اٹھیں۔ بوڑھا زمین دار جو بار بار مہمانوں سے کام کے بہانے مطہرت کر کے اپنی خواب گاہ میں جا کر کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھتا تھا۔ اس کی نظریں اس سمت اور در تک دیکھتی تھیں جہاں سے گاڑی کو آتا تھا۔ ماں بھی آ کر تشویش بھری سوالیہ نظروں سے اپنے بیٹی کو دیکھتی تھی..... بوڑھا زمین دار زبان سے کچھ نہ کہتا بلکہ کندھے اچکا کر رہ جاتا..... اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

بوڑھے زمین دار نے گاڑی کو حویلی کے دروازے پر پایا تو اس کی جان میں جان آئی کہ اس کی عزت بچ گئی۔ پھر وہ بیٹے کو اس کی بے پروائی غفلت اور غائب رہنے پر ڈانٹ جتانے کے لئے گاڑی کی طرف تیزی سے بڑھا۔ مگر ڈرائیور نے لوگوں کی نظریں بچا کر زمین دار کو اشارے کناپے میں سب کچھ بتا دیا کہ تین دن غائب رہنے کی وجہ کیا ہے۔

زمین دار نے گاڑی کی کھڑکی کے اندر جھانک کر دیکھا تو اس پر ساری حقیقت روشن ہو گئی تھی۔

بڑھاپے کو لوگ برا کہتے ہیں..... مگر بڑھاپے کی دانائی کبھی کبھی جوان کی طاقت سے زیادہ کام کی چیز ثابت ہوتا ہے۔ وہ دماغ سے سوچتا ہے..... جذبات سے کام نہیں لیتا ہے۔ وہ دروازہ کھول کر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر سرگوشی کی۔

”رمضان خان.....! حکیم اشرف سہدی کے ہاں لے چلو.....“

اس بستی میں ایک سے ایک بڑا وید جی تھے۔ لیکن حکیم صاحب کی بات تجربہ اور مہارت ان میں سے کسی کے پاس بھی نہ تھی۔ وہ صرف نبض شناس بلکہ قیافہ شناس بھی تھے۔ ہر کوئی ان کی قابلیت والا ماننا تھا۔

جب گاڑی حکیم صاحب کے مکان کے دروازے پر کی تو اس گاڑی کے انجن کا شور سن کر وہ حیران ہوئے کہ گاڑی میں ان کے در پر کون آیا ہے؟ جب انہوں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ وہ بھڑکی سنبھالتے ہوئے گھر سے نکل آئے۔ ان کی زندگی کی ساری تاریخ میں پہلی مرتبہ یہ واقعہ ہوا کہ گاڑی کا زمین دار خود چل کر آیا ہے۔ انہیں یہ اعزاز دے رہا ہے۔ زمین دار نے گاڑی سے اتر کر حکیم صاحب کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔ حکیم صاحب نے آج اپنی اہمیت اس طرح سے محسوس کی۔ جیسے چیونٹی سے کہا جائے کہ ہالیہ پر بت کا سارا دار و مدار ان کی جان تاواں پر ہے۔

انہوں نے زمین دار کو دلاسا دیا کہ وہ فکر مند اور پریشان نہ ہوں۔ ابھی تو بارات کی روانگی میں پورے چھ گھنٹے باقی ہیں۔ میں چھ گھنٹے میں مردے میں جان ڈال سکتا ہوں۔

زمین دار کے بیٹے کو چار پائی پر لٹا کر حکیم صاحب کے مکان کے اندر لے جایا گیا۔ انہوں نے دولہا کے نبض پر ہاتھ رکھ کر جان لیا کہ زمین دار کے بیٹے کو تین دن اور تین راتوں میں عورت نے گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ لیا ہے۔ عورت۔ عورت میں فرق ہوتا ہے، گھریلو عورت ہوتی تو سات کیا چالیس دن میں بھی ایسی نوبت نہ آتی۔ یہ ایک حرافہ، قاحشہ اور زہریلی ناگن جیسی عورت کا کارنامہ ہے۔ گاڑی کا دو دن اور اس کے ساتھ گزرا تو وہ کسی قابل نہ رہتا۔

حکیم صاحب اس کی دوا دارو میں معروف ہو گئے۔ برسوں پرانے سر کے کی پوری بوتل زمین دار کے بیٹے کو دو تین گھنٹے میں پلا دی۔ اور اس کا نشہ سر کے کی کھٹاس سے آہستہ آہستہ اترنے لگا۔

اب تو نہ شراب کا نشہ رہا تھا اور نہ ہی شباب کا۔۔۔۔۔ جب اسے ہوش آیا تو لگا کہ وہ سپنوں کی اس وادی میں نہیں ہے۔

یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ زمین دار کا بیٹا بارات روانہ ہونے کے وقت تک پورے ہوش و حواس میں آ گیا تھا۔

یاد پھر اپنے بدن میں پہلے کی سی توانائی محسوس کرنے لگا۔ وہ جوانی کی جس توانائی سے محروم ہوا تھا اسے پوری طرح لوٹ آنے میں چند دن درکار تھے۔ کیوں کہ اس کی ساری توانائی اس زہریلی ناگن نے شراب کی طرح پی لی تھی۔

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ باپ کے کندھے کا سہارا لے کر بدقت تمام غیر محسوس اعداد سے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

احتیاط کے طور پر اس کا باپ اور ماموں یہ ظاہر دل کے چاؤ کے لئے اکتھار کے لئے۔۔۔۔۔ مگر درحقیقت دولہا کو سنبھال کر بیٹھنے کی طاقت دینے کی غرض سے اس کی کمرہاتوں کی فیک دے

کر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

پھولوں کے زرقا سہرے نے دولہا کا منہ چمپا رکھا تھا۔۔۔۔۔ اس لئے کہ اس کے تین دن رات کے عیش کی تباہ کاریاں برائیوں کی نظر سے پوشیدہ رہیں۔ اگر چہ وہ سہرے میں چھپا نہ ہوتا تو گزرا ہوا لسانہ سب پڑھ لیتے۔

آخر کار بارات بستی کی گلیوں کے چکر کھاتی ہوئی روایتی دھوم دھام اور شان سے دلہن کے دروازے پر جا پہنچی۔

ایک بستی والوں نے دوسری بستی والوں کا پر تپاک استقبال کیا وہ خوشی سے اس عزت افزائی پر باغ باغ ہو گئے زمین داروں کی ایک برادری نے اپنے بھائی بندوں کی دوسری برادری کی راہ میں آنکھیں بچھا دیں۔ صدیوں پرانی روایت کے پیش نظر۔۔۔۔۔ دونوں خاندانوں کے شجرے پڑھے۔۔۔۔۔ آباؤ اجداد کے کارناموں کا ذکر سن کر دونوں برادری ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے اپنا اپنا سراونچا کر کے بڑی بڑی گھٹی اور لمبی لمبی مونچھوں کو تاد دینے لگے۔

منداکئی کے روپے اور گاؤں والوں کی محبت اور عقیدت نے بارات کی خاطر مدارت کا وہ سامان کر رکھا تھا کہ براتی حیران رہ گئے۔ انہیں یقین نہیں آیا کہ ایسی بڑی دست پزیرائی ہوگی۔

جب وہ پنڈال میں جا کر بیٹھے جو منداکئی کی حویلی کے کشادہ صحن میں براتیوں کے بیٹھنے کے لئے لگایا گیا تھا تو سارے براتی بڑی حیرت سے اس کی آرائش کا سامان دیکھنے لگے۔ خوابوں میں اور قصورات میں ایسا ممکن نہیں تھا۔

کوئی بھی یہ بات جان نہ سکتا تھا کہ ان کی آنکھوں کی ناکہانی، کشادگی کی ترک و اصل دولہا کی بخت آوری تھی یا پھر ان کی عافیت نشیں زنی۔۔۔۔۔ دولہا کا باپ بھی دلہن کے گھر کی شان دیکھ کر اپنی شان میں کچھ کی محسوس کرنے لگا۔

جب تمام مہمان اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو نوجوان اور کنواری باندیوں نے شہہ شگون کے لئے اودھ سے بھرے ہوئے کنوڑے اپنے خوب صورت، سڈول اور مرمریں ہاتھوں سے تقسیم کرنا شروع کئے۔

پھر پوتا کے بڑے مندر کے پنڈت جی کو لایا گیا تاکہ انہی کے ساتھ پھیرے ہوں۔ جیسے بیاہ ۱۱ ہر طرف سے مبارک باد کا شوراٹھا۔ دونوں بستیوں کے مسلمان مہمان بھی شریک تھے۔ دولہا کے باپ کا سر خوشی اور غرور سے کچھ اونچا اونچا سا نظر آنے لگا۔ تکبر سے گردن اکڑ گئی۔ انہوں نے اپنا ہندوگر سے تان لیا۔ آخر ان کا خواب پورا ہونے والا ہے۔

پھر کھانے کا بندوبست مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے الگ الگ تھا۔ براتیوں نے بڑھ

چڑھ کر کھانا پکانے والوں کے ہنر اور مہارت کی دل کھول کر داد دی۔ کھانا ایسا لذیذ، ذائقہ دار اور مزے دار تھا کہ مہمانوں نے انگلیاں چاٹ لیں۔

بھانڈا اپنا کھیل تماشا دکھانے میں مصروف ہو گئے تاکہ مہمان محفوظ ہو سکیں۔ زمین دار ہنس ہنس کر ایک دوسرے پر پھبتیاں کئے لگے غرض حویلی کے صحن میں ایک ہنگامہ پیا ہو گیا۔۔۔۔۔

مگر جو ہنگامہ حویلی کے اندر برپا تھا اس کا اندازہ باہر سے نہیں کیا جاسکتا تھا۔

منداکئی نے دولہا کی ماں کے سر پر سے چھوٹے ٹوٹوں سے بھری ایک ہزار روپے کی تھیلی بچھا کر کے ڈومنیوں میں بانٹ دی۔

دولہا کی ماں کب کسی سے پیچھے رہنے والی تھی اس نے دو ہزار کے چھوٹے بڑے نوٹ دلہن کے سر سے بچھا کر کے آگن میں ڈال دیے۔

اب کیا تھا۔۔۔۔۔ سب نوکرانیاں اور ڈومنیاں آگن میں بکھرے ہوئے ٹوٹوں پر ٹوٹ پڑیں۔۔۔۔۔ وہ دھکم دھکاغل غپاڑہ ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ حویلی میں رونق اور بہاری آگئی تھی۔

منداکئی۔۔۔۔۔ پھولوں سے لدی ہوئی اور گھونگھٹ سے چمپی ہوئی بیٹی کا بازو پکڑ کر اس کمرے میں چلی گئی جہاں آری مصحف کی رسم ادا ہونے والی تھی۔ دلہن تو دلہن۔۔۔۔۔ وہ کمرہ بھی دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ ہندو مسلم صدیوں سے ساتھ رہ رہے تھے۔ مسلمانوں میں علاقائی اور ہندو انداز رکھیں جس طرح ہونے لگی تھیں اس طرح ہندوؤں میں بھی۔۔۔۔۔ منداکئی کو آری مصحف کی رسم بہت پسند تھی۔ اس نے شادی کی بات چیت کے وقت ہی دولہا کی ماں سے کہہ دیا تھا کہ اسے یہ رسم بہت پسند ہے۔ کیوں کہ اس میں ایک دل کشی، حسن اور حسرا و کیف سا محسوس ہوتا ہے۔ دولہا کی ماں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ مسلمانوں کی اس رسم سے ہندو دھرم پر کوئی ضرب نہیں پڑتی تھی۔

چمپرکھٹ پر پھولوں کے ہاروں کا سائبان اور اس سائبان کے چاروں طرف دھاگوں کی سنہری اور روچیلی لڑیاں عجیب بہار دکھا رہی تھیں۔ چمپرکھٹ کے سامنے گاؤں کیلئے کے سہارے ایک بڑا سا آئینہ رکھا تھا جس میں دولہا دلہن کے چہرے کا عکس دیکھ کر دھما کی رسم ادا کرنے والا تھا۔ دلہن چمپرکھٹ پر بٹھادی گئی۔

دوسرے لمحے دلہن کی سہیلیاں چمپرکھٹ کے چاروں طرف ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جمع ہو گئیں۔۔۔۔۔ اور دلہن کو چھیڑنے لگیں۔ روشنی کے قہقہے۔۔۔۔۔ کھلے ہوئے پھول۔۔۔۔۔ اور الہڑکیوں کی ہنسی۔۔۔۔۔ سہاگ کے گیتوں کی رس بھری تانیں۔۔۔۔۔ غرض یہ جگہ عروسی ایک طلسم صفت رنگ تھا جس کا حسن آنکھوں کو مسحور اور جس کی شادمانی دل کو مسرور کر رہی تھی۔

اتنے میں شوراٹھا کہ دولہا۔۔۔۔۔ آری مصحف کی رسم ادا کرنے حویلی کے اندر آ رہا ہے۔ ڈومنیوں نے اپنے گیتوں کی تانیں اور بلند کر دیں۔۔۔۔۔ لڑکیوں کے ترنم اور ریلے قہقہوں سے فضا گونج اٹھی تو ایسا لگا سات مدھر ستر ایک ساتھ بج اٹھے ہوں۔

منداکئی نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دولہا کمرے کے اندر داخل ہوا۔ منداکئی نے اس کی بلائیں لیں۔ ایک پھولا ہوا لٹافہ جس میں پچاس ہزار کی رقم تھی دولہا کے ہاتھ پر رکھ دی۔ دولہا آگے بڑھا اس کے پاؤں میں لغزش تھی۔ اس کا چہرہ سہرے سے ڈھکا ہوا تھا۔ سہرے کا ارمان نہ صرف منداکئی بلکہ دولہا کی ماں کو بھی تھا۔۔۔۔۔ وہ اس تلوار کا سہارا لے کر جو راجپوتوں کی پرانی رسم کے مطابق بیاہ کے دن دولہا کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔۔۔۔۔ دلہن کی چمپرکھٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ ابھی وہ دو چار قدم ہی چلا تھا کہ اس کا دامن کمرے میں رکھے ہوئے شمع دان سے الجھ گیا۔ اس کی ٹانگوں میں اتنی سخت نہیں تھی کہ شمع دان کو الگ کر دے وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور اوندھے منہ گر پڑا۔ ایک دھماکہ ہوا۔ دلہن سرا سیمہ ہو گئی۔ بری طرح گھبرا گئی۔ اپنے چہرے سے سہرا اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔۔۔۔۔ دولہا نے کوشش کر کے اپنا سر اٹھایا اور ہاتھ زمین پر ٹیک کر اٹھنے لگا۔ دلہن کے منہ سے بے ساختہ ایک چیخ نکلی اور وہ زور سے چلائی۔

”سانپ“

اسے صاف صاف دکھائی دے رہا تھا کہ ایک کالا ناگ اپنا پھن اٹھائے اور پراٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دلہن کے منہ سے سانپ کی آواز سن کر منداکئی دوڑی دوڑی بیٹی کے پاس گئی۔ دلہن نے دیکھا یہ وہی کالا ناگ ہے جو پسیرے کی بیٹی کی پٹاری میں تھا اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا اور اب اپنا پھن لہراتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے پھر ایک دل خراش چیخ ماری اور ماں کی چھاتی سے لپٹ گئی۔ پھر اس نے سسکیاں بھرتے ہوئے آواز سے ماں کے کان میں کہا۔

”وہ دیکھو ماں۔۔۔۔۔ اس۔۔۔۔۔ سانپ۔۔۔۔۔“

دولہا چمپرکھٹ کے قریب ہی آیا تھا کہ اس کے پاؤں الٹ گئے اس طرح جیسے کسی نے اس کی چھاتی پر چڑے کے کوڑے کی ایک شدید ضرب لگائی ہو۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف ہٹا گا۔ دلہن چلائی۔

”دیکھو ماں۔۔۔۔۔! سانپ تل کھاتا ہوا دروازے سے نکلا جا رہا ہے۔ منداکئی اور دوسری عورتیں کچھ نہ سمجھ سکیں۔۔۔۔۔ وہ تو صرف یہی دیکھ رہی تھیں کہ دولہا اٹنے پاؤں دروازے سے نکل گیا ہے۔

دلہن نے اپنے سینے کے اندر کچھ ایسی تپش محسوس کی جیسے کسی نے اس کی چھاتی پر دھکتا ہوا

انکارہ رکھ دیا ہو۔ اس نے فوراً ہی اپنا ہاتھ بڑھا کر اپنا سینہ ٹٹولا۔ اس کے گلے کے ہار میں سپیرے کا دیا ہوا منکا آگ کی طرح جل رہا تھا۔

دلہن نے فوراً ہی وہ ہار نکال دیا۔ اس منکا نے اس کی جان بچالی تھی۔ لیکن اس کا لے سانپ نے جو کالا ناگ بن گیا لگتا ہے اس نے دولہا کو ڈس لیا تھا ہوا یہ تھا کہ رخصتی سے قبل کالا سانپ دولہا کے پیروں کے قریب سے گزر رہا تھا تب دولہا نے اس پر تلوار کا وار کیا تھا۔ وہ دلہن کو تلوار کے سائے میں لے جا رہا تھا۔ کالا سانپ اس کے وار سے بچ گیا تھا لیکن اس کی دم پر زخم آ گیا تھا۔ پھر اس نے ڈس لیا۔ دلہن تین گھنٹے کے بعد ہی بیوہ ہو گئی۔ اس کے بیوہ ہونے کے سات دن بعد زمین دار نے سپیروں کو بلا کر کہا۔ ”اس کا لے سانپ کو کسی نہ کسی طرح پکڑ کر میرے سامنے لاؤ۔ میں اپنے ہاتھوں سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتا ہوں۔ جو سپیرا اس سانپ کو پکڑ کر لائے گا میں اسے بیس ہزار روپے انعام میں دوں گا۔“

لیکن سانپ وہ سانپ کسی سپیرے کے ہاتھ نہ لگ سکا۔ اس نے ایک دن اس زمین دار کو ڈس لیا۔ زمین دار نے اس قدر دہشت زدہ ہوئی کہ وہ حویلی بیچ کر اور ساری دولت لیکر اپنی بڑی بہن کے پاس ممبئی شہر چلی گئی۔ اس کے ڈرائیور نے منداکئی کے ہاں ملازمت کر لی۔ منداکئی نے اس کی بیوی کو بھی نوکرانی رکھ لیا۔

ایک روز منداکئی اپنی بیٹی کے بیوہ ہونے پر صدمے سے دوچار تھی تب ڈرائیور کی بیوی نے اس سے کہا۔

”مالکین.....! آپ کی بیٹی کا بیوہ ہو جانا ہی اچھا ہوا..... اگر وہ بیوہ نہ ہوتی تو ساری زندگی خوش نہ رہتی.....“

”کیا مطلب.....؟“ منداکئی نے حیرت اور غصے سے پوچھا۔

پھر اس نے جواب دیا۔ ”زمین دار کا بیٹا اس کا لے سانپ سے کہیں زہریلا اور خطرناک تھا۔“

”وہ کیسے.....؟“ منداکئی نے پوچھا۔

پھر ڈرائیور کی بیوی نے اسے بتایا کہ..... ”زمین دار کے بیٹے نے ایک فلمی رقاصہ کو داشتہ بنانے شادی سے چار دن پہلے پونا گیا تھا۔ تین دن اور تین راتیں اس کے پہلو میں گزاریں اور ہر رات کا ایک لاکھ روپیہ دیا..... پھر اس سے کہا کہ تم فکر نہ کرو۔ شادی کے بعد میں اپنی بیوی کی تمام جائیداد اور دولت کا مالک بن جاؤں گا ہر ماہ میں تین دن کے لئے آؤں گا ایک لاکھ روپے تمہارے چرنوں میں ڈال دیا کروں گا..... پھر اس نے بتایا کہ اس کے بچے نے کس طرح زمین دار کے بیٹے کو لایا۔“

منداکئی اس کی باتیں سن کر حیرت اور خوشی سے بولی۔

”اوہ بھگوان..... تم نے مجھ پر اور میری بیٹی پر کتنی بڑی کرپا کی..... یہ کالا سانپ ہمارا محسن بن گیا۔ زمین دار کا بیٹا تو اس کا لے سانپ سے کہیں زہریلا اور خطرناک تھا..... باپ بیٹا دونوں ہی کا لے سانپ سے کہیں ظالم اور بے رحم تھے..... ان کا یہی انجام ہونا تھا۔ تو نے ہم ماں بیٹی کو بچا لیا۔“

جب چندرا دیوی نے اس کا لے سانپ کی کہانی سنا چکی تو سریش نے کہا۔

”اس کا لے سانپ کی کہانی نہ صرف دل چپ اور حیرت انگیز ہے بلکہ سنسنی خیز بھی ہے..... کیا یہ حقیقت ہے اور اس بات میں سچائی ہے کہ اس کا لے سانپ میں کسی ناگ دیوتا کی آتما نے جنم لے لیا جو وہ لوگوں کو کاشا پھر رہا ہے؟“

”ہاں.....“ چندرا دیوی نے اثباتی انداز میں سر ہلایا۔ ”اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا.....؟“

”اب آپ کیا کریں گی.....؟“ سریش نے سوال کیا۔ ”اے قابو میں کر کے اس کا لے سانپ اور ساری نعمتی جبین لوں گی۔ اسے مجبور کروں گی کہ وہ انسانی جانوں سے نہ کھیلے.....؟“

جب وہ ہری پور پہنچے تو سہ پہر ڈھل چکی تھی وہ سیدھا منداکئی کی حویلی پہنچے، چندرا دیوی نے منداکئی سے کہا۔

”کچھ دنوں پہلے ایک سپیرا آیا تھا اس نے آپ کی پٹنائی کی ایک کا لے سانپ نے آپ کی بیٹی کو بیوہ کر دیا اور اس نے زمین دار کو بھی ڈس لیا..... اس کے علاوہ اس بستی کے کئی لوگوں کو ڈس چکا ہے.....؟“

”جی ہاں.....“ منداکئی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”وہ کالا سانپ ہمارا محسن ہے..... اس نے کارن میری بیٹی، اس کی تمام املاک اور دھن بچ گیا۔ زمین دار اور اس کے بیٹے کی نیت اچھی نہ تھی، نہ ہم کوڑی کوڑی کھتاج ہو جاتے۔“

”ایٹور جو کرتا ہے وہ ٹھیک ہی ہوتا ہے۔“ چندرا بولی۔ ”کیا وہ اس روز کے بعد پھر کبھی حویلی میں دکھائی دیا؟“

”نہیں.....“ منداکئی نے جواب دیا۔ ”لیکن آپ یہ سب کچھ کس لئے پوچھ رہی ہیں.....؟ آپ ہیں کون.....؟ میں نے اپنی زندگی میں شاید ہی آپ جیسی حسین عورت دیکھی۔ آپ دیوی معلوم ہوتی ہیں۔“

”آپ کچھ بھی سمجھ لیں.....؟“ چندرا ہنس پڑی۔ ”میں یہاں اس لئے آئی ہوں کہ اس

کالے سانپ سے آپ کی بستی والوں کو نجات دلاؤں..... یہ بڑا انیائے ہے کہ وہ انسانی جانوں سے کھیل رہا ہے۔“

”آپ عورت ذات ہیں اسے کیسے قابو میں کر سکیں گی؟“ مندراکئی حیرت سے بولی۔ ”بڑے بڑے سپرے بھی اسے قابو میں نہ کر سکے..... یہ کالا سانپ جتنا موڑی ہے اتنا ہی خوفناک، زہریلا اور خطرناک ہے۔ وہ جسے کاٹتا ہے آدی مر جاتا ہے..... پانی مانگنے کی مہلت بھی نہیں ملتی ہے..... آپ اپنی جان خطرے میں نہ ڈالیں۔ اس سے نہ الجھیں تو بہتر ہے..... سپیروں نے جیسا کہ بتایا کہ اس میں کسی ناگ دیوتا کی آتما نے جنم لے لیا ہے۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ.....؟“ چندرا نے ممنونیت سے کہا۔ ”یہ میرا مسئلہ ہے میں اسے حل کروں گی۔“ آپ صرف اتنا بتا دیں کہ وہ اکثر کہاں، کب اور کس وقت دیکھا جاتا ہے؟“

”میری حوصلی کے پیچھے ایک فرلانگ کی دوری پر ایک ندی ہے..... وہ اکثر پونم کی رات..... پھر ابتدائی چاندنی راتوں میں..... آج اتفاق سے پونم کی رات ہے۔ وہاں وہ کالا سانپ مل جائے گا۔ آپ جاتے سے منکا لے جائیں..... تاکہ وہ نقصان نہ پہنچا سکے۔ یہ منکا آپ کی حفاظت کرے گا۔“

”نہیں..... اس کی ضرورت نہیں.....؟“ چندرا دیوی نے مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہا۔

اس لئے کہ ایک سپرے نے مجھے ایک ایسا منتر سکھایا جس کی یہ دولت میں نہ صرف سانپوں اور ناگوں بلکہ اڑدھوں سے بھی محفوظ رہتی ہوں۔ وہ میرا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔“

مندراکئی نے اصرار کر کے ان اجنبی مہمانوں کو رات کے کھانے تک روک لیا۔

چندرا دیوی اس وقت جا کر اس کالے سانپ کو اپنی پراسرار طاقت سے طلب کر سکتی تھی لیکن وہ عجلت کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتی تھی نہ ہی اس کی کوئی ایسی خاص ضرورت تھی۔ رات کے کھانے کے بعد وہ اس جگہ سریش کے ساتھ پہنچی جہاں کالے سانپ نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ ایک درخت کے پاس جو جھاڑیاں تھیں وہاں اس کا مل تھا۔

انسانی بوسہ نگہ کر کالا سانپ اپنے بل سے باہر نکل آیا۔ پھر وہ چندرا دیوی اور سریش کی طرف بڑھتا ہو سریش خوف زدہ سا ہو گیا۔ یہ کالا سانپ دیکھنے ہی میں بہت خوفناک دکھائی دیتا تھا، چندرا دیوی کے عقب میں سریش کھڑا ہو گیا۔ چندرا نے اسے راستے میں کہا تھا کہ وہ کالے سانپ کو دیکھ کر خوف زدہ نہ ہو۔ بالکل بھی نہ ڈرے۔ وہ بال تک بیکا نہیں کر سکتا۔ لیکن پھر بھی سریش کے دل میں ایک خوف دامن گیر ہو گیا تھا۔

وہ سانپ..... چندرا دیوی کے سامنے پھن اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی خوفناک آنکھوں سے

اسے گھورنے لگا۔ پھر اس نے اپنا پھن چندرا دیوی پر مارا تو اس نے سانپ کو اس طرح پکڑ لیا جیسے وہ کوئی کھلوتا ہو..... وہ بے بس سا ہو گیا تھا۔ پھر اس نے پھنکارتے ہوئے اپنی دم سے چندرا دیوی کو کوڑے کی طرح ضرب لگانی چاہی تو چندرا نے کوئی دفاع اور مزاحمت نہیں کی..... اس نے پوری طاقت سے ضربیں اس کے جسم پر لگانا شروع کی۔ چندرا دیوی پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بڑے سکون اور اطمینان سے کھڑی مسکراتی رہی..... اس کے دم کی ضربیں پھولوں کی چھری کی طرح سارے بدن پر لگ رہی تھیں.....

سریش قدرے ہٹ کر کھڑا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ کالے سانپ کی دم اتنی لمبی، مضبوط اور سخت تھی کہ عام آدی کیا بڑے سے بڑا سورا بھی اس دم کی ایک ضرب بھی سہہ نہیں سکتا تھا۔ دو تین ضربوں میں موت کے منہ میں چلا جاتا۔ اس کی دم چڑے کا کوڑا بنی ہوئی تھی۔ شپ شپ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ دودھیا چاندنی میں نہ صرف سانپ بلکہ اس کی دم بہت ہی خوفناک لگ رہی تھی۔ وہ ایک طرف کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ چندرا پر ان ضربوں کا کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے نہ ہوگا..... کالا سانپ کیا جانتا تھا کہ اس کا واسطہ کس سے پڑا ہے۔

کالا سانپ..... چندرا دیوی پر ضربیں لگاتے لگاتے بے حال ہو گیا۔ جب اس میں دم ختم نہیں رہا تو چندرا دیوی نے اسے دور پھینک دیا۔ اس میں اتنی جان اور سکت نہیں رہی تھی کہ راہ فرار اختیار کرے۔ وہ مردہ سانپ کی طرح نظر آ رہا تھا۔

چند لحوں کے بعد اس سانپ کے بدن سے ایک کثیف دھواں اٹھنے لگا۔ اس نے ایک انسانی ہولے کی شکل اختیار کر لی۔ چند لحوں کے بعد ایک طویل قامت شخص سامنے کھڑا تھا۔ وہ دیو زاد لگ رہا تھا۔ اس کا قد دس فٹ سے زیادہ ہی تھا۔

”کیا تم جانتی نہیں کہ میں کون ہوں.....؟“ وہ غرا کر بولا۔ ”میں نے سو برس تک تپسیا کی ہے۔ تب کہیں ناگ دیوتا نے مجھے ہشتی شالی بنایا..... ایسی ہلستی دی ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہو..... میں ہر جان دار روپ میں آ سکتا ہوں..... انسان..... شیر اور ہر طرح کا خون خوار درندہ بھی بن سکتا ہوں..... ہر آدی کو..... درندے کو ایک چوٹی کی طرح مسل سکتا ہوں.....“

”یہ تم اس قدر تفصیلی تعارف کس لئے کر رہے ہو.....؟“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”مجھے دھمکا اور خوف زدہ کر رہے ہو..... لیکن اس وقت تمہاری ہلستی کہاں گئی جب میں نے تمہارا پھن پکڑ کر بے بس کر دیا تھا..... تمہارے دم کی اتنی ساری ضربیں میرا کچھ بگاڑ نہیں سکیں۔ تم ہلستی شالی ہو..... یہ بتاؤ کہ تم انسانی زندگیوں سے کیوں کھیل رہے ہو.....؟“

”تم نے مجھے دھوکے سے پکڑا اور اپنے جادو سے بے بس کر دیا تھا۔“ ویسے میں نے اب تک

جن لوگوں کو ڈسا اور ان کا خون پیا ہے وہ سب کے سب پانی تھے۔“
 ”وہ پانی تھے یا زردوش تھے..... جو بھی تھے۔ ان کی موت کا حق تمہیں کس نے دیا جو تم موت بن گئے۔“ وہ بولا۔

”دراصل مجھے ایک ہزار انسانوں کا خون پینا ہے جس کے کارن میں دو ہزار برس تک موت سے بچا رہوں گا.....“

تم دو ہزار برس تک زندہ رہ کر کیا کرو گے.....؟“ چندرا نے پوچھا۔

”میں تین ناگنوں سے دل بہلاؤں گا تاکہ ہماری نسل بڑھتی رہے..... اور پھر اس دنیا میں حسین لڑکیاں اور عورتیں ہیں۔ مجھے سو برس کے بعد ان سے وقت گزاری کی اجازت مل جائے گی..... انسان کے بہرہ میں آ کر.....“

”تمہاری یہ آرزو پوری نہیں ہوگی۔“ چندرا دیوی کہنے لگی۔ ”دنیا میں پانی لوگ ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں میں ہیں۔ پاپ روز بہ روز بڑھتا جا رہا ہے..... تمہیں کسی کی بھی جان لینے کا کوئی ادھیکار نہیں ہے..... تم ایک موذی ہو۔ میں تمہیں ختم کرنے آئی ہوں۔ تمہاری نسل انسانیت کے لئے خطرہ ہے۔“

”میں دیکھتا ہوں کہ تم مجھے کیسے ختم کرو گی.....؟“ اتنا کہہ کر وہ کالا سانپ اس کی طرف بڑھا۔ دوسرے لمحے وہ دھواں بن کر کالا سانپ کے جسم میں سما گیا..... پھر اس نے ایک بہت ہی بڑے لمبے اور موٹے اور خوفناک قسم کے ناگ کی شکل اختیار کر لی۔ پھر وہ چندرا دیوی کی طرف بڑھا۔

چندرا دیوی نے کوئی منتر پڑھ کر اس پر پھونکا۔ وہ ایک شعلہ بن کر کالا ناگ کی طرف لپکا۔ پھر اس شعلے نے اس ناگ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ کچھ دیر تک جلتا رہا۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہاں راکھ کے سوا کچھ نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

چندرا دیوی گرائڈریسٹورنٹ میں داخل ہو کر اس گوشے کی طرف بڑھی جہاں کچھ میزوں پر دو دو کرسیاں ہوتی تھیں جو جوڑوں یا صرف دو گاہکوں کے لئے ہوتی تھیں۔ وہ یہاں اکثر کافی پینے اور سینڈوچ کھانے کے لئے آتی رہتی تھی۔ اس کی نظر سرلا پر پڑی جو دو کرسیوں والی میز پر اکیلی بیٹھی کسی گہری سوچ میں غرق تھی۔ اس کے چہرے پر گہری یاسیت طاری تھی اور اس کی آنکھوں سے دھندلہ جھانک رہا تھا۔ کناٹیوں میں آنسو زور سے تھے۔

وہ سرلا کو بہت قریب سے جانتی تھی۔ بہت پہلے ہی لڑکی تھی۔ اس کی بد قسمتی یہ تھی کہ وہ ایک

ایک ماں باپ کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ کل کپور کے ہاں تیس برس سے مالی کام کر رہا تھا۔ اور اس کی ماں ملازمہ کا..... انہیں رہائش کے لئے سروٹ کو ارڈر دیا ہوا تھا۔ سرلا اس سروٹ کو ارڈر میں پیدا ہوئی تھی۔ جب اس نے تعلیم مکمل کی تھی اس کے دو برس بعد اس کے چہاٹی دنیا سے سدھار گئے تھے اس نے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک نجی دفتر میں ملازمت کر لی تھی۔ اس کی ماں چاہتی تھی کہ وہ اپنی ثادی کے اخراجات کے لئے رقم پس انداز کرے۔ کیوں کہ انہیں رہائش اور کھانے پینے کی ہر سہولت تھی اس لئے۔

چندرا کی سیکلی کی چھوٹی بہن کی سرلا ہم جماعت تھی۔ سرلا سے وہیں وہ متعارف ہوئی تھی۔ اسے سرلا بہت پسند آئی تھی۔ کیوں کہ وہ چھٹی پیاری تھی اتنی ہی پیاری اس کی باتیں بھی..... آج اس نے بہت دنوں کے بعد سرلا کو دیکھا تھا۔ وہ خاموشی سے اس کی میز پر جا بیٹھی۔ اس کی اداسی کا سبب اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

سرلا کو اس بات کا ہوش ہی نہیں تھا کہ اس کی میز پر کوئی آ بیٹھا ہے۔ جب ویٹر آرڈر لینے آیا تو اس نے ویٹر سے اشارے کنایے میں پوچھا کہ..... کیا اس نے کوئی آرڈر دیا ہے.....؟ اس نے لٹی میں سر ہلا دیا۔

پہلے دو کلب سینڈوچ..... پھر تھوڑی دیر بعد کریم کافی دے جانا.....“ چندرا نے کہا۔ سرلا ججا کھینچنے کئے گہری سوچوں میں غرق تھی ایک نسوانی شیریں اور مانوس سی آواز سن کر بڑے زور سے چوکی..... اس نے چندرا دیوی کو اپنی میز پر پایا تو وہ بڑی حیران ہوئی پھر اس نے قہر زدہ لہجے میں کہا۔

”دیدی.....! آپ کب آئیں..... مجھے تو بالکل بھی پتا نہیں چلا.....؟“
 ”زیادہ دیر نہیں ہوئی۔“ چندرا دیوی نے پیار سے اس کا گال تھپ تھپایا۔ ”اس مرتبہ ہم سے بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی..... یہ تو اس قدر اداس اور پریشان کیوں لگ رہی ہو.....؟ کیا مجھے اس کا سبب نہیں بتاؤ گی.....؟“

”بات یہ ہے کہ پچھلے ماہ ہمارے مالک کرن لال رائے کا دیہانت ہو گیا۔“ وہ اداسی سے بولی۔ ”وہ جب تک زندہ تھے ایک باپ کا ساسا یہ محسوس ہوتا تھا۔ ان کی موت نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا؟“

”کیا مطلب.....؟“ چندرا نے محبت بھرے لہجے میں سوال کیا۔
 ”ان کے وکیل نے ان کے پس ماندگان اور مجھے بھی اپنے دفتر میں بلایا ہے۔“ سرلا نے

اب دیا۔

”وہ کس لئے.....؟“ چندرا دیوی بولی۔

”اس کے لئے کرن لال رائے نے جو وصیت یا خط لکھ کر وکیل صاحب کے پاس رکھوایا تھا وہ پس ماندگان اور مجھے بھی سنائے۔“

اس کے پس ماندگان میں کون کون ہے.....؟“ چندرا دیوی نے دریافت کیا۔

”ایک پوتی اور تین پوتے.....“ سرلا نے بتایا۔ ”آنجنابی نے ان چاروں کو اپنی دولت اور املاک کا وارث اپنی زندگی میں قرار دیا تھا..... میرے خیال میں چاروں میں شاید ساری تقسیم نہیں ہوگی۔“

”یہ ممکن ہے.....“ چندرا دیوی نے سر ہلایا۔ ”اگر ساری تقسیم کی بات ہوتی تو وہ اپنی زندگی ہی میں اس کا حصہ دے دیتے..... پھر وصیت نامے یا خط کی کوئی ضرورت پیش نہ آتی۔“

”لیکن مجھے کس لئے بلایا گیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”میں تو ان کے ملازم کی بیٹی ہوں۔ وارثوں میں سے تو ہوں نہیں.....“

”شاید انہوں نے ترکہ میں تمہارے لئے کچھ رقم مخصوص کی ہو.....“ چندرا نے کہا۔

”ماں بھی یہی کہتی ہے۔“ سرلا نے کہا۔ ”لیکن ہم رقم لے کر کیا کریں گی..... وہ اتنی رقم تو ہوگی نہیں جو سہارا بن سکے..... اب ہم ماں بیٹی کو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ وارث جو ہیں وہ ہمیں بے دخل کر دیں گے تاکہ کوئی فروخت کر کے اپنا اپنا حصہ لے لیں..... آپ جانتی ہیں کہ اس شہر میں فلیٹ کس قدر گراں کرایہ پر ملتے ہیں..... وہ بھی پکڑی پر..... اس کے لئے رقم کہاں سے لائیں۔“

”تم کسی بات کی چھتا نہ کرو۔“ چندرا نے اسے دلاسا دیا۔ ”تمہیں حصے میں پوری رقم اور جو بھی چیز اور جتنی بھی ملے وہ لے لینا.....“

”ماں بھی یہی کہتی ہے۔“ سرلا نے کہا۔ ”ماں یہ بھی کہتی ہے کہ رقم ملنے کے بعد دیکھا جائے گا۔“

”اچھا یہ بتاؤ..... کیا میں بھی تمہارے ساتھ وکیل کے دفتر چل سکتی ہوں۔ وکیل اعتراض تو نہیں کرے گا؟“

”وکیل صاحب نے ہم ماں بیٹی کو بلایا ہے..... میں وکیل صاحب سے کہہ دوں گی کہ چوں کہ ماں کی طبیعت نامناسب ہے اس لئے میں دیدی کو ساتھ لے کر آئی ہوں۔“ سرلا نے کہا۔ ”اگر آپ کچھ خیال نہ کریں تو کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کس لئے چلیں گی؟“

”اس لئے کہ..... میں یہ دیکھوں گی کرن لال رائے آنجنابی جو ایک ارب پتی شخص تھا جس کی کوٹھی چالیس کروڑ کی مالیت کی ہے بھگوان جانے اس کے پاس جانے کتنا بینک بیلنس وہ اپنے

دارثوں میں کس حساب سے حصہ دے رہا ہے۔ اور پھر تمہارے پتاجی نے جو اس کی چالیس برس سیوا لی اور تمہاری ماں نے پچیس برس..... تمہارے نام کتنا کچھ ہے۔“ وہ بولی۔

”اگر میری ماں یا میرے نام بھی کچھ لکھا ہے تو مجھے امید نہیں کہ وہ ملے گا.....؟“ سرلا کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”کیوں.....؟“ چندرا نے متعجب نظروں سے دیکھا۔

”اس لئے کہ ہم دارثوں کے لئے کبھی بھی پسندیدہ نہ رہے۔“ سرلا بولی۔ ”وہ بلاوجہ ہم سے نارکھاتے تھے۔ شاید اس لئے کہ آنجنابی ہم سے بہت اچھا سلوک کرتے تھے اور بڑے مہربان بھی تھے۔“

”وصیت میں جو کچھ بھی تمہاری ماں یا تمہارے لئے لکھا ہوگا تم اس کی قانونی طور پر حق دار ہوگی۔“ چندرا نے کہا۔ ”اس کے حصول کے لئے تم عدالت میں جاسکتی ہو..... تم افسردہ اور پریشان نہ ہو۔ چل کر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے؟“

☆.....☆.....☆

وہ چاروں وارث جنہیں آنجنابی نے اپنی دولت اور املاک کا وارث قرار دیا تھا وہ اپنے سرگرم باش دادا کے وکیل سبھاش بسل کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کرسیاں نیم دائرے کی صورت میں چھبی ہوئی تھیں۔ وہ چاروں آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ سرلا نے وکیل کو فون کر کے بتایا کہ چوں کہ اس کی ماں شدید طویل ہے اس لئے حاضر نہیں ہو سکتی۔ اگر اعتراض کی بات نہ ہو تو وہ اپنی کزن دیدی کے ساتھ آجائے.....؟ وکیل نے اجازت دے دی تھی۔

سرلا اور چندرا دیوی ان وارثوں سے ہٹ کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ سرلا اور چندرا دیوی ایک طرف خاموش بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان چاروں وارثوں کو اس بات کا شدت ہے انتظار تھا کہ ان کے دادا کی وصیت جلد از جلد پڑھی جائے۔ گو وہ اس بات کا تاثر دے رہے تھے کہ انہیں وصیت سننے کی جلدی ہے اور نہ ہی بے تابی کہ وصیت جلد پڑھی جائے۔

لیکن ان کا عمر رسیدہ اور گھماگ قسم کا اور گھسا ہوا وکیل جو ایک طرح سے قیافہ شناس بھی تھا..... ہانا تھا کہ ان کی موجودہ متانت اور افسردگی محض ایک نقاب ہے۔ انہوں نے اپنے دلی تاثرات پہمانے کے لئے بے چینی تھے کہ وصیت میں ان کے نام کتنی املاک لکھی ہوئی ہے.....

دوسرے کمرے میں وکیل کی نوجوان اور طرح دار سیکریٹری شو بھا متفرق اوراق بڑے سلیقے اور طریقے سے اور ترتیب سے جمع کر رہی تھی۔ وصیت کی فائل پر یہ عنوان لکھا ہوا تھا۔

”کرن لال رائے کا تازہ اور آخری وصیت.....“ اس پر ایک ماہ پہلے کی تاریخ درج تھی۔
تھوڑی دیر بعد سیکریٹری کمرے میں آئی اور فائل وکیل کی طرف بڑھائی تو سرگوشیاں ایک دم
سے خاموشی کی آغوش میں چلی گئیں۔ ایک گہرا سناٹا مسلط ہو گیا پورے ماحول پر..... اگر سوئی بھی
فرش پر گرتی تو اس کی آواز سنائی دیتی۔

کمرے کے ایک گوشے میں سفید گلاب کا ایک بڑا سا پودا رکھا ہوا تھا..... اسے ایک خوب
صورت کیلے میں بڑی نفاست سے لگایا ہوا تھا جس نے کمرے کی خوب صورتی میں اضافہ کر دیا تھا۔
وکیل نے فائل کھولتے وقت غیر ارادی طور پر کیلے کی طرف دیکھا اور باری باری اپنے موکل
کے وارٹوں پر ایک نظر ڈالی۔

”دوستو.....!“ وکیل نے کھنکھار کر کہا۔ ”میں نے آپ کے دادا کی وصیت عین ان کی مرضی
کے مطابق تیار کی تھی۔ ایک وکیل کا کام بلکہ یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنے موکل کی ہدایات پر عمل
کرے..... اس کے ذاتی خیالات کچھ بھی ہوں زیر نظر وصیت بھی اس اصول سے مطابقت رکھتی ہے
۔ اس میں جو کچھ بھی کہا گیا ہے وہ تمام تر آج کے سرگ باش دادا کرن لال رائے کے خیالات ہیں
اس میں میرا اپنا قطعی کوئی مشورہ یا رائے شامل نہیں ہے۔ آپ کے دادا نے مجھے یہ ہدایت کی تھی کہ
وصیت سننے سے پہلے آپ سب کو ان کا خط سنایا جائے۔ انہوں نے یہ خط آپ سب کے نام لکھا
تھا۔ چوں کہ یہ وصیت نامہ سے ایک الگ تحریر ہے اس لئے اس کے مندرجات کا علم ان کے خاندان
کے سوا کسی اور کو نہ ہو۔“

وکیل نے توقف کر کے گہرا سانس لیا۔ فائل میں سے ایک کاغذ اٹھا کے ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا
شروع کیا۔

”میرے بچو.....! میری زندگی تیزی سے اختتام کو پہنچ رہی ہے۔ میرا جسم ایک عام آدمی کی
توقع سے زیادہ میری خدمت کر چکا ہے..... میں ایک مٹی کا دیا ہوں نہ جانے کب کس دن، کس
گھڑی اور لمحے بچھ جاؤں۔ عنقریب میں موت کی آغوش میں جانے والا ہوں جو کسی عفریت کی
طرح منہ کھولے میری طرف بڑھ رہی ہے..... موت جس سے آج تک کوئی نہیں بچ سکا۔ میں کیسے
بچ سکتا ہوں۔ لیکن مجھے اس بات پر تازہ ہے۔ فخر ہے کہ کمزور ہو جانے کے باوجود میرا ذہن اب تک
اپنی تمام صلاحیتوں سے بہرہ مند اور روشن ہے۔ اس عمر میں آدمی کا دماغ حواس میں رہنا بہت بڑی
بات ہوتا ہے۔

تم چاروں میرے پیارے اور اکلوتے بیٹے کی اولاد ہو۔ بد قسمتی سے میرا بیٹا مجھ سے پہلے ہی
اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے، اب تم لوگوں کے سوا دنیا میں میرا کوئی عزیز اور رشتہ دار نہیں ہے۔

اس صورت میں چنداں یہ جتانے کی ضرورت نہیں کہ مجھے تم چاروں سے کتنا قلبی تعلق ہو سکتا ہے
۔ میں تم سب کے بارے میں تمہاری توقعات سے کہیں زیادہ سوچتا رہا ہوں۔ تم یہ بات خود بھی
محسوس کر لو گے..... مجھے تم لوگوں کی زندگیوں اور مصروفیات کے سلسلے میں وافر معلومات حاصل
ہیں۔ مجھے تم لوگ ایک پراسرار اور پر تجسس دادا کہہ سکتے ہو..... کیوں کہ یہ ایسی معلومات ہیں جو
پراسرار اور غفلتی علوم کے ماہر سے ہی حاصل کی ہو سکتی ہیں۔ تم یہ سب سن کر بھونچکے ہو جاؤ گے۔ فرار کی
کوئی راہ نہیں رہے گی۔ لہذا جگر تھام کر سنو۔“

بچو! میری زندگی کس تیزی سے اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے اس کا احساس بہت زیادہ ہونے لگا
ہے۔ یہ بات تم لوگ بھی محسوس کر رہے ہو گے۔ میرا جسم ایک عام آدمی کے توقع سے کہیں زیادہ
میری خدمت کر چکا ہے۔ میں نے خاصی لمبی عمر پائی ہے۔ اب میرا جسم بہت جلد چتا پر پہنچنے والا
ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میرا ذہن حزن و غم ہونے کے باوجود اب تک اپنی تمام صلاحیتوں
سے بہرہ مند اور روشن ہے۔ تم چاروں میرے اکلوتے بیٹے کی اولاد ہو۔ بد قسمتی ہے کہ میرا بیٹا مجھ
سے پہلے ہی اس دنیا سے جا چکا ہے۔ کاش! وہ ہوتا..... خیر اب رونے سے کیا حاصل؟ اب تم لوگوں
کے سوا اس دنیا میں میرا کوئی عزیز اور رشتہ دار نہیں ہے۔ اس صورت میں یہ جتانے کی چنداں
ضرورت نہیں ہے کہ مجھے تم لوگوں سے کتنا گہرا تعلق ہو سکتا ہے؟ میں تم سب کے بارے میں تمہاری
توقعات سے کہیں زیادہ سوچتا ہوں۔ یہ بات تم خود بھی محسوس کر لو گے۔

مجھے تم لوگوں کی زندگیوں اور مصروفیات کے سلسلے میں وافر معلومات حاصل ہیں۔ میں نے
تمہارے کام اور تمہارے عیب..... دونوں کی چھان بین کی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ میں بے حد مایوس
ہوا ہوں مجھے تم لوگوں سے اس کی قطعی امید نہیں تھی۔ تم دل میں حیران اور پریشان ہو رہے ہو گے کہ
میں نے کس طرح اور کیسے یہ سب کچھ معلوم کیا..... جب کہ یہ بڑھا گھر میں رہتا تھا..... یہ بات
تمہیں بڑی عجیب اور پراسراری محسوس ہو رہی ہوگی۔ لیکن تم بھول رہے ہو کہ سفید بال تجربے کے
لسان ہوتے ہیں۔ میں نے جو کچھ بھی معلوم کیا اس کی تمہارے فرشتوں کو بھی خبر نہیں..... میرے
ذرائع تم لوگوں سے پوشیدہ رہے ہیں۔ اب میرا بے راگ رائے سنو..... تم لوگوں نے مجموعی حیثیت
سے اچھائی کے بجائے برائی اور خوبیوں کے بجائے خامیوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ اگر میری یہ رائے
منصفانہ نہیں ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔ اب میں تم چاروں سے فردا فردا کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

سہواگ! تم اپنی بہن اور بھائیوں میں سب سے بڑے ہو۔ جس وقت یہ وصیت پڑھی جائے
گی اس وقت اندازاً تمہاری عمر پچاس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ بہ ظاہر تم ایک کامیاب آدمی ہو اور
تمہارا کاروبار برابری کر رہا ہے۔ تمہارا گھر بھی بہت عالی شان ہے۔ اس کا ہر کمرہ آرائش کے قیمتی

ساز و سامان سے مزین ہے۔ میں کبھی کبھی تمہارے گھر جا کر اسے دیکھتا رہا ہوں..... تم کئی بڑے کلبوں کے رکن ہو اور تم نے اعلیٰ حلقوں میں بڑا اثر و رسوخ حاصل کر لیا ہے۔ اس لئے شہر کی سرکاری اور غیر سرکاری ایسی کوئی تقریب نہیں ہے جس میں تمہیں مدعو نہ کیا جاتا ہو اور تم سماجی اور دھرم کے معاملات میں پیش پیش رہتے ہو۔ ان تمام باتوں کے باوجود یا یوں کہنا چاہئے کہ ان تمام باتوں کے باوجود میں تمہیں ایک فریبی اور جعل ساز دشمن خیال کرتا ہوں۔ بے شک تم نے بے اندازہ دولت کمائی ہے..... مگر مجھے شبہ ہے کہ یہ دولت ناجائز ذرائع سے کمائی گئی ہوگی..... لیکن میرا خیال ہے کہ تم نے یہ کام یا بی فاؤسٹ کی طرح اپنی روح شیطان کے ہاتھ فروخت کر کے حاصل کی ہے۔“ وکیل ایک لمحے کے لئے رکا اس نے نگار کی راہ جھاڑ دی۔

سہواگ ایک دراز قد شخص تھا۔ معاشرے میں اسے بہت اہمیت حاصل تھی۔ اس کا ایک ایسے شخص کا عکاس تھا جو احکام داری کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ مگر اس وقت وہ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ اس کے رخساروں سے غصے کی سرخی جھلک رہی تھی۔ اس نے احتجاج کے طور پر منہ کھولا مگر کچھ سوچ کے خاموش رہا اور اپنا غصہ سنجیدگی میں چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ وکیل نے چند لمحوں کے توقف کے بعد پھر خط پڑھنا شروع کیا۔

”دولت مند بننے میں کوئی قباح نہیں ہے سہواگ! لیکن مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تم نے دولت کو اپنا سب کچھ بنالیا ہے۔ نتیجتاً کچھ نہایت خطرناک لوگ تمہارے دشمن بن گئے ہیں۔ وہ ایک نہ ایک دن موقع پا کر تم سے حساب بے باق کر لیں گے۔ وہ اس کی کوشش ہر قیمت پر کریں گے اور تم انہیں روک نہ سکو گے۔ اس لئے کہ تم نے ان سے جو عہد کیا تھا اسے پورا نہیں کیا۔ دولت کے لالچ میں..... لالچ بری بلا ہے۔

دوسری طرف تم نے ایک اعصابی مریضہ سے شادی کر لی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ تمہارے محل کے بجائے کسی جموہنری میں زیادہ خوش رہتی۔ کیوں کہ تمہیں اس غریب کی کوئی پروا نہیں ہے۔ دولت کی ہوس نے تمہیں حد سے زیادہ لالچی اور خود غرض بنا دیا ہے۔ تم نے بار بار مجھ سے میرے مالی حالات کے متعلق بات کی۔ مجھے ہر بار یہ محسوس ہوا کہ تم میرے مفاد کے بارے میں نہیں سوچ رہے ہو بلکہ یہ سوچ رہے ہو کہ میری موت کے بعد تمہیں کیا ملے گا؟“ وکیل نے توقف کر کے صفحہ الٹا اور پھر پڑھنا شروع کیا۔

”اب میں اپنے دوسرے پوتے رام داس سے مخاطب ہوں..... رام داس! میری معلومات کے مطابق تم اپنے بڑے بھائی کے بالکل برعکس ہو۔ تم نے سراسر غیر ذمے داری اختیار کر رکھی ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے کہ تم کسی جائز پیشے سے متعلق نہیں ہو..... تمہاری آوارگی اور عیاشیوں کی

استائیں اکثر میرے کانوں تک پہنچتی رہی ہیں۔ تم ایک عیاش آدمی ہو اور عیاشی کی وجہ سے تمہارا ہال ہال قرض میں جکڑا ہوا ہے۔ ایک کھلنڈرے نوجوان کے کردار میں تم بے حد کامیاب ہو۔ اطہرت نے تمہیں خوب رٹی اور دو جاہت نہایت فیاضی سے عطا کی ہے۔ نہ صرف نوجوان لڑکی بلکہ شادی شدہ عورتیں تک بھی تم پر شمار ہوتی ہیں۔ مگر تمہاری ظاہری صورت کے پیچھے سیرت اور اچھے کردار کا کوئی نام و نشان تک نہیں ہے۔ تمہاری اچھی سیرت والی دو بیویاں تم سے طلاق لے چکی ہیں۔“

رام داس..... سہواگ سے دو تین برس چھوٹا تھا۔ وہ اپنے بارے میں اپنے آن جہانی دادا کی بات سن کر مسکرانے لگا۔ اگر اس تنقید سے اسے کوئی اختلاف ہوگا بھی تو اس نے ظاہر نہیں کیا۔ وہ سہواگ کی طرح لال پیلا نہیں ہوا تھا بلکہ خوش دلی سے قہقہہ لگا کر بولا۔

دادا جان نے میرے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ سچ ہے۔ اس میں زہر برابر بھی مبالغہ نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ میرا ہال ہال قرض میں جکڑا ہوا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ انہوں نے میرے قرضے ادا کرنے کا کیا انتظام کیا ہے.....؟“ وکیل نے اس کا تبصرہ سنا اور پھر آگے پڑھنے لگا۔

”لیکن رام داس.....! ایک بات میں تم اپنے بہن بھائیوں سے نمایاں ہو..... تمہاری طنساری مشہور ہے۔ تم اپنے ملنے والوں کو ایک بااخلاق اور بی خواہ شخص معلوم ہوتے ہو..... پتا نہیں..... تمہاری بی خواہی میں صداقت کتنی ہے اور نمائش کتنی.....؟ یہ خصوصیت عورتوں میں تمہاری مقبولیت کی بنیادی وجہ ہے..... جیسا کہ میری معلومات کے مطابق شادی شدہ عورتوں سے تمہارے تعلقات ہیں۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کسی غیرت مند شوہر نے تمہیں اب تک جیل کیوں نہیں بھجوا دیا اور موت کے گھاٹ کیوں نہ اتار دیا۔ یہ بات کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ کاروں کاری زیادہ عرصہ تک نہیں چلتی ہے۔ اس کا یا کہ نہ ایک دن راز افشاء ہو جاتا ہے۔ کتنے غیرت مند شوہروں نے اپنی بد چلن بیویوں کو طلاق دے دی ہے یا پھر عین موقع پر موت کے گھاٹ اتار دیا..... میں جانتا ہوں کہ تمہاری زندگی میں ایسا دن جلد یا پھر دیر سے آئے گا..... تم اس دن سے بچ نہ سکو گے۔“

وکیل پانی پینے کے لئے رکا۔ اس نے حاضرین پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ وہ سب بہت غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کا تجسس بڑھتا جا رہا تھا۔ اب میں ساکت و جامد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان پر پھر کے تجسس کا دھوکا ہوتا تھا۔ وکیل پھر خط پڑھنے لگا۔

”اب میں اپنی پوتی سربتا سے مخاطب ہوں..... سربتا! تم ایک حسین اور ذہین عورت ہو۔

واقعہ کو شش کر کے دبا دیا گیا تھا۔ میں بھی تمہاری یہ افسوسناک غلطی دہراتا..... مگر میں نے یہ محسوس کیا کہ تم اگر چہ محتاط رہنے کا وعدہ کر چکے ہو پھر بھی تمہاری بے پروائی جاری ہے۔ اندیشہ ہے کہ تمہاری وجہ سے کسی اور سزے سے شرمناک وقت سے پہلے مرنا نہ پڑے۔“

ڈاکٹر موہن کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ دھلی ہوئی چادر کی طرح لگ رہا تھا۔ لہو کی بوند تک نہ رہی تھی۔ وہ اپنے چشمے سے وکیل کو قہر آلود نظروں سے گھور رہا تھا۔ سزے سے شرمناک معاملے میں اس نے انتہائی رازداری سے کام لیا تھا۔ اس لئے اسے شاید حیرت تھی کہ اس کے دادا کو کس طرح پتا چل گیا اور جب انہیں یہ راز معلوم تھا تو ان کے علاوہ نہ جانے کون کون اس سے واقف ہوگا۔ ڈاکٹر موہن کی بہن اور بھائی اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

وکیل ڈاکٹر کو اس تکلیف دہ صورت حال سے بچانے کے لئے جلدی جلدی خط پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

”اور اب میں تم لوگوں کے بارے میں یہ یقینی خط ختم کرتا ہوں۔ یہ مشورے میں نے محض محبت اور خلوص کی بنا پر تحریر کئے ہیں۔ امید ہے کہ تم لوگوں نے بھی انہیں محبت اور خلوص سے ہی سنا ہوگا۔ میری دلی خواہش ہے کہ تم سب ٹھنڈے دماغ سے میرے خط کا مقصد سمجھو اور ممکن ہو تو اپنی خامیاں دور کرنے کی کوشش کرو۔ جو اپنا عہدہ کرتا ہے۔ وہ اپنی زندگی اور مستقبل بناتا ہے۔

اب میں تم لوگوں کے من پسند موضوع کی طرف آتا ہوں۔ تم سب لوگوں کی بڑی خواہش تھی کہ میں مرجاؤں..... اور تم لوگ اس بات پر حیران اور جڑ بڑھتے کہ مر کیوں نہیں رہا ہوں..... خیر..... کوئی بات نہیں۔ کیوں کہ انسان دولت کی ہوس کا پتلا ہے۔

میں تم لوگوں کو بتاتا ہوں کہ میں نے تم لوگوں کے لئے کیا چھوڑا..... میری دولت اور املاک کی اصل قیمت جان کر تم لوگوں کو مایوسی ہوگی۔ تم لوگ مجھے کو سو گے..... برا بھلا کہو گے۔ لیکن مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کیوں کہ میری آتما نشانتا رہے گی۔ اس لئے کہ میں نے انسانیت کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ تمہارے اندازوں کے مطابق زیادہ مال نہیں چھوڑ سکا..... تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ میں گزشتہ دس برس سے نرسنگ ہوم میں اپنے دن پورے کر رہا تھا۔ تم میں سے کسی میں یہ نہ ہو سکا کہ مجھے اپنے ہاں لے جا کر رکھتا۔ میری سیوا کرتا۔ میں تم سب کے ہوتے ہوئے اس دنیا میں اکیلا تھا۔ لیکن میں اپنے ملازم مالی کیل کپور اور اس کی بیٹی کی سیوا کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ کیل کپور جب تک زندہ تھا اس نے میری بڑی خدمت کی اس کی بیٹی اور بیٹی نے میرے نرسنگ سے گھر آنے اور نرسنگ میں زیر علاج رہنے کے وقت بھی میرا خیال رکھا۔

ہاں تو میں یہ بتا رہا تھا کہ نرسنگ ہوم کے بڑے بھاری اخراجات تھے۔ میں نے ایک دی آئی

ایسا بہت کم دیکھنے میں آیا کہ حسین عورت، ذہین بھی ہو۔ تم نے بہت مناسب مرد سے شادی کی ہے۔ ہر لحاظ سے وہ تمہارا جوڑ ہے۔ ایسے شوہر نصیب سے ہی عورتوں کو ملتے ہیں..... لیکن سہواگ کی طرح تمہیں بھی دولت سے پیار ہے۔ اس کے حصول کی تمہیں لت پڑتی جا رہی ہے۔ اس کے اندھے جنون میں مبتلا ہو گئی ہو۔ یہ ایک طرح کا علاج مرض ہے۔

اخبارات میں آج کل تمہارے متعلق کچھ خبریں شائع ہو رہی ہیں۔ ان کے مطابق تم اپنا بیش تر وقت سماجی سرگرمیوں میں صرف کرتی ہو۔ گویا تم ایک سماجی لیڈر ہو۔ تم شہر کے کسی نہ کسی اندیشے میں مبتلا ہوتی رہتی ہو۔ مگر اپنے گھر اور بچوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتی ہو۔“

سرتا جدید طرز کے قیمتی لباس میں ملبوس جس میں اس کے جسم کی نمائش ہو رہی تھی نہایت شان سے سگریٹ کا دھواں اڑا رہی تھی۔ اس نے اپنے آن جہانی دادا کی رائے سن کر ناک بویں چڑھائیں۔ وکیل خط پڑھتا رہا۔

”تم بچپن میں بہت اچھی بچی تھیں..... میں نے تم میں تمہارے بچپن کی خصوصیات تلاش کرنے کی کوشش کی مگر مجھے شدید جسم کی مایوسی ہوئی۔ میں نے تمہارے بچپن میں ان خصوصیات کا شاید محسوس کرنا چاہا۔ مگر افسوس کہ اس میں ناکام رہا۔ تم سب نام و نمود اور نمائش کے عادی ہو۔ نمود و نمائش میں خلوص کے سوا سب کچھ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سہواگ کی طرح تم نے بھی وہ رکوانے کے لئے اپنی انسانیت قربان کر دی ہے۔ یہ ایک مہنگا سودا ہے۔“

وکیل نے صفحہ الٹا۔ سب کی نظریں ڈاکٹر موہن کی طرف اٹھ گئیں۔ ان چاروں میں وہی باقی رہ گیا تھا۔ وکیل پڑھنے لگا۔

”موہن! تم نے اپنی زندگی میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔ تم ایک اچھے اور ماہر سرجن کی حیثیت سے خاصے مشہور ہو..... لیکن زندگی کی قدر و قیمت کرنے میں تم نے بھی فاش غلطیاں کی ہیں۔ بے شک تم اچھے اور کامیاب ڈاکٹر ہو..... لیکن تمہاری دولت کمانے یا مختلف طبی اداروں کے اعلیٰ سے اعلیٰ درجے حاصل کرنے پر مبذول رہی۔ اس امر نے تمہاری طبیعت پر صلاحیت بہت متاثر کی۔ مثال کے طور پر میں ایک واقعے کا انکشاف کرتا ہوں۔ امید ہے کہ یہ انکشاف خاندان کے افراد کے سوا کسی اور کے علم میں نہیں آئے گا۔

میں افسوس سے یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ تمہاری بے توجہی سے ایک انسانی زندگی ضائع ہو چکی ہے..... میرا اشارہ سزے سے شرمناک کی طرف ہے۔ تعصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ..... سزے سے شرمناک کا دیہانت محض تمہاری قابلا نہ اور ناقص تشخیص کی وجہ سے ہوا۔ حالاں کہ اس کی بیماری مناسب وقت پر معلوم ہو جاتی تو علاج ہو سکتا تھا۔ مجھے علم ہے کہ یہ

پی کمرہ لیا ہوا تھا۔ ایک نرس میری دیکھ بھال پر مامور تھی۔ جب لوگوں کو میری فکر اور پردہ نشینی تو میں کیوں تم لوگوں کی فکر کرتا۔ زندگی وہاں سکون اور اطمینان سے گزرتی رہی۔ بیماری کے باوجود..... مطالعہ، ٹی وی اور ٹی وی پر کرکٹ میچ اور فلمیں دیکھ کر جیتتا رہا۔ یہ جیسے میری عیادت اور میری بیماری کو کم کرتے رہے۔ مجھے اپنی کوٹھی فروخت کر کے اس نرسنگ ہوم کے ہماری اخراجات کے علاوہ کچھ قرضے بھی ادا کرنے ہیں۔ میرے وکیل تمہیں بتائیں گے کہ میری چند ذاتی اشیاء کے علاوہ بینک میں معمولی رقم ہے۔ اگر میں چند مہینے اور زندہ رہ جاتا تو تمہیں اتنا حصہ بھی نہ ملتا۔ میری موت کے بعد آخری رسوم کے اخراجات بھی وکیل صاحب کو دے رہا ہوں۔ جو رقم بینک میں جمع ہے اس میں سے تم سب کوئی کس بیس ہزار ملیں گے۔

میں کپور کی بیوہ اور اس کی بیٹی سے شرمندہ ہوں کہ انہیں صرف سفید گلاب کا ایک پودا دے رہا ہوں۔ کپل کپور اور مجھے سفید گلاب ہمیشہ سے پسند رہا ہے۔ کاش! میں اس کی بیوہ کو اس سے بڑھ کر دے سکتا۔ ماں بیٹی مجھے شاکر دیں کہ میں ان کی محبت، سیوا اور خلوص کا انعام نہ دے سکا۔ یہ پودا مجھے ہمیشہ عزیز رہا ہے۔ اگر تم میں سے کوئی اس پودے کو لینا چاہے تو وہ لے لے..... لیکن بیوہ کپل کپور کو اس کے عوض اپنا حصہ بیس ہزار کی رقم دینا ہوگی۔ اٹانے میں پودے کی شمولیت پر تمہیں بہت حیرانی ہوگی۔ میری زندگی میں بھی تم لوگ پودے سے میری وابستگی کو دماغی خلل سمجھتے تھے۔ اس لئے میری خواہش ہے کہ میرے بعد کم سے کم یہ ننھا پودا میری یادگار کے طور پر باقی رہ جائے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میری موت کے بعد تم میں سے کوئی بھی میرا نام لینا اور یادگار قائم کرنا پسند نہیں کرے گا۔ اس لئے میں کپل کپور کی بیوہ کو دے رہا ہوں۔ اگر کوئی مجھ سے بچی محبت کرتا ہو اور میری یادگار کو لے جانا چاہتا ہے تو اسے وہ شرط پوری کرنا ہوگی جو میں نے بیان کی ہے۔ میں نے ہدایت دے دی ہے کہ میری چند قدیم نادرا اشیاء کے سوا باقی کی فروخت سے جو رقم ملے اس سے قرضے اور اسپتال کے بل ادا کر کے باقی رقم تم سب میں مساوی طور پر ادا کر دی جائے تاکہ کسی کو شکایت نہ ہو۔ میرے خیال میں اس سفید گلاب کے پودے کو تم میں سے کوئی اس کی نگہداشت کرتا رہے میری یادگار سمجھ کر اور اس کی دیکھ بھال اپنے ذمے لے لے۔ میری تو یہ خواہش ہے کہ تم چاروں مل کر اسے اپنے پاس باری باری رکھو..... کسی اور سبب سے نہیں..... محض اس خیال سے کہ تمہارے بوڑھے دادا کو اس سے جنون کی حد تک محبت تھی۔ کیوں کہ میری زندگی میں مجھ سے بڑی شہ دہ سے اپنے قلبی تعلق کا اظہار کرتے تھے اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں کہنا..... اب میں نیک تمناؤں سے رخصت ہوتا ہوں۔“

چاروں دائرہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہے آخر سب سے پہلے سہواگ نے غصے سے زبان کھولی۔

”ہونہہ..... کل بیس ہزار کی رقم..... میں ہرگز یقین نہیں کر سکتا؟“ اس نے وکیل سے کہا۔ آپ دادا جان کی جملہ املاک کے بنگران ہیں۔ آپ سے زیادہ کون واقف ہوگا کہ ان کے پاس کہیں زیادہ دولت تھی۔ ابھی گزشتہ برس میں نے چیک کیا تھا تو.....“

”گویا آن جہانی کا قیاس سو فیصد درست تھا۔“ وکیل نے درمیان میں لقمہ دیا۔ ”مسٹر سہواگ آپ ان کی جائیداد کی ٹوہ میں رہتے تھے۔“

”جی ہاں..... یقیناً اور میں آپ کو خبردار کرتا ہوں آپ وہ جائیداد دبا کر نہیں بیٹھ سکتے۔ اب وہ ہماری ہے۔“

”اگر آپ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مرحوم کی جائیداد خط میں بیان کردہ مالیت سے زیادہ تھی تو آپ اپنا دعویٰ ثابت کرنے کی کوشش ضرور کیجیے..... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“ وکیل نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ”اس وقت ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آپ میں سے کون سفید گلاب کا پودا قبول کرے گا؟ ان کی شرط کے مطابق..... ویسے اسے قبول کرنا آپ کی ذمہ داری ہے، کیوں کہ آپ سب سے بڑے ہیں۔“

”ہرگز نہیں.....“ سہواگ ناک چڑھا کر بولا۔ ”میں اسے بیس ہزار کی رقم کے عوض خریدوں..... آپ اسے کپل کپور کی بیٹی کو ہی دے دیں۔ میں تو اسے ہاتھ لگانا بھی پسند نہیں کرتا، میں تو اسے ملت میں بھی قبول نہ کروں۔“

”آپ کے دادا کی خواہش تھی کہ یہ خاندان کے کسی فرد کے پاس رہے۔“ وکیل نے چاروں طرف رکھیں۔ ”گلاب وہ اس دنیا میں نہیں رہے ہیں۔ امید ہے کہ آپ میں سے کوئی بھی مرحوم کی خواہش پوری کرے گا آپ کے لئے بیس ہزار کی رقم کوئی اہمیت نہیں رکھتی ہے۔“

”تم سے کم میں تو ہرگز دادا کی شرط پوری نہیں کروں گی اور نہ ہی مجھے اب پودوں کی ضرورت ہے۔ بیس ہزار خاصی بڑی رقم ہے۔ سو دو سو روپے میں کسی بھی نرسری سے ایسے بیس پودے مل جائیں گے۔“

وکیل نے رام داس اور ڈاکٹر موہن کی طرف دیکھا اور انہیں مخاطب کیا۔

”کیا آپ دونوں میں سے کوئی آمادہ ہے.....؟“

ڈاکٹر اور رام داس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”جی نہیں..... یہ کپل کپور کی بیٹی کو دان کر دیں۔“

ڈاکٹر موہن نے کہا۔

ان حالات میں وصیت نامہ پڑھنا ایک صبر آزمائے کام تھا۔ مگر وکیل کو اس سے عہدہ برا ہونا پڑا۔ وہ ساٹا آواز میں وصیت کی مختلف شرائط سناتا رہا..... وصیت میں مرحوم کی ذاتی اشیاء کی تفصیل

تمہاری ماں اور تمہارے باپ اور تم نے جو برسوں میری بے غرض خدمت کی یہ اس کا صلہ ہے
یہ ایک خزانہ ہے جس کی مالیت چار کروڑ کی ہے۔ میں نے ہندوستانی کرنسی کی بجائے غیر ملکی اس لئے
رکھی ہے کہ اس کی قیمت روز بروز بڑھتی ہے۔ میں نے اولاد کو یہ سب کچھ کس لئے نہیں دیا، میرا خط
سن کر تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا وہ کیسے خود غرض اور دولت کے بھوکے تھے..... سچ پوچھو تو تم تینوں نے
جو میری سیوا کی اس کے مقابلے میں یہ ورثہ کچھ بھی نہیں ہے۔
کرن لعل رائے

”آپ اس کی چھتا نہ کریں۔“ چند راہروی نے انہیں دلاسا دیا۔ ”ان کے دادا کا خط آپ دونوں کو تحفظ دے گا..... میں ایسا انتظام کر دوں گی کہ یہ دولت سرلا کے نام کر دوں گی۔ اس سے املاک خرید کر اور رقم بینک میں رکھ کر گزارنا..... سرلا کے لئے جواہر پرکاش کا رشتہ آیا ہے اس کی شادی اس سے کر دیتا۔ وہ دنیا میں تنہا ہے وہ نیک طبیعت کا ہے۔ اسے دولت کی ہوس بالکل بھی نہیں ہے۔ اوم پرکاش کا روبرو کرنا چاہتا ہے اسے بڑی رقم دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

چند رادیوی بنگلور میں دسہرہ کا میلہ، جشن اور اس کی بہادر دیکھنے آئی تھی۔ دسہرہ کا میلہ جو صوبہ

چند رادیوی نے کملے میں سے پودے کو نکالا۔ کملے کی مٹی میں روئی چڑے کا ایک تھیلہ دبا ہوا تھا۔ چند رادیوی نے تھیلے کا منہ کھول کر اسے بستر پر الٹ دیا تو ماں بیٹی کی آنکھیں پٹی پٹی رہ گئیں۔ انہیں یقین نہیں آیا۔ انہیں ایسا لگا جیسے وہ کوئی سندر سا پستانہ کھڑی ہی ہوں۔

کرنا تک میں صدیوں سے ہر برس بڑی شان و شوکت اور روایتی انداز اور دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اس کی سہیلی شاردانے اسے مدعو کیا تھا جو شادی کے بعد اس کے شوہر کا تالہ بنگلہ ہونے کے بعد وہ دوسرے سے رہ رہی تھی۔ چندرا دیوی نے دسہرے کی بڑی تعریف سن کر تھی جو پورے کرنا تک کے ہر گاؤں اور شہروں میں منایا جاتا تھا۔ یہ میسور مہاراجا کی روایت تھی۔ صدیوں کے گزر جانے کے باوجود آج بھی یہ ریت قائم تھی۔ زبردست طریقے سے بنگلہ اور میسور میں سہرہ منایا جاتا تھا۔ چندرا دیوی کی بڑی خواہش تھی کہ وہ دسہرہ دیکھے۔ آج وہ آگئی تھی۔

شاردانے اسے اپنے ہاں ٹھہرایا تھا۔ اس کا شوہر کچھ دنوں کے لئے دفتر کے کام سے دہلی گیا ہوا تھا۔ شارداس بات سے واقف تھی کہ چندرا دیوی غیر معمولی اور پراسرار صلاحیتوں کی مالک ہے۔ سفلی علوم اور کالا جادو اور ہر قسم کے جادو کے ماہر، بدروحمیں اور چڑیلیں اس کے آگے بے بس ہیں۔

چندرا دیوی نے اسے شادی سے پہلے ایک سفلی علوم کے ماہر سے نجات دلائی تھی جو اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

”یارا تو بڑے اچھے وقت آئی ہے۔“ شاردانے اس سے کہا۔ ”میری ایک سہیلی پدنی ہے۔ اس وقت وہ بہت بڑی مشکل میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس پر ایسی افتاد آن پڑی ہے کہ اس سے تو ہی نجات دلا سکتی ہے۔“

”بات کیا ہے.....؟ قصہ کہانی کیا ہے.....؟“ چندرا دیوی نے پوچھا۔

”بات بڑی نازک اور قصہ کہانی بڑی لمبی ہے۔“ شاردانے جواب دیا۔ ”میں نے اس سے تمہارا ذکر کیا تھا، میں اسے لٹچ پر مدعو کرتی ہوں۔ تم اس کی زبانی سن لینا..... وہ تمہیں مجھ سے بہتر بتائے گی۔“

شاردانے اپنی سہیلی پدنی کو فون کیا تو وہ ایک بجے پہنچ گئی۔ پدنی اتنی حسین تھی کہ چندرا دیوی نے اسے لپٹا کر بے اختیار چوم لیا۔ پدنی چندرا دیوی سے مل کر بہت خوش اور سرزدہ ہوئی تھی۔ وہ کہے بغیر نہ سکی۔

”میں نے اپنی زندگی میں آپ جیسی حسین ناری نہیں دیکھی ہے..... آپ واقعی آکاش سے اتری ہوئی دیوی معلوم ہوتی ہیں۔ جب بھی شارداسے ملاقات ہوتی ہے وہ آپ ہی کا ذکر اور تعریف کرتی ہے۔ آپ سے ملنے کا میرا دل کرتا تھا۔ آج آپ سے ملاقات ہوگئی۔“

کھانے سے فراغت پانے کے بعد شاردانے ان دونوں کو ایک کمرے میں چھوڑ دیا تاکہ ان کے درمیان کچھ بات ہو سکے۔

چندرا دیوی نے کہا ”آپ مجھ سے کوئی بات نہ چھپائیں۔ آپ جو بھی بتائیں گی وہ میرے اور آپ کے درمیان راز رہے گا۔ آپ مجھ پر اندھا بھروسہ کر سکتی ہیں۔ میں شارداکو بھی نہیں بتاؤں گی۔ آپ بے فکر ہیں۔“

”میری کوئی بات شارداسے چھپی ہوئی نہیں ہے اور نہ ہی میں آپ سے چھپاؤں گی۔“ پدنی نے جواب دیا۔ ”میں آپ کو اپنی رام کہانی سناتی ہوں۔“

☆.....☆.....☆

”میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو یقین نہیں آیا کہ میری شادی کو گیارہ برس گزر چکے ہیں۔“ یہ سب ایک سہنا سا معلوم ہوتا تھا۔ وقت جو کسی کا نہیں ہوتا ہے وہ پلک جھپکنے گزر گیا تھا۔ کوئی اس بات کو نہیں مانتا اور نہ ہی یہ بات ماننے کے لئے تیار ہوتا تھا کہ میں شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں ہوں۔

”لوگ مجھے سترہ اشادہ برس کی دو شیزہ ہی کہتے تھے۔ میرے ساتھ اکثر ایسا ہوا تھا کہ کسی شادی کی تقریب یا کسی اور محفل میں شرکت کرنے جاتی تو بڑی بوڑھی عورتیں مجھے کنواری لڑکی سمجھ کر گھیر لیتی تھیں اور سوالات کی بوچھاڑ کر دیتی تھیں۔“

”بیٹی! تم کہاں رہتی ہو.....؟ تمہارے ماما پاپا کا کیا نام ہے؟“

تم نے گرجویشن کر لیا ہے یا ابھی زیر تعلیم ہو؟ زیر تعلیم ہو تو کس کلاس میں ہو؟

کہیں تمہارا رشتہ تو طے نہیں ہوا؟ کیا تم مجھے اپنے گھر کا پتہ دینا پسند کرو گی؟

کیا تمہارے گھر والے بھی اس تقریب میں موجود ہیں.....؟ وہ کہاں ہیں؟ ان سے ملاقات تو کرو۔“

میں ان کے سوالات کی بوچھاڑ میں مسکرا دیتی اور مسکرا کر ان سے کہتی۔ ”میں شادی شدہ ہوں۔“

”نہیں بیٹی۔ تم کسی وجہ سے جھوٹ بول رہی ہو۔ میرا بیٹا انجینئر ہے..... منیجر ہے..... ڈل ایسٹ میں جاب کرتا ہے۔“

اگر بچے اس تقریب میں موجود ہوتے تو میں انہیں ان کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیتی۔ ”یہ مہرے بچے ہیں۔“

یا پھر میں اپنے والدین سے ملا دیتی یا کسی ایسے مہمان سے جو مجھ سے واقف ہوتا تھا اس سے ملا دیتی تھی۔

جب ان کے علم میں آتا کہ میں شادی شدہ ہوں تو انہیں یقین نہیں آتا۔ وہ کہتی تھیں کہ میں

کسی وجہ سے مبالغہ سے کام لے رہی ہوں۔ وہ مجھے اپنی بہو بنانے کی خواہش مند ہوتی تھیں۔ میں دل میں حیران ہوتی تھی کہ وہ صرف خوبصورتی کے پیچھے کیوں اور کس لئے بھاگتی ہیں؟

میرے دو پیارے پیارے بچے ہیں۔ سب سے بڑا لڑکا ہے اس کی عمر نو برس کی ہے۔ دوسری بیٹی ہے جو سات برس کی ہے۔ میرے پتی کرشنا کمار ایک کامیاب اور ممتاز بزنس میں ہیں۔ ان کا شمار صرف بنگلور شہر کے بڑے بڑے تاجروں میں نہیں بلکہ پورے صوبہ کرناٹک میں بھی ہوتا ہے۔ ان کی بنگلور شہر میں تین بڑی بڑی دکانیں شہر کے اعلیٰ کمرشل ایریا میں ہیں۔ ان میں ایک دکان جیولری کی ہے اور دوسری ملبوسات کی ہے۔

میرے پتی کے پاس دولت کی فراوانی ہے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ زندگی پریش گزر رہی تھی۔ کوئی پریشانی، بیماری اور مسائل نہ تھے۔

میرے پتی نے مجھے ہر قسم کی آزادی دے رکھی ہے مجھے اپنی ذات پر سنکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں خرچ کرنے کی اجازت ہے۔ انہوں نے کبھی میرے اخراجات کا حساب نہیں لیا۔ اور نہ ہی میری فضول خرچی پر کبھی باز پرس کی۔ اس لئے کہ وہ ہر حال میں مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔

میں اپنے پتی کے کاروبار سے بھی خوب فائدہ اٹھاتی ہوں۔ جب کبھی میرا دل چاہا میں جیولری شاپ کھلی گئی۔ اپنی پسند کا کوئی جدید ترین زیور لے آئی چاہے اس کی قیمت کتنی ہی کیوں نہ ہو۔

میرے پاس اس قدر زیورات ہیں کہ ان سے ایک چھوٹی سی دکان کھولی جاسکتی ہے۔ اس کے باوجود کبھی میرا دل زیورات سے نہیں بھرا۔ عمدہ نفیس اور جدید فیشن کے ملبوسات بھی میری بڑی کمزوری ہیں۔ ہر ہفتہ چھ سات جوڑے خریدنا میرا مشغلہ ہے۔

مجھے سارا دن گھر میں بن سنور کر رہنے۔۔۔۔۔ اچھے سے اچھے کھانے کی دلدادہ بھی ہوں۔ گھر میں، میں نے کھانے پکانے والی تین عورتوں کو رکھا ہوا ہے جنہوں نے ہر قسم کے کھانوں کا کورس کیا ہوا ہے۔ وہ بڑی ماہر ہیں انہیں میری پسند اور ذوق کا بھی خیال رہتا ہے تفریحات اور تقریبات میں شرکت کے سوا کوئی کام نہیں ہے۔ گھر میں نوکروں چاکروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔۔۔۔۔ کچھ

سہیلیاں میری اس خواب ناک زندگی پر رشک کرتی ہیں اور کچھ وہ۔۔۔۔۔ مگر میں اس کے باوجود ان سے بڑی محبت اور کھلے دل سے ملتی ہوں اور انہیں ساتھ لے کر چلتی ہوں۔ میری سہیلیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان میں ہر طبقے کی بھی ہیں میں ناداروں کی وقفاؤ قائم د کرتی ہوں۔

پدمی نے توقف کر کے پوچھا۔ ”کہیں آج ان تفصیلات سے بے زار تو نہیں ہو رہی ہیں؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”میں سن رہی ہوں۔ آپ کہتی جائیں۔“

میں آپ کو تفصیلات اس لئے بتا رہی ہوں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ میں کس طرح اور کیسے۔۔۔۔۔؟

اور کیوں کر ایک کمسی کی طرح کڑی کے جال میں پھنس گئی ہوں۔

میں نے اپنے دونوں بچوں کو میسور کے ایک اسکول اور بورڈنگ میں داخل کرا دیا تھا۔ جہاں دولت مندوں، اعلیٰ سرکاری افسران اور سفارت کاروں کے بچے بھی پڑھتے ہیں۔

بگلور میں ایک سے ایک اچھے اور اعلیٰ معیار کے اسکول موجود ہیں لیکن میں نے اس لئے وہاں بچوں کو داخل کرایا تھا کہ وہ میرے مشاغل اور تفریحات میں حائل ہوتے۔۔۔۔۔ میسور شہر چوں کہ دور تھا اس لئے وہ صرف چھٹی میں گھر آتے اور مجھے ایک ماں ہونے کے ناطے وقت

بٹا پڑتا۔ میرے پتی نے اتنی دور داخل کرانے پر سخت احتجاج بھی کیا تھا۔ مگر میں نے ان کی ایک نہ سنی۔ وہ جمعہ کی شام ہوائی جہاز سے ملے آتے اور اتوار کی شام چلے جاتے ہیں۔ بچے

بھی وہاں کے ماحول اور اس بات کے عادی ہو گئے ہیں ان کا دل وہاں لگ گیا تھا دراصل وہاں ان کی تفریحات کی کوئی کمی نہیں ہے۔ میری کوشی اس شہر کے سب سے اعلیٰ رہائشی

ملائے میں ہے۔ جتنی خوب صورت ہے اس سے کہیں پر شکوہ ہے۔ دور سے دیکھنے پر کسی محل کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ دو مرد نوکر ہیں اور ایک چوکی دار بھی ہے۔ ایک عمر رسیدہ شخص سودا

سلف لانے پر مامور ہے۔ نوکرانیوں میں شوٹی، لکشمی اور کانتا ہے جو کھانے پکاتی ہیں۔ ایک لوتن ہے جو اوپر کا کام کرتی ہے۔ شو بھا اور لکشمی ساتھ رہتی ہیں ان کے گھر در اس اور ویلور

شہر میں ہیں۔ ہر تین مہینے بعد انہیں ہاری ہاری سات دنوں کی چھٹی دیتی ہوں۔ بعض اوقات میں انہیں چار دنوں سے زائد چھٹی نہیں دیتی ہوں۔

میرے پتی پر کاش آئندہ نوجو بچے جاتے تو رات نو بجے سے پہلے نہیں لوٹتے ہیں۔ ان کا معمول ہے۔ اگر کہیں جانا ہوتا تو وہ چھ سات بجے آ جاتے۔۔۔۔۔ میں صبح ان کے ساتھ

دشٹا کرتی۔۔۔۔۔ جب وہ چلے جاتے تو ایک گھنٹہ اخبار پڑھتی یا پھر اپنی کسی سہیلی کے ہاں چلی جاتی یا پھر سہیلیاں میرے ہاں آ جاتیں اور لچ کر کے چلی جاتیں۔ اگر کوئی نہ آیا اور کسی وجہ

سے میں نہیں جاتی تو گھنٹوں فون پر گپ شپ کرتی رہتی۔

میرے پتی اپنی دکانوں کے مال کی خریداری کے سلسلے میں سنگاپور، ہانگ کانگ، دہلی اور جاپان بھی جاتے تھے۔ وہ پندرہ بیس دن سے پہلے نہیں لوٹتے تھے۔ اس طرح سے مجھے

اور آزادی مل جاتی پھر میں گھر میں ایک گھنٹہ بھی نہیں ملتی تھی۔ آزاد پنچھی کی طرح پرواز کرنے لگتی۔ میں اپنی نئی بڑی گاڑی میں سہیلیوں کے ہاں پہنچ جاتیں۔ ہم ہندوستانی، انگریزی اور ہر قسم کی فلمیں دیکھتیں کہ کیف و سرور رگ رگ میں دوڑ جاتا۔ میری سہیلیوں میں اکثریت

ٹادی شدہ کی تھی۔ اس لئے آپس میں بہت فری، بے تکلف اور بے حجاب تھیں۔ ہمارے

درمیان کوئی دیوار اور رکاوٹ نہ تھی۔

ہم کسی چائینز ہوٹل ریسٹورنٹ میں جا کر پر تکلف لُچ کرتیں کھانے کے دوران فلموں پر بے لاگ تبصرے سرگوشی کے انداز میں اور معنی خیز طریقے سے کرتیں جس سے بڑا لطف آتا۔ وقت اور دل بہل جاتا۔ حیرت کی بات تھی کہ ہندوستان میں بھی امریکہ اور یورپ جیسی فلمیں بننے لگی ہیں۔

آپ جانتی ہوں گی کہ بنگلور کے مضافات میں سور جاتے ہوئے راستے میں برعدادن گارڈن ہے۔ وہاں ایک ڈیم ہے سنچر اور اتوار کی رات اس وسیع و عریض جگہ پر زبردست چراغاں ہوتا ہے۔ وہاں مصنوعی آبشار بھی ہیں مقامی اور سیاح بھی چراغاں دیکھنے جوق در جوق آتے ہیں وہاں اور بھی تفریحات ہیں۔ مردوں کے علاوہ عورتوں کے لئے مخصوص سونٹنگ پول اور حمام بھی ہیں۔ عام دنوں میں ہم ادھر جاتی ہیں اس لئے وہاں رش نہیں ہوتا ہے۔ صرف سنچر اور اتوار کو بہت رش ہوتا ہے۔ ہم اس سونٹنگ پول میں نہایت سکون اور آزادی سے نہایتی تھیں آزادی کے سہارے میں نہانے کا لطف اور ہی ہوتا ہے۔ اس میں ایک فرحت پوشیدہ ہوتی ہے آپس میں خوب چھیڑ چھاڑ ہوتی۔ ایک دوسرے کو دیوچ بھی لیا جاتا۔ ہمارے درمیان کوئی حجاب اور شرم نہیں ہوتی تھی۔ پھر ہم وہاں سے خوب محظوظ ہو کر واپس گھروں کو لوٹتے۔

اس مرتبہ میرے پتی ہانگ کانگ، جاپان اور کوریا کے لئے روانہ ہوئے تو انہوں نے کہا کہ ان کی واپسی میں ڈیڑھ دو مہینے بھی لگ سکتے ہیں۔ وہ انجینی کے لئے موبائل فون کمپنیوں سے کاروباری معاملات طے کرنے جا رہے تھے۔ یہ نیا دور تھا۔

ان کے جانے کے دوسرے دن میں حسب معمول گیارہ بجے بیدار ہوئی۔ (جب میرے پتی باہر دورے پر ہوتے تھے تو میں گیارہ بجے دن تک سوتی رہتی تھی۔) کانا نے آکر بتایا کہ سروسوٹی ماسی صبح سات بجے سے آئی بیٹھی ہیں اور مجھے جگانے کا کئی بار کہہ چکی ہیں کہ ایک بے حد ضروری کام ہے۔ لیکن میں نے آپ کو جگایا نہیں۔ پر مصر تھیں۔ میں نے انہیں بڑی مشکل سے باز رکھا ہوا ہے۔

سروسوٹی ماسی میری ماتحتی کے دور کے رشتہ داروں میں سے ہیں ان کا ایک بیٹا امرت لال میرے پتی کی جیولری کی دکان میں سیلز میں ہے سروسوٹی ماسی ایک تیز و طرار اور شاطر قسم کی عورت ضرور تھیں۔ لیکن مجھ سے بے حد ہم درد اور مخلص ہیں انہوں نے مجھے یہ گرتایا تھا کہ شوہر کو کس طرح مٹھی میں رکھا جاتا ہے۔ مٹھی میں رکھنا ضروری ہے کیوں کہ تمہارا شوہر نہ صرف

لوب صورت ہے بلکہ بھرپور جوان شخص ہے۔ آج کل کی جوان حسین لڑکیاں دولت مندوں کو ہمار کرتی پھرتی ہیں۔ ایک بات یاد رکھو کہ خرد کا ایک بار پیر پھلا تو پھسلتا ہی جاتا ہے۔ تم اس خوش فہمی اور زعم میں مت رہنا کہ..... چون کہ تم بہت حسین ہو لہذا تمہارا شوہر کسی لڑکی کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔ مرد کی فطرت ہے کہ ایک عورت لاکھ حسین اور جوان کیوں نہ ہو یکسانیت سے اکٹا جاتا ہے۔

انہوں نے مجھے چند ایک مفید مشورے دیئے تھے کہ شوہر کو کیسے مٹھی میں کیا جاتا ہے۔ مرد کو کس طرح خوش کرنا اور اس پر مہربان ہونا چاہئے کہ اس کا دل بھرتا نہیں چاہئے..... وہ روز بروز اسیر ہوتا جائے۔ ان کے مشوروں اور نسخوں پر میں نے عمل کر کے انہیں مٹھی میں لیا ہوا تھا۔ اگر میں ایسا نہ کرتی تو میرے پتی کب کے میرے ہاتھ سے نکل چکے ہوتے۔ میرے پتی کرشنا کار کے دو ایک کاروباری دوستوں کو جانتی ہوں جنہوں نے دو دو شادیاں کی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی جو دوست لڑکیاں اور پرائیویٹ سیکریٹری تھیں وہ اپنا اسیر بنا کر دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی تھیں۔ سروسوٹی ماسی نے میری رہنمائی نہیں کی ہوئی تو میں اب تک ان کی نظروں میں اپنی وقت کھوجی ہوتی۔ سروسوٹی ماسی کہتی تھیں کہ شادی کے کچھ عرصے بعد شوہروں کو خوش کرنے سے بے پروا ہو جاتی ہیں اور وہ وارنٹی، والہانہ پن اور خود سپردگی نہیں ہوتی ہے جس کی تمنا پتی کرتا ہے۔ رسی انداز میں اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتی ہیں اور پھر اپنے جسم کی خوب صورتی کا بھی خیال نہیں کرتی ہیں۔ مرد حسن کا بڑا دلدادہ ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ عورت اپنے جسم کی خوبصورتی کا خیال رکھے۔ ورنہ وہ چھپتائے گی۔

جب کوئی ایسا مسئلہ پیش آتا جواز دواجی زندگی میں دراڑ ڈالنے والا ہوتا تو میں انہیں بلا لیتی تھی۔ ایک مرتبہ مجھے کسی نے بتایا ایک مقامی ٹی وی ڈراموں کی ہیر و دن اور فلم کی رقا صدر نجنا جس نے ہارے صوبے کرناٹک اور مدراس میں بھی اپنے ہوش رہا رقصوں سے فلموں اور اسٹیج ڈراموں میں قیامت چار کی تھی۔ وہ بے حد سیکسی تھی۔ لوگ اس کے ناچ دیکھنے کے لئے بے تاب ہوتے تھے اس میں دل چسپی لے رہے ہیں وہ دونوں اکثر تفریحی مقامات اور ہوٹلوں میں ساتھ ساتھ دیکھنے گئے ہیں اور دو ایک راتیں ایک فائیو اسٹارز ہوٹل میں کالی کی ہیں اور میرے پتی کرشنا کار نے اسے ایک جڑاؤ ٹیکس ان راتوں کے عوض تحفے میں دیا وہ تین لاکھ کی مالیت کا ہے۔ اور بھی شاید بیش قیمت تحائف بھی دیئے ہیں۔

یہ سن کر مجھ پر کوئی بجلی سی آگئی۔ اتفاق سے وہ اس رات کو گھر پر نہیں تھے۔ تین دن کے لئے اہل گئے ہوئے تھے۔ وہ ہوتے تو صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا اور میں ان سے لڑ کر میکے چلی

جاتی۔ بھگوان جانے کیا ہوتا۔ گھر اور حسین ازدواجی زندگی اجڑ جاتی۔ میں یہ سن کر گھر آ کر پھوٹ پھوٹ کر بچوں کی طرح روتی رہی۔ پھر میں نے ایک ملازمہ کو بھیج کر انہیں بلایا۔ انہیں تمام باتیں سنائیں۔

انہوں نے مجھ سے کہا کہ ”میں جو کچھ پوچھوں اس کا سچ جواب دیتا۔ کوئی بات نہ چھپانا.....؟“

میں نے ان سے کہا کہ ”آپ پوچھیں۔ میں نے آج تک آپ سے کوئی سی بھی بات نہیں چھپائی ہے۔“ اور میں نے ساری باتیں انہیں بتا دیں۔

”تم نے ایک جتنی ہو کر اچھا نہیں کیا۔ آئندہ ایسا نہ کرنا۔“ انہوں نے کہا۔

پھر سروسٹی ماسی نے جادو ٹونے سے ایسا توڑ کیا کہ رنجنا ایک ہفتہ بعد ہی چلی گئی۔ اس نے ایک ارب پتی تارواڑی فلم ساز کو کچھانے کراس سے شادی کر لی یوں مجھے اس حرافہ رنجنا سے نجات مل گئی۔ اس روز سے میں نے کبھی اپنے پتی کی کسی بھی خواہش اور جذبات کو پکلا نہیں۔ انہوں جو توڑ کیا تھا میں نے اس کارن دس ہزار کی رقم کی صورت میں پیش کیا۔ میں ان کی وقتاً فوقتاً مالی مدد بھی کرتی رہتی تھی۔ ان کی تین جوان بیٹیاں تھیں اور ان کے پتی اکثر بیمار رہتے تھے۔ اس لئے گزر بسر مشکل سے ہوتی تھی۔

سروسٹی ماسی کی اتنی غیر متوقع آمد پر جو جلدی ہوئی تھی۔ مجھے غصہ آیا تھا۔ کیوں کہ تین چار دن قبل وہ مجھ سے شوہر کی اور ایک بیٹی کی کالج فیس کے لئے دو ہزار کی رقم لے جا چکی تھیں۔ آج پھر کس بہانے مجھ سے رقم لینے کے لئے نازل ہو گئی تھیں۔

میں نے اٹھ کر غسل کیا۔ پھر جب ناشتے کی میز پر آئی تو وہ اس کمرے میں ایک کونے میں غم زدہ، ہنکار پریشان سی بیٹھی ہوئی تھیں۔ چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ میں ان کی اتنی ہی شکل دیکھ کر سمجھ گئی کہ وہ اپنے پتی کی کہانی سن کر رقم اٹھنے آئی ہوئی ہیں۔ اب تک کسی نے یہ معلوم کر کے نہیں بتایا کہ ان کے پتی واقعی بیمار ہیں۔ وہ کوئی دو تین برس سے بیمار چلے آ رہے تھے اور نامعلوم مرض میں مبتلا تھے۔ نہ ہی میں نے کبھی ان کے ہاں جا کر تصدیق کی تھی۔ مجھے کبھی ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے بیمار شوہر کی آڑ میں مجھے لوٹ رہی ہیں۔ لیکن میں اسلئے خاموش تھی کہ انہوں نے میری ازدواجی زندگی کو غموں کے سائے سے بچایا تھا۔ پھر انہوں نے شوہر کو خوش رکھنے کے لئے اسے گرتائے تھے کہ وہ میرے علاوہ کسی اور عورت کے پاس نہیں جاسکتے تھے اور میرا سحر کوئی سی بھی عورت توڑ نہیں سکتی تھی۔

انہوں نے میرے انکار کا جواب دینے کے بعد حسب عادت مجھے بہت ساری دعائیں دے

الیں اور پھر میری بلائیں بھی لیں۔ لیکن اسکے باوجود میں نے قدرے ناگواری سے پوچھا۔ ”آج آپ اتنی جلدی کیسے آ گئیں.....؟ کبھی اتنی سویرے نہیں آئیں؟ خیریت؟“

”مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”میں تمہارے کام سے آئی ہوں۔ پہلے آپ اطمینان سے ناشتہ کر لیں۔ میں پھر تم سے بات کروں گی۔“

”اگر ایسی کوئی بات ہے تو..... ایسا کرو کہ میز پر آ جاؤ۔“ میں نے کہا یہ ساتھ میں ناشتہ بھی کرتی جائیں جو بات کرنی ہے ساتھ میں کرتی جائیں..... آج کا وقت بھی بچ جائے گا۔“

”بات کچھ ایسی ہے کہ میں یہاں..... کسی کے سامنے..... اس وقت ناشتے کی میز پر کرنا نہیں چاہتی ہوں۔“ ان کا لہجہ بڑا پرسرا سا تھا۔ اس نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے؟ میں نے سوچا، جانے کیوں میرا دل دھک سے ہو گیا۔

”میں منع کر دوں گی اس کمرے میں کوئی نہ آئے.....؟“ میں نے کہا۔ ”آپ کہہ دیں کوئی جھگ نہ کریں؟“

”دوبار کے بھی کان ہوتے ہیں۔“ وہ بولیں۔ ”اسی لئے میں تم سے تنہائی میں بات کرنا چاہتی ہوں۔“

مجھے تعجب ہوا تھا کہ ایسی کیا بات ہے اس وقت اور ناشتے کی میز پر کرنا نہیں چاہتی ہیں۔ کبھی اس سے پہلے ایسا نہیں ہوا تھا۔ اتنی احتیاط اور رازداری نہیں برتی ہے۔ جب کہ وہ جانتی ہیں کہ میری لو کرانیاں رازدار اور بھروسے کی ہیں۔

میں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا۔ ناشتے کے دوران بھی میں نے بہت سوچا کہ ایسی کیا بات ہے؟ خوف، تعجب، دوسوے اور اندیشے پھنکارتے ہوئے زہریلے ناگوں کی طرح ڈستے رہے۔ میرا خیال اپنے پتی کی طرف گیا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ زندگی ہنسی خوشی گزرتی تھی۔ میں اب کسی بھی وقت ان کی کسی بھی خواہش سے انکاری نہیں ہوتی تھی۔ سروسٹی نے جب سے مجھے بتایا تھا اس روز سے میں ان کے ساتھ بڑی گرم جوشی اور والہانہ پن اور وارفتگی سے اتنی محبت سے پیش آنے لگی تھی ہر رات سہاگ کی پہلی رات کی طرح محسوس ہوتی تھی کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا۔ اور شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا تھا۔ پھر یہ خیال آیا کہ شاید ان کی لڑکیوں کا کوئی مسئلہ ہوگا۔ کیوں کہ لڑکیاں لوجوان اور حسین تھیں۔ شاید میں کسی لڑکی سے کوئی لغزش ہو گئی ہوگی۔ اس کا کوئی نتیجہ برآمد ہوگا جس پر وہ چشم پوشی کرنے اور نجات حاصل کرنے کے خیال، مدد اور مشورے کے لئے آئی ہوں گی۔

پھر میں ان کے کہنے پر اپنی خواب گاہ میں لے آئی۔ دروازہ بند کر کے اندر سے چٹنی لگا دی۔

حالاں کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کیوں کہ میں نے تمام نوکرانیوں سے کہہ دیا تھا کہ میں جب تک کسی کو نہ بلاؤں کسی کو آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

میں نے انہیں کرسی پر بٹھایا اور خود بستر پر بیٹھ گئی۔ پھر ان سے دریافت کیا۔

”ہاں تو سرسوتی ماسی! کیا بات ہے۔ جلدی سے بتائیں؟“

انہوں نے پرس میں سے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھا دیا اور سرگوشی میں بولیں۔

”اس میں کچھ تصویریں ہیں۔“ میں آپ کو دکھانے لائی ہوں۔“

”تصویریں.....؟ کیسی تصویریں.....؟“ میں نے ان کے ہاتھ سے لفافہ لے کر انہیں سوالیہ

نظروں سے دیکھا۔ ”کس کی تصویریں ہیں؟ میں ان تصویروں کا کیا کروں؟“

”اس میں تصویریں نہیں بلکہ ہم ہیں.....“ سرسوتی ماسی نے بڑے پراسرار لہجے میں کہا۔ ”اس

میں جو تصویریں ہیں انہیں حاصل کرنے کے لئے میرے بیٹے نے دس ہزار کی رقم خرچ کی ہے ایک

دوست سے قرض لے کر..... میرے بیٹے رام چندر کو دس ہزار کی رقم دینی ہوگی تاکہ وہ قرض ادا

کر سکے۔“

”دس ہزار کی رقم کیوں اور کس لئے دوں.....؟“ میں نے قدرے ناگواری سے کہا۔ ”ان

تصویروں سے میرا کیا تعلق.....؟ میں ان تصویروں کے عوض اتنی بڑی رقم ہرگز نہیں دوں گی.....؟ کیا

آپ کے خیال میں دس ہزار کی رقم معمولی ہے جو بلاوجہ دے دوں؟“

اس لمحے اچانک ایک خیال مجھے آیا۔ بل بھر میں، میں نے بہت کچھ سوچ لیا۔ میں اپنی

سہیلیوں کو لے کر گاؤں جاتی تھی۔ گاڑی میں خود ہی ڈرائیور کرتی تھی۔ نہ تو کوئی مرد ساتھ ہوتا تھا

اور نہ ہی کسی سیکلی کا پتی۔ عموماً ہم عام دنوں میں جاتی تھیں۔ میرے ذاتی استعمال میں ذاتی گاڑی

مرسدیز ہوتی تھی۔ وہاں بڑا خوبصورت سوئمنگ پول ہوتا ہے۔ جس کا ماحول بڑا خوب ناک ہے وہ

جدید طرز کا ہے ہر قسم کی سہولیات ہیں اس کی دیواریں اندر جو ہیں وہ زمین سے لے کر چھت تک

آئینے کی ہیں۔ اس کی چھت بھی آئینے کی ہے۔ رنگین برقی طاقت درختوں سے بھی آتی ہے۔ اس میں نہانے

کی فیس اتنی ہے کہ ایک عام عورت کیا صاحب حیثیت عورت بھی سوچتی ہے۔ نہایت سکون

اور اطمینان اور آزادی کے سہارے سے بے نیاز ہو کر نہاتی تھیں۔ آخر پردہ کس بات کا..... نہانے

کے دوران ہمارے درمیان کوئی حجاب نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح نہانے کا ایک الگ ہی مزاح تھا

اور لذت بھی پوشیدہ بھی محسوس ہوتی تھی شاید کسی بلیک میلر نے کسی برقی قلم سے کیمرا نصب کر کے

ہماری تصویریں اتاری ہوں گی تاکہ ہم میں سے تمام سہیلیوں کو بلیک میل کر کے ان سے موٹی رقم

تھیلیاں جائے۔ کیوں کہ ہم سب کا تعلق اعلیٰ گھرانوں سے تھا۔

کوئی ڈیڑھ برس پہلے ایک ایسا واقعہ وہاں پیش آیا تھا۔ یہ ایک صنعت کار اور ممبئی کی ایک فلمی

ہیروئن کے ساتھ پیش آچکا تھا۔ ان کے پیچھے ایک بلیک میلر لگا ہوا تھا۔ اس وقت ان دونوں کے سوا

کوئی اور سوئمنگ پول میں نہ تھا۔ بلیک میلر نے وہاں کے ملازمین سے ساز باز کر کے دس ہزار روپے

دے کر ایک خفیہ جگہ سے ان کے نہانے کی ویڈیو فلم بنائی۔ اس بلیک میلر نے صنعت کار اور ہیروئن

سے دس دس لاکھ اور ہیروئن سے کہا کہ وہ دس دنوں کے لئے بھی اس کے ساتھ رہے..... صنعت کار

نے ایک اجرتی قاتل کی خدمت حاصل کر کے اسے مرداد یا۔ اب ایسے واقعات اور بلیک میلنگ عام

ہوتی جا رہی ہے۔ شو بزنس کے مشہور و معروف اداکارائیں بھی بلیک میلروں کے پھندوں میں پھنسی

ہوتی ہیں۔

یہ خیال آتے ہی میرا سینہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔ دل کبھی ڈنکی پر بندے کی طرح پھڑ پھڑانے

لگا۔ ایسا لگا وہ سینشن کر کے نکل آئے گا۔ ہاتھ پیرن ہو کر رہ گئے۔ میں نے سوچا کہ اب تو میں اپنے

شوہر کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گی..... ایک خیال یہ بھی آیا کہ سرسوتی ماسی کا بیٹا رام چندر

بلیک میلر بن گیا ہے.....؟ اس نے کسی بلیک میلر سے میری تصویریں اس لئے خریدی ہیں کہ مجھے

بلیک میل کر سکے..... میری دولت پر اس کی نظریں ہیں اور رال فک پڑی ہے۔ یہ لوگ نمک حرام اور

احسان فراموش ہوتے ہیں؟

میری پیشانی نے صرف عرق آلود ہو گئی تھی بلکہ سارا جسم پسینے میں بھیک گیا اور کپڑے جسم سے

چپک گئے۔ مجھ میں اتنی بہت اور سکت نہیں رہی تھی کہ تصویریں نکال کر دیکھ سکوں۔ رگوں میں لہو بھی

منجمد ہو گیا تھا۔

تمہارا ان تصویروں سے گہرا تعلق ہے.....“ سرسوتی ماسی نے مجھے پریشان اور خوف زدہ دیکھ

کر کہا۔ ”ایٹھو کا شکر ادا کرو کہ میرے بیٹے نے تمہارے احسانات کا بدلہ اتارا ہے..... اگر وہ کسی

سے دس ہزار کی رقم لے کر یہ تصویریں حاصل نہ کرتا تو ایٹھو جانے تمہارا کیا حشر ہوتا؟ تم اس کا تصور

بھی نہیں کر سکتی ہو.....؟“ اتنا کہہ کر انہوں نے ایک لمبا سانس لیا۔

میں ان کا آخری جملہ سن کر بری طرح چوگی..... اب اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں آیا تھا

کہ یہ میری تصویریں ہیں..... میں پچھتا رہی تھی اور میری سہیلیاں آخراں سے باکی اور آزادی سے

یوں نہاتی ہیں؟ اس کا یہی انجام ہوتا تھا۔ آج سارا کیف و لطف غارت ہو کر رہ گیا تھا۔ ان کے

بیٹے نے مجھے جس شرمناک حالت میں دیکھا اس کا خیال کر کے ہی میری حالت غجالت سے پانی

پانی ہو گئی۔ میری سہیلیاں بھی بڑی گھرانوں کی تھیں۔ معلوم نہیں ان کی تصویریں بھی تھیں یا

نہیں.....؟ ان کے بیٹے نے شاید صرف میری تصویریں اس بلیک میلر سے اس خیال سے خریدی

ہوں گی پہلے تو مجھ سے نمٹ لے..... پھر ان سے ایک ایک کر کے نمٹ لیا اور مال وصول کر لیا جائے گا۔ وہ بے حد ماؤرن تھیں۔ ان کی تصویریں لازمی ہوں گی۔ کیوں ایک حمام میں ہم سب ہی مادر پدر آزاد تھیں۔

میں نے جی کڑا کے ان تصویروں کو لفافے سے نکالا۔ اس کے سوا چارہ بھی تو نہیں تھا کہ میں اس بھیا تک اور لرزہ خیز حقیقت کا سامنا کروں۔ اس لفافے میں پوسٹ کارڈ سائز کی صرف چار تصویریں تھیں۔ وہ مختلف پوز کی تھیں۔ یہ دیکھ کر جان میں جان آئی کہ ان میں میری ایک تصویر بھی نہیں تھی۔ میرے دل کو جو شانتی محسوس ہوئی کیا بتاؤں۔ ایسا لگا کہ مجھے ایک نئی زندگی ملی ہے۔ یہ ایک نوجوان اور بے حد حسین لڑکی کے چار مختلف پوز تھے۔ ہر پوز ایسا تھا کہ مردوں کے دلوں کو بر بادے۔ اس میں ایک پوز دلہن کا بھی تھا۔

میں نے ان تصویروں پر ایک سرسری نظر ڈالی اور پھر لا تعلقی سے کہا۔
”سرسوتی ماسی.....! میرا اس لڑکی سے کیا واسطہ.....؟ میں اس لڑکی کو بالکل بھی نہیں جانتی ہوں۔ پہلی بار اس کی تصویریں دیکھ رہی ہوں؟“
سرسوتی ماسی نے معلوم نہیں کیوں میری بات کا کوئی فوری جواب نہیں دیا۔ شاید کہنے کے لئے الفاظ موزوں کر رہی اور ترتیب دے رہی تھیں۔ ان کی ذہنی کشش ان کے چہرے سے صاف عیاں ہو رہی تھی۔ پھر وہ ایک گہری سانس لے کر بولیں۔

”بیٹی.....! میری بات سن کر تم اپنے آپ کو سنبھالنا..... دل مضبوط کر لینا..... اس لئے کہ تمہاری زندگی میں..... تمہاری بے خبری میں ایک زبردست طوفان آ گیا ہے..... کاش! یہ منحوس طوفان نہ آتا..... ہائے میرے بھگوان.....“ انہوں نے اپنا سینہ دبا لیا۔

”طوفان.....؟ کیسا طوفان.....؟ میں نے انہیں ٹوکا۔“ سرسوتی ماسی.....! آپ ہوش میں تو ہو.....؟ آج یہ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو.....؟ کہیں تم نے نشہ کرنا تو شروع نہیں کر دیا.....؟ کیا تمہارے لئے ایک گلاس ٹھنڈا پانی منگوا دوں؟“

”یہ لڑکی ایسا طوفان ہے جس نے تمہاری ازدواجی زندگی نہ صرف تاخت و تاراج بلکہ تمہیں نہیں کر دی ہے؟“ وہ بے حد سنجیدہ ہو کر بولیں۔

میں ایک دم سے اس طرح اچھل پڑی۔ جیسے مجھے برقی جھٹکا لگا ہو۔ میں بھونچکی سی ہو گئی۔ میں نے اسے اپنی سماعت کا فتور سمجھا..... لیکن یہ کوئی فتور نہ تھا..... دوسرے لمحے میرا سر چکرانے لگا۔ مجھے یوں لگا جیسے کمرے میں بھونچال سا آگیا اور کمرے کی ہر چیز ڈولتی اور مجھ پر گرتی محسوس ہو رہی تھی..... میرے سامنے سرسوتی ماسی جو بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ گردش کرتی نظر آ رہی تھیں۔ صرف ان کا

چہرہ نہیں بلکہ ہر چیز دھندلا سی گئی تھی۔ مجھے تو اپنی زندگی بھی دھندلائی اور چکراتی، ڈولتی اور کانپتی محسوس ہونے لگی۔

انہوں نے میری جو غیر حالت دیکھی ایک دم گہرا سی گئیں۔ ایک لحظہ انہوں نے میرے پاس آ کر جلدی سے بستر پر مجھے لٹا دیا۔ پھر اے سی بند کر دیا۔ پھر انہوں نے بستر کے پاس آ کر مجھ پر جبکہ کراچی ساڑھی کے پلو سے میری عرق آلود پیشانی کو صاف کیا۔
”کیا ہوا بیٹی.....!“ انہوں نے مجھے متوحش نظروں سے دیکھتے ہوئے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”پانی.....“ میں صرف اتنا ہی کہہ سکی کیوں کہ میرے حلق میں کانٹے سے چھ رہے تھے اور سخت پیاس لگ رہی تھی۔

وہ بجلی کی سی سرعت سے لپک کر باورچی خانے میں گئیں۔ وہاں فریج تھا۔ اس میں سے ایک گلاس ٹھنڈا پانی لے کر آئیں۔ مجھے سہارا دے کر اٹھا یا وہ نکیوں کے سہارے بٹھا دیا۔ پھر انہوں نے گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ پانی پینے سے میری حالت قدرے سنبھل گئی۔ ایک طرف بڑا سکون سا محسوس ہوا۔ دوسری طرف میرے اندر نفرت اور لمحے کی لہر اٹھی۔

”اگر آپ کو اس کا پہلے سے علم تھا تو آپ نے کیوں نہیں بتایا؟“ میں نے بگڑ کر برہمی سے کہا اور سینے میں سانس پھول گئی اور کان کی لوئیں دھک اٹھی تھیں۔ ”پانی سر سے گزرنے کے بعد ایسے تار ہی ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو؟“

”مجھے اس بات کا کل شام بتا چلا تھا۔ سرسوتی ماسی کہنے لگیں۔“ اور یہ بات کل شام ہی میرے بیٹے کے بھی علم میں آئی تھی۔ وہ دوڑا دوڑا چلا آیا تھا..... اگر ہمیں اس کا علم پہلے ہو جاتا تو ان کی شادی فوراً رکوا دیتے اور تمہیں بھی اس کی اطلاع دے دیتے۔ اس بات کا سخت افسوس ہے..... دکھ ہے اس کا۔ تیرا کمان سے نکل گیا۔“

”یہ شادی کب اور کس دن ہوئی؟“ میں نے بھڑک کر پوچھا۔ میرا سر تیزی سے گھومنے اور لٹس میں لہواٹنے لگا۔

”انہوں نے یہ شادی سنگاپور روانگی سے ایک دن پہلے کی تھی۔“ سرسوتی نے جواب دیا۔
”اب وہ اپنی نئی دلہن کے ساتھ نئی مون منانے کے لئے گئے ہیں۔ ان کی واپسی دو مہینے سے پہلے ہونا ممکن نہیں ہے کیوں کہ ان کا ارادہ یورپ کی سیر و سیاحت کا بھی ہے۔“
میں ان کی بات سنتے ہی کسی شیرنی کی طرح پھر کراٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے تن بدن میں ایک

آگ لگ گئی تھی۔ میں غضب ناک لہجے میں بولی۔

”میں آج ہی سنگاپور جاتی ہوں..... مجھے معلوم ہے کہ وہ کس ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں..... میں اس کمپنی کے اتنے جوتے لگاؤں گی کہ..... نہ صرف اس کے چہرے کا جغرافیہ بگڑ جائے گا بلکہ سر پر ایک بال بھی نہیں رہے گا..... اپنے شوہر کے بھی ایسے ہوش ٹھکانے لگاؤں گا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھیں گے..... کسی دوسری عورت کی طرف دیکھنا بھی بھول جائیں گے..... وہ کیا سمجھتے ہیں اپنے آپ کو..... میرے گھر والے ابھی مرے نہیں زندہ ہیں..... ان کا گریبان پکڑ سکتے ہیں؟“

نفرت اور غصے سے میرا برا حال ہو گیا۔ نفس میں انگارے بھر گئے اور کان کی لویں دھک اٹھیں اور جسم کا پنے لگا۔ اگر اس وقت ثنا میرے سامنے ہوتے تو میں الماری سے پستول نکال کر بے دریغ انہیں گولیاں مار کر ختم کر دیتی۔ سینے میں سانسوں کا جو زیروم تھا وہ قابو میں نہیں آیا تھا۔

سرسوتی ماسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بستر پر بٹھا دیا۔ میرا شانہ دھیرے دھیرے سے تھپ تھپایا۔ پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔

”دیکھو بیٹی.....! خود کو قابو میں رکھو..... جذباتی نہ ہو اور نہ ہی اس قدر غصے میں آؤ۔ کیوں کہ یہ سب کچھ لا حاصل ہے۔“

”ایک حرافہ نے میری دنیا اندھیر کر دی اور میں غصے میں نہ آؤں.....؟“ میں نے تپے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا آپ جانتی ہیں کہ میں ان دونوں کو شادی کی پر غلوس مبارک باد اور کوئی بیش قیمت تحفہ بھیجوں.....؟ آپ کی عقل ٹھکانے ہے۔“

”میری عقل ٹھکانے ہے تمہاری عقل نہیں..... اس لئے کہ غصے میں کوئی بات ٹھیک سے بھائی نہیں دیتی ہے۔ بعد میں پشیمانی اٹھانی پڑتی ہے..... اس کو تابی پر بچھتاوا ہوتا ہے۔“ سرسوتی ماسی مجھے سمجھانے لگیں۔ ”جب تیرا مکان سے نکل جاتا ہے تو واپس نہیں آتا ہے۔ تم ایک سمجھ دار عورت ہو..... نادانی کی باتیں نہ کرو..... انتقام کے اندھے جنوں میں اپنے بیروں پر کلہاڑی نہ مارو..... تم نے وہاں جا کر کوئی ہنگامہ کھڑا کیا تو اول تم وہاں اندر ہو جاؤ گی..... وہاں کے قوانین بڑے سخت ہیں۔ یہ ہندوستان نہیں ہے کہ معاملہ دب جائے..... اور پھر صاحب غصہ میں آ کر اپنی بے عزتی برداشت نہ کر کے تمہیں طلاق کی دھمکی دے کر نکال باہر کریں گے..... اس شادی کا کوئی ثبوت بھی تو نہیں ہے..... تم ان کا کچھ بگاڑ بھی نہ سکو گی۔ تم ایک خالی برتن کی طرح ہو کر رہ جاؤ گی جس میں کچھ نہیں ہوتا ہے۔ تم نے ان پہلوؤں پر سوچا ہے.....؟ نہیں سوچا ہے تو ٹھنڈے دل سے سوچو.....“

”وہ مجھے واپس آ کر بھی طلاق دے سکتے ہیں.....؟“ میں نے کہا۔ ”تب بھی میری کوئی حیثیت وقعت نہیں ہوگی؟ میں دو کوڑی کی ہو کر رہ جاؤ گی..... میرا داغ ماؤف ہو رہا ہے۔ میری کچھ

کچھ میں نہیں آ رہا ہے.....؟ میں اپنی دل کی کیفیت بتا نہیں سکتی.....“

”میں یہ چاہتی ہوں کہ سانپ بھی مر جائے لاشی بھی نہ ٹوٹے.....“ وہ کہنے لگیں۔ ”ان کی واپسی میں ڈیڑھ دو مہینے کا عرصہ باقی ہے۔ اس عرصے میں بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ اس عرصے میں ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں..... بات صرف اتنی سی ہے کہ تحمل اور عقل سے کام لینے کی ضرورت ہے..... تم حوصلہ اور ہمت نہ ہارو اور نا امید نہ ہو..... تم نے حوصلہ ہار دیا تو سب کچھ ہار دو گی۔“

”بھلا! اب ہم کیا کر سکتے ہیں.....؟“ میں زچ ہو کر بولی۔ ”میرے سینے میں سانسوں کا زیروم ہم قابو میں نہیں آیا تھا۔“ میرا پتی دیو ایک نوجوان، نوخیز دوشیزہ سے شادی کر کٹانی مون منار ہا ہے اور میرے سینے پر سانپ لوٹ رہے ہیں۔ اب ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے..... یہ طفل تسلیاں ہیں۔“

”آخر تم کرنا کیا چاہتی ہوں؟“ سرسوتی ماسی نے پوچھا۔ ”تمہارے ذہن میں کیا ہے؟ اس وقت تم کیا سوچ رہی ہو؟“

”اب ہم کچھ نہیں کر سکتے..... سوائے اس کے کہ میں اپنے والدین کے پاس چلی جاؤں اور انہیں اپنی درد بھری کہانی سناؤں کہ ایک ڈاکٹر نے میرا آبا گھر اجاڑ دیا ہے۔ سب کچھ جس جس ہو کر رہ گیا ہے.....؟ اب میں کیا کروں؟“

”بیٹی.....! تم نے اتنی جلدی حوصلہ ہار دیا۔“ سرسوتی ماسی نے کہا۔ ”میں نہیں جانتی تھی کہ تم اندر سے اتنی کمزور اور بے ہمت ہو۔“

”مجھ پر اس وقت کیا بیت رہی ہے یہ میں جانتی ہوں.....“ میں نے کہا۔ ”اب اس لڑکی کا جادوان پر چل گیا ہے..... میں اس سحر کو توڑ نہیں سکتی..... ایک طویل عرصہ ساتھ گزار کر اب ان کا دل مجھ سے بھر گیا ہے..... اب وہ مجھ میں کوئی دل کشی اور جاذبیت نہیں پارہے ہیں..... اس لئے تو وہ اس کمپنی اور حرافہ کے جال میں آ گئے ہیں۔ وہ واپس آتے ہی سب سے پہلے مجھے طلاق دے دیں گے؟“

”ہو سکتا ہے کہ وہ واپس آ کر تمہیں طلاق نہ دیں..... وہ اسے کسی دوسری جگہ پر رکھیں..... یہ تم نے کیسے سوچ لیا.....؟ سمجھ لیا.....؟ فیصلہ کر لیا کہ وہ تمہیں طلاق دے دیں گے..... یہ تم کیسی اداس محرومی کی باتیں کر رہی ہو؟ آخر تم آج اب بھی لاکھوں میں ایک ہو..... تمہارا حسن اور یہ پر شباب بدن اور پر شکوہ سراپا بڑا گدا ہے۔ تم سولہ برس کی کنواری لڑکی لگتی ہو۔“

”سرسوتی ماسی.....!“ میں نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”آپ مردوں کو نہیں جانتی ہیں..... جب ان پر کسی نوجوان اور حسین لڑکی کا جادو چل جاتا ہے تو پھر بیوی کا جادو اس کے آگے ماند پڑ جاتا ہے۔ چاہے وہ لاکھ حسین نہ ہو..... پھر ان کی نظروں میں بیوی گھر کی مرغی دال برابر

ہو جاتی ہے..... میں کوئی بچی نہیں ہوں اور نہ خوابوں میں رہنے والی عورت ہوں۔ میں ایک حقیقت پسند عورت ہوں..... خود کو فریب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی..... انہوں نے دوسری شادی کر لی اس لئے کہ ان کا دل مجھ سے بھر گیا ہے.....“

سرسوتی ماسی نے سانس لینے کے لئے توقف کیا تو ان کا چہرہ یک لخت کسی خیال سے دمک اٹھا۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔

مجھے ایسا لگا جیسے انہیں گھورا اندھیرے میں امید کی کوئی کرن دکھائی دی ہو۔ جس نے نہال کر دیا ہو۔

پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بستر پر میرے پاس آ بیٹھیں۔ پھر انہوں نے میرا ہاتھ تمام لیا۔ پھر فرط مسرت سے کہنے لگیں۔

”تم مایوس اور دل برداشتہ کیوں ہوتی ہو.....؟ جس طرح لوہے کو لوہا کاٹتا ہے..... اس طرح جادو کو جادو ہی کاٹ سکتا ہے..... رام چندر بتا رہا تھا کہ صاحب اس لڑکی کے جال میں نہیں آ رہے تھے۔ وہ ان پر ڈورے ڈال رہی تھی۔ اس نے صاحب کو اپنے ہاں اپنی سالگرہ کے بہانے بلایا..... اس دن اور اس وقت گھر میں صرف لڑکی اکیلی تھی۔ ایک تو اس نے ایسا نامناسب لباس پہن رکھا تھا کہ مرد بے قابو ہو جائے اور پھر اس نے ایسی ایسی حرکتیں کیں کہ صاحب کا پیر پھسل جائے۔ صاحب فوراً ہی گھر سے نکل گئے۔ اس لڑکی کی بڑی بہن دوسرے کمرے میں تھی تاکہ ان کی غلاظت تصویریں بنا کر بلیک میل کیا جاسکے..... تب انہوں نے صاحب کو جادو کے ذریعے سے اپنے جال میں پھانسنے کی کوشش کی..... دراصل اس لڑکی کا ماموں جادوؤں نے اور سفلی علوم کا ماہر ہے۔ یہ اس کا ذریعہ معاش بھی ہے۔ اس نے اپنی بھانجی کا گھر بسانے اور مالی فوائد حاصل کرنے کے لئے صاحب کو پھانسا..... اس طرح تمہارے صاحب اس کے کالے جادو کا شکار ہو گئے ہیں..... کالا جادو گوکہ تمام جادوؤں پر بھاری ہے، لیکن اس جادو کا توڑ بھی ہے۔ یہ توڑ کسی جادو سے ہی ممکن ہے۔ اس کے سوا کوئی اور صورت ایسی دکھائی نہیں دیتی صاحب کو اس جادو سے نکالا جائے۔“

سرسوتی ماسی کی بات میرے دل کو لگی۔ ہندوستان میں جادوگروں، شعبدہ بازوں اور بڑے بڑے عالموں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ پوری دنیا میں مصر، بنگال اور ہندوستان کا جادو بہت مشہور ہے۔ یہاں بھی سنا تھا اور سنتی تھی کہ ایک سے ایک بڑا جادوگر مشہور ہے۔ بہت ساری ایسی عورتیں جو ستائی ہوئی ہوتی تھیں اور لوگ بھی جو پریشان حال ہوتے تھے ان جادوگروں سے رابطہ کرتے تھے۔

”کیا آپ کی نظر میں ایسا کوئی جادوگر ہے جو اس جادو کا توڑ کر سکے؟“ میں نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہے..... ہمیں پہلی

فرصت میں کسی بڑے جادوگر کی مدد لیتی ہوگی۔“

سرسوتی ماسی میری بات سن کر تھوڑی دیر تک کچھ سوچتی رہیں۔ میں دھڑکتے دل اور امید بھری نظروں سے ان کا چہرہ دیکھتی رہی۔ دل میں بھگوان سے پرارتنہا کرتی رہی کہ..... کوئی ایسا جاننے والا جادوگر مل جائے جس سے مشکل آسان ہو جائے۔ ایسا ایک ان کا چہرہ دمک اٹھا۔

”یوں تو اس شہر میں پنڈتوں، جادوگروں، پجاریوں اور سادھوؤں کی کوئی کمی نہیں ہے..... لیکن ان میں کون ماہر اور اتنا طاقت ور اور باکمال ہے جو اس جادو کا توڑ کر سکے.....“ سرسوتی ماسی کہنے لگیں۔ ”اس بہروپ میں بہت سارے فراڈی اور ٹھگ موجود ہیں۔ لہذا ان میں سے کسی ایک پر اعتبار کیا جاسکتا۔ یہ اتنے کہنے ہیں کہ ستائی ہوئی عورتوں سے نہ صرف رقم بلکہ ان کی عزت بھی، کمزوری سے فائدہ اٹھا کر لوٹ لیتے ہیں۔“

”تو کیا کوئی..... ایک ایسا نہیں ہے جو مصیبت کو دور کر سکے؟“ میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔

”البتہ میں ایک ایسی عورت کو جانتی ہوں جو بہت ماہر ہے.....“ سرسوتی ماسی نے کہا۔ ”اس پر اعدھا بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔“

”کیا عورتیں بھی ماہر ہوتی ہیں.....؟“ میں نے حیرت اور تجسس سے کہا۔ ”میں نے کبھی سنا نہیں ہے؟“

”ان کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کم ہے۔“ سرسوتی ماسی نے جواب دیا۔ ”دراصل ایک بہت بڑے جادوگر کی بیٹی ہے۔ باپ نے اسے بہت سارے جادو منتقل سکھائے تھے اپنی زندگی میں..... وہ ہر قسم کے جادو کے توڑ کی ماہر ہے۔“

”اچھا..... میں ایک دم سے خوش ہو کر بولی۔“ آپ ابھی اور اسی وقت جا کر اس عورت کو لیتی آئیں..... کام میں دیر نہ کریں۔ میں نہیں چاہتی کہ اس کام میں ایک دن کیا ایک لمحے کی تاخیر ہو..... ایک ایک لمحہ میرے لئے کس قدر عذاب ناک ہے آپ نہیں جانتیں۔“

”وہ عورت یہاں نہیں رہتی ہے۔“ سرسوتی نے جواب دیا۔ ”وہ میسور میں رہتی ہے۔“

”وہ جہاں کہیں بھی کیوں نہ رہتی ہو اسے ہر صورت میں لے کر آؤ۔“ میں نے کہا۔ ”آپ ابھی اسی وقت چلی جائیں۔ اخراجات کی کوئی پروا نہ کریں..... ٹیکسی کر لیں آنے جانے کی..... یا پھر ہوائی جہاز سے چلی جائیں۔ ہوائی جہاز میں لیتی آئیں۔“

”معلوم نہیں وہ یہاں آنا پسند کرے گی بھی نہیں.....؟“ سرسوتی ماسی نے اپنا سر کھجایا۔ ”میں جانے کو تو فوراً ہی چلی جاؤں۔“

”وہ یہاں کیوں اور کس لئے آنا پسند نہیں کرے گی؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔
 ”اس لئے کہ اس کے ہاں اتنے لوگ اس کے پاس آتے ہیں کہ اسے فرصت کم ہی ملتی ہے۔“ وہ بولی۔

”میں اسے سفر کے اخراجات کے لئے اس کے علاوہ اس کی منہ مانگی فیس بھی دوں گی تو پھر وہ کیوں نہیں آئے گی؟“ میں نے تیزی سے کہا۔

”آپ نہیں جانتی ہیں ان کے بڑے خزانے ہوتے ہیں۔ ہر وقت دماغ ساتویں آسمان پر ہوتا ہے۔“ سروسنی ماسی نے کہا۔ ”جب کوئی ان کے پاس جاتا ہے تو منہ کھول دیتی ہیں۔۔۔ معلوم نہیں بنگلور آنے کا سن کر کتنے پیسوں میں راضی ہوں۔“

میں نے ان کی بات سن کر تجوری میں سے بیس ہزار کی رقم نکالی۔ ان کے ہاتھ پر رقم رکھتے ہوئے کہا۔

”یہ کل بیس ہزار روپے ہیں۔۔۔۔۔ اس میں سے دس ہزار کی رقم اپنے بیٹے کو دیں تاکہ اس نے جس سے دس ہزار روپے لئے ہیں۔۔۔۔۔ آپ پیسوں کی فکر نہ کریں، اگر وہ عورت مزید مانگے تو میں دوں گی۔“

سروسنی ماسی اس لڑکی کی تصویریں میرے پاس چھوڑ کر چلی گئیں۔ انہوں نے مجھے سختی سے تاکید کی تھی کہ میں ان تصویروں کو سنبھال کر رکھوں۔ کیوں کہ یہ بڑی مشکل اور بڑی رقم خرچ کرنے پر ملی ہیں۔ شاید وہ عورت ان تصویروں سے کام لے۔۔۔۔۔ میں نے سنا اور دیکھا ہے کہ وہ عمل کرنے کے لئے تصویر یوں سے بھی کام لیتی ہے۔ اس سے کام آسان اور کامیاب ہو جاتا ہے۔“

میں نے ان تصویروں کو الماری میں رکھنے سے قبل نہ چاہتے ہوئے بھی انہیں دیکھنے کے لئے سوچا۔ کیوں کہ میں نے پہلے ان تصویروں کو سرسری اور غصے کی حالت میں دیکھا تھا۔۔۔۔۔ دماغ میں ایک جیجان سا تھا اور میرے دل میں بڑی نفرت اور جلن بھی پیدا ہوئی تھی۔

میں نے ان تصویروں کو لفافے میں سے اس طرح نکالا جیسے یہ زہریلے سانپ ہیں جو مجھے ڈنک مار سکتے ہیں۔ میں نے ان تصویروں کو ایک ایک کر کے بڑے غور اور ناقدانہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

وہ واقعی نہایت ہی حسین و جمیل تھیں اس کا بدن گداز تھا۔ اس کی قامت اور سراپا دلکش تھا جس سے اس کی کشش اور بڑھ گئی تھی۔ اس کی عمر اٹھارہ بیس برس کی ہوگی۔ وہ کچھ ایسی حسین بھی نہیں تھی کہ اس کے آگے میرا حسن ماند پڑ جائے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں تاکہ مردوں کا کیا ہے۔ ان کا دل ہے کہ کسی پر بھی آ جاتا ہے۔ میں نے اس کی چاروں تصویریں دیکھنے کے بعد وہ لفافہ الماری کی دراز میں رکھ دیا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرے سینے میں کوئی خنجر پیوست ہو گیا ہے۔۔۔۔۔ میں نے اپنے پاؤں کے بارے میں سوچنے لگی تو میری نظروں کے سامنے سے ایک ایک کر کے کئی بھروسے اٹھتے گئے۔ معلوم نہیں کیوں میں اس طوفان سے بے خبر تھی جواب پر ہا ہو گیا تھا۔ شاید اس لئے کہ میں اپنی دنیا میں کھو کر رہ گئی تھی۔ ایک خرگوش کی طرح آنکھیں بند کر لی تھیں کہ خطرہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ خود فریبی نے مجھے دھوکا دیا تھا۔

وہ کوئی ایک مہینے سے رات آٹھ نو بجے گھر آنے کے بجائے گیارہ بارہ بجے آنے لگے تھے۔ میں نے کبھی ان کے تاخیر سے آنے کی وجہ دریافت نہیں کی۔ وہ جس وقت آتے ہیں ٹیلی ویژن دیکھ رہی ہوتی۔ وہ رات کا کھانا گھر پر نہیں کھا رہے تھے۔ کپڑے بدل کر بستر سے لیٹتے تھے اس طرح سے گہری نیند سو جاتے تھے جیسے میرا وجود ہی نہ ہو۔ اور پھر چھٹی کا سارا دن بھی باہر گزارنے لگے تھے۔ میں نے جب ان باتوں کو محسوس کیا اور نہ ہی کوئی پروا کی تھی۔ لیکن اب سمجھ میں آ گیا تھا کہ اصل بات کیا تھی۔ وہ اس لڑکی کے زلف کے اسیر ہو گئے تھے۔ دیکھا ہائے تو اس میں میرا اپنا دوش تھا۔ اگر میں اس وقت میں یہ بات محسوس کر لیتی کہ۔۔۔۔۔ وہ کیوں برسوں کی عادت پر عمل نہیں کر رہے تو مجھے آج یہ دن دیکھنا نہیں پڑتا۔

پھر میں نے کمرہ بند کر کے اندر سے چچی لگا کر اپنا آزادی سے اور ہر انداز اور زاویے ناقدانہ نظروں سے دیکھا۔ شادی سے لے کر آج تک مجھ میں کسی بات کا کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میں آج بھی دو بچوں کی باں بننے اور ایک طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی سولہ سترہ برس کی دو شیزہ دکھائی دے رہی تھی۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ آئینہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا میں کتنی ہی ایک آئینہ کے سامنے کھڑی اپنا جائزہ لیتی رہی۔

میں نے ٹیلی فون کر کے رام چندر کو بلایا تاکہ اس سے اس لڑکی کے بارے میں مزید معلومات کر سکوں۔ سروسنی ماسی نے مجھے اس لڑکی کے متعلق جو کچھ بتایا تھا وہ ناکافی تھا۔ اس لئے میرے پوچھنے پر اس لڑکی شکنتلا کا تعارف صاحب سے کس نے کرایا مجھے بالکل بھی نہیں ملا۔ وہ کوئی ڈیڑھ مہینے سے جیولری شاپ پر آ رہی تھی۔ وہ جو دو ایک مرتبہ زیورات پسند کر کے لے گئی۔ وہ ایک لاکھ کی مالیت کے تھے۔ اس کے ٹیلی فون آتے صاحب اس سے بڑی ایک گفتگو کرتے رہتے اور پھر وہ روزانہ سہ پہر چار بجے گاڑی لے کر چلے جاتے تھے۔ ایک روز دکان کے سبز مین نے بتایا کہ وہ شکنتلا کے ساتھ شامیں گزارتے ہیں اس میں ناغہ نہیں ہوتا اس نے ان دونوں کو ایک ساتھ کئی جگہ دیکھا۔

میں نے رام چندر سے دریافت کیا کہ ”اس نے شکنتلا کی تصویریں کس سے اور کس طرح

سے حاصل کیں۔“

رام چندر نے بتایا کہ وہ اس کے دوست کا ایک دوست ہے اس کی بہن کی شہنتلا ہم جماعت ہے۔ رام چندر کے دوست نے اسے بتایا کہ صاحب کو اس کی بہن کی سہیلی شہنتلا نے پوری طرح شہنتلا میں اتار دیا۔ اور شربت میں کچھ گھول کر پلایا ہے شہنتلا کا گھر انہ بہت زیادہ ماڈرن ہے اس کے حسن سے فائدہ اٹھا کر اس کی شادی کسی ایسے شخص سے کرنا چاہتے تھے جو بے حد دولت مند ہو۔ اس طرح سے انہوں نے صاحب کو پھانسا لیا۔ اس دوست نے بتایا کہ ایک منصوبہ کے تحت صاحب کو گھر پر بلایا گیا۔ شہنتلا اکیلی تھی۔ جذباتی مناظری تصویریں کس نے اتاریں تاکہ صاحب کو ٹھٹھی میں کیا جاسکے۔ میں نے اپنے دوست سے پوچھا کہ کیا وہ کسی طرح شہنتلا کی تصویر لا کر دے سکتا ہے۔ اس نے کہا کہ دس ہزار روپے دیئے جائیں تو وہ ایسی تصویریں لا کر دے سکتا ہے جو بڑی زوردار ہوں گی۔ پھر رام چندر نے ایک دوست سے دس ہزار کی رقم قرض لے کر دی تو اس طرح اس نے تصویریں رام چندر کو پہنچا دیں۔ اور اس نے رام چندر کو یہ بھی بتایا کہ اس کے صاحب نے چوری چھپے شہنتلا سے بیاہ کر لیا ہے۔ اور پھر وہ دونوں ہنسی مون منانے سنگاپور چلے گئے ہیں۔ رام چندر نے اپنے دوست کی زبانی یہ بھی سنا کہ ہنسی مون سے واپسی کے بعد وہ شہنتلا کو ایک بنگلے لے کر دینے والے ہیں۔ اور پھر وہ اس کے ساتھ ہی رہیں گے رام چندر نے ایک طرح سے مزید جلتی پرتیل چھڑک دیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ میرے بچے شہنتلا کے ساتھ ہی رہیں گے اور پھر مجھے کبھی کی طرح نکال پھینکیں گے۔ کیوں کہ ایک میان میں دو تلوں نہیں رہ سکتی ہیں۔ لہذا ہر صورت میں مجھے راستے سے ہٹانا ضروری بھی تھا۔

یہ میزے لئے ایک روح فرسا خبر تھی۔ میرا چین و سکون غارت ہو کر رہ گیا۔ میری دہا اندھیر ہو کر رہ گئی مجھے اس گھپ اندھیرے میں کسی سمت روشنی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں خوب سمجھ چکی تھی کہ میرے بچے مجھے طلاق دے دیں گے۔ اس لئے ان کا دل مجھ سے بھر گیا تھا۔ اب انہیں مجھ میں کوئی دلکشی اور کشش دکھائی نہیں دیتی تھی۔ جبکہ میں انہیں ہر طرح سے خوش کرتی اور بے انتہا محبت کرتی اور گرم جوشی سے چاہتی تھی۔

اصل بات یہ تھی کہ شہنتلا سترہ اٹھارہ برس سے بھی کم کی تھی اور میں چھتیس برس کی ہو چکی تھی۔

میں نے بڑی سوچ بچار کے بعد جو فیصلہ کیا اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا..... مجھے ہر قیمت پر اپنی ازدواجی زندگی بچانا تھی اور اسکے لئے بہت دور تک جانے کے لئے تیار تھی۔ میرا

اٹل فیصلہ یہ تھا کہ میں اپنا گھر اور شہنتلا کے گھر سنانے کا سہنا پورا ہونے نہیں دوں گی۔ اسے طرہ میں نہلا دوں گی اسے قتل کرنا میرے لئے چنداں مشکل نہ تھا۔ کیوں کہ ہر وقت پرس میں ایک بھرا ہوا پستول موجود ہوتا تھا شہر میں جرائم کی وارداتیں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں۔ میری ایک شادی شدہ سہیلی کو کچھ بد معاشوں نے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی۔ چون کہ اس کے پاس پستول تھا اس لئے وہ اپنی عزت بچانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس لئے اس روز سے میں نے ایک پستول حفاظت کی غرض سے رکھنا شروع کیا تھا۔

تیسرے دن میں صبح گہری نیند میں ایک ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی کہ..... شہنتلا کو بستر میں بچی کے ساتھ دیکھ کر میں نے پستول کی چھکی چھ گولیاں اس کے جسم میں اتار کر خون میں نہلا دیا۔ یہ دیکھ کر میرے شوہر آپے سے باہر ہو کر مجھے قتل کرنے کے لئے ریوالور نکال لیا ہے..... اس وقت میری ملازمہ کا تانے میرا شانہ ہلا کر بیدار کیا..... اس لمحے خواب میں شوہر کے ہاتھ میں ریوالور کا رخ دیکھ کر اپنی طرف میری چیخ نکل سی گئی تھی۔ میں بیدار ہوئی تو پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ میں بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی سامنے سرسوتی ماسی کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ ان کا چہرہ دمک رہا تھا اور آنکھوں میں خوشی کے ان گنت چراغ جل رہے تھے۔ انہوں نے شاید میری چیخ سن لی تھی اور وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے مجھے ایک گلاس پانی پلایا۔ اس وقت میرا پسینہ بری طرح دھڑک رہا تھا اور سانس بے ترتیب ہو رہی تھیں۔

جب میری حالات قدرے سنبھلی تو انہوں نے مجھے خوش خبری سنائی کہ وہ اپنے ساتھ اس عورت کو ساتھ لانے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔ اس نے پانچ ہزار کی رقم پیشگی لینے کے بعد اس نے مزید دس ہزار کی رقم مانگی ہے..... وہ بتانے لگیں۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ بنگلور پہنچ کر مالکن سے دلوادیں گی اس کا نام شو مارانی ہے اس کی بڑی منت ساجت کرنی پڑی اور میں نے اس کے چہرہ پکڑ کر التجا کی کہ..... ”بنگلوان کے لئے تم میری مالکن کو اس ڈائن سے نجات دلا دو وہ خوش ہو کر نہ صرف تمہاری نہیں بلکہ اس کے علاوہ بہت بڑا انعام بھی دیں گی۔“

یہ سن کر جادو گرئی آئی ہوئی ہے۔ میرا رواں رواں خوشی سے جھوم اٹھا۔ میرے اعصاب جو دو تین دن سے چٹان کی طرح بھاری تھے وہ پھول کی طرح ہلکے ہو گئے۔ سرسوتی ماسی نے اسے برآمدے میں بٹھایا ہوا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ اسے اوپر والے کمرے میں لے جاؤ۔ میں ان کے پیچھے سے پہلے اوپر والے کمرے میں پہنچ گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ سرسوتی ماسی کے ساتھ آئی تو میں نے اسے نمسکار کر کے فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔

لہا سانس اندر لے کر بولی۔

”تمہارے پتی پر کالا جادو کیا گیا ہے..... میں رات کے وقت اپنا عمل کروں گی۔ یہ عمل کسی وجہ سے دن میں نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے بھی کہ الٹا ہو جاتا ہے۔ مجھے رات کے عمل کے لئے کچھ چیزوں کی ضرورت ہے اس کی فہرست بنا کر دیتی ہوں۔ سروسوئی ماسی سے شام تک ملگوا دیں۔

چائے وغیرہ پی کر فارغ ہونے کے بعد جادو کرنی نے ایک فہرست بنا کر میرے ہاتھ میں تھما دی۔

میں نے اس فہرست پر نظریں دوڑائیں..... ایک گڑیا تھی اس کا دوفٹ کا سائز کا ہونا، بے حد ضروری تھا۔ کالج کی چھ گولیاں تھیں..... صندل، ایک خنجر..... مٹی کی ایک ہانڈی..... ایک ذبح کی ہوئی بالکل سفید بلی..... بلی ایسی کہ اس پر تل برابر بھی داغ دھبہ نہ ہو۔ اس کے علاوہ مرجع سالے..... کالج کی چوڑیاں جو ہری ہوں..... الوکا آدھا کلون، الوکا اتنا خون کہاں ملے گا؟ سروسوئی ماسی نے میرے ہاتھ سے فہرست پر ایک نظر ڈالی پھر اس کی طرف دیکھا۔

”اتنا سارا خون کہاں سے لاؤں.....؟“ سروسوئی ماسی نے حیر زدہ لہجے میں کہا۔ ”یہ نامکن ہے..... ہاں لیکن اتنا خون.....“

میں خون کے حصول کے لئے دس ہزار روپے تو کیا بیس تیس ہزار روپے دینے کو تیار تھی۔ وہ مانگتی تو دے دیتی..... میرے پاس رقم کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس وقت تجوری میں لاکھوں کی رقم کے علاوہ ایک بیلس بھی ایک ڈیڑھ لاکھ کا تھا۔ اس کے علاوہ میں ان کی کسی بھی دکان سے جتنی رقم چاہے کسی بھی وقت ایک گھنٹے کے نوٹس پر منگوا سکتی تھی۔

سروسوئی ماسی اس وقت رقم لے کر خون اور دوسری چیزیں لانے کے لئے نکل گئیں تو میں نے ہادوگر کی سے پوچھا۔

”آپ کے عمل سے کیا ہوگا.....؟ کیا میرے پتی اس لڑکی کو چھوڑ دیں گے.....؟ یا انہیں اس یعنی سے سخت نفرت ہو جائے گی.....؟“

”میں اپنے عمل سے اس لڑکی کے دل میں تمہارے پتی کے خلاف ایسی سخت نفرت پیدا اردوں گی کہ وہ تمہارے پتی سے علیحدگی اختیار کر لے گی..... تمہارا پتی تمہارے پاس لوٹ آئے گا..... سخت نادم اور شرمسار ہو جائے گا۔ پھر وہ ساری زندگی تمہارے سیوا کرے گا کسی اور کی شکل میں دیکھے گا۔“

میں اس کی باتیں کر بے انتہا خوش ہوئی مجھ پر ایک عجیب سی سرشاری طاری ہو گئی۔ اس نے یہ

میرے ذہن نے جو اس کا خاکہ بنایا تھا وہ اس کے قطعی برعکس تھا۔ وہ چالیس برس کی عمر کی گول منول اور صحت مند عورت تھی۔ آنکھوں سے خیانت ٹپک رہی تھی۔ چہرے سے شیطانیٹ ٹپک رہی تھی۔ وہ کسی بدروح کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ ایک انجانا سا خوف محسوس ہوا۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی جادوگر کی اور سفلی علوم کی ماہر عورت کو دیکھا تھا۔ میرے دل میں نفرت کی لہر اٹھی۔ دل میں آیا کہ اسے لوٹا دوں۔ پھر خیال آیا کہ اس سے کام لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ کیوں کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے..... جادوگر کا توڑ ایک جادوگر ہی کر سکتا ہے..... وہ جو بھی تھی جیسی بھی تھی اس سے مجھے کیا سروکار تھا۔ مجھے تو صرف اس بات سے غرض تھی کہ شگنتلا کے ماموں نے میرے شوہر پر جادو کیا ہے اس کا توڑ کر کے میرا شوہر مجھے واپس دلادے۔

مجھے بھی ناشتا کرنا تھا اور انہیں بھی کرانا تھا۔ میں نے اوپر والے کمرے کی طرف جانے ہوئے کانا سے کہہ دیا تھا کہ زوردار ناشتہ اوپر والے ڈائننگ ہال میں لیتی آتا۔ پھر کھانا ناشتے کی میز پر چن دیا گیا۔ میز پر میں نے ان دونوں کو بٹھایا وہ اور سروسوئی ماسی ناشتے پر اس طرح ٹوٹ پڑیں جیسے کئی دنوں کی بھوکی ہوں۔ وہ دونوں چوں کہ ریل گاڑی سے سفر کر کے آئی تھیں شاید اس لئے بھوکی تھیں۔

اس جادوگر کی نے شگنتلا کی چاروں تصویروں کو باری باری بڑے غور سے دیکھا۔ پھر اس نے ان میں سے ایک تصویر الگ کر لی جس میں شگنتلا نے پیچھا کی کا مختصر لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ لباس کیا تھا دھجیاں تھیں۔ اس نے شگنتلا کی اس تصویر کو سامنے رکھ کر کچھ پڑھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر تک آنکھیں بند کر کے بڑبڑاتی رہی۔ اس کا ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑا۔ وہ شاید کوئی منتر پڑھ رہی تھی پھر اس نے توقف کر کے تصویر پر بڑے زور کی پھونک ماری..... یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کاغذ پر شگنتلا کی صورت اور سراپا آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ جادوگر کی کے ہاتھ میں ایک کورا کاغذ رہ گیا۔

اس نے مجھے وہ کورا کاغذ دکھایا..... پھر اس کے بعد اس نے کوئی منتر پڑھ کر پھونکا تو شگنتلا کی تصویر ابھر آئی۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ آپ مجھے اپنے پتی کی کوئی تصویر دکھائیں۔ میں نے اسے ایک تصویر لا کر دی..... اس نے میرے پتی کی تصویر لے کر اس پر کوئی منتر پڑھ کر پھونکا پھر اس نے اپنی آنکھیں اس طرح بند کر لیں جیسے چشم تصویر میں کچھ دیکھ رہی ہو۔

اس کے چہرے کے تاثرات کئی رنگ بدلتے رہے۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر ایک

باتیں بڑے اعتماد سے اور مضبوط لہجے میں کہی تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ بہت بچی ہوئی جادوگرنی ہے۔

میں اور میری ملازمائیں اس کی خاطر مدارت میں لگی رہیں۔ اس کی تواضع بہت ضروری تھی۔ وہ مرغ پلاؤ..... اصلی گھی میں تلے ہوئے پراٹھے اور پوریاں..... پستہ بادام کا حلوہ..... ملائی، دودھ اور رس گلوں سے اپنا پیٹ بھرتی رہی..... اس نے جس چیز کے کھانے کی بھی فرمائش کی میں نے فوراً ہی پوری کر دی۔ اس نے کھانے پینے میں کوئی تکلف نہیں کیا تھا۔ بال مفت کی طرح کھاتی رہی۔ ڈکارتک نہیں لی۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی پیڑھوورت نہیں دیکھی تھی۔ میری ملازمائیں بھی حیران تھیں۔

اس نے سہ پہر کے وقت ریٹورنٹ سے نہ صرف چکن بروسٹ اور زنگ لارج برگر بلکہ آئس کریم بھی منگوائی۔ اس کی کوئی بھی فرمائش رد نہیں کی جاسکتی تھی۔ رات کا کھانا اس نے بنگلور کے سب سے مہنگے ترین ہوٹل اشوکا سے منگوا لیا۔

☆.....☆.....☆

سرسوتی ماسی رات دس بجے مطلوبہ سامان لے کر پہنچیں۔ رات اس کمرے میں جس میں جادوگرنی کو ٹھہرایا گیا تھا اس نے اپنے عمل کا آغاز رات دس بجے شروع کیا۔

جادوگرنی نے گڑیا کو دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا اور پھر ایک سنی میں ذبح کی ہوئی سفید بلی رکھ کر اس کے ارد گرد مریج مسالے رکھ دیئے گئے۔

سبز چوڑیاں فرش پر رکھ دیں..... جادوگرنی خون کی بوتل اپنے پاس رکھ لی۔ پھر اس نے منتر پڑھنا شروع کیا۔

اس کمرے میں ہم تینوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ جادوگرنی نے کہا تھا کہ کوئی چوتھا شخص نہیں ہوگا۔

ملازموں کو سختی سے تاکید کر دی گئی تھی کہ وہ اس وقت تک ادھر نہ آئیں جب تک انہیں آواز دے کر بلا یا نہ جائے۔ دروازے اور کھڑکیاں مضبوطی سے بند کر دی گئی تھیں۔ پردے بھی ٹھیک کر دیئے تاکہ باہر سے کوئی جھانک نہ کر سکے۔

جادوگرنی منتر تیز آواز سے پڑھ رہی تھی..... کوئی دس منٹ تک منتر پڑھنے کے بعد اس نے پہلے گڑیا پر پھونک ماری..... پھر فرش پر اور گڑیا کے قدموں کے پاس رکھی ہوئی چوڑیوں پر..... جادوگرنی کے چہرے پر ہلاکی سمیٹ گئی چھائی ہوئی تھی۔

میں نے ایک حیرت انگیز اور ناقابل یقین منظر دیکھا۔ اگر کوئی مجھ سے اس کا ذکر کرتا تو میں اس کا یقین نہیں کرتی۔

جو منظر دیکھا وہ یہ تھا کہ گڑیا جو بہت خوب صورت اور پیاری سی تھی اس کی شکل تیزی سے تبدیل ہونے لگی۔

چند لمحوں کے بعد ایسا لگا کہ شگفتا نظروں کے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے وہ ہوہو شگفتا تھی..... وہ ہوہو شگفتا تھی..... وہی قامت..... وہی سراپا..... وہی غدوخال..... ذرہ برابر بھی رنگ و روپ میں فرق نہ تھا۔ وہ بے جان سی تھی..... لیکن رفتہ رفتہ اس میں جان بھی پڑتی گی۔ پھر چند لمحوں کے بعد اس کے اس ہاتھ نے حرکت شروع کی جس میں خنجر تھا۔ بہت ہی خوفناک خنجر..... جسے دیکھ کر جسم میں جھرمری سی آ جاتی تھی..... وہ ہاتھ کبھی فضا میں بلند ہو جاتا اور بھی بیٹھے آ جاتا..... پھر اس گڑیا نے رقص کا سامعہ آغاز اختیار کر لیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ مڑکتے، بل کھاتے اور لپکتے لگی جیسے ڈانس طور پر لڑکیاں اپنے ساتھی مردوں کے ساتھ ناچتی ہیں۔ گڑیا کا رقص بڑا بھجان خیز تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی بھرپور نوجوان اور پر شاب بدن کی سچ سچ عورت ناچ رہی ہو..... اس گڑیا کے والہانہ رقص کو دیکھ کر لگتا تھا کہ یہ کوئی چابی والی جاپانی گڑیا ہو۔ اسے چابی دے کر چھوڑ دیا گیا ہو پھر وہ سبز چوڑیاں بھی تیزی سے حرکت میں آ گئیں۔ وہ بھی اس گڑیا کے گرد ناچنے لگیں۔

چند لمحوں کے بعد جادوگرنی نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں رکنے کا حکم دیا تو..... گڑیا اور چوڑیوں کا رقص اشارے کے ساتھ ہی بند ہو گیا گڑیا اپنی جگہ ساکت ہو گئی۔ پھر چوڑیاں بے ترتیبی کی حالت میں فرش پر بکھری پڑی ہوئی تھیں۔

”شگفتا.....!“ جادوگرنی نے تحسانہ لہجے میں گڑیا سے پوچھا۔ ”سچ بتاؤ..... تم شگفتا ہی ہونا؟“

”ہاں..... ہاں..... میں شگفتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے جھوٹ بولنے اور چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟“

”اچھا..... ٹھیک بتاؤ کہ تم اس وقت کہاں ہو اور کیا کر رہی ہو.....؟“ جادوگرنی نے مبالغہ لہجے میں دریافت کیا۔

”میں تم سے ڈرتی تھوڑی ہوں جو تمہیں ٹھیک ٹھیک نہیں بتاؤں گی؟“ اس نے تڑ سے جواب دیا۔

”اس وقت میں اپنے پتی کے بازوؤں میں سمائی ہوئی ہوں اور ان سے پریم کی باتیں کرتی ہوئی اہلاکی سیر و سیاحت کا پروگرام بنا رہی ہوں۔“

”تم دونوں کس شہر میں ہو یہ نہیں بتایا.....؟“ جادوگرنی نے کہا۔ ”یہاں کب تک رہو گی.....؟“

”ہم دونوں ہانگ کا نگ کے ایک ہوٹل میں مقیم ہیں اور کل سوئٹز لینڈ کی طرف چلے جائیں گے۔“ اس نے جواب دیا۔

”سنو..... بد ذات عورت.....! تم نے کرشنا سے بیاہ کر کے اچھا نہیں کیا..... یہ جانتے ہوئے بھی تم نے اسے اپنے جال میں پھانس لیا کہ وہ شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے۔“ جادوگرنی نے غصے سے کہا۔ ”تم کرشنا صاحب کو چھوڑ دو.....“

”تم کون ہوتی ہو مجھے حکم دینے والی.....؟“ گڑیا کسی زہریلی ناگن کی طرح پھنکاری۔ ”ہم دونوں ایک دوسرے کو بے انتہا پسند کرتے ہیں..... ہم دونوں میں کتنی محبت ہے تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو.....؟ وہ اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑنے والے ہیں۔“

”کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ تو نے ان سے دولت کی خاطر شادی کی ہے.....؟ مکار، ذلیل..... کینسی.....“ جادوگرنی گرجی۔

”ہاں..... ہاں.....“ گڑیا نے سر ہلایا۔ ”دولت کی خاطر ہی شادی کی ہے میں رفت رفتہ اس کی ساری املاک، کاروبار اور دولت پر قابض ہو کر اسے دودھ میں گری کہی کی طرح نکال بھیجوں گی..... تو نہیں جانتی..... وہ میری جوانی..... اور میری محبت اور قرب کا کیسا بھوکا ہے..... میں نے اسے اپنی مٹھی میں کر کے رکھا ہوا ہے۔“

”ٹھہر میں تجھے مزا چکھاتی ہوں۔“ جادوگرنی کا چہرہ سرخ اور آواز کڑھکٹ ہو گئی۔ ”ٹھہر میں تجھے مزا چکھاتی ہوں۔“

گڑیا نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی دمک ابھرائی ہے اور آنکھوں میں مستی اور خود پسندی بھر گئی ہے..... جیسے وہ میرے پتی کو خوش کر رہی ہے۔ اس پر ایک نشر اور سرشاری سی چھا رہی ہے..... پھر جادوگرنی نے کچھ پڑھا اور گڑیا پر پھوٹک دیا۔ پھر اسے غضب ناک نظروں سے گھورنے لگی۔

چند لمحوں کے بعد گڑیا دوبارہ اپنی حالت میں آ گئی..... پھر جادوگرنی نے خون کی بوتل اٹھائی اور گڑیا کے قدموں میں رکھ دی۔ پھر آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگی پھر اس کا جسم تھر تھرا کرنے لگا۔ چہرے پر بدن کا سارا خون سمٹ آیا۔ پھر وہ اور بد صورت اور خوف ناک شکل کی دکھائی دینے لگی۔ کسی چیز کی مانند لگ رہی تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی عورت کا اتنا خوفناک چہرہ نہیں دیکھا۔ چند لمحوں کے بعد اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں تو اس کے چہرے کا خوفناک پن فٹ ہو گیا۔ پھر وہ دیر تک گڑیا کو خشکیوں نظروں سے گھورتی رہی۔

”شکنتلا نے تمہارے پتی پر کالا جادو کر لیا ہے۔“ جادوگرنی نے گڑیا پر سے نگاہیں ہٹا کر میری

طرف دیکھا۔ ”دنیا میں بہت سارے مختلف قسم کے جادو ہیں ان کا توڑ بہت آسان ہے۔ یوں تو کالا جادو کا بھی توڑ ہے لیکن وہ بے حد ہی مشکل ہے..... یہ وہ کالا جادو ہے جو کالی ماتا جادو گروں کو دیتی ہے..... یہ جادو بیس برس کے دن رات تپا کے بعد کہیں جا کر ملتا ہے..... جو کوئی بھی اس کالا جادو کو پالیتا ہے وہ بہت طاقت ور ہو جاتا ہے۔ گھبراؤ نہیں..... فکر مند اور پریشان نہ ہو۔“ اس نے مجھے دلا سہ دیا۔

”اب ہوگا کیا.....؟“ سرسوتی ماسی نے اس سے تشویش ناک لہجے میں پوچھا۔ ”کیا اس جادو کا کوئی توڑ نہیں ہے.....؟ کیا ہم مایوس ہو جائیں.....؟“ ان کے چہرے پر کرب سا چھا گیا۔ ”اگر اس کا توڑ نہیں ہے تو مالکن برہاد ہو جائیں گی۔“

”نہیں..... نہیں..... مایوس ہونے کی ضرورت نہیں..... میں نے ابھی کہا تاکہ فکر مند اور پریشان نہ ہوں۔“ جادوگرنی پر امید لہجے میں کہا۔ پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ”مجھے پھر اپنے ہر دل کو بلانا ہوگا..... میں آج دونوں کی موجودگی میں یہ عمل جاری نہیں رکھ سکتی لہذا آپ نیچے جائیں اور سو جائیں۔ ٹھیک صبح سات بجے اوپر آئیں۔“

میں اور سرسوتی ماسی نیچے آئیں۔ وہ بڑی دیر تک اس جادوگرنی عورت کی تعریف میں زمین آسمان ایک کرتی رہی کہ ایسی پائے کی جادوگرنی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گی..... وہ نہ صرف بہت ماہر ہے بلکہ بہت پختہ ہوئی ہے۔ آپ کل نہ صرف ہندوستان بلکہ بنگال اور مصر میں جادوگر نیاں کیا جادوگر بھی نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔ اصل جادوگر اور جادوگر نیاں آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔

وہ اپنی رو میں کبھی جاری تھیں ادھر میں گہری سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی انہوں نے مجھے فکر اور پریشان پا کر دلا سہ دیا کہ ایٹھ سو برس بھر سہ رکھو۔ اس نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تم جا کر آرام کرو بے فکر ہو کر سو جاؤ۔ بھگوان نے چاہا تو بہت بڑی خوش خبری صبح سننے کو ملے گی۔ ان کی باتوں سے میرے دل کو بڑی ڈھارس ہوئی اور میں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہو گئی۔

صبح ٹھیک سات بجے میں اور سرسوتی اور گئیں۔ سرسوتی ماسی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا جادوگرنی کی آنکھوں میں نیند کا خمیر ابھرا ہوا تھا۔ وہ بار بار بند ہوئی ہار رہی تھیں۔ آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں گڑیا فرش پر چٹ پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سینے میں دل کی جگہ پر خنجر پیوست تھا۔ اس کے قریب وہ بوتل ٹوٹی پڑی تھی جس میں الو کا خون تھا۔ وہ خون گڑیا کے ارد گرد پھیلا ہوا تھا اور خشک ہو گیا تھا ساری چوڑیاں ٹوٹی پڑی تھیں۔

جادوگرانی نے سرسوتی ماسی کے پوچھنے پر بتایا کہ ”میں ساری رات عمل کرتی رہی ہوں۔

اور کسی حد تک شکستلار کو نقصان پہنچانے میں کامیاب ہو گئی ہوں..... شکستلار نے جس جادوگر کے کالے جادو کی مدد سے کرشنا کو اسیر بنایا ہے وہ کوئی معمولی آدمی معلوم نہیں ہے۔ اس کا لے جادو کا زور توڑنا اور اثر زائل کرنا اتنا آسان نہیں ہے مجھے پھر ایک رات اور عمل کرنا ہوگا مگر اس کے لئے کچھ اور چیزوں کی سخت ضرورت پڑے گی۔ یہ چیزیں بہت ہی جہنگلی ہیں اور شاید ہی یہاں دستیاب ہوں۔ البتہ شہر میں سستی مل جائیں گی۔ ان چیزوں کی خریداری کے لئے مجھے بیس ہزار کی رقم دے دیں..... اور سروسوئی ماسی تم بھی ساتھ چلو۔ ہم تین دن بعد واپس آئیں گی۔“

سروسوئی ماسی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے رقم دینے کے لئے اشارہ کیا۔ پھر زبان سے سفر خرچ کے لئے بھی کہا۔ میں نے کل پچیس ہزار کی رقم جادوگر کی کوڈے دی رقم دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ یہ میری مجبوری اور گھراڑنے سے بچانے کا موقع تھا۔

میں ان کے جانے کے بعد ماہی بے آب کی طرح انتظار میں رہتی رہی تھی۔ یہ دو دن جس کرب اور اذیت سے گزرے میرا دل ہی جانتا ہے دوسرے اور اندیشے پھنکارتے ہوئے زہریلے ناگوں کی طرح ڈستے رہے..... کہیں جادوگر کی رقم تو نہیں لے آئی؟ اس نے شاید سروسوئی ماسی کو چمکے دے دیا ہو۔ وہ شکل سے ہی ایک شاطر عورت دکھائی دیتی تھی۔ اس کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ دوسری طرف دل کو یہ اطمینان تھا کہ سروسوئی ماسی اسے بہت قریب اور برسوں سے جانتی ہیں۔ تیسرے دن وہ دونوں واپس آئیں تو میری جان میں جان آئی۔

سروسوئی ماسی نے ایک تھیلا اٹھا رکھا تھا جس کا منہ مضبوط ڈوری سے بندھا ہوا تھا..... سروسوئی ماسی نے وہ تھیلا لے جا کر اوپر والے کمرے میں رکھ دیا۔ میں نے ان چیزوں کے بارے میں جادوگر کی سے استفسار کیا تو وہ رکھائی سے بولی کہ..... ”میں ابھی ان چیزوں کے بارے میں کچھ بتا نہیں سکتی..... آخر ایسا بھی کیا جلدی بے تاب ہے؟ میں رات جس وقت عمل شروع کروں گی اس وقت تم انہیں دیکھ لینا۔ ان چیزوں کے حصول کے لئے کس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا میں بتا نہیں سکتی اور نہ تم سوچ سکتی ہو۔ یہ جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔“

میں سوچتی رہی کہ آخر یہ ایسی کیا چیزیں ہیں جس کے حصول کے لئے انہیں پاؤں بیلنا پڑے۔ اسی وقت شاردا ایک ٹرے میں دونوں کے لیے چائے اور پکڑے لے کر کمرے میں داخل ہوئی ٹرے رکھی پھر وہ چلی گئی۔ اسے کچھ کام تھا۔ تب پدمنی نے چندرا دیوی کی طرف دیکھا۔ اس نے محسوس کیا کہ چندرا دیوی اس کی کہانی بڑے غور سے سن رہی ہے۔ اس کے چہرے پر نہ تو کسی قسم کی بے زاری اور اکتاہٹ ہے اور نہ ہی وہ بور ہو رہی ہے پھر بھی پدمنی نے پوچھا۔

”کہیں آپ میری کہانی سن کر بور اور بیزار تو نہیں ہو رہی ہیں.....؟ اگر ایسی بات ہو تو.....“

”ارے نہیں!“ چندرا دیوی نے درمیان میں کہا اور اس کا گال تھپ تھپایا، میں بڑی غور اور توجہ سے سن رہی ہوں۔ کہانی نہ صرف بے حد پراسرار اور سنسنی خیز اور ایک طرح سے خوفناک بھی ہے۔ جس نے آپ کی زندگی اجیرن بنا رکھی ہے۔“

”نہ صرف اجیرن بلکہ اذیت ناک اور روح فرسا۔“ پدمنی نے دکی لہجے میں کہا۔ ”جب شاردا لے آپ کے بارے میں بتایا تو میں بڑی آشا لے کر آئی ہوں کہ آپ میری نجات دہندہ بنیں گی۔ اور ہنگوان! میں بھی کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔“ چندرا دیوی نے اسے دلاسا دیا۔ ”میں ہر آشا پوری کروں گی اور اس مصیبت سے نجات دلاؤں گی۔ مگر اگر م پکڑے اور گرم گرم چائے بھی ہے۔ آپ خوش کرتی ہائیں۔ اپنی رام کہانی بھی ساتھ سناتی جائیں۔“

پدمنی نے دو ایک پکڑے کھائے اور پھر کہنا شروع کیا۔

”وہ دونوں سارا دن مختلف قسم کے پر تکلف کھانوں کی فرمائش کر کے بغیر ڈکار لئے کھاتی اور بے مزے اور آرام سے سوتی رہتی تھیں۔ کچھ کھانے ہوٹل سے بھی منگوانے پڑے تھے۔ کسی نہ کسی طرح دن کٹتا..... رات بارہ بجے جادوگر کی اپنے جادو کا مظاہرہ کرنے کے لئے خم ٹھونک کر میدان میں آ گئی۔ آج بھی دروازہ اور کھڑکیاں بند کر دی گئی تھیں اور ملازماؤں کو اوپر آنے سے سخت ممانعت کر دی گئی تھی یہ سارا اندازہ اور حرکات بڑی پراسراری تھیں۔

جادوگر کی نے تھیلا کھول کر ایک چیز باہر نکالی۔ وہ ایک کپڑے کی گڑیا تھی..... کچھ سویاں تھیں جو ہتھل کی بنی ہوئی تھیں۔ ایک انسانی کھوپڑی بھی تھی۔ ایک بڑی بوتل تھی جو نیلے رنگ کی تھی۔ ایک مہوئی سی مٹکی بھی تھی جس میں مختلف قسم کی جڑی بوٹیاں اور سفوف تھے۔ ایک بوتل میں مٹی کا تیل تھا۔ ایک عدد بڑی ماچس بھی تھی۔

جادوگر کی نے اپنا عمل شروع کرنے سے پہلے سویاں ایک ایک کر کے کپڑے کی گڑیا کے جسم کے مختلف حصوں میں چھو دیں۔ پھر اس نے نیلے رنگ کی بوتل کا کارک کھول کر بوتل کو گڑیا کے پاس رکھا اور اس میں اس نے مٹی کا تیل ڈال دیا۔ پھر آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھنے لگی۔ اس کے چہرے کا رنگ خنجر ہونا شروع ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس کے چہرے پر ایک جلال سا آ گیا۔ اس نے باری باری گڑیا، نیلے رنگ کی بوتل اور مٹکی پر کوئی منتر پڑھ کر پھونکا۔ پھر اس نے ماچس اٹھا کر اس میں سے ایک دیاسلائی نکالی اور اسے جلا کر مٹکی میں ڈال دیا ایک دم بھک سے اس میں سے شعلہ جوا ایک لمحے لہر لہا۔ پھر بجھ گیا۔

چند لمحوں کے بعد مٹکی میں سے دھواں اٹھنے لگا۔ وہ دھواں کمرے میں پھیلنے کے بجائے نیلے

رنگ کی بوتل میں بھر گیا تو اس نے فوراً ہی بوتل کا منہ بند کر دیا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر فاقہ خانہ چمک ابھر آئی جیسے اس نے کوئی زبردست کامیابی حاصل کر لی ہو۔

اس نے میری طرف مسرت بھری نظروں سے دیکھا اور بولی۔

”آخر میں نے اس بد آتما کو اس بوتل میں بند کر دیا ہے۔ جس نے تمہارے پتی پر قبضہ کر رکھا تھا۔ شکنتلا اس کے زیر اثر تھی۔“

اس کی بات سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ سرسوتی ماسی کا چہرہ بھی دمک اٹھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

”کیا اب میرے پتی اس ڈائن کو چھوڑ کر سدا کے لئے میرے پاس آ جائیں گے؟“

”نہیں.....“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”وہ یکدم سے سنجیدہ ہو گئی۔“

”کیوں آخر.....؟“ مجھے اس کی متضاد بات پر نہ صرف حیرت ہوئی بلکہ غصہ بھی آیا۔

”اس لئے کہ تمہارے پتی پر شکنتلا کے حسن کا جو جادو چڑھ چکا وہ کالے جادو سے کسی طرح کم نہیں ہے۔“

”لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ میں نے اس بد آتما کو اس بوتل میں بند کر دیا ہے۔ جس نے تمہارے پتی پر قبضہ کر رکھا تھا..... شکنتلا اس کے زیر اثر تھی..... لیکن اب آپ کچھ اور کہہ رہی تھی۔“

میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔

”سنو..... اس سفلی علم کی بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں جو جلد سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔“ وہ بولی۔ ”ذرا میرے کام لو۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اس جادو کے اثر کو کم کرنے کے لئے مجھے اپنا عمل جاری رکھنا ہوگا۔“

ابھی ہمارے درمیان باتیں ہو رہی تھیں کہ اس بے جان گڑیا میں زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے..... دیکھتے ہی دیکھتے اس کے بدن میں چبھی ہوئی ساری سوسائیاں ایک ایک کر کے خود بخود کل گئیں۔ گڑیا کے ہاتھ سے بوتل چھوٹ کر فرش پر گر گئی۔ اس کی کیر چیاں ہر طرف بکھر گئیں۔ اس میں جو دھواں تھا وہ چاروں طرف پھیل کر تحلیل ہو گیا۔

یہ دیکھ کر جادوگر نے کاچہرہ فٹ ہو گیا۔ چند لمحوں تک اپنی جگہ ساکت و جامد ہو گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی آتما اس کے شریر سے نکل گئی ہو۔ اس پر کسی لاش کا سا دھوکا ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے جیسے خود پر قابو پالیا۔

”اس بد آتما اور دشمن کا جادو اتنا زوردار ہے کہ اس پر قابو پانا میرے بس کی بات نہیں ہے۔“

جادوگر نے کے لہجے سے خوف سا جھلک رہا تھا۔ ”یہ میری حد اور طاقت سے باہر ہے..... شاید اس

جادوگر کا تعلق سامری خاندان سے ہے..... سامری خاندان سے مقابلہ کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ لہذا اب تم مجھے اجازت دو اور تم اب کسی اور جادوگر کا بندوبست کرو..... اور اگر تم نے کسی اور

جادوگر کا بندوبست نہیں کیا تمہیں بہت زیادہ دکھ، تکلیف اور اذیت اٹھانی پڑے گی۔ یہ بد آتما تم سے بدلہ لے گی..... شاید تمہیں علم نہیں کہ کسی بھی بد آتما کا بدلہ لینا بڑا بھیا نک ہوتا ہے۔“

اس کی بات سن کر نہ صرف میرے ہوش اڑ گئے بلکہ پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ بد آتما کے دلہ لینے کا سن کر میں غش کھاتے کھاتے رہ گئی۔ میری نس نس میں لہو برف کی طرح بج ہو گیا۔ میں نے بہ وقت تمام خود کو سنبھالا۔ میں اور سرسوتی اس کے آگے ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑانے لگیں۔ سرسوتی ماسی معذرت ساجت کرتی ہوئی اس کے چہروں میں گر گئی اور بولی۔

”تم کچھ نہ کچھ کرو..... اس مصیبت میں نہ ڈالو..... منجھدار میں نہ چھوڑو..... کسی بھی طرح مہری بھانجی، اس کی زندگی، اس کے گھر اور بچوں کو تباہ و برباد مت ہونے دو۔ میں تمہارے پیروں پر ہوں۔“

وہ کچھ دیر خاموش رہی..... سوچتی رہی..... آخر اس پر سرسوتی ماسی اور میری التجا کا اثر ہو گیا جو میں نے بعد میں کی تھی۔ میں اور سرسوتی ماسی اس کی طرف دھڑکتے دل سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ ہاتھ لہجے میں بولی۔

”شانختی نگر سے دس میل دور جو ہندو پور ہے اس میں ایک بوڑھی جادوگر رہتی ہے۔ اس کا نام امرتی ہے۔ اس کا باپ بھی اپنے زمانے میں میسور صوبے کا بہت بڑا جادوگر تھا۔ اگر اسے کسی طرح راضی کر لو تو بات بن جائے گی۔“

جادوگر نے مجھ سے پانچ سو روپے لئے اور کچھ دیر بعد اپنا بوریا بستر سمیٹ کر دیوڑ چلی گئی۔ میں نے سرسوتی ماسی سے کہا کہ وہ فوراً ہی اپنے بیٹے رام چندر کو لے کر شانختی نگر چلی جائے۔ شانختی نگر

ایک بڑا ساقبہ ہے۔ وہ اپنے ساتھ ہر قیمت پر امرتی کو لے کر آئے۔ میں نے دکان پر فون کر کے رام چندر کو چھٹی دلائی۔ جب رام چندر آیا تو میں نے اس سے کہا کہ ایک ٹیکسی لے کر آئے۔ کیوں کہ اسے اپنی ماں کے ساتھ شانختی نگر سے دس میل دور واپس اس ٹیکسی سے آنا ہے۔

تھوڑی دیر رام چندر پندرہ سو کرایہ طے کر کے ٹیکسی لے آیا۔ میں نے کرایہ کے علاوہ پانچ ہزار لیٹم سرسوتی ماسی کے ہاتھ پر رکھ دی تاکہ وہ جادوگر کو رام کر کے لے آئے۔ کیوں کہ پیسوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

ماں بیٹے ٹیکسی میں چلے گئے۔ سارا دن کا سننا میرے لئے دو بھر ہو گیا تھا۔ دن تھا کہ گزرنے

۱۱م نہیں لے رہا تھا۔ میں ایسی اذیت ناک کرب سے کبھی نہیں گزری تھی۔ ایک ایک لمحہ صدی کی

طرح بھاری ہو گیا تھا اور کسی زہریلے سانپ کی طرح ڈسنے لگا تھا۔
وہ رات آٹھ بجے آئے ان کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ میرا سینہ دھک سے رہ گیا۔ میں نے
لرزیدہ آواز میں پوچھا۔

”کیا ہوا؟“ خالی ہاتھ کیوں آئے ہو؟“ امرتی جادوگرنی کو ساتھ لے کر کیوں نہیں
آئے؟“

”وہ بڑھیا بڑی تیر اور لالچی قسم کی عورت ہے۔“ سروسوتی نے جواب دیا۔ ”ایک تو وہ سیدھے
منہ بات نہیں کر رہی تھی۔ وہ بڑی مشکلوں سے اس شرط پر تیار ہوئی تھی کہ تیس ہزار کی رقم دی جائے۔
اس میں ایک روپیہ بھی کم نہیں لوں گی۔۔۔۔۔ وہ کالے جادو کا توڑ کرنے بد آتما سے ہمیشہ کے لئے
چھٹکارا دلادے گی۔۔۔۔۔ تیس ہزار کی رقم بہت بڑی ہوتی ہے۔ اس لئے ہم واپس آ گئے۔ وہ بڑی لیرری
اور کمینی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹنا چاہتی ہے۔ پتا نہیں کیا کتنی جانتی ہے۔ آپ کو۔۔۔۔۔“
”سروسوتی ماسی۔۔۔۔۔!“ میں نے تنک کر کہا۔ ”یہ وقت روپے پیسے کی فصل دیکھنے کا نہیں ہے۔
آپ اسے لے آئیں۔ خواہ مخواہ ایک دن غارت ہو گیا۔“

میں نے دوسری صبح مزید پچیس ہزار کی رقم امرتی جادوگرنی کے لئے دی۔۔۔۔۔ اور ٹیکسی کرایہ
پندرہ سو روپے۔۔۔۔۔ وہ صبح آٹھ بجے رام چندر کے ساتھ شانتی مگر روانہ ہو گئیں۔ میں نے ہدایت کی تھی
کہ وہ دن ڈوبنے سے پہلے اسے ساتھ لے کر آ جائیں لیکن وہ سات بجے ہی پہنچ گئیں۔ میرے سچے
میں جو وحشت بھری تھی وہ کم ہو گئی۔

میں نے اس کو تنقیدی نظروں سے دیکھا۔۔۔۔۔ امرتی جادوگرنی واقعی بڑی خزانہ اور تیز قسم کی
بڑھیا تھی۔ اسے شیطان کی خالہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس کے مزاج میں چڑچڑاہٹ اور حد سے زیادہ
تھا۔ چہرے سے عیاری اور مکاری چلتی تھی اور اس کی آنکھوں سے ایک پیشہ ور قاتل کی سفاکی جھلک
رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بدن پر ایک جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی عورت نہیں دیکھی
تھی۔ وہ مجھے جانے کیوں چڑیل سی محسوس ہوئی۔

اس کا لباس بے حد میلا کچھلا اور بوسیدہ سا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ایک برس سے نہ نہائی ہو
اور نہ ہی لباس بدلا ہو۔ اس کے کپڑوں سے بدبو کے جھکے اٹھ رہے تھے۔ اس کے گلے میں مختلف قسم
کی اور رنگ کی مالائیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ سونے کا ایک لاکٹ بھی پڑا ہوا تھا جس پر
انسانی کھوپڑی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ اس کی وضع قطع عجیب و غریب بلکہ مہلکہ خیز لگ رہی تھی۔

اس نے آتے ہی حکم صادر فرمایا کہ وہ چوں کہ لمبا سفر کر کے آ رہی ہے اسے سخت بھوک لگ
رہی ہے۔ اس کے لئے مرغ پلاؤ کا اہتمام کیا جائے۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ دو عدد سالم مرغ اصل لگ

میں تلے ہوئے۔ دسی مرغ ہوں۔۔۔۔۔ پولٹری فارم کے نہ ہوں۔۔۔۔۔ اور بیٹھے میں رس ملائی اور گلاب
جامن کھائے گی۔ پلاؤ کے ساتھ رائیہ بھی رکھا جائے۔

کھانے کی فرمائش کرنے کے بعد اس نے کہا کہ وہ نہانا چاہتی ہے۔
وہ نہانے کے لئے غسل خانے میں گھسی تو اس نے باہر نکلنے کا نام ہی نہیں لیا۔ وہ کوئی ڈیڑھ
گھنٹے بعد سروسوتی ماسی کے آواز دینے پر نکلی۔ نہانے اور نیا جوڑا پہننے کے بعد اب وہ انسان لگ رہی
تھی۔ نہانے سے قبل وہ فقیرنی سے بھی بدتر دکھائی دی تھی۔ اس کے چہرے پر رونق آ گئی تھی۔ نئے
لباس میں وہ بہت اچھی دکھائی دی۔ سنگھار میز کے بڑے آئینے کے سامنے وہ کوئی آدھا گھنٹہ کھڑی
ہالوں میں نگہمی کرتی اور اپنے آپ کو ناقدانہ نظروں سے دیکھتی رہی تھی۔ اس نے میک اپ تو نہیں
کیا لیکن اس نے تین بوتل پرفیوم اسپرے کر لیا۔ کھانے کی میز پر آتی ہی اس طرح ٹوٹ پڑی
جیسے کئی دنوں کی بھوکی ہو۔ اس نے نہ صرف دونوں سالم مرغ دیکھتے ہی دیکھتے ہضم کر لئے بلکہ چھ
عدد ابلے ہوئے اٹھارے اور ایک تاب پلاؤ بھی چٹ کر گئی۔ ایک درجن رس ملائیاں حلق سے
اتار لیں۔۔۔۔۔ وہ کوئی چار پانچ آدمیوں کا کھانا اکیلی ہڑپ کر گئی۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسا بیڑ
نہیں دیکھا۔

کھانے کی میز سے اٹھ کر ہم تینوں اوپر والے کمرے میں آ گئے جس میں میں نے جادوگرنی
کو ٹھہرایا ہوا تھا۔ وہ سروسوتی ماسی سے بولی۔

”میں بغیر سامان کے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ تم وہ سامان جو میں مانگتی ہوں ایک گھنٹے کے اندر
اندر لے آؤ۔۔۔۔۔ اگر کسی وجہ سے نہیں لاسکیں تو کل رات گیارہ بجے تک اس کا بندوبست کر دو۔ کیوں
کہ یہ سامان کالے جادو کا زور توڑنے کے لئے اشد ضروری ہے۔“

پھر اس نے سروسوتی ماسی کو سامان لکھوانا شروع کیا۔ وہ فہرست بنانے لگیں۔
سامان کی تفصیلات سن کر میرے سارے بدن میں جھرجھری سی آ گئی اور روٹنے لگے کھڑے
ہو گئے۔ ایک انجانا سا خوف محسوس ہوا۔۔۔۔۔ یہی حالت سروسوتی ماسی کی بھی تھی۔ ان کا چہرہ خستہ ہو رہا
تھا۔ ان کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں۔۔۔۔۔

اس نے کچھ اور عجیب و غریب چیزیں بھی لکھوائی ہوئی تھیں۔ ان سب چیزوں کا ایک گھنٹے
کے اندر اندر بندوبست کرنا ناممکن سا امر تھا۔ اس لئے بات اگلے روز پرنٹل گئی تھی۔ میں نے اپنا سر
ہید لیا کہ میں بھی کس مصیبت میں پھنس گئی۔

امرتی جادوگرنی کو اوپر والے کمرے میں سلا کر میں اور سروسوتی ماسی نیچے آ گئیں۔
رات دس بجے سروسوتی ماسی رام چندر کے ساری چیزیں ایک تھیلے میں لے کر پہنچیں۔ وہ مجھے

لائی ہوئی چیزیں دکھانا چاہتی تھی۔ مگر میں نے مارے خوف سے انہیں دیکھنے سے انکار کر دیا۔ مجھ پر ایسی دہشت سوار ہوئی تھی کہ رات عمل کے وقت میں کمرے میں بھی نہیں گئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہو گئی۔ کچھ دیر بعد نیند نے دبوچ لیا۔ میں اس کی آغوش میں گہری نیند سو گئی۔ اس لئے کہ میں دوراتوں سے ٹھیک سے سو نہیں سکتی تھی۔ ایک گھنٹہ جاگنا بھی قیامت سے کم نہ تھا۔ صبح آٹھ بجے سروسوئی ماسی نے میرا شانہ آہستہ سے ہلایا۔ اس وقت بھی گہری نیند میں ڈراؤنے خواب دیکھ رہی تھی۔ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔

”کیا بات ہے سروسوئی ماسی.....! آپ نے مجھے اتنی جلدی بیدار کیوں کر دیا؟“

”تمہارے لئے بہت بڑی خوش خبری ہے۔“ سروسوئی ماسی نے پر مسرت لہجے میں کہا۔ ان کا چہرہ دمک رہا تھا اور آنکھوں میں ہزاروں جیسی روشنی تھی۔ ”اس جادوگر نے اس بدآتما کو بوتل میں بند کر دیا ہے..... اس کا کہنا ہے کہ بوتل کو گھر کے کسی حصے میں گڑھا کھود کر دفن کر دیا جائے..... شرط یہ ہے کہ چالیس روز تک اس بوتل کو اس گڑھے میں دفن رہنا چاہئے..... اکتالیس ویں دن اسے وہاں سے نکال کر دریا میں پھینک دینا چاہئے..... تمہارا شوہر اس حرافہ کے طلسم سے نکل آیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج کل میں اس کا ٹیلی فون آجائے..... یا پھر وہ خود بھی آ سکتا ہے۔“

واقعی یہ میرے لئے بہت بڑی خوش خبری تھی۔ جس نے مجھ پر ایک عجیب سی سرشاری طاری کر دی تھی۔

بدآتما کو بوتل میں بند کر دینا واقعی میں ایک بہت ہی بڑا کارنامہ تھا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس میں عمل کرنے والے کی جان جانے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ بدآتما قابو میں نہ آنے کی صورت میں موت کا فرشتہ بن جاتی ہے۔

ہم تینوں نے مل کر کوٹھی کی چار دیواری کے ایک کونے میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھود کر اس بوتل کو دفن کر دیا تو ایسا لگا کہ سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ میرے اعصاب ایک دم سے پھول کی طرح ہلکے ہو گئے تھے۔ اور ایک ناقابل برداشت ذہنی اذیت سے نجات مل گئی۔ دل نے کتنی خوش محسوس کی میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔

کوئی ایک گھنٹے کے بعد میرے پتی کی جاپان سے ٹریک کال آئی..... لائن صاف نہیں تھی۔ گڑبڑ ہو رہی تھی۔ ایک شور مچا تھا۔ موسم کے باعث شہر کا مواصلاتی نظام بڑا ناقص ہو گیا تھا جس کی وجہ سے آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں نے اپنے پتی کی میٹھی اور محبت بھری اور تاسف میں ڈوبی ہوئی آواز سنی۔ وہ ندامت سے بولے۔

”جان من.....! مجھے تمہاری یاد بہت ستا رہی ہے..... یقین جانو..... میں اس سے چوری

دوسری شادی کر کے بہت پچھتا رہا ہوں..... اس کمینی نے نہ جانے کیا جادو کر دیا تھا کہ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔ صبح معنوں میں اب تمہاری قدر ہو رہی ہے۔ تم میں جو بات ہے وہ اسی اور عورت میں نہیں ہو سکتی..... میں دو ایک دن میں واپس آ رہا ہوں..... تم پریشان بالکل بھی نہیں ہونا..... اور ہاں..... میری یہ بات سنو.....“ لائن ایک دم منقطع ہو گئی۔

میں نے کریڈل پر بہت تھکا مارا۔ جیلو..... جیلو..... کہا۔ لیکن بے سود..... بہر حال میرا من لمبی سے باغ باغ ہو گیا۔ اس جادوگر نے واقعی کمال کر دکھایا تھا۔ اس کی بات سو فیصد صحیح ثابت ہوئی تھی۔ اس نے رخصت ہوتے وقت پانچ ہزار کی رقم انعام کے طور پر مانگی تھی۔ جو میں نے اسے خوشی خوشی دے دی۔ حالاں کہ وہ مجھ سے پہلے ہی منہ مانگی رقم طلب کر چکی تھی جو میں نے اسے پوری رقم پیشگی دے دی تھی۔

جادوگر نے سروسوئی ماسی رخصت کرنے اور بس میں سوار کرانے چلی گئیں۔ وہ کوئی ایک گھنٹہ کے بعد واپس آئیں۔ میری بلاشت اور زندہ دلی پھر سے لوٹ آئی تھی۔ میری زندگی میں جو ماہ بادل چھائے ہوئے تھے وہ ایک دم سے چھٹ گئے تھے۔ اب ہر سمت روشنی ہی روشنی نظر آتی تھی۔ سروسوئی ماسی گھر جانا چاہتی تھیں۔ میں نے انہیں روک لیا تاکہ وہ میری خوشی میں شریک رہیں۔

میں نے انہیں دس ہزار کی رقم بطور انعام دینا چاہی۔ پہلے تو انہوں نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ میرے لائن پر پہلے ہی سے بہت احسانات ہیں۔ انہوں نے بغیر کسی غرض اور لالچ کے کام کیا ہے۔ لیکن میرے بے حد اصرار پر انہوں نے یہ رقم قبول کر لی۔

میں دوسرے دن صبح آٹھ بجے بیدار ہوئی تو بے حد خوش تھی دل و دماغ پر کوئی بوجھ نہیں تھا۔ لیس میں فرحت سی بسی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میرے پتی میرے پاس ہیں۔ میں ان کے ہاتھوں کے حصار میں ہوں۔ وہ بے حد جذباتی ہو کر میرے چہرے پر جھکے ہوئے ہیں اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پریم بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں..... ان کی محبت بھری باتیں میرے کانوں میں رس گھول رہی ہیں..... میرے نے دوبارہ سونے اور بیدار ہونے سے پہلے جو خواب دیکھا تھا اسے دیکھنے کی کوشش کی۔ نہ تو نیند آئی اور نہ ہی وہ سندر سا خواب دکھائی دیا۔

پھر میں نے بستر سے نکل کر سنگھار میز کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سراپا اور چہرے پر ایک اقدانہ نگاہ ڈالی۔ چہرے پر دمک اور جسم کا انگ انگ مستی سے ابلا پڑتا اور کہہ رہا تھا..... دنیا کی کوئی عورت تم جیسی حسین ہے نہ پرکشش..... تم ایک ایسی قیامت ہو جو مردوں کے دلوں کو روماد جیتی ہو۔ میں نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر لباس تبدیل کیا اور بال درست کئے۔ پھر کھڑکی کے

پاس آئی اور اس جگہ کود کھینے لگی جہاں بوتل دفن کی گئی تھی۔ وہ جگہ میری خواب گاہ کی کھڑکی سے نظر آتی تھی۔

دوسرے لمحے میں اس طرح سے اچھل پڑی جیسے مجھے کسی پچھونے بے خبری میں ڈنک مارا ہو۔

وہ جگہ کھدی ہوئی تھی..... مٹی باہر نکل پڑی تھی۔ مٹی کے ڈھیر وہ بوتل ٹوٹی پڑی تھی۔ جیسے مجھ پر کوئی بجلی سی آگری ہو..... پھر دوسرے لمحے میں چونکی اور بدحواسی کے عالم میں بھاگتی ہوئی سروسوئی ماسی کے کمرے میں پہنچی۔ میں نے انہیں بری طرح جھن جھوڑ کر جگایا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ میرا زرد چہرہ متوحش نظروں سے دیکھتی ہوئی بولیں۔

بیٹی!..... خیریت تو ہے..... یہ تمہاری کیا حالت ہو رہی ہے.....؟ تمہارا چہرہ سفید کیوں پڑ گیا ہے؟“

”غضب ہو گیا سروسوئی ماسی!.....“ میں نے انک انک کر کہا۔ ”آپ میرے ساتھ چلیں..... ابھی اور اسی وقت.....“

میں انہیں ساتھ لے کر اس جگہ پہنچی۔ وہ بھی یہ سب کچھ دیکھ کر ششدر رہ گئیں۔ پھر اپنا سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گئیں۔

”یہ کیسے ہو گیا.....؟“ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولیں۔ ان کا چہرہ متغیر سا ہو گیا۔
تھوڑی دیر بعد میں اپنی خواب گاہ میں آئی تو میری حالت مردے سے بھی بدتر ہو رہی تھی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے اور کیوں کر ہو گیا میں نے سروسوئی ماسی کو دیکھا۔ وہ غم سے غم حال کمرے میں آئیں اور انہوں نے اپنا خیال ظاہر کیا کہ شکنتلا کے ماموں جادوگر کو شاید جادو کے زور سے پتا چل گیا ہوگا کہ اس نے یہاں آ کر گڑھا کھود کر اس بدآتما کو آزاد کر دیا۔ اس نے اس لئے بھی کیا ہوگا کہ وہ اس کے زیر اثر تھی..... اور اس کی موکل بھی تھی۔ اگر وہ اس کی موکل نہ ہوتی تو وہ اسے آزاد نہ کرتی۔

”اب میں کیا کروں سروسوئی ماسی!.....؟“ میں نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”آپ ہی کچھ مشورہ دیں..... کیا اس جادوگر کی خدمات دوبارہ حاصل کی جائیں.....؟ اس کے جادو کی بدولت بدآتما قابو میں آئی تھی۔ میرے بچے کو بھی اس سے نجات مل گئی تھی۔“
”نہیں..... نہیں.....“ سروسوئی ماسی گھبرا کر بولیں۔ ”ہرگز ہرگز اس کی خدمات حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

”وہ کس لئے.....؟“ میں نے انہیں متعجب نظروں سے دیکھا۔ ان کے انکار کی وجہ سے کچھ

کچھ میں نہیں آئی۔ میں نے الجھ کر کہا۔ ”حیرت کی بات ہے کہ آپ اس کی مخالفت کر رہی ہیں۔ جب کہ آپ نے مجھ سے اس کی تعریف کی تھی۔ آخر کیوں.....؟ کیا آپ اس کی وجہ متا پسند کریں گی..... جب کہ وہ بڑے پائے کی جادوگر بنی ہے۔“

”اس لئے اس عورت نے بہت خرچ کر دیا ہے۔“ وہ ہم دردانہ لہجے میں بولیں۔ ”پیسہ پانی کی طرح بہہ گیا۔ جو آپ کے بچے نے اتنی محنت سے کمایا ہے۔ میرا دل یہ دیکھ دیکھ کر خون کے آنسو روتا رہا ہے۔“

”یہاں مسئلہ پیسے کا نہیں ہے بلکہ میرے گھر..... میری ازدواجی زندگی..... اور میرے بچے کی زندگی اور ان کی عزت کا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ پیسے اور خرچے کی فکر نہ کریں۔ اب آپ کسی ایسے جادوگر کو جو اس پڑیل کو اس طرح قابو میں کر لے کہ پھر وہ آزاد نہ ہو سکے۔ وہ پڑیل جیسے ہی بول میں بند ہوئی دیسے ہی میرے شوہر کا پچھتاوے اور محبت بھرا فون آیا تھا۔“

”میں کسی جادوگر کی کو نہیں جانتی اور نہ ہی جادوگروں کے بارے میں میری کوئی معلومات ہیں اور نہ ان سے شناسائی ہے۔“ سروسوئی ماسی کہنے لگیں۔ ”یہ جادوگر نیاں کسی بھی جادوگر سے کم نہیں ہوتی ہیں..... البتہ سنا ہے کہ جانا داپور میں ایک جادوگر بنی ہے۔ میں اس سے مل کر بات کرتی ہوں۔ دیکھوں وہ کیا کہتی ہے.....؟ کیا کسی بدروح کو قابو میں کرنا اس کے بس میں ہے یا نہیں؟“

میں نے اسی وقت سروسوئی ماسی کو ایک ہزار روپے ٹیکسی کرایہ دے کر جانا داپور روانہ کر دیا کہ وہ جانا داپور جائیں۔ اس کام میں بالکل دیر نہ ہو۔ ان کے جانے کے گھنٹہ بھر بعد میرے شوہر کا ہٹاک سے فون آیا۔ آج بھی لائن میں یوٹی گڑبڑ تھی اور ان کی آواز صاف سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دراصل کئی لائیں مل گئی تھیں اس لئے دخل اندازی ہو رہی تھی۔ انہوں نے مجھ سے بڑے رکی انداز اور بے زاری سے بات کی۔ انہوں نے بچوں کی خیر خیریت معلوم کرنے کے لئے فون کیا تھا اور کسی ہوٹل سے بول رہے تھے۔ ان کے روکے اور بدلے ہوئے لہجے نے میرا دل کسی شیشے کی طرح چکنا چور کر دیا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کوئی پتھر شیشے پر لگنے سے چکنا چور ہو جاتا ہے..... پھر میں نے ان کے عقب میں کھٹکتی لمبی کی آواز سنی۔ اس لڑکی نے کہا تھا۔

”یہ تم نے نا وقت فون کیوں کیا اور اپنی بیوی سے اتنی لمبی کیوں کر رہے ہو؟ جلدی سے بات قطع کر کے میرے پاس آؤ۔ تھوڑی دیر بعد شاپنگ کے لئے تو جانا ہے..... کم آن ڈارلنگ..... رنگ میں بھگتو نہ ڈالو۔“

اس آواز نے میرے سارے بدن میں آگ لگا دی تھی۔ میرے دل پر نہ صرف چابک لگے تھے بلکہ میرے کانوں میں اس کے الفاظ گرم گرم سیسہ کی طرح پکھلنے لگے تھے۔ آخر مجھ سے

برداشت نہ ہوسکا۔ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

”آخر میں نے کیا جرم کیا تھا جو آپ نے دوسری شادی کر لی؟ میرا جرم تو بتائیں؟“

”تمہیں اس سے کیا؟“ انہوں نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ”میں دوسری شادی کروں یا تیسری شادی..... بس میں نے شادی کر لی..... اب تم میں رکھا ہی کیا ہے..... اور اب میں دو مہینے تک ہنسی مومن منا کر ہی آؤں گا۔ جب کبھی میں فون کروں گا۔ بچوں کی خیر خیریت معلوم کرنے کے لئے خبردار.....! جو تم نے مجھ سے اس موضوع پر بات کی۔“

”یہ کیا تم اپنی بوڑھی بیوی سے بحث کرنے لگے..... دفع کرو اس چڑیل کو..... آخر تم اسے گھاس کیوں ڈال رہے ہو۔“ یہ شکنتلا کی نفرت اور حقارت بھری آواز تھی۔

دوسرے لمحے ٹیلی فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میرا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ میں نے خواب گاہ کا دروازہ بند کر لیا اور میں کسی کٹی پتنگ کی طرح بستر پر گر گئی۔ پھر نیچے میں منہ دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مجھے اپنے شوہر سے ایسی امید ہرگز نہ تھی۔ جب میں خوب رو چکی تو اور دل کی بھڑاس نکل چکی تو میں سوچنے لگی کہ امرتی جادوگرنی نے اس بدآتما کو قابو میں کیا۔ ادھر میرے پتی کا ٹیلی فون آیا تو انہوں نے کتنے محبت بھرے انداز سے بات کی تھی تو میرا دل رواں خوش ہو گیا۔ آج وہ بدروح آزاد ہو گئی تو میرے پتی کے رویے اور لہجے میں کتنا فرق آ گیا۔ وہ بدآتما سارے فساد کی جڑ ہے۔

میں یہ تمام باتیں بڑے کرب اور دکھی دل سے سوچ رہی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ٹیلی فون اٹھایا تو دوسری طرف رام چندر تھا۔ اس لئے کہ ایک مقامی کلب میں کوئی ڈرامہ تھا اس میں اسے حصہ لینا تھا اس لئے وہ آج دکان نہیں گیا۔ اس نے کہا۔

”نیگم صاحبہ! آپ دکان کے فیچر سے فون کر کے میری سفارش کر کے کہہ دیں کہ مجھے سارا دن کی چھٹی دے دے مجھے ابھی اور اسی وقت ریہرسل کے لئے جانا ہے۔ اس ڈرامے کا میں مرکزی کردار ہوں۔“

رام چندر کو بچپن سے ہی اداکاری کا شوق تھا۔ وہ اسکول میں جب پڑھتا تھا اسکول کے ہر ڈرامے میں حصہ لیتا تھا۔ اسکول سے فارغ ہو کر وہ ایک ڈراما کلب کا ممبر بن گیا جو وقتاً فوقتاً ڈرامے اسٹیج کیا کرتا تھا۔ وہ اس کلب کے ہر ڈرامے میں حصہ لیتا تھا۔ اسے بڑی تعریفی اسناد بھی مل چکی تھی۔ وہ بڑا اچھا اداکار اور صداکار بھی تھا۔

میں نے جیولری شاپ کے منیجر کو فون کر کے اس کی سفارش کر دی۔ کیوں کہ وہ اور اس کی ماں میرے کام آ رہے تھے۔

دو پہر دو بجے سرسوتی ماسی آئیں تو ان کے چہرے پر خوشی پھوٹ رہی تھی۔ ان کی آنکھوں میں تپتے جمل رہے تھے۔ وہ بولیں۔

”وسنت نگر میں ایک جادوگرنی رہتی ہے..... اس کے بارے میں جانا د پور کی جادوگرنی نے بتایا۔ وہ اس کی دس بارہ برس تک شاگرد رہی ہے۔ وہ بہت ہی بڑی اور پختی ہوئی جادوگرنی ہے۔ اس کا نام راج کماری ہے۔“ سرسوتی ماسی بتانے لگیں۔ ”رات دس بجے وہ اپنا سامان لے کر یہاں پہنچ جائیں گی..... اس نے تیس ہزار روپے اپنی فیس مانگی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ عمل کے وقت ایک نوجوان لڑکی کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ کیوں کہ وہ اس سے بھی مدد لے گی۔ اس نے میری بات سن کر مجھے دلاسا دیا تھا کہ تمہاری نیگم صاحبہ کو پریشان اور ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس بدروح کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر کے ہی دم لے گی۔ وہ بہت اچھی طرح جانتی ہے کہ بدآتماؤں سے کس طرح نمٹا جاتا ہے۔ اس نے اب تک نہ جانے کتنی ہی بدروحوں کو نیست و نابود کر دیا ہے۔“

”اب تم کسی جوان لڑکی کا کہاں سے اور کیسے بندوبست کرو گی۔ جو عمل کے دوران موجود ہے۔“ میں نے پوچھا۔ ”اس نے تو یہ بڑی کڑی شرط رکھی ہے..... کیا کوئی لڑکی اس کے لئے تیار ہو سکتی ہے؟“

”آپ اس بات کی بالکل بھی چھتا نہ کریں۔ اس شرط کو پورا کرنا میری ذمہ داری ہے اور یہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں جو آپ اتنی پریشان ہو رہی ہیں۔ سرسوتی ماسی نے مجھے تسلی دی۔“ میرے محلے میں ایک غریب اور ضرورت مند لڑکی رہتی ہے۔ اسے آپ دو ہزار کی رقم دے دیں تو وہ تیار ہو جائے گی۔ اس کا باپ بہت ہی غریب آدمی ہے۔ میں رام چندر کو بھی بلا لوں گا تاکہ وہ اس لڑکی کو اس کے گھر چھوڑ آئے۔ میں نے اس لڑکی سے بات کر لی ہے۔ وہ رات آٹھ بجے آ جائے گی۔ اسے خوب پیٹ بھر کر کھانا کھلا دینا۔ میں رات دس بجے راج کماری کو لیتی آؤں گی۔ اس کی فیس اور سامان کے لئے پانچ ہزار تا کا دے دو۔“

میں نے سرسوتی ماسی کو پینتیس ہزار کی رقم اس وقت دے دی۔ اس لئے کہ اس کے سوائے دنیا کا کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔

پھر میں نے جیولری شاپ کے منیجر کو فون کر کے کہا..... وہ شام تک ایک لاکھ کی رقم ہانپا دے۔ اشد ضرورت ہے۔

میں نے شام کو منیجر سے ایک لاکھ کی رقم وصول کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ اب جادوگرنیوں پر ایک کوڑی بھی خرچ نہیں کروں گی۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ پھر مجھے اس بات کا شدت

سے احساس ہوا کہ ان جادوگر نیوں پر رقم لٹانے سے تو بہتر تھا کہ میں یہ رقم اپنے برے وقت کے لئے اٹھا رکھتی..... میں نے بینک اور الماری میں رقم ہونے کے باوجود دکان سے اس لئے رقم منگوالی تھی کہ اس جادوگر نے ناکامی کی صورت میں میرے پتی اس حرافہ کے ساتھ آئیں گے اور مجھے طلاق دے دیں گے۔ تب میں رقم کو ساتھ لے جاؤں گی اور پھر میں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ جو اٹھارہ بیس لاکھ کی مالیت کے زیورات ہیں وہ دو ایک دن میں بینک کے لاکر میں رکھ دوں گی۔ ماں باپ کے گھر زیورات لے جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ کیوں کہ میرے دونوں ان زیورات کے دشمن ہو جائیں گے۔ مجھے بہت دیر میں عقل آئی تھی۔ اب میں اتنی دور چلی گئی تھی کہ کسی بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا تھا۔ الماری میں جو رقم تھی وہ میں نے گئی۔ وہ ایک لاکھ تیس ہزار تھی۔ اب اسے سنبھال کر رکھنا تھا۔ اس فیصلے سے میرے دل کو قدرے ڈھارس سی بندھی۔

رات آٹھ بجے وہ لڑکی آگئی تھی جس کا ذکر سرسوتی ماسی نے کہا تھا۔ اسے اس کا بڑا بھائی دروازے پر چھوڑ گیا تھا۔ اس کی عمر اٹھارہ برس کی ہوگی۔ وہ سانولے رنگ اور معمولی نقش و نگار کی لڑکی تھی۔ وہ بے حد سنجیدہ اور خاموش طبیعت کی تھی۔ اس کے لباس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ واقعی بہت غریب لڑکی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا کھانا کھاؤ گی؟ اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔ میں اسے کھانے کی میز پر لے گئی اور کھانا کھایا داعی بہت بھوک تھی۔ لیکن اس نے بڑے مہذبانہ پن سے کھایا۔ اس میں ندیدہ پن نہیں تھا۔

پھر ٹھیک دس بجے سرسوتی، راج کماری جادوگر نے کو لے آئی۔ اس کا پورا نام شو بھاراج کماری تھی۔ راج کماری ان دو سابقہ جادوگر نیوں کے مقابلے میں صاف ستھری اور پڑھی لکھی تھی۔ لب و لہجہ میں بڑی نفاست اور شائستگی تھی۔ وہ چالیس برس عمر کی ہوگی۔ اس عمر میں بھی اس نے اپنی جوانی اور پرشباب جسم کی دل کشی اور تناسب کو سنبھالے رکھا ہوا تھا۔ اس میں بڑی سنسنی خیزی تھی۔

میں نے راج کماری کو برآمدے میں بٹھایا اور اس کی خاطر تواضع کی۔ رام چندر کا انتظار تھا۔ گیارہ بجے سے تھوڑی دیر پہلے۔ پھر ہم اوپر والے کمرے میں آگئے۔ راج کماری نے ٹھیک گیارہ بجے اپنا عمل شروع کیا۔ وہ اپنے ساتھ جانوروں کے اعضاء لے کر آئی تھی۔ اس کے بھی اس نے پیسے لئے تھے۔ جادوگر نیاں ایک ایک چیز کے پیسے اس طرح وصول کرتی رہی تھیں جیسے جرمانہ کر رہی ہوں۔ ان اعضاء میں ہرن اور گائے کے سر بھی تھے۔ کچھ زندہ مچھلیاں تھیں۔ ایک بڑا سا شیشے کا جار تھا جو اس میں سانپ کنڈلی مار کے بیٹھا تھا۔

راج کماری نے اس بات کی سختی سے تاکید کر دی تھی کہ جب تک عمل ختم نہ ہو کوئی بھی آواز نہ لگائے..... کھانسنے اور بات کرنے پر اسے جادو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ سو وہ اس کی ذمہ داری نہ ہوگی۔

راج کماری آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی تمکنت اور اس کی طرب صورت بڑی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ معلوم نہیں اس نے کسی زبان میں منتر پڑھنا شروع کیا۔ جادوگروں کی زبان ہی اور ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک چڑیل نمودار ہوئی..... یہ وہی بدآتما تھی جو میرے پتی پر سوار تھی۔ اس کی شکل بہت ہی خوفناک اور مکروہ تھی۔ میں نے سنا تھا کہ چڑیلیں بہت بد صورت ہوتی ہیں۔ بھیا نک ہوتی ہیں۔ فٹور نہ تھا کہ ایسی بد صورت اور بھیا نک ہوتی ہیں۔ اب جو اسے دیکھا تو میرے اوسان خطا ہونے لگے اور میں خوف و دہشت سے کانپنے لگی۔ خود پر قابو پانے کی ہر کوشش اور جدوجہد ناکام ہوتی گئی۔ قریب تھا کہ میں بے ہوش ہو جاتی۔ سرسوتی ماسی نے مجھے فوراً ہی سنبھال لیا۔

لڑکی جس کا نام ڈولی تھا اس کی حالت مجھ سے زیادہ خراب تھی۔ اس کا چہرہ دھلی ہوئی سفید چادر کی طرح سفید پڑ گیا۔ اس کا جسم بری طرح لرز رہا تھا اور وہ خود پر قابو نہ پاسکی۔ اس نے ایک دل خراش چیخ ماری اور اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ چڑیل ڈولی کی طرف کو نڈا بن کر لپکی اور وہ ڈولی میں تحلیل ہو گئی۔ پھر ڈولی نے ایک اور زردار چیخ ماری۔ پھر فرش پر ڈھیر ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد چڑیل ڈولی کے بدن سے نمودار ہوئی اور پھر نظروں سے غائب ہو گئی۔

راج کماری نے ڈولی کی چیخ سن کر اپنا عمل موقوف کر دیا تھا اس لئے کہ چڑیل فرار ہو گئی تھی۔ راج کماری اپنی جگہ سے اٹھ کر ڈولی کے پاس گئی۔ اس کی نبض دیکھی۔ پھر اس کے سینے پر دل کی جگہ کان رکھ کر اس کی دھڑکنیں سنیں۔ چند لمحوں تک سنتی رہی۔

”ڈولی نے ڈر، خوف و دہشت سے دم توڑ دیا ہے۔“ راج کماری نے افسوسناک لہجے میں کہا۔

میں یہ سنتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے بستر پر تھی اور میرے پاس راج کماری اور سرسوتی ماسی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے چہرے زرد اور مردہ سے تھے۔

ڈولی کی موت نے ایک سنگین اور دہشت ناک مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔

”ڈولی کی موت سے تمہاری ذات کو یہ فائدہ پہنچا کہ اب تمہارے پتی کو درغلا نہیں سکتی۔“ راج کماری نے کہا۔ ”اس لئے کہ وہ تمہارے گھر کے کسی فرد کے خون کی پیاسی تھی۔ اب اس کی پیاس بجھ گئی ہے۔ تمہارا پتی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے ظلم سے نکل گیا ہے۔ لیکن اس معصوم

ہماری ہر بات مان لے گی۔ پولیس تو کتے کی مانند ہوتی ہے۔ کتا اس کا ہوتا ہے جس کے آگے ہی اٹلی جائے۔“

پھر سرسوتی ماسی نے تجویز پیش کی کہ لڑکی کے باپ کو پچیس تیس ہزار روپے دیئے جائیں تو وہ ۱۱ لاکھ روپے ہو جائے گا۔ اتنی بڑی رقم پا کر اپنی بیٹی کا غم بھلا دے گا..... کیوں کہ غریب آدمی ہے اس کے لئے بیٹی بہت بڑا بوجھ ہوتی ہے۔

راج کماری نے اپنا منہ بند رکھنے کے لئے چالیس ہزار کی رقم طلب کی..... سرسوتی ماسی نے اسی ہزار کی رقم تھہیلی۔ رام چندر کو دس ہزار کی رقم دینی پڑی۔ کیوں کہ اس نے قبر کھود کر لڑکی کو اٹل کیا تھا۔ پھر اس نے قبر اس طرح سے برابر کر دی تھی کہ کسی کو گمان نہیں ہو سکتا تھا کہ یہاں ایک لالہ کی قبر موجود ہے۔ میں نے سرسوتی ماسی کو پچیس ہزار کی رقم دی کہ وہ لڑکی کے باپ کو لے جا کر اے دے۔

صبح سرسوتی ماسی کے سوا دونوں چلے گئے۔ گیارہ بجے میرے پتی کا ٹیلی فون آیا تو لائن پھر اٹاپ ہو رہی تھی۔ وہ ٹیلی فون پر کہنے لگے کہ..... میری جان! میں نے شکنتلا کو طلاق دے کر اس سے نبات حاصل کر لی ہے۔ اس کمینہ نے مجھ پر جادو کے لئے مجھے اپنا دیوانہ بنالیا تھا۔ میں ایک ہفتہ کے لئے جاپان جا رہا ہوں۔ وہاں سے سیدھا تمہارے پاس آؤں گا۔ ان کی بات سن کر اتنی لمبی ہوئی کہ الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی۔ مجھے ایسا لگا کہ جیسے کوئی انمول خزانہ مل گیا ہے۔ خوشی تو اٹل خزانے سے بھی بڑی ہوتی ہے۔

تیسرے دن میری ملازمہ ماسی نے آ کر بتایا کہ ایک پولیس انسپکٹر مجھ سے ملنے کے لئے آیا ہے۔ میں نے اسے نشست گاہ میں بٹھا دیا ہے۔ پولیس کا نام سنتے ہی میرا دل حلق میں آ کر دھڑکنے لگا۔ پھر دس سے زمین نکل گئی۔ ایس الگا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔

میں کچھ دیر بعد نشست گاہ میں گئی تو میں نے ایک لمبے چوڑے شخص کو پولیس کی وردی میں اٹل دیکھا۔ اس کی عمر کوئی چالیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے چہرے سے خباثت ٹپک رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں سے دل کا میل جھانک رہا تھا۔ وہ مجھے اس طرح سے ندیدی نظروں سے گھور رہا تھا۔ جیسے میں رستے کا مال ہوں۔

اس کمینہ پولیس انسپکٹر نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”میرا نام امر لال ہے۔ ڈولی کے باپ اور بھائی نے آپ کے خلاف تھانے میں رپورٹ لکھوائی ہے۔“

”کیسی رپورٹ.....؟“ میں نے لرزیدہ آواز میں پوچھا۔ میری رگوں میں لہو مردہ ہونے لگا۔

نوجوان لڑکی کی موت کی ذمہ داری تم پر آگئی ہے۔ اس لئے کہ اس کی موت تمہارے گھر میں واقع ہوئی ہے..... پولیس ہمارے اس بیان پر یقین نہیں کرے گی کہ وہ خوف و دہشت سے مری ہے..... کیوں کہ پولیس کے نزدیک بدروح، بھوت اور چڑیل کا کوئی تصور نہیں ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ چڑیل انسان کے خون کی پیاسی ہے۔ ورنہ میں ہرگز یہ نوبت نہیں آنے دیتی۔“

راج کماری کی ان باتوں نے میری حالت مردے سے بھی بدتر کر دی۔ اب مجھے اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا محسوس ہونے لگا۔ میں نے برسوں سے اپنے بے بسائے گھر کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی تو مصائب اور آلام کا پھندا میرے گلے میں بڑ گیا تھا۔ میں اسے اب کسی بھی صورت میں نکال نہیں سکتی تھی۔ یہ ایک دلدل تھا۔ جتنا نکلنے کی کوشش کی اتنا ہی دھنسی چلی گئی۔

میں اپنے جذبات پر قابو نہ پاسکی۔ دل ایسا دکھا کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ آنسوؤں کی جھری لگ گئی۔ میں دیر تک روتی رہی۔ وہ دونوں خاموش بیٹھیں میری شکل دیکھتی رہیں۔

”بیٹی.....!“ سرسوتی ماسی نے کہا۔ ”رونے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہمت اور حوصلے سے کام لو۔ رورو کر جی ہلکان نہ کرو۔“

”میری زندگی تباہ و برباد ہو کر رہ گئی ہے۔“ میں نے سسکیوں کے درمیان کہا۔ ”ڈولی کی موت مجھے جیل جانے اور پھانسی سے کسی قیمت پر بچا نہیں سکتی ہے۔ اس حرافہ کی میرے گھر کو نظر لگ گئی..... اب میں کیا کروں.....؟ میرے بچوں کا کیا ہوگا.....؟“

”اس تباہی و بربادی سے بچنے کے بارے میں سوچو..... سوچنے سے کوئی نہ کوئی راستہ بچنے سے نکل آئے گا۔“ راج کماری نے کہا۔

میں خاک سوچتی۔ میرا ذہن مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ میں چند لمحوں کے بعد بولی۔ ”میرا دل و دماغ مفلوج ہو گیا ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔“

”ایک تدبیر میرے ذہن میں آ رہی ہے۔“ راج کماری بولی۔ ”لڑکی کو تو کٹھی کے عقب میں قبر کھود کر دفن کر دیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟“

”لیکن یہ قبر کون کھودے گا.....؟“ میں نے پوچھا۔ ”کیا قبر کھودنا آسان ہوتا ہے؟“

”رام چندر ایک گھنٹے کے اندر اندر قبر کھود دے گا۔“ راج کماری کہنے لگی۔ ”وہ اکیلا ہولے کے باوجود جلد قبر کھود دے گا کیوں کہ مٹی بہت ہی نرم ہے اور پھر وہ ایک صحت مند اور طاقتور مرد ہے..... ہم سب مل کر پولیس کو یہ بیان دیں گے کہ لڑکی رات نو بجے ہی خرابی طبیعت کا بنا کر چلی گئی تھی..... پولیس گواہی کو زیادہ اہمیت دے گی اور پھر پولیس کی مٹھی بھی گرم کر دیں گے۔“

”تین دن پہلے اس کے بھائی نے اپنی نو جوان بہن ڈولی کو رات آٹھ بجے چھوڑا تھا۔“ اس نے جواب دیا۔ ”جب وہ دوسرے دن بھی گھر نہیں پہنچی تو انہیں تشویش ہوئی۔ اس کی ماں بیٹی کی تلاش میں آئی تھی۔ آپ نے اس سے کہا کہ ڈولی رات نو بجے خرابی طبیعت کا کہہ کر گھر چلی گئی۔ ڈولی کے باپ کا خیال ہے کہ آپ نے اس کی بیٹی کو کس وجہ سے قتل کر کے اپنی کوٹھی کے اندر یا باہر دفن کر دیا ہے۔ لہذا آج پولیس دوپہر کے وقت کھدائی کر کے اس لڑکی کی لاش کا کھوج لگانے کی کوشش کرے گی۔ لڑکی کی لاش برآمد نہ ہونے کی صورت میں آپ کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ عدالت آپ کو قتل کے جرم میں سزائے موت دیدی گی۔“

پولیس انسپکٹر ایک تیز و طرار، شاطر اور انتہائی چالاک شخص تھا۔ میرا کبھی پولیس سے واسطہ نہ ہوا تھا۔ میری اس کے سامنے ایک نہ چلی۔ آخر اس نے مجھ سے بڑی آسانی سے سب کچھ اگوا لیا۔ بہت دیر تک بحث و تکرار اور میری منت سماجت پر اس نے دو شرطیں نظر کیں۔

اس کی پہلی شرط یہ تھی کہ میں اسے ہر مہینے پچاس ہزار کی رقم مقررہ تاریخ پر دیتی رہوں۔ اس یہ معاملہ پانچ لاکھ میں طے کیا۔ جس کی ہر قسط پچاس ہزار کی ہوگی۔

اس کی دوسری شرط میرے لئے ناقابل قبول تھی۔ وہ یہ تھی..... اس کا کہنا تھا کہ جب تک ہمارے لاکھ کی رقم ادا نہیں ہو جاتی ہفتے میں ایک بار میں اس سے ملنے اس کے گھر آیا کروں اور تین گھنٹے گزار کر جاؤں۔

مجھے مر جانا پسند تھا مگر مجھے یہ شرط کسی قیمت اور کسی صورت میں ناقابل قبول تھی۔ وہ کسی تہا دل شرط کے لئے تیار نہ تھا۔ میں نے اس سے سوچنے اور فیصلہ کرنے کے لئے دو دن کی مہلت مانگی۔ اس نے بغیر کسی پس و پیش کے بغیر قبول کر لی۔ جس کا مجھے یقین نہیں آیا۔ کیوں کہ اس کا انداز اور تہا ایسا تھا کہ جیسے وہ ابھی اور اسی وقت مجھے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو میں اسے ہاتھ شوٹ کر دیتی تھی۔ کیوں کہ مجھے اپنی عزت پیاری تھی۔ اس کے جاتے ہی میں نے گاڑی نکالی اور شاردہ کے پاس آئی۔ میں نے اسے رام کہانی سنائی۔ پھر اس کا فون آیا کہ تم پہنچو۔ پریشان نہ ہو۔ اتفاق سے میری سہیلی چندرا دیوی آئی ہوئی ہے۔ وہ تمہاری مشکل حل کر دے گی۔“

”آپ قطعی پریشان نہ ہوں۔“ چندرا دیوی نے اسے دلاسا دیا۔ ”وہ لڑکی زندہ ہے۔ آپ کو بڑے خوب صورتی سے بے وقوف بنا کر لوٹا گیا ہے۔ وہ انسپکٹر بھی جلتی ہے..... کیا اس نے آپ کے رقم وغیرہ لی؟“

”جی ہاں.....“ پدمی نے سر ہلایا۔ ”اس نے دس ہزار کی رقم لی ہے۔“

”اچھا آپ میرے ساتھ چلیں اور اپنے ہاں لے جائیں۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”سب

پہلے قبر کو دیکھتے ہیں۔“

شاردا، پدمی اور چندرا دیوی..... پدمی کے ہاں پہنچیں۔ اس جگہ جہاں لڑکی کو دفن کیا گیا تھا۔ گھر کی نوکرانیوں نے کھودا۔ اس میں ڈولی تو کیا اس کی لاش تک موجود نہ تھی۔ تب چندرا دیوی نے پدمی سے کہا۔

”پدمی.....! تم جتنی حسین ہو اس سے کہیں زیادہ بے وقوف بھی، لوگ سچ کہتے ہیں کہ حسین عورت کے پاس عقل نہیں ہوتی ہے۔“

”آپ تو مجھ سے کہیں زیادہ حسین ہیں کیا آپ بھی عقل سے محروم ہیں؟“ پدمی نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

”یہ ہر کسی عورت کے بارے میں نہیں ہے۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”تم ڈولی کی لاش نہ پا کر کیا محسوس کر رہی ہو؟“

”مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں نے ابھی ابھی نیا جنم لیا ہے۔“ پدمی بولی۔ ”میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ کیا ڈولی زندہ ہے۔“

”ہاں زندہ ہے۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”دراصل ایک منصوبہ بنا کر ایک ڈرامہ کیا گیا تھا۔ تم اب ہمیں سروسٹی ماسی کے ہاں لے چلو.....“

”وہ کس لئے.....؟“ پدمی نے پوچھا۔

”اس لئے کہ تم نے اب تک جو رقم پانی کی طرح بھائی ہے اس کی پائی پائی وصول کرنی ہے۔“

چندرا دیوی نے جواب دیا۔

”لیکن وہ سب مجھ سے رقم لے کر رنو چکر ہو گئی ہیں۔“ پدمی بولی۔ ”اگر کچھ رقم مل سکتی ہے تو وہ سروسٹی ماسی کے ہاں سے.....“

اس وقت سروسٹی ماسی کے ہاں سب جمع ہیں تاکہ تم سے جو رقم مختلف بہانوں سے لوٹی گئی ہے وہ آپس میں مساوی طور پر تقسیم کر لی جائے۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”اب ہمیں چل کر اس ڈرامے کا اراپ سین کرنا ہے۔“

شاردا نے گاڑی سروسٹی ماسی کے مکان سے قدرے دور روکی۔ چندرا دیوی کے ہاتھ میں ایک جیبی سا سز کا حساس ٹیپ ریکارڈر تھا۔ سروسٹی ماسی کا جو مکان تھا اس کا بیڑوئی دروازہ بند تھا۔ چندرا دیوی کے ہاتھ رکھتے ہی بے آواز کھل گیا۔ چندرا دیوی نے اندر داخل ہو کر ان دونوں کو خاموشی سے اندر داخل ہونے کا اشارہ کیا۔ جب وہ دونوں اندر داخل ہو گئیں تو دروازہ بند کر دیا گیا۔

اندر کے ایک ہال نما کمرے میں اس ڈرامے کے تمام کردار موجود تھے۔ ایک طرف ایک بڑا

نے سرسوتی ماسی سے کہا۔

”سرسوتی ماسی نے جادوگریوں سے کہا۔ ”تم لوگ اس آگ کو بجھا دو۔“

”ان سب نے اپنی اپنی کوشش کر کے دیکھ لی۔ وہ سب کی سب ناکام رہیں۔ پھر چندرا دیوی نے نوٹوں کی گڈیوں پر منتر پڑھ کر پھونکا تو وہ سب پتھروں میں تبدیل ہو گئیں۔ پھر چندرا دیوی بولی۔

”یہ حرام کی دولت اب پتھروں کا ڈھیر بن گئی ہے۔ چلو اب اسے اٹھا لو۔“

”آ خر تم ہو کون۔۔۔۔۔؟“ سرسوتی ماسی بولی۔ ”یہ تم نے آ کر کیا ہنگامہ کر دیا ہے۔“

”میں جو بھی ہوں۔۔۔۔۔ ساری رقم لے جانے آئی ہوں۔“ چندرا دیوی نے ان پتھروں پر پھونک ماری۔ وہ پھر سابقہ حالت میں آ گئے۔

”تم یہاں سے ایک پائی بھی نہیں لے جاسکتی ہو۔۔۔۔۔؟“ رام چندرا غرایا۔ ”یہ تمہارے باپ کا مال نہیں ہے۔“

”کیا یہ تمہارے باپ کا مال ہے۔۔۔۔۔؟“ چندرا دیوی بولی۔ ”یہ ایک معصوم عورت کو بے وقوف بنا کر ایک منصوبے کے تحت لوٹا گیا ہے۔“

”تم میں ہمت ہے تو یہ رقم لے جانے سے مجھے روک سکتے ہو تو روک کر دیکھ لو۔“

امر لال اور رام چندر نے اپنی اپنی جیب سے چاقو نکال لئے۔ دوسرے لمحے وہ چاقو ان کے ہاتھوں میں سنپو لیے بن گئے۔ انہوں نے خوف زدہ ہو کر فرش پر پھینکا تو وہ پھر سے چاقو بن گئے۔

”تم ہاتھ پر ہاتھ دھرے تماشا دیکھ رہی ہو۔۔۔۔۔؟“ سرسوتی ماسی نے راج کماری کو مخاطب کر کے کہا۔ ”کیا ہوا تمہارے جادو کو۔۔۔۔۔؟“

”سرسوتی جی۔۔۔۔۔! یہ کوئی بہت بڑی جادوگری ہے۔“ راج کماری نے تلخی سے جواب دیا۔

”تم دیکھ نہیں رہی ہو اس کے کمالات۔۔۔۔۔ ہم اس سے جیت نہیں سکتے۔۔۔۔۔ یہ رقم لے جا کر رہے گی۔ ہم سب اس کے سامنے بے بس ہو گئے ہیں۔“

”شاردا۔۔۔۔۔! پدمی۔۔۔۔۔!“ چندرا دیوی نے اس کمرے کی طرف منہ کر کے آواز دی جس میں وہ کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔

دوسرے لمحے دونوں اندر داخل ہوئیں تو سرسوتی ماسی کا چہرہ پدمی کو دیکھ کر فرق ہو گیا۔ رام چندر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ چندرا دیوی نے پدمی کو مخاطب کر کے کہا۔

”یہ ہے نمک حرام اور کمینہ سرسوتی اور اس کا بیٹا رام چندر۔۔۔۔۔ یہ تمام جادوگر نیاں سبھی اس محلے میں رہتی ہیں۔۔۔۔۔ یہ ایک گروہ تم جیسی معصوم اور امیر کبیر عورتوں کو بے وقوف بنا کر لوٹتا ہے۔۔۔۔۔

ساتھیلا رکھا تھا۔ وہ سب آپس میں گپ شپ کر رہے تھے۔ ان سب کا موضوع پدمی تھی۔ ہر کردار بول رہا تھا کہ پدمی کو کیا بے وقوف بنایا گیا۔ چندرا دیوی نے ان سب کی گفتگو ٹیپ کر لی۔ پھر جادوگری امرتی نے کہا۔ ”اب شہہ کام میں دیر نہ کرو۔ رقم جلدی سے گن کر وعدے کے مطابق برابرہ تقسیم کر دو۔“

رام چندرا ٹھہر کر تھیلے کے پاس گیا۔ اس نے تھیلے کا منہ کھول کر درمیان میں الٹا تو اس میں سے وہ ساری رقم پدمی نے دی تھی۔ وہ بنڈلوں کی صورت میں فرش پر بکھر گئیں۔ ان نوٹوں پر ربرینڈ چڑھایا ہوا تھا۔

سرسوتی ماسی نے جعلی انسپکٹر امر لال اور اپنے بیٹے رام چندر سے کہا۔

”تم دونوں مل کر جلدی سے رقم گننا شروع کر دو۔۔۔۔۔ میں نے رقم اس لئے نہیں گئی کہ سب کے سامنے گنا جائے۔۔۔۔۔ پدمی سے تم سب نے اور میں نے جو رقم مختلف حیلے بہانوں سے لی وہ سب اس تھیلے میں موجود ہے۔“

جب امر لال اور رام چندر نے نوٹوں کی گڈیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا کہ چندرا دیوی نے اندر داخل ہو کر تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”خبردار۔۔۔۔۔! جو تم میں سے کسی نے نوٹوں کی گڈیوں کو ہاتھ لگایا۔“

ان سب نے چونک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک اجنبی عورت کو اندر دیکھ کر وہ پریشان سے ہو گئے۔

”تم کون ہو۔۔۔۔۔ اندر کیسے آئیں۔۔۔۔۔ دروازہ تو بند تھا؟“

”میں تم سب کی موت ہوں اور یہ رقم لے جانے آئی ہوں۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”میں بیرونی دروازے سے آئی ہوں۔ دروازہ بند ہوا کھلا ہوا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”رام چندر!“ سرسوتی ماسی نے کہا۔ ”تم جلدی سے نوٹوں کی گڈیاں تھیلے میں ڈال دو تا کہ اس سے نمٹا جاسکے۔“

رام چندر اور امر لال نے نوٹوں کی گڈیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ جیسے ہی انہوں نے گڈیوں کو ہاتھ لگایا ایک دم سے اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔ انہیں لگا کہ یہ انگاروں کی طرح دھک رہے ہیں۔

”کیا ہوا۔۔۔۔۔؟“ سرسوتی ماسی نے کہا۔

”یہ ساری گڈیاں انگاروں کی طرح دھک رہی ہیں؟“ رام چندر نے اپنا ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

”یہاں اتنی ساری جادوگر نیاں بیٹھی ہیں ان سے کہو کہ ان انگاروں کو بجھادیں۔“ چندرا دیوی

اس ڈرامے کے سارے کردار یہاں موجود ہیں۔ یہ اس لئے جمع ہوئے تھے کہ تمہاری رقم آپس میں بانٹ لی جائے۔۔۔۔۔۔ یہ رام چندر جو ایک اداکار ہے وہ تمہیں تمہارا بچہ بن کر ٹیلی فون کرتا تھا اسے کسی کے بھی لہجے کی نقل اتارنے میں بڑی مہارت ہے۔۔۔۔۔۔ یہ حرام زادہ۔۔۔۔۔۔ امر لال۔۔۔۔۔۔ یہ ایک مجرم ہے۔ رام چندر اور امر لال دونوں مل کر منصوبے بناتے ہیں۔ امر لال تمہارے خواب دیکھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ یہ جو تم نے ٹیلی فون پر ایک لڑکی کی آواز سنی تھی وہ ڈولی تھی۔۔۔۔۔۔ پدمنی اب تم بتاؤ اور فیصلہ کرو کہ انہیں کیا سزا دی جائے۔۔۔۔۔۔

”آپ نے ان کی ساری گفتگو ٹیپ کر لی ہے۔“ پدمنی بولی۔ ”انہیں قانون کے حوالے کر دیں۔ اس ٹیپ میں ان کا اقرار جرم ہے۔“

”قانون کے حوالے کرنے سے انہیں زیادہ سے زیادہ چھ سات مہینے کی سزا ہوگی۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”سزا ایسی ہونی چاہئے کہ ساری زندگی یاد رکھیں۔“

”اگر انہیں لمبی سزا ہوئی تو وہ پھر سے جرائم کرتے پھریں گے۔“

پھر آپ نے کیا سوچا کہ انہیں کیا سزا ہونی چاہئے۔۔۔۔۔۔؟“ پدمنی نے پوچھا۔

”میں ان تمام کرداروں کو آنکھوں، ہاتھ پیروں سے معذور کئے دیتی ہوں تاکہ یہ کسی جرم کے قابل نہ رہیں۔۔۔۔۔۔ بلکہ بھیک مانگ کر گزارہ کرتے رہیں۔۔۔۔۔۔ یہ سزا ان کے لئے اس لئے بھی ضروری ہے کہ ان سب نے بہت سارے بے بسائے گھر اجاڑے ہیں۔ خوشیوں کو تاخت و تاراج کیا ہے۔ ان گھروں کو کچھ اذیت اور تباہی سے دوچار کیا۔ گھر ہی نہیں ان کا مستقبل بھی تباہ و برباد ہو گیا۔۔۔۔۔۔ سہاگ سے محروم۔۔۔۔۔۔ بچوں کا سایہ تک چھین لیا۔ لہذا ان کی سزا بھی ایسی ہی اذیت ناک اور سفاکانہ ہونا چاہئے۔“

”تم کیا بھگوان ہو جو ہمیں سزا دوگی۔۔۔۔۔۔؟“ سرسوتی ماسی نے زہر ناک لہجے میں کہا۔ ”ہم نے جو کچھ کیا ہم نے اپنے فائدے کے لئے کیا۔۔۔۔۔۔ بہتر ہے تم اپنی بکواس بند کرو اور یہاں سے دھڑ ہو جاؤ۔ ورنہ زندہ واپس نہ جاسکو گی؟“

”نہ جانے کی صورت میں تم کیا بگاڑ لو گی۔۔۔۔۔۔؟“ چندرا دیوی زیر لب مسکرائی۔

”تم ان جادوگر نیوں کو دیکھ رہی ہو جو ایک سے ایک بڑھ کر ہیں؟“ سرسوتی ماسی بولی۔ ”وہ تمہیں بھسم کر دیں گی؟“

”بھسم۔۔۔۔۔۔؟“ چندرا دیوی بے اختیار مسکرا دی۔ ”تمہاری یہ جادوگر نیاں نوٹو کو سر نہ کر سکیں اور نہ ہی پتھروں سے انہیں سابقہ حالت میں لاسکیں۔ یہ مجھے کیا خاک بھسم کریں گی؟ پہلے یہ اپنی لمہ منائیں۔“

”آپ انہیں کیا سزا دیں گی؟“ پدمنی نے پوچھا۔ ”یہ کیمنی اور نمک حرام سرسوتی ماسی اور اس کا دھاکیسے اکثر کہ باتیں کر رہے ہیں۔ ذرا بھی شرم، غیرت اور ندامت نہیں۔۔۔۔۔۔ یہ جادوگر نیاں بھی کتنی احمق ہیں۔ ان کے جرائم کی فہرست کتنی طویل ہے۔ آپ نے انہیں سزا دینے کے لئے کیا سوچا۔۔۔۔۔۔؟“ آپ کیمنی اور کس طرح کی سزا دیں گی؟“

”میں چاہوں تو ان سب کو ایک لمحے میں بھسم کر دوں۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”لیکن میں انہیں سزائے موت دینا نہیں چاہتی۔۔۔۔۔۔ اس لئے کہ یہ چند لمحوں میں موت کے منہ میں چلی جائیں گی۔ میں انہیں ایسی سزا دوں گی کہ یہ ساری زندگی اور آخری سانس تک دکھ، اذیت اور تکلیف اٹھاتی رہیں۔ سرسوتی ماسی کو اندھی، لولی اور لنگڑی۔۔۔۔۔۔ اس کے بیٹے رام چندر کو اپانچ، ان جادوگر نیوں کا دل و دماغ ایسا معطل کر دوں گی کہ یہ اپنا سارا جادو بھول جائیں گی اور انہیں سدا کا بیمار، کمزور اور لاغر۔۔۔۔۔۔ کسی کو دل کا مریض۔۔۔۔۔۔ کسی کو سانس کا۔۔۔۔۔۔ کسی کو جوڑوں کے درد کا۔۔۔۔۔۔ اور پھر اس ڈولی کو اتنی ہلکہ کہ وہ کسی چڑیل کی مانند دکھائی دے تاکہ اس کی شادی نہ ہو سکے۔۔۔۔۔۔ اور پھر امر لال جس نے کلی عورتوں کی عزت اور ان کی دولت بھی شقاوت سے لوٹی یہ گھنٹوں تک معذور ہو جائے گا۔ چلنے کے قابل نہ رہے گا بلکہ اپنے ہاتھوں سے پیروں کا کام لے گا۔ گھسیٹ گھسیٹ کر چلے گا۔۔۔۔۔۔ یہ مہرت ناک سزا۔۔۔۔۔۔ یہ ساری ساری رات تڑپ تڑپ کر موت انہیں نصیب نہ ہوگی۔“

”یہ گیدڑ بھبکیاں ہیں ماں!“ رام چندر نے اپنی ماں کو دلاسا دیا۔ ”تم اس کے رعب میں نہ آؤ۔ ہمارا ہال تک بیکار نہ ہوگا۔“

”یہ سچ کہہ رہی ہے۔“ قلنی جادوگر نی نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ”کیا تم نے ابھی اس کے جادو کا کمال نہیں دیکھا؟ اس نے پتھروں کا انگارے بنا دیئے۔۔۔۔۔۔ تم دونوں کے ہاتھوں میں چاقو سلنے لئے بن گئے؟“

”پدمنی۔۔۔۔۔۔!“ چندرا دیوی بولی۔ ”تم اور شاردا مل کر نوٹوں کی گڈیاں تھیلے میں ڈال دو۔۔۔۔۔۔“ جب پدمنی اور شاردا نوٹوں کی گڈیاں تھیلے میں ڈالنے لگیں۔ رام چندر اور امر لال نے انہیں روکنے کے لئے آگے بڑھنا چاہا تو ان دونوں کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ پتھر کے ہو گئے ہیں۔ حرکت کرنا تو درکنار جنبش تک کرنا ان کے اختیار میں نہیں رہا۔ ان کی ساری طاقت اور توانائی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ دھرم وہ بلکہ سب کے سب پتھروں کے مجسمے بن گئے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ بول اور سن سکتے تھے لیکن حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ ان میں زندگی تھی۔

”تم۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔ تم کون ہو؟“ راج کماری اپنے آپ کو بے بس پا کر ہکلائی۔ وہ پھٹی پھٹی لہروں سے چندرا دیوی کو دیکھنے لگی۔ ”میں نے کبھی تم سے بڑی جادوگر نی نہیں دیکھی؟“

☆.....☆.....☆

وہ ایک نہایت حسین و جمیل عورت تھی۔ اس کی عمر چالیس برس کی ہوگی۔ چوں کہ وہ قد آدھری تھی اس لئے اس کی جسمانی کشش میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا اور نشیب و فراز میں بڑی رعنائیاں تھیں۔

200

چوں کہ وہ چہرے اور تناسب جسم کی تھی اس لئے اس کی عمر پچیس، چھپیس برس کی لگتی تھی۔ اس کے بال بے حد لمبے لمبے چمک دار اور سیاہ تھے۔ اس کے چہرے کے نقش و نگار تیکھے تیکھے اور بے اختیار دل میں اتر جانے والے تھے۔ آنکھیں بھی بہت بڑی بڑی، خوب صورت اور بادلوں کی طرح سیاہ تھیں۔ وہ شعلہ جسم تھی۔ اس کے بدن میں ایسی بجلیاں بھری تھیں۔

وہ اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے ایک نفیس، شائستہ اور متوسط گھرانے کی لگ ہی تھی۔ چندرا دیوی نے اس کا ذہن پڑھ لیا تھا۔ وہ اس عورت سے متعارف ہو چکی تھی۔ لیکن وہ اس پر اور اپنی سہیلی پر اس بات کو آشکار کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی صرف دو ایک سہیلیوں کے علم میں یہ بات تھی کہ وہ کس صلاحیت کی مالک ہے۔ ہر پر اسرار علوم کی ماہر ہے۔ اسے جو صلاحیت ودیعت کی گئی ہے وہ ہر کسی کو بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے مشن پر خاموشی سے عمل پیرا تھی۔

اس عورت نے چند لمحوں میں خود پر قابو پالیا اور اس کے سینے میں سانسوں کا جو زیرو بم تھا وہ اعتدال پر آیا تو اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی چاندی پیشانی عرق آلود تھی۔ اس نے ساڑی کا پلو اٹھا کر سینے اور شانے پر درست کیا۔ اس نے اب تک بستر کی اور ان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کی مرمیں بائیں سڈول، گداز اور اعلیٰ تھیں۔ ہاتھ بھی بہت ہی خوب صورت تھے۔ اس کے بدن میں ایک ایسا گداز تھا کہ جس نے اسے دلکش اور جاذبیت سے بھر پور بنا دیا تھا۔ اس کی نگاہ جیسے ہی ان دونوں پر پڑی وہ ایک دم سے چونکی اور پھر اس کے چہرے پر ندامت کی سرخی پھیل گئی۔ اس نے خجالت کے انداز سے ان کی طرف بڑھ کر کہا۔ ”معاف کیجئے گا۔۔۔۔۔ میں کمرہ خالی سمجھ کر آ گئی تھی۔“

”چلئے۔۔۔۔۔ آپ کو معاف کر دیا۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”آپ خوف اور سراسیمگی کی حالت میں کمرے میں کیوں تھیں۔۔۔۔۔ جب کہ یہ اسپتال ہے۔۔۔۔۔ کیا آپ مریضہ اور اسپتال میں داخل ہیں۔۔۔۔۔ انجکشن کے خوف سے تو بھاگ نہیں نکلیں اپنے کمرے سے۔۔۔۔۔؟“

”جی نہیں۔۔۔۔۔“ اس نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔ ”نہ تو میں مریضہ ہوں اور نہ ہی علاج کے لئے اسپتال میں داخل ہوں اور نہ ہی انجکشن کے خوف سے بھاگ کر اس کمرے میں پناہ لی ہے۔۔۔۔۔ اصل بات یہ ہے کہ کچھ بد معاش میرے تعاقب میں تھے۔ میں نے یہ جو اسپتال دیکھا تو اس میں گھس آئی۔۔۔۔۔ پھر ایجنٹس وارڈ کی طرف آئی اور اس کمرے میں پناہ کے لئے داخل ہو گئی۔“

رات کے اس سے ایک جوان اور حسین عورت کو اکیلی نہیں نکلتا چاہئے۔ ”چندرا دیوی کی سہیلی نے کہا۔ ”یہ ممبئی شہر ہے۔ کوئی سا بھی شہر کیوں نہ ہو۔ ہر شہر میں بد معاش اور عورتوں کے شکاری راتوں کو گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ بہت ہی حسین ہیں۔ اس لئے بھڑپوں کے منہ میں

رال بھر جانا قدرتی بات ہے۔ آخر ایسی کیا ضرورت آن پڑی تھی کہ جو آپ گھر سے اکیلی نکلیں۔ اُنکدہ آپ ایسی حماقت ہرگز ہرگز نہ کریں۔“

”یہ صرف دن پر ہی منحصر نہیں ہے۔“ عورت بولی۔ ”دن میں بھی شکاری اپنے اپنے جال لئے پھرتے ہیں۔۔۔۔۔ میں کیا بتاؤں؟ میں ایک بہت بڑی مصیبت سے نکلی ہوں۔ اس مصیبت سے بچنے کے لئے۔۔۔۔۔“

اس عورت کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ کمرے میں نرس داخل ہوئی۔ اس نے چندرا دیوی اور اس عورت سے کہا۔

”پلیز! آپ لوگ مریضہ کو سونے اور آرام کرنے دیں۔ ملاقاتیوں کو اتنی دیر تک رہنے کی اجازت نہیں۔“

چندرا دیوی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنی سہیلی سے ہاتھ ملایا اور کہا۔

”میں انہیں ساتھ لے جا رہی ہوں۔۔۔۔۔ دیکھتی ہوں کہ ان کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

پھر وہ اس عورت کو ساتھ لے کر کمرے سے نکلی اور اسپتال کے کینٹین کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔

”آپ قطعی پریشان اور ہراساں نہ ہوں۔ میں اپنے تئیں پوری کوشش کروں گی کہ آپ کو اس مصیبت سے نجات دلادوں۔“

”آپ مجھے اس وقت کہاں لے جا رہی ہیں۔۔۔۔۔؟“ عورت نے چاروں طرف متوحش نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کینٹین میں۔“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔ ”ہم وہاں بیٹھ کر اطمینان سے باتیں کریں گے۔ میں آپ کی مصیبت کی کہانی سننا چاہتی ہوں۔ اس سے بہتر اور پرسکون جگہ کوئی نہیں ہے۔ وہاں چل کر بیٹھنے میں کوئی حرج تو نہیں۔۔۔۔۔؟“

”وہ بد معاش جو میرے تعاقب میں ہیں وہاں آ گئے تو۔۔۔۔۔؟“ عورت نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

”کیا ان بد معاشوں نے آپ کو اسپتال کی عمارت میں گھستے دیکھا ہے؟“ چندرا دیوی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”شاید نہیں۔۔۔۔۔“ عورت نے بتایا۔ ”میں انہیں جل دے کر اس اسپتال کی عمارت میں داخل ہو گئی۔ سیدھا اس کمرے میں بدحواسی کی حالت میں داخل ہو گئی۔ میں یہ سمجھی کہ یہ کمرہ خالی ہے۔۔۔۔۔ لیکن وہ میری تلاش میں آ سکتے ہیں۔ کیوں کہ کوئی اور ایسی جگہ نہیں جو میں اس میں داخل ہو سکتی

ہوں..... وہ اگر آگئے تو بڑی مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔“

”یہ بہت بڑا ہسپتال ہے اور یہاں بڑی سخت سیکورٹی بھی ہے۔“ چندرادپوی نے اسے دلاسا دیا۔ ”اگر وہ یہاں آ بھی گئے تو آپ کا بال تک بیک نہیں کر سکتے اور پھر میں یہاں موجود ہوں۔ آپ کو ان لوگوں کے ہتھے چڑھنے نہ دوں گی۔ لہذا آپ کسی بات کی چٹانہ کریں۔ کینٹین میں بیٹھ کر سکون اور اطمینان سے اپنی پٹا سائیں۔“

چندرادپوی کینٹین میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ کچھ میزوں پر مرد اور عورتیں موجود تھیں۔ وہ اس عورت کو لے کر ایک ایسے گوشے میں آ بیٹھی جس میں آس پاس کی تمام میزیں خالی پڑی تھیں۔ ویٹرس ٹرے میں دو گلاس پانی لے کر آئی تو چندرادپوی نے اس سے کہا کہ پہلے وہ سینڈوچز لے جائے۔ بعد میں کافی..... ویٹرس چلی گئی تو اس عورت نے پانی کا گلاس اٹھا کر منہ سے لگایا اور ایک ہی سانس میں غٹا غٹ پی گئی۔ وہ بہت پیاسی ہو رہی تھی۔ پانی پیتے ہی اس کے چہرے پر سکون اور طمانیت سی آ گئی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی۔

”اب آپ اپنی پٹا بغیر کسی خوف و جھک کے سنائیں۔“ چندرادپوی نے کہا۔ ”یہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں ہے۔ گوکہ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ لیکن ہم دونوں عورت ہونے کے ناتے دکھ درد اور انجانے رشتے سے گہرا سبند رکھتے ہیں۔“

”آپ کی اس ہمدردی اور نچیت اور خلوص کا شکریہ کن الفاظ میں کروں؟“ وہ عورت بولی۔ ”مصیبت کی کھڑی میں اپنے بھی کام نہیں آتے ہیں۔ میں پہلے آپ کو اپنا تعارف کرا دوں۔“ میرا نام شیلہ ہے۔ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں۔ میرے دو بچے ہیں۔ ان میں ایک لڑکی اور لڑکا ہے۔ لڑکی سولہ برس کی اور لڑکا بارہ برس کی عمر کا ہے۔ میرے پتی ایک نجی دفتر میں ملازمت کرتے ہیں۔ میں اپنے پتی کے کارن آج اس مصیبت میں پھنسی ہوں..... میرے پتی ایک جواری ہیں۔ وہ برس پہلے نہیں جوا کھیلنے کی لت پڑی۔ وہ ہفتہ کی رات میرے ساتھ اور اتوار کا دن اپنے جواری دوستوں کے ساتھ جوا کھیتے ہوئے گزارتے ہیں۔ انہیں اس سے پہلے جوا کھیلنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ لیکن وہ تاش کے تمام کھیلوں میں ماہر ہیں۔ ان کے دوستوں نے انہیں جب دو ایک بار جوا کھلایا تو انہیں بھی شوق چڑھ آیا۔ وہ ہر ہفتہ ان کے ساتھ بیٹھ کر جوا کھیلنے لگے۔ چھ سات ماہ تک ایسا ہوتا رہا کہ وہ ہر ہفتہ سات سو، ہزار اور کبھی کبھی دو تین ہزار روپے بھی جیت کر اٹھتے تھے۔ میں انہیں منع کرتی تھی کہ وہ جوا کھیلنے سے باز رہیں۔ یہ بڑی خواست کا کھیل ہے۔ لیکن وہ مانعے نہیں تھے۔ ان کے چار دوستوں میں ایک دوست کی کپڑے کی دکان ہے۔ لیکن وہ گاہکوں کے ساتھ دھوکے بازی کر کے انہیں لوٹتا ہے..... دوسرا ایک بہت بڑا جعل ساز ہے۔ جعلی کرنسی، جعلی پاسپورٹ اور جعلی ویزا

کا کام کرتا ہے..... تیسرا سنا رہے۔ وہ بھی ایک نمبر کا فراڈی ہے۔ اس کی ایک چھوٹی سی دکان بھنڈی بازار میں ہے۔ ایک نمبری ٹھگ ہے۔ سونے میں خوب ملاوٹ کر کے کھاتا ہے..... چوتھا جو ہے وہ پروفیسر رام ناتھ ہے..... نجومی اور سفلی علوم کا ماہر ہے..... وہ مجبوری، احساس محرومی اور بچوں کی لڑائیوں کی منہ عورتوں کو سبز باغ دکھا کر ان کی عزت سے کھیلتا ہے۔ وہ لڑکیوں کو بلیک میل کر کے نہ صرف خود فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ جوئے باز دوستوں کو بھی پیش کرتا ہے۔ میرے پتی بھی نہ جانے کتنی مرتبہ کئی لڑکیوں سے منہ کالا کر چکے ہیں۔

پہلے میرے ہاں مہینے میں دو مرتبہ جوئے بازوں کی محفل بھتی تھی۔ میں اپنے بچوں کو نانی کے ہاں بھیج دیتی تھی۔ اس لئے کہ وہ دیکھنے میں بلکہ اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے جرائم پیش دکھائی دیتے تھے۔ کھیل کے ساتھ شراب و کباب کا دور بھی چلتا تھا۔ مجھے ان کے سامنے شراب اور ناشتا لے جانا پڑتا تھا۔ ان کے ادباش دوست مجھے بھوکے اور نیدی نظروں سے گھورتے اور میرے حسن اور جسمانی نشیب و فراز کی کھل کر تعریف کرتے..... بھنڈی آہیں بھرتے..... میرے پتی اس لئے ان کی سو قیادہ باتوں کا ذرا برابر بھی برا نہیں مناتے تھے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ لڑکیوں کے ساتھ دل بہلاتے تھے..... ایک اور بات یہ بھی تھی کہ جو جعل ساز تھا اس نے ایک مرتبہ میرے پتی سے بڑی رقم ہارنے کے بعد اپنی بیوی کو دواؤ پر لگا دیا۔ وہ ہار گیا تو اس نے تین راتوں کے لئے میرے پتی کے سپرد کر دیا۔ میرے پتی کسی ہوٹل میں اپنی رقم اس کے ساتھ گزار کر وصول کرتے رہے۔ یہ بڑی شرمناک بات تھی۔ یہ باتیں شرم سے ڈوب مرنے کی تھیں۔

ان لوگوں کے درمیان کھیل کھیل کے دوران ایسی فحش، لغو اور بے ہودہ گفتگو کرتے تھے کہ میں سن کر شرم سے پانی پانی ہو جاتی تھی۔ میں ان کی باتوں کو سن کر سوچتی کاش! مجھے پستول مل جائے۔ میں اسے اپنی پتی سمیت ان کو گولی مار دوں..... میں ان کی یہ بے ہودہ گفتگو دروازے کی اوٹ سے سنتی تھی..... میں نے کئی بار اپنے پتی سے کہا کہ آپ لوگ کس قسم کی گفتگو ان سوروں سے کرتے ہیں..... میرے پتی نے ہر بار جواب دیا کہ وہ میرے برسوں پرانے یار ہیں۔ ان کے ساتھ ہنسی مذاق ہوتا رہتا ہے۔ ہم آپس میں بے انتہا بے تکلف ہیں۔ میں نے گرہ لگائی کہ بے غیرت اور بے شرم ہیں۔ ان سے تو ایک طوائف لاکھ درجے بہتر ہوتی ہے۔

میں نے اپنے پتی سے یہ کبھی نہیں پوچھا کہ وہ کیسا بے شرم، بے غیرت اور بے ضمیر شخص ہے جس نے بیوی کو دواؤ پر لگا دیا اور آپ نے ساتھ کے ساتھ تین راتیں بسر کیں اور اس حرام زاوے نے یہ بھی پوچھا کہ اس کی بیوی نے ہر طرح سے خوش کیا کہ نہیں..... ایک روز ایسا ہوا کہ پروفیسر نے میرے پتی کو نال میں سے رقم نکال کر شراب کی بوتل لانے کے لئے رقم دی۔ آپ جانتی ہیں نال کیا

ہوتی ہے؟ جب کوئی بازی جیتتا ہے تو رقم جو داؤ پر لگائی جاتی ہے اس میں سے سو روپے نکالے جاتے ہیں ہر بازی میں..... یہ لوگ فلیش کھیل کھیلتے تھے۔ میرے پتی جب شراب کی بوتل لانے گئے ہوئے تھے تب پروفیسر اندر آیا۔ اس وقت میں بیڈروم میں تھی۔ اس نے داخل ہوتے ہی مجھے دبوچا لیا اس نے میرے ساتھ نامناسب اور غیر شائستہ من مانیوں کیس کہ میں کسی نہ کسی طرح اس کی گرفت سے نکلی۔ سبزی کاٹنے کی چھری اٹھائی۔ وہ کسی ناگ کی طرح میری طرف بڑھا تو میں نے ہڈیاں لپھ میں کہا۔

”ذلیل..... کمینے..... سور..... اگر تم نے مجھے ہاتھ لگانے کی کوشش کی تو یہ چاقو تمہارے پیٹ میں گھسیڑ دوں گی۔“

”شیلہ جانی.....!“ اس نے کہا تو اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔ ”تمہارا پتی میرے بیس ہزار کا مقروض ہے۔ لہذا میں تمہارے ساتھ من مانی کیا حد سے تجاوز کا حق بھی رکھتا ہوں۔ اس وقت تک من مانیوں کر سکتا ہوں جب تک قرض ادا نہیں ہو جاتا۔“

”قرض اس سے وصول کرو۔“ میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں تمہاری مقروض نہیں ہوں۔ قرض وہ ادا کرے گا میں نہیں.....“

”ہمارے درمیان یہ طے پایا ہے اور ہمیشہ سے اصول رہا ہے کہ جب کوئی مقروض ہو جاتا ہے تو اسے حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ دو ماہ تک قرض کی ادائیگی کا انتظار کرے۔ جب تک قرض ادا نہیں ہوتا اس وقت تک وہ اپنے مقروض کی بیوی کے ساتھ من مانیوں کر سکتا ہے۔ میں نے کوئی غلط حرکت نہیں کی..... یہ میں نے اپنا حق استعمال کیا..... تمہارا پتی شراب لانے کے بہانے اس لئے گیا ہے کہ میں تم سے اس کے آنے تک من مانیوں کر لوں..... لہذا یہ چھری پھینکو اور میرے بازوؤں میں جاؤ۔“

”میں کہتی ہوں کہ دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے.....“ میں نے اس کی نظروں کے سامنے چھری لہرائی۔ ورنہ میں تمہیں قتل کروں گی..... تم میری بات کو خالی خولی دھمکی نہ سمجھنا.....“

اس لمحے اس نے مجھ پر جانے کیا پڑھ کر پھونکا کہ میرے ہاتھ سے چاقو نکل کر فرش پر گر گیا۔ پھر اس نے میری آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر پینا ناز کر دیا۔ جب وہ میری طرف بڑھا تو مجھ میں نہ تو اتنی سکت تھی کہ اور نہ ہمت تھی کہ اسے روکوں..... پھر اتفاق سے ایسا ہوا کہ اطلاعی کھنٹی بجی۔ اس کے ایک ساتھی نے آ کر کہا۔ ”پروفیسر! آ جاؤ۔ اس کا پتی آ گیا ہے۔“

وہ چلا گیا تو میں بیڈروم کا دروازہ بند کر کے تھوڑی دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ کیوں کہ میرے ذہن میں ایک ایسی تدبیر آئی تھی کہ میں آئندہ اس محفل کو

اپنے ہاں جتنے نہ دوں..... میں نے پروفیسر کی نازیبا حرکت کا پتی سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ جب وہ سب چلے گئے تو میرے پتی نے کہا۔ ”آج تمہارا موڈ بہت خراب ہے؟ کیا بات ہے؟“

”بات جو بھی ہے ایک بات کان کھول کر سن لو۔“ میں پھنکاری۔ ”آئندہ سے اس گھر میں جوئے کی بیٹھک نہیں ہوگی؟“

”وہ کس لئے.....؟“ پتی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ انجان بن کر کہہ رہا ہے۔ شاید اس کے علم میں پروفیسر کی حرکت آگئی تھی..... جب میں ان سب کے لئے شراب لے گئی تب پروفیسر نے کہا تھا کہ ”یار! ابھائی! بنگالی رس گلہ ہے۔“

”اس لئے کہ مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں کہ گھر میں جوئے کی بیٹھک ہو۔“ میں نے تیز دند لہجے میں کہا۔ ”اڑوس پڑوس میں ہماری کوئی عزت نہیں رہی..... اور پھر اس گھر میں ایک نوجوان لڑکی بھی رہتی ہے۔“

”تمہیں پسند ہو یا نا پسند ہو..... میری بلا سے۔“ میرے پتی نے تڑ سے جواب دیا۔ ”ہر ہفتہ سات آٹھ سو سے بارہ سو روپے کی مال ملتی ہے..... دوسری بات یہ ہے کہ یہ میرا گھر ہے۔ میری مرضی..... یہاں میں جو چاہے کروں.....“

”یہ گھر صرف آپ کا نہیں بلکہ میرا اور ہمارے بچوں کا بھی ہے۔“ میں نے برہمی سے کہا۔ ”اگر آئندہ بیٹھک ہوئی تو میں تیزاب نہ صرف ان کے چہروں پر بلکہ آپ کے چہرے پر بھی پھینک دوں گی۔ میری بلا سے جو ہو گا دیکھ لوں گی۔“

میری یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ ان لوگوں نے ایک فلیٹ اس مقصد کے لئے کرایہ پر لے لیا۔ جو نال نکلتی تھی اس سے کرایہ ادا کیا جانے لگا۔ نہ صرف شراب بلکہ شباب سے بھی دل بہلایا جاتا تھا..... برائی کے بیج سے جو درخت پروان چڑھتا ہے اس کی ہر شاخ برائی کے پھل سے لدی ہوتی ہے۔ جوئے، شراب اور شباب نے انہیں غلط راستے پر ڈال دیا ہے۔

”کوئی تین ماہ پہلے میرے پتی نے آ کر مجھ سے کہا۔ ”گھر میں شادی کے جزیورات ہیں وہ مجھے دے دو۔“

”وہ کس لئے.....؟“ میں نے پوچھا۔ ”ان زیورات کی کیا ضرورت آن پڑی ہے؟“

”اس لئے کہ انہیں بیچ کے قرض ادا کرنا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے رکی انداز سے جواب دیا۔

”کون سا قرض.....؟ کیا قرض.....؟“ میں نے انجان بن کر سوال کیا۔ میں ان کی بات کی تہ میں پہنچی گئی تھی۔

”تین ماہ سے میری قسمت ساتھ نہیں دے رہی ہے۔“ وہ پریشانی کے علام میں کہنے لگے۔

”زیورات بیچنے سے کتنی رقم آئے گی.....؟“ میں نے پوچھا۔ ”آپ نے سوچا اور حساب لگایا ہے؟“

”میں نے اس خوف و خدشہ سے کہیں یہ زیورات کسی دن جوئے کی نذر نہ ہو جائیں آپ کی ماتاجی کے پاس رکھوا دیے ہیں۔ یہ زیورات امانت ہیں۔ بیٹی کی شادی کے لئے۔ آپ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں..... اگر ان زیورات کی ایسی ہی ضرورت ہے تو اپنی ماتاجی سے جا کر مانگ لیں..... لیکن یہ بات یاد رکھیں کہ یہ سارے زیورات میں جہیز میں لائی ہوں۔ یہ میری ملکیت ہیں۔ آپ لوگوں کی طرف سے ایک تولہ کا زیور بھی نہیں بنا ہے.....“

اس بات کو ایک ماہ بیت گیا۔ آج رات نوبے میرے پتی کا فون آیا کہ میں گولڈن اپارٹمنٹ کی پانچ منزل پر اپارٹمنٹ نمبر 505 پر پہنچوں۔ یہ بلڈنگ جے جے اسپتال کے عقبی گلی میں واقع ہے۔ میرے ایک دوست شیم اور اس کی بیوی نرملا امریکہ سے آئے ہوئے ہیں۔ وہ تمہیں بہت یاد کر رہے ہیں..... رات کے کھانے پر تمہارا انتظار ہو رہا ہے۔ ان سے ایک گھنٹہ قبل اچانک ملاقات ہوئی ہے۔

208

کیا دیکھتی ہوں کہ میرے پتی کے چاروں جواہری دوست کمرے میں موجود ہیں۔ میرے پتی اگلے ہیں۔ ایک ہارے ہوئے جواہری کی طرح..... اس کمرے میں کھانے کی میز بھی جس کے گرد چھ لہاں تھیں۔ مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ دوسری کرسیوں پر پردیسر اور میرے پتی بھی بیٹھ گئے۔ ایسرجو میرے مقابل بیٹھا۔ وہ میرے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر کے کہنے لگا۔

”اب کو یقین نہ آئے تو آپ کے بچی سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان سے پوچھ لیں.....“

اتنا کہہ کر پروفیسر نے میز پر رکھی ہوئی فائل اٹھا کر میرے سامنے رکھ دی۔ اسے کھول کر اس میں لگے ہوئے قرض نامے دکھانے لگا۔ پھر اس نے فائل بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ پھر اس نے کہا: ”اب آپ اپنے بچی سے بات کریں۔“

”میرے بے حس، بے غیرت اور ذلیل پتی نے اپنی گردن اثبات میں ہلائی۔“ پھر وہ بے فری سے بولا۔

”کیا تمہیں اس بات پر شرم اور غیرت نہیں آئے گی کہ تمہاری بیوی کسی طوائف کی مانند ان کے استروں کی زینت بنتی رہے؟“ میں نے تھک کر کہا۔ ”جب کہ میں ایک بیوی، عورت اور ماں بھی ہوں۔“

معا میری نگاہ بیرونی دروازے پر پڑی۔ پروفیسر نے جب میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے لمحے کے لئے

دبو چا تھا تب اس نے ٹھیک سے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ دفعتاً میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے..... میں تیار ہوں۔“ میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں سب سے پہلے کس کی مہمان بنوں گی.....“

”پروفیسر کی.....“ میرے بچے نے جواب دیا۔

”میں نے چشم زدن میں اپنی کرسی اٹھائی اور میز پر بھینکی۔ یہ لوگ اس اچانک اور غیر متوقع افتاد کے لئے تیار نہ تھے۔ میں فوراً ہی دروازے کی طرف لپکی۔ باہر نکل کر دروازہ بند کیا اور باہر سے کنڈی لگادی۔ پھر لفٹ کا انتظار نہ کیا۔ سیڑھیاں تیزی سے اترتی ہوئی نیچے آئی۔ گیٹ پر گارڈ کھڑا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے سے سکون سے گزرتی ہوئی سڑک پر آئی۔ پھر میں نے سڑک پار کی۔ میں نے دیکھا کہ پروفیسر کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے گارڈ کو بلارہا ہے..... پھر میں خوف اور سراسیمگی سے بھاگی ہوئی اسپتال میں کھس گئی۔“

شیلہ کی باتوں کے دوران سینڈوچز کا دور چلا۔ شیلہ نے داستان ختم کی تو دینرس کافی لے آئی۔ جب ہم دونوں کافی کی چسکیاں لے رہے تھے تب اس کے بچے کے چاروں دوست کینٹین میں داخل ہوئے۔ وہ شیلہ کو چندرا دیوی کے ساتھ دیکھ کر ٹھٹک کے رک گئے۔ پھر پروفیسر اچھا ساتھیوں سے کچھ کہہ کر ان کی میز پر آیا۔

”بھابھی.....“ اس نے چندرا دیوی کو نظر انداز کر کے شیلہ سے کہا۔ ”آپ بہتر ہے شرافت سے میرے ساتھ چلیں۔ ورنہ.....“

”ورنہ کیا.....؟“ شیلہ نے بے خوفی سے پوچھا۔

”ورنہ یہ کہ آپ کی بیٹی کو ہم لے جائیں گے.....“ پروفیسر نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

شیلہ کا چہرہ ایک دم سفید پڑ گیا۔ اس کے جسم میں ابھو جسنے لگا۔ چندرا دیوی نے پروفیسر سے کہا۔

”اس کی نوبت نہیں آئے گی..... شام کمار نے جو جوئے میں رقم ہاری ہے وہ ادا کر دی جائے گی اور آپ میں سے کوئی بھی شیلہ کو ہاتھ نہیں لگائے گا..... کیا آپ کو یہ شرط منظور ہے؟“

”منظور ہے۔“ پروفیسر نے کہا۔ ”قرض لاکھوں میں ہے۔ ہمیں صرف اپنی رقم سے سرکار ہے۔“

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا.....“ چندرا دیوی نے بے اعتنائی سے کہا۔ ”لیکن آپ لوگوں کو

میرے ساتھ جو اکھیلنا ہوگا؟“

”آپ ہمارے ساتھ جو اکھیلیں گی.....؟“ پروفیسر نے خیرت سے کہا۔ ”کیا آپ کے پاس

ہا کھیلنے کے لئے بڑی رقم ہے؟“

”اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔ پھر اس نے اپنا پرس کھول کر

اسے دکھایا۔ پروفیسر کو اس میں نوٹوں کی گڈیں بھری ہوئی دکھائی دیں۔ وہ خوش ہو گیا۔ ”آپ کو ابھی

ابھی اس وقت کھیلنے کے لئے چلنا ہوگا۔“

”چلیں.....“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”ذرا یہ کافی پی لیں۔“

پروفیسر ہٹ کر اپنے ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔ شیلہ نے کہا۔ ”یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ ان

ہماروں سے جیت سکیں گی..... کیا آپ کو جو اکھیلنا آتا ہے.....؟“

”ہاں.....“ چندرا دیوی نے اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ ”میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ فلیش اور

ری کھیتی ہوں۔ محض تفریح اور وقت گزاری کے لئے..... لیکن میں نے کبھی بڑے اور ماہر جواریوں

کے ساتھ جو نہیں کھیلا۔ یہ پہلا اتفاق ہوگا۔ ان کے ساتھ جو اکھیلنے کے سوا کوئی چارہ نہیں..... اس

لئے کہ آپ کی اور آپ کی جوان بیٹی کی عزت خطرے میں ہے۔“

”اگر آپ رقم ہار گئیں تو پھر میری شامت آ جائے گی۔“ شیلہ نے تشویشناک لہجے میں کہا۔ ”وہ

مجھے بے عزت کئے بغیر جانے نہیں دیں گے۔ کیا معلوم وہ آپ کو نشانہ بنانے کی کوشش کریں.....؟

ان کا کوئی بھروسہ نہیں ہے؟“

”تم بے فکر رہو۔“ چندرا دیوی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”نہ مجھ پر کوئی آج آئے گی نہ

ہم پر..... وہ ذرا ہاتھ لگا کر تو دیکھیں.....؟“

”لیکن وہ چار عدد ہیں اور ہم دو عورتیں.....“ شیلہ نے بے جان سے لہجے میں کہا۔ ”مجھے اپنے

پتی سے رتی برابر بھی توقع نہیں ہے کہ وہ ہماری عزت بچانے کی کوشش کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان

کے قرضوں کی ادائیگی کے لئے اپنی عزت ان بے غیرتوں کے بھینٹ کر دوں تاکہ انہیں قرضوں

سے نجات مل جائے۔ وہ ہلکے ہو جائیں..... ایسے بے غیرت اور بے حس اور بے شرم کے بارے

میں آپ نے سنا ہے؟“

”وہ چار ہوں یا آٹھ ہوں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ چندرا دیوی مسکرا کر بولی۔ ”میں

ملاؤ کرانے کی ماہر ہوں..... اس کے علاوہ میرے پاس ایک کھلونا ٹاپ پستول بھی ہے۔ لوگ

اسے کھلونا سمجھتے ہیں۔ اسے ہر کوئی چلا نہیں سکتا۔ چلانے سے ایک گولی بھی نہیں نکلتی ہے۔ اس میں

سائی لٹرس نصب ہے۔ میں جانتی ہوں کہ اسے کیسے چلایا جاسکتا ہے۔ دیکھنے میں وہ دس بیس روپے کا

پلاسٹک کھلونا معلوم ہوتا ہے..... ایک موقع پر جب میں نے تین بد معاش اسے تانا تھا وہ ہنسنے لگے

تھے..... جب میں نے اسے ان پر استعمال کیا تو خوف و دہشت سے ان کی آنکھیں پٹی کی پٹی رہ گئی

تھیں..... تمہارے بچے جیسے لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے..... جواری اپنی بیوی کو کیا..... بیٹی اور بہن کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات یا پہلی مثال نہیں ہے۔“

اتنا کہہ کر چندرا دیوی نے دیڑر کو بل لانے کا اشارہ کیا۔

پروفیسر نے اپنے ساتھیوں کو جب جا کر یہ بتایا کہ شام کمار کی بیوی اور سہیلی جو اکیلے اور حرام قرض جیت کر اتارنے کے لئے آ رہی ہے وہ ہنس دینے خوش ہو گئے۔ سار نے کہا۔

”یار! اس کی سہیلی تو بھابھی سے بھی کہیں غضب کی ہے..... اب تو ایک ٹکٹ میں دو حمرے ہوں گے۔“ یار یہ تو کسی نایاب، انمول اور بے دارغ ہیرے کی مانند ہے۔ ایسی سندھ جہر میں نے اب تک نہیں دیکھی؟ راتیں بڑی حسین اور نکلیں ہو جائیں گی۔“

”اسے ہر اکرنہ صرف اس کی ساری رقم جیت لینی ہے بلکہ اسے بستر کی زینت بھی بنان

ا ہے۔“ جعل ساز نے کہا۔

”اگر وہ شام کمار کا سارا قرض اتار کر اور جیت کر چلی جاتی ہے تو پھر چڑیا اڑ جائے گی۔“ چوٹے نے کہا۔ ”کیوں کہ میں اسے پھانسا کر دوں گا۔“

”تم فکر نہ کرو.....“ پروفیسر نے اپنے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ جیت جائے۔“

جب شیلہ اور چندرا دیوی ان کے پاس پہنچیں تو وہ کینٹین سے باہر نکلے۔ پارکنگ لاٹ پر چندرا دیوی کی گاڑی کھڑی تھی۔ پھر وہ سب فلیٹ پر پہنچے۔ شیلہ کا پتی ٹی دی کے سامنے بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے ساتھ ایک حسین عورت کو دیکھ کر چوٹا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کون عورت ہے؟..... اس نے کبھی اس عورت کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ اس کی بیوی کی سہیلیوں میں سے نہیں تھی۔

وہ کچھ دیر بعد تاش کی بیٹھک جمانے کھانے کی گول میز پر بیٹھے۔ شام کمار کو یقین نہیں آیا کہ شیلہ کی سہیلی بڑی رقم لے کر جا کھینے آئی ہے تاکہ اس کا قرض اتار سکے۔ اسے لگا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔

”کھیل شروع ہونے سے پہلے میں یہ چاہتی ہوں کہ ہر کوئی اپنی اپنی رقم شوکرے۔“ چندرا دیوی نے خالص جواری کے انداز میں کہا۔ ”کم از کم ہر ایک کے پاس پچاس ہزار روپے ہونے چاہئیں..... میں دس چھترہ ہزار روپوں والے کے ساتھ نہیں کھیلی ہوں۔“

”پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ کے پاس کل کتنی رقم ہے؟“ پروفیسر نے استہزاء سے لہجہ میں کہا۔

چندرا دیوی نے اپنے پرس سے بڑے بڑے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر میز پر رکھ دیں۔

”یہ دو لاکھ ساٹھ ہزار کی رقم ہے۔ آپ میں سے کوئی رقم گن کر دیکھ سکتا ہے؟.....“

”کیا اتنی بڑی رقم جو پرس میں لئے پھر رہی ہیں کہیں ڈاکا مارا ہے..... یا کالی راتوں کی کمائی ہے؟“ سار نے طنز سے لہجہ میں کہا۔

چندرا دیوی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ سار اس کے بائیں ہاتھ پر بیٹھا ہوا تھا۔ چندرا دیوی نے اس کے منہ پر اتنے زور سے ٹھٹھڑ رسید کیا کہ وہ کرسی سمیت الٹ کر فرش پر گر گیا۔ طمانچہ کیا تھا پناہ تھا۔ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ اسے ایسا لگا تھا کہ اس کا گال اس بری طرح جھلس گیا جیسے گرم گرم سلاخ سے داغ دیا گیا ہو۔

اس کے ٹھٹھڑنے سب کو دھلا دیا۔ چندرا دیوی نے بگڑ کر یہی سے کہا۔

”اس حرام زادے کی یہ مجال کہ ایک شریف عورت پر تہمت لگائے..... یہ ہر کسی کو اپنی ماں کی طرح سمجھتا ہے..... اس کی ماں تو طوائف تھی..... وہ بتا سکتی ہے اور نہ اس کی ماں کو..... اس کا باپ کون ہے۔“

”یہ حقیقت تھی اس سے نہ تو سارا نکار کر سکتا تھا اور نہ ہی اس کے ساتھی۔ ایک دم سے سناٹا چھا گیا۔ سار حیران تھا کہ یہ بات اس عورت کے علم میں کیسے ہے..... وہ کراہتا تڑپتا ہوا اٹھا۔ پروفیسر نے اسے اپنی کرسی پر بیٹھا دیا تاکہ مزید بد مزگی نہ ہو۔

پھر سب نے اپنی اپنی رقم غاہر کی..... سار کے پاس ستر ہزار..... جعل ساز کے پاس ساٹھ ہزار..... تیسرے کے پاس پچپن ہزار..... اور پروفیسر کے پاس ایک لاکھ بیس ہزار روپے تھے۔

قرض ناموں کی جو فائل تھی اس میں وہ تمام قرض نامے تھے جو شام کمار نے کھیل کے دوران لئے تھے۔ ان پر شام کمار کے دستخط تھے۔ یہ قرض نامے شامپ بھیجے پر تھے تاکہ قانونی کارروائی بھی کیا جاسکے۔ اس کی عبارت میں یہ تحریر تھا کہ وہ بیچہ ضرورت مع سود جو بیس فیصد ہے لے رہا ہے۔ معینہ مدت تک جو تین ماہ کی ہوگی..... تین ماہ میں ادائیگی نہ ہونے کی صورت میں دگنا قرض اور سود ادا کرے گا۔

”پانچ سو روپے سے کم کا بورڈ ہوگا اور نہ چال ہوگی۔“ چندرا دیوی نے ایک جواری کی طرح شرط رکھی۔

”منظور ہے.....“ پروفیسر نے کہا۔ ”بھئی آپ تو بہت بڑی جواری ہیں؟“

”میں آرمی کلب میں کھیلتی رہتی ہوں۔“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔ ”وہاں بورڈ دو ہزار کا اور چال پانچ ہزار سے کم کی نہیں ہوتی ہے۔ میں کلب میں کھیل کر ڈیڑھ لاکھ کی رقم جیت کر آ رہی ہوں۔“

کھیل شروع ہوا۔ ایک گھنٹہ کے دوران چندرا دیوی نے صرف دوسرے ہاڑی جیتی..... پورا دس اور سولہ ہزار کا تھا..... پھر وہ ہار گئی..... ایک لاکھ تک ہار گئی..... پھر اس نے جیتنا شروع کیا..... سب نے پہلے سار کی رقم ادا کر کے قرض نامہ لے کر اس کے پرزے پرزے چندرا دیوی لے کئے..... اس طرح دوسرا اور تیسرے قرضوں کی بھی ادائیگی ہوتی گئی..... آخر میں پروفیسر تھا۔ پروفیسر نے آدھا گھنٹے کی مہلت مانگی کہ وہ کسی دوست کو فون کر کے آرہا ہے۔ فون کرنے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

تب چندرا دیوی نے تینوں کو فلاش اور کنکال کر دیا۔ اب ان کے پاس کوڑی بھی نہیں رہی تھی۔ جمل ساز نے کہا۔

”ہمیں بیس بیس ہزار روپے قرض دیئے جائیں تاکہ ہم کھیل جاری رکھ سکیں۔“
”سوری۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”یہ کھیل کے اصول کے خلاف ہے۔ میں بیس ہزار کیا میں روپے بھی نہیں دوں گی۔“

”لیکن ہم نے تو شام کمار کو قرض دیا تھا۔“ جمل ساز نے کہا۔
”میں تو اس بات کی قائل ہوں اور نہ ہی کھیل میں قرض دیتی ہوں۔“ چندرا دیوی نے کہا۔
”پروفیسر کے آنے تک آپ کھیل چھوڑ کر نہیں جاسکتیں؟“ جمل ساز نے کہا۔ ”شام کمار سب سے زیادہ مقروض اسی کا ہے۔“

”میں جا کہاں رہی ہوں۔“ چندرا دیوی زیر لب مسکرائی۔ ”میں اسے بھی فلاش کئے بغیر نہیں جاؤں گی۔“

ادھر شیلا اور سیام کمار کا خوشی سے برا حال تھا۔ انہیں یہ سب کچھ کوئی سندر سا پسند نہ آ رہا تھا۔ شیلا کو ایک دھڑکا سا لگا ہوا تھا کہ کہیں چندرا دیوی پروفیسر سے ہار نہ جائے۔ تھوڑی دیر بعد پروفیسر آ گیا۔ جب اسے اس بات کا علم ہوا کہ اس کے تینوں ساتھی نہ صرف ہار کر فلاش ہو گئے ہیں ان کے قرض بھی بے بے باق ہو گئے ہیں تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔

میدان میں اب صرف دو کھلاڑی رہ گئے تھے۔ ان کے مابین کھیل شروع ہوا۔ پروفیسر نے جب دو تین بڑی بڑی بازیاں جیتی تو اسے شک ہوا۔ کیوں کہ اس کے پاس جو بڑے بچے تھے وہ پروفیسر کے پاس سے نکلے..... پروفیسر اپنے سفلی علم سے کام لے رہا تھا اس کی ایک موکلہ چہ تبدیل کر رہی تھی۔ فاسفورس کی خوشبو سے چندرا دیوی نے محسوس کر لیا۔

”پھر تین بازیاں ان کی اتنی بڑی بڑی ہوئیں کہ پروفیسر کا قرض نہ صرف ادا ہو گیا بلکہ اپنی ساری رقم سے محروم ہو کر فلاش ہو گیا۔ ہوا یہ تھا کہ پروفیسر کی موکلہ جب چپے بتا دیتی اور تبدیل کر دیتی

چندرا دیوی اس طرح سے تبدیل کرتی کہ موکلہ کو ہوا بھی نہیں لگتی۔ پروفیسر کے لئے یہ امر بڑا حیران کن تھا۔ پریشان کن تھا کہ اس کی موکلہ کیسے دھوکہ کھا رہی ہے۔ جب شو ہوا تو وہ کارڈ نہیں تھے جو موکلہ نے چندرا دیوی کے کارڈ دیکھ کر ان سے بڑے کارڈ گڈی سے نکال کر دیئے تھے..... جب شو کرنے پر اس نے کارڈ چندرا دیوی کے پاس دیکھے تو اپنا سر پیٹ لیا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے۔

چندرا دیوی نے جان لیا تھا کہ ساری بات کیا ہے۔ انہوں نے مل کر شام کمار کے خلاف ایک منصوبہ بنایا تھا کہ اس کی حسین بیوی کے ساتھ وقت گزارا جائے۔ وہ سب کے سب شیلا سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ پروفیسر نے شام کو ہر کھلاڑی کا مقروض بتا دیا تھا۔ وہ جو رقم شام کمار سے جیتتے تھے آپس میں برابر تقسیم کر لیتے تھے..... اور پھر پروفیسر نے شام کمار کو اپنے سفلی علوم سے اتنا بے لبرت، بے شرم اور بے حس بنادیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو داؤ پر لگا بیٹھا تھا۔ ان چاروں نے شام کمار سے کہا تھا کہ اس کی بیوی نے تین تین دن تک چاروں کو خوش کیا تو اس کے تمام قرض معاف کر دیں گے۔ شام کمار کھپتلی بن گیا تھا۔

اب صورت حال بہت مختلف تھی۔ قرض نامے کے ٹکڑے میز پر پکھرے پڑے ہوئے تھے اور وہ ان کا منہ چڑا رہے تھے۔ جب چندرا دیوی، شیلا اور شام کمار جانے کے لئے اٹھے تو پروفیسر نے ٹھکانہ لہجے میں کہا۔

”تم میں سے کوئی بھی یہاں سے نہیں جاسکتا..... صرف ایک شرط پر..... جاسکتے ہو.....“
”وہ کس لئے؟“ چندرا دیوی نے سوال کیا۔ ”تمہاری کیا شرط ہے؟“
”تمہارے پاس جتنی بھی رقم ہے۔ وہ سب یہاں چھوڑ کر جاؤ.....“
”پروفیسر اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... یہ رقم ڈیکتی کر کے نہیں لے جا رہی ہوں بلکہ کھیل میں جیت کر۔“ چندرا دیوی نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”تم روک نہیں سکتے..... ورنہ تم کیا کرو گے؟“

”وہ دیکھو.....“ پروفیسر نے بیرونی دروازے کی طرف دیکھا۔
ان تینوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں دورا کھشش جو سولہ سولہ فٹ کے تھے اور دو چڑیلیں جو انتہائی بھیا تک اور کردہ شکل کی تھیں وہ سب مل کر ان تینوں کو گھور رہے تھے۔
شیلا اور شام نے راکھشوں اور چڑیلوں کے بارے میں صرف سنا اور پڑھا لیکن انہیں کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

کبھی حال پروفیسر کے دوستوں کا بھی تھا۔ انہوں نے بھی کبھی دیکھا نہیں تھا اور نہ ہی وہ

”ہاں..... میرے باپ کی ہے۔“ پروفیسر نے تیز دھندلجے میں جواب دیا۔ ”یہ رقم تم کو کیا تمہارا باپ بھی دے گا..... ہم لوگ تم دونوں کے ساتھ جشن منانا چاہتے ہیں..... اگر تم نے میری بات نہ مانی تو جانتی ہو..... کیا ہوگا؟“

”میرے ہتاجی سوگ باش ہو گئے ہیں۔ تم ان سے پرلوک میں ہی جا کر وصول کر لینا..... رہی بات جشن منانے کی تو یہ ارمان دل سے نکال دو۔ ہاں..... ان چڑیلوں کے ساتھ جشن منا کر دل کے ارمان پورے کر لینا..... تمہاری بات نہ ماننے کی صورت میں کیا ہوگا.....؟“

”یہ راکھشش تمہیں دبوچ کر رقم چھین کر ہماری آغوش میں تمہیں اور شیلہ کو ڈال دیں گے.....“ وہ بولا۔

”ہارنے کے غم و صدمے سے تمہارا دماغ ٹھکانے نہیں رہا ہے..... یہ راکھشش تھوڑی ہیں.....؟ یہ نظر کا دھوکا ہیں..... یہ تو چڑیلیں ہیں..... تم نے اپنے علم سے انہیں راکھشش بنادیا ہے۔“ چندرا دیوی نے ہنس کر کہا۔

پروفیسر اس کی بات سن کر ششدر رہ گیا۔ کیوں کہ چندرا دیوی نے جو کہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔ اس نے دونوں راکھششوں کو متحی خیر اشارہ کیا..... پروفیسر کے ساتھی ان دونوں کی گفتگو سن رہے تھے۔ راکھشش چندرا دیوی کی طرف بڑھے۔ لیکن وہ ایک قدم چلنے کے بعد اس طرح ٹھٹک کر رک گئے جیسے ان کے پیروں میں کسی نادیدہ طاقت نے بیڑیاں ڈال دی ہوں..... پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ دونوں چڑیلیں بن گئے۔

پروفیسر بھونچکا سا ہو گیا۔ اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ یہ عورت کون ہے.....؟ اس کا جادو اس عورت پر کیوں نہیں چل رہا ہے؟ کیا یہ کوئی جادوگرنی ہے.....؟ وہ کوئی عام قسم کا جادوگر نہیں تھا۔ کالا جادو کا ماہر تھا۔ اس کے ماتحت بدرومیں، بھوت پریت اور موکل بھی تھے۔ اب اس کی سمجھ میں آیا تھا کہ کھیل کے دوران اس کا جادو کیوں نہیں چلا؟ اس کی اور اس کے موکلہ کی ہر کوشش ناکام ہوتی رہی۔ نہ صرف اس کے ساتھی بلکہ وہ خود بھی اس طرح ہار تھا کہ نکال ہو گیا تھا۔ اس کے پاس ایک کوڑی بھی نہیں رہی تھی۔

اور پھر ان دونوں راکھششوں کا چڑیلیں بن جانا..... وہ خوف زدہ، پریشان اور ہراساں سا ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ عورت بہت بڑی جادوگرنی ہے جس کے آگے اس کی ایک نہیں چل سکتی۔ اس کا ہر جادو اور منتر ناکارہ ہو گیا ہے۔ اسے اپنی زندگی میں کبھی کسی ایسے جادو اور جادوگرنی سے سابقہ نہیں پڑا تھا جس نے اسے بے لباس اور جادو اور منتر سے محروم کر دیا ہو۔

پروفیسر نے اپنے ساتھیوں سے کہا جو ایک طرف سب کھڑے کانپ رہے تھے۔ چڑیلوں نے

پروفیسر سے اس موضوع پر بات کرتے تھے۔ انہیں آتماؤں اور بھوت پریت اور چڑیلوں سے کمالہ تھا۔ انہیں صرف جو اکیلے اور پروفیسر کے ساتھ مل کر عیاشی کرنے اور رنگ رلیاں منانے سے دلچسپی تھی۔ اس کے ساتھی شکار گھیر کر لاتے تھے۔ پھر وہ لوگ جیت کی رقم آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ کبھی بھی کوئی شکار جیت کر جانیں نہ سکا تھا۔ پروفیسر کا جادو انہیں جیتنے نہیں دیتا تھا۔

شیلہ اور شیمام نے انہیں دیکھا تو خوف و دہشت سے ان کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اوسان غلا ہو گئے۔ وہ بے ہوش ہو کر گر گئے تھے۔

ادھر پروفیسر کے دوستوں کا بھی برا حال تھا۔ ان بلاؤں کو دیکھ کر ان کی گھٹکھی بندھ گئی۔ ان کی رگوں میں خون برف کی طرح جمنے لگا۔ ان کے پیروں میں جان نہ رہی۔ انہوں نے دیوار اور ایک دوسرے کا سہارا نہ لیا ہوتا تو گر پڑتے..... البتہ ان کی حالت بڑی غیر ہو رہی تھی۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کریں۔ ان کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔

”پروفیسر.....!“ ایک ساتھی نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ”یہ کیا بلائیں ہیں اور کیوں آئی ہیں؟“

”مجھے بہت خوف آرہا ہے۔“ دوسرے نے کہا۔ ”میری جان ٹکلی جا رہی ہے۔ ان سے بچاؤ۔ انہیں بھگا دو.....؟“

”تم لوگ خوف زدہ اور پریشان نہ ہو۔“ پروفیسر نے کہا۔ ”یہ بلائیں جیتی ہوئی ساری رقم اس عورت سے وصول کر کے دیں گی۔“

”لیکن یہ عورت ان سے خوف زدہ اور پریشان نہیں ہے۔“ تیسرے نے کہا۔ ”یہ دیکھو..... کیسے اطمینان سے کھڑی ہوئی ہے؟“

پروفیسر نے ابھی تک چندرا دیوی کی طرف غور سے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بھی شیلہ اور شیمام کی طرح بے ہوش ہو جائے گی۔ اس نے اپنے ساتھی کی بات سن کر چندرا دیوی کی طرف دیکھا۔ اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی۔ چندرا دیوی بڑے سکون اور اطمینان سے کھڑی ان بلاؤں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف کی ایک لکیر تک نہ تھی اور نہ ہی اس کی آنکھوں سے دہشت جھانک رہی تھی۔

”تم ساری رقم میز پر رکھ دو اور شیمام کو جانے دو..... تم اور شیلہ یہاں رہو گی۔“ پروفیسر نے کہا۔ ”وہ کس لئے.....؟ کیا رقم تمہارے باپ کی ہے.....؟“ چندرا دیوی نے تیز لہجے میں کہا۔

”میں اس میں سے ایک کوڑی بھی نہ دوں گی..... میں اور شیلہ یہاں کس لئے رک جائیں.....؟ کہا تمہاری شہت پر جو چند بال ہیں وہ جوتی سے اتار دیں.....“

انہیں حواس باختہ کیا ہوا تھا۔

”چلو بھاگو..... یہ چڑیلوں کی مہارانی ہے جو حسین عورت کا روپ دھار کر آئی ہے اور اس نے مجھے بے بس کر دیا ہے۔“

میرا جادو اس پر نہیں چل رہا ہے..... یہ کوئی آکاش سے آئی ہوئی بلا ہے.....“ پروفیسر ہڈیانی لہجہ میں بولا۔

”کیا تم لوگ اپنے دل کے ارمان پورے نہیں کرو گے؟“ چندرا دیوی نے مسکرا کر پوچھا۔ ایسا سنہرا موقع کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ اور نہ ہی ایسی حسین اور پرکشش عورتیں مفت کے مال کی طرح خواب میں بھی تمہیں ملیں گی؟“

”آخر تم ہو کون.....؟“ پروفیسر نے تھوک نکلے ہوئے پوچھا۔ ”اس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔“

”میں چندرا دیوی ہوں۔“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔ ”کیا تم نے کبھی میرا نام سنا ہے؟“

”تت..... تت..... تم چندرا دیوی ہو.....؟“ پروفیسر کی کھٹکھی بندھ گئی۔ ”چلو دوستو..... نکلو..... بھاگو.....“

”میں تم لوگوں کو جشن منائے بغیر جانے نہیں دوں گی۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”تم ان چڑیلوں کے ساتھ جشن مناؤ گے..... یہ کس قدر حسین و جمیل اور پرکشش ہیں۔ تمہارے دلوں میں جو جو آرزوئیں ہیں وہ اسے ہر طرح پوری کریں گی..... ایسی حسین چڑیلیں..... کیا تم لوگوں نے کبھی دیکھی ہیں؟“

”چندرا دیوی جی.....!“ ان میں سے ایک چڑیل بولی۔ ”آپ نے ہمارا دل خوش کر دیا۔ ہم ان کے ساتھ جشن منائیں گے۔ عرصہ ہوا کسی مرد کا خون پئے ہوئے.....“

”کیا..... کیا.....؟“ جمل ساز کی سٹی گم ہو گئی۔ ”ان چڑیلوں کے ساتھ..... نہیں..... نہیں..... بھاگو.....“

جب وہ دروازے کی طرف بڑھے تو وہاں کھڑی دونوں چڑیلیں ایک دم حسین اور پرکشش لڑکیوں کا روپ دھارے ہوئے تھیں۔ سولہ برس کی ناریاں دکھائی دیتی تھیں۔ انہیں جیسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ پروفیسر نے پلٹ کر ان چڑیلوں کو دیکھا جو راجشش سے چڑیلیں بن گئی تھیں۔ وہ حسین بن گئی تھیں۔ وہ چاروں فطری حالت میں تھیں۔ اور ان کے جسموں پر کپڑے کی ایک گچی تک نہ تھی۔ وہ سب کے سب مسحور ہو گئے۔ اپنے آپ کو بھول گئے۔ ان چڑیلوں نے ان کے قریب جا کر ان کے ہاتھ تھام لئے اور سامنے والے کمرے کی طرف بڑھیں تو وہ سحر زدہ سے

ہوئے..... ان کے حسن و شباب جسموں کے طلسم نے ایسا سیر کیا تھا انہیں کسی بات کا ہوش نہیں رہا تھا۔ انہوں نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر لیا تھا۔

اتنی دیر میں شیلہ اور شام کمار کو ہوش آ چکا تھا۔ ان دونوں نے خوف زدہ نظروں سے کمرے میں دیکھا۔ ان راجشش اور چڑیلوں کا نام و نشان اور وجود نہ تھا۔ شیلہ نے سوالیہ نظروں سے چندرا دیوی کی طرف دیکھا۔

”وہ..... وہ..... بلائیں کہاں ہیں؟“ شیلہ نے انک انک کر پوچھا۔

”وہ بلائیں جس طرح آئی تھیں اسی طرح چلی گئیں۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”پروفیسر نے انہیں واپس بھیج دیا۔“

”پروفیسر اور اس کے ساتھی کہاں ہیں.....؟“ شام کمار نے پوچھا۔ ”رقم تو نہیں لے گئے.....؟“

”وہ سامنے والے کمرے میں موجود ہیں اور اپنا غم غلط کر رہے ہیں۔“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔ ”آؤ اب چلیں..... وہ ایک پانی بھی وصول نہیں کر سکتے..... میں نے انہیں جو دمک دی وہ اس میں آگے اور خوف زدہ ہو گئے۔“

چندرا دیوی نے ان دونوں میاں بیوی کو ساتھ لیا اور فلیٹ سے نکل کر نیچے آ گئی۔ جب وہ لوگ اندر کے کمرے میں پہنچے تو ان چڑیلوں نے مردوں اور پروفیسر کے گلے میں ہاتھیں حائل کر دیں اور خود سپردگی کی حالت میں انہیں من مانیاں کرنے دیا۔ یہ جشن زیادہ دیر نہیں رہا۔ پھر وہ چڑیلیں سا بچہ حالت میں آ گئیں۔ پھر کیا تھا۔ ان پر جو شباب کا نشہ چڑھتا جا رہا تھا۔ وہ ایک دم سے اتر گیا۔ انہیں برقی جھٹکا لگا۔ پھر وہ دروازہ کھول کر کمرے سے اور پھر فلیٹ سے نکل آئے۔ چڑیلیں ان کے تعاقب میں زینے تک لپکیں تو وہ اس قدر اور حد درجہ خائف اور سراسیمہ ہوئے کہ ایک دم سے گودھکا دیتے اترنے لگے۔ پروفیسر نے ان پر جادو اور سحر کرنا چاہا تو اسے ایسا لگا کہ وہ سامرا جادو اور سحر طوم بھول چکا ہے۔ ایک چڑیل نے اسے پکڑا تو ہاتھ چھڑا کر سیزر حیاں اترنے لگا تو اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ سیزر حیاں پر لڑھکتا گیا تو اپنے ساتھیوں سمیت وہ لڑھکتا چھپے آیا۔ ان سب کے جسموں اور دماغوں پر نہ صرف چوٹیں آئی تھیں بلکہ ہاتھ پیروں کی ہڈیاں ٹوٹ کر وہ سب محض دروازہ پر پانچ ہو گئے۔ بے ہوش ہو کر مردوں کی طرح بکھرے پڑے تھے۔

☆.....☆.....☆

چندرا دیوی جب اپنی گاڑی میں شیلہ اور شام کمار کو لے جا رہی تھی۔ گاڑی میں خاموشی سی رہی۔ شیلہ کا چہرہ تہمتار ہا تھا۔ کسی انگارے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس کی خوب صورت اور بڑی

آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔

گھر میں قدم نہ رکھتے ہی شیلانے ایک دم سے نفرت اور غصے سے بھڑک کر شام کمار سے کہا۔
”چلو نکلو یہاں سے..... میں تمہاری منحوس صورت دیکھنا نہیں چاہتی..... بے غیرت، بے ضمیر، کیا شوہر ایسے رذیل ہوتے ہیں۔“

”مجھے شاکر دو شیلانے“ شام کمار نے بڑی عداوت سے کہا۔

”میں تمہیں معاف کر دوں..... ایسے کہنے اور رذیل شخص کو جس نے اپنی بیوی کو جوئے میں داؤ پر لگا دیا تھا.....؟“ وہ ہنسی لہجے میں چیخ کر بولی۔ ”تم اتنے بے غیرت اور بے شرم اور بے حس ہو گئے میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔“

”میری بات تو سنو شیلانے“ شام بولا۔ ”میں تمہیں اصل بات بتاؤں.....؟“

”میں نہ تو تمہاری کوئی بات سننا اور ایک منٹ کے لئے بھی تمہاری صورت دیکھنا چاہتی ہوں۔“ شیلانے برہم ہو کر کہا۔ ”کیا ایک شوہر اتنا گھٹیا اور گرا ہوا ہو سکتا ہے.....؟ کل تو تم اپنی بیوی بھی داؤ پر لگا دو گئے؟“

”شیلانے.....! چندرا دیوی نے کہا۔ ”شانتی سے کام لو۔ سنو اور دیکھو۔ یہ کیا کہنا چاہتے ہیں؟“
”میں بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے جانے کیا ہو گیا تھا.....؟ میں نے جوئے کی لت پال لی..... پھر کسی بات کی حیرت نہ دی۔ میں بے غیرت بن گیا..... قرض ناے ایسے تھے کہ مجھے جیل کی ہوا کھلا سکتے تھے۔ اس کے سوا چارہ نہیں رہا تھا کہ تمہیں داؤ پر لگا دوں۔ میں اب سوچتا ہوں تو حیران ہو رہا ہوں کہ میں اتنا بے غیرت کیسے بن گیا؟“ شام بولا۔

”میں اپنے قیاس اور اندازے سے بتاتی ہوں کہ اس میں قصور کس کا ہے؟“ چندرا دیوی نے مداخلت کی۔

”کس کا قصور ہے؟“ شیلانے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ”دولت کی ہوس کا قصور کے سوا کس کا ہو سکتا ہے؟“

”اس میں تمہارا قصور ہے.....؟“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”لہذا اپنے بچے کو دوش مت دو۔“
”میرا قصور.....؟“ شیلانے بڑے زور سے چونکی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔

”ہاں..... تمہارا..... یعنی تمہارے حسن اور اس بھرپور جوانی کا..... پروفیسر ایک مکار، چالبار اور عیاش شخص ہے۔ وہ اپنے سفلی علوم سے ہر طرح کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ تم پر ریشہ خلی ہو گیا اور شام کے دوست بھی..... ان لوگوں نے تمہارے حصول کا منصوبہ بنایا۔ پروفیسر نے جادو منتر سے تمہارے بچے کا دماغ پلٹ دیا۔ اسے بے غیرت، بے شرم، بے حس اور بے ضمیر بنا دیا۔ یہ جادو کا اثر تھا جو شام

کمار اس کی ہر بات ماننے پر تیار ہو گیا۔ لہذا تم اپنے بچے کو دوش مت دو۔ اسے شاکر دو۔“

”وہ مکینہ اور رذیل پروفیسر پھر میرے شوہر پر جادو کر سکتا ہے۔“ شیلانے خدشہ ظاہر کیا۔

”اسے اور اس کے دوستوں کو جبر تاک سبق مل سکا ہے۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”وہ اور اس کے ساتھی بیڑیوں سے گر کر نہ صرف شدید دغی ہو گئے ہیں بلکہ پانچ اور معذور ہو گئے ہیں..... پروفیسر اپنے سفلی علوم سے محروم ہو گیا ہے۔ اس کا جادو منتر اب کسی پر اثر نہیں کرے گا..... اب وہ سب بھیک مانگ کر گزارہ کیا کریں گے؟“

”آپ کو اس بات کا کیوں کر علم ہوا؟“ شام کمار نے حیرت آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بات یہ ہے کہ میں بھی تمہارا بہت جادو منتر جانتی ہوں۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”ہمارے وہاں سے نکل آنے کے بعد جب وہ بلا نہیں پروفیسر کے سحر سے نکل کر ان کا خون پینے لگے تو وہ سب کے سب بیڑیوں پر سے لڑھک گئے تھے۔“

”اوہ بھگوان.....! تو نے بڑی کرپا کی جو ایک دیوی کو لوہار بنا کر بھیج دیا۔“ شیلانے آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ ”کیا آپ سچ سچ کی جادو کرنی ہیں؟..... آپ نے ہم پر بہت بڑی دیا کی ہے؟“
”اگر میں جادو کرنی نہیں ہوتی تو اس کھیل کو کیسے جیتی۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”کھیل کے دوران پروفیسر نے اپنی ایک موکلہ کو بلا لیا تھا۔ کھیل کے دوران وہ موکلہ آ جاتی ہے اور پتے تبدیل کرتی رہتی ہے۔ آج بھی اس نے ایسا کیا لیکن وہ ناکام رہی۔“

”جس طرح لوہا لوہے کو کاٹتا ہے۔ اسی طرح جادو نے جادو کو کاٹا۔“ شیلانے بولی۔ ”یہ جو رقم آپ نے جیتی ہے اس پر صرف آپ کا حق ہے..... آپ اس میں سے ہمیں دس روپے بھی نہ دیں۔“

”تمہارے بچے نے دفتر سے جو رقم قرض لی ہوئی ہے وہ میں دے رہی ہوں اور اس کے علاوہ میں ہزار روپے..... باقی رقم میں سرکاری اسپتالوں کے نادار مریضوں میں تقسیم کر دوں گی تاکہ وہ ادویات اور کھل وغیرہ خرید سکیں۔“

”میں ہزار روپے.....؟ وہ کس لئے؟“ شیلانے حیرت سے کہا۔ ”نہ آپ قرض کی رقم دیں نہ ہی میں ہزار روپے..... قرض اسے ہی ادا کرنے دیں..... تاکہ اسے پتا چلے کہ قرض ادا کرنا کتنا مشکل ہے..... وہ اتنی بڑی رقم پا کر پھر سے جوا نہ کھیلنا شروع کر دے.....؟ اس کا کوئی بھروسہ نہیں.....“

”اب تمہارے بچے کی عقل ٹھکانے آ گئی ہے اور وہ پروفیسر کے سحر سے نکل چکا ہے۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”تمہارا بچہ اندر سے بہت اچھا آدمی ہے۔ قرض کی رقم بہت بڑی ہے۔ اس کی ہر ماہ

آدمی تنخواہ کٹ جائے گی تو پھر گھر کیسے چلے گا؟ یہ تم نے سوچا..... اسے قرض کے بوجھ سے نجات پانے دو۔ بیس ہزار کی رقم سے اچھی زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ اسے گھر اور بچوں پر خرچ کرو تا کہ احساس محرومیاں دور ہو سکیں۔“

☆.....☆.....☆

نوتن نامی جو عورت پریشان حال اور غم زدہ سی چندرا دیوی کے سامنے بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رہی تھی اسے سریش کمار نے سمجھا تھا۔ جب وہ روچکی اور اس کا جی ہلکا ہوا تو وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

”میں آپ کے پاس بڑی آشا لے کر آئی ہوں..... سریش کمار نے یقین دلایا کہ آپ میری مشکل حل کر سکتی ہیں۔ بہن..... کیا ایسا ممکن ہے؟ اگر میری مشکل حل نہ ہوئی تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی۔“

”دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔“ چندرا دیوی نے اسے دلاسا دیا۔ ”سریش کمار نے آپ کو میرے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ میں آپ کو مشکل سے نکال دوں۔ کیا بات ہے بتائیں؟“

”بڑی عجیب، پراسرار سی نہیں بلکہ بڑی حیرت انگیز اور ناقابل یقین کہانی ہے۔“ وہ بولی۔

”کہانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”آپ ساری کہانی من و عن سنا دیں۔ کوئی بات غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہ کریں۔ بعض چھوٹی اور معمولی باتیں بہت اہم ہوتی ہیں۔“

”اچھا تو پھر آپ سنیں۔“ وہ بولی۔ ”میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔“ یہ کہانی ایک راوی کے انداز سے سنائو گی۔ میں خود اس کہانی میں ایک کردار کی طرح ہوں گی۔

پنڈت جی نے کہا تھا کہ رانی کی سگائی کے لئے اتوار شہد دن ہے۔ اس لئے اس کی سگائی کا وقت شام آٹھ بجے مقرر کیا گیا تھا۔ سگائی چوں کہ سادگی سے کرنا تھی۔ دھوم دھڑکا نہیں کرنا تھا۔ اس لئے قریبی رشتہ داروں تک یہ تقریب محدود کر دی گئی تھی محلے والوں اور ملنے چلنے والوں کو بھی مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ رانی کی سہیلیاں تک مدعو نہ تھیں۔ جنہیں مدعو کرنا تھا انہیں دعوت بائے جاری کئے گئے تھے۔

شام سات بجے ایک ایسا واقعہ رونما ہوا تھا جس نے بڑی بدحواسی پیدا کر دی تھی۔ یہ ایک سانحہ تھا جس نے المیہ کو جنم دیا تھا۔

رانی بے حد حسین ہے۔ جتنی حسین ہے اس سے کہیں پرکشش اور جاذب نظر ہے، جو اسے دیکھتا ہے دیکھتا رہتا ہے، اس کا نام رانی جو رکھا گیا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے اس کے لئے موزوں تھا۔ وہ سچ کی رانی لگتی تھی۔

دنیا میں بہت ساری بلیاں اپنی خوب صورتی میں جواب نہیں رکھتی ہیں۔ ایک ایرانی اور دوسری آسامی..... جب وہ اپنے باپ کے ساتھ ایک مرتبہ کلکتہ گئی تھی وہاں اس نے ایک آسامی بلی خریدی تھی۔ اسے بچپن سے ہی بلیاں بہت پسند تھیں۔ اس کے پاس دو تین پالتو بلیاں تھیں۔ آسامی بلی لانے کے بعد اس نے دوسری بلیاں سہیلیوں کو دے دیں۔ صرف آسامی بلی رکھ لی اور وہ اس کا خیال رکھتی تھی جیسے وہ واقعی رانی ہو اور اس کا نام اس نے بلیوں کی رانی رکھا ہوا تھا۔

اس کی رانی بلی چھ بجے چھٹ پر گئی تو وہ سات بجے تک نہیں آئی۔ رانی کو بڑی تشویش ہوئی۔ کیوں کہ جب بھی وہ چھٹ پر جاتی تھی تو دس پندرہ منٹ میں واپس آ جاتی تھی۔ جب وہ سوا سات بجے بھی نہیں آئی تو حیرت اور تجسس اسے چھٹ پر لے گیا۔ اس نے اپنی بلی کو مردہ حالت میں دیکھا تو سن سی ہو کر رہ گئی۔ اس کی بلی کا مردہ جسم فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اور جان اس میں نہیں تھی۔

بلیاں کیا انسان بھی مرتے رہتے ہیں۔ لیکن انسان اور جانوروں کے مرنے میں فرق ہوتا ہے۔ یہ بلی بھی مر گئی۔ لیکن اس گھر کے مردوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ چوں کہ عورتیں بڑی جذباتی، حساس اور کم زور دل کی ہوتی ہیں۔ انہوں نے اس لئے بلی کی اچانک موت کا اثر لیا۔ اس لئے بھی کہ یہ خوب صورت بلی انہیں بے حد پسند تھی۔ گھر کی ایک پالتو بلی کا مرجانا بدشگون ہی تھا۔ رانی غصے سے تملار سی تھی اور پھوٹ پھوٹ کر روتی بھی جا رہی تھی۔ اسے رونا اس بات پر آ رہا تھا کہ یہ اس کی چیتنی بلی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ اسے مار ڈالا گیا تھا۔ یہ اس کی طبیعت نہ تھی۔ اور نہ ہی اسے کوئی مرض لاحق تھا۔ وہ کل ہی جانوروں کے اسپتال اسے لے جا کر معائنہ کروا کر آئی تھی۔ اگر اس کی طبیعت موت واقع ہو گئی ہوتی تو وہ اتنا صدمہ دل پر نہ لیتی۔

اس کے پتہ جی اور انکل نے اسے بہت برا سمجھا یا کہ اسے گھر کے کسی فرد نے نہیں مارا۔ وہ کیوں اور کس لئے مارے گا۔ اس لئے کہ وہ گھر کے ہر فرد کی چیتنی تھی۔ اور نہ ہی باہر کا کوئی آدمی چھٹ پر آ کر اسے مار سکتا ہے۔ پڑوس کی چھٹ سے کسی پلے نے آ کر اسے ہلاک کیا ہوگا۔

رانی نہ صرف ایک ضدی بلکہ سرکش اور خود سر لڑکی تھی۔ اسے بڑے ناز و نعم سے پالا گیا تھا۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی چیتنی بلی کے قاتل کو کسی قیمت پر معاف نہیں کرے گی..... چاہے قاتل بلا ہو یا انسان۔ پھر وہ اپنے پتہ جی کا ریا اور لے کر چھٹ پر گئی کوئی بلا بھی نظر آئے تو اسے شوٹ کر دے۔ وہ اپنے ماں باپ کی بے حد بلاؤں کی بیٹی تھی۔ جب کبھی اسے کسی بات پر غصہ آتا تو وہ اس طرح ریا اور ہاتھ میں لئے دندنا پی پھرتی تھی۔ کچھ نہ ملا تو ملازموں کو ہی شوٹ کرنے کی دھمکیاں دیتی رہتی تھی۔ ویسے سب یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ریا اور چلانا

تو دور کی بات ہے۔ وہ گولی چلنے کی آواز سن کر بھی کانوں پر ہاتھ رکھ لیتی تھی۔

جب وہ چھت پر چلی گئی تو اس کی ہونے والی ساس نے رانی کی ماں سے کہا۔
”یہ شگون اچھا نہیں ہے۔ سگائی کی تاریخ بدل دی جائے تو اچھا ہوگا۔“

اس کی بات سن کر رانی کے باپ نے کہا۔

”اگر آج اس کی سگائی نہ ہوتی تو پھر کبھی نہ ہو سکے گی..... آپ تو اس بات سے بخوبی واقف ہیں بھابی کہ.....! رانی ناک پر کبھی تک بیٹھنے نہیں دیتی ہے۔ اب تک کتنے ہی لڑکوں کو اس نے پسند کیا..... دوستی کی..... اور پھر ان کے ساتھ ہنستی بولتی رہی..... مگر جب شادی کی بات آئی تو اس نے صاف انکار کر دیا اور یہ کہا کہ میں انہیں دوست اور بھائیوں کی طرح سمجھتی ہوں۔ ان سے کیسے اور کیوں شادی کروں..... یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اسے آپ کا بیٹا ریش کمار پسند آ گیا ہے اور وہ اس سے دیواہ کرنے کے لئے بھی تیار ہے..... اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے سگائی کے بندھن میں باندھ نہ دیا جائے تو اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ وہ اپنا ارادہ بدل دے۔ سگائی سے وہ شادی کے لئے پابند ہو جائے گی.....“

ریش کمار کے باپ نے یہ سب کچھ سن کر ان کی بات کاٹی۔

”میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں بھائی صاحب!“ ان کا لہجہ تائیدی انداز کا تھا۔ ”اگلے ماہ کی کسی شہد دن کی تاریخ پختہ جی سے نکال کر دے دیں۔ ہم بارات لے کر آ جائیں گے۔“

رانی کی ماں نے جب یہ سنا تو اس نے ڈرتے ڈرتے اعتراض کیا۔

”آپ کو اس بات کا علم ہے کہ آج رانی کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کی چیمٹی بلی.....“

”فضول بات نہ کرو۔“ رانی کے باپ نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”اس کی بلی مر گئی ہے ماں تو نہیں مر گئی ہے کہ وہ سگائی اور دیواہ سے مر گئی ہے میں ابھی جا کر پوچھتا ہوں کہ اس کی مرضی کیا ہے..... وہ میری بات کو رد نہیں کرے گی۔“

وہ اپنی بیٹی سے اس کی مرضی پوچھنے چھت پر چلا گیا تو اس کی ماں، ریش کمار کی ماں کے پاس بیٹھ کر بولی۔

”جب میں چھوٹی سی تھی اس وقت میرے نھیال میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا کہ جو بہت عجیب و غریب خوفناک تھا۔ میری نانی ماں نے بتایا تھا کہ ایک آتما آئی تھی اور وہ کتے بلیوں کا خون چوس کر چلی جاتی تھی۔ ایسے کئی ایک واقعات محلے کے ان گھروں میں ہوئے جہاں کتے اور بلیاں پالی جاتی تھیں۔ یہ پہلا واقعہ ہمارے ہاں رونما ہوا تھا اور اس کے بعد یہ سلسلہ دراز ہوتا گیا۔“

جب رانی نے آ کر بتایا کہ اس کی عزیز از جان بلی چھت پر مری پڑی ہے تو یقین نہ آیا۔ میں نے چھت پر جا کر دیکھا تو اس کی بات سچ تھی۔ ایک عجیب اور بڑی پراسراری بات ابھی۔ اس کی بلی مردہ حالت میں پڑی تھی۔ اس کی گردن کا گوشت ادھر ادھر ہوا تھا۔ خون کی ایک بوند اسی نظر نہیں آئی۔ ایسا لگتا تھا کہ جس نے اسے موت کا نشانہ بنایا اس نے اس کا سارا خون چوس لیا۔ اس وقت ایک بات میرے ذہن میں جو آئی وہ یہ تھی کہ بلی نے اس کی جو درگت بنائی اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو بلی کے حوالے کرنے کو تیار نہیں ہوئی ہوگی۔ کیوں کہ بلا نہ صرف بد صورت مکر وہ اور لاف ناک قسم کا ہوگا۔ جانور بھی انسانوں کی طرح پسند ناپسند کا خیال کرتے ہیں۔ بلی نے مزاحمت کی تو بلی نے آخر اس پر کسی نہ کسی طرح قابو پالیا۔ فاتح بن گیا۔ بلی نے اس سے درعدگی کا بدلہ لینے کے لئے حملہ کیا ہوگا۔ بلی نے جاتے جاتے اس کا گوشت گردن کے پاس سے ادھیڑ دیا اور پھر اس کا مارا خون پی لیا..... یہ ہے اتنی سی بات۔“

ریش کمار کی ماں خوف سے لرز گئی۔ ریش کمار کے باپ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

”ہاں تو بھابی.....! آپ نے یہ نہیں بتایا کہ وہ آپ کے نھیال والی آتما کا کیا بیٹا.....؟ آپ کی نانی نے تو اسے یقیناً دیکھا ہوگا۔ کیا انہوں نے آپ کو بتا دیا تھا کہ وہ آتما کو دیکھ چکی ہیں؟“
”بے شک..... انہوں نے دیکھا تھا۔“ رانی کی ماں نے جواب دیا۔ ”لیکن اس آتما کا کتوں اور بلیوں تک خون پینے تک محدود نہ رہا تھا۔ جب اس نے محلے کے تمام کتوں اور بلیوں کا خون پی کر ہلاک کر دیا تو وہ نوجوان اور کنواری لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پھر وہ صرف کنواری لڑکیوں کا خون پینے لگی۔ شادی شدہ عورتوں کا اس نے کبھی خون نہیں پیا۔ ان عورتوں کا بھی جو نو جوان تھیں۔ جن کے محلے نہ تھے..... یہ آج کل کی لڑکیاں آتماؤں، بھوت پریتوں اور چڑیلوں سے بھی ڈرا نہیں ڈرتی ہیں..... رانی کو دیکھو..... اکیلی چھت پر چلی گئی ہے۔ کبھی اس کے باپ نے بھی ریو اور چلایا..... یہ ریو اور فقط ماں مقدم کے طور پر رکھا ہوا ہے کہ اگر کبھی راتوں کو چور ڈاکو گھس آئے تو انہیں ڈاک سے ڈرا دھمکا کر بھگا دیں..... اگر وہاں سچ سچ کوئی آتما یا بلا ہوئی تو وہ تنہا لڑکی کیا کرے گی؟“

کوئی آدمی کھٹے کے بعد ان کے پتہ جی تھا واپس آ گئے۔ انہوں نے خوش خبری سنائی۔

”رانی راضی ہے..... اور آج ہی سگائی کی رسم ادا ہو جائے گی۔ تیاری کرو۔“

”سگائی تو یہاں نیچے ہوگی۔“ رانی کی ماں نے کہا۔ ”وہ اوپر چھت پر کیا کر رہی ہے؟“

”وہ قاتل بلی کا انتظار کر رہی ہے تاکہ اس سے بلی کی موت کا انتقام لیا جائے۔“

”اگر بلی کی جگہ کوئی راکھشش یا آتما آگئی تو.....؟“ ریش کمار کی ماں بولی۔

”بھوت تو ہماری تمہاری جیسی جاہل اور ڈرپوک عورتوں کا پیچھا کرتے ہیں۔“ وہ ہنس کر بولی۔ ”رانی تعلیم یافتہ اور سمجھ دار لڑکی ہے۔ غرور اور بے خوف بھی ہے۔ اور یہ بات تو سمجھی جانتے ہیں کہ ذرا ضدی قسم کی واقع ہوئی ہے۔“

”کیا وہ ساری رات بیٹھ کر بلے کا انتظار کرے گی؟ لڑکے کی ماں بولی۔

”نہیں.....“ رانی کی ماں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کوئی بلا ولا نہیں آئے گا اور نہ ہی آتا..... وہ انتظار اور بے زاری سے اکتا کر خود ہی چلی آئے گی۔ اچھا ہے چھت پر ہوا خوری ہو رہی ہے۔ اس کا دماغ بھی تازہ دم ہو جائے گا۔“

باتوں باتوں میں کوئی ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ایک ایک کر کے مہمان آنے لگے۔ ریشم کمار جو ماں باپ کے ساتھ ہی آ کر ایک کمرے میں بیٹھائی دی دیکھ رہا تھا۔ وہاں سے نکل کر راہ داری میں آیا۔ راہ داری کے آخری سرے پر ایک زینہ تھا جو اوپر کی طرف جاتا تھا۔ وہاں سے ایک بھگ و تارک زینہ تھا جو بہت پرے جاتا تھا۔

وہ چھت پر پہنچا تو اس نے دیکھا رانی بڑے مضطربانہ انداز میں ٹہل رہی ہے آسان پر چاند چمک رہا تھا۔ اس کی دودھیا منجد چاندنی میں اس کے چہرے کی چاندنی کچھ اور کھل گئی تھی۔ شام کو وہ روتی رہی تھی۔ اس لئے آنکھیں دھل کر روشن ہو گئی تھیں۔ سیدھی دل پر دستک دیتی تھیں۔ دل میں ایک عجیب سی فرحت بھر دیتی تھیں۔

رانی نے اس وقت ایک گلابی رنگ کی سوتی ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ منی بلاؤز کے نیچے کی چمنا ہٹ..... نازک، پتلی سی اور عریاں کر کاخم اور کولہوں کا ابھارنگا ہوں کو دعوت گناہ دیتا تھا۔ ورغلا تا اور اکساتا اور ترغیب دیتا تھا۔ بہکا تا ہوا سراپا اور اس کی حشر سامانیاں کے جذبات کو تند کر رہی تھیں۔ اس نے پل بھر میں ایک رنگین سا پنڈا دیکھا۔ صرف ایک ماہ کی تو بات ہے۔ وہ اس کی دلہن بنی جملہ عروسی میں ہوگی..... اس کی ملکیت ہوگی۔ ایک زمین کی طرح..... جس کی زمین ہوتی ہے اس پر اس کے مالک کو حق ہوتا ہے۔ اسے جس طرح اور جیسا چاہے استعمال کرے۔

رانی نہ صرف بے حد حسین تھی بلکہ دولت مند بھی تھی۔ ایک طرح دار، سنبھلی ہوئی کسی خطرناک لڑکی کی مانند..... اس لئے وہ ضرورت سے زیادہ حسین دکھائی دیتی تھی۔ اس کے چاہنے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان سے دوستی اور بے تکلفی بھی تھی۔ کیونکہ وہ اس کے دوستوں میں سے تھے۔ لیکن وہ سب کو طرح دے گئی تھی..... کسی میں اتنی ہمت اور جرأت نہ تھی کہ اسے چھو سکے۔ بوسہ لے لے۔ من مانی کرے..... اس نے بے تکلفی میں بھی ایک فاصلہ رکھا تھا۔ لیکن رعب حسن کی وجہ سے وہ پاٹ نہ سکا۔

وہ سڈول محسوس تھی۔ جب باہر نکلتی تھی تو اسے جوان مرد دیکھ کر دل تھام لیتے تھے۔ یہ ریشم کی خوش قسمتی تھی کہ وہ دنیا کا خوش نصیب ترین شخص تھا جو دوستی کے بعد سے رگائی کی منزل پر پہنچ رہا تھا..... اس نے جب کبھی بھی تنہائی میں رانی سے من مانی کی اور جذباتی ہوا تو رانی نے کبھی تعرض نہیں کیا تھا۔ وہ خود سپردگی سے پیش آتی تھی۔ لیکن کبھی حد سے تجاوز نہیں کیا گیا تھا۔

ابھی پہنچا نہیں تھا رگائی کی منزل پر..... کیونکہ بدشگونی سی ہو گئی تھی..... رانی کی جیتنی ملی کی اچانک موت سے یہ خدشہ ہو گیا منزل خواب نہ بن جائے..... سراب بننے کی صورت میں کیا وہ یہ صدمہ برداشت کر سکے گا؟ اس نے سوچا۔

چھت پر ایک کمرہ تھا جس میں ایک پلنگ بھی تھا۔ صاف ستھرا بستر بھی تھا۔ جب وہ چھت پر جاتی تو کسی کو اجازت نہ تھی کہ چھت پر کوئی آئے۔ پورا گھر ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ لیکن کبھی دوپہر کے وقت آ کر آزادی کی حالت میں سو جاتی تھی۔ اس میں وہ ایک عجیب سی فرحت اور لذت محسوس کرتی تھی۔ اس لئے بھی تازہ اور فرحت بخش اور قدرتی ہوا کے ساتھ وجود کو دل و دماغ کو بڑی تقویت دیتی تھی اور ایک میٹھی میٹھی سی سنسنی اس کے سارے بدن پر بجلی کی رو بہن کر دوڑ جاتی۔

اس کمرے سے ایک راستہ چلی منزل کی طرف بھی گیا تھا۔ کھڑکی سے اس کمرے میں چاندنی جھانک رہی تھی۔ وہ بستر پر درازی تھی۔ یہ نظارہ ایسا دل کش، سلسلی خیز اور برمانے والا تھا کہ وہ اس کے سحر میں کھوسا گیا۔ اس نے سوچا۔ عورت سوتے ہوئے بھی کتنی غضب کی دکھائی دیتی ہے۔ اسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں رہی تھی۔ جب چمھرنے اس کے گال پر کاٹا تو وہ چونکا..... اس نے سوچا کہ اندر چلا جائے۔ رگائی کی بیٹھکی مبارک باد دینے اس کے ہونٹوں کی مٹھاس اپنے ہونٹوں میں جذب کر لے..... وہ کئی بار جذب کر چکا تھا۔ لیکن ایک ان جانے خیال نے اس کے قدم روک لئے۔ کہیں وہ وحشی ہرنی کی طرح بدک نہ جائے۔

رانی کی نظر اس پہ گئی تو وہ ایک دم سے چونک پڑی اور ہڑبوا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کی نظر اپنی ساڑی پر گئی جو گھٹنوں سے اوپر تک کھسکی ہوئی تھی اور ساڑی کا پلو بستر پر بکھرا ہوا تھا۔ اس نے فوراً ہی ساڑی نیچے کی۔ پلو سینے اور شانے پر درست کیا۔

چوں کہ ریشم ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں روشنی نہیں تھی۔ اس لئے اس نے ریوا اور سنبھال کر کرخت لہجے میں پوچھا۔

”کون وہاں چھپ کر کھڑا ہے.....! سامنے کیوں نہیں آتے؟ سامنے آؤ۔“

”تمہارا ریشم.....“ اس نے پیار بھرے لہجے میں جواب دیا اور کھڑکی کے پاس مسکراتا ہوا روشنی میں آ گیا۔

”اوہ..... تم ہو.....“ وہ پلنگ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہو کر بولی۔ پھر اس نے پوچھا۔
”کیا مہمان آگئے ہیں؟“

”کچھ آگئے ہیں اور کچھ آنے والے ہیں۔“ رمیش نے جواب دیا۔ ”اب تمہیں نیچے چلنا چاہئے..... وہ بلا اب نہیں آئے گا۔ اس کا انتظار نہ کرو۔“

اس کی بات سن کر رانی کے ماتھے پر ہل پڑ گئے۔ وہ قدرے ناراضی سے بولی۔

”کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس سے اپنی ملی کا انتقام لوں؟“

”ایں.....“ رمیش سٹ پنا سا گیا۔ پھر سنبھل گیا۔ وہ چوں کہ اس کے مزاج سے واقف تھا کہ اس کی کسی بات کو رد کر دیا جائے یا مخالفت کی جائے تو وہ ضد میں آ جاتی تھی۔ اس نے بستر کے قریب آ کر کہا۔ ”تمہیں ضرور انتقام لینا چاہئے۔ اتنی پیاری ملی کو اس نے کس درد نگ اور سفاکی سے مار دیا..... میری تجویز یہ ہے کہ سگائی کی رسم ہوتے ہی ہم دونوں مل کر یہاں اس کا انتظار کریں۔ مجھے بھی اسے مار کر بے پناہ خوشی ہوگی۔ اس لئے بھی کہ وہ مجھے بے حد پسند تھی۔“

”لیکن تم ایک بات صاف صاف بتاؤ۔“ رانی نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”ایک کیا دس باتیں پوچھو..... ہر بات کا جواب صاف صاف دوں گا۔“ وہ بولا۔

”سگائی کے بعد یہاں آ کر تم پیار و محبت کی باتیں کرو گے یا بلے کا انتظار؟“

رانی کے اس سوال نے اسے الجھن میں ڈال کر دورا ہے پر جیسے کھڑا کر دیا تھا۔

اگر وہ ایک طرف یہ کہتا کہ پیار و محبت کی بات تو انتقام کی تمام اہمیت ختم ہو جاتی۔

اگر دوسری طرف انتقام کے لئے کہتا تو محبت کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔

اب چوں کہ سگائی کا وقت قریب تھا اس لئے اسے تیسرا راستہ نکالنا تھا تاکہ اس ترش طبیعت

امیر زادی کا دل جیت سکے۔

”دیکھو.....“ رمیش نے کھانکار کر گلا صاف کیا۔ ”دونوں باتیں اپنی جگہ درست ہیں..... جب

ہم یہاں رمیش ہو جانے کے بعد آئیں گے چاند اور جوان ہو جائے گا اور یہ چاندنی تمہاری آنکھوں میں اترے گی اور زبان پر محبت نغمہ بن کر گنگنائے گی۔ میرے سینے میں دل دھڑکتا رہے گا اور تمہارے ہاتھوں میں ریلو اور لرزتا رہے گا۔ تمہارے لبوں پر مہربادی مہر ثبت کر دوں گا تاکہ ساری مٹھاس سے میرے ہونٹ بندھ جائیں..... محبت اور ہارود ایک جگہ نہیں رہتی..... پھر میں پرارتنا کروں گا کہ بلا جلد ہی آ جائے۔“

”کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم پرارتنا کرنے کے بجائے مہمالوں کو لطیفے سناؤ.....“ رانی نے اس

کے چہرے پر نظریں مرکوز کر کے کہا۔

”لطیفے.....؟“ اس نے حیرت سے اس کی شکل دیکھی۔ ”مہمان لطیفے سننے نہیں بلکہ رسم سگائی

میں شرکت کے لئے آئے ہیں۔“

”کل ہی تو تم نے دعویٰ کیا تھا کہ تمہیں کوئی ڈیڑھ سو لطیفے یاد ہیں۔“ وہ تنک کر بولی۔

”رانی میری جان.....! اس محفل میں لطیفوں کا کیا کام..... لطیفے کھانے کے بعد سناؤں گا۔“

غوب لطف رہے گا۔“ رمیش نے کہا۔

”تم ایک ایک کر کے..... ٹھہر ٹھہر کر سناؤ گے تو مہمان مجھے دو تین گھنٹوں کے لئے بھول

جائیں گے..... کیوں تمہیں لطیفے سنانے کا فن آتا ہے۔ آدی مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتا

ہے..... اس میں ایسی بات ہوتی ہے کہ وہ سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ اس طرح وہ بھی مجھے بھول جائیں

گے..... اتنی دیر میں وہ بلا آ جائے گا..... اگر کسی وجہ سے نہیں آیا تو میں تمہارے لطیفوں کا اسٹاک ختم

ہوتے ہی چلی آؤں گی..... کیوں ڈیر؟ اپنی آ بجکشن.....“

بھلا اس میں اتنی جرأت کہاں تھی کہ اس کے مشورے پر کوئی اعتراض کر سکے۔

اس نے سوچا کہ صرف ڈیڑھ سو لطیفوں کی بات ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح روتے گاتے..... دل

پر پتھر رکھ کر سنا دے گا۔ پھر وہ اس کی سدا کے لئے بن جائے گی۔ اب اسے صبر کرنا چاہئے۔ اس کے

سواچارہ بھی تو نہیں ہے؟ پھر اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔

”دل تو نہیں چاہ رہا ہے کہ تمہیں چھوڑ کر جاؤں..... تمہارا حکم سر آنکھوں پر۔“ پھر اس نے

آگے بڑھ کر رانی کو گود میں اٹھالیا۔ ”اے غم دل کیا کروں.....؟ وحشت دل کیا کروں..... یہ جدائی

مجھ سے برداشت ہو سکے گی؟“

”میں نے جو کہا ہے وہ کرو..... میں نے نہیں کاٹا سنانے کے لئے نہیں کہا۔“ وہ اس کے

ہاؤڈوں میں کسمپاتی ہوئی بولی۔ ”جذباتی ہونے اور ٹکنے کی ضرورت نہیں..... کوئی آگیا اور کسی نے

پیانگش رومانس دیکھ لیا تو کیا سوچے گا؟ کیا کہے گا؟“

”آج کل کا رومانس ہر قسم کی قیود سے آزاد ہوتا ہے۔ محبت اور جنگ میں ہر بات جائز

ہے۔“ وہ خوشی سے بولا۔ ”جو دیکھتا ہے وہ دیکھنے دو..... مجھے سماج کا کوئی ڈر اور خوف نہیں..... اس

لئے کہ ہم دونوں ایک سمبندھ میں بندھنے والے ہیں۔“

”تم بھگوان کے لئے جلدی سے جاؤ اور یہ فلمی مکالے رہنے دو..... ایسا نہ ہو کہ مجھے بلانے

کے لئے کوئی آ جائے۔ یہاں کسی کے آنے سے وہ بلا شاید بدک کر بھاگ جائے۔“ رانی نے کہا۔

”تم یہاں کسی کو آنے نہ دینا۔“

”اچھی بات ہے جاتا ہوں اور یہاں کسی کو بھی آنے نہیں دوں گا..... بہر حال تم اپنا وعدہ یاد

رکھنا اور جلدی چلی آتا.....“ رمیش بولا۔

”جلدی..... نہیں..... تین گھنٹے بعد.....“ رانی نے کہا۔ اس دعوے کی اس سے پہلے آنے کی امید نہیں۔“

”اچھا..... اچھا..... تین گھنٹے کے بعد ہی سہی..... مگر آ جانا۔“ رمیش نے اسے بازوؤں کی گرفت سے آزاد کیا۔

اس کے جاننے کے بعد رانی نے اپنے بے ترتیب بال اور لباس کو درست کیا۔ پلوٹھا کر سینے اور شانے پر درست کیا۔ رمیش اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ اس کی پسلیاں جیسے چیخ اٹھی تھیں۔ رمیش جب نیچے چلا گیا تو وہ بڑبڑانے لگی۔

”کبھی خود غرض ہیں..... کسی کو میری پیاری پوسی کی موت کا کوئی صدمہ نہیں..... دکھ نہیں..... افسوس نہیں میری دل جوئی کے لئے جموئے مند دل جوئی کرتے ہیں..... دوسری زبان سے سگائی کی خوشی منا رہے ہیں..... رمیش کو دیکھو۔ میں غرغم سے غڑ حال ہوں..... رمیش کو بھی اس بات کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں..... وہ من مانیاں کر کے چلا گیا۔ میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔ اونہہ..... کچھ بھی ہو..... میں بے لک جان لے کر رہی رہوں گی۔“

وہ پھر ادھر سے ادھر ٹپٹنے لگی..... دودھیا چاندنی میں آس پاس کی چھتیں ویران اور سنسان دکھائی دے رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی گلابی سردی تھی۔ اس لئے چھتوں پر سونے کے لئے کوئی نہیں آتا تھا۔ وہ ٹپٹنے کے دوران منڈیر کے پاس تھوڑی دیر کے لئے رک جاتی تھی۔ آس پاس کے مکانوں کو دیکھتی۔ مکانوں کی کھڑکیاں اور کمرے روشن تھے۔ ایک کمرے کی کھڑکی کے پردے اتنے بٹے ہوئے تھے کہ کمرے کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اس نے دیکھا۔ گھوش صاحب نے اپنی ملازمہ کو دبوچا ہوا ہے۔ وہ اسے کسی بے لک طرح دکھائی دیئے۔ جب ملازمہ حراحت کرنے لگی تو انہوں نے اس کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھما دیئے۔ ملازمہ کی حراحت بے جان ہو گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد جی بچھ گئی۔

اس کے سارے جسم پر سنسنی دوڑ گئی۔ گھوش صاحب ساٹھ برس کی عمر کے تھے۔ ملازمہ بیس برس کی اور دو بچوں کی ماں..... وہ ملازمہ اس کے ہاں بھی کام کرتی تھی۔ وہ بڑی غریب تھی۔ وہ بے چاری گھوش صاحب کی بات کیوں نہیں مانتی..... ملازمہ کا شوہر چرپی تھا۔ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ حرام بڑ تھا۔ بیوی کو مارتا رہتا تھا کہ وہ اس کے چرس کے لئے پیسے لا کر دے۔ معلوم نہیں..... وہ کتنے مالکوں سے رقم لے جاتی ہوگی..... ویسے وہ تھی بڑے غضب کی..... مرہنہ ذات کی تھی۔ اس کی رنگت بے حد سیاہ تھی۔ لیکن تھی بڑی پرکشش..... وہ اسے کبھی کبھی اس کے حال پر ترس کھا کر سوچا اس دے

جاتی تھی۔ اس نے دو ایک مرتبہ ماں کی غیر موجودگی میں ہتاجی کے کمرے میں بہت دیر تک بند پایا تھا۔ اس کے ہتاجی بھی اس کا لیلی سے کھیلنے اور دل بہلاتے تھے۔ اس ملازمہ کی بھرپور جوانی کو جانے کتنے بے پروہتے اور پامال کرتے ہوں گے.....؟“

پھر اس نے اپنے مکان کی سب سے چلی کھڑکی سے قہقہہ سنائی دیئے۔ مہمان پیٹ پکڑ کر زور زور سے ہنس رہے تھے۔ رمیش نے اس کے کہنے پر جیسے مہمانوں کو محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ رمیش کے لطیف سن کر کوئی بھی اپنی ہنسی روک نہیں پایا تھا۔

پھر مرد اور عورتوں کے ملے جٹے قہقہے جو اس کمرے میں گونج رہے تھے۔ رفتہ رفتہ جیسے دم توڑ گئے۔ ذرا سی دیر کے لئے گہرا سناٹا چھا گیا۔ اس سے کہیں زیادہ گہرا سناٹا جس پر موت کا گمان ہوتا تھا وہ رانی کے آس پاس طاری تھا۔

اس موت کی سی خاموشی میں اسے اپنی پوسی کی موت بہت بے چین کر رہی تھی۔ اس کے لئے ایک کرب ناک اذیت بنی ہوئی تھی۔

• جب تک وہ انتقام نہ لے لیتی اس کے سینے میں جو نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی سرد نہیں ہو سکتی تھی۔

اس کے دل کو جی قرار آ سکتا تھا کہ اس بے لک لاش اس کی نظروں کے سامنے خون میں نہا جائے۔

اس نے دور دور کی چھتوں پر نظریں دوڑائیں۔ آخر طویل اور اذیت ناک انتظار کے بعد وہ نظر آ گیا۔

وہ آ رہا تھا..... دیول چاچا کی چھت پر چاروں بچوں کے بل چلتے مستانی چال چلتا آ رہا تھا۔ وہ بڑے قد کا بلا تھا۔ اس کا رنگ بے حد سیاہ تھا۔ اس رنگت میں بلا کی چمک تھی۔ دونوں آنکھیں دور سے ریلیم ڈائل کی طرح چمک رہی تھیں۔ رانی کے ریاو لور کی نالی اٹھ گئی۔ انگلی لیلی تک پہنچ گئی۔ بس اسے اس قاتل بے لک کے ذرا قریب آنے کا انتظار تھا۔

وہ جھگر چاچا کی چھت پر سے چھلانگ لگا کر رانی کی چھت پر آیا۔ اور پھر منڈیر پر دوڑنے لگا۔ رانی نے اسے نشانے کی زد میں لے کر لیلی دبا کی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک کان کے اندر انگلی ٹھونس لی تھی۔ لیکن فائرنگ نہ ہو سکی۔ کیوں کہ لیلی دب نہ سکی۔ جب اس نے ریاو لور کی طرف جھنجھلا کر دیکھا۔ پتا چلا کہ اس نے سیٹھی کچھ نہیں بٹایا تھا۔

اتنی دیر میں بلا چھلانگ لگا کر منڈیر سے چار دیواری کی چھت پر پہنچ گیا اور اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ شاید وہ چھت پر دھب کر بیٹھ گیا تھا اس لئے نظر نہ آیا۔

اس ہاتھ کی انگلیاں موٹی اور کھردری اور آہنی سی تھیں۔
وہ اس انداز سے مزی ہوئی تھیں جیسے رانی کی کھوپڑی کو اپنے شکبے میں لے کر کرین کی طرح اٹھالے۔

وہ ہاتھ نہ صرف بڑا سفاک بلکہ ظالم تھا..... لیکن سب سے ہونے مجرم کی طرح ہوتے ہوئے
کاپ رہا تھا۔ جیسے کچھ کرنے سے پہلے سوچ رہا ہو یا بلے کی طرح پنجہ مارنے سے پہلے شکار کو سونگھ رہا ہو۔

رانی کی حیران حیران سی آنکھیں دور شکر چاچا کے مکان پر لگی ہوئی تھیں۔ پھر وہ چار دیواری کی چھت پر بلے کو تلاش کرنے کے لئے چارپائی پر چڑھ گئی۔ رات کے سناٹے میں چارپائی کی کراہیں ابھریں..... وہ سیدھی کھڑی ہو کر چھت کے برابر آئی۔ پھر اسے عین نگاہوں کے سامنے دیکھتے ہی اس کے اوپر کی سانس اور پری رہ گئی۔ حلق سے کھٹی کھٹی سی چیخ نکلی۔
وہ چیخ جلی منزل تک پہنچ سکتی تھی۔ ریش نے وقفے کے بعد پھر سے لطیفے سنانے شروع کر دیے اس لئے اس کی چیخ کو زوردار قہقہوں نے کچل کر رکھ دیا تھا کسی ایک کے کان میں بھی نہ پہنچی۔

پھر وہ دہشت سے گونگی ہو گئی..... پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بلے کی آنکھوں کو سینے لگی.....
اگرچہ وہ انسانی آنکھیں تھیں..... لیکن وہ انہیں دیکھ کر یہی محسوس کر رہی تھی کہ کسی بلے کو دیکھ رہی ہے۔

وہ چھت پر اوندھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ رانی دہشت زدہ ہو کر سرعت سے پیچھے ہٹ جاتی اس نے اپنی بھاری بھر کم ہتھیلیوں کے درمیان اس کے چہرے کو جکڑ لیا تھا..... دونوں کے درمیان گہری اور طویل خاموشی تھی اور وہ دونوں ایک دوسرے کی نگاہوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے..... نگاہوں کی زبان جیسے سرگوشیاں کر رہی تھی۔

وہ بلے کی طرح سیاہ نہیں تھا..... مگر سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔ چہرے پر ایک دن کا شیو بڑھا ہوا تھا۔ جو اس کی مردانہ وجاہت میں اضافہ کر رہا تھا..... ہونٹ پتکے اور سفاک تھے۔ نکتوں سے سانس خارج ہو رہی تھی۔ جیسے غرار ہا ہو۔

رانی نے ہوش سنبھالنے اور نو جوانی کی دلہیز پر قدم رکھنے کے بعد کتنے ہی چہرے اور کتنی ہی شخصیتیں دیکھی تھیں۔ لیکن ایسی مکمل ظالمانہ اور مردانہ شخصیت کو پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ یہ کہنا دشوار تھا کہ وہ اس سے سہم گئی تھی۔ ہر اس سال یا بری طرح متاثر ہو گئی تھی۔ ان میں سے کوئی بات یقینی طور پر کہنا مشکل امر تھا۔

رانی دوڑتی ہوئی کمرے کی چار دیواری کے ایک طرف آئی اور سر اٹھا کر چھت کی جانب دیکھنے لگی۔ لیکن وہ چھت اس کے قدم سے اونچی تھی۔ اس لئے اسے بلا نظر نہ آیا۔ نہ اس طرف سے اور نہ دوسری طرف سے..... اب وہ چار دیواروں کی تیسری دیوار کی طرف آئی۔ وہاں جو کھاٹ پڑی تھی۔ گرمی کے دنوں میں راتوں کو وہ اپنی پوسی کو لے کر اس پر لیٹ جاتی تھی۔ رات چاہے اندھیرے میں ڈوبی ہوئی یا چاندنی میں نہائی ہوئی..... تازہ اور فرحت بخش ہوا کی بات ہی کچھ اور ہوتی تھی۔ وہ اس کھاٹ پر چڑھ کر دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ پڑوسی کے مکان کی طرف دیکھ کر ٹھک گئی۔

دونوں مکانوں کے درمیان تقریباً چھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ دونوں کی چھتوں پر جو منڈیریں بنی ہوئی تھیں ان پر لکڑی کا ایک تختہ بچھا ہوا تھا۔ فکسی نے اس چھت سے اس چھت پر آنے کے لئے ۱۱ تختہ بچھا ہوا تھا..... سوال یہ تھا کہ ایسا کون کر سکتا تھا.....؟ شکر چاچا کا مکان کوئی ایک ہفتہ سے خالی پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی فیملی کے ساتھ ایک ماہ کے لئے الہ آباد گئے ہوئے تھے۔
رانی نے منڈیر سے جھانک کر دیکھا کہ شاید وہ کہیں آ گئے ہوں..... مگر نہیں..... ان کے مکان کی تمام کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ روشن دان سے پتہ چل رہا تھا کہ آج رات بھی ان کے ہاں بدستور تار بکلی تھی۔

پھر وہ آہستہ آہستہ اٹھنے والے قدموں چلنے لگی کہ ایسا کس نے اور کیوں کیا!
کیا محلے کے کسی آدمی کے علم میں یہ بات آئی ہو کہ وہ راتوں کو اپنی پوسی کے ساتھ چھت پر اکیلی ہوتی ہے۔ جاڑے کے دنوں میں چھت پر بنے ہوئے کمرے میں..... گرمیوں میں جب جس ہوتا ہے تو وہ نیم عریاں حالت میں ہوتی ہے۔

یہ تو کسی صورت میں نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک ویران اور غیر آباد مکان کی چھت سے محلے کا کوئی آدمی آیا ہو۔ اس تختے کے سہارے آیا ہو۔ یہ بڑی سنسنی کی بات تھی کہ ایک نو جوان، کنواری لڑکی رات کے نوبے سے بارہ بجے سے تک چھت پر اکیلی ہوتی ہے۔ وہ نہایت حسین اور پر شاب بدن کی ہے۔ دوسرے مکان کی چھتیں ذرا دور تھیں اور وہ تختہ کسی بھی دوسرے مکان کی چھتوں کو نہیں ملا سکتا تھا۔

وہ پیچھے کی طرف چلتی ہوئی کھاٹ کی طرف آ گئی۔ یہ بڑی مضبوط قسم کی نئی چارپائی کچھ دنوں پہلے ہی لائی گئی تھی۔ پرانی جو تھی وہ اس ملازمہ کو دے دی گئی تھی جس پر اس کے ہمتی مہربان تھے۔
اسی وقت ایک سایہ ہولے سے اس کے سر پر آیا..... وہ پانچ انگلیوں کا سایہ تھا..... اس کے پیچھے چار دیواری کی چھت سے ایک مردانہ ہاتھ اتر کر اس کے سر پر سایہ فگن ہو رہا تھا۔

ایک اور بات بھی تھی..... اسے دیکھ دیکھ کر چھت پر سے غائب ہو جانے والا بلا یاد آ جاتا تھا..... انجینی کی آنکھیں نیلی تھیں۔ چاند سیدھا اس کی آنکھوں میں اتر رہا تھا..... اور وہ ریڑھ ڈانٹل کی طرح چمک رہی تھیں۔

رانی کے دل میں جو دہشت بیٹھی ہوئی وہ قدرے کم ہو گئی تھی۔ اس نے خود پر جیسے کسی حد تک قابو پالیا تھا۔ سنبھل گئی تھی۔

وہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی مقناطیسی کشش تھی کہ وہ خود کو اس کی گرفت سے چھڑانا بھول گئی تھی۔ جس مضبوطی سے اس نے چہرے کو جکڑ رکھا تھا۔ وہ جبراً مضبوطی بھلی لگ رہی تھی۔ ایسا انوکھا اور لطیف سلس جو اس کے رگ و پے میں بجلی کی طرح دوڑ رہا تھا..... کیا سحر سا تھا۔

پھر انجینی کا ایک ہاتھ اس کے حسین چہرے سے پھسلتا ہوا گردن اجلی، شفاف اور روشنی جلد پر آ گیا۔ اس کی کھروری انگلیاں گردن کے خم پر کانپ رہی تھیں۔ ٹھیک اسی جگہ اس کی آسائی ملی کا گوشت ادھیڑا گیا تھا۔ ٹھیک اسی جگہ کو انجینی کی نیلی آنکھیں بڑے پیار سے تک رہی تھیں۔ وہ جیسے سحر زدہ ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں۔

چٹائی منزل سے پھر قہقہہ بلند ہوئے اور چھت تک آتے آتے ان کا زور دم توڑ گیا۔
”تت..... تم..... تم کون ہو.....؟“ رانی نے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔
”اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ لیٹے لیٹے ہی وہ کھسکا ہوا چھت کے سرے تک آیا اور وہاں سے نیچے اتر کر رانی کے برابر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایسا قد آور بھاری بھر کم تھا کہ چار پائی اس کے بوجھ سے کسی زخمی کی طرح کرار رہی تھی۔

اس نے رانی کے چہرے کو دوبارہ اپنی ہتھیلیوں میں لے کر درد بھرے لہجے میں کہا۔
”میں اپنی چندا کو نہ جانے کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ نہیں ملتی۔“
”چند اکون؟“ رانی نے اپنی لانی سرگیں پلکیں جھپکائیں۔
”میری پیاری بیٹی۔“ انجینی نے جواب دیا۔ ”وہ سفید براق تھی۔ دودھیا چاندنی کی طرح..... اس لئے اسے چندا کہتا تھا۔“

رانی کا چہرہ اور آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس نے سرشاری سے کہا۔
”تم بھی ملی سے پیار کرتے ہو.....؟“

”ہاں.....“ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”بلیاں میری بہت بڑی کمزوری ہیں۔“
”مجھے بھی بچپن سے بلیاں پالنے کا شوق ہے۔“ وہ اسے مسرت بھرے لہجے میں بتانے لگی۔

”میری ایک بہت ہی خوب صورت اور پیاری آسائی ملی تھی۔ ابھی شام کو کسی نے اسے مار ڈالا.....“
”مار ڈالا..... مار ڈالا..... خوب صورت اور پیاری سی آسائی ملی کو.....؟“ انجینی بڑبڑایا۔ اس کی بڑبڑاہٹ میں اداسی تھی۔ پچھتاوا سا تھا۔ اس کی پشت پر ایک کرب سا چھپا ہوا تھا۔

”تمہاری ملی چھدا کیسی تھی۔“ رانی نے پوچھا۔ ”کیا وہ صرف سفید رنگ کی تھی؟“
”میں نے بتایا کہ وہ بہت خوب صورت تھی..... بالکل تمہاری جیسی..... نرم و نازک اور اس کے ہال ایسے ہی ریشم کی طرح ملائم تھے..... ان بالوں کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ایک عجیب سی مہک ہوتی تھی۔ مست کروینے والی۔“

وہ اس کی ریشمی زلفوں سے کھینچنے لگا۔ پھر اس کی کھروری انگلیاں جھٹاتے ہوئے رخساروں پر اتر گئیں۔ وہ اس کی حسین بڑی بڑی اور گہری سیاہ آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانک رہا تھا۔ ڈوب رہا تھا..... پھر وہ اس کے بدن کی خوشبو بھی سونگھ رہا تھا..... اور اس کے چہرے کو انگلیوں سے ٹول کر لپٹلی کر رہا تھا کہ وہ اس کی گم شدہ چندا ہے۔

رانی اس کے لمس سے کانپ رہی تھی۔ ایک طرف خوف زدہ تھی تو دوسری طرف خواب زدہ سی تھی..... اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بھولے بسرے خواب کی تعبیر دیکھ رہی ہو۔ اس نے اپنی کپکپاہٹ پر قابو پانے یا خود کو بھلانے کے لئے پوچھا۔

”تمہاری ملی چندا کب گم ہوئی تھی.....؟ اندازاً کتنا عرصہ ہوا.....؟ یا تھوڑے دن پہلے.....؟“

”بہت دن ہو گئے..... اس وقت میں بچہ تھا..... ہم دونوں ایک دوسرے کو پیار کرتے تھے..... گھاس پر یا مٹی میں لوٹتے تھے..... اور ہم ہمیشہ ایک ہی پیالے میں دودھ بھی پیتے تھے۔ پھر وہ اٹھ سے جدا ہو گئی.....“

اس نے ایک گہری سانس لے کر رانی کو گہری نظروں سے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔
”میں اسے ایک مدت سے تلاش کر رہا ہوں..... تمہیں دیکھتے ہی میرے دل نے کہا کہ میری امداد مل گئی۔“

”مم..... مگر میں چندا کیسے ہو سکتی ہوں.....؟ وہ تو ملی تھی..... میں..... میں تو ملی نہیں ہوں۔“
”تم ملی ہو.....“ وہ غرایا اور اس کی آنکھوں کو اپنی آنکھوں میں جذب کرنے لگا۔

رانی لرز کر رہ گئی..... وہ اب تک دوسروں پر حکم چلاتی آئی تھی..... لیکن وہ انجینی اپنی بات طوانے کے لئے غرار رہا تھا۔ اس وقت اسے ریشم یاد آیا جو اس کی ہر بات میں لیس کہتا تھا۔ کبھی کسی بات سے انکار نہیں کرتا تھا۔ حالاں کہ عورت ایک گنجائی شاخ ہوتی ہے جو جھکنا چاہتی ہے۔ اگر کوئی

جھکانے والا گھرا جائے۔

انجینی اس کے چہرے پر جھک رہا تھا۔ اس کی چاندی پیشانی کو۔ آنکھوں کو۔ رخساروں کو اور گردن کو سوگھ رہا تھا۔ کوئی چومتا ہے لیکن وہ سوگھ رہا تھا۔ اس کی سانس رانی کے چہرے کو جھلسا رہی تھی۔

رانی کی آنکھیں بند تھیں۔ اس لئے وہ اس کے سوگھنے کے انداز کو نہیں دیکھ رہی تھی۔ صرف اس کی گرم سانسوں کو اپنے وجود کے باہر اور اپنے وجود کے اندر محسوس کر رہی تھی۔ پھر اسے اپنی کی سرگوشی سنائی دی۔

”میری سوگھنے کی حس بہت تیز ہے۔ میں تمہیں سوگھ کر دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم میری چندا ہو۔“

اس کے ہونٹ گردن کی ملائم جلد پر قلم گئے۔ اس کے پیار کا انداز کچھ عجیب سا تھا۔ ریش سے قدرے مختلف تھا۔ ریش نے کبھی اسے اس طرح سوگھا نہیں تھا۔ بس وہ چند لمحوں کے بعد جذباتی ہو جاتا تھا۔ چوں کہ وہ اس سے پیار کرتی تھی اور شادی کا وعدہ کر چکی تھی اس لئے ریش کی کسا مانیوں پر تعرض نہیں کرتی تھی۔ محبت میں اس کے نزدیک اتنا تو جاتا تھا۔ جب کہ اس کی سہیلیاں محبت کرتی تھیں وہ تمام حدود کو پھیلا لگ چکی تھیں۔ ریش نہیں چاہتا تھا کہ شادی سے پہلے ہی پہلی میں گر جائیں۔

اس نے کتابوں میں جو کچھ پڑھا تھا۔ اپنی سہیلیوں سے سنا تھا اور تصورات میں جو کچھ دیکھا تھا۔ وہ انجینی ان سے مختلف تھا۔ بالکل مختلف تھا۔ اور بے حد عجیب و غریب بھی۔ مگر اس پر نشہ طاری کر رہا تھا۔ اسے کیف دستی اور رنگ ترنگ کی ان دیکھی دنیا میں کشاں کشاں لے جا رہا تھا۔ وہ بھی کچے دھاگے سے بندھی ہوئی تھی۔ مدہوش اور مستی کے عالم میں رانی کو یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ وہ چوہنے سے پہلے سوگھتا کیوں ہے۔ اور بے لگی کی طرح زبان نکال کر ہال کیوں ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو وقت گزرنے کے بعد سمجھ میں آتی ہیں۔

اور ابھی وقت گزر رہا تھا۔ آسمان پر چاند تھا اور چاند پر بادل جھپٹ رہے تھے اور بڑے بڑے کمراسے مری طرح دیوچ رہے تھے۔ اگر بادل ایک لباس ہے جو چاند کی عریانی کو ڈھانپ لیا ہے تو وہ بادل گزر گیا تھا اور چاند بے لباس ہو گیا تھا۔ بادل کتنی ہی شکلیں بدل بدل کر آتے ہیں۔ سیاہ بادل سیاہ بے لگی کی طرح جھپٹتے ہیں اور چاند کے اجلے بدن پر پنچے مارے، سوگھتے، چانتے، دانت گزاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

پھر وقت کسی خواب کی طرح جیسے پلک جھپکتے گزر گیا۔ وہ وقت جھکی نہیں ٹھہرتا ہے۔

سمت پر مکمل خاموشی چھا گئی۔ چلی منزل سے آخری بار قہقہہ بلند ہوئے۔ وہ بڑے بے ہالان قہقہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا مہمان ہنسنے ہنسنے تھک گئے ہیں اور محض رسا اور اخلاقا لطیفہ کوئی پرداد ا سہ ہے ہیں۔ پھر ریش اپنی ذمے داری پوری کرنے کے بعد سمت پر سیڑھیاں چڑھتا ہوا آ گیا۔

”رانی! تم کہاں ہو۔۔۔۔۔؟ کہیں گولی نہ چلا دینا۔۔۔۔۔ میں تمہارا ریش ہوں۔“

اس کے پیچھے رانی کی ماں بھی آئی تھی تاکہ بچی کو لے جائے۔

اس نے بچی کو جو دیکھا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ سن سی ہو کر رہ گئی۔

وہ چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ چہرے کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ منی بلاؤز پہنا ہوا تھا۔ ساری گھٹنوں سے اوپر سرک آئی تھی اور خون۔۔۔۔۔ اور خون کا ایک لھا سا دھاس کی گردن پر نظر آ رہا تھا۔

بچی کا یہ حشر دیکھ کر اس کا دل خون کے آنسو رونے لگا۔ وہ چیخ کر بولی۔

”ہائے۔۔۔۔۔ یہ میری بچی کو کیا ہو گیا۔۔۔۔۔؟ کس نے اس کا یہ حشر کر دیا؟“

وہ سمجھ گئی تھی کہ کیا ہو گیا ہے۔ لیکن ریش کے سامنے اور آئے ہوئے مہمانوں کو سمجھانے کے لئے اس نے تخیال کا وہی پرانا قصہ جھپٹ دیا کہ کسی طرح ایک آتما جو ان لڑکیوں کا خون چوس لیا لرتی تھی۔ اس لئے بڑی بوڑھی عورتیں نو جوان، حسین اور کنواری لڑکیوں کو چھت پر جانے سے منع کرتی تھی۔ جو لڑکیاں اس پر کان نہیں دھرتی تھیں ان کے ساتھ ایسا ہی ہوتا تھا۔

ماں بڑھاری تھی اور بچی کا لباس درست کر رہی تھی۔ بھرے بھرے سڈول سینے پر ساڑی لاپہرہ کر کے پٹھے ہوئے اور تارتا ہوئے بلاؤز کو چھپا رہی تھی۔ رانی نے آنکھیں کھول کر ماں کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے چاند کو بکھنے لگی۔ ریش اس وقت کھڑا رانی کو دیکھتا رہا جب تک مائی کی ماں نے اس کا مریاں جسم چھپا نہیں دیا۔ پھر وہ والدین اور انکل کو آوازیں دیتا ہوا نیچے گیا تو اس کی ماں نے پوچھا۔

رانی کون تھا وہ۔۔۔۔۔؟ سچ بتا۔۔۔۔۔ کیا تم ہمیں بدنام کرنے کے لئے چھت پر آئی تھیں۔۔۔۔۔؟“

رانی نے ماں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں اٹھی تو اس کا تھکن سے احوال تھا۔ جوڑ جوڑ درد کدھا تھا۔ اس بے لگی نے اسے کسی کیلے کپڑے کی طرح نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ پھر اس نے چارپائی پر بیٹھ کر اپنے بکھرے بالوں کو سینے اور شانے سے سمیٹ کر جوڑا اٹھنے لگی۔

تھوڑی سی دیر میں سب کے سب اوپر آ گئے اور رانی کو غور سے دیکھتے ہوئے طرح طرح کے

قہادہ ہو گیا تھا۔ کمان سے نکلتا تو واپس نہیں آتا ہے۔ وہ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے۔
رانی کے باپ نے ڈاکٹر کو فون کر کے اپنے فیملی ڈاکٹر کو بلانا چاہا مگر اس کی ماں نے فون کرنے سے روک دیا تھا۔

وجہ یہ تھی کہ رانی کے بدن کو ساڑی سے ڈھانپتے وقت اس نے کئی جگہ دانتوں کے نشانات دیکھے تھے۔ یہ نشانات ڈاکٹر کو پوری رام کہانی سنا دیتے۔ ڈاکٹر اس بات کا یقین نہیں کرتا کہ یہ حرکت کسی آتما کی ہے۔۔۔۔۔ یہ وحشیانہ اور پر تشدد حرکت درندہ صفت آدمی اس وقت کرتا ہے جب نشانہ بننے والی لڑکی مزاحمت اور اپنا دفاع کرتی ہے۔ عزت بچانے کے لئے جدوجہد۔۔۔۔۔ درندہ صفت وحشیانہ پن غصے کی حالت میں اتر آتا ہے۔ جب تک اس کی خواہش پوری نہیں ہو جاتی اپنے شکار کو بھٹکا نہیں ہے۔

رانی کی ماں اپنے میکے کی پر اسرار کہانی کو پراثر اور سچ ثابت کرنا چاہتی تھی۔ پھر اس نے اپنے ہتی کو تنہائی میں سمجھایا تو فوراً ہی ان کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ بھی قائل ہو گئے۔ اس بات سے انکاری ہونے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ایسے واقعات وہ سنتے رہتے تھے۔

وہ جانتے تھے کہ راکھشش عاشق مزاج ہوتے ہیں۔ کسی حسین عورت اور دوشیزہ کو تنہا دیکھ کر ہزار جان سے مر مٹتے ہیں۔ بڑی بوڑھیاں جوان عورتوں اور لڑکیوں کو بھی کھلے محسن میں بھی سونے سے اس لئے منع کرتی تھیں۔

رمیشش اور اس کے والدین نادان، نا سمجھ نہیں تھے۔ وہ راکھششوں اور آتماؤں کی عشقیہ حرکتوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتے رہے۔۔۔۔۔ انہوں نے ان کی باتوں سے اتفاق کیا کہ رانی ان کی بہو بن کر اپنے باپ کی تمام دولت اور جائیداد لے کر آنے والی تھی۔۔۔۔۔ مٹی کی کوری ہانڈی پھوٹ سکتی ہے لیکن سونے کی ہانڈی میں کبھی سوراخ نہیں ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اگر ہوتا بھی ہے تو سونے کی چمک دمک میں چھپ جاتا ہے۔ پھر یہ کہ لڑکیوں پر بھوت پریت عاشق ہوں تو کوئی بدنامی نہیں ہوتی۔ صرف تشویش ہوتی ہے۔

اس رات سے رانی کا مزاج بالکل بدل گیا۔ وہ چپ چاپ سی رہنے لگی۔ دوسرے دن وہ چھت پر جانے لگی تو ماں نے اسے روک دیا۔ اس کی ماں اندر سے بڑی خائف اور پریشان تھی۔
”میں بلے کو دیکھنے جا رہی ہوں۔“ رانی نے ضد کی۔ ”مجھے جانے سے نہیں روکیں۔“
”بلے سے انتقام لینا ضروری نہیں۔“ اس کے ہتاجی نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اب تم چھت پر نہیں جاؤ گی۔ اپنے کمرے میں جاؤ۔“
”ہتاجی۔۔۔۔۔! میں انتقام لینا نہیں چاہتی۔۔۔۔۔ اس نے میری بلی کو نہیں مارا ہے۔ وہ تو بہت اچھا

سوالات کرنے لگے اور خود ہی جوابات بھی دینے لگے۔ کیوں کہ وہ خاموش تھی اور اس کی خاموشی سے یہ سمجھا جا رہا تھا کہ جوان لڑکی پر کسی کا سایہ پڑ گیا ہے۔ وہ دہشت زدہ ہے۔ اس لئے وہ فی الحال کچھ نہ کہہ سکے گی۔ جب سایہ ہٹ جائے گا تب ہی وہ بتا سکے گی۔

وہ اس بھیڑ سے گھبرا کر چار پائی سے اٹھی اور زینے کی طرف جانے سے پہلے اس نے فکر چاچا کے مکان کی طرف دیکھا۔ دونوں طرف کی منڈیروں کو ملانے والا لکڑی کا تختہ اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ مکان تاریک تھا۔ ویران تھا۔ وہاں زندگی کے کوئی اور کسی قسم کے آثار موجود نہیں تھے۔ پھر بھی اس کی بے چین نگاہیں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اگر یہ لوگ اوپر د آتے۔۔۔۔۔ یہ بھیڑ نہ ہوتی تو وہ شاید جاتا نہیں۔۔۔۔۔ اس کا قرب اسے میسر ہوتا۔ وہ نفع کی لذت میں ڈوبی رہتی۔

اس کے ہتاجی نے اس کے قریب آ کر سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔
”بیٹی۔۔۔۔۔! نیچے چلو۔۔۔۔۔ وہاں کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔۔۔؟ بلے کا خیال دل سے نکال دو۔ وہ یہاں نہیں آئے گا؟“

اس کی بات ختم ہوتے ہی شکر چاچا کے مکان کی چھت سے ایک سایہ اچھل کر منڈیر پر آیا۔۔۔۔۔ وہ کالا بلا تھا۔ رانی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔۔۔۔۔ وہ منڈیر پر چلا ہوا دوسری چھت کی طرف ہارہا تھا۔ آخری سرے پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اسی بھیڑ میں وہ کسے دیکھ رہا ہے؟ لیکن رانی کو ریلیم ڈائل کی طرح چمکی ہوئی آنکھیں اپنے دل کے تمام نہاں خانوں میں اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اس نے اپنے لرزے ہوئے ہاتھ کو گردن کے اس حصے پر رکھ لیا جہاں خون کا ننھا سادھا تھا۔۔۔۔۔ بلا جھلا نکلا کر دوسری چھت پر گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔
رانی گردن کے ننھے سے زخم کو سہلا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

رگائی کو آخر ملتی کرنا پڑا۔ اس لئے آج رگائی ٹل گئی۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔
رمیشش نے ایک لمبے کے لئے سوچا کہ آج کا کام کل پرنٹل گیا ہے۔
کل ضرور ہو جائے گا۔۔۔۔۔ مگر کل اور پرسوں بھی گزر گیا تھا۔ نہ جانے کب یہ شہ کام ہو؟
رانی کو اس رات ہلکا ہلکا سا بخار آیا تھا۔ مہمان سمجھ دار تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستان میں بدرجہا کثرت سے ہوتی ہیں۔ نو جوان۔۔۔۔۔ حسین اور پر شباب اور کنواری لڑکیوں پر سایہ آھا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ رانی جیسی لڑکی پر کسی سایہ کا آ جانا تعجب کی بات نہ تھی۔ اب جونہی ۱۸

ہے۔ بہت خوب صورت بھی تو ہے۔۔۔۔۔ میں اسے چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ اسے پالنا چاہتی ہوں۔

آپ مجھے اوپر جانے دیں۔

”اگر تم اسے پالنا چاہتی ہو تو ریش اسے پکڑ کر لے آئے گا۔“ اس کے ہاتھ نے سابقہ لہجہ میں کہا۔ ”مگر تم چھت پر نہیں جاؤ گی۔“

”اٹکل۔۔۔۔۔!“ ریش نے جھپکتے ہوئے کہا۔ ”وہ بلا آسانی سے گرفت میں نہیں آئے گا۔ آپ نے کل رات اسے دیکھا ہے۔ اتنے بڑے قد کا بلا میں نے زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔ کیا آپ لوگوں نے کبھی ایسا بلا دیکھا ہے؟“

”اسے بلا نہیں۔۔۔۔۔ باگڑ بلا کہو۔۔۔۔۔“ رانی کی ماں نے ناگواری سے کہا۔ ”اسے دیکھ کر ہی ڈر لگتا ہے۔ ایک نامعلوم سا خوف دل میں جنم لیتا ہے۔۔۔۔۔ نہ جانے اس بے وقوف لڑکی کو اس میں کون سی خوب صورتی نظر آگئی ہے۔“

”پسند اپنی اپنی ہوتی ہے۔“ رانی نے تک کر مختصر سا جواب دیا۔ پھر وہ گھوم کر اپنے بیڈروم کی طرف تیزی سے بڑھ گئی۔

”شام تک اس نے ریش سے کئی بار پوچھا۔ کیا تمہیں وہ بلا نظر آیا؟“

”نہیں۔“ ریش نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں چھت پر کئی بار جا چکا ہوں۔ وہاں اس کا سایہ تک نظر نہیں آیا ہے میرا خیال ہے کہ اب وہ شاید ہی آئے گا۔۔۔۔۔ اگر اسے آنا ہوتا تو وہ آچکا ہوتا۔ لہذا اس کا خیال دل سے نکال دو۔“

”کیوں نہیں آئے گا۔؟“ رانی ایک دم بھڑک اٹھی۔ ”تم لوگ نہیں چاہتے ہو کہ میری پسند کی کوئی چیز میرے پاس رہے۔ میں خود ہی چھت پر جاؤں گی۔ وہ یقیناً ہماری یا شکر چاچا کی چھت پر موجود ہوگا۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ تم نہیں جاؤ گی۔“ اس کی ماں نے کہا۔ ”کیا تم یہ بات نہیں جانتی ہو کہ جوان لڑکیاں چھت پر بار بار جائیں محلے والے نہ صرف انھیں اٹھاتے اور بدنام کرتے ہیں۔ تم لوگوں کی سوچ سے واقف ہو۔ ان کی ذہنیت کیسی ہوتی ہے۔“

”میں نے کبھی ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے جس سے بدنامی ہو۔۔۔۔۔ نہ جانے آپ سب میرے متعلق کیا سوچ رہے ہیں۔۔۔۔۔“ اس نے سپاٹ سے لہجہ میں کہا۔ ”میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ کل رات میں چھت پر اکیلے ہی اور وہ بلا میرے ساتھ تھا۔“

”بیٹی۔۔۔۔۔! ہم نے بھی دنیا دیکھی ہے۔“ ریش کی ماں نے کہا۔ ”میں بے اور انسان کے فرق کو خوب سمجھتی ہوں۔ تم میرے پتی کے سب سے عزیز دوست اور میری سہیلی کی بیٹی ہو۔ ایک بھتیجی کی

مانند اور پھر ہونے والی بہو بھی ہو۔ میں تمہاری اس غلطی پر پردہ ڈال سکتی ہوں۔۔۔۔۔ مگر بار بار ایسی لالچیاں کرو گی تو۔۔۔۔۔؟“

”بس۔۔۔۔۔ بس۔۔۔۔۔ آئی!“ اس نے تیزی سے درمیان میں بات کاٹ کر کہا۔ ”آپ مجھ پر تہمت لگا رہی ہیں۔ میں جھوٹا الزام سننے کی عادی نہیں ہوں نہ ہی میں اس بات کو برداشت کر سکتی ہوں۔۔۔۔۔ اور آپ یہ بات کان کھول کر سن لیں۔ مجھے آپ کے بیٹے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ نہ آپ کی بہو بننے کا ارمان۔۔۔۔۔ آپ مجھے بہو بنا کر احسان کرنے کا خیال دل سے نکال دیں۔“

یہ کہہ کر رانی طنطناتی ہوئی کاریڈور کی طرف چلی گئی۔ سب ہی سمجھ گئے کہ وہ چھت پر جارہی ہے۔ وہ اسے چھت پر جانے سے باز نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ صرف اور صرف اپنے باپ کا ہر حکم ماننے لگی۔ اس کا باپ گھر پر موجود نہیں تھا۔ اس لئے اسے کوئی روک نہ سکا۔ ریش کو اپنی ماں کی بات سخت ناگوار لگی۔ اس نے منہ بتاتے ہوئے کہا۔

”ماتا جی۔۔۔۔۔! آپ نے بغیر کسی ثبوت کے اس پر اتنا بڑا الزام کیوں لگایا۔۔۔۔۔؟ کل سے میں کئی بار چھت پر جا چکا ہوں اور اسے اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ آس پاس کی چھتوں سے کوئی شخص اس مکان کی چھت پر نہیں آ سکتا۔۔۔۔۔ صرف شکر چاچا کے مکان کی چھت قریب ہے مگر وہ مکان گزشتہ ہفتے سے بند اور دیران پڑا ہوا ہے۔ اور پھر ان کے ہاں ایک لڑکا دس برس کا اور دو لڑکیاں رہتی ہیں۔ ان میں سے کوئی جوان مرد نہیں ہے۔ وہ سب الہ آباد گئے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ وہاں سے کسی آدم زاد کی نہیں۔۔۔۔۔ بلکہ ایک بے کی ہی توقع کی جاسکتی ہے۔۔۔۔۔؟ اور پھر رانی بھی کل سے صرف اس باگڑ بے کو پوچھ رہی ہے۔ اس کا پوچھنا کوئی پاپ تو نہیں۔۔۔۔۔؟“

رانی کی ماں بھی ریش کی تائید کرنے لگی۔ تینوں آپس میں تکرار اور بحثیں کرتے رہے۔ آخر اس نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہو گئے کہ گزشتہ رات رانی کے پاس صرف باگڑ بلا آیا تھا۔۔۔۔۔ وہ بے کو اس لئے یاد کر رہی ہے کہ اس کی پیاری بیٹی پوسی مر گئی تھی۔

ماں نے بیٹی کو جس حالت میں دیکھا تھا اس سے ریش اور اس کی ماں بے خبر تھے۔ رانی کی ماں نے نہیں بتایا تھا۔ اگر وہ ماں بیٹا رانی کو اس حالت میں دیکھ لیتے تو پھر ان کا شک کسی قیمت پر دور نہ ہوتا۔ وہ یہی سمجھتے کہ کوئی شخص آیا تھا جو وحشیانہ اور درندگی سے اس کی عزت سے کھیل گیا۔ گو کہ ریش آیا تھا۔ لیکن وہ کمرے کی دہلیز پر تھا اور رانی کی ماں نے بیٹی کی حالت کو جلدی سے چھپا لیا تھا۔ اس لئے ریش ٹھیک سے نہیں دیکھ سکا تھا۔ وہ یہ سمجھ کر اپنے باپ اور رانی کے ہاتھ کی بھائی کو بلانے چلا گیا تھا کہ رانی نیم بے ہوش پڑی ہے۔۔۔۔۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا اس نے اس بات کا

ہات پر اسے ہنسی آ رہی ہے.....؟ وہ پاگل تو نہیں ہے کہ تنہا ہنستی ہے.....؟ ایسی ہنسی خود بخود نہیں آتی..... کیا دال میں کالا ہے؟

حیرت، تجسس اور نامعلوم خدشات اسے دروازے پر لے آئے۔ پھر اس نے فرش پر گھٹنے لہک کر کی ہول سے ایک آنکھ لگا کر کمرے کے اندر جھانکا..... اندر روشنی میں کمرے کا وہ حصہ نظر آ رہا تھا جہاں ایک الماری رکھی ہوئی تھی..... اور اس کے پیچھے دیوار پر سائے نظر آ رہے تھے۔ بیڈ لمپ کی روشنی پتنگ پر سونے والوں کی پرچھائیاں دیوار پر پھینک رہی تھی۔ لمپ چوں کہ پتنگ کے سرہانے تھا اس لئے پرچھائیاں پھیل کر کچھ عجیب سی انسانوں اور غیر انسانی شکلیں بنارہی تھیں۔ وہ دیوار کی سطح پر کبھی پھول رہی تھیں تو کبھی چپک رہی تھیں۔ کبھی ایک دم سے دو ہو جاتی تھیں اور کبھی گڈ لہو کر دو سے ایک بن جاتی تھیں۔

پھر رات کی خاموشی میں بلے کی غراہٹ سنائی دی۔ ”غافوں..... اوں..... اوں.....“
ریش حیرانی سے سن رہا تھا اور دیکھ بھی رہا تھا۔ اس کی نظریں آواز کے مطابق پرچھائیوں کی شکلیں بنارہی تھیں اور وہاں دیوار پر بلے اور لمپ کے خاکے بنتے اور گڑتے جا رہے تھے۔ وہ دونوں کبھی آپس میں لڑتے تھے اور کبھی لپٹ جاتے تھے۔ کوئی اوپر ہوتا تھا۔ کوئی زیر ہو جاتا تھا..... وہ لمپ سے میٹرھے، پھولنے اور پھیلنے سائے خود الجھ رہے تھے اور دیکھنے والے کو الجھا رہے تھے۔
ریش کچھ سمجھ رہا تھا اور کچھ نہیں سمجھ رہا تھا..... خود کو سمجھا رہا تھا کہ وہ محض سائے ہیں، مسمائی نہیں ہے۔“

سچائی شاید یہ ہے کہ رانی جاگ رہی ہے اور ایک طرف بیٹھے لمپ کی لڑائی کا تماشہ دیکھ رہی ہے..... یا پھر وہ کوئی آسپی چکر ہے۔ نضیال والی کہانی کے کردار پر پرچھائیوں کی صورت میں بیڈ روم کی دیوار پر اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔

دو دروازے سے قدرے ہٹ کر روشن دان کی طرف دیکھنے لگا تھا۔
وہ پرچھائیاں اسے اختلاج میں مبتلا کر رہی تھیں۔ جب تک وہ اصل کرداروں کو دیکھ نہیں لیتا اسے سکون نہ ملتا۔ چین نہیں آتا۔

اس لئے وہ صوفوں کے درمیان سے ایک میز اٹھالایا۔ روشن دان کے نیچے میز کو رکھنے کے بعد اس نے میز پر ایک کرسی رکھنے کے بعد دل میں سوچا کہ کیا اس کا دل جو کہہ رہا ہے وہ سچ ہوگا..... اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی ایسا تماشہ دیکھنے والا ہے۔ جو اس کے مزاج اور سوچ کے خلاف ہونے والا ہے۔ وہ جلد سے جلد روشن دان تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس جلد بازی میں کرسی میز پر سے الٹ گئی۔ مات کے سناٹے میں کٹاک کی زوردار آواز گونجی اور وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ آواز سن کر

ذکر اپنی ماں سے کیا اور نہ اپنے پتا سے.....
کوئی ایک گھنٹے بعد رانی کے پتا جی آئے تو انہیں بتایا گیا۔ وہ چھت پر گئے اور بیٹی کو سمجھا بچھا کر نیچے لے آئے۔

وہ رات خاموشی اور سکون سے گزر گئی۔ اور پھر دوسری رات بھی گزر گئی۔ اب وہ بلے کو تلاش کرنے چھت پر نہیں جاتی تھی۔ نہ تو اس کا ذکر کرتی اور نہ ہی ریش کو لفٹ دیتی تھی اور پھر اس نے شادی سے بھی صاف انکار کر دیا تھا۔

اس صورت حال سے ریش سخت پریشان تھا۔ وہ تنہائی میں مل کر اسے قائل کرنا چاہتا تھا اس جیسا وجہ، خوب صورت اور دراز قد مرد ملنا ناممکن ہے۔ وہ اس کا بہترین جوڑ ہے۔ رانی اسے تنہائی تک پہنچنے نہیں دیتی تھی۔ ریش چاہتا تھا کہ صرف ایک بار تنہائی میں ملنے کا موقع مل جائے۔ رانی اس کے دراز قد پر مرثی تھی۔ اس کا یہ خیال تھا کہ جب جب وہ رانی کو بازوؤں کے حصار میں لے کر من مانی کرے گا تو وہ پھل جائے گی۔ پھر شادی پر تیاری ہو جائے گی۔

تیسری رات وہ جاگتا رہا۔ اس کا اور اس کے والدین کا قیام اس لئے یہاں تھا کہ وہ پونا سے آئے تھے۔ اور پھر ریش یہاں ملازمت کرتا تھا۔ یہ گھرانہ رشتوں سے بڑھ کر تھا۔ رانی کے پتانے یہ کہہ کر ٹھہرایا ہوا تھا کہ سگائی تک رک جائیں۔ ایک بجے کے بعد جب گھر کے سارے افراد سو گئے تو وہ اپنے کمرے سے چپکے سے نکل کر رانی کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ اس کا خیال تھا کہ رات کے اس سے وہ تنہائی میں رانی سے مل کر ایسے جذباتی انداز سے پیش آئے گا کہ وہ کسی تذبذب کے بغیر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیگی۔ آخر وہ ایک جوان اور پرشباب لڑکی ہے۔ جذبات پر بند باندھنا آسان نہیں ہوتا ہے۔

دروازہ اندر سے بند تھا۔ پتا نہیں وہ سو رہی تھی۔ جاگ رہی تھی۔ اتنی رات کو دستک دینا مناسب نہیں تھا۔ لیکن اس سے ملنا بھی ضروری تھا۔ وہ دروازے سے ہٹ کر کھڑکی کے پاس آیا۔ کھڑکی پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ اندر روشنی تھی۔ وہ روشنی میں سونے کی عادی نہیں تھی۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ وہ جاگ رہی ہے۔

اس وقت ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ اگرچہ آواز بہت ہی دھیمی سی تھی۔ مگر وہ رانی کی مزمر ہنسی کو پہچانتا تھا۔ پہلے تو وہ مسکرایا کہ چلو موڈ اچھا ہے۔ ”جب عورت کا موڈ اچھا ہوتا ہے تو وہ مہربان ہو جاتی ہے۔ فیاضی سے پیش آتی ہے..... اسے امید سی بندھ گئی کہ حسینہ مان جائے گی۔ وہ کوئی مزاحمت اور دفاعی جدوجہد نہیں کرے گی اور برہم نہیں ہوگی۔

پھر اسے اچانک یہ خیال آیا کہ وہ اتنی رات کمرے میں تنہا ہو کر فس کیوں رہی ہے؟ کس

اس کے انکل، آنٹی یا اس کے والدین وہاں آ سکتے تھے۔ وہ تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا۔ گھر والے گہری نیند سو رہے تھے اس لئے وہ آواز ان کے کانوں تک نہیں پہنچی۔

اس نے چند لمحوں کے بعد اچھی طرح سے اطمینان کرنے کے بعد کرسی سیدھی کی۔ پھر میز پر چڑھ کر کرسی پر آیا۔ اس پر توازن سے سیدھا کھڑے ہونے کے بعد روشن دان اس کے سر سے ایک فٹ اونچائی پر رہ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر روشن دان پر رکھے اور اپنے بازوؤں کی قوت سے اوپر اٹھنے لگا۔ نیچے اس کے پاؤں کرسی سے اوپر اٹھ رہے تھے۔ روشن دان نزدیک آ رہا تھا۔ کرا آہستہ آہستہ نگاہوں کے سامنے آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ نگاہیں رانی کے پلنگ تک پہنچیں کوئی زور سے اچانک ہی اچھل کر روشن دان پر آ گیا۔

سیاہ رنگ..... خراہٹیں..... گھورتی اور چمکتی ہوئی آنکھیں..... وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ باگڑ بلا خواب گاہ میں ہوگا..... اور اس پر جھپٹنے کے لئے روشن دان تک پہنچ جائے گا۔ اچانک ہی اسے عین نگاہوں کے سامنے دیکھ کر روشن دان پر اس کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ دھڑام کی آواز کے ساتھ وہ کرسی اور میز کو لئے ہوئے قالین پر گر گیا۔

رات کے سناٹے میں مل چلی سی جگہ گئی۔ دور اور نزدیک کے کمروں سے آوازیں آ لے لگیں۔

کمروں کے دروازے کھلنے لگے۔ سب ہی بولنے اور بڑبڑاتے ہوئے وہاں پہنچے۔ رمیش نے فوراً ہی صفائی پیش کی کہ وہ کسی ایسی دیکسی نیت سے ایک جوان لڑکی کے کمرے میں جھانکنے نہیں گیا تھا..... بلکہ جوان لڑکی کے کمرے میں کچھ ہو رہا تھا اور اس کچھ کا پتا چلانے کے لئے وہ روشن دان تک گیا تو اسے وہی کل والا باگڑ بلا نظر آ گیا۔

”وہ بلا اس کے کمرے میں کیسے پہنچ گیا.....؟“ رانی کی ماں نے تشویش کا اظہار کیا۔ پھر سب ہی دروازے پر آ گئے۔ اس کے پتا جی نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے آوازیں دی۔

”رانی بیٹی..... دروازہ کھولو.....“

رمیش نے اپنے بیان میں زور پیدا کرنے کے لئے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

”انکل.....! میں نے رانی کی آواز سنی..... وہ میاؤں، میاؤں کر رہی تھی۔“

”اس کا دماغ چل گیا ہے.....“ باپ نے بگڑ کر غصے سے کہا۔

”میں تو یہ کہتی ہوں کہ اس پر کالے بلی کا سایہ پڑ گیا ہے۔“ اس کی ماں نے کہا۔

اسی وقت دروازہ کھل گیا۔

رانی اس وقت ایک چادر میں لپیٹی ہوئی ان سب کے سامنے کھڑی تھی۔

اس نے گردن سے نیچا پنے تمام جسم کو چادر سے کیوں چھپا رکھا تھا.....؟

یہ سوال کوئی نہیں کر سکتا تھا..... دیکھنے والے سمجھ سکتے تھے۔ وہ بے لباس ہے یا پھر کچھ چھپا ہوا ہے؟ جیسے ایک رات اس کی ماں نے پھٹے ہوئے بلاؤز کو اور دانتوں کے نشانات کو دوسروں سے اچھا کیا تھا۔

رمیش نے دیکھا کہ اس چادر میں رانی کے باریک سے باریک خدو خال نظر آ رہے ہیں۔ اس کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں..... رخساروں پر ایسی سرخی تھی جیسے وہ اندیکھی آگ پر پک رہی ہو؟

آنکھوں میں ایسا کرب تھا جیسے کوئی رنگین سہانا خواب اپنے کلاںکس تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈٹ گیا ہو۔“

وہ سب کمرے میں داخل ہوئے۔ سب کی نگاہیں بلے پر مرکوز ہو گئیں۔

پلنگ پر ساڑی بے ترتیبی کی حالت میں بکھری پڑی تھی اور بلا اس پر بیٹھا ہوا آنے والوں کو اچھا رہا تھا۔

جیسے ہی اس کی نظر رمیش پر پڑی۔ وہ غرایا..... رمیش ایک دم سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس ہی فلاور اسٹینڈ پر گل دان رکھا ہوا تھا۔ اس نے گل دان اٹھا کر بلے کو مارنے کی دھمکی دی۔ بلا ہٹ گیا۔ دوڑتا ہوا اچھل کر الماری کے اوپر آیا۔ پھر وہاں سے دوسری طرف کے روشن دان پر چلا گیا۔ رانی نے فوراً ہی ہاتھ اٹھا کر اسے پکارا۔

”وہاں نہ جاؤ..... واپس آ جاؤ..... تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا..... آ جاؤ..... میرے پاس آؤ..... رمیش گل دان رکھ دو..... چلے جاؤ یہاں سے..... تم میرے بلے کو بھگا رہے ہو.....“

رمیش نے فوراً ہی گل دان رکھ دیا۔ لیکن بلا واپس نہیں آیا۔ روشن دان کے راستے باہر چلا گیا۔ رانی غصے سے پھٹ پڑی۔

”آپ لوگ کیوں آئے ہیں یہاں.....؟ کیا دیکھنے آئے ہیں.....؟ اگر آپ اسے بھگا کر فرش ہو گئے ہیں تو پلیز! اب یہاں سے چلے جائیں..... مجھے سکون سے سونے دیجئے..... میرا سکون عارت تو نہ کریں۔“

”وہ بلا یہاں کیسے آ گیا.....؟“ اس کی ماں نے حیرت سے پوچھا۔

”میں چھت پر جا نہیں سکتی تھی۔ اس لئے وہ یہاں آ گیا..... کیا ایک بلے کو ساتھ رکھنے میں

بھی بدنامی ہے۔“ وہ تلخ لہجے میں بولی۔

”بدنامی کی بات نہیں..... وہ کالا کلونا بلا اسے دیکھتے ہی دہشت طاری ہو جاتی ہے..... تعجب ہے کہ تم اس بھیا تک صورت والے سے ڈرتی کیوں نہیں.....؟ آخر تمہیں اس میں ایسی کیا خاصیت نظر آئی؟“

ڈرنے کی کوئی بات ہو تو ڈرا جائے..... مجھے اس کے بغیر نیند نہیں آتی..... وہ کل بھی میرے ساتھ تھا..... پرسوں بھی میرے ساتھ رہا..... اور میں بڑے سکون سے گہری نیند سوتی رہی..... اس نے مجھے میری بللی کی طرح ذرا بھی ٹھک نہیں کیا۔

وہ سب حیرانی سے اس کا منہ بھنے لگے۔ حیرانی اس بات کی نہیں تھی کہ بلا روز آتا ہے..... بلکہ وہ سوچ رہے تھے کہ کیا ہر بات اس کی سازی اسی طرح پٹنگ پر پڑی رہتی ہے..... وہ جانور ہی سی۔ آخر بلا تھا..... بللی ہوتی تو اس کمرے میں کوئی جھاکنے نہ آتا۔

اس کی ماں نے کہا۔ ”مجھے اس بلے سے دہشت سی ہوتی ہے۔ اگر وہ آیا تو میں اسے بھاگ دوں گی۔“

”ماں..... اب وہ آپ کے پاس کبھی بھی نہیں آئے گا۔“ رانی نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”کیوں کہ میں اسے اپنے کمرے میں بند رکھوں گی اور نہ ہی وہ کسی کے سامنے جائے گا۔ اس صورت میں آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔“

اس کی ماں نے اپنے ہتی کی طرف دیکھا تو اس نے قدرے تلخی سے کہا۔

”رات کے تین بج رہے تھے۔ یہ شریف آدمیوں کے سونے کا وقت ہے۔ ابھی میں کسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ رانی سے صرف اتنا کہتا ہوں کہ وہ جلد از جلد شادی کا فیصلہ کرے۔ شادی کے بعد وہ بلا تو کیا ہاسٹی بھی پال سکتی ہے۔ چلو اب سونے دو۔“

یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلے گئے۔ ان کے پیچھے سب ہی جانے لگے۔ ریش نے قریب آ کر اسے بازوؤں میں بھر کر کہا۔

”رانی.....! میری رانی.....! تم نے مجھ سے شادی کر کے میری رانی بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر مجھ سے اچانک ناراض کیوں ہو گئی ہو؟“

رانی نے جواب دینے کے لئے ہونٹوں کو کھولنا چاہا تو ریش کے ہونٹوں نے اسے تھوڑی دیر تک بولنے نہیں دیا۔ رانی میں سردمہری سی تھی۔ پہلے کی طرح گرم جوشی نہ تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے کوئی تعرض نہ کیا۔ اپنے آپ کو ریش کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ لیکن چادر کا کونا مضبوطی سے پکڑے رہی کہ کہیں وہ پھسل نہ جائے۔ چادر پھسلنے سے ریش کا ہیر بھی پھسل سکتا تھا۔ وہ کسمسا کر بولی۔

”اب مجھے چھوڑو..... دیکھو..... وہ دیکھ رہا ہے۔“

رانی نے اتنا کہہ کر روشن دان کی طرف دیکھا۔ وہ وہ بلا پھر آ گیا تھا۔ وہ ریش کو گھور کر دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کسی رقیب رو سیاہ کی طرح چنگاریاں برسا رہی تھیں۔ رانی نے اس سے الگ دوتے ہوئے کہا۔

”میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ ناراض ہوتی تو تمہارے بازوؤں میں سامنے جاتی..... بات یہ ہے کہ یہ بلا تم سے ناراض ہے۔ اگر تم یہاں تھوڑی دیر اور رہے..... بھکتے رہے تو پھر یہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ اس لئے اب تم چلے جاؤ۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے وہ صبح کہنا..... اس لئے اب کچھ نہیں سنوں گی۔ چوں کہ بہت دیر سے جاگ رہی ہوں۔ اس لئے بڑے زور کی نیند آ رہی ہے۔“

وہ مایوسی سے سر جھکا کر رانی کی خواب گاہ سے باہر نکل آیا۔ وہ صبح تک رہنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ رانی جذبات کی رو میں بہہ کر اس پر مہربان ہو جائے تو پھر شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے گی۔ دوسری طرف وہ اس بات سے خوش تھا کہ رانی نے اس سے نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ اسے سن مانی گزرنے دی۔

اس نے باہر آ کر کمرے کی جانب دیکھا۔ وہ باگز بلا روشن دان سے کود کر الماری پر پہنچ گیا تھا۔ پھر وہاں سے کود کر وہ نیچے قالین پر آیا اور رانی کی طرف خراماں خراماں بڑھنے لگا۔

رانی نے لپک کر دروازہ بند کر لیا۔

ریش نے چشم تصور میں دیکھا کہ وہ بلا رقیب رو سیاہ اپنی بھیلی دو ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا ہے۔ اور بے اگلے دو بازو پھیلا کر رانی کو بازوؤں کے حصار میں لے رہا ہے۔ یہ اس کا خیال تھا۔ اندازہ تھا نہیں جانتا تھا کہ یہ سچ ہے یا نہیں۔

وہ منھیاں جھنجھ کر بند دروازے کی طرف دیکھتا رہا اور اندر ہی اندر سچ و تاب کھاتا رہا۔

پھر وہ کمرہ دن رات اندر سے بند رہنے لگا۔

گھر کی عورتیں بلے سے ڈرتی تھیں۔ شدید ترین نفرت کرتی تھیں۔ خار کھاتی تھیں۔ اس لئے کوئی بھی اس کی خواب گاہ تک نہیں جاتا تھا۔ گھر میں کام کرنے والی ملازمہ نے بھی وہاں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ بلا اسے دیکھ کر یوں غراتا تھا جیسے اس پر چھلانگ لگانا چاہتا ہو۔ پھر رانی نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے کمرے کی صفائی خود ہی کر لیا کرے گی۔ اسے کسی ملازمہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس کے رہنے سہنے کے طور طریقے بدلتے جا رہے تھے۔ کبھی ناز و خروش کی پالی ایک تنکا بھی اٹھا کر ادھر سے ادھر نہیں رکھتی تھی۔

لیکن اب وہ اپنے کمرے کی صفائی خود ہی کرتی تھی۔ کھانے کا وقت ہوتا تو کھانا ٹرے میں رکھ کر اپنے کمرے میں خود لے جاتی تھی اور اپنی خوراک سے زیادہ کھانا لے جاتی تھی۔ سب ہی سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ بلے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ روزانہ ایک کلو گوشت اور دو لیٹر دودھ کا خرچ بڑھ گیا تھا۔ مکھن، تازہ پھل اور سوکھے میوے بھی اس کمرے میں ہضم ہو جاتے تھے۔

بہی باتیں سوچنے پر مجبور کرتی تھیں کہ وہ باگڑ بلا آدی ہے یا جانور.....؟

بلے گوشت کھا سکتے ہیں اور دودھ پی سکتے ہیں مگر پھل، میوہ جات اور مکھن کو سونگھ کر بھی نہیں دیکھتے ہیں..... اگر وہ سب کچھ رانی کھا لیتی ہے تو تنہا اتنی چیزیں کھا کر کیسے ہضم کر لیتی ہے؟ باتیں جو عقل تسلیم نہیں کرتی ان پر کیسے یقین کیا جاسکتا ہے؟

اس کے پتاجی، انکل اور ریش اپنے اپنے اطمینان کے لئے ایسے وقت اس کے کمرے میں جب وہ دن کا یا رات کا کھانا کھا چکی تھی۔ دروازہ ہمیشہ اندر سے بند رہتا تھا۔ صرف دستک دینے پر کھلتا تھا۔ جب وہ کمرے سے نکلتی دروازے کو باہر سے مقفل کر دیتی۔ یعنی کوئی اس کی عدم موجودگی میں کمرے کے اندر جا نہیں سکتا تھا۔ یوں بھی بڑے گھروں میں باپ، بیٹیاں اور بیٹے بغیر اجازت کسی کے کمرے میں داخل نہیں ہوتے ہیں۔ لیکن رانی کمرے کو مقفل کر کے کچھ زیادہ ہی احتیاط سے کام لیتی تھی۔ اس طرح انہیں شبہ میں مبتلا کرتی تھی۔ بہر حال اس کے پتاجی نے اس کے کمرے میں جا کر دیکھا تھا۔ وہ کھانے پینے سے فارغ ہو گئی تھی۔ اس کے سامنے سینئر ٹیبل پر رکھی ہوئی پلیٹیں ایسی صاف ہو گئی تھیں جیسے پلی بلے کی طرح زبان سے چاٹ کر صاف کی گئی ہوں۔ ایک آدھ پھل اور میوے نظر آ رہے تھے۔ کچھ دیر میں وہ بھی ختم ہونے والے تھے۔ میز پر بیٹھا ہوا بلا ایک بڑے سے پیالے میں منہ ڈالے زبان نکال کر پڑ پڑ کی آوازیں نکالتا ہوا دودھ پی رہا تھا۔

اس کے پتاجی نے یہ منظر دیکھا تو حیرانی سے پوچھا۔

”رانی بیٹی! تمہاری خوراک تو بہت ہی کم تھی۔ اس لئے بھی تم نے اپنی خوراک کم رکھی تھی کہ جسم موٹا نہ ہو جائے۔ جسم متناسب رہے۔ بڑی احتیاط برتی تھیں۔ لیکن معاملہ برعکس ہے..... مگر اب تم یہ تمام چیزیں کیسے کھا لیتی ہو جب کہ بلا زیادہ سے زیادہ گوشت کھا سکتا ہے یا دودھ پی سکتا ہے۔ پھل اور خشک میوہ جات کا کھانا سمجھ سے بالاتر ہے۔“

”میری خوراک اس روز سے بڑھ گئی ہے جب سے یہ بلا آیا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اس لئے کہ میں اس کے ساتھ ہنسی کھیتی اتنا کھا لیتی ہوں کہ مجھے خود بھی حیرت ہوتی ہے۔ اب مجھے اپنی جسمانی خوب صورتی کا خیال اس لئے نہیں رہا کہ اسے لے کر کیا کرنا ہے۔ یوں بھی میری کاٹھی ایسی ہے کہ میں مرغن کھاؤں یا خوب پیٹ بھر کر ایسی ہی رہوں گی..... کیا آپ اس بات سے خوش

میں ہیں کہ میں پہلے سے زیادہ صحت مند ہو گئی ہوں.....؟“

رانی نے یہ بات غلط نہیں کہی تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کا جسم کسی ریلے پھل کی طرح ہو گیا تھا۔ وہ اور دلکش ہو گئی تھی۔ اولاد کی صحت مندی رہے تو ماں باپ یقیناً خوش ہوتے ہیں۔ اس کے پتاجی نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

”میں بہت ہی خوش ہوں بیٹی.....! لیکن مجھے یہ بات قطعی پسند نہیں کہ تم دن رات کمرے میں کسی قیدی کی طرح بند رہو۔ کسی سے کوئی تعلق نہ رکھو..... یہ بات مجھے بالکل بھی پسند نہیں..... تمہیں گھر والوں کے ساتھ ہنسا بولنا چاہئے۔ تفریح کے لئے باہر جانا چاہئے تم محض اس بلے کی خاطر اپنی سماجی زندگی کو بھلا دو۔ ہر کسی سے ملنا جلنا اور تقریبات میں جانا بند کر دو۔“

”پتاجی.....! کچھ دنوں میں یہ مجھ سے اچھی طرح مانوس ہو جائے گا تو میں اسے لے کر باہر نکلا کروں گی..... بس کچھ دنوں ہی کی تو بات ہے۔“

اس کے پتاجی کو یہ اطمینان ہو گیا کہ لڑکی اچھا کھا رہی ہے۔ صحت مند ہوتی جا رہی ہے۔ پہلے کی نسبت اس کی صحت قابل رشک ہو گئی۔ اسے بچپن سے ہی بلیاں پالنے کا شوق جنون کی حد تک رہا۔ اس نے بلے بھی پالے تھے لیکن وہ رہے نہیں تھے۔ صرف بلیاں تھیں جو ساتھ رہتی تھیں۔ آسامی ملی آنے کے بعد وہ اسے اتنی پسند آئی کہ دوسری بلیاں سہیلیوں کو دے دی تھی۔ اپنی ساری قوم اور محبت اس آسامی ملی پر مرکوز کر دی تھی۔ اس کی موت کے بعد اس کا غم بلے سے بھلا کر دور کر رہی تھی۔ اس میں تشویش اور تردد کی کوئی بات نہ تھی..... ان کا اطمینان دیکھ کر گھر والے بھی مطمئن ہو گئے۔

پھر ان کی لاڈلی بیٹی نے ایک دن گھر والوں سے فرمائش کی کہ اسے رانی نہ کہا جائے بلکہ چندا کہہ کر مخاطب کیا جائے۔

”یہ چندا بھی کوئی نام ہے۔“ اس کی ماں نے کہا۔ ”تمہارا نام جو رانی رکھا ہے اس سے اچھا کوئی اور نام تمہارے لئے موزوں نہیں ہو سکتا..... تم واقعی قصہ کہانیوں کی رانی کی طرح ہو۔ لاکھوں میں ایک ہو۔“

”یہ نام نہیں عرفیت ہے۔“ رانی نے تکرار کی۔ ”مجھے یہ اچھا لگتا ہے..... رانی کہنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میں نازک اور ملائم بالوں والی کوئی ایرانی ملی ہوں۔ عورتوں کی نہیں، قصہ کہانیوں کی نہیں بلکہ بلیوں کی رانی ہوں۔“

سب حیرت سے اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ وہ انسان کی اولاد ہو کر خود کو بلی محسوس کر کے خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ ایک عجب سی بات تھی۔ انہیں ایسا لگا تھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

اس کی ماں نے چیخ کر کہا۔

”میں اب بھی کہتی ہوں اور کہتی آ رہی ہوں کہ اس پر اس منحوس بے کاسایہ پڑ گیا ہے۔“
 بلا نہیں کوئی آتما ہے جو بلا بن کر اس پر آ گیا ہے۔ مگر میری کوئی سنتا ہی نہیں۔ دیکھ لیتا۔ یہ لڑکی کی
 دن پاگل ہو جائے گی۔“

اس کے پتا بھی جو موجود تھے وہ رانی کی بات سن کر غصہ ہونے کے بجائے ہنس کر بولے۔
 ”یہ تم جذباتی کیوں ہو رہی ہے۔۔۔۔۔؟ رانی مذاق کر رہی ہے۔ خود کو بلی محسوس کرنے سے وہ
 بلی تو نہیں بن جائے گی؟“

رانی نے یہ بات سن کر باپ کی طرف انگلی اٹھائی اور بڑے لاڈ سے بولی۔
 ”پتا جی۔۔۔۔۔ کوئی کہے نہ کہے۔۔۔۔۔ لیکن آپ تو مجھے چندا کہئے۔ کیا میں چاند کی مانند نہیں
 ہوں۔ چودھویں کا چاند نہیں ہوں؟“

”اچھا بیٹی۔۔۔۔۔ تم آج سے چندا ہو۔ میری بیٹی چاند کا کھڑا ہے۔ آج سے تمہیں چندا کہہ کر
 پکاریں گے۔“

بیٹی کی بڑی سے بڑی ضد پوری کی جاتی تھی۔ پھر وہ ضد کیسے پوری نہ کی جاتی۔ جب باپ لے
 اسے چندا کہہ کر مخاطب کیا تو سبھی اسے چندا کہنے لگے۔ باپ نے جیسے فرمان جاری کیا تھا کہ وہ آج
 سے رانی نہیں چندا ہے۔

یہ سچ ہے کہ عورت کو عورت ہی سمجھتی ہے۔۔۔۔۔ رانی کے بدلتے ہوئے تیور اور رنگ روپ کو اس
 کی ماں اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔۔۔۔۔ کیوں کہ رانی اب پہلے جیسی رانی نہیں رہی تھی۔ وہ سابقہ حالت
 کی بالکل بھی نہیں لگ رہی تھی۔ جسم پہلے سے زیادہ بھر گیا تھا اور ابھر گیا تھا۔ چہرے پر بھی کئی تازگی
 نہیں تھی بلکہ کھلے ہوئے پھول کی شکلی آگئی تھی۔ گداز بازو، اندھا ہوا سینہ اور پھیلتے ہوئے کو لمبے ہاتھ
 رہے تھے کہ وہ کسی کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے۔ مگر اپنا شہر ظاہر کرنے کے لئے کوئی ثبوت نہ
 تھا۔۔۔۔۔ ریش پر شک نہیں کیا جاسکتا۔ رانی دن رات کمرے میں رہتی یا پھر نشست گاہ میں آ کر اپنے
 باپ سے باتیں کرتی تھی۔۔۔۔۔ اب وہ نہ کسی بوائے فرینڈ سے ملنے جاتی اور نہ کوئی دوست لڑکا اس سے
 ملنے کسی طرح آتا۔ ریش سے تو سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی تھی۔۔۔۔۔ اس کی ماں یہ بات سمجھنے
 سے قاصر تھی کہ کنواری لڑکی کا بدن کس طرح اور کس آگ میں۔۔۔۔۔ تب کرکندن بنتا جا رہا تھا۔

پھر ایک ماہ کے بعد اس عرصے میں کچھ چھوٹی موٹی چوریوں کا انکشاف ہوا۔۔۔۔۔ ریش کی
 الماری سے ایک پتلون اور قمیض غائب اس نے ادھر ادھر تلاش کیا۔ پھر یہ سوچ کر نہ جانے کسی
 لاغری میں وہ کپڑے دے کر بھول گیا ہے۔۔۔۔۔ اس نے رسیدیں تلاش کی۔ یہ کپڑے نئے اور قیمتی

بھی تھے۔ اس نے صرف دو ایک مرتبہ ہی پہنے تھے۔ پھر دوسرے ہفتے ایک اور جوڑا غائب ہو گیا۔
 جب رانی کی ماں کو علم ہوا تو وہ یہ سمجھی کہ یہ کسی ملازم کا کام ہے۔ تمام ملازموں کو بلا کر ڈانٹ ڈپٹ کی
 مٹی مگر گرم شدہ کپڑے برآمد نہ ہوئے پھر ایک دن اور صبح کے وقت رانی کے پتا جی نے واش روم میں
 اپنا شیونگ کٹ غائب پایا۔ اس چوری کے بعد ملازموں کی شامت آئی۔ ملازموں نے رانی کی ماں
 سے کہا کہ وہ برسوں سے اس گھر کا نمک کھا رہے ہیں آج تک انہوں نے کوئی ایک چیز بھی بغیر
 اجازت نہیں لی۔۔۔۔۔ ایک روپیہ تک نہیں اٹھایا۔۔۔۔۔ ان کی بات غلط نہ تھی ایک نہیں متعدد مرتبہ ایسا ہوا
 تھا کہ کسی بے سوچاس کے نوٹ پر یا جیب سے نکل کر گر گئے۔۔۔۔۔ سونے کی دو ایک چیزیں بھی
 ملیں جو انہوں نے ان کے ملنے پر رانی کی ماں کو دے دی تھیں۔ وہ سب نہایت ایماندار اور فرض
 شناس بھی تھے۔ تمام مرد محتاط ہو گئے اور اس تاک میں رہنے لگے کہ دیکھیں کہ آئندہ ان کی چیزیں
 کون چرا کر لے جاتا ہے۔

کوئی ایک ہفتہ کے بعد رات کے دس بجے اطلاعی گھنٹی بجی۔ ایک ملازم نے آ کر بتایا کہ ایک
 پولیس آفیسر دو سپاہیوں سمیت آیا ہوا ہے۔ رانی گئے پتا جی فوراً ہی بیرونی دروازے پر پہنچے۔ پولیس
 انسپکٹر نے انہیں دیکھتے ہی سوال کیا۔ ”کیا یہ آپ کا مکان ہے؟“

”جی ہاں۔“ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
 ”آپ کا نام۔۔۔۔۔؟“
 ”میرا نام جگن ناتھ ہے۔ کیا بات ہے؟ کیا آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟“ انہوں نے
 پوچھا۔

”جی ہاں جگن ناتھ صاحب۔۔۔۔۔! آپ نے اپنے ہاں ایک پاگل کو چھپا رکھا ہے؟“
 ”پاگل۔۔۔۔۔؟“ ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرے
 ہاں کوئی پاگل نہیں ہے۔ میں نے کسی کو بھی اپنے ہاں چھپایا ہوا نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو
 شاید غلط فہمی ہوئی ہے۔“

انسپکٹر نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر انہیں دکھاتے ہوئے پوچھا۔
 ”کیا یہ شخص آپ کے مکان میں موجود نہیں ہے؟ وہ آپ کے ہاں رہتا ہے؟“
 ”جی نہیں۔۔۔۔۔“ جگن ناتھ نے اس کے ہاتھ سے تصویر لے کر دیکھنے کے بعد جواب دیا۔
 ”اچھا یہ بتائیں کہ وہ جو کچھ کچی گلی کی طرف آپ کے مکان کی تیسری کھڑکی ہے۔ اس میں کون
 رہتا ہے؟“

”وہ میری بیٹی کا کمرہ ہے اور وہ صرف اس میں رہتی ہے۔ کوئی اور نہیں؟“

”گھبرانے اور پریشان ہونے کی بات نہیں۔“ جگن ناتھ نے تسلی دی۔ ”میں جب تک نہ بلاؤں۔ وہاں کوئی نہ آئے؟“

عورتیں دوسرے کمرے میں چلی گئیں تو وہ انسپکٹر کو لے کر رانی کے کمرے پر دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھل گیا۔

رانی نے حیرت سے انسپکٹر کو دیکھا۔ پہلے تو گھبرائی۔ پھر اس نے فوراً ہی سنبھل کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے ہتاجی.....؟ آپ پولیس کو لے کر کس لئے آئے ہیں؟ خیریت تو ہے؟“ ”پولیس کو ایک پاگل کی تلاش ہے.....“ انہوں نے جواب دیا۔ ”انہیں شبہ ہے کہ وہ تمہارے کمرے میں موجود ہے۔ تم ایک طرف ہٹ جاؤ۔ تاکہ وہ کمرے کی تلاشی لے کر اپنا شبہ دور کر لیں۔“ اس نے خاموشی سے ایک طرف ہٹ کر انسپکٹر کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ اسے دیکھتے ہی بلا اچھل کر الماری پر چلا گیا۔ پھر وہاں سے روشن دان میں پہنچ گیا۔ انسپکٹر حیرت سے اسے گھور رہا تھا۔ بلے نے اسے غرا کر دیکھا۔ پھر انسپکٹر نے رانی سے پوچھا۔

”کیا یہ بلا پالتو ہے؟“

”جی ہاں۔“

”کیا یہ آپ کو نقصان نہیں پہنچاتا؟“

”جی نہیں.....“ رانی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نقصان پہنچانے والے جانور پالے نہیں جاتے ہیں۔“

”پالے جاتے ہیں۔“ انسپکٹر نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ”بندر، شیر اور چیتے بھی پالتے ہیں، کیا آپ نے سمیروں کو نہیں دیکھا جو سانپوں سے کھیلتے ہیں.....“

انسپکٹر نے ایسی بات کہی تھی کہ رانی لا جواب ہو کر رہ گئی۔ سچی بات تھی۔ لوگ کیا کیا نہیں پالتے تھے۔

انسپکٹر نے اپنے سپاہیوں کو اندر بلا یا جو باہر کھڑے ہوئے تھے۔

”تم لوگ اس کمرے کی تلاشی لو۔ شاید بلا کہیں یہیں چھپا بیٹھا نہ ہو؟“

پھر انسپکٹر کے حکم پر سپاہی پلنگ کے نیچے جھانک رہے تھے۔ الماری کھول کر دیکھ رہے تھے۔ اس کے پیچھے اور سنگار میز کے بھی پیچھے..... کوئے کھدروں میں بھی..... جہاں جہاں انہیں شک تھا وہاں دیکھ کر اپنی تسلی کر رہے تھے۔ انہوں نے واش روم میں بھی جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ اب کوئی ایسی جگہ نہیں رہی تھی جہاں اسے تلاش کیا جاسکے۔ جس پاگل کی تلاش تھی وہ نہ ملا۔ وہ حیران تھے کہ کیا اسے زمین کھا گئی یا پھر کمرے کی چھت.....؟ آسمان کھانے سے رہا۔ کیوں کہ اس کی راہ میں چھت،

پھر دوسرے ہی لمحے ان کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا..... بہت سے مبہم شبہات یقین کی حد تک چھوٹنے لگے۔ اب کیوں اور کیسے کے سوالات ذہن میں گلابانے لگے..... مثلاً رانی دن اور رات کمرے کو اندر سے بند کیوں رکھتی ہے؟ اپنی خوراک سے زیادہ کیسے کھا لیتی ہے.....؟ دو آدھیوں کی خوراک کیسے ہضم کر لیتی ہے.....؟ کیا اس نے اپنے کمرے میں کسی کو چھپا رکھا ہے؟ جگن ناتھ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ انہوں نے بیٹی کے کمرے میں جا کر پلنگ کے نیچے یا واش روم میں جھانک کر کیوں نہیں دیکھا۔ پھل، خشک، میوہ جات اور مکھن اور گلوڈ بڑھ کلو ہضم کرنے والا شخص وہاں ہو سکتا ہے۔

وہ سوچ رہے تھے۔ خیالات کے گرداب میں الجھے ہوئے تھے۔ انسپکٹر نے ان کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کیا سوچتے لگے ہیں.....؟ کیا میں محض الزام تراشی کر رہا ہوں؟“

”جی.....“ وہ بڑبڑا کر سوچوں کی دنیا سے نکل کر بولے۔ ”آپ نے یہ تصور مجھے دے دیں

تاکہ میں اپنی بیٹی کو دکھاؤں..... ہو سکتا ہے کہ اس نے اس پاگل شخص کو دیکھا ہو؟“

”آپ کی صاحب زادی اسے اپنے کمرے میں دیکھ رہی تھیں۔“ انسپکٹر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”ابھی آدھ گھنٹہ پہلے کی بات ہے کچھلی گلی میں گشت کرنے والے سپاہی نے اس پاگل کو اس کمرے کی کھڑکی کے پاس دیکھا ہے۔ ایک لڑکی کھڑکی کھول کر پھلوں کے جھلکے باہر پھینک رہی تھیں۔ کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا ہوا تھا۔ سپاہی نے گلی سے گزرتے وقت اس پاگل کو کمرے میں دیکھا۔ ہو سکتا ہے اسے دھوکا ہوا ہو۔ مگر ہم تصدیق کرنا چاہتے ہیں۔ آپ سمجھ دار ہیں اور قانون کو سمجھتے ہیں۔ ہمارے پاس آپ کے مکان کی تلاشی کا اجازت نامہ نہیں ہے۔ اس لئے میں آپ سے اجازت طلب کر رہا ہوں۔ اس میں آپ کی صاحب زادی کی بھلائی ہے۔ کیوں وہ پاگل جوان لڑکیوں کے لئے بے حد خطرناک ہے۔“

جگن ناتھ اس کی بات سن کر بڑے زور سے چوٹے اور اسے پریشان نظروں سے دیکھا۔ پھر بے جان لہجے میں بولے۔

”آپ میرے ساتھ آئیے..... میں آپ کے ساتھ ہر ممکن تعاون کروں گا۔“

وہ انسپکٹر کو لے کر نشست گاہ میں آئے تو گھر کی عورتیں جمع تھیں۔ ملازم نے عورتوں کو متا دیا تھا کہ پولیس آئی ہوئی ہے..... وہ بے حد پریشان اور خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ ان کی بیوی نے بدعواں ہو کر پوچھا۔

”یہ پولیس کیوں آئی ہے اتنی رات.....؟ خیریت تو ہے نا؟“

انسپکٹر نے پریشان ہو کر بے بسی سے روشندان کی طرف دیکھا اور تیزی سے پوچھا۔

”کیا آپ بتائیں گی کہ وہ بلا کتنی مدت سے آپ کے پاس ہے.....؟“

”کتنی مدت سے بھی ہے.....؟ میں نے اس دن کی تاریخ لکھ کر نہیں رکھی ہوئی ہے.....“

رانی نے تڑپے جواب دیا۔ ”یہ کوئی سوال ہے؟“

رانی کے پتا جی نے سکون و اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ انہیں لگا کہ ان کے سر سے منوں بوجھ اتار گیا ہے اور اعصاب پھول کی طرح پٹکے ہو گئے ہیں۔ نہ صرف ان کی بیٹی بلکہ ان کا گہرا نہ کتنی بڑی رسوائی اور بدنامی سے بچ گیا۔ اگر رانی کے کمرے سے کوئی آدمی برآمد ہو جاتا تو ان کی ناک کٹ جاتی۔ ذلت و خواری اٹھانا پڑتی..... لڑکے کے کمرے سے لڑکی بازیاں ہوتو اتنی بدنامی نہیں جتنی لڑکی کے کمرے سے کسی غیر شخص کا نکلتا..... لڑکی پر آج آنا زیادہ بربادی کا باعث ہوتا ہے۔

انہیں اس بات پر بھی سخت غصہ آیا تھا کہ پولیس محض اپنا شک و شبہ دور کرنے کے لئے آئی اور ان کی لڑکی کے کمرے کی بھی تلاشی لی۔ آدمی نہیں ملا تو بلا تلاش کیا جانے لگا۔ یہ کیا بات ہوئی۔ کیا کسی شریف آدمی کی عزت سے اس طرح کھیلا جاتا ہے۔ محلے کے لوگ پڑوس جانے کیا کیا سوچ نہیں رہے ہوں گے.....؟ کتنی بدنامی کی بات ہے۔

اب چوں کہ ان کے گھر پر آج نہیں آئی تھی اس لئے وہ شیر ہو کر بولے۔

”انسپکٹر صاحب! آپ ایک پاگل اور مشتعل آدمی کی تلاش میں یہاں آئے تھے نہ کہ کسی بے گناہ کی تلاش میں.....؟ آدمی نہ ملا تو بلا تلاش کرنے لگے جیسے اس پاگل نے بلبے کا روپ دھار لیا ہو.....؟ یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔ بہر حال میں نے اور میری بیٹی نے قانون کا بڑا احترام کیا ہے..... آپ کو سرچ وارنٹ کے بغیر تلاشی لینے دی..... لیکن بڑی عجیب اور مضحکہ خیز بات ہے کہ آپ پالتو جانور کے متعلق سوالات کرنے لگے..... اس طرح آپ اپنا اور ہمارا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ اس میں آپ کی سبکی اور جگہ ہنسائی ہوگی۔ لہذا اب اس کمرے سے نکلیں اور لڑکی کو سونے اور آرام کرنے دیں.....“

انسپکٹر کے چہرے پر غمت چھا گئی۔ رانی کے پتا جی نے اس کی طبیعت صاف کر دی تھی۔ انہوں نے کوئی غلط بات نہیں کی تھی۔ کھری کھری سنا دی تھی۔ انسپکٹر اپنے سپاہیوں کے ساتھ کمرے سے باہر جانے لگا۔ دروازے پر پہنچ کر وہ لمحے کے لئے رکا..... اس نے پھر ایک بار رک کر روشن دان کی جانب دیکھا تو اس کی آنکھوں میں شک و شبہ کی پرچائیاں تھیں۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔ ان سب کے باہر نکلتے ہی رانی نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر سے چٹختی لگا دی۔ اس نے

اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ پھر بڑبڑائی۔

”الحق..... گدھا..... اسے کیا ضرورت تھی تنگ دھرا ساں کرنے کی۔“

نشست گاہ میں پہنچ کر رانی کے پتا جی سے انسپکٹر نے کہا۔

”میں تنہائی میں آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کسی کو اندر نہ آنے دیں۔“

”کیا آپ تلاشی لینے کے بعد مطمئن نہیں ہیں؟“ رانی کے پتا جی نے تنخی سے کہا۔

”نہیں۔“ انسپکٹر نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ ”میں تلاشی کے بعد کچھ اور الجھ گیا ہوں۔ میں

جو کچھ کہنا چاہتا ہوں اسے سن کر شاید آپ بھی الجھن میں مبتلا ہو جائیں۔ اس لئے کہ بات ہی کچھ ایسی ہے؟“

آپ کچھ نہ کہہ کر بھی مجھے الجھا رہے ہیں۔“ رانی کے پتا جی نے پریشان ہو کر کہا۔ پھر صوفہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”تشریف رکھیے۔“

انسپکٹر نے سپاہیوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ رانی کے پتا جی بھی اس کے برابر والے صوفہ پر بیٹھ گئے۔

انسپکٹر نے پاگل کی تصویر جیب سے نکال کر ان کی طرف بڑھائی۔

”آپ اس تصویر کو غور سے دیکھئے اور میری بات غور اور توجہ سے سنیں۔“ انسپکٹر کہنے لگا۔ ”یہ ایک نہایت خوب رونو جوان ہے..... آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ آج سے نصف صدی پہلے بھی ہایاسی نو جوان تھا۔ خوب روتا تھا۔“

”یہ کیسے ممکن ہے.....؟“ رانی کے پتا جی نے متعجب ہو کر انسپکٹر کی صورت دیکھی۔

”ہاں..... یہ ممکن نہیں ہے..... ناقابل یقین بھی ہے..... لیکن آج بھی لوگ مافوق الفطرت

الفاظ سناتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے ایسے ایسے واقعات دیکھے ہیں جنہیں سن کر عقل تسلیم نہیں کرتی ہے۔ بس وہ من گھڑت اور فرضی اور سنسنی کہانیاں ہوتی ہیں جو سننے والوں کو

مکراتی ہیں..... میں تو ہم پرست نہیں ہوں اس لئے ایسی باتوں کو تسلیم نہیں کرتا..... میں نے اپنے

قلم سے رائے قائم کی ہے کہ یہ پاگل اپنے باپ کا ہم شکل ہے۔ آج سے پچاس برس پہلے اس کے

باپ کو جوانی کی حالت میں دیکھا گیا تھا..... لہذا یہ اس کے باپ کا ہم شکل ہے..... اب اس کے ہم

شکل بننے کو دیکھ کر یہ قیاس آرائی کی جا رہی ہے کہ وہ پچاس برس سے جوانی کی عمر گزارتا چلا آ رہا ہے..... کیا یہ مضحکہ خیز بات نہیں ہے؟“

”واقعی یہ جالوں کی سی باتیں ہیں۔“ رانی کے پتا جی نے اس کی تائید کی۔

”اب میں آپ کو کچھ ایسے واقعات سناتا ہوں جو چالیس برس قبل رونما ہوتے رہے۔“ انسپکٹر

کہنے لگا۔ ”ان دنوں چندن پور میں یہ بات مشہور تھی کہ وہاں ہر دوسرے، تیسرے دن ایک نادیدہ ملا آتی تھی جو کسی کتے یا بلی کا خون چوس کر چلی جاتی۔“

رانی کے پتا جی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ چندن پور رانی کی ماں کا انخیال تھا اور اس کی می بارہ انخیال کے یہ قصے سنا چکی تھی۔ انہوں نے انسپٹر سے کہا۔

”بعد میں وہ بلانو جوان، حسین اور کنواری لڑکیوں کے پیچھے پڑ گئی تھی۔“

انسپٹر کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ وہ بری طرح چونک گیا۔

”کیا آپ نے بھی یہ واقعات سنے ہیں.....؟ کس سے.....؟“

”جی ہاں..... چندن پور میری پتی کا انخیال ہے۔ ان دنوں میری پتی بہت چھوٹی تھیں۔ وہ اپنی نانی سے یہ باتیں سنتی رہتی تھیں۔“

”اچھا.....!“ انسپٹر کا لہجہ تحیر زدہ تھا۔ چند پور کے تھانے میں ان واقعات کا باقاعدہ ریکارڈ موجود ہے..... پولیس نے تفتیش شروع کی تھی۔ لیکن وہ بلا کچھ عرصہ کے لئے روپوش ہو گئی۔ تقریباً چھ ماہ کے بعد اس علاقہ میں ایک نو جوان آیا۔ وہ کون تھا.....؟ کہاں سے آیا تھا.....؟ کیوں آیا تھا.....؟ نہ تو اس سلسلے میں اس نو جوان نے اپنی زبان کھولی اور نہ ہی پولیس دوسرے ذریعے سے کچھ معلوم کر سکی۔ وہ نو جوان اسی تصویر والے پاگل کا ہم شکل تھا۔

آپ نے یہ تصویر دیکھی ہے۔ آپ یقین کریں کہ وہ اس تصویر سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ اس کی آنکھیں نیلی ہیں۔ رات کو بے کی آنکھوں کی طرح چمکتی ہیں۔ وہ وجہہ اور دراز قد ہے اور صحت مند بھی ہے۔ ایسی ظالمانہ، حاکمانہ اور مردانہ شخصیت کا مالک ہے کہ عورتیں بھی ایک ہی نظر میں اس کی طرف کھینچ چلی آتی ہیں۔ انہیں اپنے آپ پر تب کوئی اختیار نہیں رہتا۔

ان دنوں بھی عورتیں اس پر جان دیتی تھیں، بہک جاتی تھیں..... یہی حال نو جوان کنواروں کا تھا۔ انہیں اپنی آبرو اور گھر کی عزت کا کوئی خیال نہیں ہوتا تھا..... وہ کسی کے پھل کی طرح اس کی جھولی میں گر جاتی تھیں۔ اس کے پاس کوئی ایسا سحر تھا جس سے وہ انہیں محو کر دیتا تھا۔ اسے کسی جادو کی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہ خود بذات خود جادو تھا..... اس کا مردانہ وجاہت، چوڑا چکلا مضبوط سینہ، نوادہ بازو اور دراز قد..... یہ سب عورتوں اور لڑکیوں کی کمزوری ہوتی ہے۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ایسے مرد کے بازوؤں میں ساجائیں..... سننے والا راج کمار..... زندگی میں ایسا مرد کہاں ملتا ہے.....؟ شادیاں بھی بے جوڑ ہوتی ہیں۔

مرد کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ اسے بھی بھر پور جوان لڑکی ملے..... یہ خواہش مرتے دم تک قائم رہتی ہے۔ وہ اپنی اس خواہش کو اور عورتوں سے پوری کرتے ہیں..... ملازمہ سے..... بازار

میں سے..... وہ ملازماؤں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر اس کی مٹھی گرم کر کے منہ کالا (انسپٹر اس وقت یہ بات کہہ رہا تھا رانی کے باپ کو اپنا مکروہ چہرہ تصور میں آ رہا تھا۔ وہ اپنی ملازمہ کی ہار منہ کالا کر چکے تھے۔ جب بھی موقع ملتا تو ادھر منہ مارتے تھے۔ کیوں کہ ان کی پتی بے راس اور بے کشش جو ہو گئی تھی) جب وہ پہلے پہل محلے میں آیا تو اس کی زبوں حالت کسی کے دھکی چھپی نہیں تھی۔ کپڑے میلے اور پیوند لگے ہوئے اور پیر میں ٹوٹی ہوئی چپل..... وہ ایک اکان کے سا تباہ کے نیچے سو رہا تھا۔ رات کا وقت تھا۔ وہ بھوکا سو رہا تھا۔ محلے کی مال دار اور عورت جس کی عمارت چار منزلہ اور اس میں بیس کمرے کرائے پر اٹھے ہوئے تھے۔ وہ دنیا میں اکیلی تھی۔ چالیس برس کی عمر کی عورت..... اس عمر میں بہت خوب صورت، گٹھے ہوئے بدن اور شباب اور گداز تھی۔ اس سے کئی مرد شادی کے خواہش مند تھے۔ لیکن اس نے سو گند کھائی ہوئی تھی۔ وہ شادی نہیں کرے گی۔ اس لئے لوگ اس کی دولت کے بھوکے ہیں۔ وہ دھوا ہونے کے بعد اس نے جو شادی کی تھی وہ ناکام ہو گئی اور طلاق کی نوبت آ گئی۔ کیوں کہ اس کا شوہر اس کی دولت اور جائیداد کے حصول اور لالچ میں اس کے قتل کا منصوبہ بنا رہا تھا جو ایک روز مکمل ہو گیا۔ وہ بڑی رازداری سے مردوں سے دل بہلاتی تھی۔ وہ اس رات اپنے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ اسے بستر کے ساتھی کی طلب ہو رہی تھی۔ جوانی کی آگ جل رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔

معا اس کی نظر اس نو جوان پر پڑی جو سا تباہ کے نیچے شنگے فرش پر گردنیں بدل رہا تھا۔ وہ بھوکا تھا اس لئے اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کی نظر جیسے سا تباہ کی ہلکی روشنی میں اس نو جوان پر پڑی وہ اچھل پڑی۔ اس کا سینا سامنے تھا..... وہ اس کا ارمان تھا..... خواہش تھی..... وہ ایک کنواں تھا جس سے اس کی پیاس بجھ سکتی تھی۔

پھر وہ اس کے پاس پہنچی..... ایک پیاسا کنواں اس کے پاس گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا تم بھوکے ہو؟“

”ہاں.....“ اس نے اپنا پیٹ پکڑ کر کہا۔ ”دو دن سے..... پانی پی پی کر گزارہ کر رہا ہوں۔“

”اچھا.....“ وہ بولی۔ ”میں پیاسی ہوں اور تم بھوکے ہو..... آؤ۔ میں تمہیں پیٹ بھر کے کھانا کھلاؤں۔“

وہ اسے لے کر اپنے فلیٹ کی طرف بڑھی۔ سڑک اور گلیاں سنسان اور ویران پڑی تھیں۔ اس نے گھر پہنچ کر اسے تیز روشنی میں دیکھا۔ جس طرح ایک شکاری اپنے شکار کو جال

میں پھنسا دیکھتا ہے۔ اس کے پاس دوسرے بچی کے چند جوڑے اور شیونگ کا سامان تھا۔ اس سے کہا کہ شیو کرو..... اچھی طرح سے نہا کر آؤ۔ میں اتنی دیر میں تمہارے لئے کھانا تیار کر لیا ہوں۔

وہ کھانا تیار کر کے میز پر چن کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ وہ نہا کر آیا تو ایک نیا انسان لگ رہا تھا۔ راج کمار لگ رہا تھا۔ پھر وہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کیوں کہ دونوں سے بھوکا تھا۔ جب وہ کھانا کھا چکا تو عورت اس پر ٹوٹ پڑی۔ پھر اسے کچھ رقم بھی دی۔ اس نوجوان کو تیسرے دن ایک دکان پر ملازمت مل گئی۔ لیکن تنخواہ کم تھی۔ اس نے اس محلے میں ایک کمرے کا مکان کرایہ پر لے لیا۔ وہ عورت اسے اس لئے اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتی تھی کہ اس کی بدنامی اور رسوائی ہوتی۔

پھر رفتہ رفتہ اس کے جسم پر اچھے کپڑے نظر آنے لگے۔ ان دنوں ہمارا ملک آزاد نہیں تھا اور نہ ہی عورتیں اتنی آزاد تھیں کہ کھلم کھلا اسے بوائے فرینڈ بنالیتیں..... مگر ہزار پردے دار اور پابندیوں کے باوجود عورتیں خواہشات کے چور دروازے رکھتی تھیں اس سے چوری چھپ لیتیں..... مندروں کے باہر اور بازاروں میں۔ اسے تنھے میں نہ صرف عمدہ لباس اور جوئے دیتیں بلکہ نقد رقم بھی..... کیوں کہ ان کا تعلق امیر گھرانوں سے ہوتا تھا۔ یہ عورتیں اس کے بے وفائی کا مرتکب ہوتی تھیں کہ ان کے بچی بھی بھٹکے ہوئے ہوتے تھے۔ لہذا حساب برابر تھا۔ مرد عورتوں پر رقم لٹاتے تھے۔ عورتیں اپنے محبوب پر..... اس لئے اس نوجوان کی پانچوں انگلیاں گھی میں سرکڑی میں۔

اس دوران تین عورتوں کی گردن پر وہی سائیڈ زخم کے نشانات واضح طور پر دیکھے گئے۔ تینوں زخم ایک جیسے تھے اور ایک ہی مخصوص جگہ پر تھے۔ ان سے پوچھنے پر وہ معقول جواب دے سکیں..... ایک نے کہا کہ رات کو جس کی وجہ سے وہ نیچے فرش پر سو رہی تھی شاید کسی کپڑے نے کاٹ لیا ہوگا..... دوسری نے اپنی سیکلی کو بتایا کہ یہ اس کے بچی کے دانتوں کے نشانات ہیں۔ کیف و مستی کے عالم میں جب بچی بے حد جذباتی ہو جاتے ہیں تو ایسے نشانات پڑی ہاتھ ہیں..... تیسری نے یہ بیان دیا کہ رات اس نے سنے میں ایک سیاہ بلبے کو دیکھا تھا۔ وہ بلا اس کی گردن میں دانت گڑا کر خون چوس رہا تھا۔ اسے کوئی درد یا تکلیف تو نہیں البتہ ایک عجیب قسم کی لذت محسوس ہوئی۔ صبح آنکھ کھلی تو سچ سچ گردن کے اس حصے پر زخم نظر آیا تھا۔

رانی کے ہاتھ اپنے ماتھے سے پسینہ پوچھنے لگے۔ انہیں اس وقت رانی کی گردن کا دم یاد آ رہا تھا..... اور اب یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ انسپکٹر ان سے کالے بلبے کے متعلق کیوں

سوال کر رہا تھا۔

انسپکٹر اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا تھا چند لمحوں کے بعد اس نے اپنی بات جاری رکھی۔
”وہ عورتیں اپنے گناہ کو اور اپنے گنہگار کو چھپانا چاہتی تھیں۔ اس لئے انہوں نے اگلے سیدھے بیانات دیئے تھے۔

حالاں کہ وہ ایک جان لیوا خطرے سے کھیل رہی تھیں۔ وہ روز بہ روز زرد پڑتی جا رہی تھیں۔ اس لیے کہ ان کے جسم میں خون کی مقدار کم ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ خوب رونا جھپٹی ان کے لئے جان سے زیادہ عزیز تھا۔ وہ اس کا نام اپنی زبان پر آنے نہیں دیتی تھیں۔ اس خوف اور ڈر سے کہ اس سے جدائی نہ ہو جائے۔ کیوں کہ اب تک ان کی زندگی میں ایسا جوان آیا تھا اور نہ آ سکتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد ایک جوان لڑکی بیمار ہو کر اسپتال آئی۔ معائنہ کے دوران اس کی گردن پر زخم کا نشان پایا گیا۔ جب اس لڑکی پر سختیاں کی گئیں تو اس نے سب کچھ اگل دیا۔ اس نے اجنبی کا نام بتایا اور یہ بھی بتایا کہ اب وہ نشان گردن کی پشت پر چھوڑ جاتا ہے تاکہ لائے بالوں کے پیچھے وہ نشان چھپا رہے اور عام حالات میں کسی کو نظر نہ آئے..... پھر اس نوجوان کو حراست میں لے لیا گیا۔ اس کا بیان آج بھی چند دن پورہ تھانے کے ریکارڈ کے طور پر موجود ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں کون ہوں؟..... میں نہیں جانتا..... میں اپنے والدین اور رشتہ داروں میں سے کسی کو نہیں پہچانتا..... میں صرف اپنی چندا کو جانتا ہوں۔“

”چندا.....!“ رانی کے ہاتھ چوک کر انسپکٹر کا منہ بکنے لگے۔ رانی خود کو اب چندا کہتی تھی اور اس کی ضد سے مجبور ہو کر اس کے ہاتھ اور گھر کے سارے لوگ اسے چندا کہہ کر مخاطب کرنے لگے تھے۔ ان کی نیگم کی نھیال میں ہونے والے واقعات کی کڑیاں رانی کی زندگی سے آ کر مل رہی تھیں جو ایک عجیب سی بات تھی۔

انسپکٹر اس اجنبی کا بیان دہرا رہا تھا۔

”میں صرف اپنی چندا کو جانتا اور پہچانتا ہوں..... وہ میری بی بی ہے..... کہیں لاپتہ ہو گئی ہے..... میں اسے تلاش کرتا ہوں وہاں آیا ہوں..... آہ! ایک زمانہ تھا جب ہم ہنستے کھیلتے تھے..... پیار سے میاؤں، میاؤں کرتے تھے اور ایک دوسرے کو چومتے چاہتے تھے اور ایک دوسرے کو نوچتے کھوٹتے تھے..... اور پھر ایک دوسرے سے لپٹ کر گھاس پر یا مٹی میں لوٹتے تھے اور ایک ہی پیالے میں دودھ بھی پیا کرتے تھے۔ میاؤں..... میاؤں.....

اس کے بیان سے ظاہر تھا کہ وہ نیم پاگل ہے۔ اسے ایک ماہر نفسیات اور دماغی امراض کے ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا گیا۔ دوسرے دن رپورٹ آئی کہ اجنبی عام حالات میں نارمل ہے۔ لیکن

جوان لڑکیوں کو پا کر وحشی بن جاتا ہے۔ بچپن میں اسے کسی بلی سے بے حد محبت تھی۔ کسی بلی نے اس کی گردن میں دانت گڑ کر اسے مار ڈالا۔ تب سے وہ لڑکیوں کے نرم و نازک جسم میں چندا کو تلاش کرتا ہے۔ اور اسے نہ پا کر ایک بلی کی طرح بھنبھوڑ ڈالتا ہے۔ یہ جب تک چندا کو نہیں بھولے گا۔ اس وقت تک ایک نازل سماجی زندگی نہیں گزارے گا۔

ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق اسے دماغی مریضوں کے اسپتال میں بھیج دیا گیا۔ لیکن ایک ہفتے کے بعد ہی وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ اسے خونخوار پراسرار خون آشام درندہ سمجھا گیا ہے۔ میں ڈاکٹر کی رائے سے متفق ہوں کہ وہ ایک دماغی مریض تھا۔ جیسے یہ پاگل نو جوان ہے۔ ڈاکٹر سے اس تھانے کے ایس ایچ او نے تبادلہ خیال بھی کیا تھا۔

ڈاکٹر نے تصویر کی جانب اشارہ کیا اور اسے ایک ہاتھ میں لے کر کہا۔

وہ نصف صدی پہلے کا اجنبی اور یہ پاگل نو جوان دونوں ہم شکل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ دونوں باپ بیٹے ہیں اور بیٹے کو اپنے باپ سے دماغی مرض ورثہ میں ملا ہے۔ یہ پاگل بھی یہی کہتا ہے کہ یہ اس دنیا میں تنہا ہے۔ یہ کون ہے.....؟ اور کہاں سے آیا ہے؟ لیکن اسے گمشدہ چندا کی تلاش ہے۔ ”یہ کیسے اور کیوں کر ہو سکتا ہے۔“ رانی کے پتائی کی حالت دو چند ہو گئی۔ ”چہرے مہرے اور عادات کے لحاظ سے باپ بیٹے میں بھی اتنی گہری مماثلت نہیں ہو سکتی۔ صرف جڑواں میں ہو سکتی ہے۔ باپ اور بیٹے میں خاص فرق ہوتا ہے۔ مجھے تو یہ وہی اجنبی لگتا ہے جو دماغی امراض کے اسپتال میں زیر علاج تھا۔

”یعنی آپ یہ فرما رہے ہیں کہ وہ آج بھی اسی طرح جوان ہے جیسے بچپاس برس قبل تھا.....؟ بہر حال یہ اپنے اپنے سوچنے کا انداز ہے۔ میں اس پر بحث و تکرار نہیں کروں گا..... اب میں اس پاگل کے متعلق آپ کو بتا رہا ہوں..... اس شہر کی ایک معمر دو دروازہ دیو پوچھلے ماہ کی دو تاریخ کو یہ شکایت لے کر تھانے آئی تھیں کہ ایک نو جوان ان کی بیٹی کو پاگل بنا رہا ہے۔ رتاد دیو نے جو بیان دیا وہ یوں ہے۔

ایک رات اس کی بیٹی شادی کی تقریب سے واپس آ رہی تھی۔ راستے میں اس کی گاڑی خراب ہو گئی۔ بوڑھا ڈرائیور گاڑی کی خرابی دور کرنے میں مصروف ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے بونٹ سے سر اٹھا کر دیکھا تو پچھلی سیٹ پر ایک خوب رو جوان شادی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو گہری خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ ڈرائیور نہیں جانتا تھا کہ یہ نو جوان کون ہے اور کہاں سے آیا ہے۔ وہ یہ سمجھا کہ شاید وہ کوئی بوائے فرینڈ ہوگا۔ شادی کی ہم جماعت لڑکوں سے دوستی تھی۔ پھر وہ ذرا سی دیر میں بے انتہا بے تکلف اور بے باک ہو گئے۔ شادی اس کی آغوش میں تھی۔

ڈرائیور کو ایسا لگا کہ وہ اسے چوم رہا رہا..... لیکن اس نے محسوس کیا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ کسی بلی کی طرح سونگھ رہا ہے۔ جیسے بلی کو کوئی چیز کھانے سے پہلے سونگھتی ہے۔

راستہ سنسان اور ویران تھا۔ گہری تاریکی تھی۔ کوئی ان کی بے حیائی کو دیکھنے اور ٹوکنے والا نہ تھا۔ ڈرائیور نے ان سے نگاہیں ہٹا لیں اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ وہ ڈرتا تھا کہ ٹوکنے پر کہیں اسے شادی کی ڈانٹ نہ پڑ جائے اور اسے دوسرے دن نوکری سے جواب مل جائے۔ کوئی دس منٹ کے بعد دونوں گاڑی سے باہر آئے۔ شادی نے اپنا حلیہ درست کرتے ہوئے کہا کہ کوٹھی یہاں سے قریب ہے۔ میں پیدل چلی جاؤں گی۔ تم گاڑی لے کر آ جانا۔ یہ کہہ کر دونوں راستے کے کنارے کنارے جانے لگے۔ شادی کے قدم یوں لڑکھڑاہے تھے جیسے وہ گہرے نشے میں ہو۔

آدھے گھنٹے کے بعد ڈرائیور گاڑی لے کر کوٹھی پہنچا تو شادی نہیں تھی۔ اس کی ماں اور گھر والے سخت پریشان ہو گئے۔ اس کے گھر والے بھاگ دوڑ کر اسے تلاش کرنے لگے۔ آخر بڑی تلاش و بسیار کے بعد رتاد دیو نے اسے تلاش کر لیا۔ شادی پائیں باغ میں تھی۔ وہ جس حالت میں پڑی تھی دیکھ کر ان کا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ جسم میں سارا خون برف ہو گیا۔ لمحے کے لئے ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ جب دھند چھٹی تو انہوں نے دیکھا۔

وہ اس حالت میں تھی کہ اس کا لباس تار تار تھا۔ جسم پر لباس کا ہوتا یا نہ ہونا برابر ہی تھا۔ اس کی لائیں لانی گہری سیاہ زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ آنکھیں کھاس کے سبز و ملائم بستر پر آرام سے سو رہی تھی۔ انہوں نے بیٹی کو بھنبھوڑ ڈالا لیکن وہ سس سے منہ نہ ہوئی۔ اس لئے کہ اس پر ایک ایسی مدہوشی طاری تھی جیسے اس نے پرانی شراب پی لی ہو۔ بھنبھوڑتے بھنبھوڑتے وہ ایک دم سے چونک پڑی۔ انہیں سننا دینے والا بجلی کا سا جھٹکا لگا۔ انہوں نے دیکھا کہ اس کی گردن پر داہنے جڑے کے نیچے خون کا دھبہ نظر آرہا ہے۔

بیٹی کی حالت ایسی نہیں تھی کہ گھر والوں کو آواز دے کر بلائیں۔ ایک تو اس کی تن کی عریانی اور پھر اس کی حالت چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ اس کے ساتھ بڑی درندگی سے زیادتی کی گئی ہے۔ چہرے اور جسم پر جو نشانات تھے وہ گزرے لمحات کی کہانی سن رہے تھے۔ وہ گھر والوں کی نظروں سے بچتی بچاتی کوٹھی کے اندر داخل ہوئیں۔ چادر لی اور فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور بیٹی کے پاس پہنچیں۔ پھر اس کے چہرے اور جسم پر ٹھنڈے پانی کی بوتل اٹھیل دی تو اسے ہوش آ گیا۔ پھر وہ اسے چادر سے ڈھک کر اندر لے آئیں۔ کسی نے ماں بیٹی کو نہیں دیکھا۔ انہوں نے دکھ اور کرب سے سوچا۔ گھر کی عورت تو بیچ گئی۔ لیکن لڑکی کی عزت نہیں بچی.....؟“

رانی کے ہاتھی بے چینی سے صوفہ پر پہلو بدلنے لگے۔ وہ کچھ سوچ کر زینے طے کرتے ہوئے چھت پر پہنچے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو اس حالت میں دیکھا جو انسپکٹر نے واقعات بتائے تھے اور ان کی بیٹی کے ساتھ پیش آئے تھے۔

جب واپس آئے تو انسپکٹر نے بتانا شروع کیا کہ دوسرے دن سے شانتی بھی اپنے کمرے تک محدود ہوگئی۔ وہ دروازہ بند کر کے کھانا اندر کھاتی تھی۔ اور پھر اپنی خوراک سے زیادہ ہی کھانے لگی تھی۔ جب کہ وہ خوش خوراک نہیں تھی۔ وہ حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کہیں وہ کسی بے کو تو نہیں کھلاتی ہے۔ حیرانی کی یہ بات تھی کہ ایسے کھانے بلی، بلا اور کوئی جانور نہیں کھاتا تھا..... اصلی گھی میں تلے ہوئے چار انڈے..... دو تین پراٹھے..... کھن..... خشک میوہ جات، پستہ بادام کا حلوہ..... شک کی بنا پر ماں اور بھائیوں نے کمرے کا کونہ کونہ اور واش روم تک دیکھ ڈالا۔ لیکن وہاں کسی دوسرے شخص کا وجود نہیں تھا۔ صرف ایک سیاہ رنگ کا بلا تھا۔ بلا ایسے کھانے نہیں کھا سکتا تھا۔ لہذا اس پر کوئی شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔

کچھ دنوں بعد شانتی خود کو چننا کہنے لگی۔ گھر والوں نے محسوس کیا کہ رفتہ رفتہ اس کا چنی توازن بگڑ رہا ہے۔ بعض اوقات وہ گفتگو کے دوران میاؤں کی آوازیں نکالتی تھی۔ ایک روز اس کی ماں نے چھپ کر دیکھا۔ وہ دودھ سے بھرے ہوئے پیالے میں منہ ڈال کر ایک بلی کی طرح زبان نکال کر سبز پٹری کی آواز پیدا کرتی ہوئی دودھ پی رہی تھی۔

اسی دن اس کے گھر والے اسے ایک ماہر نفسیات اور دماغی امراض کے ماہر ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس نے تنہائی میں شانتی کے سامنے بے اور بلیوں سے دلچسپی ظاہر کی۔ اس موضوع کو گفتگو بنا کر اس کا ذہن کریدنے لگا۔ چون کہ ان دونوں کے سوا کوئی کمرے میں نہیں تھا اس لئے وہ باتوں ہی باتوں میں شانتی کھل گئی اور اسے بتانے لگی کہ وہ ایک اجنبی نوجوان سے بے انتہا محبت کرتی ہے۔ اس نوجوان کو چندا کی تلاش ہے۔ لہذا وہ اپنے محبوب کی خوشی کے لئے چندا بن کر ایک بلی ہی کی طرح حرکتیں کرتی ہے..... اب رفتہ رفتہ اس کی یہ حالت ہوگئی ہے۔ جب وہ ایسا کرتی ہے اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے قریب ہے۔

ڈاکٹر نے تمام باتیں سن کر اس سے سوال کیا اور کہا کہ صحیح بتاتے۔

”وہ نوجوان کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ بتاؤ۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا؟“

”میں نہیں جانتی کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتا ہے.....؟ اس نے ایک رات اتفاقاً ملاقات ہوگئی۔ اس میں ایسا بھرا تھا کہ میں اس کی اسیر ہوگئی..... ڈاکٹر نے کہا کہ ”حیرت کی بات ہے کہ آپ نے اس کا نام اور ٹھکانے کے متعلق کچھ نہیں معلوم کیا.....؟ کیوں آپ کو معلوم کرنا تھا کہ..... وہ کون

ہے.....؟ کہاں رہتا ہے؟ کہاں سے آتا ہے.....؟“ شانتی نے جواب دیا کہ ”جب وہ میرے سامنے آتا ہے تو میں نہ صرف سب کچھ بلکہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتی ہوں۔ اپنے آپ کو اس کے پھر کر دیتی ہوں۔“

پھر ڈاکٹر نے دریافت کیا۔ ”یہ تو آپ جانتی ہیں کہ وہ آپ کے کمرے میں کیسے آتا ہے.....؟“

”میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ کیسے آتا ہے.....؟ جب میں اس کے تصور میں آنکھیں بند کئے ہوتی ہوں تو اس کی خوشبو بتا دیتی ہے کہ وہ کمرے میں آ گیا ہے..... جب میں آنکھیں کھول کر دیکھتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ میرے قریب موجود ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بے کو ساتھ رکھوں..... لہذا میں اسے ساتھ رکھتی ہوں۔ اسے کھلاتی پلاتی ہوں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بلا واش روم میں جاتا ہے تو واپس نہیں آتا بلکہ اس کے بجائے واش روم سے میرا اجنبی محبوب چلا آتا ہے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟“ ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ بلا نہارے اجنبی محبوب کے روپ میں چلا آتا ہے؟“

”ہاں..... میں بھی اس بات کو خوب سمجھتی ہوں۔ کیوں کہ جب تک وہ میرے پاس رہتا ہے بلا نظر نہیں آتا ہے..... جب کوئی میرے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دیتا ہے وہ واش روم میں واپس چلا جاتا ہے یا پھر پٹنگ کے نیچے چھپ جاتا ہے۔

ایک بار وہ پٹنگ کے نیچے چھپ گیا تھا۔ میرے بھائی نے جھک کر دیکھا تو وہ بلا پٹنگ کے نیچے بیٹھا تھا۔“

ڈاکٹر اسے سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ لڑکی کا چنی توازن پھر ڈمگ رہا ہے۔

”ایسی بے تکلی باتیں کرو گی تو یہ لوگ تمہیں پاگل سمجھیں گے۔“ ڈاکٹر نے اسے سمجھایا۔

”لوگ تو ابھی بھی مجھے پاگل ہی سمجھ رہے ہیں..... میں تو اس کے پیار کی خاطر پاگل کہلانے کے لئے تیار ہوں..... وہ مجھے بلی سمجھتا ہے..... میں بھی خود کو عورت نہیں سمجھتی..... میں چندا ہوں..... میاؤں..... میاؤں۔“

وہ بلی کی آوازیں نکال کر ہنسنے لگی۔ دو گھنٹے کے بعد ڈاکٹر نے کمرے سے باہر آ کر مشورہ دیا۔

شانتی کو بے اور بلیوں سے دور رکھا جائے۔ ہو سکے تو اسے شہر سے دور لے جایا جائے اور

اسے کبھی تنہا نہ چھوڑیں۔ اگر وہ کبھی بلیوں جیسی حرکت کرے تو اسے نرمی سے سمجھا دیا جائے کہ عورت کبھی بلی نہیں بن سکتی۔

شانتی کے بھائیوں نے گھر پہنچتے ہی بے کو مار بھگایا۔ شانتی اپنے بھائیوں کو بلی کی طرح

نوجنتی، کھسوٹی رہی۔ مگر اس کی ایک نہ چلی۔ دوسری صبح انہوں نے شہر سے دور جانے کا پروگرام بنایا۔ آدھی رات کے بعد شانتی کسی کی تلاش میں پائیں باغ میں گئی۔ اس کے بھائی اس کی کڑی مگرلی کر رہے تھے۔ انہوں نے پائیں باغ میں اس نوجوان کو دیکھا جسے بوڑھا ڈرائیور دیکھ چکا تھا۔ وہ سب اس اجنبی نوجوان پر ٹوٹ پڑے۔ وہ قد آور اجنبی چٹان کی طرح مضبوط تھا۔ اس نے ذرا سی دیر میں چاروں بھائیوں کو دھنک کر رکھ دیا۔ جب وہ بیک وقت چاروں کی مرمت کر رہا تھا۔ ان کی چیخ و پکار سن کر تمام ملازمین وہاں پہنچ گئے۔ وہ چوں کہ مسلح تھے اور پھر دشمنوں کی تعداد دیکھ کر وہ کسی طرح وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ ان کے ہاتھوں پٹے سے صاف بچ نکلا تھا۔

دوسرے دن صبح رتادیوی اس نوجوان کی شکایت کرنے تھا نے گئی۔

انتا کہہ کر انسپکٹر تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو گیا پھر اس نے کہا۔

”رتادیوی کی شکایت سن کر میں نے ان سے پوچھا۔“ کیا شانتی کی گردن پر زخم کا نشان

موجود ہے؟“

”پہلی بار میں نے اس کے داہنے جبڑے کے نیچے زخم دیکھا تھا۔“ رتادیوی نے جواب دیا۔

”اس کے بعد پھر وہاں زخم نظر نہیں آیا۔ پھر ایک دن دوپہر کو وہ اپنے پلنگ پر اوندھے منہ سو رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ گرمی کی وجہ سے وہ بلاؤز نہیں پہنتی تھی۔ اس کے کمرے میں کوئی مرد نہیں جاتا تھا۔ اس وقت بغیر بلاؤز کے تھی۔ تب میں نے اس کی پشت پر تازہ زخم دیکھا۔ وہ اجنبی کوئی درندہ ہے۔ میری جوان بیٹی کا خون چوستا ہے۔ میں اسے کیا الزام دوں۔ اپنا ہی سکہ کھا ہے۔ شانتی خون کی کمی پوری کرنے کے لئے روزانہ تازہ پھل، دودھ، دہی، بکھن اور کھانے کی ہر وہ چیز استعمال کرتی ہے جس میں زیادہ غذائیت ہوتی ہے اور نیا خون پیدا ہوتا ہے۔ یہ کتنی عجیب اور دکھ کی بات ہے کہ وہ لڑکی ایک درندے کے لئے اپنے جسم میں خون کی مقدار بڑھاتی رہتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”وہ درندہ نہیں ہے بلکہ ایک دماغی مریض ہے۔ ایسا ہی ایک کیس رنگ پور میں ہو چکا ہے۔ اسے پاگل خانہ بھیج دیا گیا۔ جہاں سے وہ چھ ماہ پیشتر فرار ہو گیا۔ اسے تلاش کرنے کے لئے اس کی تصویریں تمام تھانوں میں بھیج دی گئی ہیں۔“

میں نے ایک فائل سے اس کی تصویر نکال کر رتادیوی کو دکھائی۔ اس کے بیٹوں نے پہچان لیا کہ یہ وہی نوجوان ہے۔ جو گزشتہ رات شانتی سے ملنے آیا تھا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ گھر کی چار دیواری میں شانتی کی کڑی نگرانی کریں لیکن باہر گھومنے پھرنے کی آزادی دے دیں۔ وہ اجنبی باہر کی آزاد فضا میں اس سے ملنے آئے گا میں اسے گرفتار کر لوں گا۔“

پھر ایسا ہی ہوا۔ دوسرے دن ہی وہ گرین پارک میں ملنے آیا۔ میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ کر

اس نے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے اسے گرفتار کر کے رنگ پور کے تھانے میں اس کے خلاف رپورٹ درج کر کے اسے پاگل خانہ میں پہنچا دیا۔ اس کی ایک تصویر چندن پور کے تھانے میں بھی گئی تھی۔ وہاں سے ایک بوڑھا تھانے دار پچاس برس پرانا ریکارڈ لے کر آیا۔ اس ریکارڈ میں اسی نوجوان کی ایک ہم شکل تصویر موجود تھی۔

یہ مسئلہ ابھی تک حل نہ ہو سکا کہ وہ دو مختلف شخصیتیں ہیں یا ایک ہی شخص ہے جو نصف صدی سے جوانی کی عمر گزارتا آ رہا ہے۔ ان دونوں باتوں میں جو باتیں مشترک ہیں وہ ہیں..... چندا کی تلاش اور کالے بلے کی موجودگی..... جناب میں آپ کی صاحبزادی رانی کے کمرے میں کالے بلے کو دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ وہ پاگل یہاں آتا ہے..... اگر آپ کو میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے تو ابھی اس کمرے میں جائیں اور اپنی صاحبزادی کی پشت کو ایک نظر دیکھیں۔ چوں کہ اس کا بلاؤز جدید فیشن کے مطابق بے حد نیچی تراش کا ہے۔ آپ کو میری بات کا ثبوت مل جائے گا۔“

رانی کے پتاجی کا چہرہ متما گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولے۔

”آپ بھی میرے ساتھ آئیں۔ مجھے کسی ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس بلے کو شوٹ کر دوں گا۔“

وہ دونوں نشست گاہ سے نکل کر راہ داری میں آئے۔ اس کے دوسرے جانب رانی کا کمرہ تھا۔ اس کا کمرہ اس وقت وقوع کے خلاف کھلا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے چلتے ہوئے دروازے پر آئے اور ٹھٹک کر رک گئے۔ کمرے کے اندر جھانکنے لگے۔

وہاں رانی نہیں تھی۔ بلا بھی نہیں تھا۔ دیش ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا..... لیکن کس حالت میں تھا.....؟ اس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ منہ پر ایک پٹی چسپی ہوئی تھی۔ وہ اپنا پورا زور لگا کر اس ٹکجنے سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ دونوں تیزی سے کمرے میں گھس کر اس کی طرف بڑھے۔ انسپکٹر اس کی رسی کھولنے لگا۔ رانی کے پتاجی نے اس کے منہ پر لگا ہوا ٹیپ نکالا۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔

”انکل.....! وہ ایک اجنبی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ چوں کہ آپ دونوں نشست گاہ میں تھے بھاگنے کا راستہ نہ تھا اس لئے وہ دونوں چھت کی طرف گئے ہیں.....“

انسپکٹر نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔ ”جگن ناتھ صاحب! جلدی سے آئیے۔ مجھے چھت پر جانے کا راستہ بتائیں۔“

رانی کے پتاجی اور انسپکٹر دوڑتے ہوئے زینے کی طرف بھاگے..... دیش نے رسیاں

کھلنے تک ڈینگیں ماری تھیں کہ اس نے بڑی دیدہ دلیری سے اجنبی کا مقابلہ کیا تھا اور وہ ان دونوں کو فرار ہونے سے روک رہا تھا۔ مگر اجنبی نے اسے کلورو فارم سونگھا کر بے ہوش کر دیا اور اس کی مشکلیں کس دیں..... انسپٹر جانتا تھا کہ ونیش کلورو فارم کے بارے میں جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ دیوہیکل اجنبی کے سامنے بچہ ہے۔ اس نے بڑی آسانی سے اسے دبوچ کر مشکلیں کس کر اور منہ پر ٹیپ لگا کر چلا گیا۔

وہ ونیش کی بکواس سن کر اور ان سنی کر کے چھت پر آ گئے تھے۔ شکر صاحب کے مکان کی چھت پر سے اس چھت کی منڈیر تک لکڑی کا ایک تختہ بچھا ہوا تھا۔ وہ اجنبی رانی کو دونوں بازوؤں میں اٹھائے اس تختہ پر چل رہا تھا۔ رانی کے ہتاجی کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ اگر اجنبی کے قدم ذرا بھی ڈگمگائے تو اس کے ساتھ رانی بھی بلندی سے گہری پستی میں چلی جاتی۔ دونوں کی پہلی ہڈیاں چور چور ہو جاتیں اور ان کی لاشوں کی شناخت بھی نہ ہو پاتی۔

انسپٹر نے اپنا ریوالور ہولسٹر سے نکال لیا تھا۔ لیکن خاموش کھڑا تھا۔ کیوں کہ اگر وہ لٹکارتا تو اجنبی کے قدم لڑکھڑا جاتے۔ اس لئے وہ خاموش کھڑا ہوا اس پاگل کی حرکتوں کو دیکھ رہا تھا۔ جب وہ دونوں خیریت سے شکر صاحب کے مکان کی چھت پر پہنچ گئے اور رانی اس کے بازوؤں سے اتر گئی۔ انسپٹر لٹکارتے ہوئے منڈیر کے قریب آیا۔

”خبردار..... بھاگنے کی کوشش نہ کرنا..... ورنہ جان سے مار دوں گا۔“

اجنبی جہاں تھا وہاں رک گیا۔ البتہ رانی اس کے سامنے ڈھال بن کر آ گئی اور وہ ہڈیانی لہجے میں چیختی لگی۔

”نہیں..... تم اسے نہیں مار سکتے..... میں اپنی مرضی اور خوشی سے اس کے ساتھ جاری ہوں..... یہ مجھے بھگا کر نہیں لے جا رہا ہے..... تم لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے..... یہ مجرم نہیں ہے..... تم اس پر گولی نہیں چلا سکتے.....“

”یہ خطرناک مجرم ہے۔ تم نہیں جانتی ہو۔“ انسپٹر نے کہا۔ ”یہ اب تک دو لڑکیوں کو برباد کر چکا ہے..... تم تیسری لڑکی ہو..... اس سے پہلے بھی وہ کئی گل کھلا چکا ہے..... تم اس کے سامنے سے ہٹ جاؤ۔“

وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر سینہ تانے کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اجنبی اچانک بیٹھ گیا۔ منڈیر کے پیچھے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ انسپٹر نے چیخ کر کہا۔

”تم مجھ سے بچ کر نہیں جاسکو گے..... خیریت چاہتے ہو تو سامنے آ جاؤ.....“

انسپٹر کی دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ سامنے نہیں آیا۔ رانی یک بیک قہقہے لگانے لگی۔

”انسپٹر!..... اب جتنی گولیاں چلاتا جا ہو چلاؤ..... وہ جا چکا ہے۔ تمہارے ہاتھ نہیں آئے“

وہ کہہ رہی تھی اور جھوم جھوم کر۔ ہنسی بھی جاری تھی۔

انسپٹر تھوڑی دیر تک اجنبی کو آوازیں دیتا رہا۔ جب کوئی جواب نہ ملا تو وہ منڈیر پر چڑھ گیا۔ لکڑی کے تختے پر چلتا ہوا دوسری چھت پر ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں رانی کا ایک دستی بیک اور ایک سا لٹچی کس رکھا ہوا تھا۔ رانی پوری تیاری سے بھاگ رہی تھی۔ مگر اس کے ساتھ بھاگنے والا مائل نظر نہ آیا تھا۔

وہ ہاتھ میں ریوالور لئے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھلی چھت کو دیکھ رہا تھا۔ اس اجنبی کے لئے کہیں چھپنے کی جگہ نہ تھی۔ پھر بھی وہ نہ جانے کہاں چھپ گیا تھا یا پھر غائب ہو گیا تھا۔

اس وقت چھت کے ایک دور افتادہ گوشے سے ایک سایہ اچھل کر منڈیر پر آیا۔ پھر اس سے اچھل کر انسپٹر کچھ سوچتا سمجھتا اس نے پلٹ کر اپنی ریڈیم ڈائل جیسی آنکھوں سے رانی کو دیکھا۔ پھر اچھل کر دوسری چھت پر چلا گیا..... پھر دوسری سے تیسری چھت پر..... پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ گدھے کے سر سے سینک کی طرح..... رانی ایک طرف خاموشی کھڑی اپنے ہتاجی کے ساتھ انسپٹر کو دیکھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

انسپٹر کا نظریہ بدل گیا۔ اجنبی اس کی نگاہوں کے سامنے سے غائب ہوا تھا۔ جسے عقل تسلیم نہیں کرتی تھی۔ وہ واقعہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ

وہ لوں کیا ایک ہی تصویر کے دور رخ ہیں.....؟ اگر سمجھ میں آ جاتا تو وہ بے کوبھی اتنی آسانی سے ہٹ گئے نہیں دیتا۔ اب اسے محض ایک پاگل کی نہیں سیاہ بے کی تلاش تھی۔

رانی کی ماں نے جو کہانی سنائی تھی وہ اپنی ہی آپ بیتی بن گئی تھی۔

پچاس برس پہلے کا پراسرار اجنبی ان کے خیال سے چلتا ہوا بیٹی کی خواب گاہ تک پہنچ گیا تھا۔ اب اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا تھا کہ ایک بلا جوان اور حسین لڑکی کے پیچھے بڑھ گئی ہے۔ سبھی کے دلوں پر ایک دہشت طاری ہو گئی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے یہ سوچ کر ان کا کلیجہ کانپ جاتا تھا کہ اچانک وہ لاشیں سے آئے گا اور ان کی گردنوں پر سوار ہو کر خون چوس لے گا۔

ایک رات وہ اپنے کمرے میں سو رہی تھیں۔ ان کے ہتی نہیں تھے۔ وہ صبح سے پہلے نہیں اٹھیں گے انہیں اس بات کی خبر تھی۔ وہ کسی کام کے بہانے صبح تک آنے کا کہہ کر گئے تھے۔ وہ صاف کوارٹر میں مرہٹہ ملازمہ کے ساتھ تھے۔ وہ ملازمہ کی مجبوریوں اور محرومیوں سے فائدہ اٹھا

کہیں منہ کالا کرنے چلا جاتا ہے۔ تمہارا دل کرتا ہے کہ کوئی آئے اور تم سے محبت کرے اور رات گزار کر صبح چلا جائے..... میں تمہارے جذبات اور محرومی کا احساس کر کے آج تمہارے پاس آیا ہوں۔“

پھر اس کی محبت بھری باتیں ان کے کانوں میں رس گھولتی رہیں۔ دونوں ایک دوسرے کا دل قابو دہی کی سیر کرتے رہے۔ محبت کے لمحات میں ڈوبتے۔ انجانے راستوں پر بھٹکتے، اٹھ اور راستہ بھولنے رہے۔

وہ ایک چشمہ تھا جو انہیں ایک پیاسے کی طرح سیراب کرتا رہا۔ ان کی پیاس بھگ گئی۔ اس کی محبت میں جو گرم جوشی اور دالہانہ پن تھا اسے وہ ساری زندگی بھول نہیں سکتیں۔ جب وہ بھر ہوئیں اس وقت ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ وہ بستر پر اور کمرے میں اکیلی تھیں۔ ان پر ایک لمبی سرشاری چھائی ہوئی تھی۔ جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا جیسے کسی نے انہیں نچوڑ کر رکھ دیا ہو۔ اس طرح جس طرح گیلیا کپڑا نچوڑا جاتا ہے۔

”ہائے..... یہ کیا سندرہ پڑتا تھا۔“ انہوں نے سوچا۔ پھر انہیں خیال آیا کہ ان کے ذہن میں جو پرانہ احساسات تھے وہ پتہ نہ بن گئے تھے..... بستر، لباس اور وہ خود بے ترتیب ہو رہی تھیں۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ انہیں خیال آیا کہ انہیں لباس، بال اور بستر کی چادر کی لٹکیں درست کر لینی چاہیں تاکہ ان کے پتی دیکھ کر مشکوک نہ ہو جائیں۔ مرد بڑا شکی مزاج ہوتا ہے۔ عورت کے معاملے میں..... جب وہ چادر کی ٹٹکیں اور بال درست کر کے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر لباس درست کر رہی تھیں تب وہ ایک دم سے چونک پڑیں انہوں نے اپنی دائیں ہاتھ پر زخم کا نشان دیکھا..... ان کا سینہ دھک ہو کر رہ گیا..... کیا وہ پتہ نہیں تھا.....؟ ان کے ہاتھ پر زخم خیالات نہیں تھے..... کیا یہ حقیقت تھی.....؟ انہوں نے جلدی سے بلاؤز کی آستیں اٹھا دیں وہ دھم چھپایا اور روشنی گل کر کے بستر پر آ کر دراز ہو گئیں۔ جو بھی تھا..... ان کی نسن نسن میں ان رقصاں تھا۔ معان کی نظر روشن دان پر پڑی جہاں سے صبح کے اجالے کی آمد دکھائی دے رہی تھی۔ انہیں سیاہ بلا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم سے نظروں سے غائب ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد دروازہ اس طرح سے کھلا جیسے کوئی چور کھولتا ہے۔ ان کے پتی اندر آ رہے تھے۔ انہوں نے جھٹ سے آنکھیں بند کر لیں۔ دروازہ ذرا سا کھلا چھوڑ دیا تھا۔ انہیں وہ سیاہ فام ملازمہ کسی کالی بلی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ واقعی وہ غضب ناک حد تک پرکشش تھی۔ ان کے پتی نے اپنی الماری کھول کر رقم نکالی۔ اور باہر جا کر ملازمہ کے ہاتھ میں تھما دی

رہے تھے۔ اس غریب کو دو ہزار روپے کی سخت ضرورت تھی۔ کیوں کہ اس کا بچہ سخت بیمار تھا۔ شوہر بیمار تھا۔ ایک ہزار روپے میں کام نہیں بن سکتا تھا۔ ان کے پاس اتنی رقم نہیں ہوتی تھی کیوں کہ ان کے پتی جو رقم دیتے تھے وہ گھر کے اخراجات کے لئے ہوتی تھی۔ اخراجات میں سے وہ بمشکل سو روپے پس انداز کر پاتی تھیں۔ انہوں نے اس سے کہا کہ صاحب سے بات کر لو۔ وہ صاحب سے بات کرنے لگی تو وہ بھی چند لمحوں کے بعد اس کے پیچھے پیچھے گئی تھیں۔ ان کے پتی اس سے کہہ رہے تھے کہ ساری رات سرونٹ کو ارٹھر میں رہو تو دو ہزار روپے دوں گا۔ ملازمہ نے حامی بھر لی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آ گئیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کو دو ایک مرتبہ ملازمہ کے ساتھ محبت بھرے انداز میں باتیں کرتے دیکھا تھا۔ انہیں اپنے شوہر سے بے وفائی کی امید نہ تھی۔ وہ آج اب بھی بے پرکشش، خوب صورت اور سڈول بدن کی تھیں۔ ان کی سہیلیاں کہتی تھیں کہ تم اپنی بلی کی بڑی بھولگئی ہو۔ ماں نہیں..... لیکن شوہر کا اور دوسری طرف جھکنا ان کے لئے تعجب خیز تھا۔ لیکن انہوں نے کبھی احتجاج کیا اور نہ ہی ٹوکا تھا۔ اس لئے کہ اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔ وہ اپنا منہ باہر کالا کر لے پھرتے تھے۔

بستر پر دراز ہو کر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ جلد ہی میٹھی نیند کی آغوش میں چلی گئیں۔ پھر انہوں نے پتہ نہ دیکھا۔ کیا دیکھتی ہیں کہ ایک کالا بلا ایک سرسبز و شاداب وادی میں کھڑا نظر آیا۔ وہ ریشم جیسی نرم و ملائم گھاس پر لیٹی ہوئی ہیں۔ بے نے جیسے ہی انہیں دیکھا ان کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ وہ خوف زدہ ہو کر اٹھ بیٹھیں۔ بے کو اپنی طرف آتا دیکھ کر انہوں نے ایک بڑا سا ہل اسے مارنے کے لئے اٹھالیا۔ جب وہ قریب پہنچا تو ان کے ہاتھ سے پتھر گر گیا۔ کیوں کہ بلا نو جوان اجنبی کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ پھر وہ ان کے قریب آ کر محبت بھرے لہجے میں بولا۔ ”ملا دے دیوی.....! تم کتنی حسین ہو اس عمر میں بھی..... میں تمہاری عمر کی عورتوں کو پسند کرتا ہوں.....“ ملازمہ سے محبت ہے..... میں جب تک روز چھیں دیکھ نہ لوں مجھے چین نہیں آتا اور نہ سکون ملتا ہے۔ میں روزانہ تمہیں کچھ دیر تک جی بھر کے دیکھتا رہتا ہوں جب رات کے وقت گہری نیند میں غرق ہو جاتا ہوں۔ میں روشن دان میں بے کے روپ میں ہوتا ہوں۔ تمہاری بہت ساری باتیں میرے سامنے ہوتی ہیں۔ بستر پر جانے سے پہلے نہانا، کپڑے بدلنا اور جسم پر خوشبو لگانے کا چھڑکنا اور آئینے میں اپنا جائزہ لینا۔ یہ سب کچھ تم اس لئے کرتی ہو کہ تمہارا پتی جو ساتھ ہوتا ہے تمہاری طرف متوجہ ہو جائے۔ ایک بستر پر ہوتے ہوئے تم سے بہت دور ہوتا ہے۔ نہ تو قریب آتا ہے اور نہ ہی پریم کی باتیں کرتا ہے۔ بس تمہیں ایک اجنبی مسافر سمجھتا ہے۔ تم اس کے قرب کے لئے تنہائی کی آگ میں جلتی کالی دیر تک اس کا انتظار کرتی ہو۔ لیکن وہ تم سے بے پروا اور بے نیاز ہو کر سو جاتا ہے۔ کسی کسی رات

ان کے ہتی ان کے برابر لیٹ گئے اور اپنا منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ ایک طرف انہیں ایک عجیب سی سرشاری اور کیف محسوس ہو رہا تھا تو دوسری طرف ایک خوف سا بھی..... اگر ان کے بازو پر زخم کا نشان نہ ہوتا تو وہ اسے ایک سندس سا پہنا ہی سمجھتیں..... کیا بلا اب انہیں راتوں کو آ کر ان پر جادو کر کے فائدہ اٹھائے گا۔ وہ اجنبی حقیقت کوئی جادوگر ہے۔

رانی پر کڑی پابندیاں عائد کر دی گئیں۔ اس کی خواب گاہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھا جائے گا۔ دن کو گھر کی عورتیں اس کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ رات کو ایک لیڈی کا فیشیل پہرہ دیتی اور جاگتی رہتی۔ انسپکٹر کو یقین تھا کہ وہ بلا اپنی چندا کے پاس ضرور آئے گا..... رانی کی ماں کو ایک طرف اطمینان ہو چلا تھا کہ اب بلا ان کے پاس نہیں آئے گا..... لیکن ایک ان جانی سی خواہش ان کے دل کے کسی کونے میں اٹھوائی لیتی کہ کاش! ایک بار پھر سہی..... اگر اس نے ان کا دروازہ خون پی لیا تو کیا فرق پڑے گا۔ چوں کہ ان کے ہتی رات کرے میں تھے اس لئے وہ بلا انہیں آیا تھا۔ لیکن دو ایک بار روشن دان میں نظر آیا تھا بل بھر کے لئے..... انہیں ہتی کے ساتھ ۱۲ دیکھ کر غائب ہو گیا۔

رانی گھروں کی لعن طعن سننے کے باوجود اس کا انتظار کر رہی تھی اور اپنے اطراف اور سخت پہرہ دیکھ کر اندر ہی اندر بری طرح کڑھ رہی تھی۔ کبھی وہ اپنی امی اور آنتی سے لڑتی جھلوتی تھی تو..... کبھی لیڈی کا فیشیل کو برا بھلا کہتی تھی اور کبھی کھانے کی چٹیں اٹھا کر پھینک دیتی تھی۔ ایک ماہر نفسیات کی خدمات حاصل کی گئیں اس کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا۔ وہ میاؤں میاؤں کرتی اسے نوچنے اور کھوٹنے لگتی..... اور دوڑتی تھی۔

ڈاکٹر وہاں صبح دس بجے آتا تھا مگر بلا پلٹ کر نہیں آیا۔ رانی کا ذہنی توازن بگڑنے لگا۔ ۱۱ بلیوں کی سی حرکتیں کرنے لگی..... یا تو بچ اس کا دماغ خراب ہو گیا تھا..... یا پھر وہ گھر والوں کو پریشان کرنا چاہتی تھی۔ وہ گھٹنوں کے بل میاؤں میاؤں کرتی ہوئی ادھر سے ادھر جاتی تھی۔ بلی کی طرح کھانے کے برتن میں منہ ڈال کر کھاتی تھی۔ گھر والے سمجھانے کی کوشش کرتے کرتے کہتی۔

”ذرا ہاتھ لگا کر تو دیکھنا.....؟ اب میری دم نکلنے والی ہے..... پھر میں پوری چندا لگا جاؤں گی۔“

اس سے سب ہی عاجز آ گئے تھے۔ ایک دن وہ دیوانہ وار بلے کو پکارتی ہوئی بھاگنے لگی۔ ونیش نے اسے پکڑ لیا۔ وہ اسے مارنے اور ناخنوں سے نوچنے کھوٹنے لگی۔ اس کی ماں اور آنٹی نے بھی اسے پکڑنا چاہا تو وہ ان پر جھپٹی اور پنجے مارنے لگی۔ بڑی دیر تک وہ ان سے لالہ

جھلوتی اور چٹتی رہی۔ چلاتی رہی۔ پھر چکر اکر گر پڑی۔

ونیش اسے گود میں اٹھا کر بیڈ روم میں لے گیا۔ ڈاکٹر کو فون کر کے بلایا گیا۔ اس کے ہتا جی کو بھی اطلاع دی گئی۔ تھوڑی دیر بعد لیڈی ڈاکٹر نے آ کر اس کا معائنہ کیا۔ یہ لیڈی ڈاکٹر نئی تھی اور اس خاندان سے ناواقف..... رانی کو ایک آنکشن لگایا۔ کچھ دوائیں لکھ کر دی اور بولی۔ ”مبارک ہو..... آپ کی بیٹی ماں بننے والی ہے.....“

یہ خوشخبری نہیں تھی ایک بھلی تھی جو ایک دھماکے کی طرح کانوں میں گونجی۔ ابھی تک رانی اور اجنبی کے تعلقات کا علم گھر والوں کو تھا یا پھر تھانے والوں کو..... کچھ دیر تک ان پر سکتے کی کیفیت طاری رہی..... انسپکٹر کو اس گھرانے سے بڑی ہمدردی اور محبت ہو گئی تھی۔ انسپکٹر نے رانی کے ہتا جی کو یقین دلایا تھا کہ وہ انہیں بدنامی سے بچائے گا۔

وہ دوسرے ہی دن ایک پہاڑی مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔ ٹرین کے ذریعے ایک دن اور ایک رات کا سفر تھا۔ انسپکٹر بھی ایک ہفتہ کی چٹھی لے کر ان کے ساتھ جا رہا تھا۔ سفر کے دوران بلا نظر نہیں آیا۔ رات کو ونیش اور انسپکٹر بھی باری باری جاگ کر پہرہ دیتے رہے۔ دوسری صبح وہ ایک پہاڑی اسٹیشن پر اتار گئے۔ وہاں سے ٹیکسیوں میں بیٹھ کر رام گڑھ پہنچ گئے۔ انہیں کسی حد تک اطمینان ہو گیا تھا اب بلا سیکنگڑوں میل پیچھے رہ گیا ہے۔ اب وہ رانی تک نہیں پہنچے گا۔ انہوں نے وہاں آٹھ ماہ کے لئے ایک کالج کرائے پر حاصل کر لیا۔ انسپکٹر انہیں کالج میں چھوڑ کر پولیس اسٹیشن گیا۔ وہاں کے پولیس انسپکٹر سے ملاقات کی اور پاگل اجنبی کی فائل سامنے رکھ کر اسے تمام تفصیلات بتانے لگا۔

رام گڑھ کا عمر رسیدہ انسپکٹر پرشاد دھین اور تجربہ کار تھا۔ اس نے فائل کا مطالعہ کیا اور اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نو جوان انسپکٹر کی باتیں بڑی توجہ سے سنیں۔ پھر وہ سر ہلا کر کہنے لگا۔

”بعض اوقات ایسے واقعات پیش آتے ہیں۔ جنہیں عقل تسلیم نہیں کرتی۔ اس فائل کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ پچاس برس کی عمر سے جوانی کی عمر گزارتا چلا آ رہا ہے۔ پھر آپ نے بھی اسے آدمی سے بلے کے روپ میں آتے دیکھا ہے۔ آپ اطمینان رکھیں اس لڑکی کی پوری حفاظت کروں گا اور اس پر کوئی آنچ آئے نہیں دوں گا۔“

”ایک بات اور ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”لڑکی حاملہ ہے۔“

”حاملہ ہے.....“ انسپکٹر پرشاد نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس ہونے والے بچے کا باپ وہ بلا یا پاگل اجنبی ہے؟“

”جی ہاں..... پچھلے تین ماہ سے اس بلے کے سوا کوئی دوسرا شخص اس لڑکی کے قریب نہیں گیا..... ہم نہیں جانتے کہ حقیقتاً اس کا وجود انسانی ہے یا حیوانی..... لیکن یقین سے یہ بات کہتے ہیں

وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔“

انسپکٹر پرشاد نے ایک سگریٹ سلاگیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سگریٹ کے کش لیتا ہوا سوچنے لگا۔ پھر اس نے سر ہلا کر کہا۔

”ہوں..... اگر وہ ماں بننے والی ہے تو وہ پاگل ضرور اس کے پاس آئے گا۔ آپ اس شہر سے جلد ہی واپس چلے جائیں۔ وہ آپ کو پہچانتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بدک کرواپس چلا جائے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے باہر آئے۔ پھر جیب میں بیٹھ کر کانچ پہنچ گئے۔ انسپکٹر پرشاد نے جگن ناتھ سے ملاقات کی اور اسے یقین دلایا کہ وہ ان کو بلے کے آسیب سے بچا لے گا، کسی بات کی چٹانہ کریں اور پریشان نہ ہوں۔ پھر اس نے مشورہ دیا کہ رانی پر سے پابندیاں اٹھالی جائیں۔ اگر وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے سونا چاہے تو کوئی اعتراض نہ کرے۔ اگر وہ تنہا تفریح کے لئے نکلے تو اسے کوئی نہ روکے۔ پولیس سادہ لباس میں اس کی حفاظت کرے گی۔

دوسرے دن انسپکٹر واپس چلا گیا۔ کیوں کہ اب اس کا کوئی نہیں تھا اور ساری ذمہ داری رانی کی اس نے اپنے سر لے لی تھی۔ انسپکٹر پرشاد نے لیڈی ڈاکٹر کو سمجھا دیا تھا کہ یہ ایک پولیس کیس ہے۔ رانی کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے اور پولیس کی طرف سے جو ہدایتیں دی جارہی ہیں ان پر فوری طور پر عمل کیا جائے۔

انسپکٹر پرشاد کی بدولت رانی آزاد ہو گئی۔ وہ ہر رات اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیتی تھی اور رات گئے تک بستر پر کر وٹیں بدل بدل کر روشن دان کی طرف دیکھتی رہتی تھی.....

اکثر رانی تنہا دور دور تک اونچے نیچے راستوں میں بھٹکتی رہتی..... غاروں میں بھی جھانک لیتی تھی۔ اس کا پاگل محبوب یا کوئی سیاہ رنگ کا بلا نظر نہیں آتا تھا۔ ایک روز رانی کی ماں سودا سلف لینے نوکرانی کے ساتھ بازار گئی ہوئی تھی۔ دیش اکیلا تھا۔ رانی واپس آئی تو دیش جو نہ جانے کس موڈ میں تھا رانی سے مذاق میں کہا۔ ”تم کسی سے کہنا نہیں..... میں تمہارے سیاہ بلے کو تلاش کروں گا۔“

دیش کا اتنا کہنا تھا کہ رانی نے اس بات کو سنجیدگی سے لیا اور اتنا خوش ہو گئی کہ اس نے دیش کو خوش کر دیا..... دیش کو یہ پتا لگا۔ اب دیش اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانے لگا۔ اس لئے بھی کہ رانی اس کی تھی۔ رانی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند اور محبت کرتے تھے۔ رانی اس کی من مانیوں پر معترض نہیں ہوتی تھی۔ ان کی منگنی ہونے والی تھی۔ منگنی کے ایک ماہ بعد شادی..... عین منگنی والے دن ان کے درمیان سیاہ بلا، اجنبی نوجوان آ گیا تھا..... اس کے ہاں جو کہ وہ بلے پر مرثی تھی اور اجنبی نوجوان جو بلا بن جاتا تھا۔ اس نتیجے میں وہ امید سے ہو گئی تھی پھر بھی وہ رانی سے محبت کرتا تھا۔ اس کا

حق رانی پر زیادہ تھا۔ رانی نے دیش کو اپنا ہمدرد پایا تو وہ دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گئی۔ کیوں کہ دیش نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کا بلا تلاش کر دے گا۔ رانی نے یہ سوچا تھا کہ جب تک اسے بلا نہیں مل جاتا دیش کو خوش کرتی رہے۔ کیوں کہ وہ اس کا ہمدرد ہے۔ جب وہ اس کی خوشی کا خیال کر رہا ہے تو کیوں نہ وہ بھی اس کی خوشی کا خیال کرے۔ دیش کوئی بچہ نہیں تھا۔ اس بات کو خوب سمجھتا تھا۔ اس لئے وہ جی بھر کے فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اسے کھلونا بتایا تھا۔ وہ اس سے کہتا کہ ”آؤ چلیں..... تمہارے محبوب کو تلاش کریں.....“ وہ خوش ہو کر اس کے ساتھ ہولیتی۔

وہ بلے کو تلاش کرنے کے بہانے چبکتے، مہکتے اور محبت بھری باتیں کرتے رہتے۔ ایک طرح سے دونوں ایک دوسرے کو دھوکا دے رہے تھے۔ لیکن دیش فائدے میں تھا۔

دیش کے ذہن میں ایک منصوبہ پرورش پارہا تھا کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد وہ اسے جان سے مار دے گا۔ گہری نیند کی حالت میں جب بچہ سو رہا ہوگا۔ اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر موت سے ہم کنار کر دے گا۔ کسی کو بھی بچے کی موت کا شبہ بھی نہیں ہوگا۔ لیکن ابھی یہ وقت بہت دور تھا۔

دو ماہ گزر گئے۔ پہاڑ کی چوٹیوں سے برف پکھلنے لگی۔ شہروں سے لوگ تفریح و سیاحت کے لئے آنے لگے۔ رام گڑھ کی رونق بڑھ گئی۔ کالجوں، ہسپتالوں اور تفریح گاہوں میں رنگین آنچل لہرائے تھے اور سریلے قہقہے گونجتے رہتے تھے۔ جب وہ دیش گھوم پھر کر کسی سرسبز و شاداب قطع پر بیٹھ جاتے رانی اداس ہو جاتی اور اس سے کہتی۔

”دیش سب آرہے ہیں..... لیکن میرا محبوب نہیں آ رہا ہے.....؟ اس کے لئے میرا دل غم سے پھٹا جا رہا ہے۔“

”مائیوس اور افسردہ نہ ہو میری جان!“ دیش رانی کا ہاتھ تھام کر اسے دلاسا دیتا۔ ”وہ آتا ہوگا۔ کسی دن تم اس کے سامنے بیٹھی ہوگی۔ وہ تمہارے کمرے میں ہوگا..... تم دونوں ہو گے..... تمہاری خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوگا۔ میں نے آج صبح بھی اسے ہسپتالوں میں جا کر تلاش کیا..... ریلوے اسٹیشن اور بس کے اڈے پر بھی دیکھا۔ لیکن وہ ان میں نہیں تھا۔ میرا دل کہہ رہا ہے وہ جلد ہی آنے والا ہے۔“

ان باتوں سے خوش ہو کر وہ دیش کی گردن میں جھول جاتی۔ بہک جاتی..... دو تین راتیں اس نے پتا کی جی غیر موجودگی میں رانی کے کمرے میں گزاریں۔ رانی کی ماں نے دیکھ لیا تھا۔ انہیں بداندہ لگا۔ وہ خوش ہوئیں اور سوچا کہ یہ ایک اچھا شگون ہے۔

دو ماہ اور گزر گئے۔ اب وہ ڈھیلا ڈھالا لباس پہننے لگی تھی۔ لیکن پیٹ چھپا نہیں چھپتا تھا۔ وہ ایک نئے وجود کا بوجھ اٹھائے تھوڑی دور تک چلتی تھی اور تھک کر بیٹھ جاتی تھی۔ ایک دن وہ اس

طرح تھک کر ایک کانچ کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس کے ایک طرف کانچ تھا تو دوسری طرف گہری کھائی تھی۔ وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سر کے بال شانے پر آگئے تھے۔ گردن کی پشت عریاں ہو گئی تھی۔ وہ بلے کو یاد کر رہی تھی۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے..... وہ ایک ہاتھ سے گردن کی پشت کو سہلا رہی تھی۔ وہاں جو زخم تھا وہ بھر گیا تھا۔ مگر اس ختم ہو جانے والے زخم کا نشان دور سے بھی نظر آتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اسے اپنے پیچھے غراہٹ سنائی دی جیسے کوئی بلی غرا رہی ہو۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں ایک نوجوان اور نہایت حسین لڑکی کھڑکی ہوئی تھی۔ اس لڑکی نے غرا کر پوچھا۔

”کون ہو تم.....؟ تمہاری گردن پر یہ نشان کیسا ہے؟“

رانی نے ایک آہ بھر کر جواب دیا۔ ”یہ پیار کی نشانی ہے..... تم کون ہو.....؟ اپنا نام بتاؤ؟“

”میرا نام چندا ہے.....“ لڑکی نے جواب دیا۔

رانی اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ پھر وہ اچانک غرا کر بولی۔ ”تم جھوٹ بولتی ہو..... میرا نام چندا ہے.....“

”جھوٹی ہو تم.....! تمہاری ماں..... تمہارا باپ..... چندا میرا نام ہے..... صرف میں اس کی چندا ہوں.....“

وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بچے مارنے کے لئے آگے بڑھیں۔

رانی نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے الجھ گئیں..... ایک دوسرے کو بچے مارنے لگیں۔ ان کے لڑنے کا انداز ہی ایسا تھا جیسے دو بلیاں ایک دوسرے پر جھپٹ رہی ہوں۔ وہ ایک دوسرے کے بال پکڑ کر جھٹکے دے رہی تھیں..... اسی وقت سامنے کے ایک کانچ سے ایک بوڑھی عورت اور ایک جوان مرد دوڑتے ہوئے آئے اور اس لڑکی کو پکارتے ہوئے آگے بڑھے۔

”شانتی.....! شانتی.....! یہ کیا کر رہی ہو..... چھوڑ دو اسے..... کیوں اس سے جھگڑا کر رہی ہو؟“

نوجوان نے قریب آ کر لڑکی کو پکڑ لیا تو وہ ہانپتی ہوئی بولی۔

”بھائی جان..... یہ جھوٹی ہے..... اپنا نام چندا بتاتی ہے.....“

”اس کا نام چندا ہوگا..... جیسی اپنا نام چندا بتا رہی ہے۔“ رتا دیوی بولی۔ ”یہ تمہاری طرح پاگل نہیں ہے۔ چلو کانچ میں.....“

اس کا بھائی پکڑ کر اسے کانچ میں لے گیا۔ رتا دیوی نے رانی سے کہا۔

”معاف کرنا بیٹی.....! یہ لڑکی کبھی کبھی بہک جاتی ہے..... یوں یہ پاگلوں جیسی حرکتیں کرتی ہے..... ڈاکٹر کے مشورے پر ہم آج وہاں کی تبدیلی کے لئے اسے یہاں لائے ہیں.....“

رتا دیوی بہت کچھ کہہ رہی تھیں لیکن رانی سن نہیں رہی تھی۔ وہ شانتی کو کانچ کے برآمدے میں دیکھ رہی تھی۔ لڑائی کے دوران اس نے شانتی کے بالوں کو ایک ایک بار زور سے جھکادیا تھا تب اسکی گردن عریاں ہو گئی تھی اور تب اس نے ایک تازہ زخم دیکھا تھا۔ رانی کو زخم کی پہچان تھی اور شانتی کی گردن کا زخم بتا رہا تھا کہ بلا اس کے ساتھ پچھلی رات رہ کر گیا ہے۔

اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں..... اسے غصہ اس بات کا تھا کہ بلے نے دوسری لڑکی کو چندا بتایا تھا اور اسے بھول گیا تھا..... وہ رتا دیوی کو نظر انداز کر کے اپنے کانچ کی طرف بڑھ گئی۔ عورت سب کچھ برداشت کر لیتی ہے۔ مگر سوکن کا وجود برداشت نہیں کرتی..... اندھیرا ہوتے ہی وہ پھر شانتی کے کانچ کے قریب آ گئی وہ جانتی تھی کہ بلا اس کی سوکن سے ملنے ضرور آئے گا۔ اور وہ پھر واقعی آ گیا۔

اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ انسان کے روپ میں تھا اور کانچ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رانی اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

”چندا! تم.....؟ تم یہاں ہو.....؟“ اس نے حیرانی سے کہا اور خوش ہو کر اور بازو پھیلاتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

رانی پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”بس..... بس..... مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ تم ہر جانی ہو۔ تم نے مجھے بھلا کر اس کانچ والی کو اپنا لیا۔ اسے اپنی چندا بتایا..... جاؤ..... اس کیسے چندا کے پاس.....“

”میں نے نہ تو تمہیں بھلایا تھا اور نہ ہی تمہیں بھلایا جاسکتا ہے..... تم میری مجبور یوں کو کیوں نہیں سمجھتی ہو؟ تمہارے چاروں طرف اتنا سخت پہرہ تھا کہ میں تمہارے پاس نہیں آ سکتا تھا۔ مگر میں ہمیشہ تمہیں یاد کرتا رہا ہوں..... اور تم سے ملنے کے لئے بے چین رہا ہوں۔“

”یہ بے چینی کانچ والی دور کر رہی ہے.....“ وہ طنز یہ لہجے میں بولا۔

”تم طے نہ دو.....“ اس نے غرا کر کہا اور اسے کھینچ کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

اتنے دنوں بعد رانی کو اپنے محبوب کی آغوش ملنے ہی وہ کھٹک گئی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ تم عورت نہیں ہو..... بلکہ بلی ہو..... عورت سوچتی ہے کہ مرد دوسری عورتوں کے پاس کیوں گیا..... بلیاں نہیں سوچتیں..... تم بھی نہیں سوچو گی..... بولو بلی ہو..... میری پیاری پیاری چندا ہو.....“

”ہاں..... میں تمہاری بلی ہوں..... میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔“

”آپ حکم دیں تو میں صرف ایک ہی گولی میں اس کا قصہ تمام کر دوں۔“

انسپکٹر پرشاد نے چند لمحوں تک سوچنے کے بعد بڑی بنجیدگی سے کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ تمہارا نشانہ سچا ہے۔ چوک گیا تو وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔۔۔۔۔ پھر دوبارہ مشکل سے ہاتھ آئے گا۔ کیوں کہ وہ بے حد محتاط ہو جائے گا۔۔۔۔۔ بہت ذہین، عیار اور مکار بھی ہے۔ اسے کسی ایسی جگہ گھیرنا ہوگا کہ اسے راہ فرار نہ مل سکے۔۔۔۔۔ ہم اسے ایسا ماریں گے کہ وہ آپ ہی آپ موت کے منہ میں چلا جائے۔۔۔۔۔ یعنی بندوق سے۔۔۔۔۔ کسی گہری کھائی میں دھکا دے کر۔۔۔۔۔“

”اس کے لئے کوئی تدبیر سوچنا ہوگی۔“ ماتحت نے کہا۔ ”یہی ہو سکتا ہے کہ اسے گرفتار کر کے محلات میں بند کرنے کے بجائے گہری کھائی میں دھکا دے دیا جائے۔۔۔۔۔ نہ رہے گا بانس اور نہ پہنچے گی بانسری۔۔۔۔۔“

”لیکن تم بہت ہی اہم بات بھول رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ انسپکٹر پرشاد بولا۔

”وہ کیا سرا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”اس میں ایک نہیں کئی صلاحیتیں موجود ہیں۔“ انسپکٹر پرشاد کہنے لگا۔ ”وہ جب چاہے بلا بن ہاتا ہے اور جب چاہے ایک ایسے خوب صورت، وجیہہ اور دراز قد نو جوان کے روپ میں آ جاتا ہے کہ نو جوان لڑکیاں ہی نہیں شادی شدہ جوان عورتیں بھی اس کے قرب کی خواہش کرنے لگتی ہیں۔ اس کے سپنوں کے آئیڈیل راج کمار کی طرح۔۔۔۔۔ اور پھر وہ ایک پل میں گدھے کے سر کے سینک کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ اس کی یہ ایسی صلاحیت جس کے آگے ہم سب بے بس ہیں۔۔۔۔۔ یوں تو بعض اوقات وہ پولیس کو گرفتاری دیتا آیا ہے۔ محض بے وقوف بنانے کے لئے۔۔۔۔۔ جب کبھی اسے محلات میں قید کیا گیا وہ غائب ہوتا رہا ہے۔۔۔۔۔ اگر اس میں یہ صلاحیت نہ ہوتی تو وہ نہ جانے کب کا اپنے انجام کو پہنچ چکا ہوتا۔۔۔۔۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کوئی جادوگر ہے؟“ ماتحت نے کہا۔

”ہاں۔۔۔۔۔“ انسپکٹر پرشاد نے سر ہلایا۔ ”جادوگر ہی ہے۔ سفلی علوم کا ماہر۔۔۔۔۔ اس لئے وہ بلا بن کر لڑکیوں کو اپنے سحر میں گرفتار کر کے ان سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس میں پڑنا تاز کرنے کی بھی صلاحیت ہے۔ جوڑ کی ایک بار اس کی اسیر ہو جاتی ہے۔ وہ اس کے سحر سے نکل نہیں پاتی ہے۔“

”کیا اسے قابو میں کرنے کے لئے کسی جادوگر سے مدد نہیں لی جاسکتی۔۔۔۔۔؟“

”اس پائے کے جادوگر موجود نہیں ہیں جو اسے قابو میں کر سکیں۔۔۔۔۔“ انسپکٹر پرشاد نے کہا۔ ”جو اہل وہ جادوگر نہیں شعبہ باز ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سیاہ بلا کا لے جادو کا ماہر ہے۔ اس سے مقابلہ کرنا بس کی بات نہیں ہے۔“

”سچ۔۔۔۔۔؟“ اس نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”واقعی تم سچ کہہ رہی ہو۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ابھی چند مہینوں کی بات ہے۔ تمہاری محبت کی نشانی میری گود میں کھیلے گی۔“

اجنبی کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں اور کچھ زیادہ ہی چمکنے لگیں۔ وہ محبت سے اسے سونگھنے لگا۔

”تم واقعی میری چندا ہو۔۔۔۔۔ میری چندا ہی میرے بچوں کی ماں بن سکتی ہے۔۔۔۔۔ اب میرے دل میں تمہاری محبت زیادہ بڑھ گئی ہے۔۔۔۔۔ اب میں تم سے ملنے آیا کروں گا۔۔۔۔۔ یہاں مجھے کوئی نہیں پہچانتا۔۔۔۔۔ صرف تمہارے گھر والے پہچانتے ہیں۔“

”تم ان کی پروا نہ کرو۔۔۔۔۔ میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے سوتی ہوں۔ تم روشن دان سے آ سکتے ہو۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ میں آؤں گا۔ مگر میری یہ بات یاد رکھنا کہ تم بلی ہو اور مجھے دوسری بلی کے پاس جانے سے نہیں روکو گی۔ کیوں کہ اس میں تمہاری بھلائی ہے۔ اب مجھ سے زیادہ اس بچے کو تمہارے خون کی ضرورت ہے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔ میں تمہیں کسی کے پاس جانے سے نہیں روکوں گی۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔“

”کیسی شرط؟“

”تم میرے پاس روز آیا کرو گے؟“

”ہاں روز آیا کروں گا۔ اس لیے کہ تم میرے ہونے والے بچے کی ماں ہو۔۔۔۔۔ میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑ سکتا۔ تم جاؤ۔ میں آدھی رات کے بعد آؤں گا۔“ وہ تھوڑی دور تک اسے چھوڑنے کے بعد آگے بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

پندرہ منٹ کے بعد انسپکٹر پرشاد کا ماتحت اس کے دفتر میں رانی کے متعلق رپورٹ سنار ہاتھ کا کہ وہ کہاں گئی اور کس سے ملتی رہی۔ ملنے والوں میں وہ پاگل اجنبی بھی تھا۔ جس کی تصویر اور مکمل تفصیلات ایک فائل کی صورت میں میز پر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے رپورٹ سنار کے بعد کہا۔

”سرا! میں تو آپ کے حکم سے مجبور تھا۔ ورنہ وہ پاگل مجرم مجھ سے دور نہ تھا۔ میں بڑی آسانی سے اسے گرفتار کر سکتا تھا۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ انسپکٹر پرشاد نے کہا۔ ”اسے گرفتار کرنے کے بعد کیا کرتے۔۔۔۔۔ جیل یا پاگل خانہ بھیج دیتے۔۔۔۔۔ گزشتہ پچاس برسوں سے ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے۔ وہ ہمیشہ فرار ہو جاتا ہے۔ اگر تم اسے گرفتار کرو گے تو پھر ایسا ہی ہوگا۔ ہمیں اوپر سے ایسا کوئی حکم نہیں ملا ہے کہ شوٹ کر دیں۔ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کا کام تمام کر دیا جائے۔۔۔۔۔ تب ہی برسوں پرانا قصہ ختم ہوگا۔“

”تو صاحب اسے دیکھتے ہی شوٹ کر دینا کیا زیادہ بہتر نہ ہوگا؟“ ماتحت نے پوچھا۔ ”اس کا جادو کا تم نہیں کرے گا؟“

”ہاں..... اسے اتنی مہلت اور موقع نہ دیا جائے کہ وہ کوئی منتر پڑھ سکے۔“ انسپکٹر پرشاد نے جواب دیا۔ ”جب اس کے سینے میں گولی آ رہا ہوگی تب اسے کوئی جادو منتر یا نہیں آئے گا۔ دم توڑ دے گا۔“

”اعلیٰ حکام نے اسے ماورائے قتل قرار دیا۔ تو آپ کیا جواب دیں گے؟“

”تم ان کی چھتا نہ کرو۔ میں انہیں جواب دے لوں گا اور سمجھا دوں گا۔“ انسپکٹر پرشاد نے کہا۔

اس کے دوسرے دن انسپکٹر پرشاد کا ماتحت جگ دیپ اس اجنبی نوجوان کی گھات میں بیٹھا تھا۔ سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ وہ شانتی سے ملنے اس کے کالج کی طرف جا رہا تھا..... پہلے تو سیاہ بلا کے روپ میں نمودار ہوا تھا۔ پھر وہ انسانی روپ میں آ گیا۔ جگ دیپ یہ سب کچھ اس طرح دیکھ رہا تھا۔ جیسے کوئی جادوئی قلم دیکھ رہا ہو۔ جیسے ہی وہ اجنبی قریب آیا۔ جگ دیپ جھڑپوں سے نکل کر اس کے سامنے آیا۔ اس نے رپو اور پہلے ہی سے نکال کر ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ اس کے اور اجنبی کے درمیان تین فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس نے بلا تامل نوجوان اجنبی پر گولی چلا دی۔ اس کا نشانہ چوک گیا۔ وہ حیران اور پریشان ہو گیا۔ کیوں کہ فاصلہ صرف تین فٹ تھا۔ جب کہ تیس چالیس فٹ سے کبھی اس کا نشانہ نہیں چوکا تھا..... اس کا نشانہ سچا تھا..... پھر اس نے پے در پے اس پر فائر کئے۔ ایک گولی بھی اجنبی کے نہیں لگی۔ البتہ آخری گولی رپورس ہو کر جگ دیپ کے بازو میں لگی۔ وہ بے ہوش ہو گیا۔

انسپکٹر پرشاد اس واقعہ سے فکر مند اور پریشان ہو گیا۔ سیاہ بلا نے انتقام لینا شروع کر دیا۔ اس نے سب سے پہلے جگ دیپ کی بیوی کو بچ کچ کی کالی بلی بنا دیا اور اسے راتوں کو لے جانے لگا..... صبح لا کر چھوڑ دیتا تھا۔ جگ دیپ کی شادی کو صرف چھ ماہ ہوئے تھے۔ اس نے ایک دن شانتی کے تینوں بھائی کی زبردست ہٹائی کر دی تھی۔ اس کے علاوہ اب وہ رانی اور شانتی کے گھر والوں کو ہر سال اور پریشان کرنے لگا۔ اس کے علاوہ اس نے تفریح کرنے آنے والی لڑکیوں اور عورتوں کو بھی تنگ اور ہراساں کرنے لگا۔

☆.....☆.....☆

نوتن اتنی کہانی سنا کر خاموش ہو گئی۔ پھر وہ گہرا سانس لے لے کر کہنے لگی۔

”سریش کمار صاحب سے میری ملاقات کل ہی پولیس اسٹیشن پر ہوئی تھی۔ میں انسپکٹر پرشاد کو یہ بتانے پولیس اسٹیشن گئی تھی کہ سیاہ بلا کچھ زیادہ ہی سرکش، سفاک اور شیر ہو گیا ہے۔ وہ راتوں کو رانی کے کمرے میں آنے لگا ہے۔ دو دن پہلے جب وہ اجنبی کے روپ میں رانی کو باہر لے جانے لگا

دیش اور اس کے بچے نے مزاحمت کی تو اس نے ان دونوں کی ایسی درگت بنائی کہ وہ بے ہوش ہو گئے.....“ سریش کمار نے پوچھا کہ ”ماجر کیا ہے؟“ جب اسے بتایا گیا تو اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں فوراً جا کر آپ سے ملوں..... آپ ہی ایک ایسی ہیں جو اس سیاہ بلے سے نجات دلا سکتی ہیں۔ اس لئے میں آئی ہوں۔ اس ذلیل، کینے اور غبیٹ نے شانتی اور اس کے گھر والوں کو بھی پریشان کر رکھا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کریں.....؟ کہاں جائیں.....؟ میں بڑی آشا لے کر آئی ہوں۔ امید کہ آپ مایوس نہیں کریں گی۔“

”آپ پریشان نہ ہوں۔ دمیرج رکھیں۔“ چندرا دیوی نے دلاسا دیا۔ ”میں ابھی اور اسی وقت آپ کے سنگ چل رہی ہوں۔“

چندرا دیوی ان کے ساتھ رام گڑھ پہنچی۔ بڑی عجیب و غریب، پراسرار اور ہیبت ناک کہانی تھی۔ ایک سیاہ بلا انسانی روپ میں آ کر نوجوان، حسین اور کنواری لڑکیوں کو اپنی شخصیت کے سحر سے انہیں اسیر بنا کر اس طرح سے کھیل رہا تھا جیسے وہ کھلونا ہوں۔ یہ سارا کھیل سفلی علوم کا تھا۔

چندرا دیوی سب سے پہلے جگ دیپ کے ہاں گئی۔ جگ دیپ اسپتال سے گھر آ گیا تھا لیکن ابھی وہ پوری طرح صحت یاب نہیں ہوا تھا۔ اس کی بیوی موہنی جیسے اجنبی نے بلی بنا دیا تھا وہ جگ دیپ کے بستر پر پانچٹی بیٹھی ہوئی تھی۔ جگ دیپ بہت زیادہ غم زدہ اور پریشان تھا۔ بلی چندرا دیوی کو دیکھ کر غرائی اور اس پر جھپٹی۔ چندرا دیوی نے اس پر جیسے ہی کوئی منتر پڑھ کر پھونکا وہ ٹھٹک گئی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھے اس نے انسانی شکل اختیار کر لی اور وہ سابقہ حالت میں آ گئی تھی۔

جگ دیپ یہ دیکھ کر پہلے تو بھونچکا سا ہو گیا۔ اپنی بیوی کو سامنے پا کر اس کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اسے یقین نہ آیا تھا۔ یہ سب اسے کسی سنے کی طرح لگا تھا۔ لیکن یہ حقیقت تھی۔ موہنی غرا کر بولی۔ ”میں بلی ہوں..... میاں میاؤں..... میرا نام چندا ہے۔“

چندرا دیوی نے اس پر ایک اور منتر پڑھ کر پھونکا۔ پھر وہ نارمل سی حالت میں آ گئی تو چندرا دیوی نے پوچھا۔

”تم کون ہو.....؟ کیا تم بلی ہو.....؟ کیا تمہارا نام چندا ہے.....؟“

”میں بلی کیوں ہونے لگی.....؟ میرا نام چندا نہیں..... میرا نام موہنی ہے۔“

”اب میں نے اس سیاہ بلے کا سحر توڑ دیا ہے۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”اب وہ موہنی کو دور غلا کر اور اپنا اسیر بنا کر نہیں لے جاسکتا..... اب اگر وہ آیا اور اس نے زبردستی اور جادو کے زور سے لے جانے کی کوشش کی تو اس پر یہ پتھر دے مارنا۔“ چندرا دیوی نے موہنی کی طرف بڑھادیا۔ وہ اس پتھر کی مار کھاتے ہی کتے کی طرح دم دبا کر بھاگے گا..... پھر کبھی پلٹ کر نہیں آئے گا۔“

”دیوی جی..... آپ تو ہمارے لئے اوتار بن کر آئیں.....“ جگ دیپ چندرا دیوی کے چرن چھونے کے لئے جھکا۔ ”پر آپ کون ہیں؟“

”نہیں..... نہیں.....“ چندرا دیوی نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ ”میں دیوی نہیں..... ایک عام سی عورت ہوں۔ میں یہ جانتی ہوں کہ جادو کا توڑ کس طرح کیا جاتا ہے..... سو میں نے توڑ کر دیا ہے۔ بھگوان آپ دونوں کو کبھی رکھے۔“

رانی کی ماں جو چندرا دیوی کو جگ دیپ کے ہاں لے کر آئی تھی وہ حیرت سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ واپسی میں انہوں نے پوچھا۔

”چندرا بیٹی.....! کیا میری بیٹی..... شانتی اور دوسری متاثرہ لڑکیوں اور عورتوں کو بھی اس سے نجات مل جائے گی؟“

”کیوں نہیں.....“ چندرا دیوی نے انہیں دلاسا دیا۔ ”میں جب یہاں آئی ہوں تو اسے کیفر کردار تک پہنچا کر ہی جاؤں گی۔“

”میں آپ کا یہ کمال دیکھ کر حیران رہ گئی ہوں۔“ انہوں نے کہا۔ ”آپ کتنی مہان ہیں۔“

”میں کچھ نہیں ہوں۔ بھگوان نے منش کی خدمت کے لئے جو صلاحیت دی ہے میں اسے کام میں لاتی ہوں۔“

مؤنی کوئی عام سی لڑکی نہیں تھی۔ اس کا حسن معمولی نہیں تھا۔ وہ لڑکیوں میں ایک تھی۔ اس میں جو جاؤ بیت اور دل کشی تھی وہ ہر کسی میں نہیں ہوتی۔

اجنبی جب سیاہ بلا کے روپ میں مکانات کی چھتیں پھلانگنا شکار کی تلاش میں جا رہا تھا تب اس کی نظر مؤنی پر پڑی تھی۔ مؤنی اپنی صورت سے بڑی مؤنی لگتی تھی۔ اس کے والدین نے اس کا نام بالکل صحیح رکھا تھا۔

سیاہ بلے نے اسے جو دیکھا تو وہ ٹرپ گیا۔ کیوں کہ اب تک اس کی زندگی میں ایسی مؤنی لڑکی نہیں آئی تھی۔ جگ دیپ کی راتوں میں بھی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ اس رات بھی اس کی ڈیوٹی تھی۔ اس گھر میں صرف وہ دونوں رہتے تھے۔ مؤنی گھر پر اکیلی تھی۔ سیاہ بلے نے اس پر اپنا جادو چلایا۔ اس کا ذہن پلٹ دیا۔ رانی اور شانتی کی طرح اسے بھی بلی بنا کر فائدہ اٹھانے لگا۔

اس رات وہ آیا تو جگ دیپ نیند کی گولی کھا کر سو رہا تھا۔ زخم میں ابھی بھی درد کی لہریں اٹھتی تھیں۔ نیند اور درد کو برداشت کرنے کے لئے وہ نیند کی گولی کھاتا تھا جس سے اسے بڑی گہری نیند آتی تھی اور درد کا احساس جاتا رہتا تھا۔

بلے نے روشن دان میں سے مؤنی کو دیکھا تو اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ مؤنی بلی کی

فل میں نہیں تھی۔ انسانی اور اپنی سابقہ حالت میں تھی۔ اس نے جب سے مؤنی کو بلی بنایا تھا تب سے وہ رات کے وقت آ کر اسے گود میں اٹھا کر کمرے میں لے جاتا تھا۔ جہاں ان دونوں کے سوا کوئی نہ ہوتا..... پھر وہ اسے انسانی شکل میں لے کر آتا۔ پھر دونوں بلی اور بلی جیسی حرکتیں کرتے۔ وہ نیچے آیا اور اس نے دیکھا۔ جگ دیپ گہری نیند سو رہا ہے۔ وہ انسانی شکل میں آیا اس وقت مؤنی کمرے میں نہیں تھی۔ کسی کام سے نکل گئی۔ پھر واپس آئی۔ وہ اجنبی کو دیکھ کر بولی۔ ”کون ہو تم.....؟ اندر کیسے آئے.....؟“

”میری چندا..... میری بلی.....! میں ہوں تمہارا بلا..... یہ بتاؤ کہ تم اس حالت میں کیسے آئیں.....؟“

”یہ تم کیا بک رہے ہو کیسے.....!“ مؤنی ایک دم بھڑک اٹھی۔ ”تمہیں شرم نہیں آتی۔ مجھے چندا اور بلی کہتے ہو.....؟ تم بلا نہیں..... بلا ہو جو رات کے وقت گھر میں گھس آئی ہے..... چلو لگو..... یہاں سے..... دفع ہو جاؤ۔“

”میری چندا.....! میری بلی.....! میاؤں..... میاؤں..... یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے..... چلو آؤ..... دوسرے کمرے میں چلتے ہیں۔ پیار بھری باتیں کرتے ہیں..... حیرت کی بات ہے۔ تم آپ سے باہر ہو رہی ہو.....؟ یہ کیا قصہ ہے؟“ وہ ششدر ہو کر بولا۔

”پھر تم نے مجھے میری چندا..... میری بلی کہا..... یہ تو میاؤں، میاؤں کیا کر رہا ہے..... دوسرے کمرے میں کیوں چلوں..... تو جاتا ہے کہ نہیں..... جوتی نکال کر تیرا چہرہ بگاڑ دوں.....“ مؤنی اس کے سحر سے پوری طرح نکل آئی تھی۔ وہ ہر بات بھول گئی تھی۔

اجنبی کی حیرت میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اس کے سحر سے نکل آئی ہے۔ وہ حیران تھی کہ اسے بلی سے انسان کس نے بنادیا۔ اس کا جادو ایسا تھا کہ اس کا توڑ کوئی نہیں ہے..... اس نے پھر اپنا جادو مؤنی پر چلایا۔ لیکن وہ چل نہ سکا۔

”اچھا اتنا بتا دے کہ تجھے بلی سے انسان کس نے بنایا.....؟ یا تو خود بخود عورت بن گئی؟“

”میں بلی کب تھی..... اچھا تو جاتا ہے کہ نہیں.....؟“ مؤنی پھنکاری۔

اجنبی کو بھی خند آ گئی تھی کہ وہ مؤنی کو ہر صورت میں اٹھا کر لے جائے گا۔ وہ اس کی طرف بڑھا تو مؤنی نے اسے مارنے کے لئے وہ پتھر اٹھا لیا جو چندرا دیوی نے دیا تھا۔ وہ کوئی بہت بڑا پتھر نہیں تھا۔ ایک چھوٹا سا سیاہ گیند کی طرح گول پتھر تھا۔ اجنبی رک گیا اور بڑے زور سے ہتھکڑ مار کر ہٹا۔ ایک تو وہ دیوہیکل سا تھا اور مؤنی اس کے سامنے ایک گڑیا کے مانند تھی۔ اسے ہمیشہ سے اپنے چوڑے چکلے مضبوط سینے، فولادی بازوؤں اور دراز قد ہونے پر بڑا ناز اور غرور رہا تھا۔ کیوں کہ کوئی

جس نے موٹی کاروپ دھار لیا ہو.....“ اس کی لات نے اس کے پیٹ میں شدید درد پیدا کر دیا تھا۔ اس نے جان لیا کہ نہیں..... یہ کوئی بدروح نہیں ہے۔ شاید کسی جادوگر نے موٹی کے حسن و شباب سے متاثر ہو کر اسے اتنی ہمتی دے دی ہے کہ وہ اسے بھگا دے۔ اسی نے موٹی کا سابقہ روپ بھی بحال کر دیا ہے۔ پھر وہ بیچ و تاب کھا کر اٹھا۔ غصے سے اس کا برا حال تھا۔ آج تک کسی مائی کے لال نے اسے ایسی ہزیمت نہیں دی تھی۔ اس کے پاس ایسا منتر تھا کہ وہ موٹی کو اٹھا کر لے جاسکتا تھا..... وہ اٹھا اور بڑھا۔ موٹی نے تاک کر اس کے سینے پر پتھر دے مارا۔

وہ پتھر اس کے سینے پر لگا تو اسے ایسا لگا کہ اس کے سینے میں انگارہ گھس گیا ہو۔ وہ چیخا چلا تا باہر نکلا۔ اس کے سارے جسم میں جیسے انگارے بھر گئے تھے۔ اس کا وجود جلنے لگا تھا۔ وہ ایک قریبی پارک میں گھاس پر کسی بلے کی طرح لوٹنے لگا۔ بہت دیر بعد جا کر اس کے جسم میں آگ سرد ہوتی گئی۔ اس پر ایسا خوف اور دہشت طاری ہوئی تھی کہ موٹی کے گھر کی طرف دیکھنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی۔

پھر وہ شانتی کے کانچ کی طرف بڑھا۔ حیران، پریشان اور خوف زدہ سا..... اس نے تہہ کر لیا تھا کہ وہ اس جادوگر کا پتلا کر رہے گا۔ ماضی میں اس کے کئی جادوگروں سے مقابلے ہوتے رہے تھے اسے آج تک کوئی نیچا نہیں دکھاسکا تھا۔ اسے موٹی سے محرومی پر بڑا غصہ آ رہا تھا۔ ایسی سندھ لڑکی تھی کہ اسے شاید ہی کوئی دوسری مل سکے۔ پہلی بار اس کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا تھا۔

کانچ سے کچھ فاصلہ پر وہ سیاہ بلا کی صورت میں آ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ شانتی کے کمرے کے روشن دان میں کھڑا تھا۔ شانتی دیوار کی طرف منہ کر کے سو رہی تھی۔ اس کی شکل صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کا سراپا بستر پر کسی جھرنے کی طرح بہہ رہا تھا۔ اس کی زلفیں بکھری ہوئی تھیں۔ وہ شب خوابی کے سیاہ لباس میں تھی۔ اس میں سے گورا بدن اس طرح چھلک رہا تھا جس طرح کانچ کی صراحی میں سے جھلکتا ہے۔ اس نے تمام کمرے کے روشن دانوں میں سے جھانک کر دیکھ لیا تھا۔ سب گہری نیند سو رہے تھے۔ پھر بھی اس نے احتیاطاً ایسا بھونک دیا تھا کہ کوئی صبح سے پہلے بیدار نہ ہو۔ پھر وہ روشن دان سے کمرے میں اتر آیا۔ اب وہ اجنبی کے روپ میں آ گیا۔

کمرے میں ٹیوب لائٹ جس کی روشنی دو دھیا چاندنی جیسی تھی اس میں شانتی کا چہرہ اور سراپا بتا رہا تھا۔ اس نے بستر کے قریب جا کر پہلے تو شانتی کے سراپا پر ایک نظر ڈالی اور اس کے حسن و شباب کی کرشمہ سازیوں کو نظروں میں جذب کیا۔ موٹی کی محرومی کا اثر قدرے زائل ہو گیا۔ لیکن اس کے ذہن میں اس جادوگر کے خلاف آگ ابل رہی تھی۔ جس نے موٹی کو اس سے محروم کیا تھا۔ اس نے اس جادوگر کی تلاش کا کام کل پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ آج کی رات خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔

بھی عورت یا لڑکی بازوؤں میں محصور ہو جانے کے بعد اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتی تھی اور نہ کل پائی تھی۔ ایسا بہت کم ہوا تھا کہ کسی لڑکی یا عورت نے مزاحمت کی ہو۔ وہ بازوؤں میں سما جانے کے بعد خود سپردال دیتی تھی۔ اس کے سر میں جکڑ جاتی تھی..... اور پھر ان لڑکیوں اور عورتوں کے آدمیوں نے اس پر ڈنڈوں اور لاشیوں اور لوہے کے سریوں سے حملہ کیا اور مارا بھی تھا۔ لیکن اس کا بال بھی ہکا نہیں ہوا تھا۔ بڑے بڑے پتھروں اور اینٹوں سے بھی اسے مارا گیا تھا۔ اس کے جسم پر کبھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور نہ ہوتا تھا۔ البتہ اس نے ان تمام لوگوں کی ایسی پٹائی کر دی تھی کہ وہ کئی دنوں تک چلے پھرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا پتھر ایسا تھا جیسے کوئی پھول ہو۔

”میری جان چندا.....! میری بلی..... میاؤں میاؤں..... یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم یہ پھول کیوں مار رہی ہو؟“ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ ”میری بلی..... تم یہ کیوں نہیں بتا رہی ہو تم بلی ہو.....“

”اوہ میاؤں میاؤں کی اولاد تو جاتا ہے کہ نہیں تیرا سر پھاڑ دوں.....“ موٹی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ لیکن وہ ایک لمحے لئے دل میں یہ سوچ کر سہم گئی کہ یہ چھوٹا سا پتھر اس شیطان کا کیا بازو سکتا ہے.....؟ اس کے لئے تو ایک پھول کی مانند ہے۔ پھر اس نے سوچا کہ اس میں یقیناً کوئی نہ کوئی خاص بات ہوگی جو چند رادیوی نے دیا ہے۔ چند رادیوی نے حیوان سے انسان بنایا۔

”سن.....“ اجنبی بولا۔ ”تو جس طرح پہلے میری ہر بات مان لیتی تھی اب بھی مان لے..... بتا دے کہ تجھے کس نے پھر سے انسان بنادیا..... اب چل دوسرے کمرے میں ہم وہاں کیف دوسروں کی دنیا میں پہنچ جائیں..... اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں تجھے گود میں اٹھا کر لے جاؤں گا..... ہم اچھا اور مسرت سے بھرپور وقت گزار دیں گے..... میں تجھے پھر سے بلی بنادوں گا..... میری بلی چندا..... میاؤں میاؤں..... چل آ.....“

اس سے پہلے کہ موٹی اسے پتھر مارتی اجنبی نے اسے گود میں اٹھانا چاہا۔ لیکن اسے اٹھانہ سکا۔ کیوں کہ وہ کسی چٹان کی طرح بھاری ہو گئی تھی۔ اس نے اپنی ساری طاقت اور اپنا تمام زور صرف کر دیا تھا۔ اسے وہ ٹس مس نہ کر سکا۔ اس بات نے اسے بھونچکا سر کر دیا تھا۔ اس نے اپنے جادو منتر سے کام لیا۔ اس سے بھی کچھ نہ ہوا۔ وہ حیران اور پریشان سا ہو گیا..... آخر یہ سب کیا ہے؟ کبھی تو ایسا نہیں ہوا..... موٹی جادوگرئی نہیں ہے۔

پھر اس لمحے موٹی نے اس کے پیٹ پر زوردار لات رسید کی تو وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور کئی قلابازیاں کھاتا ہوا دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے۔ وہ پٹھی پٹھی نظروں سے موٹی کو دیکھنے لگا۔ پھر اسے ایک خیال آیا۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی بدروح ہے۔

اس نے شانتی کے چہرے پر کھڑے بالوں کو ہٹایا اور اس کا شانہ ہلایا اور بولا۔

”میری چندا..... میری بلی..... اٹھو..... میاؤں میاؤں..... دیکھو میں تمہارا بلا آ گیا ہوں۔“

”تم آگئے میرے ساجن.....! میرے بلے..... میری جان..... میاؤں میاؤں.....“ شانتی

نے آنکھیں کھولنے کے بعد اسے دیکھ کر کہا۔

”میری چندا..... میری بلی..... تم کتنی حسین.....“ وہ بستر پر اس کے پاس بیٹھ کر بولا۔ ”کیا تم

نے اپنی ماں کو نہیں سمجھایا کہ وہ پولیس اسٹیشن جا کر انسپکٹر سے کیوں ملتی ہے.....؟ اس سے کہو ہم

دونوں ایک دوسرے سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ تم بلی ہو..... اور میں بلا ہوں..... اور ہم دونوں

ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہیں..... میاؤں..... میاؤں.....“

”میری ماں اور میرا بھائی ہم دونوں کو جدا کرنے کے لئے منصوبے بنا رہے ہیں۔“ شانتی

بولی۔ ”میری ماں کہہ رہی تھی کہ وہ مجھے بنارس لے جا کر گنگا میں نہ صرف اشان کرائے گی بلکہ کسی

مہان، سادھو یا چنڈت سے بات کرے گی..... اگر ایسا ہوا..... اس نے کسی مہان سے رابطہ کیا تو ہم

دونوں ایک دوسرے سے سدا کے لئے الگ ہو جائیں گے؟ میاؤں میاؤں..... سچ بولو..... میرے

بلے۔“

”میری بلی..... میری چندا..... دنیا کی کوئی طاقت ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں

کر سکتی..... میاؤں..... میاؤں۔“

اجنبی اتنا کہہ کر وہ شانتی کی خود پسردگی سے بھری آنکھوں میں جھانکتا ہوا چہرے پر جھکا.....

دوسرے لمحے وہ اس طرح سے اچھل پڑا جیسے اسے بجلی کا زیر دست جھٹکا لگا ہو..... اسے یقین نہ آیا۔

شانتی کی جگہ کوئی چڑیل تھی۔ وہ چشم زدن میں چڑیل ہو گئی تھی۔ اس کا مکروہ اور گھٹاؤنا چہرہ تھا.....

شانتی کا حسین، شاداب اور پھول جیسا چہرہ غائب ہو گیا تھا۔ وہ بستر سے فرش پر آ گیا۔

”کیا ہوا میری جان.....! میرے بلے..... تم اس طرح بستر سے کیوں اتر گئے..... میرے

پاس آؤ..... میرے بلے.....“

”یہ تمہارے چہرے کو کیا ہو گیا ہے.....“ وہ بولا۔ ”تم چڑیل لگ رہی ہو۔“

”کیا کہا..... میں چڑیل لگ رہی ہوں.....؟“ شانتی اپنا لباس اور سرپا سیمٹی ہوئی بستر سے

نکل آئی۔ ”کہیں تم نشے میں تو نہیں ہو..... کہیں سے پی کر تو نہیں آرہے ہو..... شاید تم نے اپنی کسی

بلی کا سارا خون تو نہیں پی لیا.....؟“

”نہیں..... میں کبھی پی کر نہیں آیا اس لیے کہ تم خود شراب ہوتی ہو۔“ وہ بولا۔ ”یہ تم سے کس

نے کہا کہ میں بلیوں کا خون چوستا ہوں۔“

”یہ تم گردن پر زخم سے خون جو چوستے ہو۔ یہ خون پینا نہیں ہوا؟“ شانتی نے تکرار کے انداز میں کہا۔

”نہیں..... میں کیف و سرور اور لذت کے لئے پکھتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”جب میں وہاں

ہوٹ رکھتا اور دانت گڑھ دیتا ہوں تو تمہیں لذت محسوس نہیں ہوتی ہے.....؟ نشہ اور بے خودی چھا

نہیں جاتی ہے.....؟ کیا تمہیں زخم میں درد اور تکلیف محسوس ہوئی۔“

”نہیں.....“ شانتی نے اپنی ہاتھیں پھیلائیں..... ”میری آغوش میں آ جاؤ..... میرے

بلے..... تم میرا سارا خون پی جاؤ۔ میں اف نہیں کروں گی..... میاؤں..... میاؤں.....“ شانتی اس کی طرف بڑھی۔

”تم آئینے میں اپنی شکل دیکھو..... تم چڑیل بن گئی ہو..... میں نہ تو تمہارے پاس آ سکتا ہوں

اور نہ ہی خون پی سکتا ہوں۔“

شانتی سنگار میز کی طرف بڑھی جو ایک کونے میں رکھا ہوا تھا۔ وہ واقعی کسی چڑیل کی طرح ہو گئی

تھی۔

”یہ کیا ہو گیا میری صورت کو.....؟“ شانتی دہشت زدہ سی ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ اسے اپنی

نظروں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اجنبی کی طرف دیکھا۔ ”یہ میں چڑیل کیسے بن

گئی.....؟ میں نے کون سا ایسا پاپ کیا جس سے میں چڑیل بن گئی۔“

”میرے خیال میں کسی نے تم پر جادو کر کے چڑیل بنا دیا ہے.....“ اجنبی نے کہا۔ ”تا کہ میری

چندا..... میری بلی کو مجھ سے چھین لے.....“

”کیا میں سدا کے لئے چڑیل بن گئی ہوں.....؟“ شانتی رونے لگی۔

اجنبی کو موٹی کا واقعہ یاد آیا..... اس جادوگر نے اب شانتی کے ساتھ یہ حرکت کی تھی۔

”میں کوشش کرتا ہوں کہ تمہیں اصل روپ میں لے آؤں.....؟“ اجنبی نے کہا۔ ”تم پریشان

نہو۔ میرے پاس اس جادو کا توڑ ہے۔“

اتنا کہہ کر اس نے منتر پڑھ کر شانتی پر پھونکا۔ شانتی اپنی اصلی حالت میں آ گئی۔ اس وقت

شانتی سنگار میز کے آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اپنے آپ کو سابقہ حالت میں دیکھ کر اس کی

خوشی کی انتہا نہ رہی۔

”میری چندا..... میری بلی..... میاؤں..... میاؤں.....“ اجنبی اس کی طرف دیوانہ وار

بڑھا۔ ”میں نے اس جادوگر کا اثر ختم کر دیا ہے..... آؤ..... اب ہم دونوں بہت دور چلے جائیں.....

ایک نئی اور حسین دنیا میں کھو جائیں۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ ہو..... تم

بلی..... میں بلا..... میاؤں، میاؤں۔“

پھر اس نے شانتی کو آغوش میں لے لیا۔ اس کے چہرے پر جھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ شانتی نے خود سپردگی سے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا تھا۔ کچھ دیر بعد اجنبی نے محسوس کیا کہ شانتی نے اس کی گردن کی پشت پر دانت گاڑ دیئے ہیں..... وہ اس کا خون چوس رہی ہے..... اور اس کے ہاتھ اجنبی کو اپنے جسم پر بلی کے پنجوں کی طرح محسوس ہونے لگے۔ اس نے ایک دم سے جو آنکھیں کھول کر دیکھا تو لرز گیا۔ اسے یقین نہیں آیا..... اس کی آغوش میں شانتی نہیں بلکہ شانتی کے قامت کی ایک خوفناک سیاہ بلی تھی۔ اس بلی نے اپنے ہاتھ اس کی گردن میں حائل کئے ہوئے تھے..... اجنبی کے اوسان خطا ہو گئے۔ اس نے سنہل کر بلی کے ہاتھ پکڑ کر اپنی گردن آزاد کی اور اسے ایک طرف پوری طاقت سے دھکا دیا..... بلی دور جا گری پھر وہ سنہل کر اٹھی اور بولی۔

”میرے محبوب..... تمہارا خون شراب کی مانند پر کیف اور سرور بخش ہے..... مجھے خون پینے دو..... میرے پیارے بلے..... میاؤں..... میاؤں.....“ وہ اس کی طرف پیرود کے پنجوں کے بل بڑھی۔

اجنبی اس وقت اپنا سارا جادو منتر بھول چکا تھا۔ کمرے میں شانتی جو تھی وہ نیند کی حالت میں بستر پر تھی۔ وہ ایک دم سے سیاہ بلا بن کر روشن دان پر آ گیا اور وہاں سے نکل گیا۔ وہ چند قدم گیا تھا کہ اس نے آواز سنی۔ ”میرے بلے! تم مجھے چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو.....“ اجنبی تو دل کے ارمان پورے نہیں ہوئے۔ میری جو حسرتیں ہیں وہ..... تم سے پوری ہوں گی..... میاؤں..... میاؤں.....“

اجنبی نے مڑ کر دیکھا۔ قد آور سیاہ بلی اس کی طرف بجلی کی سی تیزی سے لپکتی آرہی تھی۔ سیاہ بلا رک گیا۔ وہ اسے مزا چکھا دینا چاہتا تھا۔ جیسے ہی بلی قریب آئی وہ اس پر جھپٹ پڑا۔ اس نے کبھی اتنی قد آور بلی نہیں دیکھی تھی۔ وہ دونوں گھم گھم گئے۔ ایک دوسرے کو نوچنے اور کھسوٹنے لگے..... وہ اس پر اپنا جادو منتر چلاتا رہا۔ لیکن بلی تھی کہ اس کے قابو میں آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جب بلے نے دیکھا کہ وہ اس پر بھاری پڑ رہی ہے تب وہ ایک دم سے غائب ہو گیا..... پھر بلی بھی غائب ہو گئی۔

شانتی جو خواب کی سی حالت میں تھی وہ یک لخت نیند سے بیدار ہو گئی۔ اس نے دیکھا کہ اس کا بستر بے ترتیب ہے۔ فرش پر اس کا شب خوابی کا لباس بکھرا پڑا ہے۔ اجنبی کا نام و نشان نہیں ہے..... اس نے زخم کی جگہ ہاتھ لگا کر لگا دیکھا۔ آج اس کے بلے اجنبی نے خون نہیں پیا تھا۔ کیوں کہ زخم سوکھا پڑا تھا۔ جب وہ زخم پر اپنا منہ رکھ کر خون چوستا تھا تب وہ کیف و لذت میں ڈوب جاتی تھی اور وہ ایک بوندیں نکل آتی تھیں۔ زخم خون سے گیلا گیلا ہو جاتا تھا۔

پھر شانتی نے اپنا لباس اٹھا کر پہنا۔ آئینے کے سامنے جا کر اپنا چہرہ دیکھا۔ پھر وہ بڑبڑائی۔

”اوہ بھگوان.....! ابھی جو میں نے اپنے آپ کو چنیل کے روپ میں دیکھا تھا..... وہ کیا تھا.....؟ کیا پہنا تھا.....؟“

☆.....☆.....☆

چندرا دیوی نے ٹی وی آف کر دیا۔ وہ اور رانی کی ماں کا بیج کے کمرے میں بیٹھی ہوئی یہ واقعات دیکھ رہی تھیں۔ یہ جو چندرا دیوی نے انہیں جو کچھ دکھایا تھا وہاں سے شروع ہوا تھا جب اجنبی موٹی کے ہاں پہنچا تھا۔

رانی کی ماں نوتن ششدر سی تھیں..... انہیں یقین آیا تھا کہ چندرا دیوی ٹی وی کے لائیو پروگرام کی طرح دکھا سکتی ہیں۔ وہ تھیرزدہ سی تھیں۔ موٹی نے جو اجنبی نو جوان کی درگت بتائی تھی اس نے ان کا بیج خوش کر دیا تھا۔ اس لئے کہ اس سیاہ بلے نے جودق کیا تھا ورنہ کے گھر کا سکون اجاڑ دیا تھا ان کی بیٹی کو اپنے سحر میں لے کر حائل بنا دیا تھا۔ اس سے جوازیت کی ٹی وی وہ ناقابل معافی تھی۔

انہیں رتنا دیوی سے ہمدردی تھی۔ اس لئے کہ وہ دونوں ایک ہی کشتی کی سوار تھیں۔ ان کی بیٹی شانتی سے وہ اس طرح کھیل رہا تھا جس طرح ان کی بیٹی سے کھیل رہا تھا۔ موٹی اور شانتی کے ہاں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس نے انہیں خوش کر دیا تھا۔

”آپ نے ٹی وی پر جودو واقعات دکھائے وہ اس طرح سے دیکھے جا رہے تھے اور نظر آرہے تھے جیسے وہاں کیمرے نصب ہوں۔“ وہ بولیں۔ ”کیا آپ نے وہاں خفیہ کیمرے نصب کر دیئے تھے.....؟“

”ماضی میں بڑے بڑے جادوگروں کے پاس جادوئی گولے ہوتے تھے جس میں وہ جو چاہے دکھاتے تھے.....“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”دنیا کے کسی بھی حصے کی وہ عکاسی کرتے تھے۔ اس جادوئی گولے میں ہر وہ بات نظر آ جاتی تھی جو وہ چاہتے تھے..... یہ سارا کمال جادو کا ہوتا تھا..... آج وہ گولائی دی کی شکل میں موجود ہے..... میں نے کوئی خفیہ کیمرہ نصب نہیں کیا ہوا ہے..... یہ سب جادو کا کھیل ہے۔“

”موٹی میں اتنی شکتی کہاں سے اور کیسے آ گئی جو اس نے اجنبی کی درگت بتادی اور وہ چوہے کی طرح بھاگ نکلا۔“ رانی کی ماں نے پوچھا۔

”دراصل میں نے موٹی کا روپ دھار لیا تھا تا کہ اس اجنبی کو سبق دے سکوں۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”میں نے اسے دوسرے کمرے میں گہری نیند سلا دیا تھا۔ اگر میری جگہ موٹی ہوتی تو اس پر اجنبی کا کالا جادو اثر کر چکا ہوتا اور وہ اس سے مقابلہ نہیں کر پاتی۔“

لینے کی کوشش کی تھی۔ رانی اور شانتی کے گھر والے بھی اس کی جان کے درپے تھے۔ اس کی جان کوئی نہیں لے سکتا تھا۔۔۔۔۔ البتہ وہ جس کی چاہے جان لے سکتا تھا۔

اس کے ذہن میں ایک منصوبہ تھا کہ رانی کے والدین کو موت سے ہم کنار کرنے کی صورت میں رانی اپنے باپ کی لاکھوں کروڑوں کی جائیداد اور دولت کی وارث بن جائے گی۔ اس کی دولت پر ساری زندگی عیش کیا جاسکتا ہے۔ اس نے آج رات ہی رانی کے ماں باپ کو موت کی بھیٹ چڑھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔۔۔۔۔ کل رات اس کا جس نادیدہ طاقت سے مقابلہ ہوا تھا وہ اس سے مقابلہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں کہ اس میں ہار جیت بھی ہو سکتی تھی۔ اس کا کالا جادو منتر شاید اس جادوگر سے مقابلہ نہ کر سکے۔ اس لئے وہ رانی کے والدین کو موت کے گھاٹ اتار کر شہر چلا جانا چاہتا تھا۔ رانی کا انتظار کرے گا۔

رانی کے والدین کو موت کی نذر کرنے کا جو منصوبہ اس کے ذہن میں تھا وہ یہ تھا کہ دیش کے ہاتھوں۔۔۔۔۔ وہ اسے جادو کے زور سے کھپتلی بنا کر ہر طرح کا کام لے سکتا تھا۔۔۔۔۔ رانی سے شادی کے بعد اسے راستے سے ہٹانا یا اسے ہاتھ کا کھیل تھا۔

چودھویں کی رات تھی۔ ہر سو دودھیا چاندنی کا دریا نہج تھا۔ اس نے دور سے ہی رانی کو دیکھ لیا جو کانچ سے قدرے فاصلے پر جو ہزاروں فٹ گہری کھائی تھی اس کے پاس کھڑی چاندنی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ رانی نے جو اسے دیکھا تو فضا میں ہاتھ لہرا دیا اور اس کا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ اجنبی نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ بلا یہاں نہیں ہے۔

”میری چندا۔۔۔۔۔ میری ملی۔۔۔۔۔ میری جان!“ وہ اس کے پاس آ کر بولا۔ ”اس وقت تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“

”تمہارا انتظار۔۔۔۔۔“ رانی دل فریب انداز سے مسکرائی۔

”کیا تمہارے گھر والوں نے تمہیں اکیلے یہاں آنے دیا۔۔۔۔۔؟“ اجنبی نے حیرت سے کہا۔

”وہ سب سور ہے ہیں۔ میں یہ دیکھ کر تم سے ملنے چلی آئی۔“ رانی نے کہا۔ ”میرے بلے مجھے تم سے ملے بغیر چین نہیں آتا ہے۔“

”میری ملی۔۔۔۔۔ میری چندا۔۔۔۔۔ میاؤں میاؤں۔۔۔۔۔ میں تم سے ایک بات کہوں؟ کیا تم سنجیدگی سے سنو گی۔“ اس نے کہا۔

”ہاں کیوں نہیں بولو۔۔۔۔۔ کیا بات ہے میرے بلے۔۔۔۔۔“

”یہ بتاؤ تم میری خاطر کیا کر سکتی ہو؟“ اس نے سوال کیا۔

”جو تم کہو گے۔۔۔۔۔؟“ رانی نے کہا۔ ”میں تمہاری خاطر اپنی جان بھی دے سکتی ہوں۔“

”شانتی نے جو چڑیل کا روپ دھارا اور بعد میں جو قدریلی کی آغوش میں اجنبی تھا۔۔۔۔۔ کیا کہانی تھی؟“

”وہ چڑیل میری موکلہ تھی۔۔۔۔۔ یہ سب میں نے کیا۔ اس چڑیل کو ملی بنا دیا تاکہ سیاہ بلے کے مزاج درست کر دے۔“ چندرا دیوی بولی۔

”وہ بلا غائب ہو گیا۔۔۔۔۔ ملی بھی۔۔۔۔۔ کیا ملی نے بھی غائب ہو کر اس بلے کی خبر لی۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں نے دانستے اسے غائب ہونے دیا۔“ چندرا دیوی نے کہا۔

”وہ کس لئے۔۔۔۔۔؟“ رانی کی ماں بولی۔

”اس لئے کہ اس سے بعد میں دودھ ہاتھ کئے جاسکیں؟“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔

”آپ کیا اس کا خاتمہ نہیں کر سکتی تھیں۔۔۔۔۔؟“ رانی کی ماں نے کہا۔ ”کاش! وہ شیطان مرجاتا۔“

”میرے لئے اسے موت کی بھیٹ چڑھانا لمحے کی بات اور باتیں ہاتھ کا کھیل ہے۔۔۔۔۔ میں چاہتی تو اسے موت کی آغوش میں پہنچا دیتی۔۔۔۔۔ لیکن میں نے دانستے ایسا نہیں کیا۔“ چندرا دیوی بولی۔

”کیا اس میں آپ کی کوئی مصلحت پوشیدہ تھی جو آپ نے اس کی جان نہیں لی؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”مجھے یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ کون ہے۔۔۔۔۔؟ کہاں سے آیا ہے۔۔۔۔۔؟ کیوں آیا ہے۔۔۔۔۔؟ یہ تو میں خود بھی معلوم کر سکتی ہوں۔ لیکن میں اس کی زبانی سننا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔ جب وہ کل رات رانی کے پاس آئے گا۔“

”کیا وہ کل رات رانی سے ملنے آئے گا۔۔۔۔۔؟“ رانی کی ماں نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”آپ پریشان نہ ہوں۔۔۔۔۔“ چندرا دیوی نے تسلی دی۔ ”میں اس سے رانی کے روپ میں ملوں گی۔ بھگوان نے چاہا تو یہ اس کی زندگی کی آخری رات ہوگی۔ وہ اپنے انجام کو پہنچ جائے گا۔“

☆.....☆.....☆

اجنبی نو جوان رات بارہ بجے انسانی شکل میں رانی کے کانچ کی طرف جا رہا تھا۔ کل اس کے ساتھ جو وہ خوف ناک واقعات پیش آئے تھے اس وجہ سے وہ حد سے زیادہ پریشان اور خوف زدہ تھا۔ اسے تجسس بھی تھا کہ ان واقعات کے پس پشت کون ہے۔۔۔۔۔؟ کیا کسی جادوگر کی خدمات حاصل کی گئی ہیں اس سے نجات پانے کے لئے۔۔۔۔۔؟ اس کا خیال تھا کہ رانی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اس کے علم میں یہ بات تھی کہ اسے جان سے مارنے کے لئے پولیس کی خدمات برسوں سے حاصل کی گئی تھیں۔ پولیس اس کا بال تک بیک نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ دن پہلے ایک پولیس افسر نے اس کی جان

”مجھے تمہارے والدین کی جان کی ضرورت ہے تمہاری نہیں.....“ وہ بولا۔ ”تمہارے والدین کو راستے سے ہٹا دیا جائے تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟“

”نہیں..... میری جان نہیں..... بلکہ مجھے خوشی ہوگی کہ ہمارے راستے کے کانٹے نکل گئے۔“

رانی نے جواب دیا۔

”میری چندا..... میری بلی..... میری میاؤں تم کتنی اچھی ہو.....“ اس نے خوش ہو کر کہا۔

”اب تم میرا منصوبہ غور سے سنو۔“

”میں نے جو منصوبہ بنایا ہے وہ یہ ہے کہ تم دیش سے شادی کر دو گی۔“ اجنبی نے کہا۔

”کیا کہا.....؟ میں تمہارے بجائے دیش سے شادی کروں..... نہیں..... نہیں..... ہرگز نہیں..... میں مرجاؤں گی لیکن میں اس سے کسی قیمت پر شادی نہیں کروں گی۔“ رانی نے ہڈیانی لہجے میں کہا۔ ”میرے بلے.....! یہ تم کیا کہہ رہے ہو.....؟ تمہاری چندا اس کی ہو جائے..... نہیں..... میاؤں..... میاؤں..... چندا کسی اور مرد کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔“

”پہلے میری پوری بات اور منصوبہ سن لو.....“ اجنبی نے کہا۔ ”کیا اپنے ماں باپ کو تم قتل کرو گی؟“

”کیوں نہیں..... میں تمہاری خاطر صرف اپنے ماں باپ ہی کو نہیں بلکہ تمہارے ماما پتا کو بھی موت کی بھیٹ چڑھا سکتی ہوں۔“

”کیا تم یہ چاہتی ہو کہ قتل کر کے جیل جانا، تختہ دار پر چڑھنا اور مجھ سے محروم ہونا چاہتی ہو.....؟“ وہ بولا۔

”نہیں۔“ رانی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”تم مجھے دیش سے شادی کرنے کا مشورہ کیوں دے رہے ہو؟“

”تمہارے ماں باپ کی موت کا حصول فوری اور نہایت آسان راستہ.....“ وہ کہنے لگا۔

”تمہارے باپ نے تمہارے نام جو دولت اور جائیداد لکھی ہے وہ ان کے مرنے کے بعد ملے گی۔ پتا نہیں وہ کب اس دنیا سے پردہ ہائیں گے۔ اس لیے میں نے ان کے قتل کا منصوبہ بنایا ہے۔ تمہارے پتا جی شادی کے بعد پریش زنگی گزارنے اور سیر و سیاحت پر جانے نہیں دیں گے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ ان کا پتا جلد صاف کر دیا جائے۔“

”آخر میں کس لیے دیش سے شادی کروں.....؟“ رانی نے سوال کیا۔

”اس لیے کہ تمہارے ماں باپ اس کے سوائے کسی اور سے شادی نہیں کریں گے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا دیش مجھ سے شادی کر لے گا.....؟“ رانی تذبذب سے بولی۔ ”اس لیے کہ میں حاملہ ہو چکی ہوں۔“

”ہاں..... وہ تم سے خوشی خوشی شادی کرے گا.....“

اس کی نظریں تمہارے باپ کی دولت، جائیداد اور کاروبار پر ہے۔ یہ کل اثاثہ جو کروڑوں کی مالیت کا ہے۔ وہ اس کے حصول کے لئے بہت دور تک جاسکتا ہے۔ اسے تم کہو گی کہ اگر تمہیں دولت چاہئے تو اپنے ماں باپ کو بھی قتل کر دو..... وہ کر دے گا..... شادی کے بعد دیش کو مہرہ بنانا ہے..... تمہارے ماں باپ کا قتل اس کے ہاتھوں سے ہونا چاہئے تاکہ تم پر آج نہ آئے..... وہ ایک ایسے منصوبے کے تحت تمہارے والدین کو قتل کرے گا وہ بھی قانون کی گرفت میں نہیں آئے گا..... میں اسے کوئی مہلت نہیں دوں گا۔ قتل کرادوں گا۔ تاکہ نہ رہے ہانس نہ بیجے ہانسری.....“

”جب تم اسے قتل کر سکتے ہو، اس سے میرے ماں باپ کو موت کی نیند سلا دو تاکہ مجھے اس سے شادی کرنے کی ضرورت نہ پڑے۔“

”دراصل میں اس لیے ایسا چاہتا ہوں کہ..... یہ ثابت کیا جاسکے کہ دیش نے دولت کے حصول کے لئے قتل کیا ہے..... دیش سے نجات پانے کا یہ ایک سیدھا راستہ ہے..... ویسے میں جو کہہ رہا ہوں اس پر عمل کرو۔“ وہ بولا۔ ”بحث اور تکرار نہ کرو۔“

”میں صرف اس شرط پر تمہاری ہر بات مانوں گی کہ تم مجھے بتاؤ گے..... آج ہی بتانا پڑے گا۔“

”کیا بتانا پڑے گا.....؟“ اس نے الجھ کر پوچھا۔ ”آخر تم کیا جانا چاہتی ہو.....؟“

”میرے بلے..... میاؤں میاؤں..... کیا تم میری اس بات سے ناراض ہو گئے..... میرے پیارے بلے.....؟“ وہ اسے منانے لگی۔ ”ایک اپنا نام..... میں نے تم سے متحد ہار تمہارا نام دریافت کیا..... لیکن تم بڑی خوب صورتی سے ٹال گئے..... پھر تم نے میرے بار بار پوچھنے پر یہ بھی نہیں بتایا..... تم کون ہو.....؟ کہاں سے آئے ہو میرے پیارے بلے.....؟ لیکن آج تمہیں یہ سب بتانا ہوگا..... اگر تم نہیں بتاؤ گے تو میں تم سے روٹھ جاؤں گی..... اس وقت تک تم سے نہیں ملوں گی جب تک مجھے میرے سوالوں کا جواب نہیں ملتا۔“

”میری چندا.....! یہ آج تم پر کیسا دورہ پڑ گیا..... میری بلی.....! میاؤں..... میاؤں..... میں تمہارے ان سوالوں کا جواب اس وقت دوں گا کہ جب ہمارا بیٹا ہوگا..... جب میں تمہیں اپنے ہاں لے جاؤں گا.....“

”اس میں ابھی بہت دیر ہے.....“ رانی کہنے لگی۔ ”کیوں کہ دیش سے شادی ہوگی..... پھر

آغوش میں آ جاؤ۔ میری چندا۔ میری ملی۔! میاؤں۔۔۔۔۔“
 ”نہیں۔۔۔۔۔ میں تمہارے ساتھ ہرگز ہرگز نہیں چلوں گی۔“ وہ برہمی سے بولی۔ ”اگر تم نے مجھے ہاتھ لگایا تو۔۔۔۔۔“ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
 ”ورنہ کیا۔۔۔۔۔؟“ وہ ہنس پڑا۔ ”تمہیں کیا میری طاقت کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔۔۔۔۔؟ میں تو تمہیں اس طرح اٹھا سکتا ہوں جیسے تم پلاسٹک کی گڑیا ہو۔۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔۔ اب مذاق نہ کرو۔ وہ جمو نیڑی اور بستر ہمارا اختر ہے۔“

”ورنہ یہ کہ۔۔۔۔۔ میں اپنے کالج میں چلی جاؤں گی۔۔۔۔۔ شور مچا دوں گی۔۔۔۔۔ پھر سارے لوگ اکٹھا ہو جائیں گے اور پھر تمہاری ایسی درگت بنائیں گے کہ تم زخمی ہو جاؤ گے۔۔۔۔۔ پھر اسپتال جانا پڑ جائے گا۔“ رانی نے تیز لہجے میں کہا۔

”جو ہاتھ مجھ پر اٹھے گا میں اسے توڑ کر رکھ دوں گا۔۔۔۔۔“ اجنبی نے رعونت سے کہا۔ ”اس سے پہلے میری چندا کے چار بھائیوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔۔۔۔۔ میں نے ان کا حشر نشر کیا۔۔۔۔۔ وہ جانتے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن میری رانی چندا۔۔۔۔۔ آج تم مجھ سے یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟۔۔۔۔۔ کبھی تم نے مجھ سے ایسی باتیں نہیں کیں۔۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔۔ میرے ساتھ۔۔۔۔۔“
 ”نہیں مہندر پرکاش۔۔۔۔۔ انہیں۔۔۔۔۔ میں نے تم سے کہہ دیا تاکہ میں تمہارے ساتھ کسی قیمت پر رات گزارنے نہیں جاؤں گی۔“ وہ بولی۔

”کیا کہا۔۔۔۔۔؟“ وہ اس طرح سے اچھل پڑا جیسے کرنٹ کا جھٹکا لگا ہو۔ ”مہندر پرکاش؟“ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ بھونچکا سا ہو کر بولا۔ ”میرا نام۔۔۔۔۔ تمہیں کس نے بتایا؟“ اس کی آواز اس کے گلے میں پھنسی رہی تھی۔

”کسی نے بھی بتلایا۔۔۔۔۔ تمہیں اس سے کیا۔۔۔۔۔؟ وہ اٹھلا کر بولی۔ ”کیا میں نے تمہارا نام فلفل بتایا۔۔۔۔۔ میرے بلے۔۔۔۔۔! میاؤں۔“

”میرا نام کوئی نہیں جانتا ہے۔۔۔۔۔ میرے فرشتے بھی نہیں۔“ بلاغریا۔ ”نام بالکل صحیح ہے۔۔۔۔۔ میرے ماں باپ ہوتے تو وہ میرا۔۔۔۔۔ اصل نام بھول چکے تھے۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ صرف ایک بلا ہوں۔ میری ماں بھی ملی تھی۔۔۔۔۔ میرا باپ بلا تھا۔۔۔۔۔ کچ بچتاؤ۔۔۔۔۔ میرا یہ نام کس نے اور کیوں بتایا۔۔۔۔۔؟ وہ کون ہے۔۔۔۔۔؟ کہاں رہتا ہے۔۔۔۔۔؟ اس کا نام کیا ہے۔۔۔۔۔؟“

”جب جذبات کی عی چڑھی ہوئی تھی تم نے میرے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا تھا۔۔۔۔۔ میری جان۔۔۔۔۔! مہندر پرکاش نے آج تک کسی سے اتنی محبت نہیں کی جتنی تم سے کی۔۔۔۔۔ نہ ہی میں کبھی کسی سے کروں گا۔“

چھ سات دن اس کے ساتھ گزارنے کے بعد میں اسے اعتماد میں لوں گی کہ میرے والدین کو قتل کرو گئی بہانے اور ترکیب سے۔۔۔۔۔ تاکہ دولت، جائیداد اور کاروبار مل جائے۔ اس میں کچھ دن لگیں گے۔۔۔۔۔ انہیں قتل کرنا تو بہت آسان ہے لیکن قانون کے ہاتھوں سے پچتا بہت مشکل ہوتا ہے۔۔۔۔۔ پھر ان دونوں کا سوگ کئی دنوں تک منایا جائے گا۔۔۔۔۔ پھر ویش کو قتل کرنے کا منصوبہ بناؤ گے۔۔۔۔۔ اس طرح دو تین مہینے کا عرصہ بیت جائے گا۔ اور ہاں ورشی ملکیت قانونی طور پر میرے نام کرنے میں کئی دن لگ جائیں گے۔۔۔۔۔ پھر تمہاری اور ہماری شادی ہوگی۔۔۔۔۔ میں ایک اجنبی مرد سے کیوں کر شادی کروں گی۔۔۔۔۔ اور تین مہینے بعد میری کوکھ سے تمہاری نشانی جنم لے گی۔۔۔۔۔ میاؤں۔۔۔۔۔“
 ”یہ دن پلک جھپکتے گزر جائیں گے۔۔۔۔۔ اچھا چھوڑو۔۔۔۔۔ ان فضول باتوں کو۔۔۔۔۔ تم میرے ساتھ چلو۔۔۔۔۔“ وہ بولا۔

”میری باتیں فضول نہیں ہیں بلکہ تم فضول ہو۔۔۔۔۔“ رانی چڑ کر بولی۔ ”تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو۔۔۔۔۔؟“

”قریب میں جمیل کنارے ایک کالج ہے۔۔۔۔۔ جو درختوں سے گھرا ہوا ہے۔۔۔۔۔ وہاں ایک جمو نیڑی ہے۔۔۔۔۔ اس جمو نیڑی میں ایک چار پائی پر بڑا صاف ستر اور گداز بستر بچھا ہوا ہے۔۔۔۔۔ ہم دونوں رات کے آخری پہر تک کیف و سرور کے جہاں میں کھو جائیں گے۔“
 ”میں اس وقت تک نہیں چلوں گی جب تک مجھے تمہارے متعلق معلوم نہیں ہو جاتا۔“ رانی کو ضد آ گئی۔

”چندا کیا بات ہے جو تم میں ضد، ہٹ دھرمی اور خڑے آگے ہیں۔۔۔۔۔ تم نے کبھی میری کسی بات سے انکار نہیں کیا۔۔۔۔۔ میری خواہش کی نفی نہیں کی۔۔۔۔۔؟ میرے جذبات اور احساسات کو رو نہیں کیا۔۔۔۔۔ اب ساتھ چلنے سے صاف انکار کر رہی ہو۔۔۔۔۔!“

”تم جو میری بات نہیں مان رہے اور ہٹ دھرمی پر اتر آئے ہو۔۔۔۔۔ تو میں بھی ضد میں آگئی ہوں۔۔۔۔۔“ رانی نے تڑ سے جواب دیا۔

”میں تمہیں اپنی گود میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔۔۔۔۔ تاکہ ہم دونوں رات کا لطف اٹھائیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک قدم بڑھایا۔

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ میرے پاس نہیں آنا اور نہ ہی مجھے ہاتھ لگانا۔۔۔۔۔“ وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر ہڈیانی لہجے میں بولی۔

”تم۔۔۔۔۔؟ تمہیں ہر قیمت پر میرے ساتھ چلنا ہوگا۔۔۔۔۔ ورنہ میں جبر و زیادتی سے لے جاؤں گا۔“ وہ ہنس کر بولا۔ ”میرا دل بڑا تڑپ رہا ہے تمہارا ذرا سا خون پی جاؤں۔۔۔۔۔ لہذا آؤ۔۔۔۔۔ میری

”نہیں..... تم جھوٹ بول رہی ہو..... میں ایسی بات کسی سے کیا..... کسی بلی سے بھی نہیں کہی اور نہ کہہ سکتا ہوں۔“

”آخر تم اپنا نام سن کر اس قدر پریشان اور فکر مند..... اور خوف زدہ کیوں ہو گئے..... ایسا لگ رہا ہے کہ جیسے جان نکلی جا رہی ہو.....؟“ رانی نے استہزائیہ لہجے میں کہا اور نام میں کیا ہوتا ہے..... لوگ شوق سے خوشی سے اپنا نام بتاتے ہیں..... لیکن تم اپنا نام سن کر مرے جا رہے ہو..... مہندر پرکاش!..... ہائے..... میرے بلے راج کمار کا کتنا خوب صورت نام ہے.....“

”اگر تم نے مجھے میرا نام بتانے والے کا نام نہیں بتایا تو میں تمہارا گلابا دوں گا۔“ وہ خشونت کے لہجے میں بولا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگیں۔ ”تم..... مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہی ہو..... میں کوئی احمق نہیں ہوں۔“

”اگر تم میں اتنی ہمت ہے تو میرا گلابا کر تو دیکھو.....“ رانی بے خوفی سے بولی۔ ”میں تمہارے ہاتھ توڑ دوں گی.....“

”اچھا.....“ وہ تسخیر سے ہنسا۔ ”تو میرے ہاتھ توڑ دے گی.....؟ اچھا توڑ کر بتا.....“

وہ دوسرے لمحے ایک سیاہ بلا بن گیا..... ایک شیر کی سی جسامت ہو گئی..... وہ بلا کم بلکہ شیر دکھائی دیتا تھا۔ وہ رانی پر جھپٹنے کے لئے بڑھا تو رانی بڑے پرسکون انداز اور اطمینان سے کھڑی رہی۔ وہ قریب آ کر اس پر جھپٹ پڑا۔ گلابا نے لگا تو رانی نے اس کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ کر اپنی گردن آزادی اور اس کا دایاں ہاتھ اس طرح سے توڑ دیا جیسے وہ نازک سی شہابی ہو..... ہاتھ کی ہڈی چٹنی تو اس کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی..... وہ دہشت زدہ سا ہو کر پیچھے ہٹا..... لیکن رانی اس پر جھپٹی..... اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر فضا میں اس طرح لہرایا جیسے کوئی ڈنڈا لہرایا جاتا ہے..... تین چار چکر دینے کے بعد اسے زمین پر اس بری طرح ٹخ دیا جیسے کوئی پہلوان اپنے حریف کو پختا ہے..... سیاہ بلا نے اٹھ کر کھڑا ہونا چاہا..... لیکن وہ کھڑا ہونا تو درکنار اپنی جگہ سے حرکت تک نہ کر سکا۔ کیوں کہ اس کی کمر جواب دے چکی تھی وہ درد اور تکلیف سے ماہی بے آب کی طرح ٹرپنے لگا۔

وہ خوف و دہشت سے پھٹی پھٹی نظروں سے رانی کو دیکھنے لگا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ یہ وہی نرم و نازک بلی ہے.....؟“ جب رانی اس کی طرف بڑھی تو دوسرے لمحے وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔

دراصل رانی کا روپ چندرا دیوی نے دھارا ہوا تھا۔ وہ بھی غائب ہو کر اس کٹیا کے باہر تھی جس کے اندر مہندر پرکاش انسان کی شکل میں فرش پر پڑا ترپ رہا تھا..... کراہ رہا تھا..... اس کی چیخیں نکلی جا رہی تھیں..... چندرا دیوی نے نہ صرف اس کی ہڈی توڑ کر رکھ دی تھی بلکہ اس کی کمر بھی.....

اب وہ اس قابل نہیں رہا تھا کہ اٹھ کر بیٹھ سکے اور چل پھر سکے..... ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے تو آدمی کسی قابل نہیں رہتا ہے..... اس کے سامنے اس کا گرد بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اسے رانی کے بارے میں فرش پر ترپتے اور چیخیں مارتے ہوئے بتاتا جا رہا تھا۔ اس نے بڑی کوشش کی تھی تکلیف پر قابو پالے مگر ناکام ہو رہا تھا۔

”گرد مہاراج.....! مجھے پہلے اس درد سے نجات تو دلاؤ..... میری جان نکلی جا رہی ہے..... یہ کمینی رانی نے میرا تپا پانچ کر دیا ہے۔“ گرد مہاراج نے اس پر کوئی منتر پڑھ کر پھونکا تو اس کے درد میں قدرے آفاقہ ہو گیا۔ لیکن وہ اٹھ کر بیٹھنے کے قابل نہ ہو سکا۔

”گرد مہاراج.....!“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”میری ریڑھ کی ہڈی اور ہاتھ کی ہڈی تو جادو سے جوڑ دو.....“

گرد مہاراج نے اپنا سارا زور اور جادو صرف کر دیا۔ لیکن وہ بے اثر ہوتا گیا۔ وہ حیران اور پریشان ہو کر بولا۔

”مہندر پرکاش.....! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میرا جادو کام کیوں نہیں کر رہا ہے اور تم رانی جیسی ایک معمولی لڑکی کے ہاتھوں اپنی ہڈیاں تروا بیٹھے..... یہ بات بڑی ناقابل یقین ہے کہ تم نے ایک شیر کی جسامت اور اس کا سادزن بھی لیا ہوا تھا..... پھر بھی ایک دھان پان سی لڑکی نے تمہاری مٹی پلید کر دی..... کیا تم نے اس وقت منتروں سے کوئی کام نہیں لیا جب اس نے تمہارے ہاتھ کی ہڈی توڑ دی..... تمہیں دونوں ہاتھوں میں کھلونے کی مانند اٹھا لیا..... اس لیے کہ میرا خیال ہے کہ رانی میں کوئی بد آتما سا گئی تھی۔“

”میں بھی تو ایک آتما ہی ہوں۔“ وہ بولا۔ ”اس وقت مجھے بالکل خیال نہ آیا کہ رانی کے اندر کوئی آتما آگئی ہے..... اس لئے کہ انسان مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا..... اس نے پچاس ساٹھ برس سے مجھے موت کی غیند سلانے کی کوشش کی انسان سمجھ کر..... مجھے یہ شقی انسان کے خون سے اور آپ کے سکھائے ہوئے منتروں سے ملتی رہی۔ آپ کا میرا ساٹھ برسوں سے ساتھ رہا..... میں آپ کے منتروں کے کارن تو بلا اور پھر ایک نہایت خوب صورت اور مسحور کر دینے والا جوان بن کر لڑکیوں کو اسیر بنا کر ان کی آبرو اور خون سے اپنی پیاس بجھاتا رہا..... پولیس نے اور نہ جانے کس کس نے کوشش کی تھی کہ یہ پراسرار خون کی کون ہے.....؟ کہاں سے آیا ہے.....؟ اس کا نام کیا ہے.....؟ میں نے پچاس ساٹھ برس پہلے جنم لیا ہے..... میرا باپ جو میرا ہم شکل تھا یا میں اس کا ہم شکل ہوں اس نے اپنی نوجوانی سے ہی بلے کا روپ بھر کر میری طرح بلی کا بہانہ کر کے لڑکیوں کو بے وقوف بنانا کر ان کا آبرو اور خون سے پیاس بجھاتا رہا..... پھر وہ اپنی حماقت سے ایک مہمان بزرگ کے

ہاتھوں مارا گیا۔۔۔۔۔ پھر میں نے باپ کا جسم لے لیا۔۔۔۔۔ آپ کی سیوا بھی کی۔ لڑکیوں کو بلی بنا کر پہنچاتا رہا اور آپ بلا بن کر ان کی آبرو سے دل بہلاتے رہے۔۔۔۔۔ خون بھی پیتے رہے۔۔۔۔۔ اب اس رانی نے مجھے ناکارہ کر دیا۔۔۔۔۔ آپ کا کوئی جادو منتر کسی کام کا نہیں رہا۔۔۔۔۔ اب میرا کیا ہوگا۔۔۔۔۔؟“

”تمہاری دو محبوبائیں جیسے ہی ماں بنیں گی تب تمہیں ایک نیا جنم ملے گی اور کھویا ہوا جادو منتر مل جائے گا۔۔۔۔۔ تم پھر امر جاؤ گے۔۔۔۔۔ ہر پچاس برس کے بعد تم ایک نوجوان کا بہروپ بھر کر آسکو گے جس طرح تمہارا باپ دو صدیوں سے آتا رہا۔۔۔۔۔ تمہاری یہ دونوں اولادیں انسان نہیں ہوں گی۔۔۔۔۔ جس طرح سانپ کا بچہ سنپولیا ہوتا ہے اسی طرح تمہارے یہ بچے بھی بلے ہوں گے۔۔۔۔۔ پھر یہ بھی بلے بن کر تمہاری ہی طرح بلیوں کے بہانے لڑکیوں کی آبرو اور ان کے خون کے پیاسے ہوں گے۔“ گرد مہاراج نے کہا۔

”لیکن میرا کیا ہوگا۔۔۔۔۔؟“ اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں ایک غیر مرئی ہستی ہوتے ہوئے ایک آدمی کی طرح لاچار اور بے بس کیسے ہو گیا۔۔۔۔۔ میری ہڈیاں کیسے جڑ سکیں گی۔۔۔۔۔؟ میرے لئے کچھ کرو گرد مہاراج۔۔۔۔۔“

”تمہارے ٹھیک ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں۔۔۔۔۔ جس جادوگر نے رانی کا بہروپ بھر کر تمہارا جو یہ حشر کیا ہے وہی اپنے جادو سے تمہیں ٹھیک کر سکتا ہے۔۔۔۔۔ یا پھر رانی کا تازہ تازہ خون تمہارے متاثرہ حصوں پر لگا دیا جائے اور میں اپنا عمل دہراؤں تو تمہاری ہڈیاں جڑ جائیں گی۔ لہذا میں رانی کو لینے جا رہا ہوں۔ تم میرا انتظار کرو۔“

”لیکن آپ رانی کو کیسے اور کس طرح لائیں گے گرد مہاراج؟“ مہندر پرکاش بولا۔ ”اس لئے کہ رانی کے وجود میں جادوگر جو ہوگا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ جادوگر کون ہے۔۔۔۔۔؟ اسے کس نے یہاں بلایا؟“

”وہ سورہی ہوگی۔۔۔۔۔ رات کا سہ ہے۔۔۔۔۔ میں اسے جادو کے زور پر نیند کی حالت میں لے آؤں گا۔“ گرد مہاراج نے کہا۔ ”وہ جادوگر نہیں ہوگا۔ تمہارے عائب ہوتے ہی وہ چلا گیا ہوگا۔۔۔۔۔ لہذا میدان صاف ہوگا۔۔۔۔۔“

”رانی مجھے بہت چاہتی ہے۔۔۔۔۔ میں جس پر بھی اپنا جادو پھونک دیتا ہوں وہ میری باندی بن جاتی ہے۔ لیکن اس جادوگر نے میرے منصوبے کا ستیا ناس کر دیا۔ میں نے تو رانی کو اپنے منصوبے پر عمل کرنے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ پھر اسے رات گزارنے کے لئے کنج میں لے جا رہا تھا کہ اس پر میرے متعلق جاننے کا دورہ پڑ گیا۔۔۔۔۔ یکلخت اس کا رویہ بدل گیا۔ کبھی بھی اس کا اور کسی بھی میری محبوبہ کا رویہ نہیں بدلاتھا۔۔۔۔۔ پھر بات اتنی بڑھ گئی تھی کہ میں اسے موت کی نیند سلانے کے لئے شیر کی

جہامت کا بلا بن کر حملہ آور ہوا۔۔۔۔۔ نتیجہ سامنے ہے۔۔۔۔۔ شاید اس کے گھر والوں نے کسی جادوگر کو بلایا ہے کہ رانی کو مجھ سے نجات دلادے۔ رانی کی کیا مجال کہ وہ میرا مقابلہ کرے۔ میرا ہاتھ اور ریڑھ کی ہڈی توڑ دے۔۔۔۔۔“

”تم میرا اور اپنی بلی رانی کا انتظار کرو۔۔۔۔۔ تمہاری چندا کو بس لے آتا ہوں۔“ گرد مہاراج نے کہا۔

”اگر وہ جادوگر وہاں ہوا۔۔۔۔۔ آپ سے اس کی مڈ بھڑ ہو گئی تو۔۔۔۔۔؟“ اس نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

”آج تک مجھ سے بڑے سے بڑا جادوگر بھی مقابلہ نہ کر سکا۔“ گرد مہاراج نے بڑی اکر سے کہا۔ ”وہ کیا چاہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کا میرا آنا سامنا ہو۔۔۔۔۔ تاکہ اسے ایسا سبق دوں کہ ماری زندگی یاد رکھے۔“

”تمہیں میرے کانچ تک جانے کی ضرورت نہیں کرنی مہندر۔۔۔۔۔!“ چندرا دیوی جو رانی کے بہروپ میں تھی اندر آ کر بولی۔ ”میں خود آ گئی ہوں۔ تم سے دودھ ہاتھ کرنے۔۔۔۔۔ کیا تم اس کے لئے تیار ہو۔۔۔۔۔؟“

”میری چندا۔۔۔۔۔ میری بلی۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔؟ میاؤں۔۔۔۔۔ میاؤں۔۔۔۔۔“ مہندر پرکاش نے کہا۔ ”تم یہاں کیسے آ گئیں۔۔۔۔۔؟ اتنی دور۔۔۔۔۔؟ یہ تمہاری کانچ سے چالیس میل دور ہے۔۔۔۔۔“ وہ رانی کو دیکھ کر لمبے لمبے سب کچھ بھول گیا تھا۔

”بے وقوف۔۔۔۔۔! حق۔۔۔۔۔!“ گرد مہاراج نے کہا۔ ”کیا میں نے تجھے نہیں بتایا تھا کہ رانی کے اندر کوئی جادوگر ہے۔ پھر وہ چندرا دیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تو کون ہے۔۔۔۔۔؟ تو میرا نام بھی جانتا ہے۔۔۔۔۔؟ سامنے آ۔۔۔۔۔ اصل حالت میں آ۔۔۔۔۔“

”میں جادوگر نہیں۔۔۔۔۔ جادوگر بنی ہوں۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”تو بڑا جادوگر بنتا ہے گرد مہاراج۔۔۔۔۔! تو کالا جادو اور تمام پراسرار علوم سے واقف ہے۔۔۔۔۔ میں نے جس طرح تیرا نام معلوم کر لیا۔۔۔۔۔ تیرے متعلق معلوم کر لیا۔۔۔۔۔ یہاں پہنچ گئی۔۔۔۔۔ میں یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ تو کتنا پہنچا ہوا ہے۔۔۔۔۔؟ میرے مقابلے کا ہے بھی یا نہیں۔۔۔۔۔“

”تو عورت ہو کر بڑا تک رہی ہے۔۔۔۔۔“ گرد مہاراج غضب ناک ہو کر بولا۔ وہ تو کہہ کر غالف کرنے پر طیش میں آ گیا تھا۔ آج تک کسی نے اس طرح مخاطب نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ اہانت نہیں کی تھی۔۔۔۔۔ سبھی اس سے خوف کھاتے اور اس کا ادب و احترام کرتے تھے۔ اس لئے بھی کہ وہ ہندوستان کے بڑے جادوگروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کے سامنے بڑے بڑے جادوگر بھی

خوف کھاتے تھے۔ کوئی جادوگر اسے بچا نہیں دکھا سکتا تھا۔ یہ ایک عورت اسے طعنہ دے رہی تھی۔ اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اس کی شان میں انداز محتاط سے گستاخی کر رہی تھی..... یہ اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ وہ اسے چوٹی کی طرح مل سکتا تھا۔ تو ایک چٹیل ہے..... مجھ پر کیا رعب گانٹھ رہی ہے..... تجھ میں ہمت ہے تو سامنے آ.....؟“

”تو..... کوئی اتنی برس سے بلے ملی کا کھیل..... کھیل رہا ہے..... مہندر پرکاش کا باپ..... ستیش کو تو نے اپنے سفلی علم سے بلایا..... تاکہ وہ ان لڑکیوں اور جوان اور حسین شادی شدہ عورتوں کو جو گھروں کی چھتوں پر اکیلی اس حالت میں آتی تھیں اس کا حسن و شباب اور جسم بہکا تا تھا..... تو نے اسے خون کا رسیا بنا دیا..... وہ ملی کے بہانے لڑکیوں اور عورتوں کو اپنے سحر سے درغلا کر ان کی عزت و آبرو خاک میں ملا دیتا اور کیف و سرور کے عالم میں خون پی جاتا تھا..... پھر انہیں تیری کلمہ میں لے آتا..... جہاں تو ان سے دل بہلاتا..... وہ ایسی مدھوشی کی حالت میں ہوتی تھیں کہ انہیں ہٹا نہیں چلتا تھا کہ کسی اور نے بھی ان سے اس حالت میں فائدہ اٹھالیا ہے..... اس کا باپ ایک بزرگ کے ہاتھوں کیفر کر دار کو پہنچا تو نے اس کا نیا جنم اس کے بیٹے کے وجود میں سدا دیا..... کتنے گھروں کی لڑکیاں ذلت و رسوائی کا سبب بنیں..... لیکن اب آج ایسا نہیں ہوگا، غصیٹ! جب مہندر پرکاش ایک حادثے میں مر گیا تو اس کی آتما کو اپنے گھناؤنے اور شرمناک مقاصد کے لئے آلہ بنالیا..... تو اتنی برس سے زیادہ کا ہو چکا ہے..... لیکن تیرے کرتوتوں میں کوئی فرق نہیں آیا.....“

”تو اپنی اصلی حالت میں سامنے تو آ.....“ وہ بولا تو اس کی آواز غصے سے لڑکھڑائی تھی۔ ”تو میرے بارے میں بہت جانتی ہے..... لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور نہ ہی میرا بال بکا ہوگا..... میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا تو واقعی عورت ہے..... کیوں کہ ہندوستان میں جادوگر نماں آنے میں نمک کے برابر بھی نہیں ہیں..... تو مرد ہے۔ اس لئے سامنے نہیں آ رہا ہے۔“

”مجھے اس بات کی ککلی چلتا نہیں کہ تجھے عورت ہونے کا ثبوت دوں.....“ چندرا دیوی بولی۔
 ”جل تو ابھی تسلی کر لے۔“

”پھر دیکھتے ہی دیکھتے چند رادیوی اپنی حالت میں آ گئی۔ اب اس کارانی کاروب نہیں رہا تھا۔

مہندر پرکاش اور جادوگر مہاراج نے جو چند را دیوی کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ اس نے اسکی عورتیں کم دکھیں تھیں۔ واقعی یہ جادوگر نبی تھی۔ گردو مہاراج کا خیال یہ تھا کہ..... اگر واقعی یہ عورت جادوگر نبی ہوئی تو ساٹھ ستر برس سے کم نہ ہوگی۔ بد صورت اور مکروہ شکل و صورت کی ہوگی۔ اس کے بال سفید براق ہوں گے..... وہ یقیناً ڈائن اور چٹیل ہی ہوگی..... اگر عورت کے بھیس میں مرا

”اب تجھے یقین آ گیا کہ میں ایک عورت ہوں۔“ چند راویوں نے بولی۔ ”یہ مہندر اس قابل نہیں رہا کہ اس کا یہ جہم برقرار رہے۔۔۔۔۔ میں اسے سدا کے لئے بلا بٹاری ہوں۔۔۔۔۔ ایک عام قسم کا انجھائی سیاہ، مکروہ اور گھناؤنی صورت کا جسے دیکھتے ہی لوگ پتھر ماریں اور بھگادیں۔۔۔۔۔ یہ کسی کو نقصان نہ پہنچا سکے۔۔۔۔۔ انسانی روپ میں نہ آ سکے۔ کسی دن کسی الم ناک حادثے میں مر جائے۔۔۔۔۔ اس کے پاؤں کی جچی سزا ہے۔۔۔۔۔ اس کا ایسا ہی عبرت ناک انجام ہونا چاہئے۔۔۔۔۔ میں اس کی تمام پراسرار صلاحیتوں اور جادو کے اثر کو ختم کر رہی ہوں۔۔۔۔۔ اس نے جو دلوں کیوں کو حائلہ کیا ہوا ہے ان کے حمل بھی بغیر کسی تکلیف کے ضائع ہو جائیں گے۔“

”نہیں..... نہیں..... گردو مہاراج.....! یہ کیا بکواس کر رہی ہے.....؟ کیا ایسا ممکن ہے.....؟“ مہندر پرکاش نے چلا کر کہا۔

”نہیں یہ جھوٹ بول رہی ہے.....؟ ایسا کرنا اس کے بس میں نہیں ہے..... میں اس کا جادو چلے نہیں دوں گا۔“ گرد مہاراج نے اسے تسلی دی۔ ”تم پریشان نہ ہو..... اس کی گیدڑ بھیکوں میں نہ آؤ.....“

”یہ گیدڑ بھکیاں نہیں ہیں گردھارا ج.....!“ چند را دیوی بولی۔ ”یہ دیکھو..... اسے بلا جانتے ہوئے روک سکتے ہو تو روک لو.....“

چند ادبوی نے اس کی جانب بچہ دکھایا۔ اسے پیالہ سا بنا لیا..... اس کے ہاتھ کی انگلیوں سے
 فٹے سے لکے جنہوں نے مہندر پر کاش کو اپنی لپیٹ میں لے لیا..... وہ شعلوں اور کیف اور سیاہ
 دھوئیں میں اس کا وجود گم ہو گیا..... اس کی جینیں اور کراہیں فضا میں گونجتی رہیں..... گرو مہاراج نے
 سب کچھ ششدر ہو کر دیکھا اور اس آگ اور دھوئیں پر متر پڑھ کر پھونکے..... لیکن وہ ان پر قابو نہ
 سکا اس نے بڑے جتن کئے اس کی ہر کوشش ناکام رہی۔

کوئی چدرہ منٹ کے بعد آگ بجھ گئی اور دھواں چھٹ گیا۔ گرو مہاراج نے دیکھا کہ مہندر لاش کا درجو نہیں رہا بلکہ اس کی جگہ ایک چھوٹا سا سیاہ بلا سہا ہوا بیٹھا تھا..... وہ اپنے گرو مہاراج کو کہہ رہا تھا..... یہ بس کی تصویر بنا۔

”اچھا کرو مہاراج.....! تمہیں کیا بتا دوں.....؟“ چندرا اس کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔
 ”.....گدھا.....“
 ”یا پھر معذور شخص جو کسی سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھے بھیک
 گئے..... یا پھر سیاہ بلا..... تاکہ تم دونوں ساتھ زندگی گزارو.....“

”تو کیا مجھے جانور بنائے گی..... میں تجھے بلی بنادوں گا.....“ گرو مہاراج غرایا۔ ”یا مہر

کتیا.....

چندرا دیوی اس کی بات سن کر بڑے زور سے ہنسی۔ پھر ہنسی روک کر بولی۔

”تم کتنے بڑے جادوگر ہو۔۔۔۔۔ تم میں کتنا تہڑ ہے۔۔۔۔۔ کتنی پراسرار علوم کی صلاحیتیں اور طاقت ہے اس کا اندازہ ہو گیا۔۔۔۔۔ تم مہندر کو تو روک نہیں سکے۔۔۔۔۔ مجھے جو بتا سکتے ہو بتا کر دیکھ لو۔۔۔۔۔ میں تمہارے سامنے موجود ہوں۔۔۔۔۔“

”میں تمہیں کتیا بتا رہا ہوں۔۔۔۔۔“ وہ نفرت اور غصے سے بل کھا کر بولا۔ ”ایک ایسی کتیا جس کے پیچھے سارے کتے پڑ جائیں گے۔۔۔۔۔ تیار ہو جا۔۔۔۔۔ کتیا کی بچی۔۔۔۔۔“

گرو مہاراج نے نجانے کتنے منتر پڑھ کر پھونکے۔۔۔۔۔ کالا جادو کیا۔۔۔۔۔ سفلی علوم کے کتنے ہی حربے آزمائے۔۔۔۔۔ چندرا دیوی سکون و اطمینان سے کھڑی رہی۔۔۔۔۔ اس پر اس کے کسی عمل کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں ہوا منتر نے شعلے برسائے۔۔۔۔۔ وہ پھول بن کر اس پر گرتے رہے۔۔۔۔۔ اس کی کتیا کے ایک کونے میں ایک بڑی سی پٹاری تھی جس میں ایک دس فٹ کا سیاہ زہریلا سانپ بند تھا۔ اس نے چندرا دیوی کی طرف اس دس فٹ لمبے سانپ کو پھینکا۔۔۔۔۔ وہ سانپ تیزی سے رینگتا ہوا چندرا دیوی کی طرف ڈسنے کے لئے لپکا۔۔۔۔۔ لیکن اس کے پاس آ کر وہ کالی رسی کی شکل میں آ گیا۔ چندرا دیوی نے اسے اٹھا کر گرو مہاراج پر پھینکا تو وہ پھر سے سانپ بن گیا۔ گرو مہاراج نے اسے فوراً ہی پکڑ کر پھر سے پٹاری میں بند کر دیا۔۔۔۔۔ اس لمحے اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔

اس کی نفرت اور غصے سے بری حالت ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ کیوں کہ چندرا دیوی کا بال تک بیکا نہیں ہوا تھا۔ اس نے کچھ کر کے نہیں دیکھا۔ بہت کچھ آزمایا۔۔۔۔۔ لیکن بری طرح ناکام رہا۔ پھر چندرا دیوی نے کہا۔

”میں ایک آنکھ سے اندھا بنا رہی ہوں۔۔۔۔۔ اور ایک پیر سے معذور تاکہ تجھے اچھی طرح بھیک ملے۔۔۔۔۔ لوگ تیرے بڑھاپے اور معذوری پر ترس کھا کر بھیک دیں۔۔۔۔۔ ورنہ تو حقیقت میں اس قابل بھی نہیں کہ تجھے کھانے کو ملے۔۔۔۔۔“

”آخر تم ہو کون۔۔۔۔۔؟“ گرو مہاراج نے پوچھا۔ ”میں نے اپنی زندگی میں کسی ایسی جادوگر کی تو کیا کسی جادوگر تک کو نہیں دیکھا۔“

”میں چندرا دیوی ہوں۔۔۔۔۔“ چندرا دیوی نے مسکرا کر جواب دیا۔

”چندرا دیوی۔۔۔۔۔ میں نے تمہارے بارے میں سنا تھا اور جو سنا وہ سچ تھا۔۔۔۔۔“ وہ جملہ پورا کرنے سے پہلے غش کھا گیا۔

صبح دس بجے کے قریب رانی کے کالج میں نہ صرف اس کے گھر والے بلکہ رتنا دیوی، ان کی بیٹی شانتی موجود تھی۔ انسپکٹر پر ساد کو بھی بلا لیا گیا۔۔۔۔۔ چندرا دیوی نے رتنا دیوی اور رانی کی ماں سے کہا۔

”سب سے پہلی خوش خبری یہ ہے کہ شانتی اور رانی حاملہ نہیں رہیں۔۔۔۔۔ میں نے ان کے حمل ضائع کر دیئے ہیں۔۔۔۔۔ بغیر کسی تکلیف اور محسوس کے۔۔۔۔۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو کسی بھی کلینک میں جا کر چیک کروالیں۔۔۔۔۔“

”سچ بیٹی۔۔۔۔۔!“ رتنا دیوی خوشی سے پاگل سی ہو گئی۔ ”کیا ایسا ممکن ہے۔۔۔۔۔؟“

جادو سے بہت ساری باتیں ممکن بھی ہیں۔۔۔۔۔ دراصل یہ حمل نہیں تھا۔۔۔۔۔ گرو مہاراج کا ایک عمل تھا کہ انہیں جادو سے حاملہ کر کے ساتویں مہینے میں انہیں ضائع کرنے کے بجائے آپ دونوں سے اسے ضائع کرانے کی بھاری رقم لے۔۔۔۔۔ اب اس میں سیاہ بلبے کی کہانی اور اس کا سحران دونوں لڑکیوں پر سے میں نے اتار دیا ہے۔۔۔۔۔ اب کوئی خون چوسنے اور بے آبرو کرنے نہیں آئے گا۔۔۔۔۔ اب ان لڑکیوں کی شادی جلد بننا دیں۔۔۔۔۔ اپنے اپنے گھروں کو جائیں۔۔۔۔۔“

”ہم آپ کی کیا سیوا کر سکتی ہیں؟“ رتنا دیوی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ نے ہم پر۔۔۔۔۔ بلکہ۔۔۔۔۔ دونوں گھرانوں پر جو احسان کیا ہے ہم ساری زندگی اتار نہیں سکتی ہیں۔“ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”ہمارے پاس دولت کی کمی نہیں ہے۔“ رانی کے باپ بولے۔ ”آپ کو ہم دولت سے مالا مال کر دیں گے۔۔۔۔۔“

”میں نے یہ سب کچھ انسانیت کے لئے کیا ہے۔۔۔۔۔ بھگوان نے مجھے اتنا دیا ہے کہ کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔۔۔۔۔ بس آپ لوگ میرے لئے پراگھنا کرتے رہیں۔ مجھے جو دولت ملی ہے وہ خوشی کی ہے۔۔۔۔۔ خوشی اور آتما کی شانتی بازار میں نہیں ملتی ہے۔۔۔۔۔ کسی کی سیوا کر کے سکھ پہنچا کر ملتی ہے اس سنسار میں خوشی سے بڑی دولت کوئی اور نہیں ہے۔

☆.....☆.....☆

سریش کمار اپنے اخبار کی طرف سے ہندوستان سے سری لنکا صحافیوں کے ایک بین الاقوامی سمینار میں شرکت کرنے گیا تھا۔ اس نے چندرا دیوی کو ایک حیرت انگیز سنسنی خیز اور ناقابل یقین ہمارا کہانی سنائی جو ایک مقامی صحافی نے سری لنکا کے دورے کے موقع پر سنائی تھی۔ اس کے اس سوال پر کہ ”کیا یہاں پر اسرار واقعات پیش آتے ہیں؟“ اس نے سریش کمار کو یہ بتایا کہ ”اس خوف ناک کہانی کا ایک کردار ”خونی بہتی“ ہے۔ جس نے لوگوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔۔۔۔۔ اس سے

نجات پانے کی کوئی تدبیر اور راستہ نہیں ہے..... بڑے بڑے جادوگر، سنیا سی اور سادھو بھی اس کے آگے بے بس ہو گئے۔ وہ خونی مجسمہ نہیں بلکہ وہ دھشت ہے جو تباہی و بربادی پھیلا رہا ہے۔ سریش کمار نے یہ خوف ناک کہانی چندرا دیوی کو اس لئے سنائی کہ وہ سری لنکا جا کر پریشان اور خوف زدہ لوگوں کو اس مجسمہ سے نجات دلانے۔ سریش کمار نے جو کہانی سنائی وہ یہ تھی۔

پروفیسر امر ناتھ کو لوگ ماسٹر کہتے تھے۔ کیوں کہ وہ اپنے کام میں اتنا ماہر اور تجربہ کار تھا کہ پورے ہندوستان میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی اپنے ذوق و شوق میں تیاگ دی تھی۔ وہ بچپن سے ہی آثار قدیمہ میں دلچسپی لیتا آ رہا تھا۔ جس کام میں ہاتھ ڈالتا تھا اسے مکمل کئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ وہ اس کام میں اس قدر کھوجاتا تھا کہ اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہتا تھا۔

اس وقت بھی وہ اپنے کام میں اتنا منہمک تھا کہ اسے اس بات کی قطعی خبر نہ ہوئی تھی کہ موت کے ہر کارے اس کی طرف آرہے ہیں۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس کی زندگی کچھ دیر کی مہمان ہے۔ گھوڑوں کی ٹاپیں سن کر بھی اس نے اپنی گردن اٹھا کر نہیں دیکھا اور اڑتا ہوا گردوغبار جو مخالف سمت سے فضا پر کسی آدمی کی طرح چھا رہا تھا اس کے سامنے مختلف اقسام کے رنگ برنگے..... چھوٹے بڑے مٹی کے برتنوں کا ایک ڈھیر تھا۔ ان میں وہ مامٹ تلاش کر رہا تھا تاکہ اندازہ کر سکے کہ ان میں کون سے برتن زیادہ قدیم ہیں۔ اسے جب ہوش آیا اس کے قریب پہنچتے ہوئے گھوڑوں کی ٹھوکروں سے اس کی آنکھوں میں مٹی بھر گئی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا گئی۔ پھر اس نے گھوڑوں کے ہنہانے کی آوازیں سن کر سر اٹھا کر آواز کی سمت دیکھا اور آنکھیں صاف کیں۔

وہ چار عدد گھوڑے تھے۔ انتہائی مضبوط، توانا، قد آور اور عربی نسل کے دکھائی دیتے تھے۔ کیوں کہ ایسے گھوڑے ہندوستان اور سری لنکا میں نہیں ہوتے تھے۔ ان گھوڑوں پر جو سوار تھے وہ عام قسم کے لوگوں سے ہٹ کر تھے۔ انہیں دیکھ کر پہلا تاثر جو پیدا ہوتا تھا کہ یہ کوئی خطرناک قسم کے پیشہ ور قاتل ہیں۔ ان کے نزدیک آدمی راستے میں پڑے پھر کی مانند ہیں جسے شوکر مار کر ہٹا دینا آسان ہے، ان کی درندوں جیسی خون خوار آنکھوں میں جیسے دو بھیاں دکھ رہی تھیں اور ان کے چہروں پر سفاکانہ چمک۔ ان میں خون آشامی، بھیڑیوں کو بھی شرمادینے والی درندگی بشرے سے عیاں تھی۔ لمحے کے لئے ماسٹر لرز کر رہ گیا۔ ان کے تیوروں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ خون سے پیاس بجھالے آئے ہیں۔

ان درندوں کی پشت پر جو تین قلی کھڑے تھے ان کی خاموشی جیسے ماسٹر کی موت کا اعلان

کر رہی تھی۔ ان کے چہرے پتھروں کے مجسموں کی طرح سپاٹ تھے اور ان کی منہمک آنکھیں جو کہ اسے نہ صرف نفرت اور غصے سے بلکہ سنگ دلانہ نظروں سے ازل کی دشمنوں کی طرح گھور رہی تھیں۔

یہ چاروں گھوڑا سوار باگیں کھینچے کھڑے تھے۔ وہ اس کے لئے اجنبی تھے، اس نے جب سے یہاں قیام کیا تھا ایک بار بھی نہیں دیکھا تھا اس کے لئے اجنبی تھے۔ وہ پہلی بار انہیں دیکھ رہا تھا۔ البتہ وہ ان قلیوں سے خوب واقف تھا جو ان سواروں کے عقب میں بت بنے کھڑے کھڑے تھے۔ ان پر فصر تو نہیں آیا لیکن حیرت ضرور ہوئی تھی۔ ان کا اسے نفرت بھری نظروں سے گھورتا سمجھ سے بالاتر تھا۔ کیوں کہ وہ اسے بخوبی جانتے تھے۔ وہ ان سے مشفقانہ کام لیتا اور بڑا خیال رکھتا تھا۔ اس نے خود پر قابو پالیا تھا۔ اس لئے کہ اس نے کبھی ان مزدوروں کو بھی شکایت کا موقع نہیں دیا اور پھر ان گھوڑا سواروں سے اس کی کوئی دشمنی بھی نہ تھی۔ وہ پہلی بار اچانک اور غیر متوقع آئے تھے۔ بہر حال وہ یہ سوچ کر کھڑا ہو گیا کہ شاید وہ کوئی مطالبہ لے کر آئے ہیں۔ لہذا کسی خوف و اندیشے کی بات نہیں اور نہ ہی انہیں اس آمد پر اہمیت دینی چاہئے۔ وہ جانتا تھا کہ ان کا مطالبہ کیا ہوگا.....؟ وہ اس سے پہلے دو مرتبہ مطالبات پیش کر چکے تھے..... بیوی کے علاج کے لئے پیسے نہیں ہیں..... اس کے ہاں ساتواں بچہ ہونے والا ہے..... میرا باپ ایک جگہ مزدوری کرتے ہوئے چھت پر سے گر گیا ہے جس سے اس کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ پلاسٹر اور ایکس رے کے لئے پیسے چاہئیں..... سودا سلف ختم ہو گیا ہے..... نہ صرف اجرت میں اضافہ کیا بلکہ پیشگی رقم دے دیں۔

ان مزدوروں کا رونا روز کا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ وہ ہمیشہ شام کی اور حالات سے نالاں رہتے ہیں۔ اس کے علم میں یہ بات تھی کہ اس ملک میں غربت و افلاس ہندوستان اور بنگلہ دیش سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک بار ایسا ہی ہوا تھا کہ وہ ایک جمیل کے کنارے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔ اکیلا تھا۔ اس کے علاوہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ ایک معمر مزدور ایک سولہ برس کی دو شیرہ کو لے کر آیا جو نامناسب سے لباس میں تھی۔ جس کے جسم کے دل فریب اور حساس گوشوں کی نمائش ہو رہی تھی۔ وہ بڑی بھرپور اور گھٹے ہوئے بدن کی تھی۔ اس مزدور نے کہا کہ یہ اس کی کنواری لڑکی ہے۔ مجھے سخت مالی مشکل ہے۔ آپ اس کے ساتھ وقت گزاری کر لیں اور ہندوستانی کرنی میں بیس روپے دے دیں۔ سری لنکا میں ہندوستانی کرنی کی بڑی مانگ اور قیمت تھی۔ اگر وہ جوان ہوتا تو اس پیشکش کو ٹھکراتا نہیں۔ کیوں کہ لڑکی کی بکثرت جوانی اور سراپا بہکاتا ہوا تھا۔ لیکن اسے عورتوں سے کوئی دلچسپی کبھی نہیں رہی تھی پھر اسے بڑا ترس آیا۔ اس نے ہندوستانی بیس روپے دے دیے اور لڑکی کو ہاتھ لگائے بغیر ہٹ کر دیا تھا۔ اس کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ غریب لوگ سیاحوں کو اپنی لڑکیاں، بہنیں اور بھایاں پیش کرتے ہیں۔ انہیں ڈال ملتے ہیں۔

ماسٹر امر ناتھ کو اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا..... ایک لمحے کے لئے اسے ایسا لگا تھا کہ وہ کوئی ڈراؤنا پسند بکھر رہا ہے..... لیکن وہ جلد ہی حقیقی دنیا کی سنگلاخ زمین پر آ گیا..... یہ پسنا نہیں تھا۔ ایک بھیانک حقیقت تھی جس نے اس کے سارے جسم میں لہو خشک کر دیا تھا۔ اس کا دل تھا کہ اندر ہی اندر ڈوبنے لگا تھا۔ اسے حیرت سے دکھ اور ملال ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ وہ ان کے لئے نیا یا اجنبی نہیں تھا۔ ایک عرصہ سے ان کے ساتھ رہ کر کام کر رہا تھا۔ ان کی ہر بات کو مانتا تھا اور ان کے طور طریق اور ان کے تمام رواج اور ان کی تہذیب کا احترام کرتا تھا۔ چون کہ ان کے دکھ درد اور مسائل کا اندازہ تھا..... اس لئے انہیں روزگار اور ان کی منہ مانگی اجرت دیتا تھا۔ کتنے مزدور ایسے تھے جو اس سے قرض لے کر رقم ہڑپ کر چکے تھے اور اس نے کبھی واپسی کا تقاضا نہیں کیا..... اور صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ ان کے ناجائز مطالبات بھی بلا چوں و چرا مان لیتا تھا۔

وہ اپنی تاریخ، تہذیب و تمدن اور ماضی سے ناواقف تھے..... اس نے انہیں بے شمار باتیں بتائی تھیں..... اور پھر اس نے انہیں کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا..... پھر یہ انہیں کیوں اور کس لئے قتل کرنے آئے ہیں..... کیا شرافت اور انسانیت کا صلہ اس طرح سے دیا جاتا ہے..... ایسا تو کتنا ہی بچ، خود غرض اور کمینہ سے کمینہ شخص بھی نہیں کر سکتا۔

”کیا تم لوگ مجھے قتل کرنے آئے ہو.....؟“ ماسٹر امر ناتھ نے کہا تو اس کی آواز گولہ بن کر حلق میں انک رہی تھی۔ اسے اپنے حیروں پر کھڑا ہونا دشوار لگ رہا تھا۔ ایسا لگا تھا کہ اگر اسے کھجے کے سہارے کھڑا نہ کیا ہوتا تو وہ کب کا گر چکا ہوتا۔

اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے وہ سب کے سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگے۔ جیسے اس نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔

”کیا میری محبت اور جذبے کا صلہ احسان فراموشی سے دینا چاہتے ہو.....؟“ ماسٹر امر ناتھ گڑ گڑایا۔ ”تم لوگ جو بھی مطالبات لے کر آئے ہو میں اسے پورا کر دوں گا..... کسی کو مایوس نہیں کروں گا۔“

اس بد معاش نے پہلے تو اس کے منہ پر خنجر کا دستہ..... پھر اس کے سر پر اس بے رحمی سے مارا کہ وہ سر تا پا لرز کر رہ گیا۔ پھر وہ سب اسے کانپتا دیکھ کر استہزائیہ انداز سے ہنسنے اور قہقہہ مارنے لگے۔

”یہ بڑا کس طرح کانپ رہا ہے۔“ ایک قلی نے کہا۔ ”کتنا حرا آ رہا ہے۔“
”ہمارا صرف ایک مطالبہ ہے جسے تم پورا کرو گے اور ہر قیمت میں پورا کرنا ہے۔“ خنجر والے نے فضا میں خنجر لہراتے ہوئے کہا۔

یہ مزدور لوگ جب وقت ناوقت رقم مانگتے تو وہ کبھی نرمی سے پیش آتا اور کبھی سختی سے نفی میں جواب دے دیتا۔ کیوں کہ اسے ان کے بے جا مطالبات پر سخت غصہ آ جاتا تھا۔ اس نے ان کے بشریوں سے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ بڑے مطالبات لے کر آتے ہیں۔ وہ طاقت اور جبر سے منہا چاہتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنی مدد کے لئے اجرتی بد معاشوں کو لے کر آتے ہیں۔ انکار کی صورت میں اسے لوٹ لیں۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ اس کا بڑا نوٹوں سے بھرا رہتا تھا۔

”کیا بات ہے۔ اس وقت کیسے آنا ہوا.....؟“ اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ”میں نے تم لوگوں کو بلایا تو نہیں تھا؟“

اس کی بات کا ان میں سے کسی نے جواب نہیں دیا۔ ان قلیوں میں جو ایک جوان اور تومند گل تھا اس نے اس کے عقب میں آ کر اسے دبوج لیا۔ ان میں سے دوسرے نے اس کے پیچھا کر اسے بے بس کر دیا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ شاید وہ اس کی جیب سے بڑا نکالنا چاہتے ہیں۔ امر ناتھ نے ان کا یہ جارحانہ رویہ دیکھا تو وہ خوف زدہ اور ہراساں ہو گیا۔ اس نے مدد کے لئے پکارا تو ایک تیسرے قلی نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اتنے زور سے مکا مارا کہ اسے تارے نظر آ گئے۔ اس کی کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔

”تم لوگ کیا چاہتے ہو بتاتے کیوں نہیں.....؟“ امر ناتھ نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

اسے جواب دینے کے بجائے اسے کسی قربانی کے جالور کی طرح گھسیٹتے ہوئے اس کے پاس لے گئے جو کھدائی کے لئے نشان کے طور پر بنایا گیا تھا۔ یہ بڑا مضبوط اور سات فٹ لمبا اور ایک فٹ چوڑا تھا۔ اس کے ہاتھ پیچھے لے جا کر دو قلیوں نے مضبوطی سے پکڑ لیے۔ وہ بوڑھا ہو چکا تھا اس میں اتنی طاقت اور توانائی کہاں بھی مگر اس کے باوجود اس نے ہاتھ چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن اس کی جدوجہد ناکام رہی۔ جن دو قلیوں نے اس کے ہاتھ پکڑے ہوئے تھے وہ جوان تھے۔

امر ناتھ نے دل میں سوچا کہ ان سے کہے کہ تم لوگوں کو رقم کی ضرورت ہے تو میری جیب میں سے بڑا نکالو اور چلتے بنو اور میری جان بخش دو لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ رقم کے لئے نہیں بلکہ کسی اور ہی خطرناک ارادے سے آئے ہیں..... کیا ارادے ہو سکتے ہیں؟

وہ سوچ ہی رہا تھا اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایک بد معاش اپنے گھوڑے پر سے کودا۔ امر ناتھ کے قریب آ کر اس نے جیب سے خنجر نکالا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ پیچھے کی سانس نیچے اور اوپر کی اوپر رہ گئی۔ خوف و دہشت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ اس بد معاش کو دھڑکتے اور کانپتے دل سے دیکھنے لگا جس کے ہاتھ میں خوف ناک خنجر چمک رہا تھا۔

”میں ضرور پورا کروں گا۔“ ماسٹر امر ناتھ نے حواس کو جمع کر کے کہا۔ ”کہو..... کیا مطالبہ ہے؟“

”سوچ لو..... بہت ہی قیمتی مطالبہ ہے..... شاید تم سن کر اس کے لئے تیار نہ ہو.....“ وہ سفاکی سے بولا۔

”میں نے کہا تھا کہ کتنا ہی قیمتی کیوں نہ ہو..... اسے پورا کرنے میں ذرہ برابر بھی پس و پیش نہیں کروں گا۔“

”ہمیں تمہاری زندگی چاہئے۔“ ماسٹر امر ناتھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرایا۔

”میری زندگی.....؟“ ماسٹر امر ناتھ اچھل پڑا۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا۔ ”وہ کس لئے؟“

”اس لئے کہ دنیا میں انسان کی زندگی سے زیادہ قیمتی چیز کوئی نہیں ہے.....“ وہ شقاوت سے کہنے لگا۔ ”اب تم زندہ رہ کر کیا کرو گے؟ تمہیں جوان لڑکیاں اور عورتیں پیش کی گئیں۔ لیکن تم نے اس لئے انکار کر دیا کہ تم ان کے قابل نہیں رہے..... عورت کے بغیر مرد کی زندگی اس کی اپنی توہین ہے..... شباب کے بغیر زندگی ساٹ اور بے کیف ہو جاتی ہے..... یہ جینا بھی کوئی جینا ہے ماسٹر امر ناتھ.....! اب تم زندہ رہ کر کیا کرو گے.....؟ یوں بھی تم نے اپنی نوجوانی بڑی رنگین گزاری.....“

اس نے اپنا خنجر بلند کیا۔ سورج کی تیز روشنی میں اس کی دھار چمکی اور پھر خنجر اس کے پیٹ میں اترتا چلا گیا۔

ماسٹر امر ناتھ کے ہاتھ جو دو قلیوں نے پکڑ رکھے تھے اسے چھوڑ دیئے..... وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ منہ کے بل گرا۔ اسے ہوش نہ رہا کہ کب ایک قلی نے اپنا دایاں ہاتھ پھیلا یا اور بد معاش نے خنجر جواب چکنے کے بجائے خون میں لتھڑچکا تھا اسے جسم سے جدا کر دیا۔

☆.....☆.....☆

پرکاش مہرہ نہ صرف ہندوستان کے بڑے صنعت کاروں اور دولت مندوں میں صف اول کا سرمایہ دار شمار کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ بڑا ذہین اور جہاں دیدہ تھا۔ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا وہ بے پناہ دولت کمالیتا..... اسے مٹی کو سونا بنانے کا فن آتا تھا۔ اس کی بڑی خواہش بلکہ پینا تھا کہ دنیا میں جو دس بڑے سرمایہ دار ہیں وہ ان پر سبقت لے جائے۔ اس لئے وہ ایسے کام ڈھونڈتا تھا کہ جس میں اس کے وارے نیارے ہو جائیں..... اب تک وہ یورپ اور امریکہ کی خاک چھانتا رہا تھا..... وہاں سے بھی خوب دولت کمائی تھی..... لیکن جب وہ کسی کام سے سری

لا گیا اور اس کی تاریخ پڑھی، مندروں اور پگوڈا دیکھے..... مجسموں کو دیکھا تو اس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ سری لنکا میں سونے کی کان تھی۔ یہاں بے پناہ دولت سونے کی صورت میں تھی۔ ابھی تک اس کا خیال نہ کسی کو آیا تھا اور نہ ہی سری لنکا حکومت جانتی تھی کہ اس کا مال پاتال کی گہرائیوں میں دفن ہے..... اتنا ہے کہ وہ راتوں رات نہ صرف دنیا کا امیر ترین ملک بن سکتا ہے بلکہ اس کے ہاں جو لوگ غربت و افلاس کی چکی میں پس رہے ہیں انہیں آسودگی، خوش حالی اور ہمسرت زندگی دے سکتا ہے۔

پرکاش مہرہ نے ایک کمپنی دس برس پہلے بھارت ریسرچ سینٹر کے نام سے قائم کی ہوئی تھی چوں کہ اس نے سری لنکا میں چائے کے باغات میں سرمایہ لگایا ہوا تھا اس لئے اس نے سری لنکا کی حکومت سے بات چیت کی کہ اس کی فرم آثار قدیمہ کی کھدائی کا کام کرتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ حکومت کے تعاون اور اجازت سے کام شروع کرے۔ سری لنکا میں جو شہر کولمبو سے قریب تھا اس کا نام کینڈی تھا۔ وہاں مندروں، قدیم عمارتوں اور کھنڈروں کے نام و نشان تھے۔ مندروں میں مجسمے مورتیوں کے مقابلے میں کثرت سے تھے۔ پرکاش مہرہ کا کام نہ صرف ہندوستان اور سری لنکا بلکہ پڑوسی ممالک میں بھی تھا۔ جتنا بڑا دولت مند ہوتا ہے اتنا ہی طاقت ور اور اثر و رسوخ کا مالک ہوتا ہے۔ اس کے اپنے اثر و رسوخ کے باعث سرکاری اور غیر سرکاری سطح کی تمام رکاوٹوں کو دور کرنے میں اسے کسی دشواری کا سامنا کرنا نہیں پڑا۔

ماسٹر امر ناتھ اور جگن ناتھ اور پرکاش مہرہ کے درمیان ایک بنیادی فرق یہ تھا کہ..... پرکاش مہرہ ایک خالص کاروباری شخص تھا اور وہ دولت کمانے کی غرض سے سرمایہ کاری کر رہا تھا۔ جتنی دولت آتی ہے۔ اتنی ہی ہوس بھی بڑھتی جاتی ہے..... جب کہ ماسٹر امر ناتھ اور جگن ناتھ کے پیش نظر دولت کا حصول نہیں ہوتا..... انہیں ان نادر، قدیم اور نایاب اشیاء کی منہ مانگے دام فروخت کرنے..... کسی میوزیم کو تحفے میں دیئے جانے سے قطعی دلچسپی نہیں تھی۔

ان کا تجسس اور دلچسپی کا محور اور ہی تھا..... وہ تو سری لنکا کے ماضی کے ایک مہاراجہ کی مکمل معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔ جو بے حد پراسرار تھا۔ وہ ان کی یکے بعد دیگرے ہاشینی کے درمیان گم گشتہ کڑیوں کو ملانے کے لئے کوشاں تھے..... صدیاں گزرتے گزرتے بہت مہاراجاؤں اور راج کاروں کی سادھیاں بے نام و نشان اور زمانے کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو گئی تھیں۔ اس دور میں چوں کہ سنگ تراشی بہت عام تھی اس لئے ہر راجہ مہاراجہ اور راج کاروں..... مہارانیوں کی مجسمہ سازی کی جاتی تھی..... تاہم اس کے باوجود بہت سے مجسموں کے ملنے کا امکان تھا..... اس وقت جو مجسمے بنائے جاتے تھے وہ مورتیوں کے ناپ کے ہوتے

تھے۔ ان پر مورتیوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ لیکن بہر حال ان کے درمیان ایک واضح فرق ہوتا تھا۔ ہ سنگ تراشی کے فن کا کمال تھا۔

لیکن اس عظیم مہاراجہ نگارام کا بیش بہا مجسمہ کہاں تھا.....؟ اس طرح راجن داس چہارم اور لڑکپن میں راجا بننے والا بھی لاپتہ تھا۔ مجسموں اور سادھیوں کی لامتناہی تلاش..... سورج کی جھلسا دینے والی تلاش اور اندر کی زہریلی ہوا بڑی جوتھوں کی باتیں تھیں۔ کوئی سر پھرائی ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ لیکن یہ جنون تھا۔ ایک اندھا جنون دل و دماغ پر سوار ہو جاتا ہے تو پھر اسے کچھ بھائی نہیں دیتا ہے۔ یہ بات کسی طور غلط نہ تھی کہ امر ناتھ اور جگن ناتھ دونوں ہی سر پھرے تھے ان کی زندگی موت اور اس کے شکنجوں سے کھیلنے اور دل بہلانے کا نام تھا۔

ماضی میں راج کماروں اور مہاراجوں کی چٹا کی راکھ ندی اور دریاؤں میں بہادی جاتی تھیں لیکن وہ مجسمے جو خالص سونے کی دھات سے تراشے ہوئے ہوتے تھے انہیں دفن کر دیا جاتا تھا۔ ایک خیال یہ تھا کہ سونے کے مجسمے دیوتاؤں کو خوش کر دیتے ہیں۔ مرنے والوں نے جو پاپ کئے تھے وہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ چاہے جیسا بھی گھناؤنا اور شرمناک اور ظالمانہ پاپ کیوں نہ ہو۔ جن سادھیوں میں وہ مجسمے دفن کر دیئے جاتے تھے وہ بکروں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ چوں کہ مجسمے خالص سونے کے ہوتے تھے انہیں مورتیوں کے ناپ کے بنائے جاتے تھے تاکہ سادھیاں بہت بڑی نہ ہو جائیں۔

پرکاش مہرہ کو ان مجسموں کی تلاش تھی جو طوفانوں، سیلابوں اور ہارشوں نے ان کی باقیات کو پاتال کی گہرائیوں میں جانے کہاں کہاں پوشیدہ اور گم کر دیا تھا۔ وہ بہر حال موجود تھے۔ خاک کا پونڈ نہیں ہو سکتے تھے۔ کچھ ہم جوؤں نے ان سادھیوں اور مقبروں کو تلاش کیا تھا..... اگر ان کا کوئی نام و نشان ہوتا تو ان کے ہاتھ لگ جاتے..... پھر یہ سلسلہ اس لئے جاری نہ رہ سکا تھا کہ اسے مفروضہ سمجھ لیا گیا تھا..... کچھ قدیم کتابوں میں ان کا تذکرہ سرسری انداز سے تھا اس لئے ہم جوئی ترک کر دی گئی تھی۔ سری لنکا کی حکومت نے بھی چھ سات برس تک ہم جوؤں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ لیکن وہ بھی انہیں پانے میں ناکام رہے۔

اب چوں کہ سونا عالمی مارکیٹ میں مہنگا تھا۔ اس کے دام آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ہندوستان میں بھی خاصا مہنگا تھا۔ پرکاش مہرہ نے سوچا تھا کہ دس بارہ مجسمے بھی ہاتھ لگ جائیں تو کروڑوں نہیں بلکہ اربوں ڈالروں کی آمدنی ہو جائے گی۔ جیسا کہ اس کے علم میں ہ بات ایک بہت ہی قدیم ہندوستانی داستانوں کی کتاب سے آئی تھی کہ ایک ایک مجسمہ ایک سے دو من تک وزنی ہے۔ اس نے سری لنکا حکومت سے ایک معاہدے کے تحت ایک کروڑ کی رقم

اس لئے دی تھی کہ جو بھی مورتیاں اور نوادرات ملیں گی اس کی اپنی ملکیت ہوں گی۔ کسٹم کوئی روک ٹوک نہیں کرے گا۔ حکومت نے این او سی پرکاش مہرہ کو دے دیا تھا۔

ماسٹر امر ناتھ نے اپنی جوان اور حسین بیٹی کو معاون بنایا ہوا تھا..... اس کی بیٹی پونم بے حد ذہین اور سمجھدار تھی..... وہ باپ کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھیں جس کے باعث باپ کو بڑی مدد مل جاتی تھی۔ وہ بیٹی کی معلومات میں اضافہ کرتا رہتا۔

جگن ناتھ نے ایک نو جوان شاستری کو جو مدراس یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھا اسے معاون بنالیا تھا۔ وہ بہت ہی اولوالعزم اور تجسس پسند تھا اور اسے بھی آثار قدیمہ سے جنون کی حد تک دلچسپی تھی۔

پرکاش مہرہ کا کام صرف اس مہم کے اخراجات اٹھانا رہ گیا تھا اور اس ٹیم کو اس نے کھلی جھوٹ دی ہوئی تھی کہ وہ اخراجات کی فکر اور پروا نہ کریں۔ دل کھول کر مزدوروں اور قلیوں کو اجرت دیں۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ یہ لوگ حقیقی معنوں میں اس کی تعظیم نہیں کرتے اور نہ ہی اس کی دولت اور عظمت سے مرعوب ہیں۔ صرف رسمی انداز سے ملتے اور کوئی خوشی کی بات ہوئی تو اظہار تشکر کر دیتے ہیں۔ اس کے لئے موسم کی سختیاں برداشت کرنا اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ اس لئے وہ بہت ہی کم اس طرف آتا تھا اور رخ کرتا تھا۔ اس قدر معروف تھا کہ اس لئے وہ شاذ و نادر ہی یہاں آنے کا پروگرام بناتا..... ورنہ ٹیلی فون پر رابطہ رکھتا تھا..... کسی وجہ سے اس کا آنا شد ضروری ہوتا تو وہ صبح کی فلائٹ سے آتا اور سہ پہر کی فلائٹ سے واپس چلا جاتا..... وہ بمبئی شہر میں سکون اور طمانیت سے رہتا..... ہر طرح کی آسائش و سہولت دولت ہونے کے ناتے اسے حاصل تھی۔ اس لئے انہیں سارے بکھیروں سے بچنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جاتا۔

اس ماہ کی انتھک محنت، جدوجہد اور جان توڑ کوششوں کے بعد انہیں پتھر کا ایک زینہ نظر آیا جو نہ ہانے کس طرح مہم جوؤں کی نظروں سے اوجھل رہا۔ شاید اس لئے بھی کہ انہوں نے اتنی محنت، جستجو اور جدوجہد نہ کی ہوگی۔ اس کے لئے غیر معمولی جفاکشی کی نہیں تھی۔ پہلے پہلے تو انہیں یہی سمجھ میں آیا کہ یہ کوئی مقبرہ ہے۔ سامی اتنی بڑی نہیں ہوتی ہے۔ بدھ مذہب کے لوگ مردوں کی تدفین کرتے ہیں۔ لیکن وہ جوں جوں کھدائی کرتے گئے ان پر ایک غیر متوقع انکشاف ہوتا گیا کہ یہ کوئی غیر معمولی مقبرہ ہے..... اور اس میں شاید کسی عظیم مہاراجہ کے مجسمے کا دفن ہے۔ چھ ہفتوں کی مسلسل کھدائی کے بعد انہیں ایک بہت بڑا دروازہ نظر آیا۔ جب وہ اس میں گھسے تو وہاں لمبے گتے صدیوں کی فضا ان کی نظر تھی..... جو ایک نیست و نابود تمدن کی صدائے بازگشت سنارہی تھی۔ جو جھل اور سلین سے دم گھٹا ہاتا تھا لیکن ان کے حوصلے پست نہ ہوئے اور نہ ہی انہوں نے ہمت ہاری بلکہ ان کا عزم و حوصلہ

اندھا جنون اختیار کرتا گیا۔
مقبرے میں مدفون فرمانروا کے استعمال کی تمام اشیاء قیمتی پوشاکیں، اسلحہ، اجناس.....
نشست و برخاست کی بڑا چیزیں اور زیورات میں کچھ تھا..... ایک طرف اس کے مجبوس کا مجسمہ
تھا..... اور چاروں طرف زرد و جاہر بکھرے پڑے ہوئے تھے..... دیواروں..... کونوں کھدروں اور
فرش پر ان کے ڈھیر لگے ہوئے تھے..... گویا یہ ایک خزانہ تھا جو چاروں طرف بکھرا ہوا تھا۔
امر ناتھ اور جگن ناتھ یہ سب کچھ دیکھ کر سکتے کی سی حالت میں رہ گئے..... انہیں ایسا لگا
حقیقت نہیں بلکہ ایک سپنا ہے..... لیکن جب وہ سکتے کی سی کیفیت سے نکلے تو انہیں احساس ہوا کہ
نہیں..... یہ سپنا نہیں بلکہ ایک حقیقت تھی جو سپنے سے بھی حسین تھی..... چند لمحوں کے بعد ان کی فطری
صلاحیت عموماً کرائی..... پھر وہ ان نوادرات کی مدد سے تاریخ کی کم گشتہ کو جوڑنے بیٹھ گئے..... انہیں
ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ماضی کے اس دور میں بیٹھے ہوئے ہیں جو ایک سپنے کی طرح رنگین اور دلکش تھا۔
پونم پوری طرح اپنے حواس کو قابو میں نہ کر سکی تھی..... جب مقبرے کا اندرونی دروازہ کھلا تھا وہ
اپنے باپ کی پشت پر کھڑی ہوئی تھی..... اس دم اس کا جی چاہا کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے..... پھر
اس نے محسوس کیا تھا کہ کوئی نادیدہ ہستی اس سے کچھ کہنا چاہ رہی ہو..... اس کی مدھم مدھم سی سرگوشی
اس کے کانوں میں جیسے گونج رہی تھی..... مگر وہ دانستہ اس کا ایک لفظ بھی سننا اسے گوارا نہیں تھا اور اس
سرگوشی نے اس کے اندر ایک عجیب اور پراسرار سی وحشت بھردی تھی..... لیکن اس کے باوجود اس نے
محسوس کیا کہ ایک نامعلوم خطرے کا اندیشہ اس کے ذہن پر کسی آسیب کی طرح مسلط ہو رہا ہے.....
اس نے سوچا کہ ان لوگوں سے جو ان چیزوں کی طرف منہ کئے بغیر بیٹھے ہیں..... ان سے کہے بے عتاب
جلد ہو سکے اس جگہ سے نکل بھاگیں..... کیوں کہ وہ محسوس کر رہی ہے کوئی بھی خوف ناک اور بدترین
نوعیت کا واقعہ پیش آ سکتا ہے..... ایک انجانی ہستی اس خطرے سے آگاہ کر رہی ہے..... لیکن وہ جانتی
تھی کہ وہ اس کی بات پر عمل نہیں کریں گے بلکہ اس سے کہیں گے یہ اس کا وہم ہے۔
چوں کہ اس کے ہتاجی نے نو جوانی کے آغاز سے ہی اس کی خصوصی تربیت کی تھی اس لئے
اپنی وحشت اور اندیشوں پر قابو پانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی..... جب حواس اور خوف اس کے
قابو میں آ گیا تو اس نے وہاں سے بھاگ جانے کا ارادہ ترک کر دیا اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو
بزدل اور توہم پرست ثابت کرنا نہیں چاہتی تھی۔
اب چوں کہ اسے سکون اور دل کو طمانیت سی محسوس ہو رہی تھی اس لئے اس نے اس روشنی میں
جو اس مقبرے میں صدیوں بعد کی گئی تھی اس میں اس کا ناقدانہ اعجاز سے جائزہ لینے لگی۔
اس کے سر پامیں ایک ارتعاش تھا جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا..... کیوں کہ چاروں طرف بھلی

ہوئی ایک عجیب بو کو مٹی کی دبیز تہہ کو اور اس پراسرار سکوت کو بڑے کرب سے برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔
پھر اسے یہ خیال آیا کہ وہ ان جان لیوا لمحات کو شاید زندگی بھر نہ بھلا سکے گی..... اور پھر مزید یہ کہ کہیں
ایسا نہ ہو جب اس مقبرے میں داخل ہونے والے یہاں سے نکلیں تو شاید یہ کوئی ایسا مرض لے کر
نکلیں جو موزوں قسم کا اور علا علاج نہ ہو۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا شیوں آدمی وہاں موجود الم ناک سی اشیاء کی فہرست تیار
کر رہے تھے لیکن پونم کیسوی سے جیسے کوسوں دور تھی..... کچھ دیر بعد اس نے خود پر قابو پالیا تھا۔ اب وہ
کیفیت برقرار نہیں رہی تھی..... ہر لمحہ اس کے خوف میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ شدید گرمی، جس اور
کھٹن کے باوجود اپنے پورے جسم اور نرس نرس میں سردی کی سی کپکپاہٹ محسوس کر رہی تھی..... جیسے باہر
اور اندر بھی سردی ہو۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے سورج کی تپش یا مجسمہ کا انتقام اسے جلا کر خاکستر
کر دے گا..... اور اس کی راکھ کو ہوا کی نذر کر دیا جائے گا تاکہ وہ فضا میں بکھر جائے۔

اس نے سنا ہوا تھا کہ جس انسان کا مجسمہ بنایا جاتا ہے اس کے مرنے کے بعد اس کی آتما اس
میں سما جاتی ہے۔ جب اس مجسمے کو چھیڑا جاتا ہے تو پھر وہ انتقام لیتی ہے۔ آخر کار اس سے رہا نہ گیا
اس نے اپنی ہمت جمع کر کے اپنے ہتاجی سے کہا۔

”ہتاجی.....! جتنا جلد ہو سکے اس جگہ سے نکل چلیں..... پلیز! ہتاجی!..... آپ میری مان
لیں۔“

”وہ کس لئے یہاں سے نکل چلوں؟“ انہوں نے حیرت سے اپنی بیٹی کی شکل دیکھی۔
”اس لئے کہ ایک انجانا خوف، وحشت اور پراسراریت اور نادیدہ عفریت کی موجودگی کا
احساس سا ہو رہا ہے۔“ اس نے کہا۔

اس نے اپنی بات کا رد عمل جاننے کے لئے اپنے باپ کا چہرہ دیکھا، تو اس کو لگا کوئی اثر نہیں ہوا
ہے۔

اس نے صاف طور پر محسوس کیا کہ اس کے ہتاجی کو اس کی اس بات سے سخت مایوسی ہوئی تھی۔
پھر انہوں نے بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی حیرت سے کہا۔

”مجھے تم پر ہمیشہ بھروسہ رہا ہے..... اور پھر میں تمہاری غیر معمولی صلاحیتوں کا معترف
بھی رہا ہوں..... میں ایک استاد ہوں اور تم میری بڑی ہونہار اور ذہین شاگرد ہوئی ہو اور میری ہم
خیال بھی..... لیکن اب تم ایک دقیقہ لوسی اور تو ہم پرست عورت کی طرح باتیں کر رہی ہو اور خوف زدہ
بھی ہو رہی ہو۔“

پونم سے کوئی جواب بن نہ پڑا تو پروفیسر جگن ناتھ نے اس سے کہا۔

”تم ایسا کرو..... اس غار میں جا بیٹھو جسے ہم لوگوں نے دفتر بنایا ہوا ہے..... اور ہمارا انتظار کرو۔“

اب وہ بحث و تکرار کر کے انہیں اپنے خوف اور اندیشے سے آگاہ کرنا نہیں چاہتی تھی..... وہ ان سے کہتی کہ اس کی چھٹی حس ایک خوفناک خطرے سے خبردار کر رہی ہے۔ وہ اس کو نہ سنتے اور نہ ہی مانتے..... پھر وہ اس مقبرے سے نکل کر اس غار میں آگئی جسے عارضی طور پر دفتر بنایا ہوا تھا۔ یہ خاصا بڑا کشادہ، روشن اور ہوادار غار تھا اور یہ گرم موسم میں بھی قدرے ٹھنڈا رہتا تھا..... اس دفتر میں کارکردگی کا تمام ریکارڈ موجود تھا۔ یہاں وہ بڑی عمدگی سے ایک کلرک کی طرح اپنا کام کر سکتی تھی۔ اس نے بیکار بیٹھ کر انتظار کرنے کے بجائے سوچا کہ وہ میز ٹھیک کر دے۔ وہ میز پر ادھر ادھر پڑی فائلیں اور بکھرے کاغذات سمیٹ کر اور درست کر کے رکھنے لگی۔ پھر میز پر جو گرد و جلی ہوئی تھی اسے ڈسٹر سے صاف کرنے لگی۔ اس کے قرینے نے میز کو صاف کیا تھا۔

شروع شروع میں جب یہاں کھدائی کا آغاز ہوا تھا یہ جگہ اسے بڑی رومان پرور محسوس ہوئی تھی۔ ماحول بڑا خواب ناک اور خوش گواری سا دکھائی دیتا تھا..... لیکن اب مقبرہ دریافت ہونے اور اس کے کھل جانے کے بعد یہ جگہ اسے کانٹے کو دوڑ رہی تھی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا اور پتہ جاتی کا ساتھ نہ ہوتا تو وہ یہاں سے کہیں دور چلی جاتی..... روز اس علاقے کا مزرعت کرتی۔ کیوں کہ یہ علاقہ بڑا پر فضا اور پرسکون اور قدرت کے حسین نظاروں سے بھرا ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد شاستری آیا تو اس کے بال، لباس اور ہاتھ پیر دھول مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ پہلے تو اس نے سر کے بالوں کو گرد سے صاف کیا۔ پھر کپڑے جھاڑے..... پھر اس نے غار کے باہر پلاسٹک کے بڑے ڈرم میں رکھے ہوئے پانی سے منہ ہاتھ دھویا تو وہ ایک دم تازہ دم سا ہو گیا۔ جب وہ بالوں میں کنگھی کر رہا تھا پونم نے اس سے پوچھا کہ وقت کیا ہو رہا ہے.....؟ شاستری نے اس کا سوال سن کر مسکرا دیا۔ کیوں کہ وہ اس سے یہ سوال کئی بار پوچھ چکی تھی۔ شاستری نے اپنی جیب سے قدیم زمانے کی سونے کی گھڑی نکالی جو اس کے پردادا کی تھی۔ وہ اسے آج بھی استعمال کر رہا تھا۔ یہ ایک انگریز نے اس کے پردادا کو کسی خدمات کے صلے میں دی تھی۔ یہ ابھی تک خراب نہیں ہوئی اور وقت بھی صحیح بتاتی تھی۔

”تم نے چھپلی بار جب وقت پوچھا تھا تب سے اب تک ٹھیک دس منٹ اوپر ہوئے ہیں۔“

شاستری نے جواب دیا۔

”معاف کرنا.....“ پونم جھینپ کر بولی۔ پھر اس نے جھینپ مٹانے کے خیال سے کہا۔

”پتہ جاتی..... اور انکل جگن ناتھ کیوں نہیں لوٹے ہیں..... میں خاصی دیر سے ان کا انتظار

کر رہی ہوں۔“

”ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کے ہاتھوں کوئی ایسی خاص چیز ہاتھ لگی ہو جو تجسس کا باعث ہو۔“

شاستری نے سرسری انداز سے جواب دیا۔

”ہاں.....“ پونم نے اپنا خوش نما سر اثبات میں ہلادیا۔ ”جب وہ کسی کام میں غرق ہو جاتے ہیں انہیں کسی بات کی پروا اور احساس نہیں ہوتا ہے..... وہ کسی بھی کام کو ادھورا چھوڑنا پسند نہیں کرتے ہیں۔“

”خاص چیز سے میری مراد کوئی حسین راج کماری ہوگی جو صدیوں سے ان کی راہ دیکھ رہی ہوگی۔“ شاستری نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ اب جبکہ صدیوں بعد ملنا ہوا ہے تو وہ سب کو بھول بیٹھے ہیں۔“

پونم اس کی بات سن کر مسکرا دی اور پھر اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

”میرے پتہ جاتی کا ذوق، پسند اور انتخاب کا معیار بہت ہی اعلیٰ وارفع ہے..... میرے پتہ جاتی کو وہی راج کماری دو شیزہ پسند آئے گی ان کے من کو بھائے گی جس کی عرسولہ برس کی ہوگی۔ اس کا مجسمہ ہو، وہ ایسی ہو کہ تین ہزار برسوں کے بعد بھی جنم لے تو دو شیزہ ہی ہو۔“

”لیکن تمہارے پتہ جاتی کے لئے تو سولہ برس کی عمر کی دو شیزہ بھی زیادہ عمر کی ہوگی۔“ شاستری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ ”انہیں تو بارہ برس کی ایسی دو شیزہ چاہئے جس کا حسن چاند کو بھی شرماتا ہو۔ شاید انہیں اسی عمر کی دو شیزہ ملی ہوگی۔“

پونم ایک دم سے کھل کھلا کر ہنس پڑی تو اس کے چہرے پر نکھار آ گیا اور سرخ سرخ گداز ہونٹوں پر تبسم کی لڑیاں بکھر گئیں..... دل کھول کر ہنسا چاہتی تھی تاکہ یہ یاسیت سے بھرا ماحول اس لطیف شگفتہ اور رومان رنگ میں ڈھل جائے جو پہلے تھا۔ شاستری کے آنے سے اس کے دل کو بڑی تقویت ملی تھی۔ ماحول ایک دم بدل گیا تھا۔

گزشتہ دس بارہ مہینوں سے مل جل کر کام کرتے ہوئے ایک دوسرے کی معیت میں انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے پیدا ہوئے ہوں..... جنم جنم کے ساتھی ہوں..... وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے..... وہ محبت کے اٹوٹ بندھن میں بندھ گئے ہیں اور یہ دلوں کا رشتہ ہے جو کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔

پونم یہ بات جانتی تھی کہ اس کے پتہ جاتی کو اس کا ہاتھ شاستری کے ہاتھ میں دیتے ہوئے خوشی ہوگی..... اور پھر انکل پروفیسر جگن کی طرف سے بھی اس شادی پر آ شیر باد ملے گی اور خود کو بھی اس بات کا خیال تھا کہ اسے شاستری بہت پسند ہے بلکہ اس کی کمزوری ہے..... گو کہ ابھی زبان سے

محبت کا اقرار اور عہد و پیمان نہیں ہوا تھا۔ لیکن نگاہوں کی زبان نے دل کی بات غیر مخصوص انداز سے کہہ دی تھی جو زبان کے لئے کہنا بہت ہی مشکل تھی۔

دونوں میں بہت ساری باتیں مشترک تھیں۔ دونوں کی طبیعت ملتی تھی۔ زندگی گزارنے کے لئے جس چینی ہم آہنگی کی ضرورت تھی وہ ان میں موجود تھی۔ وہ شاستری پر اعتماد حاصل کر سکتی تھی۔ اس عرصہ میں پونم نے دیکھا اور محسوس کیا تھا کہ شاستری میں تخلیقی صلاحیتیں بدیعہ اتم موجود ہیں۔ اس کے ساتھ دل میں امنگیں اور ولولے پیدا کرتا ہے اور ایک دن شہرت اس کے قدم چومے گی۔

غار سے باہر اچانک دھول اڑنے لگی۔ مقامی لوگوں کی سری لنگن زبان میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ دوسرے لمحے غار میں جگن ناتھ داخل ہوا تو کچھ شکستہ اور بے جان دکھائی دیتا تھا۔ اس کا چہرہ سفید دھلی چادر کی طرح ہو رہا تھا اور آنکھوں سے دہشت جھانک رہی تھی۔ پونم اس کی یہ حالت دیکھ کر بری طرح چونکی اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ جگن ناتھ صدمے سے غمگین ہو رہا ہے۔ پونم بری طرح سرا سیدہ ہو گئی۔ اس کے پاس آنے سے پہلے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتی۔ جگن ناتھ نے کہا۔

”میری پیاری بچی! آواز نہ اس کے سینے میں دوڑ دیا۔“

”انکل! انکل! میرے ہاتھی کہاں ہیں؟ وہ آپ کے ساتھ آئے کیوں نہیں؟“

پونم نے ایک ہی سانس میں پوچھا۔

جگن ناتھ جواب دینے کے بجائے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ سنیل داس جو سری لنگن حکومت کی طرف سے نمائندہ تھا اور وہ کام کے ابتدائی دنوں سے ان کے ساتھ تھا۔ جب وہ اندر داخل ہوا تو اس کے پیچھے دو قلی کوئی چیز اٹھائے ہوئے آئے۔ وہ ایک اسٹریچر اٹھائے ہوئے تھے۔ پونم کو دیکھنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ جان چکی تھی۔

دونوں قلی غار کے وسط میں پہنچ کر رک گئے اور پھر جیسے یہ پہلے سے طے شدہ تھا کہ انہیں غار میں داخل ہو کر کیا کرنا ہے۔ انہوں نے اسٹریچر کو فرش پر جیسے ہی بٹھ دیا۔ ماسٹر امر ناتھ کے منہ پر جو کپڑا تھا وہ ہٹ گیا۔ شاستری نے آگے بڑھ کر سامنے والے قلی کے منہ پر اس زور سے تھپڑ سید کیا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ فرش پر منہ کے بل گر گیا۔

”شاستری! پلیر!“ جگن ناتھ نے آگے بڑھ کر شاستری کا ہاتھ پکڑ لیا تاکہ وہ دوسرے قلی پر ہاتھ نہ اٹھا دے۔ ”انہیں نہ مارو۔“

”ان دونوں نے دانستہ اسٹریچر گرایا ہے۔“ شاستری نے غصے بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں لے

خود غور سے دیکھا ہے۔ میں انہیں بخشوں گا نہیں۔“

سنیل داس نے شاستری کو جو غصے میں بھرے ہوئے دیکھا تو اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر کہا۔

”آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ مرنے والوں کی بے حرمتی ہمارا شیوہ نہیں ہے۔“

”میں مقامی لوگوں کے طور طریقوں سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔“ شاستری نے سخت غصے سے کہا۔ ”میں کوئی نیا نہیں ہوں۔ میں ان لوگوں کی رگ رگ سے خوب واقف ہو چکا ہوں۔ حالیہ چند مہینوں میں ان کی کئی گھٹیا اور شرمناک حرکتیں دیکھی ہیں۔ کیا آپ کو ان کی تفصیل بتاؤں۔ آپ سنیں۔ ہمارے اسٹور سے کئی چیزوں کی چوری۔ ہمارے مزدوروں کو کام چھوڑنے پر اکسانا اور بھڑکانا۔“ شاستری کا پارہ چڑھتا گیا۔ ”یہ پہلے ہمارے ممنون تھے اور پالتو کتوں کی طرح آگے پیچھے دم ہلاتے پھرتے تھے۔ یہ ساری حرکتیں اس لئے تھیں کہ ہمارے پاس بے تحاشا خرچ کرنے کے لئے پیسہ تھا اور آپ ہاتھ مانگ کر خوش تھے۔ پھر ہم نے تنکا رام کا مقبرہ جسے آپ لوگ مقبرے کا نام دیں یا سادھی کہیں۔ دریافت کر لیا جو ایک عمارت میں واقع ہے۔ اور تم نے۔“ وہ آپ سے تم کے مخاطب پر آ گیا۔ ”تم نے اس پر ایک نظر ڈالتے ہی اس پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ تمہارے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور اب۔۔۔۔۔ اس نے ماسٹر امر ناتھ کی لاش کو دیکھتے ہوئے خشونت سے کہا۔ ”تم نے ماسٹر امر ناتھ کے ساتھ کیا کیا۔ کیا تم ہمیں دہشت زدہ کر کے یہاں سے بھاگنا چاہتے ہو۔؟ کیوں یہی بات ہے۔؟“

”ایسے گھٹیا قسم کے الزامات تھوپنے کی آپ کو ہمت کیسے ہوئی۔“ سنیل داس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”ہماری حکومت اور میں نے آپ لوگوں سے ہر قدم پر تعاون کیا۔ کیا آپ کو اس بات سے انکار ہے؟“

”تم نے ہمیں کوئی سہولت نہیں پہنچائی۔ ذرا گن کر تو بتائیں؟“ شاستری نے ہڈیانی لہجے میں چیخ کر کہا۔

”پلیر! ماسٹر سنیل داس۔۔۔۔۔ ماسٹر شاستری۔۔۔۔۔“ جگن ناتھ نے دونوں کو چپ کرایا۔

پھر جگن ناتھ نے قلیوں کو اسٹریچر کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سبھی سبھی نظروں سے شاستری کو دیکھتے ہوئے اسٹریچر اٹھا کر غار کے اندرونی حصے میں لے گئے۔ اس تمام عرصہ میں پونم بت بنی کھڑی رہی۔

”میں آپ سے احتجاج کرتا ہوں کہ اپنے الفاظ واپس لے لیں۔“ سنیل داس نے تیز لہجے میں شاستری سے کہا۔
 ”ہم کل تک اپنا کیسپ اٹھا رہے ہیں۔۔۔۔۔“ جگن ناتھ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”ہم مہینے واپس جا رہے ہیں۔“
 جگن ناتھ کے الفاظ اس پر بجلی بن کر گرے۔ وہ تیزی سے جگن ناتھ کی طرف مگھوم کر بولا۔

”ابھی تو آپ کا کام مکمل اور ختم نہیں ہوا ہے۔۔۔۔۔ دیکھا جائے تو اس کی ابتدا ہوئی ہے۔“
 ”دو تہیں ہمارے کام کی فکر کرنے اور ہمارے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ جگن ناتھ نے جھنجھلا کر جواب دیا۔ ”نوادرات اور اپنے تحفظ کے لئے ہم باقی کام اپنے شہر جا کر کریں گے۔ ہمیں یہاں رہ کر جان سے ہاتھ دھونا نہیں ہے۔“
 ”ایسا لگتا ہے کہ تمہارے منصوبے اور تمہارے حربے ہمیں یہاں سے بھگانے کے لئے کارگر ہوئے ہیں سنیل داس!“ شاستری غرایا۔ ہم اپنا بورسا بستر سمیٹ کر بھاگ جائیں گے۔۔۔۔۔ اپنی مرضی سے آئے تھے اور اپنی مرضی سے ہی جا رہے ہیں۔“
 ”آپ اپنی مرضی سے اور بھاگ کر بھی نہیں جاسکتے۔۔۔۔۔“ سنیل داس نے کہا۔
 ”کیا تم روک لو گے۔۔۔۔۔؟ اگر تمہیں اتنی ہمت ہے کہ روک سکتے ہو تو روک کر بتاؤ۔“
 شاستری نے چیلنج کے سے انداز میں کہا۔ ”ہمیں تم کیا۔۔۔۔۔ سری لنکا کی حکومت بھی جانے سے نہیں روک سکتی۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ یہ بات نہیں۔۔۔۔۔“ سنیل داس نے جیسے زیر لب کہا تو شاستری کو اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ”اس لئے کہ اب اس پر اسرار مقبرے کے عذاب سے چھٹکارا پانا ناممکن نہیں رہا۔“
 ایک تیز سرد لہر پونم کی ریڑھ کی ہڈی میں کسی زہریلے اور تیز دھار خنجر کی نوک کی طرح اتر گئی تو اس کا جسم لرزنے لگا۔

وہ راہب بجلی کی سرعت سے اس کے ذہن میں کوند گیا۔ جو متعدد لوگوں کی زبان پر تھا کہ۔۔۔۔۔ مہاراجاؤں، مہاراجاؤں، اور بھی دولت مندوں نے اپنی سادھیوں کو تیرنا بنا کر ان میں اپنے مجسمے اپنی موت سے نقل بنوا لئے تھے۔ وصیت کی جاتی تھی کہ ان کے مرنے کے بعد ان کی چتا کی راکھ فضا میں بکھیر دی جائے اور مجسمہ سادھی میں دفن کر دیا جائے۔۔۔۔۔ یہ

سادھی جو مقبرہ نما ہوتی تھی شاعی محل کے کسی گوشے میں ہوتی تھی۔۔۔۔۔ اور پھر ان کی آتمائیں سادھیوں یا مقبروں کو مٹی گارے یا پتھروں سے کسی دھات کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی تباہ کن پوشیدہ طاقت سے بند کر دیتے تھے تاکہ کوئی ان مجسموں کو لے جانہ سکے۔۔۔۔۔ اگر کسی نے انہیں لے جانے کی حماقت یا کوشش کی تو پھر وہ مجسمہ ان کی جان کے درپے ہو جاتا تھا۔
 ”دنیا کی کوئی طاقت ہمیں یہاں سے جانے سے روک نہیں سکتی۔۔۔۔۔“ شاستری نے یہ کہہ کر اسے ڈانٹ پلائی۔ ”سنیل داس اپنی بکواس بند کرو۔“

”خود فریبی میں مبتلا نہیں ہونا۔۔۔۔۔ موت ہمارا مقدر بن چکی ہے۔“ سنیل داس نے اپنا سر پیوں جھکا لیا جیسے دعاما نگ رہا ہو۔ پھر اس نے کہنا شروع کیا۔ ”مرنے والوں میں میں بھی رہوں گا۔۔۔۔۔ کیوں کہ اس میں، میں بھی ملوث رہا ہوں۔۔۔۔۔ ہمیں سادھیوں کی سزا ہلاکت کی شکل میں ہر قیمت پر ملے گی۔۔۔۔۔ اس سے فرار ممکن نہیں ہے۔“

”یہ بکواس تم اس لئے کر رہے ہو کہ ان مفروضہ قصہ کہانیوں سے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر۔۔۔۔۔“ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”نہ تو یہ دھول ہے اور نہ ہی جھوٹی قصہ کہانیاں بلکہ یہ آپ کا اندھا پن ہے۔۔۔۔۔ اندھا جنون جس نے آپ کو دیکھنے اور سمجھنے سے محروم کر رکھا ہے۔“ سنیل داس نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔
 ”کاش! آپ لوگ حقیقت اور عقل سے کام لیں۔“

جگن ناتھ کے سارے جسم میں خوف کی لہر بجلی کی رو کی طرح اتر گئی۔ اس نے جیب سے دھسکی کی بوتل نکال کر اس کا کارک کھولا اور منہ سے لگالیا۔

”سنگ رام کیا۔۔۔۔۔ کسی بھی راجا مہاراجا کی مورتنی۔۔۔۔۔ مقبرہ یا سادھی ہمیں عذاب نہیں دے سکتی سنیل داس۔“ شاستری نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس میں ایک سونے کا مجسمہ ہے جو بے جان۔۔۔۔۔ کیا تم نہیں جانتے کہ آدمی کے مرنے کے بعد اس کی آتما پر لوک میں قید ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ صرف بد آتمائیں دنیا میں منڈلاتی پھرتی ہیں۔۔۔۔۔ وہ بھی بہت ہی کم۔۔۔۔۔“

پونم آہستہ آہستہ چلتی ہوئی باپ کی لاش کے پاس پہنچی اور اس پر جھک گئی۔۔۔۔۔ پھر اس نے ایک دردناک چیخ ماری۔۔۔۔۔ اس کے باپ کا ایک بازو اسٹرینچر پر پھیلا ہوا تھا اور دوسرا بازو سینے پر رکھا ہوا تھا۔۔۔۔۔ لاش کے قریب ہی کتنا ہوا بازو اور خنجر جس پر خون جم گیا تھا۔ قریب ہی پڑے تھے۔

پونم کی چیخ سن کر جگن ناتھ تیزی سے اس کے پاس پہنچا اور اس کے بازوؤں کو تھام لیا۔ اگر وہ پونم کو نہ تھامتا تو وہ باپ کی لاش پر گر کر اور چٹ کر دھاڑیں مار مار کر روتی۔۔۔۔۔ شاید بے ہوش بھی ہو جاتی۔ غم و غصے سے۔۔۔۔۔

شاستری ان کے پاس آ پہنچا..... خون آلود اسٹریچر پر نظر پڑتے ہی اس نے کہا۔

میرے خیال میں ہم یہاں سے جتنی جلدی نکل سکتے ہیں نکل جائیں.....“

پونم اپنے باپ کی دردناک موت پر جگن ناتھ کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆.....☆.....☆

وہ ہفت بڑی غلٹ سے انہوں نے رخصت کی تیاریوں میں گزارا..... جلدی جلدی سامان کی فہرست تیار کی..... ایک ایک چیز کو اچھی طرح سے چیک کیا کہ کہیں وہ رہ نہ جائے..... مقبرہ نما سادھی کا نقشہ بنادیا..... نوادرات کا مکمل قوع نوٹ کیا اور جگہوں کی پیمائش کی تاکہ مستقبل میں کوئی یہ نہ کہے اور طعنہ نہ دے اور نہ ہی تسخراڑائے کہ اس کمپنی نے کھدائی کا کام جدید اور سائنٹفک طریقوں سے کیا تھا..... لکڑی کی بڑی بڑی اور مضبوط پٹیاں جو خصوصی طور پر بنائی گئی تھیں۔ کولہوشہرے منگوائی گئی تھیں۔ سنیل داس اپنی حکومت اور میوزیم کے حکام سے رسی اور قانونی روادگی کے لئے بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ گوکہ پرکاش مہرہ کو اجازت مل چکی تھی۔ پھر بھی اجازت اس لئے ضروری تھی کہ سادھی سے انہیں جو کچھ ملا تھا اس کی مالیت بے پناہ تھی۔ پرکاش مہرہ نے معاہدے کے تحت ایک کثیر رقم غیر ملکی کرنسی کی صورت میں دی ہوئی تھی..... شاستری کا سنیل داس کے بارے میں شبہ ہلکا پڑتا جا رہا تھا۔ کیوں کہ وہ بڑی تیزی سے ان کی روادگی میں مدد دے رہا تھا اور نوادرات لے جانے کے بارے میں اس نے روڑے اٹکائے نہیں تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ چاہتا ہوگا کہ یہ لوگ جتنا جلد ہو سکے اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ وہ ان کا سایہ تک دیکھنا نہیں چاہتا ہے۔

ایک روز سنیل داس کولہوشہرے والی پر میوزیم کے دو معمر اور بہت ہی پرانے ملازم لے آیا تھا۔ وہ اس لئے سنیل داس پر بگڑ رہے تھے کہ اس نے ایک دن بعد چلنے کی مہلت نہیں دی تھی..... لیکن جب انہوں نے سادھی کی اشیاء دیکھیں تو ان کی ساری برہمی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

سری لنکا میں سینکڑوں مندر ہیں..... جو ماضی کے راجاؤں اور مہاراجوں نے بنایا تھا..... ان کی حویلیاں، محل اور سادھیوں کی عمارتیں جو پر شکوہ تھیں انہیں سونامی، طوفانوں اور زلزلوں نے مدفون کر دیا..... نوادرات اور خزانوں کی کوئی کمی نہیں ہے..... ان کی تلاش میں تیس برس تک ملکی اور غیر ملکی آثار قدیمہ تلاش کرنے والی کمپنیاں خوار ہوتی رہیں..... اس لئے حکومت نے ایک کروڑ کی رقم ڈالر کرنسی میں وصول کر کے اس کے عوض اجازت دے دی کہ جو بھی اشیاء کھدائی سے برآمد ہوں گی۔ وہ کمپنی کی ملکیت ہوں گی..... لہذا میں میوزیم کی جانب اتنی ہزار اسٹرلنگ پونڈ کی پیشکش ان

نوادرات اور مجسمہ کے عوض کرتا ہوں..... یہ بہت بڑی پیش کش ہے۔ دارے نیارے ہو جائیں گے۔“

یہ شخص کولہوشہرے کے میوزیم میں ایک عہدے پر فائز تھا وہ لندن میں برٹش میوزیم میں دس برس انچارج رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ ان نوادرات کی کیا اہمیت ہے۔ وہ ماہر نوادرات تھا۔

جگن ناتھ نے فوراً ہی برٹش پونڈ کو ہندوستانی کرنسی سے حساب کیا..... یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ کھدائی کے سارے اخراجات بھی پورے ہو جاتے اور فرم کو خاصا منافع بھی ہوتا..... تو میوزیم کے ملازم نے پوچھا۔

”مسٹر جگن ناتھ! کیا ہماری اتنی بڑی فراخ دلانہ پیش کش منظور ہے۔“

اس گراں بہا پیش کش سے جگن ناتھ اندر ہی اندر بہت خوش ہو گیا لیکن اس نے بشرے سے ظاہر ہونے نہیں دیا۔ اس کا فوری جواب نہ پا کر میوزیم کا ملازم یہ سمجھا کہ جگن ناتھ تذبذب میں پڑ گیا ہے اور اسے رقم کم لگ رہی ہے۔ پھر اس نے کہا۔

”میں اس میں بیس ہزار پونڈ کا اضافہ کر سکتا ہوں اور اس سے مزید رقم میں اضافہ نہیں کر سکتا۔“ اس گراں بہا پیش کش سے جگن ناتھ اور شاستری بہت خوش ہوئے۔ جگن ناتھ نے شاستری سے اس کی رائے پوچھی تو شاستری نے اتفاق کیا۔ پھر جگن ناتھ نے کہا۔ ”آپ کو جواب کے لئے شام تک انتظار کرنا ہوگا۔“

”وہ کس لئے.....؟“ میوزیم کے افسر ملازم نے حیرت سے سوال کیا۔

”اس لئے کہ اس سودے کا اختیار صرف اس فرم کے مالک مسٹر پرکاش مہرہ کو ہے۔ اگر ان کی طرف سے اجازت ہوئی اور انہوں نے با اختیار بنایا ہوتا تو ہم یہ پیشکش قبول کر لیتے۔ لمحے کی بھی دیر نہ کرتے.....“

”آپ پرکاش مہرہ سے فون پر رابطہ کر کے آمادہ کر لیں۔“ سنیل داس نے مشورہ دیا۔ ”پھر یہ نوادرات یہیں رہیں گے..... ملک سے باہر نہیں جائیں گے..... ایک طرح سے ماضی کا ورثہ ہے۔ امانت ہے۔“

”کیا تم یہ چاہتے ہو کہ یہاں کے میوزیم میں ان کی نمائش کی جائے؟“ جگن ناتھ نے پوچھا۔ ”تاکہ اس سے میوزیم کو مالی فائدہ حاصل ہو؟“

”ہاں.....“ سنیل داس نے سر ہلا کر ٹھنڈی آہ بھری۔ ”دوسری بات یہ ہے کہ عذاب سے بھات مل جائے گی۔“

شاستری کی پیشانی پر شکنوں کا جال ابھر آیا..... وہ سمجھ گیا کہ سنیل داس کی نیت میں کون سا

جذبہ کار فرما ہے۔ اس کے خیال میں میوزیم ان نوادرات اور مجسمہ کو کسی غیر ملکی یا برٹش میوزیم کو فروخت کر کے لاکھوں پونڈ آسانی سے کما لے گی۔۔۔۔۔ وہ سنیل داس کو سخت لہجے میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ جگن ناتھ نے اس کا بشرہ بھانپ کر غیر محسوس انداز سے آنکھ سے اشارہ کر کے خاموش رہنے کے لئے کہا۔

ہفتے کے آخری دو دن اشیاء پیک کرنے اور انہیں سادگی کی عمارت سے نکالنے میں لگ گئے۔ جگن ناتھ اور شاستری خوش تھے کہ سارے نوادرات بہ حفاظت باہر نکال لئے۔۔۔۔۔ قلیوں نے کوئی توڑ پھوڑ نہیں کی اور ان کی سخت اور کڑی نگرانی کے باعث ایک چیز ادھر ادھر ہو سکی اور نہ چوری۔۔۔۔۔ شاستری کو ان قلیوں پر کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ شاید غربت و افلاس کے باعث چوری چکاری کر کے پر مجبور تھے۔ اس نے آخری مرتبہ فہرست چیک کر کے پونم کے حوالے کر دی کہ اسے سنبھال کر رکھ لے۔

شاستری اور جگن ناتھ آپس میں خوش گپیاں کر رہے تھے کہ سنیل داس نے آ کر پرکاش مہرہ کی آمد کی اطلاع دی۔

”آپ کے پاس پرکاش مہرہ آئے ہیں اور آپ دونوں کا انتظار کر رہے ہیں۔“
شاستری کو اور جگن ناتھ کو پرکاش مہرہ کی اچانک اور غیر متوقع آمد پر بڑی حیرت ہوئی۔ جگن ناتھ نے کہا۔

”چلو۔۔۔۔۔ اس کا اس طرح سے اچانک اور غیر متوقع آ جانا ایک لحاظ سے بہتر ہی ہوا۔ اس کی موجودگی میں تمام معاملات منٹ جائیں گے۔“

”وہ کمرے میں نہیں بلکہ دفتر میں آپ دونوں کے منتظر ہیں۔“ سنیل داس نے بتایا۔
پرکاش مہرہ پہلی بار اس دفتر میں آیا تھا۔ جب اس نے دفتر کو دیکھا تو اسے بہت پسند آیا کیوں کہ یہ نہ صرف خاصا کشادہ اور لمبا بھی تھا۔ بلکہ صاف ستھرا اور آئینہ کی طرح صاف و شفاف اور چمکا ہوا سا تھا۔ اس پر کسی ہال کا دھوکا ہوتا تھا۔ پھر جب ماسٹر امر ناتھ، جگن ناتھ اور شاستری نے اسے اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا تو شروع شروع میں آفس کی اور اطلاع دینے کا مرکز مذاق کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ پھر یہ زبان پر یوں چڑھ گیا اسے سب ہی آفس کہنے لگے۔۔۔۔۔ پھر رفتہ رفتہ غار ایک لحاظ سے آفس ہی بن گیا۔

جب وہ دونوں پرکاش مہرہ سے ملنے کے لئے پہنچے تو وہاں پونم پہلے سے ہی موجود تھی۔
”تم لوگوں کے لئے ایک چھوٹا سا تھہ لایا ہوں۔۔۔۔۔“ پرکاش مہرہ۔۔۔۔۔ رتنا سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ کول کتہ سے آیا ہے۔۔۔۔۔ جب آپ لوگ یہاں کھدائی میں مصروف تھے تب میں وہاں ہوا آیا۔“

ہنگالیوں کی مٹھائی مشہور ہے۔۔۔۔۔ یہ ہنگالی مٹھائی چمک کر دیکھیں کہ کیسی ہے؟ جانے وہاں کی مٹھائی میں ایسی کوئی خاص بات ہے جو یہاں نہیں ہے۔“

”یہ ہنگالی رس گلے تھے۔ ان کی شہرت پورے ہندوستان میں تھی اور غیر ممالک بھی جاتے تھے۔ امریکی اور یورپی مٹھاس کم پسند کرتے تھے۔ لیکن وہ ہنگالی رس گلے بہت پسند کرتے تھے۔ اس کا ذائقہ، لذت اور مزہ کسی یورپی سوئٹس میں نہ تھا۔ وہ ایسی عجیب سی لطافت کی وجہ سے انہیں لپٹتے تھے۔ کول کتہ سے یہ رس گلے بڑے اسٹور والے منگواتے تھے۔

پونم کو بھی یہ بہت پسند تھے۔ اس نے ایک رس گلہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا اور بولی۔
”لا جواب۔۔۔۔۔ مزیدار۔۔۔۔۔ جی چاہتا ہے کہ ساری مٹھائی اٹھا کر اکیلی ہی کھا جاؤں۔“
پرکاش مہرہ نے ان دونوں کو اندر آتے دیکھا تو کہا۔ ”آپ لوگ بھی نوش فرمائیں۔۔۔۔۔ تکلف بے طرف۔۔۔۔۔ میں آپ لوگوں کے لئے لایا ہوں۔“

جگن ناتھ اور شاستری نے ایک ایک رس گلہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا۔ جگن ناتھ نے تعریفی لہجے میں کہا۔

”رس گلے واقعی بہت اچھے ہیں۔ میں کوئی دس برس کے بعد کھا رہا ہوں۔ ایک ہنگالی پروفیسر ممی میں میرے تھا۔ وہ جب کبھی کول کتا جاتا تھا وہاں سے لے آتا تھا۔۔۔۔۔ اس کا اسپیشلسٹ صرف ایک دکان دار کا لالچہ ہے۔ دوسرے اس کے مقابلہ کا نہیں بناتے ہیں۔“
”اچھا یہ بتائیں۔۔۔۔۔ کام کیسا چل رہا ہے؟ کوئی نتیجہ برآمد ہوا؟“

”میں آپ کو ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں۔ آپ بڑے اچھے موقع پر آئے ہیں۔۔۔۔۔ نہ آتے تو میں فون پر رابطہ کرنے والا تھا۔“ جگن ناتھ کہنے لگا۔ ”چونکہ آپ نے سرمایہ کاری کی ہے۔ ایک بڑی رقم دان کی ہے۔ اس لئے مجھے پختہ یقین ہے کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔“ اس نے تفصیل بتانے کے بعد اس نے کہا۔ ”سنی داس کو لمبو میوزیم کی جانب سے بہت بڑی پیشکش لایا ہے۔۔۔۔۔ اتنی بڑی رقم ہے کہ نہ صرف تمام اخراجات پورے ہو جائیں گے بلکہ زبردست مالی فائدہ بھی ہوگا۔ یہ پیشکش میوزیم کے دو اعلیٰ افسران نے کی ہے۔“

”خاصی رقم۔۔۔۔۔ آخر کتنی ہے۔۔۔۔۔؟“ پرکاش مہرہ نے سوال کیا۔
”ایک لاکھ برٹش پاؤنڈ۔“ جگن ناتھ نے جواب دیا۔ ”پہلے اس نے اتنی ہزار کہے تھے۔

خود ہی اس نے بیس ہزار کا اضافہ کر دیا۔“
پرکاش مہرہ کے فلک شکاف قہقہے سے غار گونج اٹھا۔ پھر اس نے اپنی ہنسی روک کر کہا۔
”ایک لاکھ برٹش پاؤنڈ۔ کیا تمہارا دماغ خراب ہے۔۔۔۔۔ بھلا یہ کیا پیشکش ہوئی۔۔۔۔۔؟“

جگن ناتھ کے چہرے پر تناؤ آ گیا..... وہ ایسی گفتگو کا عادی نہ تھا۔ اسے پرکاش مہرہ کا لہجہ ناگوار لگا۔ اس نے کچھ کہنے کے لئے اس کے ہونٹ کپکپائے..... شاستری بے چین اور منتظر تھا کہ کیا کہتا ہے..... لیکن شاستری نے محسوس کیا کہ وہ کسی خیال کے زیر اثر خاموش ہو گیا ہے.....

”میں آپ کو بتا دوں.....“ پرکاش مہرہ کھلفہ مزاجی سے اسے مخاطب کیا۔ اسے محسوس ہو گیا کہ تم کے مخاطب نے جملے کا برا منایا ہے۔“ میں ساری دنیا گھوم پھر کر اس مجسے کی نمائش کروں گا جو د صرف سونے کا ہے بلکہ عجیب و غریب خصوصیت اور صدیوں پہلے کا ہے۔ گنگا رام.....“

”آپ ایسا ہرگز نہیں کر سکتے.....“ سنیل داس ایک دم سے اس طرح اچھل پڑا جیسے اسے برقی جھٹکا لگا ہو..... شاستری نے پہلی بار دل میں اس کے لئے ہمدردی محسوس کی جس نے بڑی بے خونی سے پرکاش مہرہ کو ٹوکا تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ سنیل داس کو اپنے دلش سے سچی محبت ہے۔“

”ایسا نہیں کر سکتے.....؟ اس سے تمہارا کیا مطلب ہے.....؟ آئندہ مجھ سے ایسی بات نہ کہنا.....“ پرکاش مہرہ نے سر کی جنبش سے سنیل داس کو ایک طرف ہٹ کر کھڑے رہنے کے لئے کہا۔

پھر وہ جگن ناتھ اور شاستری سے مخاطب ہوا۔

”آپ دونوں میرے ساتھ ساتھ رہیں..... پھر دیکھیں گے کہ صحیح معنوں میں پیسہ کیا ہوتا ہے اور کس طرح سے کمایا جاتا ہے..... یہ بھی ایک ہنر ہے کاروبار ہے.....“

”ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا.....؟“ جگن ناتھ نے تکرار کے انداز میں کہا۔

”یقیناً پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا.....؟“ پرکاش مہرہ نے سر ہلا کر اعتراف کیا۔

”اس قدر اہمیت کی حامل اور ایسی اور اتنی مالیت کی تاریخی چیزوں کی عام نمائش نہیں کی جاسکتی ہے۔“ جگن ناتھ نے کہا۔ ”میرے نزدیک یہ غلط بات ہوگی اس لئے میں آپ کو اس کی اجازت نہیں دوں گا۔“

”اس لئے بھی کہ یہ مقدس نوادرات ہیں..... ان کی نمائش کرنا اور ان کی بے حرمتی کرنے کے مترادف ہے۔“ سنیل داس نے احتجاجاً کہا۔ ”میں پروفیسر جگن ناتھ کی تائید کروں گا..... آپ مجھے بھی ان کا ہم خیال سمجھیں۔“

”دولت کمانے سے کسی کی کوئی بے حرمتی نہیں ہوگی۔“ پرکاش مہرہ نے ڈھٹائی سے کہا۔

”مسٹر ایہ بزنس ہے بزنس..... بزنس میں سیوانہیں کی جاتی ہے۔ دولت کمانا مقصد ہوتا ہے۔ بزنس میں ایک حقیقت پسند ہوتا ہے..... کیا تم یہ بات نہیں جانتے؟“

”اگر آپ کا سنجیدگی سے یہی ارادہ ہے اور آپ مذاق نہیں کر رہے ہیں تو مجھے اس بات کا ادھیکار ہے کہ میں اعلیٰ حکام سے بات کروں گا..... میں ان سے پہلی فرصت میں بات کروں گا تاکہ

نمائش کی اجازت نہ دی جائے۔“

”جو جی آئے وہ کرو.....“ پرکاش مہرہ نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ ”میں وہی کچھ کروں گا جو میرے جی میں آئے۔“

سنیل داس اس کی بات سن کر پروفیسر جگن ناتھ کی طرف گھوم گیا جو اس کے عقب میں کھڑا تھا۔

”سرا جگن ناتھ! مجھے یقین ہے کہ آپ کا دقار اور ذوق اس طرح کام کرنے کے لئے ذہنی طور پر قبول نہیں کرے گا۔“ سنیل داس نے کہا۔

”مسٹر جگن ناتھ..... میری فرم کے لئے کام کر رہے ہیں۔“ پرکاش مہرہ نے تہنیت کے انداز میں سنیل داس سے کہا۔ ”ان کا اس معاملے سے کوئی غرض نہیں..... کوئی سروکار نہیں..... ان سے جتنا کہا گیا وہ اسے نہایت ایمان داری اور فرض شناسی سے اپنا کام کر رہے ہیں جو انہیں سونپا گیا ہے۔ میں جو کہوں گا وہی کریں گے۔ آپ کو مشورہ اور دخل اندازی کی کوئی ضرورت نہیں۔“

سنیل داس نے مایوسی اور افسردگی سے سر ہلایا۔ پھر وہ سر جھکا کر دروازے کی طرف بڑھا۔ پھر دلیز کے پاس رک کر بولا۔

”ہمیں کچھ ایسے اقدامات کرنے ہوں گے جو آپ کو یقیناً ناگوار ہوں..... لیکن میں اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔“

اتنا کہہ کر اپنی بات کا رد عمل دیکھنے کے لئے رکنا نہیں..... کسی سنسناتے تیر کی مانند باہر نکل گیا۔

”یہ سب ایک ہی جیسے ہوتے ہیں.....“ پرکاش مہرہ نے غرا کر کہا۔ ”ہمیشہ کسی نہ کسی چکر میں پڑے رہتے ہیں..... وہ جو چاہتا ہے اسے کرنے دو..... میں جانتا ہوں کہ وہ کچھ نہ کر سکے گا..... اس لئے کہ جو کر جتے ہیں وہ برستے نہیں..... آئیں..... اب تفصیلات طے کر لیں تاکہ کام مکمل ہو جائے۔“

جگن ناتھ نے بول نکال کر منہ سے لگالی۔ وہ مے نوشی کا عادی تھا۔ وہ بڑا مضطرب اور پریشان ہو گیا تھا۔ جب بھی وہ دماغ میں کوئی بیجان محسوس کرتا تو اسے کم کرنے کے لئے دسکی کا سہارا لیتا تھا۔

”ہم ممبئی پہنچ کر..... وہاں سے لندن چلیں گے۔“ پرکاش مہرہ نے کہا۔ ”ہم روانگی میں دیر نہیں کریں گے۔“

”مسٹر پرکاش مہرہ! کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں.....؟“ جگن ناتھ نے غیر یقینی لہجے میں

دریافت کیا۔

”جیسا کہ میں ہمیشہ کہتا ہوں..... اس طرف کا رخ کرنا چاہئے۔ جہاں پیشہ ہو۔ یہ میرا صول ہے کہ خوب پیسہ کماد..... جب بھی مجھے کوئی ایسا سنہرا موقع ملتا ہے میں اسے ہاتھ سے جانے نہیں دیتا ہوں۔ فوراً ہی استفادہ کرتا ہوں۔“

”لیکن یہ.....“ جگن ناتھ نے اپنی رائے دینا چاہی لیکن پرکاش مہرہ نے فوراً ہی بات کاٹ دی۔

”آپ مجھے بتاتے رہیں کہ یہ ایک عظیم دریافت ہے..... ٹھیک ہے نا..... صدیوں میں دریافت ہونے میں سے ایک.....“

”لیکن..... انسانیت کے مفاد میں.....؟“ جگن ناتھ نے لقمہ دیا۔

”انسانیت کو کون زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے..... میں یا آپ.....؟“ پرکاش مہرہ نے بھنا کر کہا۔ ”آپ ان نایاب اور مقدس نوادرات کو ایک چھوٹے سے ملک کے ایک چھوٹے سے شہر کے میوزیم میں رکھنا چاہتے ہیں۔ جس میں کوئی بھی قابل ذکر اشیاء موجود نہیں ہیں..... جہاں سیاحوں کے سوا انہیں کوئی اور نہیں دیکھے گا..... اس لئے کہ مقامی باشندوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اگر لوگ معلومات حاصل کرنا چاہیں گے تو میں کروں گا..... دور پے کے ٹکٹ کے عوض.....“

شراب اور غصے سے جگن ناتھ کے گال تھمتانے لگے۔ وہ میز پر مکا مارتے ہوئے بنا فردختہ ہو گیا۔

”مسٹر پرکاش مہرہ.....! اگر آپ بچکانہ نمائش پر بعد ہیں تو میرے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں..... چارہ نہیں کہ میں اپنی ذمے داریوں سے سبک دوش ہو جاؤں۔“

”اچھا..... یہ بتائیں کہ بچکانہ بات کون کر رہا ہے؟“ چکاش مہرہ نے سنبھل کر کہا۔

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اس کام میں شریک نہیں ہو سکتا.....“ جگن ناتھ نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

غار میں گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ ایک تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پرکاش مہرہ کچھ دیر تک بت بٹا رہا..... پھر وہ طنز و طعنے کی طرف دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو..... دیکھ رہے ہو اپنے باس کی حماقت..... اس لئے بے وقوف کو اس میں اس قدر جذباتی اور غصہ ہونے کیا کی ضرورت ہے.....؟“

شاستری نے دل میں اعتراف کیا کہ..... اس کے سر، پروفیسر جگن ناتھ کی بے جا ضد ہے، اسے عظیم تر مفاد میں اپنی فرم کے مالک کا ساتھ دینا چاہئے۔ معاً پرکاش مہرہ نے اس سے سوال کیا۔

”کیا اپنی حیثیت میں ترقی اور تبدیلی چاہو گے..... کیا ممی چل کر اس نمائش کے ٹکراں کا

مہرہ سنبھالو گے.....؟ پھر دیکھو گے کہ حالات کیسے اختیار کرتے ہیں.....؟“

شاستری سٹ پٹا گیا..... تحسین کی بو چھاڑ..... نمایاں مقام..... تابناک مستقبل کی امید..... اس نے ایک پل میں یہ سارے سنے دیکھ لئے..... پھر اس کی نظر جگن ناتھ کی طرف اٹھ گئی تو اس کی وفاداریاں اس شخص کے ساتھ نظر آئیں۔ جس نے بے روزگاری میں اسے ملازمت دی تھی۔ درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں اور پر عزم امیدواروں میں اس کا انتخاب کیا گیا۔

اس نے رک کر جواب دیا۔ ”جہاں تک میرا خیال ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ ہی بدستور

انچارج ہیں۔

”لیکن وہ تو ہمیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔“ پرکاش مہرہ نے کہا۔ ”اب وہ میرے ملازم نہیں

رہے۔“

جگن ناتھ نے پرکاش مہرہ کی بات سن کر تیزی سے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں مسٹر شاستری.....! تم نے ان کی بات بھی سن لی ہے اور میری

بھی..... میں ایک طرح سے زبانی طور پر استعفیٰ دے چکا ہوں..... تحریری طور پر بھی دے دوں گا تاکہ انہیں یقین آ جائے۔“

”لیکن..... سر.....؟“ شاستری نے درمیان میں کہا۔

”اس جہم کے مفاد میں میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ مسٹر پرکاش مہرہ کی پیشکش قبول کر لو..... کم از کم نمائش تو ڈھنگ کی ہوگی۔ چوں کہ تم ایک با صلاحیت اور با ذوق جوان ہو..... مجھے امید ہے کہ اس میں خوش ذوقی تو ہوگی۔“

”جب آپ ایسا سمجھتے ہیں تو آپ اپنے اس فیصلے پر اس قدر جذباتی کیوں ہو گئے

ہیں.....؟“ شاستری نے کہا۔

”یہ میرا فیصلہ ہے کہ میں اس کام میں ساتھ نہیں دے سکتا..... اس فیصلے کو جو نام دینا ہے

دے لو.....“ جگن ناتھ نے کہا۔ ”کسی وجہ سے میرے لئے ممکن نہیں ہے..... البتہ تم کر سکتے ہو اور

میں تمہاری راہ میں حائل نہیں ہوں گا۔“

اس پیش کش کو شاستری نے پونم کی طرف مشورہ طلب نظروں سے دیکھا تو اس نے بڑی

خاموشی سے سر کو ہلادیا کہ وہ قبول کر لے۔

”آج رات آپ لوگ میرے ساتھ رات کا کھانا کھائیں۔“ پرکاش مہرہ نے اس تناؤ کی

کیفیت کو ختم کرتے ہوئے کہا۔

شاستری اور رتنا نے پرکاش مہرہ کے ساتھ رات کا جو کھانا کھایا وہ اس علاقے کا سب سے اچھا ہوٹل تھا۔ اس کے مچن میں میزیں لگی ہوئی تھیں۔۔۔۔۔ زبان کا ذائقہ بدلنے کے لئے انہوں نے مقامی کھانا جو کھایا وہ لذیذ اور ذائقہ دار اس لئے نہیں لگا تھا کہ وہ ناریل کے تیل میں پکے ہوئے کھانے تھے۔ یوں بھی سری لنکن کھانا پکانے میں ماہر تھے اور نہ ہی کوئی ذوق اور ذائقہ رکھتے تھے۔ وہ غربت و افلاس اور گرانی کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ آسودگی اور خوش حالی ہوتی تھی تو اس کا ہر طرح کا اعلیٰ ذوق ہوتا۔۔۔۔۔ پرکاش مہرہ نے ہندوستانی کھانے منگوائے۔۔۔۔۔ اس ہوٹل میں ہندوستانی اور مغربی کھانے دو تین مدد راسی یا باورچی تھے وہ تیار کرتے تھے۔ ان میں بڑی لذت اور ذائقہ ہوتا تھا۔ جتنے ہندوستانی وغیرہ تھے وہ ہندوستانی کھانوں کو ہی ترجیح دیتے تھے۔

اس ہوٹل کے وسیع و عریض مچن میں لوگ کا ناچ گانا خوب زوروں پر تھا۔ لیکن اس میں تیرہ چودہ برس سے لے کر بیس برس کی طرح دار پر کشش اور متناسب جسم کی لڑکیاں تھیں جس نے ماحول میں بڑا حسن، رنگینی اور قیامت بپا کر دی تھی۔ اس کی ایک اور وجہ ان کا لباس بھی تھا جس میں ہیبت اور بڑھ گئی تھی۔ پرکاش مہرہ نے ویٹروں کو خوب دوڑایا۔ اور مٹھی بھر بھر کے سکوں کی بارش ناچنے والوں پر کر دی۔۔۔۔۔ نوٹ ان سات لڑکیوں کو دیئے جو جوان تھیں۔ ان کے دل کش رقص نے دل موہ لئے تھے۔ پرکاش مہرہ کو توقع نہیں تھی کہ یہ لڑکیاں اتنا اچھا رقص پیش کریں گی۔

کھانے کے دوران پرکاش مہرہ نے اچانک اپنا ہاتھ کھانے پر روک کر پوچھا۔

”مسٹر شاستری۔۔۔۔۔ اتم نے میرے ساتھ رہنے کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا؟“

”میں آپ کے ساتھ ہوں مسٹر پرکاش مہرہ!“ شاستری کی زبان سے غیر ارادی طور پر نکل گیا۔

”مجھے تمہارے اس دانش مندانہ فیصلے سے بڑی خوشی ہوئی۔“ پونم نے بے ساختہ اور غیر متوقع سرگوشی میں شاستری کی طرف منہ کر کے کہا۔ ”مجھے تم سے یہی توقع تھی شاستری۔۔۔۔۔!“

پرکاش مہرہ ایک دم سے اچھل پڑا۔ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”میں ایسی ہی بات سننا پسند کرتا ہوں۔ ہماری خوب نیچے گی۔۔۔۔۔ لیکن مجھے جگن ناتھ کے رویے پر سخت افسوس ہے۔۔۔۔۔ لیکن تم کہہ سکتے ہو۔ وہ اگلے دنوں کا آدمی ہے۔ یہ ایک جدید اور ترقی یافتہ دور ہے۔۔۔۔۔ کیا انہیں اس بات کا اندازہ اور حساس نہیں ہے کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ جو وقت کے ساتھ چلتا ہے وہی کامیاب بھی رہتا ہے۔ تمہیں آج کے دور میں رہنا ہوگا۔۔۔۔۔ پروفیسر کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔“

پھر وہ مستقبل کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد ایک بہت ہی بد صورت اور

سیاہ قام جیسا جوان لڑکا بھیڑ کوچر تا ہوا ان کی میز پر آیا۔ اس نے شاستری سے کہا۔

”آپ کو آپ کا مالک بلارہا ہے۔۔۔۔۔ آپ فوراً ہی اس کے پاس پہنچیں۔“

”کون۔۔۔۔۔؟ شاستری کا سارا دھیان ناچ کی طرف تھا اس نے کچھ نہ کہتے ہوئے پوچھا۔

”اس کی مراد جگن ناتھ سے ہی ہوگی۔“ پونم نے حیرت سے کہا۔ انہوں نے کس لئے اس وقت بلایا ہے؟“

”میرے خیال میں یقیناً کوئی اہم بات ہوگی۔۔۔۔۔ ورنہ وہ نہیں بلاتے۔۔۔۔۔ معاف کیجئے گا ہم ابھی ہوا آتے ہیں۔“ شاستری بولا۔

”میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔“ پرکاش مہرہ نے ان کے ساتھ اٹھتے ہوئے کہا۔

غار میں پہنچتے ہی انہیں ایک نظر میں احساس ہو گیا کہ واقعی کوئی اہم بات ہے۔ جگن ناتھ کا چہرہ چٹکی کھا رہا تھا۔

”کیا بات ہوگئی۔۔۔۔۔؟“ پرکاش مہرہ نے پوچھا۔ وہ غار میں نظریں دوڑانے لگا۔

”یہاں جو چور آئے تھے؟“ جگن ناتھ نے گہرا سانس لے کر جواب دیا۔ ”الیٹور نے بڑا

بھلا کیا۔ کوئی چیز نہیں گئی۔ انہوں نے کچھ تلاش کیا۔۔۔۔۔ وہ چیز غالباً ان کے ہاتھ نہیں گئی۔ وہ مایوس ہو کر خالی ہاتھ چلے گئے۔

”کس چیز کی تلاش ہو سکتی تھی۔۔۔۔۔؟“ پرکاش مہرہ کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔

”انوپم۔۔۔۔۔“ سنیل داس نے جواب دیا۔ ”وہ غائب ہے۔۔۔۔۔ نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”مسٹر ساجن۔۔۔۔۔!“ پیچھے سے آواز آئی تو انہوں نے ایک قلی کو غار کے دہانے پر کھڑا ہوا

دیکھا۔۔۔۔۔ وہ شاستری کو اشارے سے بلارہا تھا۔ شاستری اس کے پیچھے پیچھے گیا تو غار سے قدرے لاصلے پر انوپم زمین پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ اس کے سینے میں خنجر پیوست تھا۔۔۔۔۔ شاستری بو جھل قدموں سے غار میں آیا۔

”شاستری۔۔۔۔۔!“ پونم نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ ”تمہاری چیزوں کی فہرست غائب ہے۔“

”غائب ہے۔۔۔۔۔؟“ شاستری نے حیرانی سے کہا۔ ”اسے تو بڑی حفاظت سے رکھا گیا تھا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ میں نے اسے صندوقچی میں رکھ کر تالا لگا دیا تھا۔“ پونم بولی۔ ”اس کی چابی

میرے پاس ہے۔“

لیکن یہ ٹوٹی پڑی ہے۔۔۔۔۔ اس میں فہرست نکال لی گئی ہے۔“ شاستری نے کہا۔

شاستری سر ہلکا کر بیٹھ گیا اس کی نقول بھی نہیں تھیں اور اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ دوسری فہرست تیار کی جاتی۔ اس کی گھنٹوں کی محنت کا ارت گئی تھی۔ اسے بچھتا و اسسا ہو رہا تھا کہ اس نے ان کی

نقول کیوں نہیں تیار کی۔

”لیکن وہ کیوں اور کس لئے فہرست لے گئے ہیں۔“ جگن ناتھ نے جھنجھلا کر کہا۔ ”آ خر وہ اس فہرست سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟“

سینل داس جو پونم کی پشت پر کھڑا ہوا تھا اپنی جگہ سے بولا۔

”اگر کسی کو مقبرے میں پانی جانے والی تمام اشیاء کے نام درکار ہوں تو یہ مقصد تمہاری فہرست سے چٹکی بجاتے ہوئے ہو سکتا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ..... تنکا رام کے نوادرات سے دلچسپی رکھنے والے صرف ہم لوگ ہی نہیں ہیں۔“ شاستری نے کہا۔

”اس بات سے ظاہر تو یہی ہوتا ہے۔“ پونم بولی۔ اب ہمیں بہت ہوشیار اور محتاط رہنا ہوگا۔“

رات کا وقت تھا..... سمندر تاریک، پرسکون اور کسی لقی و دوق صحرا کی طرح بے کنار نظر آتا تھا۔ لیکن اس کی سطح سے ہوا کے فرحت بخش لطیف جھونکے اٹھ اٹھ کر جہاز کے عرشے کو چوم چوم رہے تھے۔ فضا پر گہرا سناٹا مسلط تھا۔

پونم..... محسوس کر رہی تھی کہ وہ زندگی کی آخری سانس تک اس جہاز کے رینگ پر چبکی رہے گی اور اس کی زندگی تمام ہو جائے گی..... مرتے مرتے پانی کی سرگوشیاں سنتی رہے گی۔

اس کے چٹائی کی ناگہانی موت کا زخم جو بہت ہی گہرا اور تازہ تھا..... ایسا زخم جلد نہیں بھرتا ہے۔ گو کہ وقت بڑے سے بڑا زخم بھردیتا ہے۔ لیکن اس میں وقت لگتا ہے..... کسی پر قتل کا شک نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی الزام عائد کیا گیا تھا..... مقدمہ چلنا بھی تو کس پر چلنا..... یہ تو اس وقت ہوتا کسی کو شک پر گرفتار کیا جاتا..... کوئی گواہ ہوتا..... اسے دکھ سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ نامعلوم قاتلوں نے کیوں اور کس لئے اس کے بے گناہ، معصوم اور بد نصیب کی جان لی..... جب کہ وہ کسی کا دشمن نہ تھا۔ ایک بے ضرر سا آدمی تھا..... وہ کسی کو نہ تو کوئی تکلیف پہنچاتا تھا اور نہ ہی کسی کو دکھی دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر سوچا..... کاش! اس قتل کا سبب تو معلوم ہو جائے۔ وہ اندھیرے میں تھی۔

آخر اس کے باپ کا جرم کیا تھا.....؟ یہ ایک معمہ تھا۔ ایک ایسا راز بن گیا تھا جو کبھی ظاہر نہیں ہو سکتا تھا..... شاید وقت کی گرد دوسروں کے ذہن کی طرح اس واردات کو اپنی آغوش میں چھپالے۔ ایک بھولا بھرا بھیا تک خواب بن جائے۔

دور سے جہاز کے آرکسٹر کی دھیمی دھیمی مسور کن آواز آرہی تھی جو کشاں کشاں اپنی طرف

کسی طلسم کی طرح کھینچ رہی تھی۔ آتما میں دھیرے دھیرے کسی امرت کی طرح رس رہی تھی..... عرشے پرسکون اور سکوت دونوں ہی تھے..... لیکن اس کے نچلے حصے کے بارے میں پونم کو چین و اطمینان نہیں تھا۔ جہاز..... قہقہوں..... موسیقی اور طمانیت سے پرے..... تنکا رام کا مجسمہ جس پر کسی مٹی کا گمان ہوتا تھا..... اور اس کے ساتھ اس کی سادھی کے زیورات بھی رکھے تھے۔ پونم ان کا بوجھ اپنے اعصاب پر کسی چٹان کی طرح محسوس کر رہی تھی جس نے اسے بے کل اور پریشان کر دیا تھا۔ وہ بڑی مضطرب بھی ہو رہی تھی۔

”کتنی سہانی اور خواب ناک اور حسین رات ہے.....“ اچانک اس کے کانوں میں سرگوشی ابھری اور ایک ہاتھ نے اس کے مرمریں ہاتھ کو بڑی محبت سے تھام لیا۔

”تمہیں شاید یاد ہو کہ نہ یاد ہو..... میں ایک عورت ہونے کے ناتے نہیں بھول سکتی۔“ پونم کہنے لگی۔ ”جب ہم چین کی بندرگاہ جا رہے تھے۔ ایسی ہی رات تھی..... کیوں.....؟ بعض باتیں..... لمحات اور گھڑیاں ایسی ہوتی ہیں کہ لاکھ بھلانے کے باوجود بھی نہیں بھولتی ہیں..... وہ دل کے نہاں خانے پر نقش ہو کر رہ جاتی ہیں۔“

پونم جذباتی سی ہو کر سوچنے لگی..... وہ سفر کتنا حسین، یادگار اور سہانا تھا جب پتائی آثار قدیمہ کے سروے کے لئے گئے تھے تو اسے بھی ساتھ لے لیا تھا۔ جگن ناتھ اور شاستری بھی تھے، ان دنوں وہ شاستری سے بہت قریب ہو گئی تھی اور ایک جذباتی رشتہ جسے رفاقت نے جنم دیا تھا..... ان دنوں وہ ایک پر جوش، ادا العزم اور اس ٹیم کے مستعد کارکن تھے جو ماضی کے سر بستہ رازوں کو ان پاتال کی گہرائیوں سے نکالنے کا عزم اور ایک جذبہ لے کر یہ ٹیم لگی تھی۔ ہر ایک نے کس قدر بڑھ چڑھ کر غلوں نیت سے اس مہم میں حصہ لیا تھا جس سے کامیابی نے قدم چومے تھے۔

لیکن یہاں کیا ہوا تھا.....؟ جو کچھ ہوا وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ یہاں اس مہم کا ڈاکٹر نہ ہر ملا اور انتہائی تلخ اور اذیت ناک ہو کر رہ گیا تھا..... اس نے اپنے مشفق باپ اور ان کی چاہت کو کھو دیا تھا۔ اب وہ ٹھنڈی چھاؤں سے محروم ہو گئی تھی۔ وہ اس کی دنیا تھے۔ اس کا محبت بھرا خزانہ تھے..... باپ کے بغیر دنیا کتنی دیران اور غیر اہم معلوم ہوتی تھی۔ باپ اور بیٹی کے درمیان محبت کا جواؤٹ رشتہ ہوتا ہے وہ کسی اور رشتہ میں یہ بات نہیں ہوتی ہے۔ اس نا خوشگوار اور الم ناک واقعہ کی یاد نے اس کے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑا دی۔ اس کے سر پا میں ارتعاش سا ابھرا۔

پونم کے جسم میں جوار رعاش پیدا ہوا تھا اسے شاستری نے محسوس کر لیا تھا۔ اس نے کہا۔

”پونم.....! کیا سردی لگ رہی ہے.....؟ موسم تو سرد نہیں ہے۔“

”نیچے جو مجسمہ رکھا ہوا ہے اس کی موجودگی کے احساس نے مجھے پریشان اور خوف زدہ کر دیا

”معلوم نہیں..... اب انکل جگن ناتھ کیا کریں گے.....؟“ پونم نے لہروں پر سے نگاہ اٹھا کر شاستری کی طرف دیکھا جو اسے اپنی نظروں کی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ ”وہ بہت دگمی ہو گئے ہیں۔“ ”اصولاً انہیں ریٹائر ہو جانا چاہئے۔“ شاستری نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ کس لئے.....؟“ پونم حیرت سے بولی۔ ”وہ بڑے قابل آدمی ہیں۔“ ”اس لئے انہیں ریٹائر ہونا پڑے گا کہ اب وہ جوان نہیں رہے۔“ شاستری نے سرد مہری سے کہا۔ اب اس شخص کو باقی ماندہ زندگی گھر میں گزارنا چاہئے۔ کسی ادارے میں رہ کر اس کی مٹی پلید تو نہ کریں۔“

پونم کو اس کا لب و لہجہ اور گفتگو کا انداز بڑا زہرناک لگا۔ چند لمحوں کی اذیت ناک خاموشی کے بعد اس کی طرف دیکھے بغیر جی سے بولی۔

”اپنے محسن اور پاس کو اس انداز سے مخاطب کرتے ہوئے تمہیں ذرا برابر خجالت کا احساس نہیں ہو رہا ہے.....؟ تم یہ کیوں بھولتے ہو کہ وہ صرف تمہارے پاس ہی نہیں بلکہ محسن بھی ہیں..... کیا محسنوں کے ساتھ احسان فراموشی کرنا تمہیں اچھا لگتا ہے۔“

پونم نے کھری کھری سنا کر شاستری کی طبیعت صاف کر دی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ معا ایک شکستہ چیخ سنائی دی..... ایسے لگا جیسے کسی نے چیخنے والے کو اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخنے سے روک دیا ہو۔ یہ مردانہ چیخ تھی۔ جگن ناتھ کی چیخ لگتی تھی۔

”تم یہیں ٹھہرو۔“ شاستری نے اسے تاکید کی۔ ”میں دیکھ کر آتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے؟“ شاستری بجلی کی سی سرعت سے اس دروازے کی سمت کو نڈا بن کر لپک گیا جو دو کیمینوں کے درمیان واقع راہ داری میں کھلتا تھا۔

پونم نے لمحہ بھر توقف کیا..... پھر اس سے رہا نہیں گیا۔ کیوں کہ یہ چیخ انکل جگن ناتھ کی تھی اس لئے وہ اس سمت بے تحاشہ دوڑ پڑی..... اسے اس بات کا احساس ہوا تھا کہ ان دونوں کے سوا کسی اور نے یہ چیخ نہیں سنی تھی۔ کیوں کہ اس چیخ کو سن کر کوئی بھی باہر نہیں آیا تھا۔ البتہ اس نے ایک دروازہ کھٹکے پر ٹپکتے ہوئے پایا۔

پونم جب دروازے کے قریب پہنچی تو اندر سے ایک شخص بڑی سرعت سے باہر آیا تو وہ اس سے ٹکرائی۔

وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکی۔ وہ گرنے لگی تو اس نے ٹکرانے والے شخص کا بازو پکڑ لیا تو اس شخص نے اس کی نظروں کے سامنے ایک خوفناک خنجر لہرایا۔ اس کی تیز دھار اندھیرے میں چمکی تو وہ لرز گئی اور اس نے خوف زدہ ہو کر اس شخص کا بازو چھوڑ دیا اور ساتھ ہی لڑکھڑا کر قریب پڑی ہوئی

ایک کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کا سارا خون خشک ہو گیا تھا۔ وہ شخص فضا میں خنجر بلند کر کے پونم پر جھپٹا جیسے اسے قتل کر دے گا۔ عرشہ پر جو دراز قد شخص ٹہل رہا تھا وہ لپک کر آیا اور اس اجنبی حملہ آور کے پیٹ میں دو زبردست گھونے جڑ دیئے تو وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ فرش پر چاروں شانے چت ہو کر گر پڑا۔ لیکن وہ دوسرے ہی لمحے سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور دراز قد شخص سے سخت تم گھبرا گیا۔ دونوں لڑتے لڑتے عرشے کے وسط میں پہنچ گئے۔

اندھیرے کے باعث پونم کے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ کس کا پلہ بھاری تھا..... چند لمحوں کے بعد حملہ آور لڑکھڑاتا ہوا ریلنگ پر جا گرا..... پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ سمندر کی آغوش میں سما گیا۔

”کوئی شخص پانی میں گر گیا ہے۔“

ایک زوردار سی آواز سکوت کا سینہ چیرتی ہوئی فضا میں گونجی۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک طوفان ساپا ہو گیا۔ بہت سارے وہ لوگ جو رات جگا کر رہے تھے۔ رات کی رنگینی اور مختلف قسم کی تفریحات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ سب عرشے پر آ گئے۔ ہر کسی کو حیرت اور تجسس سا تھا کہ ایک آدمی پانی میں کیسے گر گیا.....؟ کیا کسی نے اسے سمندر میں پھینک دیا ہے.....؟ یا پھر وہ نشے کی حالت میں ریلنگ پر جھکا ہوا تھا اور آدھا جسم باہر نکالے جھانک رہا تھا۔ وہ سب ل کر ہڈیانی انداز سے چیخنے اور شور مچانے لگے تھے کہ ”ایک آدمی سمندر میں گر گیا ہے۔“ پھر کان کے پردے پھاڑنے والا بھونڈا سا سارن بجنے لگا۔

پونم کا محسن اور نجات دہندہ اپنا جیکٹ ٹھیک کرتے ہوئے آہستہ آہستہ اس کے پاس آیا۔ دروازے سے باہر آنے والی روشنی میں پونم نے پہلی بار اس کا چہرہ دیکھا اور اس کی نگاہیں ناقدانہ انداز سے جائزہ لے رہی تھیں۔

وہ نہ تو جوان تھا اور نہ ہی درمیانہ عمر کا تھا۔ وہ ایک متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے چہرے سے اس کے تجربے اور بردباری ظاہر ہوتی تھی۔ اس میں جو وقار تھا اور حکمت تھی اس نے پونم کو مرعوب سا بھی کیا تھا۔

وہ دشمن کون تھا جو آپ کی جان لینے کے درپے تھا؟“ اس نے پونم کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”میں نہیں جانتی وہ حملہ آور کون تھا.....؟“ پونم نے جواب دیا اور پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”معاف کیجیے۔ میں شاستری کو دیکھ لوں..... معلوم نہیں وہ کہاں ہے؟“

پونم کو ایک دم سے شاستری کا خیال آ گیا تھا کہیں وہ حملہ آور کا نشانہ تو نہیں بنا..... اس لئے وہ بے تحاشہ دوڑتی ہوئی کیمینوں کی طرف بڑھی۔ لیکن ناتھ کا چٹا کیمین تھا اور اس کا دروازہ تقریباً کھلا ہوا سا تھا۔ دبلیز پر شاستری گھری سائنا ہوا تھا۔ جب وہ اس کے پاس پہنچی تو اس نے شاستری کو کراہتا ہوا پایا اور وہ اٹھ کر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

پونم نے اسے سہارا دے کر بیٹھا دیا۔ شاستری نے اسے نیم وا آنکھوں سے دیکھا اور ہاتھ سے کیمین کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن ناتھ بھی اسی حالت میں الجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام رکھا تھا۔

”شاستری.....! شاستری کیا ہوا.....؟“ پونم نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ”تم ٹھیک تو ہونا.....؟“ انکل بھی کیسی حالت میں بڑے ہوئے ہیں۔“

”پہلے تو حملہ آور نے انکل کے سر پر حملہ کیا تھا۔“ شاستری نے لیکن ناتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا تو اس کے لہجے میں نقاہت تھی۔ ”میں نے انہیں بچانے کی کوشش کی تو اس نے مجھ پر حملہ کر دیا۔“

لیکن ناتھ کسی نہ کسی طرح کوشش کر کے کھڑے ہو گئے..... آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جہاز میں نصب الماری سے بوتل نکالی اور شاستری سے پوچھا۔ ”کیا تم داسکی پیٹا پسند کرو گے.....؟“ اس سے کم زوری دور ہو جائے گی۔“

”آپ جانتے ہیں کہ میں شراب نہیں پیتا۔“ اس نے نفی میں سر ہلادیا۔

”کیا میں کوئی مدد کر سکتا ہوں.....؟“

پونم کو اپنی پشت پر آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہی نجات دہندہ کھڑا ہوا تھا۔

”انہوں نے اس حملہ آور سے میری جان بچائی تھی۔“ پونم نے شاستری سے کہا۔ ”اگر یہ بروقت نہ آتے تو میں اس کے ہاتھوں قتل ہو جاتی..... اس کے ہاتھ میں ایک خوفناک خنجر تھا۔“ اتنا کہہ کر وہ کانپ سی گئی۔

”میرا نام ونود کھنہ ہے۔“ اجنبی نے اپنا تعارف کرایا۔

دونوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا..... لیکن ناتھ بستر پر ان سے بے نیاز بیٹھے ہوئے شراب

پئے جا رہے تھے۔

”سرا..... کوئی چیز غائب تو نہیں ہوئی ہے؟“ شاستری نے لیکن ناتھ سے سوال کیا۔

”غائب.....؟“ لیکن ناتھ نے اسے احمقوں کی طرح دیکھا۔ ”یہاں ایسی کوئی قیمتی شے

ہے نہیں ہے جو غائب ہو جائے..... البتہ میرا بڑا تھا..... اس میں خاصی رقم رکھی ہوئی ہے۔“ لیکن

ناتھ نے توقف کر کے کھٹکے کے نیچے سے بڑا انکال کر رقم گئی۔ پھر اس نے کہا۔ ”رقم تو پوری موجود ہے۔ اس میں ایک روپیہ بھی کم نہیں ہے۔“

”اگر رقم چوری نہیں ہوئی تو پھر وہ کیا چرا کر لے گیا ہوگا.....؟“ ونو کھنہ نے کہا۔

شاستری نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اس نے سوچا..... کہیں نوادرات کی فہرست تو چوری نہیں ہوگئی.....؟ پھر اسے نوادرات اور مجسمہ کا خیال آیا۔ انہیں نہ پا کر چور اس کے کیمین میں بھی چوری کے لئے گھس سکتا تھا۔

”یہ محض کوئی اتفاقہ امر نہیں ہو سکتا.....“ پونم نے فکر مندی کے لہجے میں ونود کھنہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ کچھ جانتے ہیں؟“

”مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ ونود کھنہ مسکرا دیا۔ ”آپ کی ٹیم کی شہرت دور دور تک پھیل چکی ہے..... البتہ پروفیسر لیکن ناتھ کوئی قیمتی شے اپنے کیمین میں رکھی نہیں ہوگی؟“

”بالکل بھی نہیں.....“ شاستری نے صاف جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ ”نوادرات جہاز کے اسٹور روم میں کڑے پہرے میں رکھی ہوئی ہیں۔“

”کیا آپ لوگوں نے کوئی پروگرام بنایا ہوا ہے.....؟“ ونود کھنہ نے پوچھا۔

”ہم ان تمام نوادرات کو قیمتی لے جا رہے ہیں؟“ شاستری نے جواب دیا۔

”کیا انہیں وہاں لے جا کر فروخت کر دیں گے.....؟“ ونود کھنہ نے سوال کیا۔

”فروخت کرنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔“ شاستری بولا۔ ”مسٹر پرکاش مہرہ ممبئی میں ان کی نمائش کریں گے۔“

”آپ کہاں قیام کریں گے.....؟ کیا وہاں کوئی ذاتی فلیٹ وغیرہ ہے؟“ ونود کھنہ نے دوسرا سوال کر دیا۔

پونم نے شاستری کے بشرے سے محسوس کیا کہ وہ ونود کھنہ سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے..... اور یہ ایک طرح سے ٹھیک بھی تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ شاستری اپنے کیمین میں جا کر چیزوں کی جانچ پڑتال کرنا چاہتا تھا۔ پونم نے شاستری کی اس مشکل کو حل کرنے کے لئے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تو وہ دونوں اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔

”جی نہیں..... کوئی ذاتی فلیٹ یا سکونت نہیں ہے۔“ شاستری نے جواب دیا۔ ”میں نے ہالی

ڈے ان میں بک کرائے ہوئے ہیں..... میں اور پونم اسی ہوٹل میں قیام کریں گے۔“

”لیکن وہ جگہ اچھی ہے نہ علاقہ۔“ ونود کھنہ بولا۔

پونم نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا کہ شاستری اس کی بات کا کیا جواب دیتا ہے۔ وہ اس کا جواب

سننا چاہتی تھی۔ شاستری کے چہرے پر ناگواری اور تنہائی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک انجی کی دخل اندازی جیسے زہر لگی تھی۔ اس نے قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”دبئی شہر کا کوئی علاقہ اور جگہ اچھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ پارک کے قریب ہے۔ اس کے برابر میوزیم بھی ہے۔۔۔۔۔ اور پھر اس کے سامنے ایک وسیع و عریض ہے جس میں نمائش کے انتظامات کئے جائیں۔ اس لحاظ سے اس سے اچھی، مناسب اور موزوں جگہ کوئی اور نہیں ہے۔۔۔۔۔ اور وہ جگہ چوں کہ شہر کے وسط میں ہے۔ اس لئے لوگ آسانی سے نمائش دیکھنے پہنچیں گے۔“

”میری ایک بہت بڑی کوشی ہے۔“ ونود کھنے نے کہا۔ ”اگر میں آپ کو اس میں قیام کرنے کی پیشکش کروں تو کوئی خیال تو نہیں کریں گے۔۔۔۔۔ ایک تو وہ شہر کے ہنگاموں سے دور اور ایک پرسکون اور اعلیٰ رہائشی علاقے میں واقع ہے۔ اسی طرح آپ ہوٹل کے اخراجات سے بچ جائیں گے۔“

زینہ طے کرتے کرتے ان کے قدم یک لخت رک گئے۔۔۔۔۔ پونم نے شاستری کے چہرے کے تاثرات سے محسوس کیا کہ اسے اس پیشکش سے ایک دھچکا سا لگا ہے۔ اس کا مزاج خالص مدراسی تھا۔۔۔۔۔ وہ اس قسم کی بے تکلفی کو پسند نہیں کرتا تھا اور پھر اس بے تکلفی کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ اس سے ونود کا آخر تعلق بھی کیا تھا۔ اور پھر اس دعوت کا کوئی معقول جواز ہوتا تو سوچا بھی جاسکتا تھا۔ صرف تھوڑی دیر کی شناسائی تھی۔۔۔۔۔ اور وہ محسن بھی تھا۔

پونم کے دل کے کسی کونے میں شک و شبہ نے کسی زہریلے سانپ کی طرح اپنا پھن لہرایا۔ کہیں ونود کھنے اس کے حسن و شباب اور غیر معمولی کشش سے متاثر ہو کر اس کے قرب کے لئے تو پیش کش نہیں کر رہا ہے۔۔۔۔۔؟ پھر اس نے اپنے اس خیال کی نفی کر دی۔۔۔۔۔ کیوں کہ ونود کھنے اتنا خوب صورت، وجیہ اور دراز قد اور سحر انگیز شخصیت کا مالک تھا اور ایک امیر کبیر شخص تھا۔۔۔۔۔ جانے نو جوان اور حسین لڑکیاں اس کی شیدائی ہوں۔

ان تمام باتوں کے باوجود پونم کے دل میں ایک ان جانی خواہش نے جنم لیا کیوں نہ ونود کھنے کی اس فراخ دلانہ پیشکش کو قبول کر لیا جائے۔

وہ جانتی تھی کہ یہ ایک عجیب سی بات ہوگی۔۔۔۔۔ لیکن ونود کھنے اس سے جو ایک سحر سا محسوس کیا تھا وہ اسے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔

”آپ کی اس پر خلوص پیشکش کا بہت بہت شکریہ۔۔۔۔۔ لیکن میں معافی چاہتا ہوں کہ کسی وجہ سے یہ پیشکش قبول نہیں کر سکتا۔“ شاستری نے بڑی سنجیدگی سے اس کی پیشکش مسترد کر دی۔

”آپ کی اس عنایت کا بہت بہت شکریہ۔“ پونم نے فوراً بات بنائی تھی۔ کیوں کہ شاستری کے لہجے میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ روکھا پن بھی تھا۔

”دراصل بات کچھ ایسی ہے اور پھر آپ کا کام ہی کچھ ایسا ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہا ہے۔“ ونود کھنے نے کہا۔ ”میرے دل میں ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ اپنا زیادہ سے زیادہ وقت آرٹ کے لئے وقف کر دوں۔۔۔۔۔ آرٹ بچپن سے میری کمزوری رہا ہے۔“

”یہ علم آثار قدیمہ ہے۔۔۔۔۔ اس کا آرٹ سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ہی یہ تفریح طبع کا سامان ہے۔ یہ سائنس ہے۔“ شاستری نے تراخ سے جواب دیا۔

”مجھے آپ کی یہ بات سن کر بڑی حیرت ہو رہی ہے۔“ ونود کھنے نے اس کے لب و لہجے کی تہی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ مجھے اس بات کی وضاحت کریں گے کہ۔۔۔۔۔ آپ نے جو کھدائی سے نوادرات برآمد کئے ہیں ان کا مقام آرٹ میں ہے یا سائنس میں۔۔۔۔۔؟ دونوں میں۔۔۔۔۔؟ اگر آپ میرے ساتھ چلیں تو مجھے آپ سے بڑی محبت ملے گی۔“

”میں آپ کی مدد ضرور کرتا اور تعاون بھی مسٹر ونود کھنے!۔۔۔۔۔ بات یہ ہے کہ ہم نے جو پروگرام بنایا ہوا ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے سے بھی قاصر ہیں اور نہ ہی ہمیں اس کی اجازت ہے۔“ شاستری نے معذرت کی۔

”ونود کھنے نے مدد طلب نظروں سے پونم کی طرف دیکھا۔

لیکن پونم نے اس سے لاطیفی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ کیوں کہ وہ شاستری سے ہٹ کر کوئی فیصلہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔۔۔۔۔ حالاں کہ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ونود کھنے کی بات مان لے۔

”اچھا چلیں۔۔۔۔۔ چل کر کچھ پی لیتے ہیں۔۔۔۔۔ وہاں اس معاملے پر غور اور تبادلہ خیال کریں گے۔“ ونود کھنے اصرار کرنے لگا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ بڑی اچھی بات ہوگی۔“ پونم نے اس خیال سے فوراً ہی تائید کر دی کہ کہیں شاستری انکار نہ کر بیٹھے۔

شاستری نے اسے تیز نظروں سے دیکھا اور تیز لہجے میں بولا۔

”اس میں غور کرنے کی کون سی بات ہے۔۔۔۔۔ کیا یہ وقت ضائع کرنے والی بات نہ ہوئی؟“

”لیکن کچھ دیر اکٹھے بیٹھ کر پی لیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔“ پونم نے کہا۔

”ہمیں کچھ ضروری کام بھی تو کرنے ہیں۔“ شاستری نے بہانہ تراشا۔ ”اس لئے میں ماتھ دینے سے معذرت چاہوں گا۔“

س سے متاثر ہوئے جا رہے تھے۔ اس کے برتاؤ اور باتوں سے اس کی امارت ظاہر نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی اس نے کبھی اس کا اظہار کیا تھا۔

”پونم!..... کیا تم نے اس بات پر غور کیا.....؟“ شاستری نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
 ”کس بات پر.....؟“ پونم نے اپنی لابی پلیکیں جھپکائیں۔

”نیت میں فتور.....؟“ شاستری نے اس جملے پر بڑا زور دیا تھا..... شاستری کی کسی بات کا پلہم نے کوئی جواب نہیں دیا تھا جب کہ اس کے پاس جواب تھا۔ لیکن ایک عورت ہونے کے ناتے وہ شاستری سے کہتے ہوئے جھجک رہی تھی۔ حالاں کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف تھے۔ کوئی حجاب نہیں تھا۔ اس نے شاستری کو کئی مرتبہ من مانیوں کرنے دیا تھا لیکن حد سے تجاوز اور ناشائستہ حرکت کرنے نہیں دیا اور نہ ہی شاستری نے ایسی کوئی حرکت کی تھی جو معیوب ہو۔ دوستی اور محبت میں اتنی اجازت ہوتی ہے۔ آج ک محبت کل کی محبت کی طرح نہیں رہی تھی۔ تنہائی میں موقع ملا فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ کوئی حد سے نہیں بڑھتا تھا۔ لیکن بہت سے رومانی جوڑے حد سے تجاوز کر جاتے تھے۔

پونم کے ذہن میں کوئی وضاحت تھی بھی تو وہ اتنی ذاتی نوعیت کی تھی اس پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی..... وہ حقیقت کو تسلیم کرنا نہیں چاہتی تھی..... جہاز جوں جوں ممبئی شہر سے قریب ہوتا جا رہا تھا وہ ایک ہیجان اور ان جانی تشویش میں مبتلا ہوتی جا رہی تھی..... اس نے بار بار نو دھکنے کی نظروں

شاستری نے اپنے کیمبن میں جا کر اپنی چیزوں کو دیکھا۔ یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ وہ سب چوں کہ جوں اپنی جگہ موجود ہیں۔ کسی چیز کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا۔ وہ پراسرار شخص اس کے کیمبن میں نہیں آیا تھا۔ جگن ناتھ کے کیمبن میں کس نیت سے گیا کچھ کچھ میں نہیں آیا۔ پھر وہ کیمبن سے نکل کر ریٹورنٹ کی طرف بڑھ گیا۔ کیوں کہ اطمینان ہونے کے بعد اب اسے کچھ کھانے کی خواہش ہونے لگی تھی۔

سفر کے بقیہ دنوں میں ونود کھنہ کی یہ کوشش جاری رہی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح شاستری کا دل جیت لے۔ اس کا انداز بڑا دوستانہ تھا اور وہ بڑے خلوص اور جذبے سے شاستری سے ملتا..... کسی بات پر کبھی شاستری قدرے تلخی سے جواب دیتا..... لہجے میں ترش روئی ہوتی بھی ونود کھنہ اس بات کا قطعی برائ نہیں مناتا تھا۔ وہ ایک صاف دل اور نرم خوشمخس تھا۔

دونو دھند ان کے لئے نہ صرف عجیب و غریب بلکہ ایک طرح سے پراسرار اور مشکوک سا مفعول بن گیا تھا۔

شاستری اور پونم نے لاکھ سوچا..... ایک دوسرے سے تبادلہ خیال بھی کیا..... کئی باتوں اور پہلوؤں پر غور بھی کیا لیکن وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر رہے کہ..... وندو دکنہ آ کر انہیں اہمیت کیوں اور کس لئے دے رہا ہے.....؟ اس کی تہہ میں کون سا جذبہ کارفرما ہے؟

وہ دھکنہ اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے اور جس کیمین میں ٹھہرا تھا وہ اول درجے کا وہی آئی پی تھا..... اس لئے کہ وہ ایک دولت مند شخص تھا۔ اس کیمین کا کرایہ ہوائی جہاز کے کرائے سے ڈیڑھ گنا زیادہ تھا۔ وہ چاہتا تو ہوائی جہاز سے ممبئی جاسکتا تھا۔ ہوائی جہاز کے سفر میں صرف تین گھنٹے لگتے تھے۔ جب کہ بحری جہاز میں چار دن..... لیکن اس نے بحری جہاز کو ترجیح دی تھی۔

وہ لوگ ساز و سامان کے باعث بحری جہاز سے سفر کر رہے تھے۔۔۔۔۔ ان کے خیال میں ایک امیر کبیر آدمی کا بحری جہاز سے سفر کرنا شوق ہی کہا جاسکتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن ایسے جنون نہیں ہونا چاہئے تھا۔ جنون کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ لیکن اس امیر آدمی کے نزدیک شاید کوئی حد نہ تھی۔ انہوں نے اشارے کنایے میں بحری جہاز سے سفر کی وجہ معلوم نہیں کی۔ یہ معیوب اور خلاف تہذیب بات تھی۔

وہ دولت مند ہوتے ہوئے بھی اس میں اتنی انکساری اور خلوص اور دوستانہ انداز تھا کہ وہ

غواب ناک ماحول دیکھ کر انہیں ایسا لگا جیسے وہ واقعی سو رگ ہیں آگئے ہوں..... پونم کا کمرابہت بڑا اور کشادہ تو نہ تھا لیکن اس کا حسن، دلکشی اس کے درود پوار سے ٹپک رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی رنگین پستانا دیکھ رہی ہو..... اور جیسے وہ بیسوں سے اس کی متلاشی تھی..... نرم و گداز بستر دیکھ کر بے ساختہ اس کا دل سونے کو چاہا..... چوں کہ مشروط بات کے لئے نیچے جانا تھا اس لئے وہ بستر پر واز نہ ہو سکی۔

نشست گاہ میں پہنچ کر جو اس نے اس کی آرائش و زیبائش دیکھی تو ششدر ہو کر رہ گئی۔ ایسی سجاوٹ کا تصور اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ میز پر بہترین، عمدہ چکن سوپ جس کا ذائقہ اور لذت اس نے آج تک کبھی کسی سوپ میں محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے خوب سیر ہو کر سوپ پیا۔ پھر وہ سوپ کا پیالہ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر وہ کمرے میں محکوم پھر کر سجاوٹ کی چیزیں قریب سے دیکھنے لگی..... اس کے قدم ایک قیمتی شوکیس کے سامنے رک گئے۔ جس میں تمام زیورات رکھے ہوئے تھے۔ جن پر بڑی نقاست، نزاکت اور مہارت سے کام کیا ہوا تھا..... ان سے ان کے مالک کی نقیص اور عمدہ ذوق کا اظہار ہوتا تھا۔ موجودہ دور میں ایسے زیورات کسی محل ہی میں ہو سکتے تھے۔

”کیا آپ کو پسند آئے؟“

معا سے اپنی پشت پر وودھنے کی آواز سنائی دی۔ وہ نہ جانے کب سے کھڑا ہوا اس کی حرکات و سکنات کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ان زیورات کو دیکھنے میں اس قدر محو تھی کہ وہ وودھنے کی آہٹ تک سنائی نہیں دی تھی۔

”بہت ہی خوب صورت اور نادر قسم کے ہیں۔“ پونم نے تعریفی لہجے میں کہا۔

وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ جیگا رام کے نوادرات سے کہیں خوب صورت اور قیمتی معلوم دیتے ہیں..... میں نے سنے میں بھی ایسے زیورات نہیں دیکھے۔ آپ کے انتخاب اور ذوق کی وداد نہ دینا ہر ذوقی ہوگی۔

وودھنے نے شوکیس کا ڈھکن اٹھا کر ایک چھوٹا لاکٹ نکالا جس کی آب و تاب نظروں کو خیرہ کر رہی تھی۔ جب اس نے پونم کی مرمریں صراحی دار گردن سے لگایا تو اس کا دل اتنے زور سے دھڑکا کہ شاید اس کی دھڑکن شاید وودھنے نے بھی سن لی ہوگی۔

”میں نے اسے کسی حسین اور نازک خاتون کے لئے سنبھال کر رکھا تھا۔“

پونم نے اس کے ہاتھ سے لاکٹ لے کر دیکھا۔ زیور عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہوتی ہے۔ وہ زیر لب بولی۔

میں اپنا چہرہ اور سراپا جکڑا پایا تھا۔ گو کہ اس میں کوئی میل نہیں تھا۔ چہرہ جودل کا آئینہ ہوتا ہے۔ وہ صاف و شفاف تھا..... اس کے باوجود وہ وودھنے سے نظریں چراتی رہی تھی..... وہ ان دونوں میں سے ایسے متضاد جذبوں میں جکڑی گئی تھی کہ جن سے وہ اب تک ناآشنائی تھی۔ جب جہاز ممبئی کے ساحل پر لنگر انداز ہوا تو حالات نے شاستری کو وودھنے کے آگے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

اس لئے کہ وہ ان ساری کی ساری بے بدل اشیاء کو تنہا ساحل پر اترا دینا نہیں سکتا تھا..... کیوں کہ اس کے علاوہ ان کی وہ فہرست بھی غائب تھی جس سے ملکی قوانین پوری ہو سکتی تھی۔ اس فہرست کے بغیر کشم کلیرنس نہیں دے سکتا تھا۔

شہر میں ایک سیاسی حکومت مخالف پارٹی نے کال دی تو جلاؤ، گھیراؤ اور ٹرانسپورٹ کا سارا نظام معطل ہو کر رہ گیا۔ پرکاش مہرہ غصے سے بھن بھناتا پھر رہا تھا۔ پولیس نے ان حالات میں اس کی ہر قسم کی مدد سے معذرت کر لی تھی اور کسی بات کی ضمانت دینے کو تیار نہ تھی..... ایسے میں وودھنے ہی ان کے کام آیا..... اس کی دولت اور اثر و رسوخ نے سارے کام باآسانی بڑی سہولت اور حفاظت سے کروادے، کشم نے جانچ پڑتال کئے بغیر سارا سامان کلیر کر دیا تھا..... حالاں کہ پرکاش مہرہ بھی بڑا بااثر، طاقت ور تھا۔ لیکن آج اس کی گھن گرج اور اثر و رسوخ کوئی کام نہ آ سکا تھا۔ وودھنے نے جس معقول طریقے سے دوستوں کی مدد کی تھی وہ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ پھر اس نے پیشکش دہرائی تو شاستری کو اس کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس لئے بھی کہ جس ہوٹل میں انہوں نے کمرے بک کئے ہوئے تھے وہ سب سے شورش برده علاقہ تھا اور مفادات کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ پونم نے اس بات سے دل میں خوش تھی کہ بالآخر شاستری لے ہار مان لی۔

وودھنے نے اپنے مکان کی جتنی تعریف کی وہ اس سے کہیں زیادہ اچھا نکلا۔

سر سبز درختوں میں گھرا ہوا..... کشادہ پرسکون اور پرشکوہ..... آرائش و زیبائش..... راحت آسائش کے لوازمات شاہانہ تھے..... اندر وہ کسی محل سے کم دکھائی نہ دیتا تھا..... پونم لمحے کے لئے سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ لوگ اپنے آرام و سکون کے لئے پیسہ کتنا بھاتے ہیں..... اس دیش میں جو غربت و افلاس ہے کتنے لوگ ایسے ہیں کہ انہیں ایک چٹائی اور ٹھٹھ تک نصیب نہیں..... وہ نکلے فرش اور زمین کو بستر بناتے ہیں۔

گرد و پیش میں جنگل جیسا سناٹا تھا۔ پونم اور شاستری کو یہ جگہ آئیڈیل لگی..... وہاں ایک سنجیدہ اور پروقار مزاج کے دیرینہ ملازم جگ دیپ سنگھ نے انہیں ان کے کمرے دکھائے۔ وہاں کا

”اوہ! کتنا خوب صورت لاکٹ ہے.....؟ کسی ماہر ستار نے بتایا ہوگا؟“

”میں یہ چاہتا ہوں کہ اسے آپ کی نذر کر دوں.....“ ونود کھنے نے سرگوشی کی۔

پونم جلدی سے دو قدم ہٹ کر لاکٹ کو یوں دیکھنے لگی جیسے کوئی زہریلا ناگ ہوا سے ڈس لینا

چاہتا ہو۔

ونود کھنے کی سرگوشی نے اسے چونکا دیا تھا۔ ایک طرح سے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے کانوں

میں گرم گرم سیسہ انڈیل دیا گیا ہو..... اور پھر ایک انجانا سا خیال بڑی تیزی سے ذہن میں کودا

بن کر لپکا..... یہ سب کچھ بڑی تیزی سے ہو رہا ہے..... بڑی شدت سے.....

”لیکن یہ تو بڑا نایاب، اصول اور قیمتی لاکٹ ہے۔“ وہ بہ مشکل کہہ پائی۔ اس کی آواز میں

ہلکا سا ارتعاش صاف نمایاں تھا۔

”یہ میرے لئے بڑی مسرت کی بات ہوگی کہ آپ کے گلے کی زینت بن جائے۔ اگر آپ

نے اسے قبول نہ کیا تو میرے نزدیک اس کی کوئی وقعت نہیں رہے گی.....“

ونود کھنے کی ٹھہری ہوئی آواز اسے کانوں میں رس گھولتی اور کانوں سے دل میں اترتی محسوس

ہوئی اس کی آواز میں ایک ایسا عجیب سا محر تھا جس نے اسے جکڑ لیا تھا۔

اس کے پر تعین انداز نے پونم کی خود اعتمادی کو حشر لڑ کر دیا..... وہ کتنا بھرپور انسان اور کسی

ادوار کی طرح نظر آیا تھا اور ایک شاستری..... کشن پر پاؤں پھیلانے بیٹھا ہوا شاستری اسے دور

بہت دور ہٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا.....

پونم نے ونود کھنے سے نظر ہچا کر شاستری کو کن اکھیوں سے مدد طلب نظروں سے دیکھا.....

لیکن اس کا پیارا شاستری جو اسے نظر انداز کئے ہوئے کسی خیال میں غرق بھلا بیٹھا تھا۔

”آپ اسے رکھ لیں گی نا.....؟“ ونود کھنے نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس میں حکم تھا اور نہ ہی

درخواست.....

”اسے قبول نہ کرنا..... آپ کے پر خلوص پیش کش کی ناقدری ہوگی۔“

پونم نے بے جان لہجے میں کہا..... اس نے سوچا۔ وہ مہمان نہ ہوتی تو اسے قبول نہ کرتی۔

ونود کھنے نے بڑی نرمی سے اس کے نازک، سڈول اور خوب صورت ہاتھ کو تمام کر اس کی

پشت پر بوسہ دیا۔

”آپ نے اسے قبول کر کے مجھے جو عزت اور اعزاز بخشا ہے میں اسے کبھی نہ بھول سکوں

گا۔“ ونود کھنے نے کہا۔

ونود کھنے نے وہ لاکٹ اس کی سرمریں صراحی دار گردن میں پھنسا دیا۔

پونم خواب کی سی حالت میں چلتی ہوئی بڑے صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔ اسے یہ سب سندر پینا جیسا لگا تھا کہ اس قدر قیمتی، نایاب اور اصول لاکٹ اس کی گردن کی زینت بن جائے گا۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔

شاستری خالی گنگ تھامے اسے گھور رہا تھا۔ ونود کھنے نے اس کے قریب آ کر اس کے ہاتھ

سنگ لے لیا..... اور پھر اسے دوبارہ بھرتے ہوئے فاتحانہ مسکراہٹ سے پونم کی طرف دیکھا۔

اس مسکراہٹ میں شاستری کے لئے تسخیر تھا۔ پونم کو اس کی یہ حرکت بڑی ناگوار لگی۔ وہ ایسی باتوں

کو بالکل بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

”مجھے ایک جام تجویز کرنے کی اجازت ہے.....“ ونود کھنے نے شکستگی سے کہا۔ ”نمائش کی

شاعر کا میانی کا جام.....“

اتنا کہہ کر ونود کھنے نے دو خالی گنگ میں بیئر انڈیل دی تو ان دونوں نے اپنے اپنے گنگ

اٹھائے۔

پھر ان تینوں نے ایک ساتھ پر تکلف ڈن لیا۔ شاستری بے دلی سے نکھار رہا تھا لیکن پونم کے

اصرار پر اس نے پھر شکم سیر ہو کر کھایا۔ پھر وہ فراغت پا کر سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں

چلے گئے۔

اس آرام اور ریٹیم کا سا گداز لئے بستر نے پونم کے سارے بدن میں ایک لطیف سی فرحت

بھردی تھی۔ بستر پر دراز ہو کر پہلے تو اس نے ان نوادرات کے بارے میں سوچا جو ایک خوب

صورت الماری میں سجے ہوئے تھے، یہ نوادرات سینکڑوں برس قدیم زمانہ کے تھے۔ اس کا اندازہ

ان کی ساخت سے ہوتا تھا۔ کاریگری اور مہارت جیسے چی چی کر کہہ رہی تھی ہم سینکڑوں برس پہلے

کے فیشن کے مطابق بنائے گئے ہیں..... اور یہ جڑاؤ لاکٹ جس میں ننھے ننھے ہیرے جڑے تھے

ان کی آب و تاب برقرار تھی..... کہیں ونود کھنے نے اسے قریب لانے کے لئے چارہ تو نہیں

ڈالا.....؟ اگر اس کے عوض ونود کھنے نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی وہ اس کی یہ آرزو پوری ہونے

دے گی اور یہ لاکٹ اسے واپس کر دے گی۔ شاستری کو لے کر یہاں سے چلی جائے گی۔

ایک سوال جو اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا کہ..... ایسے قدیم نوادرات اس کے پاس کہاں

سے کیسے آئے.....! یہ ہزاروں کے نہیں..... لاکھوں کے نہیں..... بلکہ کروڑوں کی مالیت کے

ہیں..... کیا یہ ارب پتی ہے.....؟ پونم یہ سب کچھ سوچتی ہوئی ایک دم سے چونک پڑی..... کیا ونود

کھنے اس دور اور اس دھرتی کا پاسی معلوم نہیں ہوتا ہے.....؟ ایسا لگتا ہے کہ صدیوں قبل جن راج

کماروں اور مہاراجاؤں کی قصہ کہانیاں سنی تھیں وہ ان سے معلوم ہوتا تھا..... کیوں کہ ایسی قامت و

چاہت، وقار اور خوب صورتی تمام اور آج کے دور کے کسی مرد میں دکھائی نہیں دیتی تھی..... اس پر نیند کی غودگی طاری ہونے لگی۔ اس نے ایسا محسوس کیا کہ نیند اور نو دھنہ اسے اپنی آنکھوں میں لے رہے ہیں۔ پھر اس نے چہرے پر گرم گرم سانس اور ہونٹوں پر پیشی محسوس کی تو اس نے ایک جھٹکا دے کر آنکھیں کھول دیں۔ یہ اس کا واہمہ تھا..... ایک لمحاتی پہنا تھا۔ اس کے پرانگندہ احساسات نے اسے شک میں ڈال دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

پونم اور شاستری اپنے اپنے کام کو نٹانے لگے..... پرکاش مہرہ نے رام جی پارک میں اس سے متصل میدان میں ایک لمبا چوڑا پنڈال لگا لیا تھا جس پر بلدیہ نے سخت اعتراضات کئے تھے..... پرکاش مہرہ کوئی عادی نہیں تھا۔ خاندانی تھا۔ مہرہ ٹیلی پورے ملک میں عزت و احترام سے دیکھی جاتی تھی وہ اس خاندان میں سب سے بڑا اور اہم فرد تھا۔ پرکاش مہرہ کے سامنے بلدیہ کیا بچتی تھی۔

اس نے نہ صرف اپنے آدمیوں بلکہ زیر اثر میڈیا کے ذریعے یہ افواہ پھیلا دی تھی کہ اگر اسے نمائش کی اجازت نہ دی گئی تو امریکہ اور یورپ جا کر ان کی نمائش کرے گا جس سے وہ لاکھوں ڈالر اور پونڈ کمائے گا..... وہاں وہ کہہ دے گا کہ وہ ہندوستان کی نہیں بلکہ سری لنکا کی نمائندگی کر رہا ہے۔ وہاں اس کی جو پذیرائی ہوگی اس کا ہندوستانی حکومت سوچ بھی نہیں سکتی ہے۔ اس طرح ہندوستان کے لاکھوں لوگ ان نوادرات کی نمائش سے محروم رہیں گے۔ پھر وہ تمام نوادرات برٹش میوزیم کو فروخت کر دے گا۔

اس کا یہ نفسیاتی حربہ کارگر ثابت ہوا۔ میڈیا نے تو ایک طوفان کھڑا کر دیا تو عوام کا غصہ اور جوش و خروش بڑھ گیا۔ حکومت نے اس دباؤ کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اس طرح خوب پبلیٹی بھی ہو گئی۔

شاستری نمائش کے انتظامات میں بڑی سرگرمی سے لگ گیا۔ اس نے نوادرات کو صندوق سے نکالنے کی ذمہ داری لے لی۔

پرکاش مہرہ نے نمائش کا بڑے سلیقے، ترتیب اور عمدت اور شاعرانہ طریقے سے اہتمام کیا تھا..... تین دن تک اس نے نہ صرف خود کام کی نگرانی کی اپنا زیادہ تر وقت صرف کیا..... پنڈال کے اندر اس نے سادھی کا سامان احوال بنانے کی کوشش کی تھی نا کہ تماثیل زیادہ متاثر اور مرعوب ہوں۔ بڑے بڑے پوسٹروں پر تنکا رام اور اس کے خاندان کے حالات کے علاوہ نوادرات کے کوائف بھی درج کئے گئے تھے۔ ساری چیزیں اس نے بڑی مناسب اور مخصوص جگہ پر رکھی

تھیں۔ ٹھیک وسط میں رنجیت کمار کے مجسمے کو ایک تابوت میں رکھا ہوا تھا۔

یہ تابوت اشارہ تھا..... اس پر ڈھکن تھا۔ اس لئے کہ یہ مجسمہ خالص سونے کا تھا..... تنکا رام کی کہانی پوسٹروں میں اس طرح بیان کی گئی تھی کہ وہ اور دلشان..... مہاراجا واسیو کے جڑواں بیٹے تھے۔ جب ان دونوں نے نوجوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تو وہ مختلف کردار کے مالک تھے۔ تنکا رام سچائی اور ابدیت کا متلاشی تھا اور ایک سادھو کی سی زندگی گزار رہا تھا..... اس کے برعکس دلشان دنیاوی لذتوں کا قائل تھا اور جسمانی لذت کو متاع حیات سمجھتا تھا..... جب اسے کسی لڑکی کی بلوغت کی خبر ملی تو اس لڑکی کی شامت آجاتی تھی اور اس کی عزت محفوظ نہیں رہتی تھی۔ وہ داغدار ہو جاتی تھی..... جب کسی شادی شدہ عورت کے حسن و شباب کی تعریف سنتا تو وہ اسے بستر کی زینت بنائے بغیر چمن سے نہیں بیٹھتا تھا۔

تنکا رام کو رعایا میں ایک مقام حاصل تھا وہ اس پر جان چھڑکتی تھی اور اس کی ایک دیوتا کی طرح پوجا کی جاتی تھی۔

دلشان کو بھائی کی عزت، اس کے اعلیٰ مقام اور اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے حسد ہونے لگا۔ حسد کی آگ نے اس کا سکون اور سارا چمن غارت کر دیا تھا۔ لوگ اس سے نفرت کرنے لگے تھے۔ اسے ایک خون آشام بھیڑیا کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ امر اس کے لئے روح فرسا اور اذیت ناک تھا۔ اس نے اپنے سازشی مشیروں اور ہم منصب ساتھیوں کی مدد سے اس کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دی۔ جب اس کے بوڑھے باپ نے دیکھا کہ بہت بڑی خون ریزی ہونے کا خوف و خدشہ ہے تو اس نے اپنے وزیروں اور مخلص دوستوں کی رہنمائی اور مشورے سے خانہ جنگی سے بچنے کے لئے اپنے محبوب بیٹے کو بین باس کر دیا۔ تنکا رام اپنے گئے چنے مخلص، وقادار اور جانثار ساتھیوں کے ہمراہ سنسان اور ویران علاقوں میں پناہ کی تلاش میں گھومتا رہا۔ گو کہ وہ بہت ساری دولت لے کر نکلا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی ایک جگہ مستقل قیام ہو جائے۔

آخر چند مہینوں کی خاک چھاننے کے بعد ایک دور افتادہ بستی کے ایک سردار نے اسے پناہ دی..... وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس کے فلسفے اور کردار سے متاثر ہونے لگے اور اسے اپنا مہاراجا بنالیا۔ دو ایک برسوں کے بعد اس نے وطن واپسی کا تہیہ کر لیا۔ کیوں کہ اس کے علم میں یہ بات آ رہی تھی کہ وہاں کے حالات بڑے ابتر ہیں اور لاقانونیت کا دورہ ہے۔ نوجوان لڑکیوں اور شادی شدہ عورتوں تک کی عزت و آبرو کو درندگی اور تشدد سے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ان کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جا رہا ہے..... وہاں ہر برائی اپنے عروج پر تھی۔ کوئی پرسان حال

نہ تھا اور نہ ہی کوئی اوتار ان کی مدد کو آیا تھا۔

جب تنگ رام کے بھائی دلشان کے کانوں میں بھٹک پڑی کہ تنگ رام اس کی سرکوبی کے لئے آ رہا ہے تو اسے بہت غصہ آیا۔ وہ اپنے بھائی کی جان لینے کے درپے ہو گیا۔ قاتلوں نے تنگ رام کا بازو کاٹ لیا جس کے ہاتھ کی انگلیوں میں انگوٹھیاں تھیں اور اسے وہ بطور نشان اس کے بھائی کے پاس لے گئے۔ اس کی لاش نذر آتش کرنے کے بجائے بے سروسامانی کی حالت میں دفن کر دی گئی۔

لیکن اس کے باپ سیدو نے مرنے سے پہلے اس کی لاش منگوالی..... پھر اس کی چتا جلائی گئی۔ پھر اس کی سادھی میں جو شاہانہ تھی۔ اس میں تنگ رام کا سونے کا مجسمہ بنوا کر دفن کر دیا گیا۔ اس کی چتا کی راکھ دریا برد کر دی گئی۔

☆.....☆.....☆

”کیا چوتھے پر تابوت کو کھولو گے.....؟“ ونودکنہ نے سوال کیا جو بڑی مستعدی سے شاستری اور پونم کے ہر کام میں ہاتھ بٹا رہا تھا اور پیش پیش تھا۔

”کیوں نہیں.....؟ کیا یہ دیکھو گے کہ یہ کیا ہوگا.....؟“ پرکاش مہرہ بولا۔

اس سے پہلے کہ ان تینوں میں سے کوئی کچھ کہتا پرکاش مہرہ نے خنجر سے تابوت کے گرد لپٹا ہوا فیث کاٹا اور اس کا ڈھکن اٹھایا۔

تنگ رام کا مجسمہ جو کسی مٹی کی طرح اپنا دیدار کرانے کا منتظر تھا..... ونودکنہ اسے ٹھنکی باندھے دیکھتا رہا۔ پھر وہاں سے ہٹ گیا۔

پونم بھی اس کے ساتھ ساتھ چل دی اور جاتے جاتے اس نے شاستری سے دریافت کیا کہ وہ بھی ان کے ساتھ جا رہا ہے کہ نہیں؟

”ابھی کچھ کام باقی ہے۔“ شاستری نے جواب دیا۔ ”اسے نمٹا کر تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔“

انہوں نے گھر پہنچ کر کچھ دیر تک شاستری کا انتظار کیا..... چوں کہ ان دونوں کو بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی اس لئے کھانے بیٹھ گئے۔ شاستری کا اب مجھے بھی انتظار کرنا محال تھا۔

کھانے سے فراغت پا کر پونم کمرے میں آئی۔ اس نے لباس تبدیل کرنے کی غرض سے اپنے اٹیچی میں کوئی مناسب جوڑا تلاش کرتے سے اس کی نظرسونے کی دھات کی طرح اس گول کلڑے پر پڑی جو وہ سری لنکا سے لائی تھی..... یہ بے سایہ نقش اس کے ہتاجی نے کھائی کے دوران ایک روز اسے دیا تھا..... اس پر کسی قدیم سری لنکن زبان کے الفاظ کند تھے، جن کے

بارے میں اس کے باپ نے اسے کچھ نہیں بتایا تھا..... اس کے ہتاجی نے یہ چیز کہیں پڑی پائی ہوگی یا پھر کسی مقامی باشندہ سے خریدا ہوگا جو کسی وجہ سے اسے فروخت کرنے آیا ہوگا..... سادھی سے برآمد ہونے والے زیورات اور جوہرات کے مقابلے میں یہ گھسا ہوا نقش ہے وقعت تھا۔ اس کی کوئی مالیت بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کے ہتاجی کی اس نشانی کو پونم نے بڑی حفاظت سے اس طرح سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ جیسے یہ کوئی انمول، نایاب اور قیمتی شے ہو۔ اب جو نظر اس پر پڑی تو باپ کی یاد اسے شدت سے تڑپانے لگی۔ اس لئے بھی کہ بیٹی کو باپ سے کچھ زیادہ ہی لگاؤ ہوتا ہے۔ اس نے نقش کو ایک پتلی زنجیر میں پرو کر گلے میں اس طرح ڈال لیا جیسے یہ واقعی یہ نایاب شے ہو۔

جب وہ کھانے کی میز پر بیٹھے تو ونودکنہ کی نظر اس نقش پر پڑی اور وہ بڑے غور سے اس نقش کو دیکھنے لگا جو اس کے دیئے ہوئے لاکٹ کے سامنے دو کوڑی کا دکھائی دیتا تھا۔

”کیا یہ بنا خریدا رہے.....؟“ ونودکنہ نے اس کی نظروں میں اپنے آپ کو جذب کرتے ہوئے پوچھا۔ لیکن اس کی نظروں کی گرفت میں نقش بھی تھا جس نے اس کی ساری توجہ اپنی طرف مبذول کیا ہوا تھا۔

”بہت پرانا ہے.....“ پونم نے اس کے تجسس سے متاثر ہو کر کہا۔ ”آج اس پر نظر پڑی تو یکن لیا۔“

وہ سوچ رہی تھی کہ ونودکنہ نے مزید نہیں کریدا..... لیکن اس کی نظریں پونم کے چہرے کا طواف کرتی رہیں..... جیسے پٹانم کے زیر اثر پونم نے الف سے بے تک اپنے حالات اسے سنا دیئے۔ کوئی بات اس سے نہیں چھپائی..... ونودکنہ بڑے انہماک سے سنتا رہا۔ اس دوران میں شاستری کا تذکرہ آنا ناگزیر تھا۔

پونم جب اپنی رام کہانی سنا چکی تو وہ ونودکنہ نے جیسے غیر ارادی طور پر سوال کیا۔

”تو آپ نے شاستری سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا ہوا ہے.....؟“

”پونم کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ یہ بات کہتے ہوئے اسے زبان پر اختیار نہ رہا تھا۔ ”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی..... شاستری ایک مخلص ساتھی ہے۔ میں اس کی بڑی عزت کرتی ہوں۔“

”تو پھر آگے بڑھنے سے پہلے خود کو اچھی طرح سے یقین دلادیں۔“ ونودکنہ نے کہا۔ ”زندگی کے زیاں سے بڑا کوئی المیہ نہیں ہے..... اور آپ جیسی ہستی کے لئے تو یہ دگنا المیہ ہوگا..... یہ ایک ایسا دکھ ہے جسے آپ سہہ نہ سکیں گی۔“

”وودکھنہ.....! آپ بہت پریشان کن باتیں کر رہے ہیں۔“ پونم نے صاف گوئی سے کہا۔

”بات یہ ہے پونم.....! تم بہت حسین ہو.....! میں نے اپنی زندگی میں تم جیسی حسین لڑکی نہیں دیکھی۔“ وہ خواب ناک لہجے میں آپ سے تم کے مخاطب سے بولا۔“

وہ اس کے قریب آنے کا انتظار کرتی..... اور جب وہ قریب آتا تو مزاحمت نہ کرتی..... پوری خود سپردگی سے اس نے اپنے آپ کو وودکھنہ کے حوالے کر دیا تھا..... طوفان میں سمندر کی طغیانی میں جس طرح ایک بار ہوا ملاح کشتی کو بے رحم موجوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح پونم نے اپنے آپ کو اس کے تند جذبات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا..... دنیا سوئی کی طرح گھوم رہی تھی..... اور وہ اسے روکنا نہیں چاہتی تھی..... اور اسے روکنا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی..... بالکل ایسا ہی تھا جیسے شاستری کے جذباتی ہوتے سے ہوتا تھا۔

شاستری کمرے میں داخل ہوا تو وہ اس طرح بھونچکے ہو گئے جیسے دوا دار کا راہنہ اپنا کردار ادا کرتے کرتے کسی کی اچانک مداخلت سے سب کچھ بھول گئے ہوں..... لیکن شاستری نے اس پر چنداں توجہ نہ دی۔

”معاف کرنا..... کچھ کام ایسا پھنسا کہ مجھے دیر ہو گئی.....“ شاستری نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

”اگر آپ زیادہ تھک گئے ہوں تو کھانا آپ کے کمرے میں بھجوا دوں۔“ وودکھنہ نے کہا۔

”نہیں..... میں کھا کر آیا ہوں۔“ شاستری نے جواب دیا۔

وہ پرکاش مہرہ کا کھانا زہر مار کر آیا تھا۔ جب کہ وہ اس کے ساتھ کھانا نہیں کھانا چاہتا تھا۔ پھر وہ محبت بھرے انداز سے پونم کی طرف بڑھا پونم لا تعلقی کے انداز سے ایک طرف لوٹ گئی..... اس نے فوراً ہی غیر محسوس انداز سے اپنا لباس، بال اور حلیہ درست کر لیا تھا۔ تھکاوٹ کے باوجود اسے پونم کی حرکت ناگوار گزری..... پہلی مرتبہ اس کے دل کے کسی کو نے میں شہبے نے سراٹھایا تھا..... اس نے کمرے میں داخل ہوتے وقت جو منظر دیکھا اور پونم کا لباس، بال اور حلیہ جو بے ترتیب سا تھا وہ اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہا تھا۔ اب اسے اپنے شہبے کی تصدیق کے لئے دور جانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

پونم اور وودکھنہ تیزی سے ایک دوسرے کے قریب ہوتے جا رہے تھے اور وہ جیسے اسی تیزی سے پیچھے ہٹا جا رہا تھا۔ اس نے پونم کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا..... پونم اس کی

نظروں کی تاب نہ لاسکی اس نے کسی مجرم کی طرح نگاہیں جھکا لیں۔ اس کا شک پکا ہو گیا۔ اس نے جو کچھ دیکھا تھا اسے پونم جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ وودکی من مانیوں اور اس کی خود سپردگی نے کچھ بھی پوشیدہ رہنے نہیں دیا تھا۔ اس لمحے اس کی نظر پونم کی گردن میں پڑے ہوئے نقش پر پڑی۔ وہ پونم کی طرف بڑھا۔

”یہ کیا ہے..... میں نے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا؟“ وہ پونم پر جھکتے ہوئے بولا۔

پونم نے جلدی سے گلے سے اتار کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ لو..... دیکھو لو.....“

شاستری ہلکیلیں جھپکا جھپکا کر نقش کو دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس پر ابھری ہوئی لکیریں..... الفاظ ہیں یا ڈیزائن..... وہ کوئی زمانہ کا زیور ہے یا کچھ اور.....؟

”یہ کیا اس نے دیا ہے.....؟“ شاستری نے وودکھنہ کی طرف اشارہ کیا۔

”انہوں نے نہیں بلکہ میرے ہاتھ نے دیا تھا۔“ پونم نے جواب دیا۔ ”لیکن میں نے اسے آج پہنا ہے۔“

”کب دیا تھا.....؟“ شاستری نے اس کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کر دیں۔

”سورگ باش ہونے سے ایک دن پہلے.....“ پونم نے بتایا۔

”یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔“ شاستری نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”کھدائی سے ملنے والی ایک ایک چیز کا اندراج کیا جاتا تھا۔ لیکن مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے کہ فہرست میں اس کا اندراج نہیں تھا..... فہرست موجود ہوتی تو معلوم ہو جاتا۔“

”شاستری.....؟“ پونم نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میرے ہاتھ نے کھدائی کے دوران.....“

وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ میرے باپ پر چوری کا الزام لگانا چاہتے ہو۔

”میری بات سنو.....“ وودکھنہ ان کے درمیان آ گیا۔ ”یہ سادگی میں سے نکلا ہوا نہیں لگتا ہے۔“ اس نے شاستری کے ہاتھ سے نقش لے کر الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو جنگا رام سے بھی دو ہزار برس قبل قدیم لگتا ہے۔“

شاستری یہ سن کر بھنا گیا۔ وہ اس شخص کی لاف زنی سے تنگ آ چکا تھا۔ وودکھنہ نے اندھیرے میں تیر چلا کر اپنا رعب ڈالنے کی کوشش کی تھی کہ جیسے وہ بھی بہت کچھ جانتا ہو۔ اب جب کہ وہ اپنی سر زمین پر تھا وہ وودکھنہ کی ساری برائی کی باتوں کو ختم کر دینا چاہتا تھا..... اب اسے اس شخص سے شدید نفرت ہوتی جا رہی تھی۔

”اس بات کا علم آپ کو کیوں کر ہوا.....؟“ شاستری کے لہجے میں تنہی اور طنز سا تھا۔

”آپ کے کام میں میری دلچسپی محض شوقیہ نہیں ہے۔“ ونودکھنے نے چوٹ کی۔

”آپ پہلی بار یہ سنسنی خیز اور حیرت انگیز انکشاف کر رہے ہیں۔“ شاستری نے پھر طنزیہ لہجے میں کہا اور اس نے تائید کی غرض سے پونم کی طرف دیکھا۔ لیکن پونم دوسری طرف متوجہ تھی۔

”میں ان موضوعات پر سرکھپا نا نہیں چاہتا تھا جو آپ کے دائرہ کار میں زیادہ اور میرے کم ہیں۔“ ونودکھنے نے جس لہجے میں کہا وہ بڑا شائستہ اور مودبانہ تھا لیکن شاستری نے اسے اپنے اوپر طنز محسوس کیا۔ ونود نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا مطالعہ دراصل قدیم تہذیب اور زبان کا ہے۔ اس لئے میں نے اندازے سے یہ بات کہی۔“

”لیکن میں اب بھی یہی کہوں گا کہ یہ سادگی سے ملا ہے۔“ شاستری نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

ونودکھنے کے چہرے اور آنکھوں سے سختی جھلکنے لگی تو شاستری دل میں خوش ہوا کہ اس نے بلا آخر تندخو مزاج کو کھلی دشمنی پر اتر آنے پر مجبور کر دیا ہے۔

”میں آپ کو یقین دلاتا ہوں مسٹر شاستری!..... یہ بہت پرانے زمانے کی چیز ہے۔“ ونود کھنے نے لہجہ بدل کر کہا۔

”تفصیلی معائنہ کے بغیر سوائے آپ کے اور کوئی اتنے یقین اور اعتماد سے نہیں کہہ سکتا۔“ شاستری نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”تو پھر تفصیلی معائنہ تک اپنے فیصلے کو محفوظ کیوں نہیں رکھتے.....؟“ ونودکھنے نے چپے ہوئے لہجے میں کہا اور ہاتھ نقش کی طرف اس انداز سے بڑھایا جیسے اسے ہتھیانا چاہتا ہو۔

شاستری نے اسے مضبوطی سے پکڑ کر اپنا ہاتھ قدرے ایک طرف ہٹالیا اور پوچھا۔

”پونم!..... تمہاری اجازت ہے۔“

”کس بات کی.....؟“ پونم نے حیرت سے لانی لانی پلکیں جھپکائیں۔

”صرف ایک ہی ایسا شخص ہے جو ہر عہد پوری معلومات فراہم کر سکتا ہے اور وہ ہے سر پروڈیوسر جگن ناتھ.....“ شاستری نے کہا۔ ”ان سے ملنے جا رہا ہوں۔“

”کیا ابھی اور اسی وقت..... ونودکھنے نے بدستور شائستگی سے کہا۔“ مسٹر شاستری.....! اس وقت بہت دیر ہو چکی ہے..... وہ آرام کر رہے ہوں گے..... ایسی جلدی کیا ہے..... کل صبح دیکھ لیں گے۔“

”نہیں..... میں ابھی اور اسی وقت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ شاستری نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”وہ اتنی جلدی سوتے نہیں ہیں.....“

کمرے سے نکلتے وقت شاستری دل میں خوش تھا کہ..... اس نے پونم اور ونودکھنے کو ایک ذہنی الجھن میں ڈال دیا ہے اور وہ اس کی عدم موجودگی سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے..... یہ ذہنی تناؤ ان کی پریشانی، ان کا سکون غارت کر دے گا۔

جیسا کہ اس کا خیال تھا کہ جگن ناتھ جاگ رہے ہوں گے..... جگن ناتھ ابھی تک جاگ رہے تھے۔ بشرطیکہ اسے جاگنا سمجھا جائے۔ وہ لاہیری میں بیٹھے پی رہے تھے۔ ان کی صحت بہت گرگن تھی..... شاستری نے بغیر کسی تمہید کے نقش ان کے سامنے رکھ دیا اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ جگن ناتھ اسے اس نقش کے بارے میں بتانے کے بجائے اپنا دکھارونے لگے۔

”میں اس لئے آیا ہوں کہ آپ مجھے اس نقش کے بارے میں کچھ بتائیں؟“ شاستری نے تیز اور اخلاق کو پس پشت ڈالتے ہوئے خود غرضی کے انداز میں کہا۔ ”اسے شناخت کر لیں۔ اس کا تاریخی زمانہ اور اس کی اہمیت بتائیں۔“

جگن ناتھ نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر نقش پر گہری نظر جمع کر کے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا..... لیکن اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ پھر اس نے کتابوں کے فلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”وہاں کوشش کر کے دیکھو..... تیسرے فلیٹ میں..... نہیں چوتھے فلیٹ میں بیرونی اور ایم ڈی گیتا داس جو کتابیں جو قدیم مہاراجاؤں اور پراسرار کہانیوں کے موضوع پر ہیں..... ان میں شاید اس کا ذکر ہو۔“

شاستری کتابیں کھگانے لگا۔ اس دوران میں جگن ناتھ نشے کی کیفیت میں پرکاش مہرہ اور حکومت کو برا بھلا کہتا رہا۔ جن کی وجہ سے نہ صرف اس کا مستقبل تباہ ہو گیا تھا بلکہ اس کی ساری زندگی کی جدوجہد اکارت ہو گئی تھی۔

کتابوں کی ورق گردانی سے شاستری کے کچھ پلے نہ پڑا تھا..... پھر اس نے جگن ناتھ کی منت سماجت کی کہ وہ اس کی مدد کرے۔ اس کی قابل رحم حالت دیکھ کر جگن ناتھ کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ سی ابھر آئی اور نقش لینے کے لئے شاستری کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن وہ میز پر کھے ہوئے گلاس سے ٹکرا گیا..... اور گلاس ایک چھناکے سے فرش پر گر گیا۔

”اوہ..... تم بے ڈھنگے بوڑھے شرابی.....“ شاستری سے بے ساختہ منہ سے نکل گیا تو جگن ناتھ اس لب و لہجہ اور انداز مخاطب دکھ اور حیرت سے اسے منہ کھولے دیکھنے لگا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اس کی اہانت کی جائے گی۔

شاستری کو احساس ہوا تو وہ جھل سا ہو گیا۔ وہ اپنے مربی، محسن اور استاد سے معافی مانگنے

والا ہی تھا کہ جگن ناتھ کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے اور وہ اس کے رخسار پر ڈھلک گئے۔

”تو تم بھی میری عزت نہیں کرتے ہو..... میں اس قدر حقیر ہو گیا ہوں۔“ جگن ناتھ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اب مجھے کیا کیا دن دیکھنا پڑ رہا ہے..... کیا یہ بھلائی کا صلہ ہے.....؟“

شاستری کا دل اندر سے کٹ کر رہ گیا۔

”سرا! میں بے حد شرمندہ ہوں۔“ شاستری نے عداوت سے کہا۔ ”جن جھلاہٹ پر میرے منہ سے یوں ہی نکل گیا تھا..... سر پلیز!..... سر آپ مجھے شام کر دیجئے.....“ اس نے چرن چھولنے۔

”شب بخیر.....“ جگن ناتھ اپنی طاقت جمع کر کے اٹھا اور بڑے سپاٹ لہجے میں بولا۔

”جب اپنا کام ختم کر لو گے تو باہر جانے کا راستہ تمہارا دیکھا بھالا ہے۔“

جگن ناتھ لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل گیا۔ شاستری دیر تک سائے میں رہا۔ اس کا دل اندر سے ملامت کئے جا رہا تھا۔ پھر اس نے ایک گہرا سانس لیا..... پھر اس نے میز پر رکھا محراب شیشہ اٹھالیا۔ اپنی سمجھ کے مطابق اس کی جانچ پڑتال کرنے لگا۔

وہ سر جھکا کر اپنے کام میں منہمک تھا کہ اسے اپنی پشت پر قدموں کی ہلکی چاپ سنائی دی۔ اس سے پہلے کہ وہ سر گھما کر دیکھتا اس کے سر پر ایک ضرب لگی اور کرسی سمیت وہ فرش پر لڑھک گیا۔

☆.....☆.....☆

نمائش کے افتتاح سے دس منٹ قبل سنیل داس پنڈال میں داخل ہوا۔ وہ سیدھا پرکاش مہرہ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ پونم اور ونود کھنے ان سے قدرے فاصلے پر ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی باتوں کا انداز دیکھ کر پونم نے ونود کھنے سے کہا کہ ”چل کر دیکھنا چاہئے کہ کیا ہو رہا ہے؟ ان کے درمیان تاؤ سا پیدا ہو رہا ہے اور لب و لہجے میں تلخی بھر گئی ہے۔“

پھر وہ ونود کھنے کو ساتھ لے کر ان کے قریب پہنچ کر رک گئی۔

سنیل داس تیز لہجے میں پرکاش مہرہ سے کہہ رہا تھا۔

”دولا کھ پچاس ہزار برٹش پونڈ کی رقم کم نہیں ہوتی ہے مسٹر پرکاش مہرہ.....!“

”یہ تو چوڑوں کے لئے چارہ ہے..... مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ یہ ساری چیزیں جہاز پر لا کر واپس چھوڑ آؤں؟“ پرکاش مہرہ کے لہجے میں تمسخر تھا اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

”میری حکومت ٹرانسپورٹ کے تمام اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہے۔“ سنیل داس

اصرار کر رہا تھا۔

”یہ تو اور بھی بچکانہ بات ہوگی.....“ پرکاش مہرہ نے اس کا شانہ تھپ تھپایا۔ ”میں پورے ہندوستان میں اس کی پبلیٹی کر چکا ہوں اور پیسہ پانی کی طرح بہایا ہے..... کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنے دلیں کے لوگوں کو مایوس کروں..... تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ کتنی بے چینی سے اس کی لائش کا انتظار کیا جا رہا ہے..... اس کے علاوہ امریکہ اور یورپ میں بھی اس کی پبلیٹی ہو رہی ہے۔ وہاں کا پریس بھی بڑی دلچسپی لے رہا ہے۔“

”میں آخری بار کہہ رہا ہوں کہ آپ میری حکومت کی پیشکش قبول کر لیں۔“ سنیل داس نے اضطراب سے کہا۔

”بہت خوب..... آپ کی حکومت کو اب ہوش آیا.....؟ کیا وہ گھوڑے بیچ کر سو رہی ہے..... میں اس کی مد میں ایک بہت بڑی رقم کی ادائیگی کر چکا ہوں اور کیا چاہئے..... جب تیر گمان سے نکل جاتا ہے تو واپس نہیں آتا ہے..... اپنے نصیب نصیب کی ہے۔“ پرکاش مہرہ نے کہا۔

”تو پھر تمام تر نتائج کی ذمہ داری آپ پر ہوگی.....“

سنیل داس نے چیخ دیتے ہوئے کہا تو پرکاش مہرہ اسے ہاتھ کے اشارے سے ایک طرف چلے جانے کو کہا۔

”بڑا افسوس ہو رہا ہے کہ ایسے موقع پر شاستری نہیں ہے..... کیا حال ہے اس کا.....؟“

سنیل داس کے جانے کے بعد پرکاش مہرہ نے کہا۔ ”اس کی کئی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔“

پونم اور ونود کھنے یہاں آنے سے پہلے شاستری کو جگن ناتھ کے ہاں جا کر دیکھ آئے تھے۔ وہ اس وقت تک بے ہوش تھا اور ڈاکٹر نے اسے جگن ناتھ کے ہاں سے لے جانے سے منع کر دیا تھا۔ جگن ناتھ نے انہیں ساری رو داد سناتے ہوئے بتایا تھا کہ نقش غائب ہو چکا ہے۔

تینوں باتیں کر رہے تھے کہ میڈیا کے نمائندے اپنے ساتھیوں کے ساتھ پنڈال میں آنا شروع ہو گئے۔ یہ لوگ پریس کلب سے ساتھ آئے تھے۔ پرکاش مہرہ نے بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور ان کی خاطر تواضع کے لئے خصوصی اہتمام کیا ہوا تھا۔ اس لئے بھی کہ ان سے جو مال مل سکتی تھی وہ لاکھوں خرچ کرنے اور کسی بھی ذریعہ سے نہیں..... اس کے نزدیک بزنس کے لئے ایک کامیاب گرتھا۔ ان کی نشستیں جو مخصوص تھیں وہ ان پر براجمان ہو گئے۔

پھر پرکاش مہرہ نے خود ہی نظامت کے فرائض بھی سنبھال لئے۔ اس نے چبوترے پر کھڑا ہوا اور تقریر شروع کر دی۔ مجسمہ کا تابوت بھی وہیں رکھا تھا..... اس نے اپنی تقریر کا آغاز

اپنی کھدائی کی ٹیم کے ممبروں کا تعارف..... اپنی تعریف اور نوادرات کے تاریخی پس منظر لے کیا..... اخباری نمائندوں اور حاضرین کی توجہ پرکاش مہرہ کی تقریر سے زیادہ ان نوادرات پر مگن جو تابوت کے ارد گرد سجائی ہوئی نوادرات پر تھی۔

جگن ناتھ کو اس نمائش میں پونم بڑے اصرار سے لائی تھی۔ وہ آنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں کہ جب سے پرکاش مہرہ نے اس کی اہانت کی تھی اس کا دل اندر سے ٹوٹ گیا تھا اور اس کا دل ساری دنیا اور ہر چیز سے اچاٹ ہو کر رہ گیا تھا۔

پونم ایک کونے میں کھڑی مہمانوں اور شائقین کا جائزہ لے رہی تھی۔ جیسے ہی اس کی اسٹینل داس پر پڑی وہ بری طرح چوکی..... اس وقت وہ اسے بے حد پر اسرار، مشکوک اور خطرناک سا لگا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اچھے نہ تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے ارادے اچھے نہیں ہیں..... اس کی کیفیت کیا ہے.....؟ اس کے دل میں کیا فتنہ ہے۔ پونم جان نہ سکی۔ اس کی نگاہیں تابوت پر جمی ہوئی تھیں..... اس کی آنکھوں میں ایک ایسی چمک تھی جسے پونم سمجھنے کا صرخی۔ اس نے اپنے سارے جسم پر ایک عجیب سی سن سناہٹ محسوس کی جس نے اس کا دل جیسے خشک کر دیا تھا۔

”اس سے پہلے کہ میں اس مجسمے کی رونمائی کروں اس کے بارے میں کچھ بتانا پسند کروں گا۔“ پرکاش مہرہ نے پر جوش لہجے میں کہا۔ ”یہ تنکا رام کا مجسمہ ہے جو خالص سونے کا بنا ہوا ہے۔ اس پر کسی می کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس کا وزن دو من تیس کلو.....“

پرکاش مہرہ کے اس انکشاف سے سارے مجمع میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ کیوں کہ اس واقعہ سونا عالمی اور ہندوستانی مارکیٹ میں روز بروز مہنگا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ ساٹھ ہزار روپے تولہ ہمارا تھا۔ سونے کی کبھی اتنی قیمت نہ ہوئی تھی۔ گویا یہ اربوں کی مالیت کی صورتی تھی۔ ایک نے اسے ساتھی سے سرگوشی کی۔ ”یار! پرکاش مہرہ کتنا خوش قسمت ہے.....؟ کتنا اونچا ہاتھ مارا.....“

ان دونوں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی۔ پرکاش مہرہ تابوت کے پاس فہمی لئے ہوئے آئے تو اخباری نمائندوں اور فوٹو گرافروں اور بہت سارے شائقین اس کے گرد کھڑے ہو گئے۔ اس نے تابوت پر لپٹا ہوا فیتہ کاٹا۔ پھر فہمی ایک طرف رکھ کر وہ تابوت کا ڈھکن آہستہ آہستہ اٹھانے لگا۔ تابوت بہت ہی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ کیوں کہ مجسمہ سوا دو من وزن کا تھا۔

پرکاش مہرہ نے تابوت کا ڈھکن اٹھا کر پاس کھڑے ہوئے ملازم کے حوالے کر دیا۔ جو لوگ پر جس نظروں سے تابوت میں جھانک رہے تھے وہ ایک دم سے اچھل پڑے۔ ”مسٹر پرکاش مہرہ!“ نامنر آف انڈیا کے نمائندے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”یہ کیا مال

ہے.....؟ کیا آپ نے ہم سب کو بے وقوف بنانے کے لئے بلایا تھا.....“ پھر تمام صحافی ایک طرف ہٹ کر واپس چل دیئے..... البتہ فوٹو گرافروں نے کھٹ کھٹا کھٹ تصویریں بنالیں۔

خالی تابوت ان سب کا منہ چڑا رہا تھا۔ پرکاش مہرہ جو پنجکا سا ہو گیا..... اس پر جیسے کوئی بجلی سی آ گری تھی۔ وہ ساکت جامد ہو کر خود مجسمہ بن گیا تھا..... کہیں یہ اس کی نظر بندی تو نہیں..... اس کا واہمہ تو نہیں.....؟ وہ سکتے کی سی حالت میں کھڑا رہا۔

اس وقت کسی نے دیکھا نہ دیکھا ہو..... اسے نظر آیا ہو یا نہ آیا ہو..... لیکن ایک جگن ناتھ تھا جس نے ایک عجیب و غریب سامنظر دیکھا..... حقیقت یہ تھی کہ یہ منظر اس کے سوا کسی اور کو نظر نہ آیا تھا۔

جس وقت پرکاش مہرہ نے تابوت کا ڈھکن اٹھایا تھا اس میں سے مجسمہ بہت ہی ہلکی دھند میں کسی آخر کی طرح باہر آیا تھا۔ یہ دھند اتنی ہلکی تھی کہ اس کے سوا کسی اور کو نظر نہ آئی تھی..... پھر وہ مجسمہ پنڈال کے ایک کونے میں کسی زندہ آدمی کی طرح کھڑا استہزائیہ انداز میں چند لمحوں تک پرکاش مہرہ اور پنڈال میں موجود لوگوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ ایک دم سے گدھے کے سر کے سینک کی طرح غائب ہو گیا۔ پھر وہ جگن ناتھ کو پنڈال کے کسی کونے کھدے میں نظر نہ آیا۔

اگر تابوت میں مجسمہ ہوتا تو جگن ناتھ اس منظر کو اپنا واہمہ سمجھتا..... یا پھر نفی کا اثر..... اس وقت وہ بغیر شراب کے موجود تھا۔ پورے ہوش و حواس میں تھا..... لیکن یہ اس کا واہمہ نہ تھا..... وہ اپنی زندگی میں بھوت پریت، بدروحوں اور چڑیلوں کو اپنے علم کے باعث دیکھ چکا تھا۔ وہ تھوڑا بہت سفلی علم جانتا تھا۔ اسے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ پرکاش مہرہ کی بے عزتی اور جگن ہنسائی ہوئی..... پرکاش مہرہ نے جو اس کی توہین کی تھی..... ذلیل و رسوا کیا تھا البتہ اس نے اس کا بدلہ لے لیا تھا..... کل کے اخبارات میں جب اس مجسمے کے بارے میں خبریں شائع ہوں گی تو پرکاش مہرہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اس وقت اس نے جو کیف و مسرت کو محسوس کیا تھا وہ کبھی شراب سے نہیں ملی تھی۔

اس سے پہلے کہ شائقین اور اخباری نمائندے پنڈال سے باہر نکلتے۔ پونم بجلی کی سی سرعت سے لپک کر پنڈال کے باہر گئی۔ وہاں پولیس کی بھاری نفری موجود تھی..... پونم کا خیال تھا کہ یہ ڈکیتی کی واردات ہے۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس مجسمہ کو غائب کر دیا ہے..... حیرت کی بات یہ تھی کہ نوادرات میں سے ایک چیز بھی غائب نہ تھی۔ مجسمہ کا تابوت میں سے

میرے خیال میں میرے خلاف سازش کی گئی اور منصوبہ بنایا گیا..... مجھے بدنام اور ذلیل کرنے کے لئے وہ تابوت جس میں مجسمہ تھا عائب کر دیا گیا اور ویسا ہی تابوت لا کر رکھ دیا گیا.....“

”آپ کو کون ذلیل اور رسوا کر سکتا ہے؟“ دوسرے صحافی نے کہا۔

”ایک دوست اور ہزار دشمن ہوتے ہیں۔“ پرکاش مہرہ بولا۔ ”میرے پاس جو دولت ہے اس سے حسد کرتے ہیں۔ حاسد ہی اور دشمن ہی ایسا کر سکتا ہے۔“

”کیا آپ کو کسی پر شک ہے؟“

”ہاں..... پرکاش مہرہ نے قدرے ہٹ کر کھڑے ہوئے سنیل داس کی طرف اشارہ کیا۔

”اس نے مجھے دھمکی دی تھی۔ اس کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔“

پولیس افسر جو قریب کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا اس نے سنیل داس کو قریب بلا کر پوچھا۔

”مسٹر پرکاش مہرہ..... آپ پر جو الزام عائد کر رہے ہیں اس سے کیا آپ کو انکار ہے؟“

”میں کیوں ایسی گھٹیا حرکت کرنے لگا۔“ سنیل داس نے کہا۔ ”ان کا الزام بے سرو پا ہے..... اگر مجسمہ چوری کرنا ہی ہوتا تو میں یہاں کیوں موجود ہوتا۔ مجھے اس سے کیا حاصل تھا۔“

”یہ شخص اس نمائش کا سخت مخالف تھا..... اور مجسمہ مجھ سے اونے پونے خرید کر کسی میوزیم کو منافع پر فروخت کرنا چاہتا تھا۔ میں نے انکار کر دیا تو اس نے مجسمہ کو عائب کر دیا۔“

”کوئی آخرا پنا اور کسی میوزیم کو فروخت کرنا جرم نہیں ہے۔“ پولیس افسر نے کہا۔ ”صرف اس بنا پر ان پر الزام عائد نہیں کیا جاسکتا.....“

”اگر میں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہوتا تو کیا میں احمق ہوں جو یہاں موجود ہوں۔“ سنیل داس نے کہا۔ ”یقیناً کسی اور نے اس مجسمے کے بارے میں سن کر اسے پراسرار طور پر چوری کر لیا ہے..... ہاں..... میں نے ان سے یہ بات ضرور کہی تھی کہ فروخت نہ کرنے کی صورت میں تمام تر نتائج کی ذمہ داری ان کے سر ہوگی۔“

”میں ابھی شہر بھر کی پولیس الرٹ کئے دیتا ہوں۔“ پولیس افسر نے پرکاش مہرہ سے کہا۔

ابتداً مجسمہ چوری کے لئے آسانی سے ہضم نہیں ہوگا..... پولیس سارے شہر کی ناکہ بندی کرے گی اور دین، گاڑیوں اور سوز و دیوں کو چیک کیا جائے گا۔“

”میں بتاتا ہوں کہ اصل ماجرا کیا ہے؟“ جگن ناتھ جو ایک طرف کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا پولیس افسر کے پاس آ کر بولا۔ ”یہ مجسمہ نمائش کے لئے لا کر پرکاش مہرہ نے سخت حماقت کی ہے..... مجسمہ چوری ہوا اور نہ اسے کسی نے چوری کیا ہے..... یہ حقیقت ہے جب اسے تابوت میں لایا گیا تھا۔ وہ بہت دیر تک تابوت میں ہی موجود تھا.....“

عائب ہو جانا ناقابل فہم تھا۔ اس تابوت کو چار پانچ مزدور دین سے اتار کر لائے تھے۔ وہ بھی موجود تھے۔

اس وقت پونم بڑی سراسیمہ تھی اور اس کی عقل کام نہیں کر رہی تھی..... اس نے پولیس افسر کو واقعہ بتایا اور اندر لے آئی۔ اس افسر نے پنڈال میں داخل ہوتے ہی بغیر سوچے سمجھے اعلان داغ دیا۔

”جو بھی پنڈال سے باہر نکلے گا اسے اپنی تلاشی دینا ہوگی۔“

اس کا یہ احمقانہ اعلان سن کر لوگ ہنسنے لگے۔ ایک نے اس پولیس افسر کے پاس آ کر کہا۔

”جناب.....! جو مجسمہ تابوت سے عائب ہوا ہے۔ وہ دو من تیس کلوا تھا..... کیا آپ کے خیال میں اسے بغل میں داب کر لے جایا جاسکتا ہے؟“

”سر! دوسرے نے جیسے چوٹ کی۔“ وہ مجسمہ کوئی باشت بھر کا نہیں بلکہ پورے چھ فٹ کا تھا..... جیسا کہ پرکاش مہرہ صاحب نے بتایا..... کیا اسے آستین میں چھپا کر لے جایا جاسکتا ہے؟“

پولیس افسر جھل سا ہو گیا۔ اس نے سپاہیوں سے کہا کہ لوگوں کو بغیر تلاشی کے جانے دیں۔

مسٹر پرکاش مہرہ.....! ایک اخباری نمائندے نے کہا۔ ”کہیں ایسا تو نہیں کہ دو تین تابوت ہوں۔ غلطی سے خالی تابوت اٹھا کر لایا گیا ہو..... آپ کیوں نہ چیک کر لیں۔“

”جی نہیں۔“ پرکاش مہرہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں نے خود اپنے سامنے مجسمہ کو تابوت میں رکھوا کر فیتہ باندھا تھا۔ وہ پانچ مزدور بھی موجود ہیں۔ جنہوں نے اسے دین میں اٹھا کر رکھا تھا۔“

پرکاش مہرہ نے ان مزدوروں کو بلایا۔ جنہوں نے تابوت اٹھا کر دین میں رکھا تھا۔ اس نے ان سے پوچھا۔

”جب تم لوگوں نے تابوت اٹھا کر دین میں رکھا تھا۔ وہ بھاری تھا یا ہلکا.....؟“

”بہت ہی بھاری تھا.....!“ ان میں سے ایک مزدور نے جواب دیا۔ ”دین میں تابوت رکھتے وقت اور دین سے اتار کر یہاں چوتھے پر لاتے لاتے ہماری حالت خراب ہو گئی۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجسمہ یہاں لایا گیا تھا اور آپ ہی عجیب پراسرار طور پر عائب ہو گیا؟“ صحافی کے لہجے میں طنز اور تمسخر بھی تھا۔

”لیکن ایسی کوئی بات نہیں.....“ پرکاش مہرہ بولا۔ ”جب میں انتظامات میں مصروف تھا۔ تابوت بہت پہلے ہی لایا گیا تھا..... مجھے تھوڑی دیر کے لئے پنڈال سے باہر جانا پڑا تھا.....“

”اس بات کا علم آپ کو کیوں کر اور کیسے ہوا.....؟“ پولیس افسر نے حیرت سے جگن ناتھ کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ”کیا آپ نے اس مجسمہ کو چوری ہوتے ہوئے دیکھا.....؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ کس نے اور کس طرح اسے غائب کیا؟“

”مزدور اس تابوت کو جس طرح سے اٹھا کر لائے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ تابوت منوں بھاری ہے۔“ جگن ناتھ نے جواب دیا۔ ”یہ مجسمہ کیسے اور کس طرح سے غائب ہوا آپ اس بات کو تسلیم کریں گے نہیں..... بلکہ مذاق اڑائیں گے۔ یہ امر آپ کے لئے ناقابل فہم ہوگا۔ بہتر ہے آپ نہ پوچھیں۔“

”بتانے میں کیا حرج ہے؟“ پولیس افسر بولا۔ ”یقین کرنا نہ کرنا یہ ہمارا کام ہے.....؟“

”یہ پرکاش مہرہ..... جو بڑا دولت مند ہے..... اسے اپنی دولت پر بڑا ناز اور گھمنڈ ہے..... اس کے نزدیک آدمی کی نہیں بلکہ دولت کی قدر اور عزت..... چوں کہ اس نے میرے ساتھ بدسلوکی..... میری اہانت و توہین کی..... مجھے کیڑے کی طرح حقیر جانا..... سارے دیش میں ذلیل و رسوا کیا جس کی اسے سزا ملی ہے۔“ جگن ناتھ نے دل کی بھڑاس نکالی۔

”یہ ان کا اور آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔“ پولیس افسر نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ قانون کی مدد کریں۔ یہ بتائیں کہ مجسمہ کس طرح چوری کیا گیا.....؟ چور کون ہے.....؟“

”اس شخص نے میری جو بے عزت کی مجسمہ نے اس کی سزا سے دی ہے..... وہ خود بہ خود تابوت سے غائب ہوا..... اسے کون چرا کر لے جاسکتا تھا۔ جب کہ پولیس کی بھاری نفری موجود تھی اور اس نے پنڈال کو چاروں طرف سے حصار میں لیا ہوا تھا۔ چڑیا تک پر نہیں مار سکتی تھی۔“ جگن ناتھ نے کہا۔

”ایک مجسمہ بے جان..... سونے کی دھات کا بنا ہوا..... کس قدر خود بہ خود غائب ہو سکتا ہے.....؟“ پولیس افسر نے اسے اس طرح سے دیکھا جیسے وہ خبطی ہو۔ یہ ناممکن سی بات ہے۔ اس بات کو عقل تسلیم نہیں کرتی ہے۔“

”میں نے خود اس مجسمہ کو ایک سفید دھند میں اس وقت تابوت سے باہر آتے دیکھا جب پرکاش مہرہ اپنی تقریر جھاڑ رہا تھا..... یہ اس کی آتما تھی جو باہر نکل آئی تھی..... وہ کچھ دیر حاضرین کو دیکھتی رہی، مسکراتی رہی..... پھر وہ ایک دم سے غائب ہو گئی۔ وہ اپنا شریر بھی لے گئی۔“ جگن ناتھ نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”آپ شاید یقین کریں یا نہ کریں..... یہ ایک حقیقت ہے۔“

”یہ بڑھا خبطی اور شرابی بھی ہے۔“ پرکاش مہرہ نے جل کر کہا۔ اسے جگن ناتھ کا انداز مخاطب زہر لگا تھا۔ وہ سب کے سامنے اس سے بداخلاقی سے بات کر رہا تھا۔ ”نفس کی حالت

میں ہڈیانی بک رہا ہے۔“

”یہ صاحب جو بھی ہیں ان کی باتوں کو جھٹلایا نہیں جاسکتا.....“ ایک صحافی نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ”جیسا کہ مزدوروں کا کہنا ہے کہ وہ تابوت اس قدر بھاری تھا کہ پانچ مزدوروں نے اسے بڑی دقت سے اتارا اور پنڈال میں پہنچایا۔ ان کی حالت غیر ہو گئی..... ان صاحب کا کہنا بھی سو فیصد درست ہے کہ پنڈال کے گرد پولیس کی بھاری نفری موجود تھی اور اب بھی ہے۔ چڑیا تک پر نہیں مار سکتی..... لہذا چوری ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے..... لیکن دوسری بات جو ناقابل فہم ہے وہ یہ کہ مجسمہ زندہ ہو گیا وہ اپنے شریر اور آتما سمیت غائب ہو گیا۔“

”یہ دو ہزار برس قدیم مجسمہ ہے.....“ پرکاش مہرہ بھنا گیا۔ ”کیا اسے آج ہی زندہ ہونا تھا.....؟“ وہ دوسو برس پہلے بھی زندہ ہو سکتا تھا..... دو ہزار برس پہلے بھی یہ جنم لے سکتا تھا..... انپکڑا اس بڑھے کی باتوں پر نہ جائیں۔ میرے خیال میں کوئی اور ہی چکر ہے۔ یہ ناممکن سی بات ہے کہ ایک مجسمہ دو ہزار برس بعد اچانک زندہ ہو جائے۔ غائب ہو جائے۔ میں ان باتوں کو نہیں مانتا..... نہ ہی اس بڑھے شرابی کی بات میں کوئی وزن ہے.....“

”یہ پرکاش مہرہ کیا جانے یہ اسرار و رموز کیا ہوتے ہیں؟“ جگن ناتھ نے پولیس افسر سے کہا۔ ”یہ دولت کے اسرار و رموز سے واقف ہے..... میں اس وقت پورے ہوش و حواس میں ہوں۔ میرے بجائے پرکاش مہرہ کی دماغی حالت کا معائنہ کرائیں..... میں نے ایک عجیب بات عرض کر دی..... مانیں یا نہ مانیں..... میری بلا سے.....“

جگن ناتھ اتنا کہہ کر اور پرکاش مہرہ جلتی پرتیل گرا کر آگے بڑھ گیا۔ پرکاش مہرہ اندر ہی اندر بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ پھر اس نے پولیس افسر سے کہا۔ ”اس بڑھے کی جھوٹی باتوں پر نہ جائیں..... فوراً ہی کارروائی تیز کر دیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس مجسمے کو کسی نہ کسی ذریعے اور راستے سے اس شہر سے چور نکال کر لے جائیں.....“

”یہ چھوٹ کا مجسمہ ہے اسے اتنی آسانی سے اسمگل کر کے لے جایا نہیں جاسکتا۔“ پولیس افسر نے یقین دلایا۔ ”آپ بے فکر رہیں۔“

”کیا میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ اس مجسمے کو آپ میری حکومت کو ایک بڑی رقم کے عوض فروخت کر دیں۔“ سٹیل داس نے کہا تو پرکاش مہرہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ اس کے زخموں پر نمک چھڑک رہا ہو۔ ”آپ نے میری بات نہیں مانی۔ آپ ادھر کے رہے نہ ادھر کے..... ایک دم کاروباری بن گئے..... مسٹر جگن ناتھ نے بالکل سچ ہی کہا..... وہ مجسمہ زندہ ہو کر چلا گیا..... اب ساری زندگی کف افسوس ملتے رہیں۔ اب وہ ہاتھ آنے سے رہا.....“

پرکاش مہرہ یہ چوٹ برداشت نہ کر سکا۔ اس کی کھوپڑی گھوم گئی۔ وہ گھڑ کر رہی سے بولا۔
”میرا خیال ہے کہ یہ سارے کروت تہمارے ہیں تم نے جادو کے زور سے اسے غائب کر لیا ہے۔“

”اگر ایسا جادو آتا ہوتا تو وہ مجسمہ سری لنکا سے یہاں آ نہیں پاتا۔۔۔۔۔ اور پھر میں نے جب دولاکھ پچیس ہزار برٹش پونڈ کی پیشکش کی تو آپ نے بڑے تسخّر اور غرور و تکبر سے کہا کہ ہاں چوزوں کا چارہ بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔ یہ چارہ مل جاتا تو آپ کے کیا تمام اخراجات نکل نہیں آتے؟۔۔۔۔۔ غرور کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔۔۔ مجھے مجسمہ غائب کرنا ہی ٹھہرتا تو میں اتنی بڑی پیشکش کیوں کرتا۔“ سنیل داس نے اس کے وجود پر جیسے دکھتا انگارہ رکھ دیا۔

”میں کہتا ہوں میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔“ پرکاش مہرہ ہڈیانی لہجے میں چیخا۔

اس کی حالت پاگل کتوں کی سی ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ اس کا دماغ ماؤف تھا۔ وہ پریشان ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔۔۔۔۔ وہ دو تین بار خالی تابوت میں جا کر جھانکا رہا۔۔۔۔۔ اسے سب سے زیادہ شک سنیل داس پر ہو رہا تھا۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر دودھنہ اور ہلم اس کے پاس گئے۔ پونم بولی۔

”مسٹر پرکاش مہرہ۔۔۔۔۔! جو کچھ ہوا۔“ بڑا افسوسناک ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ اس وقت آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔ آپ ہوٹل میں جا کر آرام کر لیں۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ پولیس جلد یا بدیر مجسمہ برآمد کر لے گی۔ مایوس اور فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔۔“
”مس پونم ٹھیک کہہ رہی ہیں۔“ دودھنہ نے کہا۔ ”اس وقت آپ کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔“

”میری اتنی بدنامی اور رسوائی ہو گئی اور میں جا کر آرام کروں؟“ پرکاش مہرہ الجھ کر بولا۔

”میرے لائق کوئی سیوا ہو تو بتائیں۔۔۔۔۔؟“ دودھنہ نے رمی لہجے میں کہا۔

”ایسا کرو۔۔۔۔۔ تم تابوت میں لیٹ جاؤ۔ میں اعلان کر دوں گا کہ مجسمہ لوٹ آیا ہے۔“
پرکاش مہرہ مل کھا کر بولا۔

دودھنہ اور پونم نے محسوس کر لیا کہ۔۔۔۔۔ مجسمہ کے غائب ہوجانے کے باعث پرکاش مہرہ کو گہرا صدمہ پہنچا ہے اور وہ دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔ اس لئے اس کے منہ لگنا فضول سا تھا۔ ہلم نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اس کی بات کا جواب دیئے بغیر دونوں پنڈال سے نکل گئے۔ پرکاش مہرہ کی بات کا جواب دیئے بغیر جو وہ دونوں نکل گئے تو پرکاش مہرہ کو اور غصہ آ گیا۔

ان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد شاستری آیا تو پنڈال بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ کرسیاں

خالی پڑی تھیں۔ دو خالی کرسیوں پر دو سپاہی بیٹھے اس مجسمہ کے غائب ہوجانے پر چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ایک کرسی پر پرکاش مہرہ حسرت و یاس کی تصویر بنا بیٹھا تھا۔
پرکاش مہرہ اسے دیکھ کر چونکا۔ لمحے بھر کے لئے وہ اپنا صدمہ بھول گیا۔ وہ بولا۔

”تم اس حالت میں کیوں چلے آئے۔۔۔۔۔ تمہیں کسی نے شدید زخمی کر دیا اور ڈاکٹر نے چلنے پھرنے سے منع کیا تھا؟“

”میں نے ریڈیو پر مقامی خبروں پر مجسمہ کے پراسرار طور پر غائب ہوجانے کی خبر سنی تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔“ شاستری نے جواب دیا۔ ”مجھے یقین نہیں آیا۔ اس لئے میں خود معلوم کرنے چلا یا آیا ہوں۔“

”یہ سچ ہے۔“ پرکاش مہرہ نے اسے سارا واقعہ سنایا۔۔۔۔۔ اور جتن ناتھ کی بات بھی بتائی۔
”جتن ناتھ نے جو کچھ کہا وہ سولہ آندھ ہے۔“ شاستری نے کہا۔ ”آپ انہیں پاگل، خطی اور شرابی نہ سمجھیں۔۔۔۔۔ مجسمہ واقعی غائب ہے۔ یہ کوئی ڈکیتی یا چوری کی واردات نہیں ہے۔“
”ایسا کیسے ممکن ہے۔۔۔۔۔؟“ پرکاش مہرہ نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ”دو ہزار برس کے بعد مجسمہ زندہ ہو جائے۔۔۔۔۔ جب کہ وہ مٹی نہیں۔۔۔۔۔ اگر وہ مٹی ہوتا تو میں اس بات کا یقین کر لیتا۔ میں جادو وغیرہ کو نہیں مانتا۔۔۔۔۔“

”بات یہ ہے کہ تنگ رام مہاراجہ کی آتما اس مجسمہ کے شریر میں بس گئی۔“ شاستری بتانے لگا۔ ”پھر وہ اسے لے گئی۔ لیکن یہ اچھا نہیں ہوا۔ وہ ایک طاغوتی طاقت بن گیا ہے۔ جو بہت خطرناک اور خونخوار ثابت ہوگا۔“
”یہ بات تم اتنے وثوق سے کس بنا پر کہہ رہے ہو۔۔۔۔۔؟“ پرکاش مہرہ بولا۔ ”کیا تم سفلی علوم کے ماہر ہو؟“

”بات یہ ہے کہ میں نے نقش پر کندہ حروف کے معنی پالے ہیں۔“ وہ کہنے لگا۔ ”میں سفلی علوم تو جانتا نہیں ہوں لیکن قدیم سے قدیم زبان جاننے کا ماہر ہوں۔ یہ نقش ایک طلسماتی شے ہے۔ اس نقش سے مجھے بہت ساری باتوں کا علم ہوا۔۔۔۔۔ اس بات کا بھی پتا چلا کہ تنگ رام کی شکتی کا راز کیا ہے۔۔۔۔۔“

”وہ نقش کہاں ہے؟“ پرکاش مہرہ نے سوال کیا۔ ”تم نے اور کیا کیا باتیں معلوم کیں اس نقش سے۔۔۔۔۔؟“

”میں اس نقش کو دیکھ رہا تھا کہ کسی نے میری پشت پر خاموشی سے آ کر میرے سر پر شدید ضرب لگا کر بے ہوش کر دیا اور وہ نقش لے کر فرار ہو گیا۔۔۔۔۔“ اتنا کہہ کر اس نے لمبی سرد تھ بھری۔

”یہ نقش کون لے جاسکتا ہے.....؟“ پرکاش مہرہ بولا۔ ”یہ کسی اور کے کیا کام آ سکتا ہے؟“
 ”میرے خیال میں تنگ راکھ کی آتما لے گئی ہوگی.....؟“ شاستری نے کہا۔
 ”یہ نقش لے کر وہ کیا کرے گی.....؟ پرکاش مہرہ کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔ اس نے سوچا..... چوں کہ شاستری اس خطی پر وفسر کا شاگرد ہے اس لئے اپنے خطی استاد کی سی بات کر رہا ہے۔“ کیا وہ اس کا اچار ڈالے گی.....؟ مجھے جو نقصان پہنچا ہے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے.....“

شاستری کو اس کی بات سن کر غصہ آیا کہ یہ کس قدر خود غرض، مفاد پرست اور زر پرست ہے۔ اس نے محض دولت کمانے کے لئے یہ نمائش منعقد کی تھی۔ اس نے میڈیا کو مدعو کیا اور ان کی بڑی خاطر مدارات اس لئے کی تھی کہ اسے مفت کی پبلٹی مل جائے۔ وہ ایک سوداگر تھا۔ جس کی ذہنی سطح موجودہ دور کے یہودی خوروں سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ اگر یہودی کے دام لگ سکتے تھے وہ ان کا بھی سر کس کھول کر بیٹھ جاتا تا کہ دمڑی بھی ہاتھ سے نہ جائے۔

شاستری کو حملہ آور نے ایسا شدید زخمی کیا تھا کہ اس کی حالت غیر ہو گئی تھی۔ لیکن مجسمہ کے غائب ہو جانے کی خبر ایسی سنسنی خیز اور ناقابل یقین تھی کہ اسے برداشت نہ ہو سکا۔ بڑا درد اور تکلیف سہتے ہوئے پرکاش مہرہ کی دل جوئی اور تجسس لئے پہنچا تھا۔ پرکاش مہرہ کی باتوں نے اس کے تن بدن میں نفرت اور غصے کی آگ بھردی تھی۔

”کیا معلوم وہ آدمیوں کا اچار ہی ڈال دے۔“ شاستری نے جل کر کہا۔ ”آپ اس بات کو تسلیم کریں کہ جگن ناتھ نے جو کچھ کہا وہ سو فیصد درست ہے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔“
 ”تم کچھ بھی کہہ لو میں اپنی بات پر قائم ہوں اور رہوں گا کہ یہ مجسمہ اس لئے ایک بہت بڑے اور سوچے سمجھے منصوبے کے کارن چوری کیا گیا ہے کیوں کہ وہ سوادھمن کا مجسمہ تھا۔“
 پرکاش مہرہ نے ٹھنکرائی۔

”اب یہ سوچنا ہے کہ کیا پیش بندی کی جائے..... کیسے اور کس طرح.....؟ کیوں کہ مجسمہ زندہ ہو گیا ہے۔“ شاستری نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
 ”میرے خیال میں تمہارا دماغی معائنہ ضروری ہے۔“ پرکاش مہرہ بگڑ گیا۔ ”چوں کہ تمہاری کھوپڑی پر ضرب لگی ہے اس لئے تم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟ دو ہزار برس بعد مردہ زندہ ہو جاتا ہے..... کیوں اور کس لئے.....؟“

دو برس کی دس ہزار برس کے بعد ان مجسموں، میموں اور مورتیوں میں جان پڑ جاتی ہے اور دوسرا جنم لیتے ہیں جو آدمیوں کی ہوتی ہیں۔ ان کے مرنے اور مرنے سے پہلے اور بعد میں مجسمے

بنائے جاتے ہیں۔ میموں نے بھی دوسرا جنم لیا ہے..... آپ ان اسرار و رموز اور دیوتاؤں اور بھگوانوں کی اچھا کو کبھی سمجھ نہیں سکتے..... ایسا صدیوں سے چلا آرہا ہے..... آپ میری بات سن لیں۔ اسے بکواس نہ سمجھیں..... یہ مجسمہ جس نے اب جنم لے لیا ہے۔ وہ آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے..... اسے جس نے بھی جنم دیا وہ کسی دیوتا کی پارتھنا کر کے..... بھگوان نے شاید اس مجسمے میں جان ڈالنے کی ہمتی دی ہوگی..... اس نے اس لئے اس مجسمے میں جان ڈالی ہوگی کہ وہ انتقام لے سکے..... ماضی کے کسی ایسے شخص سے جو آج بھی زندہ ہے..... اس کی آتما کہیں موجود ہے.....“

”میرا خیال ہے کہ اب تم جا کر آرام کرو..... کل میں کسی بڑے ماہر نفسیات معالج کے پاس تمہیں لے جاؤں گا۔“ پرکاش مہرہ بولا۔ ”میں ویسے تمہاری باتوں پر سوچ و بچار ضرور کروں گا۔ اب تم جاؤ۔“
 ”گویا آپ کو میری کسی بات کا یقین نہیں آیا ہے.....؟“ شاستری نے کہا۔ ”آپ اسے بکواس سمجھ رہے ہیں؟“

”شاستری..... ایہ بتاؤ کہ تم کس دنیا میں رہتے ہو.....! پرکاش مہرہ تیز لہجے میں کہنے لگا۔
 ”کیا تم نہیں جانتے کہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور سائنس نے دنیا میں کیسے کیسے عظیم انقلاب برپا کئے ہیں..... لیکن تم ہو کہ دو ہزار برس کے آدمی کی سی باتیں کر رہے ہو..... اس عظیم دور میں..... میں کیا ایک بچہ بھی اس توہم پرستی کو نہیں مانے گا..... ایک سونے کے مجسمے میں جان پڑ جائے جو دو ہزار برس پہلے کا ہے..... یہ مجسمہ جو خالص سونے کا تھا..... سوادھمن بھاری..... اسے ایک زبردست منصوبے کے تحت چرایا گیا ہے۔“

”سوال یہ ہے کہ اتنا بڑا اور وزنی مجسمہ کون پر اسرار طور پر غائب کر سکتا ہے جب کہ زبردست حفاظتی انتظامات موجود تھے۔“
 ”میرا خیال ہے کہ کسی لالچ میں سنیل داس نے یہ حرکت کی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا ہے۔“

”سنیل داس کو کس بنا پر آپ مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں؟“ شاستری حیرت سے بولا۔
 ”کیا وہ یہاں موجود تھا؟“

”وہ میری بربادی کا تماشہ دیکھنے کے لئے موجود تھا۔“ پرکاش مہرہ کہنے لگا۔ ”تم ہوتے اس کے بشرے سے بھانپ لیتے..... میں ایک کاروباری ہوں..... کامیاب بزنس میں قیافہ شائس ہوتا ہے..... میرے خیال میں اس نے پولیس، مزدوروں، مجھے اور بھی لوگوں کو پھانٹا تا ناز

کر کے مجسمہ اڑالیا۔ اس کے ساتھیوں نے ڈکیتی کی ہے۔۔۔۔۔ مجسمہ غائب کروانے کے بعد وہ اس لئے یہاں موجود رہا کہ کہیں اس پر بھی شک نہ کروں میں نے خفیہ پولیس کو اس کا پتا دے دیا ہے۔ وہ اس کا تعاقب کریں گے۔ غیر محسوس انداز سے۔۔۔۔۔“

شاستری اس کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔ کیوں کہ پرکاش مہرہ سے ٹکرا اور بحث و مباحثہ فضول تھا۔ اس وقت پنڈال کی تمام بتیاں بجھادی گئی تھیں۔ صرف دو ایک بتیاں روشن تھیں جن کی روشنی بڑی مدھم سی تھی۔

شاستری باہر جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اس نے ایک ہیو لاسا دیکھا جو پنڈال میں نہ جانے کہاں سے نمودار ہوا تھا۔ اس کا بدن سنہرا سا تھا۔ جیسے وہ خالص سونے کا بنا ہوا ہو۔ جب وہ مدھم روشنی میں ظاہر ہوا تو ایک دم سے پرکاش مہرہ چونکا۔ اسے لگا تنگ رام کا مجسمہ جو اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ پرکاش مہرہ سمجھ گیا کہ اس کے ساتھ کوئی مذاق کر رہا ہے۔

”کون ہوتم۔۔۔۔۔؟“ پرکاش مہرہ نے غضب ناک ہو کر کہا۔ ”کیا مجھے بے وقوف بنانے آئے ہو۔۔۔۔۔؟“

”میں تنگ رام ہوں۔۔۔۔۔“ اس نے جواب دیا۔ ”تم نے مجھے پہچانا نہیں۔۔۔۔۔؟“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔۔۔۔۔ میں اس قسم کا بے ہودہ مذاق پسند نہیں کرتا۔“ پرکاش مہرہ نے برہمی سے کہا۔ ”میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔ مجھے اور پریشان نہ کرو۔ ورنہ۔۔۔۔۔“

”حیرت کی بات ہے کہ تم نے میرے حصول اور میری نمائش پر لاکھوں خرچ کر دیئے اور کروڑوں کمائے کا منصوبہ بنایا۔۔۔۔۔ مجھے پہچان نہیں رہے ہو۔۔۔۔۔؟ دمکی دے رہے ہو؟ ورنہ کیا۔۔۔۔۔؟ کیا کر لو گے؟“

”میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔۔۔۔۔ تمہارا حلیہ بگاڑ دوں گا۔ پولیس کے حوالے کر دوں گا۔“

پرکاش مہرہ رعونت سے بولا۔

”تم میرا کیا منہ توڑ دو گے۔۔۔۔۔ میں تمہارا قیہ کر کے رکھ دوں گا۔۔۔۔۔“ مجسمہ نے تسخر کے انداز میں کہا۔

اس کا جواب سن کر پرکاش مہرہ بے قابو ہو گیا۔ اس نے اپنی پوری قوت سے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر رسید کر دیا۔

پرکاش مہرہ بھونچکا ہو گیا۔ پھر درد اور تکلیف سے تڑپ کر اس نے اپنا ہاتھ دوسرے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ اس نے ہاتھ مارا تو ایسا لگا تھا کہ کسی آہنی چیز مارا ہے۔ وہ کراہنے لگا۔ اس نے ہر سمجھا تھا کہ یہ شخص سنہرا لباس پہن کر آیا ہے۔ یہ سنہرا لباس نہ تھا۔۔۔۔۔ سونے کا مجسمہ تھا۔ زبردست

چٹ پڑی تھی۔ اسے تارے نظر آ گئے تھے۔

”اب یقین آیا کہ نہیں۔۔۔۔۔ میں کون ہوں۔۔۔۔۔؟“ مجسمے نے استہزاء سے لہجے میں کہا۔ ”اب بھی یقین نہیں آیا ہے تو ایسا کرو کہ تمہاری جیب میں بھرا ہوا پستول موجود ہے۔ اس کی ساری گولیاں مجھ پر برسا دو۔“

پرکاش مہرہ نے بغیر سوچے سمجھے جیب سے پستول نکال لیا۔۔۔۔۔ اس نے پستول کی نالی پر سائی لینر لگا لیا تو شاستری نے چیخ کر کہا۔ ”ایسی حماقت نہ کرنا۔۔۔۔۔ یہ واقعی تنگ رام کا مجسمہ ہے۔۔۔۔۔ اس سے معافی مانگ لو۔۔۔۔۔“

پرکاش مہرہ نے شاستری کی ایک نہ سنی۔۔۔۔۔ اس نے پے در پے مجسمہ پر گولیاں چلا دیں۔ پستول سے شخص شخص کی آوازیں نکلیں۔ مجسمہ سے گولیاں ٹکرا کر زمین پر گر پڑیں۔۔۔۔۔ مجسمہ بڑے مفرورانہ انداز سے کھڑا مسکراتا رہا۔

پرکاش مہرہ نے یہ دیکھ کر مجسمہ کا بال تک بیکا نہیں ہوا۔ اس نے غضب ناک ہو کر پستول مجسمہ کے منہ پر دے مارا۔ دوسرے لمحے وہ دہشت زدہ ہو گیا۔ اب اس کے مغز میں آیا کہ یہ واقعی تنگ رام کا سونے کا وہی مجسمہ ہے جو وہ سری لنکا سے لایا تھا۔ پھر وہ تیزی سے پنڈال کے دروازے کی طرف لپکا۔ اس نے صرف دو قدم اٹھانے تھے کہ مجسمہ نے اسے کمر سے پکڑ لیا۔ اسے اس طرح فضا میں اٹھالیا جیسے وہ کوئی بے وزن سی شے ہو۔۔۔۔۔ اسے لکڑی کی طرح تیزی سے گھما ہا شروع کر دیا۔

پرکاش مہرہ کی نظروں کے سامنے ہر چیز چکر کھانے اور گھومنے لگی۔ زمین، آسمان۔۔۔۔۔ دروازہ۔۔۔۔۔ پنڈال۔۔۔۔۔ شاستری۔۔۔۔۔ پھر اس نے پرکاش مہرہ کو گھما کر بلند کیا۔۔۔۔۔ فضا میں اسے کرکٹ کی گیند کی طرح اچھلاتا رہا۔۔۔۔۔ پھر اسے اس طرح ایک طرف پھینکا جیسے فیلڈر ہاؤنڈری لائن کی طرف پھینکتا ہے۔ وہ گیند کی طرح فضا میں بہت بلند ہوتا جا رہا تھا جیسے چھکارا مارا گیا ہو۔ وہ گیند کی طرح پنڈال سے نکلا۔۔۔۔۔ پارک کے ایک گوشے میں سوننگ ہل کا ڈاک تھا اس کے محلے پر گر کر وہ پھر فضا میں بلند ہوا اور سمندر میں جا گرا۔۔۔۔۔ اس کے منہ سے سسکی بھی نہیں نکلی۔ وہ سمندر کی آغوش میں چلا گیا۔

”سمندر میں غرق ہونے کے بعد کیا پرکاش مہرہ اس دنیا سے پدھار مار گیا۔۔۔۔۔؟“ چندرا دیوی نے سریش کمار سے کہا۔ ”کھیل ختم۔۔۔۔۔ پیسہ ہضم۔۔۔۔۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ کہانی تو اب شروع ہوتی ہے۔“ سریش کمار نے جواب دیا۔ ”یہ پہلا حصہ تھا جو میں نے سنایا۔۔۔۔۔ اب اس کا دوسرا حصہ نہ صرف سنسنی خیز، حیرت انگیز بلکہ خوف ناک اور مخیر

لعقول واقعات پر مشتمل ہے۔ یہ تو خونی مجسمہ نے اپنی طاقت، پراسراریت اور دوسرے جنم کا آغاز اس طرح سے کیا ہے۔

”کہانی واقعی بڑی دلچسپ، عجیب و غریب اور ناقابل یقین سی لگتی ہے۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”لیکن دنیا میں کوئی بات یا واقعہ ناقابل نہیں رہا۔ ایک منٹ، نہیں دس منٹ توقف کرو۔ میں کافی بتا لاتی ہوں۔“

تھوڑی دیر میں چندرا دیوی سینڈوچز اور کافی بتا لائی۔ پھر وہ کہنے لگی۔ ”اب گرما گرم کہانی سنانا شروع کرو۔“

جب پرکاش مہرہ کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑی مسہری کے بستر پر پایا۔ بستر بڑا نرم و گداز، صاف ستھرا اور بے حد آرام دہ تھا۔ ایسی مسہری اور ایسا بستر اس نے اپنی زندگی میں کیا خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا تھا کہ وہ اپنے کمرے میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ جو واقعہ گزرا تھا وہ اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ جب وہ واقعہ اس کے ذہن میں تازہ ہوا تو اسے لگا کہ اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں موجود ہے۔ لیکن دوسرے لمحے وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ یہ تو اس کا کمرہ نہیں تھا اور نہ ہی بستر تھا۔ ایسا خوب صورت، آراستہ و پیراستہ کمرہ جو کسی شاہی محل کی خلوت کی طرح اس کا بیڈروم نہیں تھا۔ حالاں کہ اس نے اپنی خواب گاہ کو آراستہ کرنے پر لاکھوں روپے خرچ کئے ہوئے تھے لیکن وہ اس کمرے کے مقابلے میں عام قسم کا طول سا لگ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا جس پر بیش قیمت پردے پڑے تھے۔ ایک کھڑکی پر سے پردہ ہٹا ہوا تھا۔ اس نے دیکھا کہ باہر پانی ٹھانٹیں مار رہا ہے۔ اسے خیال آیا کہ کہیں وہ بحری جہاز میں تو موجود نہیں ہے۔ لیکن یہ بحری جہاز معلوم نہیں ہوتا تھا۔ یہ کمرہ اپنیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ گویا سمندر میں کوئی گھر ہے جس کے کمرے میں وہ موجود ہے۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔؟“ اس نے حیرت سے بوجھا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ یہ خواب ہے۔“ وہ خواب کی دنیا میں ہے۔ اس نے اپنا لباس دیکھا۔ وہ بالکل خشک تھا۔ وہ سمندر میں گرا تھا اور اس کی تہہ میں جا رہا تھا تو وہ ہبک گیا تھا۔ بستر بھی خشک تھا۔ اگر اسے سمندر سے نکال کر بستر پر ڈال دیا گیا ہوتا تو بستر کی چادر ٹپکلی ہوتی۔ اگر وہ زیادہ دیر تک بے ہوشی کی حالت میں پڑا ہوا تھا تب بھی اس کا لباس اور بستر کی چادر خشک ہونے سے رہی۔ یہ اسرار اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ پھر اس نے دیکھا کہ چھوٹی بڑی اور ہر قسم کی مچھلیاں تیرتی ہوئی اوپر کی سطح اور تہہ کی طرف جارہی ہیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سمندر کی تہہ میں بنے ہوئے مکان میں مقید ہے۔ اس

کے علم میں کیا۔۔۔۔۔ ساری دنیا جانتی تھی سمندر کی تہہ میں کوئی مکان نہیں تھا اور نہ ہی کوئی ایسا جہاز جو کبھی غرق ہو گیا ہو۔۔۔۔۔ اگر وہ کسی غرق شدہ جہاز کے کسی کمرے میں مقید تھا تو کسی جہاز کا ایسا کمرہ نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ حیرت اور خواب کی سی حالت میں کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ معاس کی نگاہ ایک بہت بڑی آہوی الماری پر پڑی جس میں صرف نوادرات اور چھوٹے بڑے مجسمے بھرے تھے۔ لمحے کے لئے وہ اپنے آپ کو بھول گیا اس طرح اس الماری کی طرف بڑھ گیا۔ جیسے اسے کسی نادیدہ طاقت نے اپنی طرف کھینچا ہو۔ جب وہ سامنے پہنچ کر رکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ نوادرات اور مجسمے قیدیوں کی طرح جھانک رہے اور جیسے مسکرا رہے تھے۔ اس کے تین خانوں میں ہر قسم کے اور ہر ساز کے ہیرے جواہرات بھرے تھے۔ ایسے انمول، نایاب اور قیمتی ہیرے جواہرات اس نے اپنی زندگی کیا خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ نہ اس کے وہم و گمان میں تھا کہ ایسے بھی ہو سکتے ہیں۔ دوسرے تین خانوں میں آب دار، نایاب اور ہر ساز کے موتی تھے۔ یہ موتی سیکنڈوں کی تعداد میں تھے جس طرح ہیرے جواہرات تھے۔ تیسرے خانے میں ایک سے لے کر دو فٹ سائز کے خالص سونے کے بنے ہوئے مجسمے تھے۔ یہ کھل بارہ عدد تھے۔ ان کی آنکھوں میں ہیرے تھے۔ جو چمک دمک رہے تھے۔ اس کے اعزاز کے مطابق یہ مجسمے دس سے لے کر بیس کلو کے درمیان تھے۔ یہ تمام مجسمے مہاراجاؤں اور راج کماروں کے معلوم ہوتے تھے۔

اس کی نیت میں فوراً آ گیا۔ اس نے سوچا کہ بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی۔ کیوں نہ وہ ان ہیروں سے اپنی جیبیں بھر لے۔ کچھ موتی بھی اٹھا لے۔۔۔۔۔ اگر موقع ملا تو دو ایک مجسمے بھی اٹھا کر لے جائے۔ اس نے دیکھا الماری مقفل ہے۔ اس نے اوپر سے نیچے تک دیکھا اسے الماری کھولنے کی جگہ نظر نہیں آئی۔ وہ مجسمے میں پڑ گیا کہ الماری کیسے کھولے۔ پھر اس نے دیکھا کہ الماری کے شیشے بڑے نازک، صاف و شفاف اور کاغذ کی طرح ہیں۔ صرف ایک کے کی ضرورت ہے۔ وہ ہلکی سی ضرب کی بھی تاب نہ لاسکیں گے۔ چکنا چور ہو جائیں گے۔

اس نے جیسے ہی شیشے پر مکارا اسے ایسا لگا کہ یہ آہنی شیشہ ہے۔ ایسی کڑی چوٹ آئی تھی کہ وہ اپنا ہاتھ پکڑ کر رہ گیا اور اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ درد کی شدت نے بلبلا دیا۔ جیسے ہی اس کا ہاتھ شیشے پر لگا تھا مقفل دروازہ کھل گیا۔ اسے اندازہ ہوا کہ شیشے پر ہاتھ رکھنے کی دیر ہوتی وہ کھل جا جا سم کی طرح ہوتا ہے۔

اب اس کی نظروں کے سامنے نوادرات اور مجسمے تھے۔ وہ جس چیز کو چاہے ہاتھ لگا سکتا

تھا۔ اس کی دسترس میں تھے۔ انہیں چھوٹا اس کے لئے آسان تھا۔ راہ میں کوئی رکاوٹ اور دیوار نہیں تھی۔ اس کی چوری اور حرکات و سکنات کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ بڑے ہیروں کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے دروازے کی طرف دیکھا۔ اطمینان کیا۔ بکمرے کے باہر کوئی آہٹ نہ تھی۔ پھر اس نے سونے کی اس منتش ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھایا جس میں بڑے ہیرے بڑے سلیقے سے سجا کر رکھے ہوئے تھے۔

جیسے ہی اس نے ایک ہیرا اٹھانے کی کوشش کی اس کا ہاتھ بری طرح جھلس گیا۔ وہ ہیرا کسی انگارے کی طرح دکھ رہا تھا۔ پائیں ہاتھ سے دایاں ہاتھ پکڑ کے جلن اور تکلیف سے اچھلنے اور تڑپنے لگا۔ پھر اس نے اس سے تسخرانہ انداز سے ہنسنے اور قہقہہ لگانے کی آوازیں سنیں۔ جیسے اس پر ہنسا جا رہا تھا۔ بہت سارے جیسے اس پر ہنس رہے تھے۔ اس نے حیران اور خوف زدہ ہو کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ معاً اس کی نظر مجسموں پر پڑی تو وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ ان مجسموں میں جیسے جان پڑ گئی تھی۔ وہ انسانوں کی طرح دیکھ رہے، ہنس رہے اور قہقہہ لگا رہے تھے۔

ان میں سے ایک مجسمہ جوان مجسموں میں سے بڑا تھا۔ اس نے اپنی ہنسی روک کر کہا۔
”لا چلی..... خود غرض اور مورکھ انسان..... تو نے کیوں کہ چوری کی نیت سے ہاتھ لگایا اس لئے تیرا ہاتھ جھلس گیا۔“

وہ مجسمے کو بولتے دیکھ کر بھونچکا سا ہو گیا۔ لمحے کے لئے اپنی تکلیف بھول گیا۔ پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

”تو ان ہیروں کو دیکھنے کی نیت سے ہاتھ لگاتا، اٹھاتا اور پرکھتا تو تیرا ہاتھ جھلتا نہیں.....“
دوسرا مجسمہ بولا۔ ”ہم اور یہ نوادرات پانچ ہزار برس سے موجود ہیں۔ یہ دنیا ختم ہونے تک رہیں گے۔ کوئی یہاں سے ایک چیز بھی لے جائیں سکتا۔“

”مجھے شاکر دو.....“ پرکاش مہرہ گڑ گڑایا۔ وہ دل میں حیران تھا کہ مجسمے کو کیسے اس کی نیت کا پتا چل گیا۔ ”ہماری دنیا میں چوں کہ ایسے قیمتی، انمول اور نایاب نوادرات موجود نہیں ہیں اس لئے میرے دل میں فوراً پیدا ہو گیا تھا.....“

”تیرے پاس دولت کی کوئی کمی نہیں ہے پھر بھی تیرے دل میں دولت کی ہوس موجود ہے.....؟“ تیسرے مجسمے نے کہا۔ ”اتنی دولت سے بھی تیرا دل بھرا نہیں ہے..... تو..... دولت کا بھوکا ہے۔ تو اتنی دولت پیدا کرنا چاہتا ہے کہ دنیا میں تیرے سوا کسی اور کے پاس اتنی دولت نہ ہو..... تو بے پناہ دولت کا کیا کرے گا.....؟ جب کہ تو ایک دن مر جائے گا۔ دنیا سے یہ دولت

لے کر جائے گا کیا.....؟ تجھے کیا یہ دولت دنیا میں چھوڑ کر جانا نہیں ہوگا.....؟“
پرکاش مہرہ ان مجسموں کو بولتا اس کے دل کا حال بیان کرتے دیکھ کر ششدر ہوتا جا رہا تھا۔ یہ سونے کے مجسمے انسانوں کی طرح فلسفیانہ انداز سے بولتے جا رہے تھے۔

”اگر انسان یہ بات سوچ لے اور سمجھ لے تو پھر دولت کی ہوس نہیں کرے گا۔“ چوتھے مجسمے نے کہا۔ ”یہ جو ہم سب یہاں مجسموں کی صورت میں موجود ہیں آج سے پانچ ہزار برس قبل راجا، مہاراجہ، اور راج کمار تھے۔ یہ جو تم نوادرات دیکھ رہے ہو ہماری اپنی ملکیت تھے۔ اس کے حصول کے لئے ہمارے درمیان بڑی خون ریزی ہوئی۔ لیکن یہ سارا خزانہ دنیا میں رہ گیا..... ایک دیوتا نے ہم سب کو اس سونے میں مجسمہ بنا دیا جو خزانے میں تھا۔ ہم ایک ایک مجسمے کا وزن دو من سے کم نہیں ہے۔ دیکھنے میں ایسا محسوس نہیں ہوتا۔ یہ نوادرات کتنے قیمتی ہیں شاید تمہیں اندازہ ہو..... ایک ہیرا..... ایک موتی..... آج کے دور میں لاکھوں سے بھی بڑھ کر ہوگا..... ہم پانچ ہزار برسوں سے مجسموں کی شکلوں میں ہیں لیکن ہماری آتماں آزاد ہیں۔ صرف آتماں اس محل سے باہر جاسکتی ہیں..... ہمیں جنم لینے سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ہم زندہ ہیں۔ بے بس، مجبور اور قیدی ہیں۔ بھگوان اور دیوتا ہمارے باپ معاف کر کے جنم لینے دینا نہیں چاہتے۔ اس لئے کہ ہم نے دولت اور خزانے کے حصول کے لئے ایسے ایسے باپ کئے ہیں کہ وہ ناقابل معافی جرم ہیں..... ہم نے کیا کچھ نہیں کیا.....“

لیکن تمہاری دنیا ہم سب سے بھی زیادہ پاپی اور خراب ہے۔“ ایک اور مجسمے نے کہا۔ ”ہم جنم لے کر اس دنیا میں جانا نہیں چاہتے ہیں۔ یہاں ہم بڑے سکون اور اطمینان سے ہیں۔ ہم اپنے ماضی کو یاد کرتے اور باتیں کرتے رہتے ہیں۔“

”مجھ پر ایک دیا کرو.....“ پرکاش مہرہ نے درد اور تکلیف سے کراہتے ہوئے کہا۔ ”جھلسا ہوا ہاتھ کیسے ٹھیک ہوگا؟ میری جان لگی جا رہی ہے..... جلن ناقابل برداشت ہوتی جا رہی ہے۔“

”ایسا کرو..... اپنا متاثرہ ہاتھ ہم میں سے کسی ایک کے بدن پر لگا دو۔ تمہارا ہاتھ سابقہ حالت میں آ جائے گا۔ جلن اور تکلیف ختم ہو جائے گی۔“ ایک مجسمہ نے کہا۔ ”اگر تم نے پھر یہ حرکت کی تو تم جل کر خاک ہو جاؤ گے۔“

”نہیں..... نہیں..... اب میں ایسی حرکت نہیں کروں گا؟“ پرکاش مہرہ نے افساری سے کہا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ ایک مجسمہ کے بدن پر پھیرا تو اس کا ہاتھ نہ صرف ٹھیک ہو گیا بلکہ جلن اور تکلیف بھی دور ہو گئی۔ اس نے اپنے سارے بدن میں ایک عجیب طرح کی فرحت سی محسوس کی۔ بڑا سکون ملا۔ اس نے اپنا ہاتھ دیکھا۔ دھچکلا ہوا دکھائی نہیں دیا۔

”اچھا ایک بات تو بتائیں..... یہ کون سی جگہ ہے.....؟“ پرکاش مہرہ نے پوچھا۔
 ”یہ مجسموں کا محل ہے جو سمندر میں ہے۔“ ایک مجسمہ نے بتایا۔ ”تمہارے شہر اور دلش سے
 دس ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔ تم اس محل کے ایک کمرے میں مقید ہو..... تم قیدی ہو ہمارے مہاراجا
 کے..... یہ مجسموں کا مہاراجا ہے..... یہاں حسین، جوان ناریاں ہیں، یہ پانچ ہزار برس پہلے کی
 ہیں..... یہ بڑی پانی تھیں..... یہ بھی سزا بھگت رہی ہیں اپنے کئے کی..... یہ گوکہ راج کماریاں اور
 مہارانیاں تھیں اس کے باوجود بد چلن تھیں..... لہذا انہیں بھی ان کے مرنے کے بعد ان کی آتمائیں
 مقید ہیں۔“

”کیا انہیں بھی مورتیاں بنا کر کسی کمرے میں قید کیا ہوا ہے؟“ پرکاش مہرہ نے پوچھا۔
 ”نہیں.....“ مجسمہ نے جواب دیا۔ ”انہیں ان کی اصلی حالت میں سمندر میں چھوڑا ہوا ہے
 اور ایک بڑے کمرے میں رہتی ہیں اور انہیں سمندر میں تیرنے، نہانے اور گھومنے کی آزادی ہے،
 لیکن وہ ساحل پر اور سمندر سے نکل کر باہر کی دنیا میں جا نہیں سکتی ہیں..... ایسا کرنے کی صورت میں
 ایک آگ ان کی طرف لپکتی ہے جو ان کی ہلکتی چمن لیتی ہے۔ ان کی آتمائیں بھی مقید ہیں۔ اگر تم
 انہیں دیکھنا چاہے ہو تو کھڑکی کے پاس جا کر سمندر میں جھانکو..... وہ تمہیں شاید اس سے پھیلیوں کی
 طرح تیری دکھائی دیں۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ تمہارا مہاراجا کون ہے.....؟“ پرکاش مہرہ نے پوچھا۔
 ”وہی مجسمہ جو سری لنکا کے ایک شہر میں دو ہزار برس سے دفن تھا۔“ ایک مجسمہ بولا۔ ”اے
 سادھی سے نکال کر تم لوگوں نے اپنے پیروں پر کھڑی ماری..... اس کے باہر آتے ہی اس کی آتما
 نے کالی ماتا سے زندگی اور ہلکتی مانگ لی۔ وہ مجسمہ اب خونی مجسمہ بن گیا ہے..... انسان کے کیا کسی
 بھی روپ میں آسکتا ہے..... اس نے تمہیں اٹھا کر گیند کی طرح سمندر میں پھینکا اور اس کمرے میں
 قید کر دیا..... اب تم اس کے قیدی ہو۔“

”یہ تمام باتیں کس نے بتائی ہیں.....؟ اس نے حیرت آمیز لہجے میں دریافت کیا۔
 ”ہماری آتماؤں نے.....“ اس نے جواب دیا۔ ”جب کبھی کوئی عجیب و غریب، پراسرار یا
 انوکھا واقعہ پیش آتا ہے تو ہماری آتمائیں اس کے متعلق تفصیل سے بتاتی ہیں..... اس طرح ہم
 صدیوں سے باہر کے حالات سے واقف ہوتے آ رہے ہیں۔“

”تمہارا مہاراجا کیسے ہو گیا.....! جب کہ تم پانچ ہزار برسوں سے ہو۔ یہ دو ہزار برسوں سے
 سادھی میں دفن تھا۔“ پرکاش مہرہ بولا۔ ”اس نے کس طرح اور کیسے اس محل پر قبضہ کر لیا۔ اسے اپنی
 ملکیت بنالیا؟“

”اس محل میں جو مہاراجا تھا اسے اس کے ایک دشمن نے ختم کر کے اس کی آتما کو پرلوک میں
 بند کر دیا۔ دیوتا اس مہاراجا سے بہت ناراض تھے۔ تنگوارام کی آتما دو ہزار برس سے دیوتا کی پراستھا
 کر رہی تھی کہ تنگوارام کو نئی زندگی..... نیا جنم دیا جائے تاکہ وہ اپنے دشمن سے انتقال لے سکے۔ جب
 سادھی کی کھدائی ہو رہی تھی تب دیوتا نے تنگوارام کی آتما کی پراستھا قبول کر کے دو ہزار برس بعد اس کا
 جنم دے دیا..... اور پراسرار علوم اور غیر معمولی شگفتگی کا مالک بھی بنادیا..... یہ محل کسی مہاراجا کے بغیر رہا
 تھا یہاں تنگوارام آ گیا۔ اب یہ محل اس کی ملکیت ہے۔ اسے جس کسی سے انتقام لینا ہو..... سزا دینا ہو
 تو اس محل میں لے آتا ہے..... جنہیں خوش کرنا ہو وہ ان لڑکیوں اور عورتوں کو ان کے تابع کر دیتا
 ہے..... وہ جس لڑکی یا عورت سے جب تک دل کرے جی بھلاتا رہے..... یہ لڑکیاں اور عورتیں
 سمندر کے اندر تیرنے اور سیر کرنے کے بعد اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے چلی جاتی ہیں.....
 یہ بڑی خوشی سے مہمان مردوں کا دل بھلایا کرتی ہیں۔ چوں کہ ماضی میں یہ بدکردار رہی ہیں اس
 لئے انہیں مردوں کو ہر طرح سے خوش کرنے کا فن آتا ہے۔“

”کیا تمہیں اندازہ ہے کہ مہاراجا میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا.....؟“ پرکاش مہرہ نے
 سوال کیا۔
 ”نہیں.....“ ایک مجسمہ نے جواب دیا۔ ”مہاراجا کے دل میں کیا ہے۔ یہ کچھ کہا نہیں
 جاسکتا..... شاید بہتر سلوک ہی کرے۔ کیوں کہ تم زندہ حالت میں موجود ہو۔ اگر اسے کوئی سزا دینا
 ہوتی تو شاید وہ تمہیں اب تک پھیلیوں کا چارہ بنادیتا۔“

”اس محل میں کتنی لڑکیاں اور عورتیں مقید ہیں.....؟“ پرکاش مہرہ نے پوچھا۔
 ”میں.....“ ایک مجسمہ نے بتایا۔
 پرکاش مہرہ کے لئے یہ باتیں اور داستان بڑی دلچسپ، انوکھی اور سنسنی خیز تھیں۔ وہ چوں کہ
 ایک حقیقت پسند شخص تھا اس لئے اسے کسی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ نہ ہی یقین کرنے کے لئے جتنی
 طور پر تیار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے..... یہ ایک سہانا ہے۔ سہنا ایسا ہی ہوتا ہے۔ محیر
 العقول..... پھر اس نے اپنے بدن میں ایک نہیں تین مرتبہ زوردار چٹکی لی..... اسے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ
 یہ سہانا نہیں حقیقت ہے۔ وہ سہانا نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ کسی طلسماتی محل میں موجود ہے۔
 ”کیا تمہیں ہماری کسی بات کا یقین نہیں آیا ہے.....؟“ سب سے بڑے تجسس نے دریافت
 کیا۔

”ہاں.....“ پرکاش مہرہ نے جواب دیا۔ ”مجھے یہ سب کچھ کسی سہنے کی طرح لگ رہا ہے۔“
 ”وہ کس لئے؟“

”اس لئے کہ یہ ہیرے جواہرات، موتی جواہرات کی طرح دکھ رہے ہیں..... پھر تم مجسموں کی بات کرنا..... عجیب وغریب داستان جو اس محل اور پانچ ہزار برس کی لڑکیوں اور عورتوں کے بارے میں سن کر جو آج بھی ماضی کی طرح حسین اور جوان..... تنگ رانم کے بارے میں جان کر..... آج کی سائنس اتنی ترقی کر چکی ہے کہ ان باتوں کا یقین نہیں کیا جاسکتا..... کوئی بھی یقین نہیں کرے گا۔“

”ہم بے جان مجسمے ہیں لیکن جو انسانوں کی طرح بات کر رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے دیوتا نے اس کی طاقت دی ہے..... اس حقیقت اور سچائی کا تمہیں بہت جلد اندازہ ہو جائے گا..... وہ دیکھو..... لڑکیاں اور عورتیں تیری نظر آ رہی ہیں۔“

اس مجسمے نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ پرکاش مہرہ نے دیکھا اور کھڑکی کے پاس جا کر جھانکا۔ لڑکیوں اور عورتوں کا ایک جھٹھا تھا مچھلیوں کی طرح تیرتا جا رہا تھا۔ وہ مچھلیوں کی حالت میں تھیں۔

اس کے سارے جسم پر سنسنی دوڑ گئی۔ ان کے حصول کے لئے اس کے ارمان مچلنے لگے۔ وہ مختلف انداز اور زاویوں سے تیرتی ہوئی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں لیکن دل سے نہیں..... وہ دل تمام کدہ گیا۔ جب وہ پلٹا تو ایک مجسمے نے کہا۔

”کیا اب ہماری بات کا یقین آیا۔ تم نے دیکھ لیا تاہ کس قدر حسین ہیں؟“

”کیا پانچ ہزار برس پہلے واقعی لڑکیاں ایسی جوان اور حسین ہوتی تھیں؟“ پرکاش مہرہ نے پوچھا۔

”ہاں.....“ وہ مجسمہ بولا۔ ”یہ حسن و شباب اور کشش اور جسمانی نشیب و فراز ماضی میں بے حجابی کے سبب بھی فتنہ اور بد چلنی کا سبب بنے..... یہ ایک جادو ہے جو مرد پر چل جاتا ہے۔ اس سے بڑا کوئی جادو، دنیا میں کوئی نہیں ہے..... ہر دور میں یہ جادو فساد کی جڑ بن رہا ہے۔ آج بھی ہے..... اگر عورت اتنی خوب صورت اور پرکشش نہ ہوتی پھر آبدور یزی، بے حرمتی اور بد کرداری دنیا میں جنم نہ لیتی..... اچھا..... اب خاموش ہو جا۔ ہم بھی ہو جاتے ہیں۔ کمرے کی طرف ایک لڑکی آ رہی ہے۔ شاید تجھے مہاراجا کے دربار میں پیش کرنے ساتھ لے جانے کے لئے.....“

پرکاش مہرہ کو راہ داری میں آہٹ سی محسوس ہوئی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ ایک حسین لڑکی اس حالت میں نمودار ہوئی جس حالت میں اس نے سمندر میں دیکھا تھا۔ اس حالت میں دیکھ کر اس پر کوئی بجلی سی آ گری۔ وہ دل فریب انداز میں مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ دل پر قیامت ڈھا گئی۔ پرکاش مہرہ اس کے سارے جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ اسے اپنے جذبات پر قابو پانا

دشوار ہو رہا تھا۔ وہ لباس میں بھی ہوتی تو پرکاش مہرہ بے قابو ہو جاتا..... پرکاش مہرہ کے جی میں آیا کتا گے بڑھ کر وہ اسے اپنی آغوش میں لے لے۔

وہ اپنے ملک ہی میں نہیں جب بھی کاروباری دورے پر امریکہ اور یورپ..... کسی بھی غیر ملک کے شہر میں جاتا تو مقامی عورتیں اور لڑکیاں رات کی تنہائی میں اس کی بہترین رفیقہ ثابت ہوتی تھیں۔ شراب اور شباب سے اپنی راتیں رنگین کرتا تھا۔

پانچ ہزار برس قبل لڑکیاں کتنی حسین اور پرکشش ہوتی تھیں.....؟ اس نے لمبے کے لئے سوچا۔ آج کیوں نہیں ہیں؟ نہ امریکہ اور یورپ میں ہیں اور نہ ہی ایشیا میں..... اس کے سامنے قلو پٹھر بھی ماند تھی..... اسے ایسا لگ رہا تھا کہ بھگوان نے اس لڑکی کو کسی خاص سانچے میں ڈھال کر بڑی ذلت سے بنایا ہے۔ ایسا سانچہ اب کیوں نہیں.....؟ کیا بھگوان نے وقت کے ساتھ ساتھ سانچہ بدل دیا ہے..... آج اس دنیا میں اس قدر حسین لڑکیاں اور عورتیں نظر نہیں آتی ہیں..... بد صورت..... بے کشش، عیب دار اور ایسی لڑکیاں اور عورتیں جن کی طرف دیکھنے کو دل نہیں کرتا..... اس نے ان لڑکیوں اور عورتوں کو سمندر میں تیرتے دیکھا ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے کم نہیں تھی۔ ایک سے ایک بڑھ کر تھی۔

”آپ میرے ساتھ چلیں.....“ اس لڑکی نے قریب آ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔

اس نے سوچا..... پوچھیے..... کہاں؟ اور کس لیے..... لیکن وہ اس لڑکی کے ہاتھ تھامنے سے ایسا حیر زدہ ہوا کہ وہ سب کچھ بھول گیا۔ پھر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ اس کا ہاتھ چھوڑ کر دروازہ کھولا۔ جب وہ باہر آیا تو لڑکی اور دروازہ بند کر کے اسے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور سبک خراہی سے چلنے لگی۔ اس کے بجلی بھرے بدن کے پیچ و خم نے اسے بے قابو کر دیا۔ اس نے لپک کر لڑکی کو دیو بچ لیا۔

لڑکی نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اسے تھوڑی دیر تک خود سپردگی سے من مانی کرنے دیا۔ پھر وہ اسے سامنے والے کمرے میں لے آئی۔ یہ کمرہ انہایت آراستہ خواب گاہ تھا۔ ایک کونے میں شان دار اور بہت بڑی مسبری تھی۔

”سنو.....“ وہ بولی۔ ”ہمکنے اور حد سے زیادہ تجاوز کرنے کی ضرورت نہیں..... ابھی مہاراجا کے دربار میں حاضری دیتا ہے..... وہاں سے واپسی کے بعد تم اس کمرے میں آ جانا..... تم جب تک دل کرے مہمان رہو گے..... میرے کمرے کا دروازہ جو ہے اس کی پیشانی پر تاگن کی تصویر بنی ہوئی ہے..... چلو..... میں تمہیں دربار تک پہنچاؤں..... مہاراجا تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔“

”مہاراجا نے مجھے کس لئے بلایا ہے.....؟“ پرکاش مہرہ بولا۔ ”اس نے کس لئے مجھے قید کیا

ہوا ہے.....؟“

”یہ تو میں نہیں جانتی اور نہ ہی میں جانتی ہوں کہ کس لئے قید کیا ہے؟“ وہ بولی۔ ”تم پہلے آدی ہو جسے یہاں قید کیا گیا ہے؟“

”یہ مہاراجا کب سے اس محل میں حکومت کر رہا ہے.....؟“ پرکاش مہرہ بولا۔

”تھوڑے دنوں سے.....“ وہ بولی۔ ”جب سے اس مجھے نے جہنم لیا ہے..... اسے سری لنکا سے یہاں لایا گیا ہے تب سے وہ یہاں حکومت کر رہا ہے..... وہ پراسرار قوتوں کا مالک ہے..... انتہائی طاقت ور ہے..... اس لئے ہم سب اس کے محکوم ہیں۔“

”وہ مجسمہ ہے یا انسان ہے.....؟“ پرکاش مہرہ نے سوال کیا۔

”وہ کسی بھی روپ میں ظاہر ہو سکتا ہے..... اس وقت وہ انسان کے روپ ہی میں ہے۔“ کمرے سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پرکاش نے سوال کیا۔ ”کیا وہ تم لوگوں کو تنگ اور پریشان کرتا ہے.....“

”نہیں.....“ اس نے کہا۔ ”ہم پر جو پانچ ہزار برسوں سے سندھ کی حدود کے اندر رہنے کے لئے جو پابند کیا گیا ہے اسے اس نے برقرار رکھا ہوا ہے.....“

پرکاش مہرہ اس سے اور بھی بہت ساری باتیں پوچھنا چاہتا تھا۔ چون کہ دربار کا دروازہ آگیا تھا۔ لڑکی نے رک کر کہا۔

”تم مجھ سے بہت ساری باتیں پوچھنا چاہتا ہو..... اگر مہاراجا نے تمہیں شام کر دیا اور یہاں رہنے کی اجازت دے دی تو تم میرے کمرے میں آ جاؤ..... میں تمہیں بہت کچھ بتاؤں گی..... تمہیں ہر طرح سے اس طرح خوش کر دوں گی کہ تم اپنی دنیا میں جا کر مجھے کبھی بھی میری معیت میں گزراے لمحات بھول نہ سکو گے۔“

پھر اس نے پرکاش مہرہ کی بات کا انتظار کئے بغیر بڑھ کر دروازے پر تین مرتبہ دستک دی اور پھر اس کے سونے کا لٹو تھام کر اسے گھمایا۔ دروازہ اتنا کھولا کہ اس میں سے صرف وہ گزر سکتا تھا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی دروازہ بند ہو گیا۔

پرکاش مہرہ نے دربار میں قدم رکھتے ہی دیکھا کہ یہ نہایت وسیع و عریض، بے حد کشادہ اور آراستہ و بے آراستہ ہال ہے۔ اس کے کونے میں سامنے ایک بہت بڑا تخت تھا جس میں بہت ہی بڑے بیش قیمت ہیرے جڑے ہوئے چمک رہے تھے۔ اس تخت پر تنکا رام کا مجسمہ بڑی شان اور کدھر سے بیٹھا ہوا تھا..... اس نے دس اور تجسوں کو دیکھا جو سب کے سب سونے کے تھے۔ وہ آنے سے سامنے مودب، انسانوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ تنکا رام کا مجسمہ اسے گھورنے لگا۔

”ادھر آؤ..... لالچی انسان.....“ مجسمہ نے اسے گرج دار آواز میں مخاطب کیا۔

اس کے بارے بدن میں خوف و دہشت کی لہر دوڑ گئی۔ اس کے سارے جسم کی طاقت جیسے سلب ہو گئی تھی۔ وہ تخت کی طرف بڑھا تو اسے اپنے پیر منوں بھاری لگ رہے تھے۔ وہ تخت کے سامنے جا کر رکھا۔

”تم مجھے دولت کمانے کا ذریعہ بنا رہے تھے۔“ مجسمہ نے کہا۔ ”کیا تمہارے پاس دولت کی کوئی کمی ہے؟“

”نہیں..... یہ بات نہیں۔“ پرکاش مہرہ ہمت کر کے بولا۔ ”دنیا والوں کو اور اپنے دلش میں یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ دو ہزار برس پہلے مہاراجا تنکا رام نے سری لنکا میں حکومت کی..... اس کے سورگ بارش ہونے کے بعد وہاں کی روایت کے مطابق اس کے پتا جی نے اس کا مجسمہ سونے کا بنا کر سادھی میں دفن کر دیا تاکہ اس کی آتما شناختی سے رہ سکے.....“

”دو ہزار برس پہلے کی یہ کہانی تم لوگوں کو کیسے معلوم ہوئی.....؟“ تنکا رام کے لہجے میں حیرت اور تجسس بھی تھا۔

”اس دنیا میں ایسے ماہر آثار قدیمہ موجود ہیں جو اپنے علم کی بدولت کچھ چیزوں سے ماضی کا کھوج لگا لیتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا تھا۔ ”تمہارے بارے میں سادھی سے برآمد والی اشیاء اور تمہارے مجسمے سے تمہارا نام وغیرہ معلوم کیا۔“

”حیرت کی بات ہے۔“ مجسمہ نے کہا۔ ”کیا یہ جادو ہے جو ماضی کی بات معلوم کر لی جاتی ہے؟ میرے خیال میں جادو سے بھی معلوم کرنا مشکل کیا بلکہ ناممکن سی بات ہے..... مجھے تمہاری بات کا یقین نہیں آیا۔“

”یہ جدید دور کا سائنسی علم اور جادو ہے۔“ پرکاش مہرہ کہنے لگا۔ ”دو ہزار برس کیا..... دس ہزار..... لاکھوں برس کی باتیں بھی کسی ایک شے کو دیکھ کر بتائی جاسکتی ہے..... وہ آدی کا ڈھانچا ہو..... برتن اور ہیرے جو اہرات ہوں..... جیسا کہ تمہارے بارے میں بھی یہ بات علم میں آئی کہ دو ہزار برس قبل کے دور کے مہاراجا تھے۔“

مجسمہ بڑا حیران ہوا۔ اسے اب بھی پرکاش مہرہ کی کسی بات کا یقین نہیں آیا تھا۔ وہ بولا۔

”تمہارے دور کا یہ جادو جسے تمہیں سائنس اور اس کا علم کہہ رہے ہو وہ مجھ پر قابو نہیں پاسکتا اور نہ میں تمہارے ہاتھ آنے سے رہا ہوں۔ تم اپنا سائنس مجھ پر چلا کر دیکھ لو..... میں یہ بات جان چکا ہوں کہ تم یہ چاہتے ہو کہ میرا مجسمہ ساری دنیا میں دکھا کر دولت کماؤ۔ پھر مجھے پگھلا کر میرا سونا بیچ دو..... لیکن تمہارا یہ خواب، یہ خواہش اور حسرت کبھی پوری نہیں ہوگی..... میں نے یہ جہنم کیوں اور کس

ایک نوجوان کی طرح محسوس کرنے لگا۔ اس نے کبھی ایسی طاقت محسوس نہیں کی تھی۔ اس نے نس نس میں خون دوڑتا ہوا محسوس کیا۔

☆.....☆.....☆

پرکاش مہرہ تین دن تک ان تمام لڑکیوں اور عورتوں کے سنگ جشن مناتا رہا۔ ان میں سے اسے کسی نے نامراد اور مایوس نہیں کیا۔ ان کی معیت میں گزرا ایک ایک لمحہ یادگار اور ناقابل فراموش بن گیا تھا.....

پرکاش مہرہ تیسرے دن رات رنگ رلیاں منا کر سو گیا..... جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ساحل سمندر کی ریت پر پڑا پایا۔ اس وقت خالی الذہن تھا..... چند لمحوں کے بعد اسے یاد آیا کہ اسے مجسمہ نے پنڈال سے اٹھا کر سمندر میں پھینکا تھا۔ پھر اس نے خود کو ایک محل کے کمرے میں پایا تھا..... یہ محل سمندر میں بنا ہوا تھا..... اس کمرے میں ہیرے جواہرات، نوادرات ایک الماری میں تھے۔ اس کمرے میں مجسمے بھی تھے۔ اس نے ایک ہیرا اٹھا کر جیب میں رکھنا چاہا تو ہیرے نے اس کا ہاتھ جھلکایا تھا..... تمام مناظر ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگے..... کیا یہ حقیقت تھی.....!

نہیں..... نہیں..... اس نے دل میں کہا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ سمندر کی گہرائی میں شای محل ہو..... اس محل کے ایک کمرے میں نہایت قیمتی، نایاب اور انمول قسم کے ہیرے جواہرات اور موتی..... اتنے بڑے بڑے ہیرے کہیں ہوتے ہیں اور موتی بھی جن کی آب و تاب آنکھوں کو خیرہ کر دے.....؟ اور پھر ہیرے کو اس نے چوری کے ارادے سے اٹھایا تو اس کا ہاتھ جھلک گیا..... اور پھر ان محسوس کو انسانوں کی طرح پراسرار اور عجیب و غریب باتیں کرنا.....؟

اور پھر تیس عدد عورتیں جن میں دس عدد دوشیزائیں جو پانچ ہزار برس پہلے کے دور کی تھیں..... ایک سے ایک حسین..... پانچ ہزار برسوں کے دور کی ہونے کے باوجود وہ جوان کی جوان تھیں۔ زندہ تھیں اور ان پر عمروں کی چھاپ نہیں تھی..... وہ کیسے وہ پانچ ہزار برسوں سے زندہ ہوں..... انہوں نے اپنے پاپوں اور سزاؤں کے بارے میں بتایا تھا وہ ناقابل یقین تھا..... پانچ ہزار برس قبل جو تہذیب تھی وہ یہ تھی کہ انسانیت نے تہذیب کو چھو نہیں تھا..... وہ سب فطری حالت میں تھیں۔ اس کے ساتھ جس طرح پیش آئی تھیں وہ حیوانوں کو شر بادینے والی حرکت تھیں..... یورپ اور امریکہ بلکہ دنیا میں ممنوعہ قسمل کی فلمیں دھڑا دھڑ بن رہی تھیں۔ ان میں اور ان فلموں کے کرداروں میں کوئی فرق نہیں تھا..... لیکن وہ کس قدر حسین تھیں؟ تصور سے کہیں بڑھ کر..... سپنوں میں ایسی حسین عورتوں کا نظر آتا.....؟ اور پھر اس کا پسنا کیسا نشاط انگیز تھا..... نہ بھولنے والا..... اور پھر وہ

لئے لیا ہے بتادوں..... میں خون کا پیا سا ہوں..... انتقام کا پیا سا ہوں..... مجھے انتقام لینا ہے..... تم لوگوں نے اچھا کیا ہے مجھے سادھی سے نکال کر..... سادھی سے نہ نکالتے تو میں دوسرا جہنم لے نہیں پاتا..... میں چاہتا تو تمہیں موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ اس لئے نہیں اتارا کہ تمہیں بتاؤں کہ میں کیا ہوں..... تم اس محل میں تین دن تک قید رہو گے..... لیکن ایک بات یاد رکھنا کہ تم یہاں سے نہ تو ہیرے جواہرات لے جا سکتے ہو، نہ موتی اور مجسمہ..... نہ کسی لڑکی یا عورت کو..... یہ ساری لڑکیاں اور عورتیں تمہارا ہر طرح سے دل خوش کریں گی۔ جی بھر کے عیش کرو..... معلوم نہیں کیوں مجھے تم پر دم آ گیا ہے..... اور ہاں..... میری سادھی سے جو خزانہ لائے ہو..... تم اس سے بھی محروم ہو جاؤ گے..... اب تم جاؤ..... جس لڑکی اور عورت کے کمرے میں جانا چاہے جاؤ.....“

اس مجسمے کا ایسا رعب، خوف اور دبدبہ پرکاش مہرہ پر طاری ہوا کہ وہ ایک لفظ بول سکا اور نہ ہی بحث و تکرار کر سکا۔ وہ ایک مجسمے کو زندہ ہو کر انسانوں کی طرح بولتے دیکھ کر بھونچکا تھا۔ جب وہ دربار سے باہر آیا تو وہ لڑکی راہ داری میں کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر پرکاش مہرہ کا ہاتھ تھام لیا اور اسے لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھی تو پرکاش مہرہ بولا۔

”تم نے تو کہا تھا کہ کمرے میں انتظار کروں گی..... لیکن تم میرے انتظار میں یہاں کیوں کھڑی ہو.....؟“

لڑکی دل فریب انداز سے مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتی ہوئی بولی۔

”اس لئے کہ کہیں کوئی اور لڑکی یا عورت تمہیں اپنے کمرے میں نہ لے جائے.....؟ میرا پہلا حق تم پر ہے۔“

وہ اسے اپنے کمرے میں لے آئی۔ پرکاش مہرہ خود پر قابو نہ پاسکا۔ جذبات کا طوفان آیا اور پھر تہس نہس کر دیا۔ طوفان گزرنے کے بعد پرکاش مہرہ میں اتنی طاقت، سکت اور توانائی نہیں رہی تھی کہ وہ جنبش تک کر سکے۔

لڑکی نے الماری میں سے ایک بہت بڑی بوتل نکالی۔ اس میں لال رنگ کا عرق نظر آ رہا تھا۔ اس نے گلاس میں عرق اڑھایا۔ نصف گلاس تک بھرا..... پھر اسے سہارا دے کر بٹھایا..... پھر گلاس اس کے منہ سے لگا دیا۔ یہ عرق بڑا میٹھا، عجیب و غریب خوشبو لئے ہوئے ذائقہ دار تھا۔ وہ ایک ہی سانس میں پی گیا۔

اس کے سارے جسم میں ایک عجیب سی فرحت دوڑ گئی۔ اس کی ساری کھوپٹی ہوئی توانائی، طاقت اور جان لوٹ آئی تھی۔ کم زوری کا دور دور تک نام و نشان نہیں رہا۔ وہ پھر سے اپنے آپ کو

مجسمہ..... اس کی دھمکیاں.....

وہ ساحل سمندر پر اکیلا پڑا تھا۔ اس کے کپڑے خشک تھے۔ اس مجسمے نے اسے اٹھا کر نہیں پھینکا تھا..... بلکہ اس کے کسی دشمن نے اسے پٹا تازہ کر کے یہاں لا ڈالا..... دشمن کون ہو سکتا ہے.....؟ کون ہو سکتا ہے.....! سری لنکا کی حکومت کے سوا..... اس کا ایک آدمی اس ملک کی نمائندگی کر رہا ہے۔ اس کی تمام تر کوشش یہی ہے کہ مجسمہ اور کھدائی اور سادھی سے برآمد ہونے والا خزانہ اور نوادرات اس کے ملک کو واپس مل جائیں..... اب اسے کیا کرنا اور کون سا قدم اٹھانا چاہئے.....؟

☆.....☆.....☆

شاستری نے جو یہ واقعہ دیکھا تھا وہ کسی ڈراؤنے خواب سے کہیں خوف ناک اور دہشت ناک تھا۔

اس کے بدن پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ ان کی نس نس میں خون برف کی طرح بچھ ہونے لگا۔ وہ اپنی جگہ کسی مجسمہ کی طرح ساکت و جامد ہو گیا۔

لمحے کے لئے اسے ایسے لگا تھا کہ..... جیسے وہ کوئی سنسنی خیز، تحیر انگیز اور دل دہلا دینے والی فلم دیکھ رہا ہو۔ ہار قسم کی فلموں میں روٹنے کھڑے کر دینے اور بھونچکا کر دینے والے مناظر کی بھرمار ہوتی تھی۔ دل دھڑکنا بھول جاتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ فلم ہے۔ ان مناظر کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں لیکن پھر بھی تماشا کی حالت غیر ہو جاتی تھی۔ اس وقت وہ بھی ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھا۔ اس نے جو کچھ دیکھا وہ پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا تھا۔ اندر سے اس کی حالت بڑی غیر ہو رہی تھی۔

اس کا بھی یہی خیال تھا کہ مجسمہ کو کسی سازش یا منصوبے کے تحت تابوت سے غائب کر دیا گیا.....؟ لیکن جب اس نے مجسمہ کو اچانک اور غیر متوقع سامنے پایا تو اس کی مٹی گم ہو گئی تھی..... جب کہ پرکاش مہرہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔ پرکاش مہرہ نے چوں کہ اس کے ساتھ بدتمیزی اور بداخلاقی اور غرور و تکبر کا مظاہرہ کیا تھا اس لئے مجسمہ نے اسے مڑا چکھا دیا تھا۔

جب مجسمہ نے پرکاش مہرہ کو کرکٹ کی گیند کی طرح پنڈال سے باہر پھینکا تو اس کا خیال تھا کہ اس کی بھی شامت آگئی..... جب مجسمہ نے اسے قہر آلود نظروں سے گھورا تو اس کی جیسے جان ٹل گئی۔ وہ دل میں اس خیال سے ڈر اور خوف سے کانپ گیا کہ کہیں وہ اسے بھی پرکاش مہرہ کی طرح پھینک نہ دے..... لیکن مجسمہ نے اسے ایک لحظہ اوپر سے نیچے دیکھا۔ پھر وہ ایک دم سے اس کی نظروں کے سامنے گدھے کے سینک کی طرح غائب ہو گیا۔ ایسا لگا تھا کہ اس کا وجود تھا ہی

نہیں.....؟ تب شاستری کی جان میں جان آئی اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ اس کا سارا بدن پسینے میں بھیگ چکا تھا۔

شاستری نے نزدیک خوف و دہشت کی بات تھی کہ اس مجسمہ میں دو ہزار برس کے بعد اس مجسمہ میں اس کی آتما آگئی تھی جس سے اس نے دوسرا جنم لے لیا تھا۔ اس میں زندگی آگئی تھی..... وہ زندہ ہو گیا تھا۔ کیوں اور کس لئے.....؟ اس نے یہ دوسرا جنم کس لئے لیا..... اب وہ اس دور میں کیا کرے گا.....؟ اس کی زندگی کس کام کی..... دو ہزار برس پہلے کے دور اور آج کے دور میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

شاستری نے مجسمہ کی حرکت سے اندازہ کیا کہ وہ خونی بن گیا ہے..... کیا وہ انسانیت کا خون خرابا کرے گا.....؟ اگر ایسا ہوا تو یہ بہت ہی برا خوف ناک ہوگا..... اس لئے بھی کہ اس سے مقابلہ آسان ہوگا۔ ایک تو وہ طاغوتی طاقت کا مالک ہے۔ جدید سائنس پر اسرار علوم پر یقین نہیں رکھتی ہے اور نہ ہی اس کا توڑ اور مقابلہ کر سکتی ہے..... جس طرح لوہے کو لوہا کا ٹٹا ہے اسی طرح اس خونی مجسمے سے پر اسرار علوم سے ہی مقابلہ کیا جاسکتا ہے..... ایسا کوئی مہا جادوگر یا سنیا سی اور سادھو مہاراج کو تلاش کرنا ہوگا جو اس سے مقابلہ کر سکے..... لیکن ایسا آدمی ملے گا کہاں.....؟ ہندوستان میں آج بھی پائے کے جادوگر، سنیا سی، سادھو موجود ہیں۔ اصل کام انہیں تلاش کرنا اور ان کی خدمات حاصل کرنا ہے۔

پھر اسے ایک دم سے نقش کا خیال آیا۔ اس نے سوچا۔ کاش!..... نقش اس کے ہاتھ سے نہ جاتا..... کاش! نقش اسے مل جائے.....؟ نقش کے ملنے سے وہ اس کی مدد سے اس خونی مجسمہ پر قابو پاسکتا تھا..... اگر نقش نہ ملا تو پھر بڑی تباہی و بربادی ہوگی..... جانے وہ کتنی جانوں کے خون سے اپنی پیاس بجھائے.....؟ ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں معصوم اور بے گناہ اس کی بھیٹ چڑھ جائے..... اسے ہر قیمت پر نقش کرنا ہوگا۔

کاش..... یہ مجسمہ ملتا اور نہ لایا گیا ہوتا..... اور نہ ہی یہ سونے کا ہوتا..... سارے فساد کی جڑ اس لئے ہے کہ یہ سونے کا ہے..... پرکاش مہرہ دولت کے حصول کے اندھے جنون..... زیادہ سے زیادہ کمائے کے چکر میں اس نے نہ صرف اپنے سر مصیبت مول لی بلکہ اور لوگوں کو بھی ایک عذاب اور آفت میں مبتلا کر دیا۔

نقش اسے کہاں سے اور کیسے مل سکتا ہے.....؟ کہیں یہ سنیل داس کی حرکت تو نہیں ہے.....؟ سنیل داس کو شاید اس بات کا علم ہوگا کہ نقش کی مدد سے مجسمہ حاصل کیا جاسکتا ہے..... وہ اس مقصد سے تو سری لنکا سے ہندوستان آیا ہے..... یقیناً اس نے کسی ایسے جادوگر کی خدمات حاصل کی ہوگی

جو اس کا ہم وطن ہے..... اس نے نقش حاصل کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو قتل کے بارے میں جانتا ہو..... اب اسے سنیل داس کو تلاش کرنا ہوگا جو پراسرار رہتا ہوا ہے۔

سنیل داس کی تلاش میں جانے سے قبل وہ پرکاش مہرہ کی خبر لینا چاہتا تھا..... وہ کیا سمندر میں گرا ہے یا خشکی پر..... اگر خشکی پر گرا ہے تو زندہ ہے یا مردہ.....؟ اسے پرکاش مہرہ کی زندگی اور موت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی..... وہ اپنے لوگوں کو اس خونی بلا سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ خون ریزی اور موت سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

وہ پنڈال سے نکل کر سمندر کے کنارے آیا۔ اس وقت اندھیرا سا تھا۔ چاند کے نکلنے میں دم تھی۔ دائیں جانب قدرے فاصلے پر اسے ریت پر کوئی بڑا دکھائی دیا۔ صاف اور واضح نہیں تھا۔ ساحل سسنان اور ویران پڑا تھا۔ رات کے اندھیرے میں لوگ نہیں آتے تھے۔ چاندنی راتوں میں بہت سارے جوڑے رنگ رلیاں منانے اور دل کے ارمان پورے اور جذباتی محبت میں ڈوب جانے اور تیرنے اور بنانے بھی آتے تھے..... لہذا پرکاش مہرہ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے دیکھتا اس کی طرف بڑھا۔ وہ قدرے پہنچ کر ٹھٹک کے رک گیا..... وہ پرکاش مہرہ نہ تھا..... ایک جوان لڑکی اور تیس برس کا مرد تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے ہوا جوانی کے جنگل میں گز رہا تھا۔ انہیں اس کی آمد کا احساس نہ ہوسکا اس نے اندازہ کر لیا کہ پورا اس لڑکی کو پھانس کر لایا ہے اور محبت سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ان کی سرگوشیوں سے اسے یہی اندازہ ہوا تھا اس بے شرم میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نو جوان لڑکیاں خوابوں کے سراب کے پیچھے بھاگ کر آلودہ ہو جاتی تھیں..... ہو رہی تھیں۔ وہ واپس لوٹ آیا..... اب اس بات میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا پرکاش مہرہ سمندر میں غرق ہو گیا ہے..... پہلے تو اس نے سوچا کہ وہ ساحل سمندر کی انتظامیہ کمرہ کر دے کہ پرکاش مہرہ سمندر میں غرق ہو گیا ہے..... اگر وہ انہیں بتاتا کہ پرکاش مہرہ کو ایک مہم نے پنڈال میں سے اٹھا کر سمندر میں پھینک دیا ہے تو اس کی بات کا یقین نہ کرتے..... جتنے اہل پاگل سمجھتے..... کیوں کہ سمندر پنڈال سے کوئی نصف فرلانگ پر نصب کیا ہوا تھا..... ”ایک آدمی لٹا میں کسی کے پھینکنے سے اڑتا ہوا سمندر میں کیسے گر سکتا ہے؟“ اس نے سوچا۔ ”پرکاش مہرہ مر چکا ہوگا..... اس کا مرجانا ہی بہتر ہے..... اس کی لاش کو مچھلیاں کھا جائیں گی..... یا پھر کسی دور مقام پر سمندر کی لہریں پھینک دیں گی..... زندگی رہے گی تو فوج جائے گا..... لہذا اب اسے پرکاش مہرہ کی لاش کرنے کے بجائے نقش کی تلاش میں سنیل داس کے پاس جانا چاہئے..... نقش یقیناً سنیل داس کے پاس ہی ہوگا۔“

آشائیل ایک ہوٹل تھا۔ یہ چار منزلہ پرانی لیکن مضبوط اور لمبی چوڑی عمارت تھی۔ اس میں مردان اور اندرون ملک سے ممبئی میں ملازمت کے لئے جوڑیاں، عورتیں اور مرد..... ملازم پیشہ مہاں بیوی بھی ٹھہرتے تھے..... اس کے علاوہ اس میں ان مردوں اور عورتوں اور لڑکیوں نے کمرے کرائے پر لے رکھے تھے جو آشنائی رکھتے تھے۔ یہاں وقت گزاری کرتے تھے..... یہاں سب کچھ چلتا تھا۔ چل رہا تھا..... اس کا مالک اندرون ملک کے ملازم پیشہ مرد، عورتوں کو لڑکیوں کو ترجیح دیتا تھا۔ انہیں رعایتی کرایہ پردے دیتا تھا۔ یہ ایک کمرے کے فلیٹ تھے۔ اس میں ملحق داش روم..... کشادا کچن اور لاؤنج بھی تھا۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔

شاستری جب گراؤنڈ فلور پر پہنچا تو اس کا دفتر استقبالہ بند تھا۔ یہ اس وقت کھلا رہتا تھا جب کوئی کمرہ خالی ہوتا تھا۔ اس کے کسی بورڈ پر مالک عمارت کا فون نمبر رابطہ کے لئے لکھا ہوا تھا۔ ساحلوں کے لئے بھی کمرے کرائے پر دیئے جاتے تھے۔ اس وقت چوکی دار نہ تھا۔ شاید تھا ہی نہیں..... زینے اور بیڑیاں سسنان اور ویران تھیں..... لفٹ پر ایک کارڈ لٹکا ہوا تھا۔ خراب اور ناقابل استقبال ہے..... لیکن اس وقت ایک امریکی سیاح عورت جو چالیس برس کی ہوگی ایک ہندوستانی بیس برس کے لڑکے کے ساتھ محبت بھرے جذبات میں گم تھی۔ نہایت آزادی اور بے ہاکی سے اظہار محبت مغربی انداز سے ہو رہا تھا۔ لیکن ان دونوں نے لفٹ کو ناقابل استعمال بنا دیا تھا۔

شاستری کے لئے یہ بڑا مسئلہ تھا کہ سنیل داس کا کمرہ معلوم کرے۔ اس وقت نو بج چکے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کس سے سنیل داس کا فلیٹ معلوم کرے۔ اس کے لئے بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔ کیوں کہ بہت سارے کمروں کے نمبر اس قدر دھندلے اور مٹیا لے ہو گئے تھے کہ راہ داری کی ملکی روشنی میں صاف پڑھنے نہیں جا رہے تھے۔

اس کے علم میں جو فلیٹ نمبر تھا۔ اس کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ اس نے پہلی منزل کے کمرہ نمبر بارہ پر دستک دینے کے لئے جو ہاتھ رکھا تو وہ چوں کہ بھڑا ہوا تھا وہ زرا سا کھل گیا۔ لاؤنج اور کچن میں اندھیرا تھا لیکن بیڈ روم میں روشنی تھی۔ بیڈ روم کا منظر اس روشنی میں نہا رہا تھا۔ راہ داری اور لفٹ میں سناٹا تھا۔ اس نے بستر پر مرد اور عورت کو غلاظت کے دلدل میں دھنسا دیکھا۔ عورت کہہ رہی تھی۔

”نریش.....! تم مجھے اس بات سے نروک سکتے ہو اور نہ منع کر سکتے ہو کہ میں اپنے افسر کو لاش کرتی ہوں..... ہمارے درمیان جو معاہدہ ہوا ہے وہ یہ کہ ایک دوسرے کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گے..... میں نے کبھی اس بات پر تمہیں ٹوکا نہیں کہ تم اپنی افسر ششی کلا

کے ساتھ جو تم سے بیس برس بڑی ہے عشق لڑا رہے ہو اور اس کی ہر خواہش پوری کرتے ہو۔۔۔۔۔ میں تمہارے لئے کھانا پکاتی ہوں۔۔۔۔۔ کپڑے دھوتی ہوں۔ جب اور جس وقت تمہیں میری طلب ہوئی انکار نہ کیا۔۔۔۔۔ تم ستر فیصد اخراجات برداشت کرتے ہو۔۔۔۔۔ اگر میں بارگراں ہوں تو معاہدہ ختم کر دو۔۔۔۔۔ اس لئے کہ میں اس سے زیادہ ایک فیصد بھی تمہیں نہیں دے سکتی۔ کیوں کہ سات ماہ بعد میری شادی ہونے والی ہے۔ اگر میں مطلوبہ چیز نہیں لے سکتی تو ساس، مندریں مجھے زندہ جلادیں گی۔۔۔۔۔ اس لئے میں اس بات کی کوشش کرتی ہوں کہ اپنے آپ کو جتنا کیش کر سکوں کر لوں۔۔۔۔۔ پانی پانی جمع کر رہی ہوں۔ میرے لئے سو روپے کی رقم بھی بہت بڑی ہے۔۔۔۔۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میرا بوڑھا افسر مجھ پر ریٹائر ہو گیا ہے۔ میں نے اسے اس فریب میں رکھا ہوا ہے کہ میں اس سے شادی کروں گی۔۔۔۔۔ مجھے یہ بات پسند نہیں کہ وہ اپنی چٹی کو طلاق دے دے۔۔۔۔۔ اس کی دو جوان لڑکیاں بھی ہیں، میں جیسی بھی ہوں، جو بھی ہوں۔۔۔۔۔ لیکن میرے اندر عورت تو ہے۔۔۔۔۔“

”آئی ایم ساری۔۔۔۔۔!“ مرد نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”بات یہ ہے شیلہ۔۔۔۔۔! ہم دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔ تم نہیں جانتی ہو کہ اس بوڑھی کو خوش کرتے سے مجھے کس اذیت اور کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ وہ چیل میری وجاہت پر مرثی ہے۔۔۔۔۔ مہنگائی کس قدر بڑھ گئی ہے۔۔۔۔۔ جب بھی میری چٹی کی چشمی یا فون آتا ہے تو اس میں اس کا ایک ہی رونا ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اس لئے میں تم سے کہتا رہتا ہوں کہ پانچ سو روپے بڑھادو۔۔۔۔۔ اب میں نہیں کہوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ ہماری زندگی میں بد مزگی پیدا ہو۔۔۔۔۔“

شاستری نے ایک لمحہ کے لئے سوچا کہ کیسی کیسی کہانیاں جنم لیتی ہیں۔۔۔۔۔ دونوں ہی بہت خوب صورت تھے۔۔۔۔۔ اس نے دروازے پر دستک دی اور دروازہ کھینچ لیا۔ اس نے کسر پھرا، آہٹ سی سنی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ نصف سا کھلا تو ایک چالیس برس کا مرد کھڑا تھا۔ وہ صرف تہ بند میں تھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری اور جن جھلاہٹ تھی۔ آنکھوں میں غصے کی سرلی تھی۔ لیکن شاستری کی نگاہ اس کے عقب پر پڑی۔ وہ عورت جو بیس بائیس برس کی ہوگی گا، سے بدن ڈھانپ رہی تھی۔ اس کے ریشمی سیاہ بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے شاستری کو افسوس ہوا کہ وہ کیوں کباب میں ہڈی بن گیا۔

مرد نے شاستری کو خشکیں نظروں سے اوپر سے نیچے دیکھا۔ پھر غرایا۔
”کون ہو تم۔۔۔۔۔؟ یہ کوئی وقت ہے جو دروازہ کھٹ کھٹا کر دوسرے کے آرام میں خلل ڈال جائے۔ تمہیں تیز نہیں۔“

”میں معافی چاہتا ہوں کہ۔۔۔۔۔ میں نے آپ کو نا وقت ڈسٹرب کیا۔۔۔۔۔“ شاستری نے معذرت خواہانہ انداز سے کہا۔ ”میں یہاں پہلی بار آیا ہوں۔ ایک تو چوکی دار ہی نہیں ہے اور کوئی ایسا شخص نہیں ملا جو میری رہنمائی کر سکے۔۔۔۔۔ بہت سارے دروازوں پر نمبر اس قدر دھندلے اور مٹا دیے ہیں کہ پڑھنے میں جارہے ہیں۔۔۔۔۔ اس عمارت میں کمرانمبر بتیس میں ایک سری لنکن باشندہ سنیل داس ٹھہرا ہوا ہے۔“ پھر اس نے توقف کر کے حلیہ بتایا اور پھر کہا۔ ”کیا آپ یہ بتانے کی زحمت کریں گے کہ وہ کمر اکدھر ہے۔۔۔۔۔“

”کیا میں تمہارا نوکر، چوکی دار اور فالتو آدمی ہوں۔“ وہ بھنا کر بولا۔ ”دفع ہو جاؤ۔۔۔۔۔“ شاستری نے جیب میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو سوسو کے وہ نوٹ آ گئے۔ مجبوری تھی۔ سنیل داس کا ہر قیمت پر پتا چلنا تھا۔ وہ پچاس پچاس کے دونوں نکالنا چاہتا تھا۔ دوسو کی رقم بڑی تھی۔ اس نے نوٹ مرد کی نظروں کے سامنے لہرائے۔ وہ عورت چادر میں ملبوس آئی تو اس کا بھڑکیلا جسم ابل رہا تھا۔ انگ انگ میں بجلی بھری تھی۔ وہ اسے روشنی میں بے حجاب دیکھ چکا تھا۔ لیکن چادر میں بھی ملبوس قیامت ڈھا رہی تھی۔ شاستری نے دل میں سوچا۔۔۔۔۔ مرد نے کیا اچھا ہاتھ مارا ہے۔ اس عورت نے شاستری کے ہاتھ میں نوٹ دیکھے تو مرد کو پیچھے کر کے اس کے ہاتھ سے نوٹ اچک لئے۔ پھر بولی۔

”آپ نے جو حلیہ بتایا ہے سری لنکن باشندے کا۔۔۔۔۔ اسے میں نے دیکھا ہے۔۔۔۔۔ وہ کوئی تین چار دن سے شاید ٹھہرا ہوا ہے۔۔۔۔۔ کمرانمبر بتیس اس لائن میں سب سے آخر میں ہے۔۔۔۔۔ چوکیدار کہہ رہا تھا کہ وہ کمر کڑ ہے۔“ اس شہر کی کسی ٹیم میں شامل ہونے آیا ہے۔“
”بہت بہت شکریہ۔۔۔۔۔“ شاستری نے ممنونیت سے کہا۔ ”میں ایک بار پھر ڈسٹرب کرنے کی معذرت چاہتا ہوں۔“

مرد دروازہ بند کرنے کے بجائے عورت کے ہاتھ سے نوٹ لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔۔۔۔۔ عورت نے ہاتھ پیچھے کئے تو چادر کے کونے ہاتھ سے نکل گئے۔ شاستری کی نظروں کے سامنے ایک کونداسالپکا۔ ان دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں تو عورت نے سرخ ہو کر دروازہ بند کر دیا۔ مرد کو پتا نہیں چلا کہ شاستری نے عورت کو کس حالت میں دیکھ لیا ہے۔۔۔۔۔ دروازہ بند ہوتے ہی مرد ہڈیانی لہجے میں بولا۔

”تم مجھے اس میں حصہ دو۔۔۔۔۔ ایک سو روپے پر میرا بھی حق ہے۔“
”میں کیوں دو۔۔۔۔۔؟“ عورت تیز لہجے میں بولی۔ ”تم اسے پتا اور اس شخص کے بارے میں بتانے کے بجائے تم اس سے بدتمیزی سے پیش آئے اور غصے سے کہا تھا کہ دفع ہو جاؤ۔۔۔۔۔ میں

تہارا نوکریا چوکیدار نہیں ہوں..... اس نے دوسو روپے لہرائے تو تب بھی تم نے نوٹ لئے..... میں نے نوٹ لئے کر کمرے اور اس شخص کے بارے میں بتایا تو تم دعوے دار بن رہے ہو.....

”مجھے اس پر غصہ اس لئے آیا تھا کہ اس نے ڈسٹرب کر کے سارا حرا کر کر دیا تھا.....“

وہ مفاہمانہ لہجے میں بولا۔ ”جب کہ ہم ہر معاملے میں فغٹی فغٹی کر رہے ہیں تو اس میں بھی فغٹی فغٹی کر لو..... کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ اس نے صرف کمرانمبر معلوم کرنے کے لئے دوسو روپے دے دیئے.....“ ”فغٹی فغٹی نہیں.....“ عورت نے کہا۔ ”صرف تھرٹی پرسنٹ..... میں تمہیں صرف تھرٹی پرسنٹ دوں گی۔“

مرد نے کیا کہا اس نے سنا نہیں..... کیوں کہ وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ لیکن اس نے جو بیجان خیز نظارے دیکھے تھے اس نے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑادی.....

شاستری نے نیم اندھیرے کے باعث غلطی سے برابر والے کمرے کا دروازہ کھٹ کھٹا دیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک عورت نے جو شب خوابی کے لباس میں تھی اس کے گلے میں بانٹیں حائل کر کے بولی۔ ”رندھیر! میں کبھی تم نہیں آؤ گے..... میرے شوہر کو تو ناٹ ڈیوٹی پر گئے آدھا گھنٹے سے زیادہ ہو گیا..... تمہارے انتظار میں میرا حال ہو گیا.....“

اس عورت کے ہونٹوں نے اس کے ہونٹوں کو بولنے نہیں دیا۔ ایک طویل بوسے کے بعد عورت بولی۔ ”اندھیر چلو.....“

”میں رندھیر نہیں ہوں محترمہ.....! کمرانمبر بتیں کون سا ہے.....؟“ شاستری نے اسے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”رندھیر نہیں ہو.....؟“ عورت نے چونک کر آنکھیں پھاڑ کے دیکھا۔ ”چلو..... کوئی بات نہیں..... وہ ڈرپوک اور بزدل ہے نہیں آئے گا..... یہ کمرانمبر اکتیس ہے..... اس میں کوئی عورت نہیں رہتی ہے..... تم آ جاؤ..... تم تو رندھیر سے لاکھ درجے بہتر ہو..... وہ آئے گا تو اسے گھسنے نہیں دوں گی۔“

اگر وہ سنیل داس کی تلاش میں نہ آیا ہوتا تو اس عورت کی دعوت قبول کر لیتا۔ وہ کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ اس کا حسن و شباب اور جسم بے مثال تھا..... اس کے چہرے کی مصوہیت نے اسے اور حسین بنا دیا..... اسے بڑا دکھ ہوا کہ پستی اور غلاظت میں کیسی عورتیں گری ہوئی ہیں۔ اس کی عمر ہی کیا تھی۔ یہ مشکل انیس برس کی ہوگی۔

”بہتر ہے تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“ شاستری نے کہا۔ ”مجھے تمہاری دعوت قبول نہیں ہے.....؟“

”کیا تم مرد نہیں ہو.....؟“ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی اور مسکرا دی۔

”یہی سمجھ لو.....“ وہ بولا۔ پھر اس نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ ”میں پولیس انسپکٹر ہوں۔

ایک کیس کی تحقیقات کے لئے آیا ہوں۔“

پولیس انسپکٹر کا سنتے ہی عورت کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس نے غڑاپ سے اندر ہو کر دروازہ بند کر لیا۔

اس نے جیب سے لائٹر نکال کر روشن کیا..... اس کی روشنی میں اس نے برابر والے کمرے کا دروازہ پر دیکھا۔ اس کی پیشانی پر نمبر صاف تھا۔ لائٹر بجھ گیا..... اس نے وقفے وقفے سے دروازے پر تین مرتبہ دستک دی..... تیسری دستک قدرے تیز تھی۔ اتنی تیز کہ گہری نیند سونے والا بھی بیدار ہو جائے..... شاستری کو سب سے پہلے خیال جو آیا وہ یہ تھا کہ کہیں وہ کسی لڑکی کے ہاتھ غلاظت کے دلدل میں دھنسا ہوا دنیا دافنیہا سے بے نیاز اور کسی بات کا ہوش و حواس نہ رہا ہو..... شاید اس لئے نہ تو جواب مل رہا ہے اور نہ ہی دروازہ کھل رہا ہے..... جو مرد بھی اندرون یا بیرون ملک سے آتا ہے وہ عورت اور مشروب سے وقت گزاری کرتا تھا۔ اس لئے کہ اس شہر میں ہر رنگ و نسل، قوم اور مذہب کی اور ہر قیمت کی لڑکیاں اور عورتیں دستیاب تھیں۔ اس طرح شراب بھی تھی۔

شاستری کو اندازہ ہو گیا کہ اندر نہ تو سنیل داس ہے اور نہ ہی کوئی لڑکی..... پھر بھی اس نے پناہ طلبانہ کرنے کے لئے دروازے سے کان لگا دیئے..... نہ تو اسے اندر کوئی سرگوشی، سرسراہٹ اور آہٹ سنائی دی..... اندر گہرے اور پراسرار سنائے کے راج کا بیسرا محسوس ہوا۔ پھر اس نے کچھ سوچ کر چند لمحوں کے بعد راہداری کا جائزہ لیا۔ راہداری ویران اور سنسان پڑی تھی۔ اس نے زینے پر جا نہیں سیں..... زینہ بیس قدم پر تھا۔ دروازہ قدرتی عورت اور وہ لڑکا نمودار ہوا جو لفٹ میں مستیاں کر رہے تھے۔ لڑکے کا ایک ہاتھ اس عورت کی نرم دناڑک اور چمکیلی کمر پر تھا۔ دوسرے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ عورت کے بازو میں لڑکا تھا۔ وہ اس کے چہرے پر چمکی ہوئی تھی۔ وہ دونوں دوسری منزل پر چلے گئے تو شاستری نے دروازے کے ہینڈل کے لٹوکو تھام کر بے آواز گھمایا۔ پھر غیر محسوس انداز سے دروازے کو اندر کی طرف دھکا دیا..... دروازے کو اندر کی طرف کھینچتے ہوئے اسے اچانک ایک دہشت ناک خیال آیا تو اس کے سارے بدن پر ایک سرد سفاک ہر دوڑ گئی۔ پھر اس کا بدن لرز گیا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس خونی مجسمہ نے آ کر سنیل داس کو موت کی بیسٹ چڑھا دیا ہو.....؟ وہ خونی مجسمہ کچھ بھی کر سکتا ہے.....؟ اس خیال نے اس کے جسم کی ساری لافٹ جیسے سب کر لی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ اندر گھس گیا۔

کرنے کا حق رکھتا ہوں کہ تم چوری کے ارادے سے میرے فلیٹ میں گھس آئے تھے۔ اس خنجر سے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تو میں نے خنجر تمہارے ہاتھ سے چھین کر اپنا دفاع کیا تو تم مارے گئے۔“ شاستری نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا بلکہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سنیل داس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”ابھی یہ کہانی سنانے کا وقت آیا ہے اور نہ آئے گا۔۔۔۔۔ فضول باتیں نہ کرو۔ یہ لا حاصل ہیں۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں یہاں کس لئے آیا ہوں۔۔۔۔۔ میں نے دو تین منٹ تک دروازے پر تین بار زور زور سے دستک دی۔۔۔۔۔ جواب نہ ملا اور دروازہ نہ کھلا تو میں نے ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ میں وہ چیز تلاش کر رہا تھا جس کے لئے آیا تھا۔ تم آگئے۔۔۔۔۔ اصل بات یہ ہے۔“

سنیل داس نے خنجر لہرا کے اس کی طرف ایک قدم بڑھایا۔ پھر اس نے سختی سے کہا۔

”تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم کس لئے میرے فلیٹ میں چوروں کی طرح گھسے۔۔۔۔۔ تمہاری صفائی میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”تم کوئی بچہ نہیں ہو۔۔۔۔۔ تم میرے آنے کا مقصد خوب سمجھتے ہو۔۔۔۔۔ باتیں نہ بتاؤ۔ یہ بتاؤ کہ نقش کہاں ہے۔“

”نقش۔۔۔۔۔؟“ سنیل داس ایک دم سے چوٹکا۔ پھر وہ حیرت سے بولا۔ ”کیا وہ نقش اس شہر میں موجود ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ وہ تمہارے پاس موجود ہے۔۔۔۔۔ اسے تم نے چرایا ہے۔“ شاستری نے اس پر الزام لگایا۔

”میرے پاس موجود ہے۔۔۔۔۔ اسے میں نے چرایا ہے۔۔۔۔۔ مسٹر شاستری! کیا تم ہوش میں ہو؟“ سنیل داس بولا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ میں اس کی تلاش میں پی کر نہیں آیا ہوں۔“ شاستری نے سختی سے کہا۔ ”تم انجان نہ بنو۔۔۔۔۔ کیا تم نے مجھ پر عقب سے سر پر ضرب لگا کر بے ہوش نہیں کیا۔ اور نقش لے کر بھاگ گئے؟“

سنیل داس نے اس کی بات بڑے تحمل سے سنی۔ اسے چند لمحوں تک ایک تک دیکھتا رہا۔ اس کے چہرے پر استعجاب چھا گیا۔ اس نے یک بارگی پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے خنجر کو میز پر رکھا اور دروازہ بند کر کے آیا۔ پھر اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”یہ کس قدر عجیب اور حیرت کی بات ہے کہ ہم دونوں ہی اس کی تلاش میں مارے مارے

کمرے میں اس قدر گھپ اندیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔۔۔۔۔ اس نے کمرے میں ایک عجیب سی وحشت اور پراسراریت محسوس کی۔۔۔۔۔ اسے ایسا لگا خونی مجسمہ آہا، سنیل داس کو موت سے ہم آغوش کر کے چلا گیا۔۔۔۔۔ یا پھر اس اندیرے میں کھڑا اس کی حرکات و سکنات کو نوٹ کر رہا ہے اور اسے دیوچ کر گھادبا کر مار دے گا۔ اس خیال سے اس کے جسم پر لرزہ سا طارہ ہو گیا۔ لیکن اس نے بہت سا کام لیا اور اس خیال کی لٹی کر دی۔ اس نے اندازہ سے سوچ بورت تلاش کیا۔ لیکن اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر اس نے جیب سے لائل نکالا۔ اس کے ننھے سے شعلے کی روشنی میں دیکھا کہ کہیں خونی مجسمہ موجود تو نہیں ہے؟ وہ نظر د آیا۔ البتہ اس کی نظر سوچ بورت پر نظر پڑی جو دروازے کے قریب نصب تھا۔۔۔۔۔ اس نے سہل آن کیا تو کمراتیز روشنی میں نہا گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے بستر اور کمرے کا جائزہ لیا کہ کہیں بستر یا کمرے کے فرش پر سنیل داس کی لاش تو نہیں پڑی ہے۔۔۔۔۔ اس نے سنیل داس کی لاش دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا۔ پھر ملحق شمس خانے اور پٹنگ کے نیچے دیکھا۔ وہ خالی تھے۔

پھر اس نے کمرے کی تلاشی لینا شروع کیا۔۔۔۔۔ اسے پوری پوری امید تھی کہ نقش کمرے میں ہی اور اس کے سامان میں ہوگا۔

لیکن سنیل داس اس وقت کہاں گیا ہوگا۔۔۔۔۔؟ اور پھر اس نے کمرہ مقتول بھی تو نہیں کیا۔۔۔۔۔؟ سنیل داس کا سامان ایک درمیانہ سائز کے اٹپٹی میں تھا۔۔۔۔۔ اس میں دو تین جوڑے، زیر جامے تھے۔ ایک جوڑا غسل خانہ میں ہک میں لگا ہوا تھا۔ کمرے میں فرنیچر مختصر سا تھا۔ کمرے میں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی کوئی چیز چھپائی جاسکے۔ نقش اتنا بڑا تو نہ تھا کہ اس کے لئے بڑی جگہ چاہئے۔ وہ تو جیب میں بھی آسانی سے آنے والی چیز تھی۔ وہ بستر کے پاس جا کر گداالت کر دیکھنے لگا۔

اس نے محسوس کیا کہ عقب میں کوئی دبے قدموں، بے آواز اور غیر محسوس انداز سے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نے فوراً ہی بجلی کی سی سرعت سے پلٹ کر دیکھا تو اسے نظروں سے یقین نہیں آیا۔

سنیل داس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار والا خوف ناک خنجر چمک رہا تھا۔۔۔۔۔ اس کے چہرے پر سفاکی چھائی ہوئی تھی اور آنکھوں سے دردنگی جھانک رہی تھی۔ اس کے تپور ہمارے تھے کہ وہ شاستری کے سینے میں خنجر بھونکنے کے ارادے سے اس پر خنجر تانے کھڑا ہے۔

”مسٹر شاستری۔۔۔۔۔! تم ایک عادی چور کی طرح بڑے پراسرار انداز اور خاموشی سے میرے فلیٹ میں بغیر اجازت گھس آئے۔۔۔۔۔؟“ سنیل داس نے تیز لہجے میں کہا۔ ”میں تمہیں مل

یعنی گواہ تھا۔ پڑا ل میں اس وقت صرف وہ دونوں موجود تھے۔ اگر وہ بتاتا تو سنیل داس پرکاش مہرہ کی لاش ملنے پر اسے قاتل قرار دیتا۔ خاموش اور انجان رہتا ہی بہتر اور دانش مندی بھی تھی۔

”میرا پتا.....؟“ سنیل داس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ ”یہ کیسے پتا چلا.....؟ اس نے تمہیں یا پرکاش مہرہ کو بتایا نہیں تھا۔“

”پولیس والوں سے تمہارا پتا ملا..... کیوں کہ جو لوگ پرکاش مہرہ کے جہاز میں نوادرات اور مجسمہ لائے تھے اور جن کا قتل سری لنکا سے تھا اور وہاں کے پاسپورٹ پر آئے تھے ان کے پاسپورٹ اور ممی میں قیام کے پتے نوٹ کئے..... یہ فلیٹ تمہارے سری لنکن دوست کا تھا اور تم نے یہاں کا پتا لکھوایا تھا..... تم قتل سے نہ صرف لاعلمی ظاہر کر رہے ہو بلکہ فریب بھی دے رہے ہو۔ اپنی باتوں..... کیا تم حلقہ آدر نہیں تھے.....“

”نہیں.....“ سنیل داس نے کہا۔ ”میرے ہاتھ قتل لگ جاتا تو کیا میں یہاں بیٹھا رہتا.....؟ میں مجسمہ کو قابو میں کر کے تمام نوادرات سمیت غائب ہو کر سری لنکا پہنچ چکا ہوتا..... احمقوں کی طرح یہاں نہیں رہتا۔“

☆.....☆.....☆

پرکاش مہرہ نے ساحل سمندر کی حدود سے نکل کر سوچا کہ اب وہ گھر جا کر آرام کرے گا۔ بسز پر دروازہ ہو کر حالات کا جائزہ لے گا۔ کل وہ پولیس ہیڈ کوارٹر جا کر پراسرار طور پر غائب اور نمودار ہونے اور ایک شخص کا مجسمہ کا بھرپور بھر کے اسے اٹھا کر پھینکنے کے بارے میں بتائے گا..... پولیس سے کہے گا کہ اسے پھانسا کر کے بے ہوش کر کے ساحل سمندر پر ڈال دیا تھا۔ پارکنگ پر اس کی گاڑی نہیں تھی۔ یوں بھی وہ پیدل جانا اور راستہ بھر سوچتا چاہتا تھا..... اس وقت فرحت بخش ہوا چل رہی تھی جس سے اس کے دل و دماغ کو ایک عجیب طرح کا سکون مل رہا تھا۔ وہ سوچتا چلا چلا گیا۔

رات اندھیری تھی۔ جس سڑک سے وہ گزر رہا تھا۔ ویران اور سنسان تھی۔ لیکن بلند و بالا عمارتوں کے فلیشوں میں روشنی تھی اور ٹی وی کے پروگرام دیکھنے میں مکیں منہمک تھے۔ گویا سارا شہر ٹی وی کی بدولت جاگ رہا تھا۔

وہ ایک قدرے تنگ گلی میں آیا۔ وہاں روشنی تھی۔ ایک مکان کے اندر سے ایک نوجوان عورت نے نکل کر اس کا راستہ روک لیا۔ وہ نشے کی حالت میں لگ رہی تھی۔ اس کا لباس نہایت نامناسب تھا۔

پھر رہے ہیں۔“ تنکا رام کا نقش..... کیا تمہیں اس نقش کے پس پردہ کیا اسرار پوشیدہ ہیں معلوم ہیں؟“

”نہیں.....“ شاستری نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”مجھے کچھ خبر نہیں.....“

”جب اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے ہو تو پھر کس لئے اس کے حصول کے لئے کوشاں ہو؟“ سنیل داس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”میں صرف ایک بات جانتا ہوں کہ اس نقش کی بدولت خونی مجسمہ سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے.....“ شاستری نے جواب دیا۔ ”میں اس نقش کی شہتی اور اسرار کو سمجھ رہا تھا کہ نقش سے محروم ہو گیا۔“

”میں تمہیں بتاتا ہوں کہ اس کا پس منظر کیا ہے.....“ سنیل داس کہنے لگا۔ ”تنکا رام کا مقدس نقش..... جس پر اس کا بھائی مسرت چندرکار جسے حاصل کرنے میں بری طرح ناکام و نامراد رہا تھا..... مسرت چندرکار کے پالتو قاتلوں نے اسے بھاری انعام و اکرام کے لالچ میں تنکا رام کو موت کے گھاٹ بڑی شقاوت سے اتار دیا تھا..... انہوں نے مسرت چندرکار کو اس کی موت کے ایسے ثبوت دیئے تھے جس کی سچائی سے وہ انکار نہ کر سکا۔ یہ ٹھوس ثبوت تھے..... لیکن انہیں تنکا رام کی سب سے بڑی ملکیت کا قطعی علم نہ تھا۔ وہ اس سے بے خبر اور لاعلم تھے۔“

مجھے تم پر شک و شبہ تھا کہ تم تنکا رام کمار کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہو اور مجھ سے دانستہ چھپا رہے ہو..... یہ بات تم اس وقت سے جانتے ہو جب تنکا رام کا مجسمہ سادھی سے برآمد ہوا تھا..... جب میں یہ سب کچھ جاننے کے قریب پہنچا تھا کہ تم نے.....“

”تم شہتی اور وہی ہو.....“ سنیل داس نے اس کی بات کاٹی۔ ”تمہارے خیال میں کیا میں کوئی دیوتا یا بھگوان..... مہمان جادوگر ہوں جو مردوں اور مجسموں میں کسی کی آتما کو ڈال کر انہیں جنم دے دوں..... اگر میں یہ شہتی رکھتا ہوتا تو میں کیا تمہیں بے ہوش کر کے نقش لے جاتا.....؟ تمہارے ذہن میں یہ بچکانہ خیال کیوں آیا..... اور پھر کیا یہ مجسمہ کو جادو کے زور پر واپس نہیں لے جاتا؟“

شاستری کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ سنیل داس نے جو کچھ بتایا اس کی بات کیا کہے۔ تمام واقعات کے پیش نظر شاستری نے کہا۔

”پرکاش مہرہ نے مجھ سے کہا تھا کہ میرے پاس تمہارا پتا ہے میں فوراً جا کر تم سے ملوں.....“

پرکاش مہرہ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا دانستہ اس نے نہیں بتایا تھا۔ اس واقعہ کا صرف وہ

”میں نے تمہیں سو روپے دیئے تھے کہ گنگارام کی دکان سے ایک ٹرے کی بوتل لاؤ۔ تم بوتل نہیں لائے۔“

”تم نشتے میں ہو۔۔۔۔۔ میں وہ نہیں ہوں جسے تم نے سو روپے دیئے تھے۔ مجھے جانے دو۔۔۔۔۔“ پرکاش مہرہ نے کہا۔

”عورت نے قریب آ کر اس کے گلے میں اپنی بانہیں حائل کر دیں۔“ تم مجھے سو روپے دو۔ تمہیں جانے نہیں دوں گی۔۔۔۔۔“

”میں سو روپے کیا۔۔۔۔۔ ایک روپیہ نہیں دوں گا۔۔۔۔۔“ پرکاش مہرہ اپنی گردن آزاد کرانے لگا۔

”لیکن ان بانہوں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ کام یاب نہ ہو سکا۔“ تم سو روپے نہیں دو گے تو شور مچا دوں گی۔۔۔۔۔ سب کو بلا لوں گی۔۔۔۔۔ محلے والوں سے کہوں گی کہ میرے سو روپے لے کر بھاگ رہا ہے۔ پھر تمہاری پٹائی ہو جائے گی۔“

پرکاش مہرہ بہت پریشان ہو گیا۔ اس نے بڑے سے سو کا ایک نوٹ نکال کر بڑھایا تو وہ نوٹ لے کر بولی۔

”اچھا۔۔۔۔۔ اب ایک سو روپے اور دے دو۔۔۔۔۔“

”وہ کس بات کے۔۔۔۔۔؟“ پرکاش مہرہ کو غصہ آ گیا۔

”وہ جو میں نے تمہاری دو گھنٹے سیوا کی ہے۔ کیا میں نے مفت میں کیا ہے؟“

”دفع ہو جاؤ۔۔۔۔۔ مکار عورت۔۔۔۔۔ تم اس بہانے مجھے لوٹ رہی ہو؟“ پرکاش مہرہ دہاڑا۔

”رام لعل۔۔۔۔۔ جسونت۔۔۔۔۔ دشوانا تھ۔۔۔۔۔“ وہ ہڈیانی انداز سے چیخنے چلانے لگی۔

پرکاش مہرہ نے مزید سو کا ایک نوٹ دے کر اسے اس مکان کے اندر دھکیل دیا جس سے وہ باہر آئی تھی۔ پھر باہر سے کنڈی لگا کر تیزی سے چل پڑا۔

پرکاش مہرہ کو اس بات کا ڈر اور خوف تھا کہ یہ کہیں بد معاش یا وہ عورت اس کے تعاقب میں نہ آئیں۔۔۔۔۔ وہ مڑ مڑ کر جود دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔ سراسیمگی کی وجہ سے اسے اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کدھر نکل آیا ہے۔۔۔۔۔ اس کے دفاتر دہلی، کوکلتہ اور ممبئی میں تھے۔ لیکن مرکزی دفتر دہلی میں تھا۔

وہ ممبئی کا روہاری دورے اور دفتر کی کارکردگی کا جائزہ لینے آتا رہتا تھا۔ وہ اس شہر کے چپے چپے سے واقف تھا۔

مجمہ اس کے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ مجسمہ اگر اسے مل گیا تو اس کی پلٹنی جو ہو چکی ہے اس واقعہ سے اور زیادہ ہو جائے گی۔۔۔۔۔ جو پراسرار اور چونکا دینے والا واقعہ

پیش آیا ہے اس نے لوگوں میں یقینا مل چل مچادی ہوگی۔

وہ اس مجسمہ کو پولیس کی مدد سے ہی محفوظ نکال سکتا تھا۔ جب تک مجسمہ نہ ملے اس وقت تک نمائش کا سوچا بھی نہیں جاسکتا۔۔۔۔۔ وہ سر توڑ کوشش کرے گا کہ مجسمہ شہر سے باہر یا سری لنکا نہ جاسکے۔۔۔۔۔ اسے سب سے زیادہ شک سنیل داس پر تھا۔۔۔۔۔ اس نے چلتے چلتے دو ایک جہازوں کے جھونپر سے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس پورٹ کے علاقے میں دھکے کھا رہا تھا۔

پھر ایک تنگ و تاریک راستے پر آ گیا۔ چند قدم چل کر ٹھٹک کے رک گیا اور اس کے سارے جسم پر سنسنی دوڑ گئی۔ اس نے ایک ہیولا دیکھا۔ اسے شک ہوا کہ یہ مجسمہ ہے۔ لیکن دوسرے لمحے اسے لگا کہ یہ مجسمہ نہیں کوئی آدمی ہے۔

اس نے بلند آواز اس ہیولے سے کہا۔ ”کیا آپ میری رہنمائی کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔؟ میں راستہ بھول گیا ہوں۔“

وہ شاستری تھا اس نے دور سے ہی پرکاش مہرہ کو اس کی جسامت، قامت اور چال سے پہچان لیا تھا۔ اسے حیرت اس بات کی تھی کہ وہ کہاں سے برآمد ہوا ہے۔ اور زندہ سلامت ہے۔۔۔۔۔ اور اکیلا پیدل آ رہا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔

”مسٹر پرکاش۔۔۔۔۔!“ شاستری نے حیرت اور تجسس بھرے لہجے میں کہا۔ ”آپ خیریت سے تو ہیں نا۔۔۔۔۔؟ آپ کہاں تھے۔۔۔۔۔؟ میں نے آپ کو ساحل پر تلاش کیا۔۔۔۔۔ شاید اند میرے کے باعث نظر نہیں آئے۔“

”میں اتنے بڑے ساحل پر اند میرے میں کیسے نظر آتا۔۔۔۔۔؟“ وہ بولا۔ ”مجھ پر دو گھنٹے بے ہوشی طاری رہی۔۔۔۔۔ جس نے مجھے اٹھا کر پھینکا وہ مجسمہ نہیں تھا۔۔۔۔۔ شعبہ ہاڑ تھا۔ مجسمہ کا بہروپ بھرا ہوا۔ اس نے ہم دونوں کو پھنسا کر دیا تھا۔ تم کیا کہتے ہو؟“

شاستری اس سے کسی بات پر بحث و تکرار کرنا اور الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ پرکاش مہرہ ابھی تک احتیوں کی دنیا میں تھا۔ اس لئے اس نے کہا۔

”اب آپ بتائیں۔۔۔۔۔ کیا کیا جائے۔۔۔۔۔ میں اس شعبہ ہاڑ کو جانتا ہوں اور نہ ہی اس کی شکل یاد ہے۔“

”میں یہ چاہتا ہوں کہ ابھی اور اسی وقت پولیس کو وارنٹیک چلو۔۔۔۔۔ کیا تمہارے پاس وقت ہے۔ وہاں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔“

”میں ضرور چلوں گا۔۔۔۔۔“ شاستری نے جواب دیا۔ ”اس لئے کہ آپ کی پریشانی کو سمجھتا ہوں۔۔۔۔۔ قانونی کارروائیوں اور آپ کو تباہی سے محفوظ رکھنے کے لئے مجھ سے جو کچھ بھی ہو سکتا

سے لے کر افریقہ کے بھی اسراروں کو سمجھ سکتا ہے..... وہ شاید دنیا میں ایک ایسا شخص ہے کہ ماضی کی ہر گتھی کو آسانی سے سلجھا سکتا ہے۔

جنگن ناتھ لکھنے کی میز پر آ بیٹھا..... وہ یہ چاہتا تھا کہ اس کا دماغ چوں کہ تیزی سے کام کر رہا ہے تو کیوں نہ وہ اس سے فائدہ اٹھائے۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ پیش آنے والے ممکنہ خطرات اور ان پر اسرار قوتوں سے آگاہ کرے جو کسی بھی وقت انسانیت کے خلاف برسرِ پیکار ہو سکتی ہیں..... خونی مجسمہ کا تابوت میں سے پر اسرار طور پر غائب ہو جانا ایک ایسا واقعہ تھا کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا اور نہ ہی اسے ایک عام سی بات سمجھ کر نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔

وہ شاستری کے دیئے ہوئے اشاروں اور علاقوں پر لکھنے میں منہمک ہو گیا۔ جیسے جیسے ان کے اسرار عیاں ہوتے گئے۔ وہ انہیں تحریر میں لاتا گیا۔ حیرت اور تجسس اور پر اسراریت کے انکشافات نے اس کی دلچسپی بڑھادی۔ وہ جیسے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی نادیہ قوت اور اس سے یہ سب کچھ کھسوار ہی ہے۔

اچانک ایک دھماکا سا ہوا تو اس نے چونک کر اس سمت دیکھا کہ یہ آواز کہاں سے آئی ہے۔ درتے کے شیشے ایک زوردار آواز سے ٹوٹے تھے..... اس کی کرچیاں چاروں طرف کمرے میں بکھری نظر آئیں۔ اسے ایسے لگا تھا کہ کسی نے بڑے زور سے کوئی بڑا سا پتھر دے مارا ہو..... کمر اس کے شور سے گونج اٹھا تھا۔

اس نے جو سرگمما کر دیکھا تو اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ کہیں وہ نشے میں تو نہیں ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے ایک گھونٹ بھی تو نہیں پی ہے۔ وہسکی کی بوتل میز پر دھری ہے اور گلاس میں ایک بوند بھی نہیں ہے۔

وہ حیرت اور خوف سے اچھل پڑا۔ اس کی رگوں میں لہو برف کی طرح منجمد ہونے لگا۔ کھڑکی کے باہر جنگل پر اسے خونی مجسمہ نظر آیا۔ جنگل بہت مضبوط لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اس کی سلاخیں بہت ہی موٹی تھیں۔ اسے ایک کیادس آدی بھی نکال کر پھینک نہیں سکتے تھے۔ لیکن اس مجسمہ نے ایک جھٹکے سے اس طرح سے ٹکاک کر پھینک دیا جیسے وہ پلاسٹک کا ہو۔ پھر وہ اس راستے سے کمرے میں داخل ہونے لگا۔ اس کھڑکی میں سے دو تین آدی بیک وقت اندر آ سکتے تھے۔

جنگن ناتھ کو فوراً ہی اپنی حفاظت کا خیال آیا..... پھر اسے یاد آیا کہ میز کی اوپر والی دراز میں ایک بھرا ہوا غیر ملکی ساخت کا ریو لور رکھا ہے۔ اس کی صرف ایک گولی سے نہ صرف شیر بلکہ گینڈا اور تیندوا بھی ہلاک ہو سکتا تھا۔ ایسا ریو لور عموماً شکاری رکھتے تھے۔

وہ مجسمہ چونک سے کود کر پروفیسر جنگن ناتھ کے سامنے دو فٹ پر کھڑا ہو گیا۔

ہے وہ میں کروں گا۔“

شاستری نے ایک خالی ٹیکسی روکی۔ وہ دونوں پولیس ہیڈ کوارٹر پہنچے۔ ٹیکسی سے اتر لے کے بعد پرکاش مہرہ نے کہا۔

”تمہارے خیال میں یہ کس کی سازش یا حرکت تھی.....؟ سنیل داس کو جو سری لنکا حکومت کا نمائندہ ہے۔“

”اگر آپ تلخ سچ اور سنگین حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں تو خود فریبی سے نکلنا ہوگا۔“ شاستری کہنے لگا۔ ”آپ کی کسی بات سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا..... محسوس کیا اور میرے تجربے اور علم میں آیا وہ یہ کہ خونی مجسمہ ایک حقیقت ہے۔ اس مجسمہ میں آتما اور زندگی آگئی ہے..... اس نے دوسرا جنم لیا ہے..... میرے خیال میں نہ تو سنیل داس کا اس میں ہاتھ ہے اور نہ ہی سری لنکا کا..... اس کے پس پشت پر اسرار اور طاغوتی طاقتیں کام کر رہی ہیں ان کے آگے جدید سائنس علوم کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے..... وہ ناکارہ سی نظر آتی ہے۔“

☆.....☆.....☆

جنگن ناتھ کو پینے کی طلب ہونے لگی۔ اس نے بہت دیر سے اپنی اس طلب کو دبائے رکھا تھا۔ آخر اس سے برداشت نہ ہو سکا تو الماری سے وہسکی کی بوتل نکالی، اسے میز پر رکھ کر گلاس کو قدرے بٹا کر رکھ دیا۔ وہ مزید طلب کو دبائے رکھنا چاہتا تھا۔ کیوں کہ اس کا دماغ تیزی سے کچھ سوچ رہا تھا اور وہ اس سے بہت سارے اہم کام لینا چاہتا تھا تاکہ یکسوئی سے انہیں انجام دے سکے۔ وہ شاستری کی صلاحیت اور قابلیت کا شروع ہی سے معترف تھا۔ وہ ایک ہونہار شاگرد ثابت ہوا۔ جب شاستری اس سے ملنے آیا تھا تو تب اس نے اپنے شکوک و شبہات کا ذکر کیا تھا۔ حال اسے سن کر وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکا تھا کہ وہ اپنی جگہ سو فیصد درست ہے۔ صحیح سمت جا رہا ہے۔ اسے سراہا بھی ہے..... اب ایک ایسے متحرک کام کا کام تھا کہ اس کی رہنمائی میں چل رہا ہے۔

شاستری کے سر پر جب کسی نادیہ شخص نے چوٹ لگا کر اسے بے ہوش کیا تھا تب شاستری نے کچھ کاغذات چھوڑے تھے..... جنگن ناتھ نے مطالعے کی غرض سے اٹھائے۔ شاستری نے جو پوائنٹ لکھے تھے وہ انہیں ایک دوسرے سے مربوط کر کے ان کی تہ میں پہنچنے کی کوشش کرنے لگا۔ بڑی جدوجہد، کوشش اور مغز پاشی کے بعد آخر کار ایک جملہ اس کی سمجھ میں آ گیا..... زندگی کے مقدس الفاظ..... وہ گوگو کی کیفیت میں مبتلا ہو گیا..... پھر اسے وہسکی کی طلب ستانے لگی اور لمحہ بہ لمحہ شدت اختیار کرتی چلی گئی..... لیکن وہ اپنی اس ترغیب کو کچل دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو بتانا چاہتا تھا کہ وہ نہ صرف قدیم ہندوستان، ایشیا..... بلکہ مصر

”تم.....؟“ جگن ناتھ نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر حیرت سے کہا۔ ”تم نے دوسرا جنم پالیا ہے.....؟ یقین نہیں آیا.....؟“

”تمہارے اس احمق مالک کو بھی یقین نہیں آیا۔“ خونی مجسمہ غرا کر بولا۔ ”میں نے اسے پنڈال سے نکال کر گھرے سمندر میں اس جگہ پھینکا تھا جو یہاں سے دو ہزار میل پر سمندر میں بنا ہوا ایک محل ہے..... یہ محل دس ہزار برس پہلے کا بنا ہوا طلسماتی محل ہے۔ اب وہ محل میری ملکیت میں ہے..... میں نے اسے موت کی نیند نہیں سلا یا۔ اس لئے کہ اس نے مجھ پر بڑی دیا کی۔ احسان کیا..... سادھی سے جو میرا مجسمہ نکالا گیا اس کی بدولت..... اس محل میں پانچ برسوں پہلے کی حسین اور فوجوان لڑکیاں وہ اس قدر حسین ہیں کہ ایسی حسین ایک بھی اس دنیا میں نہیں ہے..... میں نے اس سے کہا کہ تم تین دن تک اس کے ساتھ وقت گزارو..... اس نے وقت گزارا..... پھر میں نے اسے واپس سمندر کے کنارے لا ڈالا..... وہ بے وقوف یہ سمجھتا ہے کہ وہ حقیقت نہیں تھی اور ایک پہنا تھا..... اسے پہنا تازہ کر کے یہاں لا ڈالا..... وہ یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کسی نے ایک منصوبہ اور سازش کے تحت تابوت سے عائب کیا ہے۔ گدھا ہے..... الو کا پٹھا ہے..... اسے اس بات کا یقین ہی نہیں ہے میں نے جنم لے لیا ہے اور میں نمائش میں تابوت سے عائب ہو گیا۔ وہ بڑا تیس مار خان بنتا ہے..... میں اس کے دماغ درست کروں گا.....“

”اس کے ساتھ جو کچھ بھی کرو میری بلا سے.....“ جگن ناتھ نے مجھے بے پروائی سے شانے اچکا کر کہا۔ لیکن اس کے لہجے سے خوف عیاں تھا۔ ”لیکن تم یہاں کیوں اور کس لئے آئے ہو.....؟ مجھ سے کیا چاہتے ہو.....؟“

”میں تمہیں موت کی نیند سلانے آیا ہوں۔“ خونی مجسمہ غرایا اور اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک کو مدی۔

”وہ کس لئے.....؟“ جگن ناتھ نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔ ”میں نے تمہارا کیا بگاڑا؟“

”اس لئے کہ تم جتنے بوڑھے ہواتے ہی خطرناک بھی.....“ خونی مجسمہ نے جواب دیا۔ ”تم نے میرا کچھ بگاڑا تو نہیں..... لیکن تم زندہ رہے تو بہت کچھ بگاڑ سکتے ہو..... تم پر اسرار علوم سے واقف ہو۔ میرے راستے کا کاٹنا بن سکتے ہو..... تم اپنی ذات سے مجھے جو نقصان پہنچا سکتے ہو..... وہ کوئی اور نہیں.....“

”میں نے اپنی زندگی میں کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تو تمہیں کیا پہنچاؤں گا.....؟“ جگن ناتھ بولا۔

”میں تم سے بحث و تکرار کرنے نہیں بلکہ تمہاری جان لینے آیا ہوں۔“ خونی مجسمہ نے سرد سلاک لہجے میں کہا۔

خونی مجسمہ نے اس کی طرف قدم بڑھایا تو جگن ناتھ نے اس کا ریوالور سے نشانہ لیتے ہوئے کہا۔ ”خبردار!..... میرے قریب نہ آنا..... یہ ریوالور دیکھ رہے ہو۔ بے حد خطرناک ہے۔ جس طرح آئے ہو۔ اسی طرح واپس چلے جاؤ۔“

”ریوالور.....؟“ وہ قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسا۔ ”تم مجھے اس کھلونے سے ڈرا رہے ہو.....؟ تم ایسا کرو..... پہلے تم مجھ پر گولی چلاؤ..... دل کی حسرت پوری کر لو..... پھر میں تم سے ملتا ہوں۔“

جب اس نے جگن ناتھ کی طرف قدم بڑھایا تو جگن ناتھ نے اس کے سینے پر دل کی جگہ گولی داغ دی..... جب اس نے دیکھا کہ خونی مجسمہ پر کوئی اثر نہیں ہوا تو اس نے فوراً ہی دوسری گولی اس کی گردن میں اتار دی..... دوسری گولی بھی پہلی گولی کی طرح جسم کے آ رہا رہ گئی تو اس نے تیسری گولی اس کی کھوپڑی میں اتار دی۔ لیکن وہ کھوپڑی میں سوراخ کرتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی۔ خونی مجسمہ کا بال تک بیکانہ نہیں ہوا تھا۔ وہ نہایت سکون و اطمینان سے کھڑا قہقہہ لگا تا اور ہنستا رہا۔

”جتنی گولیاں چلا سکتے ہو چلاؤ.....“ خونی مجسمہ نے استہزائی لہجے میں بولا۔ ”کیا تم نہیں جانتے ہو کہ میں ایک مجسمہ ہوں..... میرے جسم پر نہ تو کوئی اثر کر سکتی ہے اور نہ ہی خنجر اور گولہ..... اگر تلوار اور خنجروں سے بھی حملہ کیا جائے تو وہ ٹوٹ جائیں گی.....“

جب وہ اس کی طرف بڑھنے لگا تو جگن ناتھ نے دہشت زدہ ہو کر باقی تینوں گولیوں سے اس کی آنکھوں کو نشانہ بنایا۔ گولیاں آنکھوں میں سے گزر گئیں..... پھر جگن ناتھ نے اس پر ریوالور دے مارا تو اس کے گلے گلے ہو گئے۔

پھر مجسمے نے اسے لپک کر دیوچ لیا جو مڑ کر تیزی سے بھاگا تھا۔ اس میں اب اتنا دم نہیں رہا تھا اور خونی مجسمہ نے اسے دہشت زدہ کر کے اس کی حالت غیر کر دی تھی۔ پھر اسے اس طرح سے فرش پر دے مارا تھا جیسے وہ کوئی ننھا سا بچہ ہو۔

”سنو..... سنو..... مجھے نہ مارو.....“ جگن ناتھ گڑگڑایا۔ ”میں بوڑھا آدمی ہوں۔ کچھ لوگوں کا مہمان ہوں..... مجھے طبعی موت مرنے دو..... اس بے دردی سے تو نہ مارو.....“

”اچھا.....“ خونی مجسمہ نے جواب دے ہاتھ اس کا گلا دبانے کے لئے بڑھایا تھا ایک دم سے روک لیا۔

”ہاں..... ہاں..... تم بوڑھے ہو.....“ خونی مجسمہ بولا تو اس کے لہجے میں نری تھی۔
”تمہاری عمر کیا ہے.....؟“

”میں اتنی برس کا ہو رہا ہوں۔“ جگن ناتھ نے سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”اتنی برس کے.....؟“ خونی مجسمہ نے کہا۔ ”میرے دور میں..... دو ہزار برس پہلے ایک آدمی کی عمر سو سو برس سے زیادہ ہوتی تھی..... وہ دو سو برس کی عمر میں بھی ایسا جوان، طاقتور اور وجیہ اور خوب صورت ہوتا تھا کہ وہ دس دس لڑکیوں اور عورتوں سے دل بہلاتا تھا..... تین سو برس کی عمر میں بھی وہ بوڑھا دکھائی دیتا تھا اور نہ اس کے چہرے پر ایک جھری تک ہوتی تھی۔

صرف اتنی برس کی عمر میں تم بوڑھے کیوں اور کس لئے ہو گئے.....؟“ وہ ہنسا۔ ”تمہارا یہ دور تو بڑا جدید ہے۔ سائنس کے جادو نے دنیا کو جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا..... کیا اس لئے تمہاری صحت قابل رشک نہیں بنائی..... یہ کیا جادو ہے جو تم بوڑھے ہو۔ ہمارے ہاں جو تین چار سو برس کے بوڑھے ہوتے ہیں وہ تم سے لاکھ درجے بہتر ہوتے تھے۔“

”اس لئے کہ اس دور میں ایک آدمی کو اس قدر فکر، پریشانیاں، معاشی اور مالی حالت آدمی کو وقت سے پہلے بوڑھا اور کمزور کر دیتے ہیں اور اسے یہ ساری پریشانیاں دیمک کی طرح اندر ہی اندر چاٹ جاتی ہیں..... میں نے ساری زندگی بڑے دکھ اٹھائے۔ فاقے بھی کئے لیکن میری زندگی میں کبھی سکھ نہیں آیا..... میرے علم کی بہت ہی کم لوگوں نے قدر کی..... اگر میں امریکہ یا یورپ میں ہوتا تو میری بڑی قدر ہوتی..... میں اس عمر میں بھی جوان رہتا..... اپنے دکھوں اور احساس محرومیوں کو مٹانے کے لئے شراب کا سہارا لیا..... شراب پی کر میں سب کچھ بھول جاتا ہوں..... دکھ اور ناقدری.....“

خونی مجسمہ نے بوتل اٹھا کر اس کا منہ کھولا اور اسے ایک ہی سانس میں پی گیا۔ پھر اس نے بوتل ایک طرف پھینک کر کہا۔

”یہ شراب ہے.....؟ اس سے اچھی شراب تو ہمارے دور میں ہوتی تھی..... اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری زندگی میں کوئی عورت آئی.....؟ کیا تم نے اس سے جی بہلا لیا.....؟“

”جب میں تیس برس کا تھا میں نے ایک بہت حسین اور جوان لڑکی جس کی عمر تیس برس کی تھی شادی کی تھی۔“ جگن ناتھ نے جواب دیا۔ ”لیکن وہ ڈیڑھ برس کے بعد اپنے آشنا کے ساتھ بھاگ گئی..... اس کا آشا دولت مند تھا۔ میں اسے وہ سب کچھ نہیں دے سکتا تھا جو وہ چاہتی تھی۔ اسے شوہر کی نہیں دولت کی ضرورت تھی۔“

”پھر تم نے دوسری شادی کی؟“

”نہیں.....“

”وہ کس لئے.....؟“ خونی مجسمہ نے حیرت سے کہا۔ ہندوستان میں عورتیں اور لڑکیاں مردوں سے زیادہ ہیں۔“

”اس لئے کہ مجھے عورت سے نفرت ہو گئی تھی.....“ اور آخر کار ایک دن وہ بھاگ گئی.....“
”مجھے تمہاری درد بھری کہانی سن کر جانے کیوں بڑا ترس آیا ہے..... اگر میں تمہیں پھر سے بیس برس کا جوان بنا دوں..... تمہیں ایسی جوان اور شکست دے دوں کہ تم جب تک زندہ رہو گے یہ قائم رہے گی..... تم کبھی بوڑھے نہ ہو گے..... تم ایک رات میں جتنی لڑکیوں اور عورتوں سے دل بہلاتا چاہو بہلا سکو گے..... وہاں ایسی شراب ہوگی تم نے کبھی پی نہیں ہوگی..... اس کا لائقہ..... لذت..... سرور جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے..... تمہاری سیوا کے لئے عورتیں ہوں گی۔“

”ہاں..... ہاں..... مجھے منظور ہے.....“ جگن ناتھ خوش ہو کر بولا۔ ”میں سکھ سے بھری زندگی گزارنا چاہتا ہوں..... لیکن کیسے.....؟“

”اس کے لئے تمہیں میرے ہاتھوں مرنا ہوگا.....“ خونی مجسمہ نے جواب دیا۔
”کیا کہا.....؟“ جگن ناتھ کی شئی کم ہو گئی اس کے سارے جسم میں خوف و دہشت کی لہر کسی بھڑکی نوک کی طرح اتر گئی۔ اس کی ساری مسرت کا فور ہو گئی۔ اس نے سنبھل کر پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔ ”یہ کیا بات ہوئی..... ایک طرف تم مجھے پھنسا دکھا رہے ہو۔ دوسری طرف مجھے موت کی بیٹھک اتارنا چاہتے ہو..... تمہاری یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔“

”اس لئے کہ جب تک تم میرے ہاتھوں مارے نہ جاؤ اس وقت تک وہاں کے مزے وٹ نہیں سکتے.....“ خونی مجسمہ بولا۔ ”تمہارے مرنے کے بعد تمہاری آتما وہاں چلی جائے گی۔ پھر تمہاری آتما وہاں سے کبھی بھی نکل نہ سکے گی..... میری دیوتا سے یہ سوگند ہے کہ اس پنوں جیسی دنیا میں جس کسی کو سودا تک رکھنا ہے میرے ہاتھوں اس کی موت واقع ہوگی۔ ویسے کچھ دنوں کے لئے مرے بغیر بھی رکھ سکتا ہوں..... جیسے میں نے پرکاش مہرہ کو رکھا تھا۔ لیکن تمہیں اس دنیا میں زندہ رہنا دیکھنا نہیں چاہتا.....؟“

”وہ کس لئے.....؟“ جگن ناتھ نے پھنسی پھنسی آواز میں پھر کہا۔ ”میں نے تمہارا کیا اڑا ہے.....؟ کیا جرم کیا ہے؟“

”اس لئے کہ تم ایک نہایت ہی ذہین اور باصلاحیت اور بہت سارے علوم کے ماہر ہو..... تمہارا زندہ رہنا میرے لئے نہ صرف خطرناک بلکہ مصیبت کا باعث بن سکتا ہے..... تم واحد شخص

اس وقت وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ مجھے کاہتا نہیں تھا۔ پھرے کمرے کا دروازہ کھلا۔ کمرے میں ایک تیس برس کی پرشباب گداز بدن کی عورت داخل ہوئی۔ وہ اتنی حسین تھی کہ اس نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی اس کی دنیا میں تھی۔ اسے بے جاہلی کی حالت میں دیکھ کر وہ دم بخود رہ گیا۔ اس نے قریب آ کر جھکن ناتھ کا ہاتھ تھاما تو اس کے بوڑھے اور کمزور جسم میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔

وہ عورت اس کو ایک کمرے میں لے آئی۔ اس الماری میں سے ایک شراب کی بوتل نکال کر پلائی۔ شراب پیتے ہی اسے لگا وہ پھر سے سترہ اٹھارہ برس کا جوان ہو گیا۔ اس نے اپنے اندر ایسا بے پناہ قوت محسوس کی وہ عورت پر ٹوٹ پڑا۔ پھر عورت اسے ایک کمرے میں لے آئی۔ جہاں اس عورت کو ملا کر بیس حسین اور پرکشش لڑکیاں موجود تھیں۔ وہ سب اس حالت میں تھیں جس حالت میں عورت تھی۔ اس وقت مجسمہ کمرے میں آ گیا اور بولا۔

”اب تمہیں میری بات کا۔۔۔۔۔ یہ دو شیرائیں اور عورتیں تمہاری سیوا کریں گی۔۔۔۔۔ یہ سورگ عورتوں کو۔۔۔۔۔ اچھا اب واپس چلو۔۔۔۔۔ آنکھیں بند کرلو۔۔۔۔۔ عمر مرنے کے تم مرنے کے بعد یہاں ہو گے۔۔۔۔۔“

چند لمحوں کے بعد وہ اپنے کمرے میں تھا۔ جھکن ناتھ اس پر سنے کا نہیں حقیقت کا گمان ہوا۔ اس سے پہلے وہ کچھ کہتا۔ مجھے نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹ دیا۔

☆.....☆.....☆

ہندوستان میں ایک سے ایک گائیکی موجود تھا۔ فلمی دنیا کے گلوکاروں نے ملک بھر میں دھوم مچا رکھی تھی۔ لیکن یہ آواز کیا تھی۔۔۔۔۔ اس نے کبھی اپنی زندگی میں ایسی مسوکن آواز نہیں سنی تھی۔ اس آواز میں نہ صرف مدھر پن تھا بلکہ سات سروں کی دنیا آباد تھی۔ ہر سو قوس قزح کا ایک رنگ تھا۔ اس نے حیرت سے سوچا کہ وہ تو دریڈیو، فلم اور ٹی وی ہو کسی نغمہ سرا کیوں نہ ہوا۔ اگر وہ شو بیز کی دنیا میں چلا جائے نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا میں تہلکہ مچا سکتا ہے۔ لیکن اس نے اپنی مہارت، خوبی اور فن سے فائدہ کیوں نہ اٹھایا؟ کیا اس لئے کہ وہ دولت مند ہے۔۔۔۔۔ اسے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔۔۔۔۔ اپنی آواز کو روشناس نہ کرنا حیرت کی بات تھی۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ نہ صرف دولت مند بلکہ شہرت کا مالک ایسی شہرت کی کو نصیب نہ ہوتی ہونہ ہوگی۔

وہ تو کھنکھانے والی گیت بڑے جذباتی انداز سے گارہا تھا۔ پونما س کے سامنے بیٹھی اس کی آواز کے سحر میں ڈوب رہی تھی۔ اس کی آواز جادو جگ رہی تھی۔ پونم آنکھیں بند کئے سن رہی تھی۔۔۔۔۔

ہو جو میرے بارے میں معلومات کر سکتے ہو۔۔۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ دنیا والوں کو میرے بارے میں علم ہو کہ میں کیوں اور کس لئے اس دنیا میں آیا ہوں۔ ایک نیا جم لیا ہوں۔“

”مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میری موت کے لئے تم یہ ساری باتیں کر رہے ہو۔۔۔۔۔؟ جھوٹ بول رہے ہو۔۔۔۔۔ قریب دے رہے ہو۔۔۔۔۔ ایسی سپنوں کی دنیا کہیں نہیں جس کے بارے میں تم بتا رہے ہو۔ مجھے تمہاری کسی بات کا یقین نہیں۔۔۔۔۔“

جھکن ناتھ کا خیال تھا کہ اس کی کھری کھری باتیں سن کر مجسمہ غصے میں آ جائے گا اور اسے موت کی بجائے چڑھادے گا۔ لیکن مجسمہ مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

”تم بوڑھے اور دکھی نہ ہو تو میں تمہیں درد کی سے موت کے گھاٹ اتار چکا ہوتا۔۔۔۔۔ میری سچائی جاننا چاہتے ہو۔۔۔۔۔ میں تمہیں تھوڑی دیر کے لئے اس دنیا میں لے جا رہا ہوں۔ پھر وہاں سے واپس لے آؤں گا تاکہ تم جان لو کہ میں نے جو کچھ کہا وہ غلط نہیں۔۔۔۔۔ اس تھوڑی دیر میں تم بہت کچھ جان لو گے۔۔۔۔۔ کہ یہ سنا نہیں ایک حقیقت ہے۔ تم آنکھیں بند کرلو۔“

جھکن ناتھ نے اس کی بات آزمانے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اس کے دل کے کسی کونے میں ایک لرزہ خیز خیال نے جنم لیا کہ کہیں اس بہانے وہ اسے مارنا تو نہیں چاہتا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کھول نہ سکا۔

چند لمحوں کے بعد اس نے اس مجسمہ کی آواز سنی۔ ”اب تم اپنی آنکھیں کھول دو۔۔۔۔۔“

جھکن ناتھ نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے اپنے آپ کو ایک خوب صورت اور آراستہ کمرے میں پایا۔ اس کے سامنے اتنی بڑی مسہری تھی جس پر نرم و گداز بستر بچھا ہوا تھا۔ ایسا کمرہ اس نے خواب میں کیا تصور میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس مسہری کے عقب میں جو کھڑکی تھی اس کا پردہ ہٹا تھا۔ اس نے بہت ساری رنگین، چھوٹی اور بڑی مچھلیاں تیرتی ہوئی دیکھیں۔۔۔۔۔ جواہر کی سطح اور تہ میں جاری تھیں۔

معا اس کی نگاہ ایک بہت بڑی آبخوی الماری پر پڑی جس میں خوب صورت اور چھوٹے بڑے مجسمے بھرے تھے۔ اس لمحے وہ اپنے آپ کو بھول گیا۔ وہ تجسس اور اشتیاق کے زہرا الماری کی طرف بڑھا تو اسے لگا کسی نادیدہ طاقت نے اپنی طرف کھینچا ہو۔ جب وہ سامنے لگا کر رکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور اسے یقین نہ آیا۔

یہ نوادرات اور مجسمے کسی قیدیوں کی طرح جھانک رہے تھے۔ مسکرا رہے تھے جیسے زماہ ہوں۔۔۔۔۔ اس کے تین خانوں میں جو ہر ساز کے ہیرے جواہرات رکھے تھے اس نے ششہا کر دیا تھا۔ وہ خواب ناک نظروں سے دیکھنے لگا۔

و نو دکنہ کی نظروں کی گرفت میں پونم کا سراپا تھا۔ وہ اس حسن و شباب کی حشر سامانیاں نظروں میں جذب کر رہا تھا۔ پونم کی سرکش جوانی، اس کا ابلتا شباب اور اس کے انگ انگ سے ابلتی مستی کسی ناگن کی طرح اسے ڈس رہی تھی۔

یہ گیت ایسا تھا کہ اس کے پس پشت اظہار محبت تھی..... لیکن پونم نے محسوس کیا کہ اس میں کوئی اور جذبہ کارفرما ہے۔ یہ گیت اس کے جذبات کے اظہار ہے تھے جیسے و نو دکنہ چاہتا تھا کہ وہ اس کی آواز اور گیت سے متاثر ہو کر اس کی جموٹی میں کسی کپکپھل کی طرح گر جائے۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اپنے جذبات پر قابو نہ پاتی۔

اس گیت کے آخری مصرعہ نے پونم کو چوکا دیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو و نو دکنہ کی آنکھوں میں ہوسنا کی بھری محسوس ہوئی۔ لیکن سولہ بے حد رومانی اور جذباتی تھی۔ مرنے کے بعد بھی تم سے پیار کروں گا۔

”مرنے کے بعد پیار کروں گا.....“ پونم بولی۔ ”کیا مرنے کے بعد پیار کیا جاسکتا ہے.....؟ کیا آسمان پر یا پر پوک میں.....“

”ایک شاعر نے اپنے احساسات کی ترجمانی کی ہے۔“ و نو دکنہ بولا۔
”یہ گیت..... پرانگندہ شعروں سے بھرا ہوا ہے۔“ پونم بولی۔ ”یہ سغلی جذبات کی بھرمار ہے..... یہ ایک فلم کا گیت ہے۔ آج کل فلموں میں ایسے گانوں اور گیتوں کی بھرمار ہے..... جس سے نئی نسل خراب ہو رہی ہے۔“

”یہ وقت کا تقاضا ہے.....“ و نو دکنہ نے کہا۔ ”آج کل کے نوجوانوں کو ایسے ہی گیت من بھاتے ہیں۔“

”یہ وقت کا تقاضا کیا ہوتا ہے.....؟“ پونم نے طنز یہ لہجہ میں کہا۔ فلموں میں جو بے ہودہ، لچر اور عریاں مناظر ہوتے ہیں وہ برائی کی طرف اکساتے ہیں کہ وہ بھی وقت کا تقاضا ہے.....؟ ویسے آپ کی آواز بہت سندر ہے۔ محو کن ہے۔ آپ نے شو بزنس کی دنیا میں قدم کیوں نہیں رکھا.....؟ میرا خیال ہے کہ آپ فلم، ٹی وی اور ریڈیو پر آئیں تو دھوم مچا دیں۔“

”اس تعریف کا بہت بہت شکریہ۔“ و نو دکنہ نے کہا۔ ”میں نے بھی اس دنیا میں جانے کا نہیں سوچا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری آواز اتنی اچھی ہے۔ چوں کہ آپ نے میری بہت تعریف کی ہے لہذا میں سوچوں گا۔ یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔“

و نو دکنہ نے محسوس کر لیا تھا کہ پونم کا جھکاؤ اس کی طرف غیر محسوس انداز سے ہو رہا ہے۔ لہذا اس گیت کے بول پونم پر جادو کر دیں گے لیکن اس کا یہ جادو نہ چلا۔ وہ مایوس بھی نہیں ہوا تھا۔

یہ میدان عشق تھا۔ محبت میں ہار اور جیت ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے اس کے ذہن میں تدبیر آئی تو اس نے پونم کو آ زمانے کے لئے موضوع بدلا۔

”کل مجھے ایک بے حد ضروری کام سے ممبئی سے جانا پڑ رہا ہے۔“ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

”نہیں..... نہیں.....“ پونم کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکلا۔ وہ پریشان سی ہو گئی۔
”جب تک یہ نمائش ہے اس وقت تک کے لئے..... میں تمہارے اور شاستری کی رہائش کے لئے ہر طرح کا انتظام کر جاؤں گا۔“ اس نے کہا۔ ”کسی بات کی کمی اور ضرورت محسوس نہ ہوگی۔ لہذا کسی چٹا کی ضرورت پیش نہیں آئے گی.....“

”کیا ہم دونوں تمہارے بغیر یہاں رہیں گے.....؟“ پونم کے چہرے پر ایک خوف کی سی لہر ابھری..... ایک ان جانے خیال نے اسے ڈسا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں..... شاستری کوئی قاعدہ نہ اٹھائے۔ گو کہ اسے اپنے اوپر بھروسہ تھا۔ شاستری پر بھی..... لیکن وہ یہ بات جانتی تھی کہ مرد اور ناگ کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ اکیلی عورت ہونے کا خیال مرد کو بہکا دیتا ہے۔

”میں نے کہا نا کہ میری غیر موجودگی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ شانتی رکھو۔“ و نو دکنہ اسے دلاسا دیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے و نو دکنہ.....!“ پونم نے فکر مندی سے کہا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ تمہاری جدائی میرے لئے سوہان روح بن جائے گی۔“

و نو دکنہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آیا اور اس کے غمگین شانے تھام لئے اور اسے کھڑا کر دیا۔ پھر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”میری جدائی تمہارے لئے ناقابل برداشت ہے تو میرے ساتھ چلو..... یہ میری دلی خواہش ہے کہ تم میری ہم سفر رہو..... تاکہ تمہاری رفاقت میں یہ سفر نکلیں اور حسین ہو جائے..... میں یہ بات کہہ رہا ہوں تو تمہیں برا تو نہیں لگ رہا ہے.....؟“

پونم نے لمحے کے لئے سوچا کہ..... اس سے دریافت تو کرے کہ وہ کہاں اور کتنے عرصے کے لئے..... کیوں جا رہا ہے..... واپسی کب ہوگی..... اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد پوچھا۔
”کب روانگی ہوگی؟“

”کل علی الصبح.....“ و نو دکنہ نے جواب دیا۔ ”میں روانگی کا پروگرام دو دن قبل ہی بنا چکا ہوں۔“

پونم..... شاستری اور و نو دکنہ کو صرف دوست اور ساتھی سمجھتی تھی۔ ابھی اس نے یہ فیصلہ نہیں کیا

نہیں لڑ رہے ہیں.....؟ شاستری سے لڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ دودھ دکن ہو سکتا تھا۔
پونم فوراً ہی بجلی کی سرعت سے کمرے کی دہلیز پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ جہاں سے ہال کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ اس نے جو منظر دیکھا تو اسے نظروں پر یقین نہیں آیا۔ اس کے منہ سے ایک دلدوز چیخ نکل کر خاموش فضا میں بکھر گئی۔

دودھ دکن اور خونی مجسمہ ہال میں آپس میں الجھے ہوئے تھے۔ وہ پہلوانوں کی طرح محکم کھٹا ہو رہے تھے۔ وہ خونی مجسمہ پتھر کا نہ تھا بلکہ کسی گوشت پوست کے انسان کی طرح تھا۔ اس کا جسم اس قدر سخت مضبوط اور صحت مند دکھائی دیتا تھا کہ جیسے وہ آہنی انسان ہو۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ دودھ اس کے جسم پر اس طرح سے کے برس رہا تھا جیسے وہ ریڑ کا پانی ہوا ہو۔ مجسمہ کی انگلیوں نے دودھ کی گردن کو ہاتھوں کے ٹکڑے میں سرس رکھا تھا جیسے وہ اسے ختم کر دینا چاہتا ہو۔ دودھ کی گردن اس قدر سخت تھی کہ وہ اس کا گلا گھونٹ نہ پا رہا تھا۔

پونم کی دل خراش چیخ سن کر وہ دونوں ہی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ لڑائی لمحے کے لئے رک گئی۔

مجسمے نے پونم کی طرف دیکھا اور اس نے لہنی گرفت کمزور کر دی تو دودھ کی گردن آزاد ہو گئی۔
مجسمے نے اسے زور سے دھمکا دیا کہ وہ اس طرح لڑکھڑاتا ہوا دور جا کر جیسے پلاسٹک کا گدا ہو۔ وہ فرش پر بے سدھ پڑا تھا۔

مجسمہ زینے کی طرف برقی سرعت سے لپکا۔ راپتے میں دودھ آیا تو اسے ایک لات ماری تو وہ گیند کی طرح اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔

جب مجسمہ نے زینے پر ایک قدم رکھا تو پونم کے اوسان خطا ہو گئے اور اسے خود پر قابو نہ رہا۔ وہ دہشت زدہ ہو کر ایک قدم پیچھے ہٹی تو دیوار سے جا لگی۔ اس نے اپنے کمرے کی طرف بھاگنے کی کوشش کی تو اسے لگا اس کے پیروں نہ صرف بلکہ منوں بھاری ہو گئے ہیں۔ وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتی..... کمرے میں جا کر پناہ لینے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ کیوں کہ کمرے کا دروازہ توڑنے اور گرانے کے لئے اس کا صرف ایک ہی مکا کافی تھا۔ دروازہ کھڑے کھڑے ہو جاتا۔

مکان سے باہر نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ اوپر نہ تھا۔ وہ بالکنی سے چھلانگ لگا کر دودھ بھی نہیں سکتی تھی۔ نیچے البتہ دو ایک راستے تھے۔ لیکن وہ جانی کیسے..... کیوں زینے پر سے مجسمہ اوپر اور اس کی طرف آ رہا تھا۔

مجسمہ کے چہرے پر نہ تو غصہ تھا اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں ہوسٹاکی..... پونم کو ایسا محسوس ہوا تھا کہ وہ جیسے اس کی عزت لوٹنے آ رہا ہو..... اگر اس کی نیت ایسی ہوتی تو بشرے اور آنکھوں سے

صاف ظاہر ہو جاتا۔ جب مجسمہ اس کے قریب پہنچا تو وہ چکرائی اور مجسمے کے بازوؤں میں جھول گئی..... وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی تھی۔

وہ نیم بے ہوشی کی سی حالت میں تھی..... دیکھ رہی تھی..... محسوس کر رہی تھی..... وہ اس قدر دہشت زدہ ہو گئی کہ اس کی آنکھوں سے نکلنے کے لئے کوئی جدوجہد نہ کر سکتی تھی..... اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالے کر دیتا تھا..... مجسمے کی سانسیں گرم گرم تھیں لیکن ان میں ایک فرحت سی تھی..... اس کا لمس بڑا انوکھا اور لطیف سا تھا..... اس کے ہونٹوں میں مسکاس تھی..... اس کے ہونٹ..... چہرے..... لمحوں گردن کے نیچے رقص کرتے رہے..... وہ بے خودی ہوئی جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ حد سے تجاوز کرنے والا ہے..... لذت اور ایسا سرور کیف تھا کہ اسے روکنے کا کوئی خیال نہیں تھا۔

اچانک نیچے سے دودھ دکن ہڈیانی لہجے میں چیخ پڑا۔
”اوبہرام..... راجا رام..... شکھو..... شوم“

مجسمہ جو حد سے تجاوز کرنے والا تھا ان الفاظ نے جادو کا اثر کیا اور یک لخت مجسمے نے اپنے بازوؤں سے پونم کو آزاد کر دیا تھا۔

دودھ فوراً ہی زینہ طے کر کے اوپر آ گیا۔ اس نے پھر سابقہ الفاظ دہرائے۔
پونم نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ کسی ایسی جگہ چھپ جائے کہ مجسمہ کی نظر اس پر نہ پڑ سکے۔ لیکن کہاں چھپے اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ کمرے میں رکھی الماری کے پیچھے اتنی جگہ تھی کہ وہ با آسانی چھپ سکتی تھی۔ جب وہ الماری کی طرف بڑھی تو مجسمہ نے اسے دیکھ لیا۔ اسے پکڑنے کے لئے لپکا۔ ایک قدم بڑھایا تھا کہ ساڑی میں اس کا پیر آ گیا۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ فرش پر بکھر گئی۔ وہ زور زور سے سسکیاں لینے لگی اور اس کا سانس دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔ وہ جان گئی تھی کہ اب نہ تو اس کی عزت محفوظ ہو سکتی ہے اور جان..... مجسمہ اس کی بے حرمتی کر کے اسے جان سے مار دیا۔

مجسمہ اس کے پاس فرش پر دوڑا تو ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کا لباس بے ترتیب ہو رہا تھا..... ساڑی کا پلے سینے اور شانے سے ڈھلک کر فرش پر بکھرا تھا..... اس کی ساڑی گھٹنوں سے اوپر تک کھسک آئی تھی..... وہ بے جانی کی سی حالت میں پڑی تھی جس سے مرد کے جذبات بھڑک سکتے..... مجسمے نے اس کے چہرے اور سر پر ایک غلط نگاہ ڈالی اور اس پر جھک کر بولا۔

”تم نہایت حسین ہو..... انجی حسین کہ کسی راج کمار کی طرح..... تمہاری تو پرستش کرنی چاہئے۔“

پونم نے جواب نہیں دیا۔ وہ جواب کیا دیتی..... وہشت سے پٹی پٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”تم خوف زدہ اور پریشان نہ ہو دیوی.....! نہ صرف تمہاری عزت بلکہ زندگی بھی محفوظ رہے گی.....“ مجسمہ نے اسے دلاسا دیا۔ ”میں دود کی طرح سیاہ کار اور بدکار نہیں ہوں..... لیکن حسن کا پرستار ہوں۔ میں تمہیں صرف پیار کروں گا۔“

مجسمہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ پونم نے اس کے لہجے میں اور آنکھوں میں سچائی محسوس کی..... اس نے دود دھن کے ہارے میں غلط نہیں کہا تھا..... وہ اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے بولا۔

”تھوڑی دیر پہلے وہ بے ہودہ اور فحش گیت سنا کر تمہارے جذبات بھڑکا رہا تھا۔ اگر میں نے دیکھ اور محسوس نہ کر لیا ہوتا تو تم اس کی درندگی کا نشانہ بن چکی ہوتیں..... یہ میں تھا جو وہاں عاتبانہ طور پر موجود تھا اور اس کے مشترکات و ذکر تیار ہا۔ اگر میں اس کی تلاش میں نہ آیا ہوتا تو تم اس کی ہوس کی غر ہو چکی ہوتیں..... تم اس ذلیل اور کمینے سے ہوشیار رہنا..... وہ بھیڑیا صفت ہے۔“

پھر اس نے پونم کا خوب صورت، سڈول اور مرمریں ہاتھ تمام لیا..... اس میں نہ صرف ملاحت تھی بلکہ چاہت کا سا انداز تھا اور آنکھوں میں محبت تھی..... چہرے پر نہ ہوسنا کی تھی اور اس کی کسی بات اور حرکت سے درندگی محسوس ہوئی..... مجسمہ نے دود دھن کے ہارے میں جو کچھ بھی کہا تھا وہ غلط نہ تھا..... دود نے اس کی عزت سے کھینے کی کوشش کی تھی۔

پونم کی وہشت میں کمی آگئی تھی..... مجسمہ اس کے چہرے پر جھک گیا..... اس کے ہونٹ پونم کے چہرے، لمبوں..... مرمریں ہاتھوں..... گردن کے نیچے طواف کرتے رہے..... آخر میں اس کا بوسہ طویل ترین تھا۔ وہ ایک عجیب سے نفع اور کیف میں ڈوب گئی..... یہ نشاط انگیز لمحات اس کے لئے جیسے یادگار تھے..... وہ اس کے رحم و کرم پر تھی۔ وہ اسے حد سے تجاوز کرنے سے روک نہیں سکتی تھی..... مجسمہ نے اسے سہلے لے کر کھڑا کیا۔

”اب تم جا سکتی ہو.....“ مجسمہ نے کہا۔ ”میں نے تمہیں جی بھر کے پیار کیا وہ میرے لئے سربایہ ہے۔“

وہ ہال اور لباس درست کر کے دینہ اترنے لگی۔ وہ دود دھن کو بتانا نہیں چاہتی تھی کہ مجسمہ نے جی بھر کے اس کے ساتھ من مانیاں کیں..... نیچے دود دھن ناموس زبان میں چلا رہا تھا۔ وہ مجسمہ کے ساتھ نیچے پٹی تو اس کی جسامت کے عقب میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ اس وقت نظر آیا جب مجسمہ کا ہاتھ اس پر پڑا اور لڑھکتا ہوا دور جا گرا۔

اس وقت بہت سارے لوگوں کا شور بلند ہوا..... لوگ زور زور سے دروازے پیٹ رہے تھے۔ مجسمہ تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھا۔ صرف ایک ہل میں غائب ہو گیا۔ اس کا وجود نہیں رہا تھا۔

دود دھن نے دروازہ کھولا تو دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں سے ہال بھر گیا تھا۔ ایک آدمی تیزی سے زینہ پر چڑھ کر بیڑھیاں پھلانگتا اور پر آیا۔ پھر وہ پونم کی طرف بڑھا۔ پونم پر ایسا نشہ اور سرشاری طاری تھی کہ اسے کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے نیاز اپنے آپ کو مجسمے کے بازوؤں کے حصار میں محسوس کر رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ مجسمے کے بوسوں کی بو چھڑا ابھی بھی ہو رہی ہے۔

”جان..... جان تمنا.....! جان دل.....! کیا ہوا!“ اس کے کالوں میں ایک تھیر زدہ سی آواز گونجی۔

”پونم جیسے اس سحر سے نکل آئی۔ اس نے چونک کر اس آواز کی طرف دیکھا جو ناموس اور دل میں اتر جانے والی تھی۔

یہ شاستری تھا..... پونم کو اس بات پر حیرت، دکھ اور افسوس ہوا تھا کہ یہ شاستری کیوں تھا..... وہ کیوں اور کس لئے آیا تھا..... اسے آنے کی کوئی ضرورت نہ تھی..... اسے اپنے کمرے میں آرام کرنا چاہئے تھا۔

اور پھر یہ مجسمہ کیوں اور کس لئے آیا تھا.....؟ دود دھن کی جان لینے.....؟ وہ دود دھن کو زیر نہ کر سکا..... شاید زیر کر لیتا اور جان سے ختم کر دیتا دروازے پر دود کے سارے ملازمین نہ آ جاتے اور شور نہ کرتے..... کاش.....! وہ کچھ دیر نہ آتے..... ان لوگوں نے نہ صرف اس کا رنگین پینا چھین لیا بلکہ کیف و سرور کے لئے اسے جہاں سے نکال لیا جس سے وہ کبھی آستانہ ہوتی تھی۔

دود..... کیسا ہے دود دھن.....! پونم نے سرگوشی میں دریافت کیا۔

”آپ ٹھیک ہیں سر.....! لیکن ناموس اور بھاری آواز دود دھن سے مخاطب تھی۔

”دود.....! دود.....! پونم نے شاستری کے سہارے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ اس کا سارا جسم درد کر رہا تھا۔ جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا تھا۔ لیکن اس میں بیٹھا بیٹھا سارا درد بھر گیا تھا۔ مجسمے نے تو اسے کسی کیلے کپڑے کی طرح نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔

پونم نے جب نیچے کر تشریف لیا اس ناموس اور بھاری آواز نے اسے دلاسا دیا۔

”فکر کی کوئی بات نہیں..... یہ بالکل ٹھیک ہیں..... انہیں کچھ نہیں ہوا..... آپ بالکل پریشان نہ ہوں.....“

اسے بے تحاشا چوما تھا۔ اس کی بات کا یقین نہ کیا جاتا..... البتہ شاستری کو شک ہوتا کہ وہ حرکت یقیناً دود کی ہے۔ اسے یہ سب کچھ بتانے کی ضرورت نہ تھی۔

”جی ہاں..... یہ حقیقت ہے کہ میں نے اسے دیکھا..... میں کوئی بچی نہیں ہوں جو آپ میری بات پر یقین نہیں کر رہے ہیں۔“ وہ تنک کر بولی۔ اس نے مسٹر دودھنہ پر بھی حملہ کیا تھا۔ ددوں آپس میں تھم گئے تھے۔

”کیا.....؟ اس نے دودھنہ پر حملہ کیا تھا.....؟“

شاستری نے جس لہجے میں یہ سوال کیا تھا پونم نے اس سے اندازہ کیا کہ اس مجسمہ کے ذمہ ہوجانے سے شاستری کو اتنا اچنبھا نہیں ہوتا دودھنہ پر حملہ کرنے سے..... اس بات کو صرف تینوں ہی سمجھ سکتے تھے۔

شاستری اور سنیل داس نے نظروں ہی نظروں میں دیکھ کر کچھ کہا..... لیکن یہ حرکت پونم کی نظروں سے پوشیدہ نہیں رہی۔ ”لیکن اس مجسمے نے ایسا کیوں کیا.....؟“ وہ انپکٹر سے کہنے لگا۔ ”وہ صرف مسٹر دودھنہ کو ختم کرنے آیا تھا..... اگر اسے گھر کے کسی فرد کو نقصان پہنچانا مقصود ہوتا تو وہ مجھے یا اس پونم کو نقصان پہنچا سکتا تھا..... ملازموں میں سے کسی اور کو..... صرف مسٹر دودھنہ کو یہ ایک معرہ ہے..... انپکٹر! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو قصوری ہم نے آپ کو پیش کی وہ غلط ثابت ہوئی..... میں حیران ہوں کہ ایسا کیوں ہوا.....؟ اس بات نے تو دماغ الٹ دیا ہے۔“

”قیدیوں کے ساتھ بھی معصیت ہے۔“ انپکٹر کا لہجہ فکر مندی سے بھر گیا۔ وہ بسا اوقات غلط بھی ہو جاتی ہیں..... اس لئے ان کے متعلق دھوکے سے کوئی بات نہیں کہی جاتی ہے..... اس طرح موسم کو لے لیں۔ ان کے متعلق جو پیشین گوئی کی جاتی ہے وہ کبھی درست ثابت نہیں ہوتی..... لہذا محکمہ موسمیات بہت بدنام ہے۔“

ہال کا بظنی دروازہ کھلا..... دودھنہ کا ملازم جوزف سرا سمہ سا اندر داخل ہوا۔ اس نے انپکٹر اور دوسرا ہوں کی مدد سے اٹھایا جو ایک کمرے میں بستر پر پڑا تھا۔ اسے اس کی خواب گاہ میں لے جا کر بستر پر لٹایا۔

”دیکھئے انپکٹر! شاستری نے کہا۔“ کیا آپ ہمیں اپنی بات بچ ثابت کرنے کا ایک اور موقع دیں گے.....؟“

”ایک پیشہ ور سراغ رساں کے مقابلے میں ایک شوقیہ سراغ رسائی کرنے والے کو یہی تو ایک فائدہ رہتا ہے۔“ انپکٹر مسکرا دیا۔ ”دوسرا موقع.....؟ اس امر کی اجازت کی کیا ضرورت ہے..... آپ لوگ ہر طرح سے آزاد ہیں۔ ہم نے کوئی قدغن نہیں لگائی اور نہ ہی آپ کے راستے میں

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں..... بھگوان کرے۔ ایسا ہی ہو۔ میں تو دل میں بہت ڈر گئی تھی۔“ پونم نے گہری سانس لے کر کہا اور شاستری کے سہارے ہال کی طرف بڑھی..... اسے مجسمے نے منع کیا ہوا تھا کہ ان رنگین لحات کے بارے میں وہ دودھ کو بالکل بھی نہ بتائے۔ اس کا راز میں رہنا ہی بہتر ہے۔

”آپ نے مجھے پچھانا مس پونم.....!“ انپکٹر جگ دیپ نے کہا۔ ”میں انپکٹر جگ دیپ ہوں۔“

”جی ہاں.....“ پونم نے رسمی انداز میں سر ہلا دیا۔ ”نمسکار.....“

”مس.....!“ انپکٹر جگ دیپ نے اسے دوبارہ مخاطب کیا۔ ”کیا آپ مجھے بغیر کسی ڈراور خوف کے بتائیں گی کہ کیا ہوا تھا..... آپ بے فکر ہیں..... اب وہ مجسمہ یہاں آنے سے رہا۔“ ”مجسمہ.....؟“ پونم صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

اس کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا وہ کیسے اور کیوں کرایک اجنبی مرد کو بتا سکتی تھی..... یہ سب صرف اور صرف کسی راز دار دوست یا سبکی کو ہی بتایا جاسکتا تھا..... مجسمہ کے تصور نے اس کی زبان تنگ کر دی تھی..... اور پھر مجسمے نے اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ کسی کو بھی اس واقعے کے بارے میں نہیں بتائے گی..... مجسمہ کی شخصیت سحر زدہ ہی تھی۔ اس کا ہاتھ میں ہاتھ لینا جس میں بڑی ملاصفت اور گداز سا تھا..... اس کی محبت بھری نظریں جس میں ہوسنا کی بالکل بھی نہ تھی..... اور پھر اس نے اپنے بوسوں سے اس کا چہرہ، سراپا اور بانٹیں تک چوم لی تھیں..... اس کی سانسیں کیسی فرحت بخش تھیں..... وہ اکیلی اور اس کے رحم و کرم پر تھی۔ اس کے باوجود اس کی عزت پر آنچ نہیں آئی تھی۔ لیکن اس کے بوسوں نے اسے غڑ حال کر دیا تھا۔

اس انپکٹر کے ساتھ سنیل داس بھی آیا ہوا تھا۔ وہ بولا..... ”کیا..... کہا وہ یہاں آیا تھا.....؟“ سنیل داس نے سوال کیا تو اس کا لہجہ نہ صرف تحیر زدہ تھا بلکہ غیر یقینی بھی.....

پونم نے چونک کر سنیل داس کی طرف دیکھا۔ پھر سوچا۔ یہ یہاں کیا لینے آیا ہے.....؟ ”ہاں..... ہاں..... وہ یہاں آیا تھا.....“ پونم نے جواب دیا۔ ”وہ مجسمہ زندہ ہو کر انسان کے روپ میں ڈھل گیا تھا یا مجی کہہ لیں..... وہ گوشت پوست کا دکھائی دیتا تھا۔ کچھ کا آدمی.....“

”کیا آپ نے اسے واقعی دیکھا.....؟“ انپکٹر نے سوال کیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”کہیں یہ آپ کا داہمہ تو نہیں ہے.....؟“

اس کے چہرے..... رخساروں..... اور عریاں ہاتھوں اور گردن کے نیچے گہرے گہرے سراغ نشان تھے۔ کسی نے اس پر غور نہیں کیا..... اگر وہ بتاتی کہ یہ مجسمہ کے ہونٹوں کے نشان ہیں۔ اس نے

رکاوٹ بن رہے ہیں۔“

ان کی گفتگو پونم کے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ مبہم اور غیر واضح تھی۔ ایک طرح فلسفہ بگھارا جا رہا تھا۔ اپنی طرف متوجہ نہ پا کر وہاں سے کھسک گئی۔ پہلے وہ اپنے کمرے میں گئی۔ چہرے اور جسم پر جہاں گہرے سرخ نشانات تھے اسے صاف کیا۔ پھر اپنے کمرے سے نکل کر دودھ کنے کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کے باوجود کہ مجھے نے اس کے دل میں دودھ کنے کے بارے میں یہ گمان پیدا کر دیا تھا۔ اسے دودھ کنے کی بڑی فکر اور پریشانی تھی وہ اس لئے تشویش میں مبتلا تھی کہ مجھے نے دودھ کنے کے جو ہاتھ مارا تھا بڑا بھرپور اور آہنی سا تھا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ بڑے پرسکون انداز سے بستر پر اس طرح لیٹا ہوا تھا جیسے کچھ ہوائی نہیں تھا۔ اس نے پونم کو دیکھ کر کمرے میں موجود سپاہیوں کو جو اس کی حفاظت کے لئے موجود تھے ان سے باہر چلے جانے کے لئے کہا۔ وہ ایک ایک کر کے کمرے سے نکل گئے۔

پونم دل میں اس بات پر حیران پریشان تھی کہ اس کے دل میں دودھ کنے کے لئے نفرت و محبت کے ملے جلے جذبات موجود کیوں ہیں۔ جب وہ اس کے سامنے آتی ہے تو اپنے دل میں اس کے لئے بے پایاں محبت محسوس کرتی تھی۔ آخر یہ کیا اسرار ہے۔؟ مجھے نے دودھ کنے کے خلاف جو نفرت کا زہر اگھا تھا۔ اب دودھ کنے کے سامنے آتے ہی وہ امرت میں بدل گیا تھا۔ سپاہیوں کے جانے کے بعد پونم نے دروازہ بند کیا اور اس کے پاس آ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ دودھ کنے نے بستر پر دروازے ہونے کے بعد اس کا ہاتھ تمام لیا۔ لیکن عجیب سی بات یہ تھی کہ دودھ کنے کے ہاتھوں میں وہ لطیف اور انوکھا لمس نہ تھا جو مجھے میں تھا۔ ”میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا ہے کہ یہ سب کیا تھا۔“ اس نے فکر مندی سے دودھ کنے کی طرف دیکھا۔ ”یہ عقل میں آنے والی بات نہیں ہے۔ میں تو سوچ سوچ کر خوف زدہ اور پریشان ہوئی جا رہی ہوں۔“

”کون سی بات۔؟“ دودھ کنے اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتے ہوئے بولا۔

”مجھے کاغذ ہو کر آتا۔ وہ ہو، ہو کسی آدمی کی طرح لگ رہا تھا۔ گوشت پوست کا تھا۔ کیا ایسا ممکن ہے۔؟ اگر ایک می بھی آدمی بن جائے ناقابل یقین سا لگے۔ کیا ایسا ممکن ہے۔؟ یا پھر یہ اسرار اور خوفناک واقعہ جسے پولیس تو کیا سائنس بھی تسلیم نہیں کرے گی۔“ اس کا چہرہ ابھی تک سفید تھا اور آواز میں لرزیدگی سی تھی۔

”ہاں۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ بڑا عجیب و غریب پر اسرار۔۔۔۔۔ ناقابل فہم سا لگ رہا ہے۔“ دودھ کنے نے بے نیازی سے کہا۔ لیکن جب ان پر سے پردہ اٹھے گا تب تمہیں جلد ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ جب حقیقت کا علم ہوگا تب ساری باتیں معقول اور حقیقت سے قریب لگیں گی۔ ان میں

کوئی ابہام نہیں ہوگا۔“

”حقیقت۔۔۔۔۔ کیسی حقیقت۔۔۔۔۔ کیا حقیقت پر اسرار ہوتی ہے۔۔۔۔۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ مجھے نے صرف تم پر حملہ کیوں کیا۔؟ اس نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔ اگر وہ قصے کہانیاں غلط نہیں ہیں تو اسے سادگی کو دھونے والوں کا پیچھا کرنا اور حملہ آور ہونا تھا۔ یعنی میری مراد لیکن ہاتھ اور سٹری سے اور خود سے ہے۔“ یہ بات کہتے کہتے اس خیال سے لرز گئی، اگر مجھے اس کی عزت تاراج کرنے کے بعد جان سے مار دیتا۔؟ لیکن اس کے ساتھ ایسا نہیں کیا۔ اسے ایک لذت سے آشنا کر گیا۔ ایسی لذت اور کیف جس سے وہ آشنا تھی۔ چوں کہ ایک عورت ہونے کے باعث دودھ کو پلانے سے قاصر تھی۔ اس نے اس لئے تو تمہیں نشانہ بنانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ تم نے نہیں مہمان بنایا اور ہمارا۔“ پونم نے دانستہ اپنا جملہ پورا نہیں کیا۔

دودھ کنے نے اس کی بات پھر سے غور سے سنی۔ اس کے چہرے پر خوف کی علامت نہ تھی اور اس نے پونم کی بات کا کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ مجھے کے قاتلانہ جملے سے دہشت زدہ ہوتا۔ وہ ہر طرح سے پرسکون نظر آتا تھا۔

پونم کو اس بات پر سخت حیرت تھی کہ دودھ کنے کو ہر وقت جس بات کا تجسس سار ہا تھا۔ اس وقت کیوں نہیں۔؟

”تمہارے ذہن میں جو کشمکش اور ہی ہے۔۔۔۔۔ جو سوالات جنم لے رہے ہیں مجھے اس کا بہ خوبی اندازہ ہے۔ تم خوف اور تجسس کے جس گرداب میں پھنسی ہو اس سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا ہے۔ کیا میں غلط کہہ پاؤں؟“

”ہاں۔۔۔۔۔“ پونم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”ہاں۔۔۔۔۔ میں یہ جانتا چاہتی ہوں آخر یہ اسرار کیا تھا۔؟“

”مجھے جو لوگ ہیں انہیں جانے دو۔ پھر میں تمہیں بتاتا ہوں کہ کیا اسرار ہے۔؟“ دودھ کنے نے کہا۔

”لیکن ابھی اتنی جلدی وہ ٹپٹے والوں میں سے نہیں ہیں۔“ پونم نے کہا۔ ”وہ دھرم مار کر بیٹھ گئے ہیں۔ لیکن ان کی موجودگی سے کیا طریق پڑتا ہے۔“

”بات کچھ ایسی ہے کہ میں ان کی موجودگی میں بتانا نہیں چاہتا۔“ دودھ کنے نے اس کا ہاتھ تمام کر اس کی پشت چھو چھائی۔

”وہ سب نیچے ہیں۔ کمر بند ہے۔ آواز نیچے جانے سے رہی۔“ پونم نے تکرار کیا۔ اس لمحے دروازے پر دستک ہوئی تو پونم کی بات کی تصدیق ہو گئی کہ لوگ نیچے دھرم دے بیٹھے

ہیں۔ ان کے جانے کا دور دور تک امکان نہیں ہے۔ دوسرے لمحے کمرے میں شاستری داخل ہوا دود کے ہاتھ میں پونم کا ہاتھ دیکھ کر وہ ٹھٹکا۔ پھر بظاہر لائق اور چہرے پر کوئی رد عمل لئے ان کی طرف بڑھا۔

”ہمیں اس اسرار کو ہر قیمت پر اور کسی نہ کسی طرح جاننا ہوگا۔“ شاستری نے کہا۔ ”ہمیں خاموش نہیں بیٹھنا ہے۔“

”لیکن کس طرح سے اس راز پر سے پردہ اٹھا سکتے ہیں.....“ پونم نے غیر محسوس انداز سے اپنا ہاتھ دود کے ہاتھ سے چمڑا کر پوچھا۔ ”وہ دل میں بڑی خجالتی محسوس کر رہی تھی کہ شاستری نے کیا سوچا اور خیال کیا ہوگا؟

”سر جگن ناتھ کے تعاون کے بغیر یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا..... اس کے لئے انہیں کسی نہ کسی طرح آمادہ کرنا ہوگا۔ میرے خیال میں ہندوستان صرف وہی ایک ایسی جہتی ہیں جو اسرار علوم کے بارے میں جانتے ہیں..... گو کہ وہ پرکاش مہرہ کے رویے سے دل شکست ہو چکے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ تجسس کے باعث اس راز کو بے نقاب کر دیں۔“ شاستری نے کہا۔

”گویا آپ نے تہیہ کر رکھا ہے کہ اس اسرار کو بے نقاب کر کے ہی دم لیں گے.....؟“ دود کھنہ نے اس سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

”جب بھی میں کسی بات کا ارادہ کرتا ہوں تو اسے پایہ تکمیل تک پہنچائے بغیر چین سے نہیں بیٹھتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آپ کے صحت یاب ہوتے ہی اس کام پر توجہ دی جائے۔“ شاستری کے لہجے میں بھرپور طر تھا۔ پونم کے چہرے پر کسی اور خیال سے سرفی دوڑ گئی جس سے اس کے چہرے پر ایسا نکھار آیا کہ وہ اور حسین دکھائی دینے لگی۔

دود کھنہ نے سوچا کہ اگر شاستری نہ ہوتا تو پونم کے چہرے کر نکھار کو ہونٹوں پر جذب کر لیتا۔

”آپ کو نہ صرف پولیس کو بیان دینا ہوگا بلکہ ان کے سوالات کی بوجھاڑ بھی سہنا ہوگا۔“ شاستری بولا۔ ”جب تک آپ بیان دے کر پولیس کو مطمئن نہیں کریں گے پولیس آپ کے گھر پر ہر ادیتی رہے گی..... کسی ملاقاتی کو اعدا نے نہیں دے گی..... کیوں کہ پولیس اس پر اسرار واقعہ سے بہت ہی پریشان اور بری طرح الجھ گئی ہے..... پولیس اس واقعے کو جاننے کے لئے کسی قیمت پر تیار نہیں ہے لکن کے خیال میں میں پس پردہ کوئی ٹھوس بات ہے۔ پولیس سے دانستہ چھپائی جا رہی ہے۔“

پونم نے صاف محسوس کیا کہ شاستری نے صاف دھمکی دی ہے۔ لیکن دود نے کوئی اثر نہیں لیا۔

”دیکھ نہیں رہے ہو اس وقت ان کی کیا حالت ہو رہی ہے۔“ پونم بولی۔ ”اس وقت آرام کی سخت ضرورت ہے..... یہ باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں..... پولیس سے کہو وہ کسی اور دن آ کر ان کا بیان لے لے۔“

ٹھیک ہے تم انہیں ہر طرح سے آرام پہنچاؤ..... ان کی سیوا میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھو۔“ شاستری کا لہجہ جتنی سے بھر گیا۔

وہ پونم سے یہ بات کہہ کر نکل گیا۔ انہیں زینے پر اس کی چاہیں دور ہوتی سنائی دیں..... پھر بیرونی دروازہ دوسرے بند ہوا جیسے غصے سے بند کیا گیا..... دود کھنہ کی دل کی مراد برآئی تھی۔ اب اس کمرے میں آزادی ہی آزادی تھی۔ دود نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے اوپر کھینچ لیا اور چہرے کر نکھار کو ہونٹوں میں جذب کر لیا تو وہ کسمائی۔ پھر وہ اور جذباتی ہوتا گیا۔

”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ پونم نے چند لمحوں کے بعد بستر سے نکل کر لباس درست کیا۔ ”تم مرد بڑے جلد باز ہوتے ہو۔“

شاستری کے جانے کے بعد دود کھنہ نے جو اس سے کچھ دیر من مانی کی تھی اس کے بعد ان کے درمیان ایک سکوت سا طاری رہا۔ وہ یہ سوچ رہی تھی کہ مجھ اور دود کھنہ میں آخر اتنا فرق کیوں ہے..... دو ہزار برس قبل کی لاش اس میں آتما آ جاتی ہے اور وہ دنیا میں ایک آدمی کا جنم لیتی ہے تو اس کا لکس اتنا انوکھا، لطیف اور سنسنی خیز کیوں ہے، اس نے سنا تھا کہ جو کوئی روح دنیا میں آ جاتی ہے تو وہ غیر مرئی ہوتی ہے..... لیکن دو ہزار برسوں پہلے کی روح ایک عام انسان کی طرح تھی لیکن ایک غیر معمولی آدمی کی طرح..... اس میں انسانی جبلت تھی۔ اس میں انسانی حس موجود تھی۔ کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک سمجھ ہے۔

دود کھنہ نے اسے گہری سوچ میں غرق دیکھ کر بھانپ لیا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے اور کس انگلیش میں جلتا ہے۔ وہ اس موضوع پر پونم سے کوئی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اس گھر سے سکوت کو ٹوڑا۔

پولیس اتنی احمق ہوگی میں سوچ بھی نہیں سکتا..... کیا یہ سوچنے بچھنے کی بات نہیں ہے کہ میں ان کی آنکھوں میں دھول جمونک کر فرار ہو جاؤں گا.....؟ خود اپنے گھر سے..... آخر کیوں اور کس لئے.....؟ کیا میں کوئی مجرم ہوں..... مجھ سے سنگین جرم سرزد ہوا ہے..... دوسری بات جو ہے وہ اس پر اسرار واقعہ کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہے؟ کیا اس میں حیرت سے زیادہ عجیب بات نہیں لگتی ہے.....؟ وہ اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہے؟“

”پولیس سے جان چمڑانا کون سا مشکل کام ہے۔“ پونم بولی۔ ”وہ اپنی کارروائی پوٹی کرنا

چاہتی ہے۔ ایک کوئی سا بھی بیان دے دو وہ یہاں سے چلی جائے گی۔ آخر تم اس کی موجودگی سے اس قدر پریشان کیوں ہو رہے ہو۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ اب میں کل کسی وقت اسے کوئی بیان دے دوں۔“ دودھ نے بے پرواہی سے کہا۔

”تو کیا۔۔۔۔۔؟“ پنم بے صبری سے بولی۔ ”کیا تم نے جو کل رواگلی کا پروگرام بنایا ہے اسے ملتوی کر دو گے؟“

”رواگلی سے پہلے میں تمہیں حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔“ دودھ نے جواب دیا۔

”اس لئے کہ تم سے کوئی بات مخفی نہ رہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم میری بات غور سے سنو۔ اور ذہن نشین کرتے جاؤ۔“

اتنا کہہ کر دودھ نے اپنا چہرہ اس دیوار کی جانب کر دیا جو سامنے کی طرف تھا۔ جس کا ایک رخ پنم کی نظروں سے اوجھل تھا۔۔۔۔۔ جب اس نے پہلی بار دودھ کو دیکھا تو اس کی مردانہ وجاہت، خوب صورتی اور دراز قد اس کے من کی افتادہ گہرائیوں میں اتر گیا تھا۔۔۔۔۔ اس طرح جیسے من کا دیوتا ہو اور جس کے خواب وہ جو جانی کے آغاز سے دیکھتی آ رہی تھی۔

لیکن اب وہ چہرہ اس کی نظروں کے سامنے نہ تھا۔۔۔۔۔ کوئی اور ہی چہرہ تھا جو اس چہرے کے پیچھے چھپا ہوا تھا اب وہ سامنے آ گیا تھا۔ بھیاںک اور مکروہ۔۔۔۔۔ آج پہلی بار یہ چہرہ سامنے آیا تھا جسے دیکھتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ اس کے جسم میں شدید سردی کی لہر دوڑی گئی تو کچکی سی ہونٹیں تھیں۔ اس کی رگ رگ میں لہو برف ہو گیا۔ اس کی محرومہ سی آنکھوں میں وہ ڈوب کر رہ جاتی تھی اس وقت وہ ویران کھنڈر دکھائی دے رہی تھی۔۔۔۔۔ وہ ہونٹ جس میں اس کے لبوں کا امرت بھرا تھا وہ تارکول کی سڑک معلوم ہوتے تھے۔ جب یہ ہونٹ اس کے لبوں پر چپکے تھے تب اس نے کوئی تعرض نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ اس وقت وہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے کو تیار تھی۔۔۔۔۔ اب اسے ایک عجیب سی وحشت ہونے لگی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ بھاگ جائے نہ جانے کیوں اسے دودھ نے پر کسی بدروح کا گمان ہونے لگا تھا۔۔۔۔۔ اس نے ارادہ کیا تو اسے ایسا لگا کہ یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے کیوں کہ کسی نادیدہ ہستی نے اسے جیسے حصار میں لے لیا ہو۔ اب اس کا کوئی اختیار نہیں رہا ہے۔ اسے جیسے محرومہ کر کے بے بس کر دیا گیا ہے۔ وہ اب اس کا چہرہ اور آنکھیں لمسے کے لئے بھی دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔

”اچھا اب میں چلتی ہوں۔۔۔۔۔“ وہ بہ وقت تمام خود پر قابو پا کر بولی۔ ”تمہیں آرام کی اشد ضرورت ہے۔ باتیں بعد میں ہوتی رہیں گی۔ میں بھی بے حد محکم سے غم حال ہو رہی ہوں۔ چل کر

آرام کرنا چاہتی ہوں۔“

”تم نہیں جاؤ گی۔۔۔۔۔ اس لئے کہ مجھے تم سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔۔۔۔۔ تم میرے آرام کی فکر نہ کرو۔“ دودھ نے کہا۔

”میں بھاگی تھوڑی جا رہی ہوں۔“ وہ بڑے جبر سے ہنس کر بولی۔ ”تم سو جاؤ۔ میں کمرے میں ہی تمہاری دیکھ بھال کے لئے رہوں گی۔ برابر کا تو کرا ہے۔ بس ایک آواز پر آ جاؤں گی۔“

”پنم جانے کی ضد نہ کرو اور اطمینان سے بیٹھ کر میری بات سنو۔۔۔۔۔ دودھ نے اسے کسی صورت میں جانے دینے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ وہ کہنے لگا۔ ”سب سے پہلے تم اپنا ذہن تنگ رام سے منسوب داستان کی طرف لے جاؤ۔۔۔۔۔ تم میں سے کوئی بھی اس کی تحریر پر نہ پہنچ سکا جو سامی پر کندہ تھی۔۔۔۔۔ نہ پہنچ بھی سکتا تھا۔۔۔۔۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس پر جو لکھا ہوا تھا وہ نامکمل تھا اور درمیان کی اہم کڑیاں غائب تھیں۔۔۔۔۔ داستانہ ان تحریروں کو مٹا دیا گیا تھا۔“

”ایسا کیوں اور کس لئے کیا گیا تھا؟“ پنم کے حسین چہرے پر گہرا استعجاب بکھر گیا۔ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”اس لئے کہ۔۔۔۔۔ راز۔۔۔۔۔ راز ہی رہے۔۔۔۔۔ پھر وہ راز کیا جو افشا ہو جائے۔“ وہ کہنے لگا۔

”تمہارے پتائی کی نشاندہی جب اس کی کھدائی شروع ہوئی تو اس بات میں کسی قسم کی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی کہ سامی بڑا مدہ ہو جائے۔۔۔۔۔ اس لئے تمہارے پتائی کو نہایت درندگی اور بے رحمی سے موت کی سمیٹ چڑھا دیا گیا۔۔۔۔۔ اس بات کا خدشہ تھا کہ تمہارے پتائی اس تحریر کو با آسانی پڑھ لیں گے۔۔۔۔۔ اہم کڑیاں غائب کرنے کے باوجود تمہارے پتائی اسے پڑھ لیتے۔۔۔۔۔ تمہارے سامی ان کم شدہ کڑیوں کو طوائف کی پوری کوشش کرتے۔۔۔۔۔ کوئی بید نہ تھا کہ یہ اسرار ان پر کھل جاتا۔“

اس نے توقف کر کے گہرا سانس لیا۔ پہلو بدل کر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

سنو۔۔۔۔۔ اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔۔۔۔۔ جب مہاراجا نے اپنے چہیتے بیٹے تنگا رام کے مرنے کی خبر سنی تو اس پر جیسے آسانی بجلی گر پڑی۔ اس پر سکتہ سا چھپا گیا۔ اس کے دل کو اس قدر گہرا صدمہ پہنچا کہ وہ تین چار دنوں تک کتلی سے بات کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس صدمے نے اس کی جان لے لی تھی۔۔۔۔۔ مرنے سے پہلے اس نے حکم دیا تھا کہ اس کی سامی کی عمارت بہت شان دار اور اس قدر عالی شان ہو کہ جو دیکھے دیکھتا رہ جائے۔۔۔۔۔ پورے شاہانہ وقار سے اس کی آخری رسومات ادا کی جائیں۔ اس عمارت میں جو اس کی سامی بنائی جائے وہ قبر کی طرح ہو۔ اس کا سونے کا مجسمہ بنایا جائے۔ پھر اس کا خالص سونے کا مجسمہ بنا کر دفن کر دیا گیا۔۔۔۔۔ یہاں تک اس معاملے کا ہر کسی کو علم ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس راز اور اس بات کا کسی کو علم نہیں ہے کہ جب ہمارا بادشاہ بستر

مرگ پر تھا اس شخص کو بلا نہ بھیجا جو اس کے پیارے بیٹے کی موت کا ذمہ دار تھا۔ جس کے ہاتھوں میں رام کی موت واقع ہوئی تھی..... دلشان نے اسے بد دعائیں دی تھیں اور وہ خود اپنے بھائی کی آتما کے ہاتھ ہلاک ہو..... اس کی موت اتنی ہی دردناک ہو جتنی اس کے عزیز از جان بیٹے کی ہوئی تھی۔

اس نے سانس لینے کے لئے توقف کیا تو پونم جو بت بنی بیٹھی تھی باتیں سن رہی تھی اس نے فوراً ہی سوال کر ڈالا۔

”لیکن تمہیں دو ہزار برس کا یہ راز..... یہ تمام باتیں کس طرح اور کیسے معلوم ہوئیں..... جب کہ تم اس طرح بتا رہے ہو جیسے یہ کل کی باتیں ہیں.....؟“ وہ ششدر ہو کر کہنے لگی۔ ”اور پھر جب کہ تمہارا تعلق سائنس اور فنون لطیفہ سے ہے۔ جب کہ تم آثار قدیمہ سے متعلق نہ تو کوئی معلومات رکھتے ہو اور نہ ہی کبھی دلچسپی کا اظہار کیا۔“

”اس لئے کہ..... وہ شخص میں ہوں۔“ دودھنہ نے ساٹ لہجے میں جواب دیا۔

”کون شخص.....؟“ پونم کی سمجھ میں خاک نہیں آیا۔ ”میں تمہاری بات سمجھی نہیں.....“

دودھنہ یک لخت اٹھ بیٹھا اور بستر سے نکل کر کمرے کے وسط میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے سرخوت سے بلند کر کے اور سینہ تان کر پونم کو یک ٹک دیکھنے لگا..... اس کی نگاہیں پونم کے جسم سے آر پار ہو کر کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔

”میں مسرت لکار ہوں.....“ پونم کو اس کی آواز غلاؤں سے آتی محسوس ہوئی۔ ”میں مہاراجا دلشان کا چھوٹا بیٹا..... اب سمجھیں..... یا مزید بتانے کی ضرورت ہے۔“

مکان پر ایک وحشت کسی آسیب کی طرح مسلط تھی۔ کمرے کی در و دیوار پونم کو زہریلے پھنکار تے سانپوں کی طرح اسے اپنے حلقے تک کرتی محسوس ہو رہی تھی..... وہ خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ ایک پاگل کی باتیں سن رہی ہے..... ایک نفسیاتی مریض..... لیکن ساتھ ہی یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اس خوش فہمی میں رہنا نہیں چاہتی..... اس دنیا میں کیا کچھ ممکن نہیں ہے..... وہ ان اسرار کو جھٹلا نہیں سکتی تھی اور وہ سکتی تھی جواب تک پیش آچکے تھے۔ دودھنہ نے اس سے سچ کچھ کہنے کا جو وعدہ کیا تھا وہ اسے پوری سچائی سے پورا کر رہا تھا۔

”مجھے اس سنسار کے ختم ہونے تک بھٹکنے کی اذیت ناک بد دعا مل گئی ہے۔“ دودھنہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”مجھے کبھی موت نہیں آئے گی..... وہ واحد شخص مجھے اس بد دعا سے نجات دلاتا تھا ان لوگوں کے ہاتھوں ہلاک ہو گیا ہے جنہیں میں نے بھائی کے قتل کے لئے معاوضہ دیا تھا۔ میرے باپ نے بہت سوچ سمجھ کر مجھے اس عذاب میں مبتلا کر دیا تھا۔ میرے لئے اب اس کے سوا کوئی راہ نجات نہیں کہ اس شخص کے ہاتھوں مارا جاؤں جو خود مر چکا ہے..... اور ایک ناقابل یقین..... ناممکن

کی بات ہے..... لیکن یہ سب کچھ حالات پر منحصر ہے۔“

دودھنہ کی آواز جو مترنم اور کانوں میں رس گھولنے والی سی تھی..... جب وہ بات کرتا تو پونم کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کئی سربیک وقت بول رہے ہوں۔ وہ مسکوری ہو جایا کرتی تھی..... اس آواز کے سحر نے تو اسے دودھنہ کا اسیر بنا دیا تھا..... لیکن اب اس کی آواز بڑی بھیا تک اور صدیوں اور ہزاروں برسوں کی بازگشت تھی۔

بلا آخر اس نے منہ پر ہونے لہجے میں کہا۔ ”میں نے ابھی ابھی کہا تھا لیکن یہ سب کچھ حالات پر منحصر ہے۔ وہ وقت آن پہنچا ہے۔“

جگن ناتھ کی لاش اس طرح لائبریری میں پڑی تھی۔ اس کی ہلاکت کی کسی کو خبر نہ ہوئی تھی۔ اس کی آتما اس محل میں تھی جو موت کے بعد مجسمہ لے گیا۔ اب وہ اس محل میں مجسمہ کا مہمان تھا۔ سب سے پہلے اسے وہ شراب پلائی گئی تھی جو بوڑھوں کو جوان بنادیتی ہے۔ اب اس میں ایک جوان لڑکے کی سی جوان مردی، طاقت اور شباب تھا۔ سترہ اٹھارہ برس کے جوان لڑکے کی طرح.....

لوجوان لڑکیوں اور عورتوں میں وہ راجہ اندر بنا بیٹھا تھا۔ دل میں بہت خوش تھا۔ دوسری دنیا میں پہنچ کر وہ خوش تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ مجسمہ نے اپنا وعدہ نبھایا ہے۔

ایک ملازم نے دو تین مرتبہ اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی تھی۔ جب اس نے چوتھی مرتبہ بڑے زور سے کھٹ کھٹایا، تب بھی جواب نہ ملنے کی صورت میں اسے پریشانی سی ہوئی۔ کہیں کوئی گڑبڑ والی بات تو نہیں ہے..... اتفاق سے اس وقت پونم، سنیل داس..... شاستری اس کمرے کے دروازے پر دروازہ زور زور سے بجانے پر وہ لوگ وہاں پہنچ گئے۔ شاستری نے دروازے کا ہینڈل کھما کر دروازہ کھولا۔

پھر وہ سب کمرے میں داخل ہوئے۔ پونم نے جو جگن ناتھ کی لاش دیکھی غش کھا گئی۔ شاستری اسے لپک کر فوراً نہ سنبھالتا تو وہ فرش پر گر پڑتی۔ اس نے پونم کو صوفے پر لے جا کر بٹھا دیا اور اس کی پشت لاش کی طرف رکھی۔ پونم جگن ناتھ کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ جگن ناتھ کو بھی اپنے باپ کی طرح چاہتی تھی۔

انسپکٹر نے فوراً ہی ایک ملازم کو دوڑایا کہ وہ سپاہیوں کو بلالائے اور اس نے ایسوی لینس کے لئے اسپتال فون کیا..... سنیل داس اور شاستری مل کر کتابوں کے انبار کھولنے لگے شاید انہیں کوئی کام کی ڈھل جائے..... پولیس والے فرش سے کرسیاں اور شیشے کے ٹکڑے معائنے کے لئے چن رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں ایسوی لینس آگئی تو لاش پوسٹ مارٹم کے لئے روانہ کر دی گئی۔ اس سے تھوڑی دیر ہاں افسران بالا پہنچے تو انہوں نے جگن ناتھ کی لاش کا معائنہ کیا تھا..... وہ خود کو کوئی رائے قائم کرتے لیکن

آجائے..... اب ہم دونوں ہی رہ گئے ہیں سادھی کی کھادی میں شریک تھے اور ہم یہاں موجود ہیں۔
مجسمہ کو ہم دونوں تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش آنے سے رہی..... وہ جب اور جس وقت چاہے پہنچ
سکتا ہے۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا۔“

شاستری نے غلط نہیں کہا تھا..... چند لمحات بھی نہیں گزرے تھے کہ کھڑکی کے پردے میں
سربراہ جیسے تیز ہوائیں چلنے سے ہوتی ہیں..... وہ جس طرح سے آہستہ سے اٹھاتا اس طرح
آہستہ سے گھر میں گیا تھا۔ سنیل داس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”کیا ایسی کوئی بات ہے جس سے تم سرا سیمہ ہو رہے ہو.....؟“ شاستری نے کہا۔
”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔“ سنیل داس نے نفی میں سر ہلا کر جواب دیا۔ ”تمہاری بات
کے بارے میں سوچ رہا تھا۔“

دوسرے لمحے پردہ پھر سررایا..... اور پھر اس کا رخ قدرے شاستری کی طرف تھا۔ اس نے
بٹیوں میں لپٹا ہوا ایک ہاتھ دیکھا۔ سنیل داس نے شاستری کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ اس نے
شاستری کا چہرہ متغیر دیکھ کر خطرے کی بو محسوس کر لی۔ اس نے فوراً کرسی کھسکا کر میز کے قریب کر لی۔
وہ مستعد، چونکا اور بے خوف سا تھا۔

اچانک کھڑکی کی چوکت پر مجسمہ کا وجود ابھرا۔ وہ کسی ایسے شخص کی طرح زور زور سے سانس
لے رہا تھا۔ جیسے بہت دور سے دوڑتا ہوا آ رہا ہو۔ جس سے سینے میں سانس پھول جاتی ہے..... اس
کی حرکت سے ظاہر ہو رہا تھا اسے اندر داخل ہونے میں بڑی دقت ہو رہی ہو، شاستری نے فوراً ہی
لپک کر جلدی سے دروازے کا پینڈل گھمایا اور اسے کھول کر دہلیز سے باہر ہو کر ہڈیانی لہجے میں چلایا۔
”انسپکٹر..... انسپکٹر..... کمرے میں مجسمہ کھڑکی سے گھس رہا ہے۔“

باہر نیچے انسپکٹر جگ دیپ کے دوڑنے کی آواز آئی..... پھر وہ چند لمحوں میں دو سپاہیوں کے
ساتھ موجود تھا۔ اس کے آدمیوں نے جال اٹھا رکھا تھا..... اس نے جو مجسمے کو دیکھا تو یقین نہیں آیا۔
وہ اب تک ان لوگوں کی باتوں کو ایک مفروضہ سمجھ رہا تھا۔ لیکن اسے اب اس اسرار کا یقین کرنا پڑا تھا۔
اس کے آدمی بھی بے حد خوف زدہ تھے اور وہ مجسمے کو اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی عفریت ہو
اور کسی بھی لمحے انہیں موت کی بھیٹ چڑھا سکتا ہے۔

”کھڑے تمنا کیا دیکھ رہے ہو..... اس پر جال پھینک دو۔“ انسپکٹر غصے سے چیخ کر بولا۔
”جلدی کرو..... ایسا نہ ہو کہ وہ نکل جائے۔“

اس وقت مجسمہ کمرے کے وسط میں تھا۔ انہوں نے جال فضا میں اچھال کر مجسمہ پر پھینکا۔
جس میں مجسمہ کا شانہ اور سر پھنسن گئے۔ انسپکٹر فوراً ہی آگے بڑھ کر اس کا پھندا تنگ کرنے لگا۔ مجسمہ

انہیں سا جن اور سنیل داس کی باتوں کا یقین کرنا پڑا۔ یہ واقعہ اور جگن ناتھ کی موت پر اسرار حالت میں
رو نما ہوئی تھی۔ ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ ان کی بات کو تسلیم کرنے پر مجبور تھے۔ جھٹلانے کے لئے ذرا
ان کے پاس کوئی دلیل تھی اور نہ ہی جواز۔

”کھڑکی کو اسی طرح کھلا رہنے دیں۔“ اس نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ ”نہ کوئی اس کے پاس
جائے اور نہ ہاتھ لگائے۔“

انسپکٹر نے کمرے میں پہرے پر دو سپاہیوں کو مامور کر دیا اور باقی سپاہیوں کو ساتھ لے کر وہاں
سے نکل گیا۔

سنیل داس کو جس بات کی تلاش تھی وہ کسی کتاب سے انہیں نمل سکی۔ وہ عام کتابوں کی طرح
تھی لیکن شاستری کو وہی کچھ ملا جس کی وہ توقع کر رہا تھا اور اس کے نزدیک بے حد اہم بھی تھا۔ سنیل
داس نے چوں کہ کسی اور خیال اور نظریے سے جو تلاش کیا اس لئے وہ کچھ بھی پانہ نہ سکا تھا۔ اس لئے
اسے بڑی مایوسی ہوئی تھی..... لیکن ان دونوں کو ان کے شبے کی کسی حد تک تو تقویت ہوئی تھی۔ یہ امر
بھی ان کے لئے بڑا اہم تھا۔ وہ نظر انداز کرنا نہیں چاہتے تھے۔

میرے خیال میں کتابوں میں جو پرا تھنائیں بھری ہوئی ہیں ان سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے
تا.....؟“ شاستری نے کہا۔

”وہ کیا.....؟“ سنیل داس نے تجسس بھری نظروں سے دیکھا۔
”صرف انہی لوگوں کی ہلاکت کا خوف و خدشہ ہے جو براہ راست سادھی کھودنے میں ملوث
ہیں۔“ شاستری نے جواب دیا۔

شاستری نے جو خیال ظاہر کیا اس سے سنیل داس نے اتفاق کیا..... دونوں اس بات پر اہم
خیال کہیں نہ کہیں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو کتابوں میں کسی اور انداز سے درج ہے۔ اس لئے ان
دونوں کو بہت ہوشیار اور محتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔ کیوں کہ یہ مجسمہ اب خونی بن گیا ہے۔
بھگوان جانے پر کاش مہرہ کا کیا انجام ہوا..... اگر وہ مر گیا ہے تو اس خونی مجسمہ کا یہ پہلا قتل ہوا
دوسرا قتل پروفیسر..... جانے وہ کس کس قتل کرنا پھرے۔

”مجھے اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ یہ مجسمہ دوبارہ جنم لے گا اور دنیا میں آئے گا..... وہ جنم لے
ہی ایک آدمی کے روپ میں آ گیا اور اسے ٹھکٹی مل جائے گی۔ ناقابل یقین حد تک کی..... وہ آدمی
روپ بھر کر ایک قاتل بن گیا۔ اس پر جیسے قتل کا اندھا جنون سوار ہو گیا ہے..... کیوں اور کس
لئے.....؟“ شاستری کہنے لگا۔ ”نہ جانے وہ کتنے لوگوں کی موت کا باعث بنے گا..... یہ بات
شخص کیسے جان سکتا ہے جو خطرے کی زد میں ہے..... کب اس کی شامت یا تمہاری شامت

اس میں پھنستا چلا گیا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی بڑی کوشش اور جدوجہد کی..... انسپکٹر کے آدمیوں نے انسپکٹر کے ساتھ مل کر جال کو جھکا دیا۔ وہ فرش پر گر کر ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔

سنیل داس اس کے قریب گیا۔ مجسمہ کو بے بس دیکھ کر دفعتاً اس کے منہ سے ایک کراہ نکل گئی۔
”بس کرو.....“ دفعتاً سنیل داس چیخ پڑا۔ ”اب اسے اذیت نہ دو۔“

انسپکٹر نے سنیل داس کی اس حرکت کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ اسے یقین نہ آیا۔ شاستری نے قریب جا کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا وہ اسے ہٹانا چاہتا تھا..... لیکن سنیل داس گھٹنوں کے بل دو زانو ہو گیا تھا مجسمہ کے پاس۔

”او مہاراجا.....“ سنیل داس نے رندھے ہوئے لہجے میں مخاطب کیا۔ ”آپ ہیں یہ.....؟“

مجسمہ نے جیسے ہی سنیل داس کی آواز سنی اس نے ایک دم سے ہاتھ پاؤں چلانا چھوڑ دیا..... پھر اچانک وہ ساکت و جامد ہو گیا۔ اس کی تیز تیز سانسیں بھی رک گئیں..... اب وہ زندہ مجسمہ نہیں رہا تھا..... اب یہ وہی مجسمہ تھا جسے پٹیوں میں لپیٹ کر تابوت میں رکھا گیا تھا۔ اب ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زندگی سے محروم ہو چکا ہو۔

اے سری لنکا کے بادشاہ اور عالی مرتبت مہاراجا..... مہاراجوں کے عظیم بیٹے..... اپنے حقیر ترین غلاموں کے حقیر ترین..... غلام کی طرف دیکھ..... جو حالات کے بندھن میں جکڑا تیرے چروں میں سر جھکائے بیٹھا ہے۔“

”سنیل داس.....!“ شاستری نے اس کا بازو پکڑا تا کہ اسے سہارا دے کر اٹھانا چاہا۔
لیکن جیسے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا..... کسی بے نام..... نادیدہ اور طاقت ور شے تھی..... ایسی کوئی عظیم قوت جو انصاف میں توازن کی داعی ہو۔ اس کے سارے جسم میں ایک سن سناہٹ سی دوڑ گئی۔ اس میں بازو چھڑانے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

”میں تجھ سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ میرے اجداد کا تصور تیرے ذہن سے نکل جائے..... شاکر کرو.....“ وہ گڑگڑا کر کہہ رہا تھا۔ اس آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ”تیرے دل میں صرف میری حقیر ذات کا خیال رہ جائے..... میں نے ناقابل معافی پاپ کیا ہے..... خود کو پاپوں میں شامل کر کے تیری سادھی اور مجسمے کی بے حرمتی کی ہے..... تجھ سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ میرے جسم کو نہایت بے دردی اور سفاکی..... اور بے رحمی سے ملیا میٹ کر دے..... روند دے..... تاکہ میری آتما تک میرے گناہوں کا خمیازہ بھگتی رہے..... مجھے مر کر بھی کسی سے چین نہ ملے۔“

مجسمہ میں زندگی کے آثار پیدا ہونے لگے..... اس کی سانس پھر سے چلنے لگی۔ وہ آہستہ

آہستہ سانس لے رہا تھا..... شاید نادیدہ قوت اس میں آتما پھونک دی تھی..... اس میں توازن اور تیزی آتی گئی۔ اس میں جیسے توانائی میں جنم لینے لگی۔

پولیس والوں نے جو بڑی مضبوطی سے جال کو تھام رکھا تھا اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی۔ اس سے پہلے اسے سنبھالتے اور اسے قابو میں رکھتے مجسمہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ جال سے باہر نکال کر پھیلا دیے۔ جال اس کے سینے پر کڑکڑایا اور اس کے ہاتھوں نے اسے کچے دھاگے کی طرح توڑ کر پھینک دیا۔ اب جال فرش پر بکھرا پڑا تھا۔

ایک سپاہی دہشت زدہ ہو کر بدحواسی سے بھاگ نکلا۔
پھر مجسمہ سنیل داس کی طرف بڑھا۔ اس کے تیور بتا رہے تھے کہ وہ سنیل داس کو غضب کا نشانہ بنانے والا ہے۔

سنیل داس کا سر فرش پر ٹکا ہوا تھا۔ مجسمہ نے اپنا ایک پاؤں آہستہ سے اٹھایا اور اس کے پاس لے گیا جیسے فاصلہ ناپ رہا ہو..... اس کا دوسرا پیر بھی اسی طرح سے اٹھا اور نیچے گرا۔

سنیل داس کے منہ سے ایک ایسی عجیب سی آواز نکلی جس میں نہ تو ہمت تھی اور نہ ہی التجا.....
مجسمہ اپنا دایاں پیر بار بار اس کے سر مارنے لگا جیسے کوڑے سے ضربیں لگا رہا ہو۔ سنیل داس کا سر پھٹ کر خون میں لتھڑ گیا اور اس کا مغز باہر نکل لایا۔

شاستری نے محسوس کر لیا تھا موت اس کے سامنے کھڑی ہے اور وہ بچ نہیں سکے گا..... وہ جانتا تھا کہ یہ خونی مجسمہ پراسرار طاقت کا مالک ہے..... اس سے کوئی بچا نہیں سکتا..... مقابلہ نہیں کر سکتا..... اس پر نہ تو ریوالتور..... پستول اور شارٹ گن گولیوں کی بو چھار بھی اس پر کوئی اثر کر سکتی ہے..... نہ ہی مہلک سے مہلک آتشیں اسلحہ بھی اس پر کارگر ہوگا..... اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے تو مجسمہ اسے بھاگنے نہیں دے گا..... ایسی کوئی تدبیر نہیں تھی کہ اس کے ہاتھوں مرنے سے بچا جائے..... اب اس کا بھی وہی حشر ہوگا جو سنیل داس کا ہوا..... نہ ہی کوئی ایسی طاقت جس کے بل پر وہ بچ سکے..... یہ ایک پراسرار بلا تھی۔ فرار کی اس نے تمام راہیں مسدود کی تھیں تو وہ ڈبئی طور پر موت کے لئے تیار ہو چکا تھا۔

مجسمہ متوجہ ہو کر اس کی طرف بڑھا۔ انسپکٹر اور اس کے مسلح ساتھی بڑی بہادری اور بے خونی سے ان دونوں کی راہ میں حائل ہو گئے۔ جال ان کے ہاتھ سے کب کا چھوٹ چکا تھا۔ پھر انہوں نے اپنی بندوقوں کی نالیں اس کی طرف کی ہوئی تھیں..... انسپکٹر بھی ہولسٹر سے ریوالتور نکال چکا تھا..... اس سے پہلے کہ وہ تینوں مجسمہ پر فائر کھولتے مجسمہ نے ایک لمحے میں سب کو قہر آلود گناہوں سے گھو کر دیکھا۔ پھر وہ اس قدر سرعت سے کھڑکی کی طرف لپکا کہ وہ دیکھتے رہ گئے اور انہیں اس پر فائر کرنے

کی مہلت بھی نہ مل سکی..... چشم زدن میں جو کچھ دیکھا اس نے انپکٹر کو بھونچکا کر دیا۔ مجسمہ کھڑکی سے کود گیا تھا۔

انپکٹر نے فوری طور پر اپنے آدمیوں کو ہدایات دیں۔ پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔

جلدی سے سب انپکٹر کپور کمار کو بلا لو اور اس کا پیچھا کرو..... لیکن ایک بات کا خیال رکھنا کہ فاصلہ اس کے درمیان ضرور قائم رہے..... جب اس کے قریب ہو جاؤ..... وہ تم پر حملہ آور تو کوشش کر کے اس پر چادر یا کمبل ڈال دینا..... پھر جال ڈال کر اس کا جسم رسی سے باندھ دینا..... وہ اس طرح قابو میں آ جائے گا۔“

شاستری نے اس کی اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا..... کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اب مجسمہ کو دنیا کی کوئی طاقت نہ تو قیدی بنا سکتی تھی اور نہ ہی نجات دلا سکتا تھا..... یہ خون کا پیا سا ہو چکا تھا۔ سامی کھودنے والوں کو موت کی بھینٹ چڑھائے بغیر چین سے نہیں بیٹھے گا..... وہ سوچ رہا تھا.....

”کاش! پروفیسر زندہ ہوتا.....! وہ اس خونی مجسمہ سے نجات دلا دیتا۔“

چند لمحوں کے بعد انپکٹر نے سیٹل داس کی لاش پر ایک نظر ڈالی۔ پھر اس نے شاستری کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا آپ کو اندازہ ہے کہ خونی مجسمہ نے اب کس طرف کا رخ کیا ہو گیا.....؟“

”اس کا شکار وہی لوگ بن رہے ہیں جن کی ذات سے اسے اذیت اور تکلیف پہنچی۔“

شاستری نے جواب دیا۔ ”اسے صرف انہی لوگوں کی تلاش ہے، وہ ایک ایک کو چن چن کر جب تک نہیں مار لے گا۔ اس وقت تک چین نہیں لے گا۔“

”اس کا مطلب تو صاف، واضح اور ظاہر یہ ہوا کہ اب آپ اور مس پونم ہی رہ جاتے ہیں۔“

انپکٹر نے کہا۔ ”ورنہ پونم کی نہ صرف زندگی بلکہ عزت پر آج آ سکتی ہے۔ میں اس وقت سب انپکٹر کے ساتھ جا رہا ہوں۔“ شاستری نے دروازے کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔

”آپ اکیلے مت جائیں۔“ انپکٹر نے کہا۔ ”میں بھی ساتھ ساتھ چلوں گا۔“ انپکٹر اس کے پیچھے لپکا۔

☆.....☆.....☆

وہ تہہ خانہ..... پونم کو مکان کے مقابلے میں بہت بڑا لگ رہا تھا..... وہ نیم تاریکی میں

آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بڑی متوجش تھی۔ اس کی حیرت کی وجہ صرف اور محض جگہ کی کشادگی نہیں تھی..... بلکہ اسے جس طرح سے بھرا گیا تھا وہ اس کی حیرانی کا باعث تھا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ کسی خالی جگہ کو اس طرح سے بھی بھرا جاسکتا ہے کہ وہ کباڑ خانہ معلوم ہو۔

سیڑھیوں کے قریب اور زینے کے درمیان جو جگہ تھی وہاں بھٹریا..... اوہ بھگوان.....! بھٹریا پر نگاہ پڑتے ہی اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا اور اس کا جسم کانپ گیا۔ لمحے کے لئے دل دھڑکنا بھول گیا..... رامون..... جس سے سری لکا کے لوگ عاجز تھے یہ اس کا مجسمہ تھا۔ اسے خونی بھٹریا کہا جاتا تھا..... اس کی آنکھیں اندھیرے میں یوں چمک رہی تھیں جیسے وہ زندہ ہو..... اس کی خوف ناک اور بڑی بڑی آنکھوں میں فیطیت بھری ہوئی تھی۔ ہوس کی چنگاریاں تھیں..... اس کے متعلق جو قصہ کہانیاں برسوں سے زو عام تھیں اسے سن کر روکنے کھڑے ہو جاتے تھے..... یہ مہاراجا تھا..... اس کی رعایا میں جو بھی لڑکی سیانی ہوتی تھی اس کی عزت و آبرو محفوظ نہ ہوتی تھی۔ اس کے پاس ان لڑکیوں کی فہرست ہوتی تھی جو پیدا ہوئی تھیں..... ان کی عمریں..... اور وہ جو جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والی ہوتی تھیں..... اس نے منادی کرائی ہوئی تھی جیسے ہی لڑکی نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا اس کی خدمت میں پیش کیا جائے..... وہ شب ب سری کے بعد کسی چڑیل کی طرح اس کا خون پی جاتا..... اس کی جان کسی نہ کسی طرح بچالی جاتی تھی لیکن وہ ایک ماہ تک ہسٹریائی کیفیت میں مبتلا رہتی..... پھر اس کی موت تک لوگ بڑے پریشان، خوف زدہ اور ہراساں تھے۔ اس کی موت کی دعائیں مانگتے تھے..... آخر اس کی موت بارہ برس کی ایک نوجوان لڑکی کے ہاتھوں ہوئی۔ اس نے مہاراجا کے کمرے میں پہنچ کر اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکالا اور اس کے پیٹ اور سینے میں دل کی جگہ اتار دیا..... اس لڑکی کو قتل کرنے کے بجائے مہارانی بنا دیا گیا۔ کیوں کہ مہاراجا سے سپاہی بھی پریشان تھے۔ ان کی جوان ہونے والی لڑکیوں کو بھی بستر کی زینت بنانا تھا۔ انکار کی صورت میں لڑکی کے ماں باپ کو قتل کر کے ان کا گوشت کتوں کو کھلا دیا جاتا تھا۔ اس کی موت سے پھر جانے سکھ کا سانس لیا تھا۔

اس کے طویل القامت مجسمے کے قدموں میں ایک انتہائی بد صورت کسی آدمی کا مجسمہ تھا جسے دیکھتے ہی جسم پر جھرمجری سی آ جاتی تھی..... پونم نے سوچا..... شاید یہ بھی خون آشامی ہوگا۔ اس کی صورت سے ظاہر ہوتا تھا۔

چاروں دیواروں پر بڑے بڑے فیلف تھے جن پر بڑی بڑی بیش بہا اور نادر اشیاء رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ان میں سے بہت ساری اشیاء کو نہ صرف پہچانتی تھی بلکہ ان کے بارے میں ان کی بڑی وسیع معلومات بھی تھیں۔ البتہ اس نے ساری چیزوں کو یک جا پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ ایک طرح سے

اس کمرے میں کسی میوزیم کا دھوکا ہوتا تھا۔

”تم نے بتایا نہیں کہ ان ساری چیزوں کو..... نوادرات کو ایک جادکھ کر کیا محسوس کر رہا ہو.....؟“ وودکھنے نے پوچھا۔

”مجھے..... مجھے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا ہے..... بس ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ میں کوئی سندرسا سپنا دیکھ رہی ہوں۔“ پونم نے جواب دیا۔ ساری کی ساری چیزیں اس سلیقے اور قریب سے ترتیب سے رکھی ہوئی ہیں کہ اس نے ان کی خوب صورتی میں اضافہ کر دیا ہے۔ اس اعلیٰ اور نفیس ذوق کی تعداد نہ دینا بد ذوقی ہوگی۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں کسی میوزیم میں کھڑی ہوں۔“

چلتے چلتے فرش پر نگاہ پڑی تو وہ ٹھک کر رکی۔ ایک سکے پڑا ہوا چمک رہا تھا۔ اس کی آب و تاب نظروں کو خیرہ کر رہی تھی۔ اس نے جھک کر اٹھا لیا..... اس پر کسی دیوی کا چہرہ تھا۔ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی ہوئی بولی۔

”یہ مصر کے کسی فرعون کے عہد کا ہے..... فرعون کی کوشش ہوتی کہ ان کے دور کے سکے بہت شان دار اور جاذب نظر ہوں۔“

”شروع ہی سے اسے میں نے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔“ وودکھنے نے عقب سے کہا۔ ”معلوم نہیں فرش پر کیسے گر گیا اور سکے سامنے والی الماری میں رکھے ہیں۔“

پونم نے وہ سکے شیلیف میں رکھ دیا۔ پھر مڑ کر اس کے رو بہ رو ہوئی تو اس کے سارے جسم میں سن سناہٹ دوڑ گئی..... کیا یہ اس وقت مسرت کما رہی ہے..... پونم نے خوف کی سی حالت میں سوچا۔ جانے کیوں اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی جال میں پھنس گئی ہے۔ کیوں کہ اسے یہاں وحشت سی ہو رہی تھی۔ یہ ساری چیزیں اور در دیوار کاٹ کھانے کو دوڑ رہی تھیں۔

”کیا ہونے والا ہے.....؟“ پونم سے رہا نہیں گیا۔ وہ دہشت زدہ سی ہو کر بولی۔ ”میری پھلی حس کہہ رہی ہے کہ کچھ ہونے والا ہے..... تم اور میں..... آخر یہ سب کیا ہے.....؟ یہ کیسا اسرار دار انجانا خوف ہے؟“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ جان تمنا.....! اب میں مرنے والا ہوں۔“ وودکھنے کا لہجہ بے حد سرد اور ساٹ تھا۔ ”میری موت میرے سامنے کھڑی ہوئی ہنس رہی ہے کہ..... اب تم مرنے سے باز نہیں سکتے۔“

”وود.....!“ پونم نے اس کا نام لیا تو اس کے لہجے کی طرز زندگی چھپی نہ رہ سکی۔

یہ ایک انسان کا کام تھا..... اس کے عہد اس کی دنیا کا باسی تھا اور اس سے چھین لیا گیا تھا اس نے کتنا ٹوٹ کر چاہا تھا..... لیکن اب وہ وودکھنے نہیں رہا تھا..... مسرت کما رہا تھا..... حال کا نہیں

ماضی کا آدمی تھا۔

”جب تمہارے ہاتھی نے میرے بھائی کی ساڈھی دریافت کی تو اس نے میرے مرنے کے ذرائع مہیا کر دیئے..... لیکن یہ ذرائع اس وقت بے جان..... بے وقعت اور بے اثر تھے..... یہ تم پر چھوڑ دیا گیا تھا..... صرف تم پر میری جان پونم.....! ان ذریعے کو کیا زبان دوں..... تاکہ یہ اب تک کے لئے جان دار ہو جائیں۔“

”مجھ پر.....؟“ وہ بھونچکی سی ہو گئی..... اس پر لمحے کے لئے سکستہ سا طاری ہو گیا..... اسے اپنی سماعت پر نفور سا محسوس ہوا۔ وہ اسے پھٹی پھٹی نظروں سے گھورنے لگی۔ اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔

وودکھنے نے جیب سے نقش نکالا تو پونم نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ یہ سوال کرتی کہ تمہارے پاس کہاں سے آیا۔ وودکھنے نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔

”جب تک میرا بھائی میرا دشمن اور میری موت کا خواہش مند ہے اور اس کا ہاتھ موجود ہے..... مجھے اسے استعمال کرتے رہنا چاہئے..... اس کے بعد میں اور تم ایک ہو جائیں گے جیسا کہ میں چاہتا تھا.....“

تم اور میں..... پونم میری جان ہم یک جان دو کا لب ہو جائیں گے..... تم نے کہا تھا میرے ساتھ چلو گی..... نہیں کیا تھا.....؟“ وودکھنے نے اس کا چہرہ نظروں کی گرفت میں لے کر بولا۔

”اب.....؟“

”وہ پونم کا خوب صورت..... سڈول اور مرمریں ہاتھ تھام کر اسے تہہ خانہ کے وسط میں لے گیا جہاں ان پر شیلیف پر رکھے سروں کی نظریں پڑ رہی تھیں..... پونم کو اس جگہ پر کھلونوں کی دکان کا گمان ہو رہا تھا۔

اتنے میں وودکھنے گھٹنوں کے بل تعظیم کے انداز میں جھک گیا..... اور اس نے پونم سے بھی ایسا ہی کرنے کے لئے کہا۔ پونم نے نہیں چاہتے ہوئے بھی اس کی ہدایت پر عمل کیا..... اس نے محسوس کیا تھا کہ کوئی نادیدہ قوت اس کی بات ماننے پر مجبور کر رہی ہے۔ اس لئے اسے عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ اس نے اتنا تو جان لیا تھا کہ کوئی سحر ہے جس نے اسے جکڑ لیا ہے۔

”میں جو کہتا جاؤں گا اسے دہراتی جاؤ گی.....“ وودکھنے بولا۔ ”تم تیار ہونا.....؟“

”ہاں..... میں تیار ہوں.....“ پونم کو اپنی آواز بہت دور سے آتی سنائی دی۔

”جاگ..... اے خاموش شے..... جو.....“ نند کی طرح سو رہی ہے.....“ وودکھنے نے سحر زدہ

لیکن پونم نے اپنے ہونٹ سختی سے بھیج لئے۔ اس نے جملہ دہرایا نہیں۔

ظاہر ہو جاؤ.....“ پونم نے دیکھا کہ تہہ خانہ کی دیوار ایک جگہ سے پھٹ گئی اور شکاف میں مجسمہ کا ہولا کھڑا تھا..... پھر اس نے قدم شکاف سے باہر رکھا تو پونم دہشت زدہ سی ہو گئی۔ اس کے حلق سے کھٹی کھٹی چیخ نکل گئی۔

”اوہ..... دلشان کمار..... سب کے باپ..... اپنے اس تیر غلام کو وہ چیز دان کرو جو انڈے میں بند پرندے کو دیتا ہے..... اسے زندگی اور موت کی لازوال طاقتیں دو.....“

وَنُو دَکھنا اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے مجسمہ کو مخاطب کیا۔
خوش آمدید..... میرے پیارے بھائی.....! اب وقت ہے اور غیر معمولی طاقت تیرے

قدموں میں ہے..... تیری مٹھی میں ہے کہ دنیا کو تخیر کرے اور دنیاوی کام پورا کرے..... ابد تک سکون سے آرام کر سکے..... میں تجھ سے دیا کا..... کر پا کا طالب ہوں..... اور مجھ سے پہلے.....“

پھر اس نے پونم کی طرف دیکھے بغیر کہنے لگا۔
 ”میں نہایت عاجزی سے تھے اس چیز کا نذرانہ پیش کرتا ہوں جس کا تو ہمیشہ طلب گار

رہا۔۔۔ دیکھ ذرا غور اور توجہ سے دیکھ۔۔۔ تو ہمیشہ حسن پرست رہا۔۔۔ پر شباب گداز بدن تیری کم زوری رعی۔۔۔ اس کا سراپا دیکھ۔۔۔ جسمانی نشیب و فراز کی قیامتیں۔۔۔ اس میں کیسی کیسی بجلیاں بھری ہیں۔۔۔ جسم کیسے کیسے فتنے جگا رہا ہے۔۔۔ انگ انگ سے مستی اٹلی پڑ رہی ہے۔۔۔ جس طرح اس کے باپ نے سادھی کو تباہ کیا۔۔۔ اس لڑکی نے بے حرمتی کی۔۔۔ تو بھی اس کی بے حرمتی کر دے۔۔۔ یہ دنیا کی سب سے حسین اور کوئل شے ہے۔۔۔“

”تو نے اسے نقشِ ثانی کیوں دیا..... اسے تو اب ہاتھ لگا سکتا ہے اور نہ میں..... ہم دونوں کو

”لیکن جب تک میرے پاس نقشِ ثانی رہا مجھے کچھ نہیں ہوا..... میرا بال تک برکا نہیں ہوا.....“

تھوڑی دیر پہلے تو میں نے اسے اس لڑکی کے گلے میں پہنایا ہے..... اس لئے کہ یہ ہماری ہر طرح سے تعلق ہو جائے گی..... یہ کیسے نقصان پہنچا سکتا ہے.....“

”ابھی ابھی میں نے اپنے باپ کی آتما کو دیکھا ہے..... جانتے ہو اس کی آتما کس لئے آئی ہے..... وہ اس لڑکی کی مدد کرنے..... وہ اس بات کا سخت مخالف ہے کہ عورت کی عزت و آبرو خاک میں نہ ملائی جائے..... اس کی آتما نے مجھ سے وچن لیا تھا کہ میں جس سنسار میں جاؤں بھلے وہاں کی عورت سے پریم کروں..... اس کے جسم سے کھلیوں..... لیکن اس کی عزت و آبرو کو براد نہ کروں..... میں نے اس لڑکی سے خوب جی بہلایا..... لیکن حد سے تجاوز نہیں کیا..... پتا جی کی آتما نے اس نقش میں ایسا سحر پھونک دیا ہے کہ جو بھی اس عورت کو برے ارادے سے ہاتھ لگائے گا جس کے گلے میں نقش پانی ہے اس کے جسم سے ایک آگ سی نکل کر اسے جھلسا دے گی..... اگر تمہیں میری بات کا یقین نہیں ہے تو اسے ہاتھ لگا کر دیکھو.....؟“

و نو دکنہ کو اس کی بات کا یقین نہیں آیا۔ ”تم جھوٹ بول رہے ہو..... اس لئے کہ اسے اپنی ملکیت بتا لو۔“

اس نے پونم کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ اسے بے لباس کر کے..... اپنی آغوش میں لے کر اس کی عزت کو بھائی کے سامنے ہی پامال کر دے۔ اس نے جیسے ہی پونم کا بازو پکڑا اسے ایسا لگا جیسے وہ دھکتا ہوا انگارہ ہو..... اس کا ہاتھ بری طرح جھلس گیا۔ وہ اپنے متاثرہ ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر ترچے اور تاجے لگا.....“

”نہنم.....! نقش ثانی کو اس مردود کے جسم سے لگا دو..... یہ جل کر مر جائے گا..... جلدی شاستری دروازے کی دہلیز پر کھڑا جو یہ تماشا دیکھ رہا تھا وہ وہاں سے چیخ کر بولا۔

”کرو۔“

پونم نے فوراً ہی نقشِ ثانی نکال کر نو دھکنے کے جسم سے لگا دیا۔۔۔۔۔ اس کے سارے بدن میں آگ لگ گئی۔ اس کا سارا جسم شعلوں کی نذر ہو رہا تھا۔۔۔۔۔ اسی وقت انسپکٹر اپنے ساتھیوں کے ساتھ پہنچا۔۔۔۔۔ اس نے نو دھکنے کو نذر آتش دیکھا تو اسے یقین نہیں آیا۔۔۔۔۔ اس کی دل خراش جینیں فضا میں گونج رہی تھیں۔۔۔۔۔ تھوڑے دیر بعد وہاں سوختہ لاش بڑی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جو کچھ پیش آیا وہ ہر ایک کے لئے ناقابل یقین اور کسی جادوئی فلم کے منظر کی طرح حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھا۔

مجسمہ نے اپنا منہ کھول کر ان دونوں پر ایک زور سے پھونک ماری۔ اس کے منہ سے دھوئیں کا ایک مرغولا نکلا ان دونوں کے چہروں پر ایک بڑا سا مرغولہ بن کر چھا گیا..... پھر ان دونوں کو کچھ خبر نہیں رہی۔ اس دھوئیں کے مرغولے میں انہیں ایسا لگا وہ تاریکیوں میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ جب وہ ہوش میں آئے تو انہیں یہ بھی یاد نہیں آ سکا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہے..... انہوں نے اپنے آپ کو سادھی پر پایا..... ان سے خاصے فاصلے پر نو دو دھند اور مجسمہ کھڑے ان کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

پونم کو یہ سب کچھ کسی خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ آنا فانا وہ ہندوستان سے یہاں سادھی پر کیسے آ گئے..... لیکن اسے یاد آیا کہ جادو کے زور پر کیا نہیں ہو سکتا..... یہ بھی طلسماتی کرشمہ ہے جس نے ان دونوں کو پلک جھپکتے میں لا ڈالا ہے۔ وہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی تو نو دو دھند نے اسے فوراً ہی جکڑ لیا۔ ”میرے بھائی.....! تم نے کیا فیصلہ کیا..... کیا تم اپنے بھڑکتے جذبات کی پیاس نہیں بجھاؤ گے؟ کیا رسیلا بدن ہے..... کسی کپکپے ہوئے پھل کی طرح..... نس نس میں امرت بھرا ہوا ہے..... تجھے ایسی رسیلی ماری نہیں ملے گی.....؟ اس کی بھرپور نوجوانی اور ابلتا شباب دیکھ..... اگر تجھے میری بات کا یقین نہیں آ رہا ہے تو کیا اسے کسی تلوار کی طرح بے نیام کر دوں.....؟ اس کی دھار اور چمک دیکھنا چاہتا ہے۔“

اس سے پہلے کہ نو دو دھند کا ہاتھ اسے بے لباس کرنے کے لئے بڑھتا پونم نے ایک چیخ ماری اور اس کے بازوؤں کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کی، اس کا بدن کسمایا۔ نو دو دھند کے ہاتھوں کی گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ اس کا حلق توڑ نہ سکی۔ وہ اسے چومنے کے لئے چہرے پر جھکا تو پونم نے اس کے چہرے کو ناخنوں سے لہو لہان کر دیا۔ پھر وہ اسے چوما تو نہیں البتہ اسے مضبوطی سے تھامے فاتحانہ انداز اور تکبر سے دیکھتا رہا۔ پونم کے گداز جسم کا لمس سارے جسم میں سنسنی دوڑاتا رہا۔

مجسمہ نے ایک قدم بڑھ کر ایک ہاتھ اوپر اٹھایا تو اس نے پونم کو مجسمہ کے سامنے کر دیا۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں بھائی اس دنیا سے واپس پر لوک میں جائیں..... دنیا والوں کے لئے محض قصہ کہانیاں ہوں..... اس پاپی قوم کو نیست و نابود کر دے..... یہ اس قابل نہیں کہ ہمارے انجام کو دیکھے..... ہمارے درمیان کوئی انسانی وجود آ کر ہمیں نجس اور پاپی کر دے.....“ نو دو دھند کسی شیر کی مانند گرج رہا تھا۔

پونم نے اس گفتگو کے دوران شاستری کو دیکھا جو نیم غشی کی سی حالت میں فرش پر پڑا ہوا تھا..... اس نے شاستری کو بیدار کرنے کے لئے ایک فلک شکاف چیخ ماری..... نو دو دھند نہیں چاہتا تھا کہ شاستری بیدار ہو کر اس کی مدد کو آئے..... اس نے پونم کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تاکہ وہ پھر چیخ نہ

نو دو دھند نے جو چار ہزار گز کے رقبے پر عالی شان کوٹھی بنائی ہوئی تھی وہ ایک کالونی کے عقب میں دیرانے میں تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں سے گھری ہوئی..... اس پر جویلی کا دھوکا ہوتا تھا..... ایک دم سے ایک کثیف دھواں اٹھا جس نے ان سب کو لپیٹ میں لے لیا..... انہیں کچھ بھائی نہیں دیا..... وہ کھانسنے اور آنکھیں ملنے لگے..... تھوڑی دیر بعد جب دھواں چھٹ گیا تو ان سب کی آنکھیں اس قابل ہوئیں کہ دیکھ سکیں..... انہوں نے دیکھا کہ اس کوٹھی کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ وہاں ایک بہت بڑا خالی پلاٹ پڑا ہے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہاں اس عالی شان کوٹھی کا وجود ہی نہیں تھا۔

انسپکٹر اور اس کے ساتھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ اس نے شاستری سے کہا۔

”کہیں یہ خواب تو نہیں ہے جو میں دیکھ رہا ہوں..... یہ کوٹھی کہاں گئی..... سوختہ لاش اور مجسمہ.....“

”شاید اب بھی آپ میری کسی بات کا یقین نہیں کریں گے۔“ شاستری نے کہا۔ ”یہ عمل جادوئی تھا..... اسے جادو کے زور سے بنایا گیا تھا..... اس کا جادو ختم ہوا تو عمل بھی ختم ہو گیا..... کہا اب بھی جادو کے اسرار اور علوم کے قائل نہیں ہوئے؟“

”ہو تو گیا ہوں.....“ انسپکٹر نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ”کیا وہ مجسمہ بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہے.....؟“

”جی نہیں.....“ شاستری بولا۔ ”اس کا وجود ابھی ہے..... وہ غائب ہو گیا ہے..... معلوم نہیں وہ اب کیا کرنے والا ہے۔ اس کے عزائم کیا ہیں.....؟ بہر حال ہمیں اس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا.....“

”یہ کام اب یہاں نہیں سادھی پر ہوگا.....“ مجسمہ نے جواب دیا۔ ”اسے ہم سادھی پر لے چلے ہیں.....“

شاستری اس طرف آنکلا تھا۔ اس نے مجسمہ کی بات سن لی تھی۔ اس نے پونم کے پاس آ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر وہ چیخ کر بولا۔

”پونم.....! بھاگ چلو..... نیچے انسپکٹر اور اس کے آدی مسلح ہیں۔ وہ ہمیں پچالیں گے.....“

”پچالیں گے.....؟“ نو دو دھند ہتھ مار کر بڑے زور سے ہنسا۔ اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔ ”مجسمہ سے غائب ہو کر بولا۔ ”اچھا ہوا یہ آ گیا..... اسے بھی لے چلو..... سادھی پر اس سے بھی انتقام لیں گے۔“

سکے..... پونم نے اس کے بازوؤں کے حلقے میں کسمساری تھی..... چل رہی تھی..... اس کی ہر کوشش بے سود اور ناکام ہو رہی تھی۔ لیکن اس نے اپنی جدوجہد ترک نہیں کی.....
مجسمہ نے اسے اس طرح سے گود میں لے لیا جیسے وہ نوزائیدہ بچی ہو..... ابھی ابھی پیدا ہوئی ہو..... پھر وہ اسے اٹھائے ہوئے مخالف سمت غار نما گوشے میں داخل ہو گیا۔
پونم نے اپنے عقب میں شاستری کی آواز سنی۔ وہ پوچھ رہا تھا۔ ”کینے بتا..... پونم کہاں ہے.....؟“

پونم مزید کچھ نہ سن سکی..... کیوں کہ اس کے دائیں بائیں اور سامنے ایسا گھپ اندھیر تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہ دے..... وہ کسی عفریت کی طرح گھور رہا تھا..... یہ مجسمہ یوں تو اس کے لئے کسی عفریت سے کم نہ تھا..... لیکن وہ جو اس کے ساتھ ایک محبوب کی طرح پیش آیا تھا..... جی بھر کے من مانیاں کی تھیں بلکہ اس نے بھی تو خود سپردگی سے اپنے آپ کو مجسمہ کے حوالے کر دیا تھا۔ مجسمہ کیف و سرور کے ایک ایسے جہاں میں لے گیا تھا جس سے وہ نا آشنا تھی..... وہ بہکتا رہا تھا..... لیکن اس نے حد سے تجاوز پیش کیا تھا۔ پونم کی عزت پر آنچ نہیں آئی تھی۔ اگر وہ فاصلہ مٹا دیتا تو پونم مزاحمت بھی نہ کرتی۔

بہت ساری باتیں جتنی عجیب و غریب تھیں اتنی ہی ناقابل فہم بھی..... اس کے کسی ساتھی نے سوچا نہیں تھا..... اور وہم و گمان میں یہ بات آ سکتی تھی دو ہزار برسوں کے مجسمے میں جان بھی پر سکئی ہے..... نکارام کی آتما اس میں سا کر مجسمہ کو حیات نو بخشے گی..... اب وہ مجسمہ کے رحم و کرم پر تھی اور اسے کوئی بچا نہیں سکتا تھا..... پراسرار اور نادیہ تو توں کا سائنس اور جدید ترین اسلحہ..... جو اس مجسمے کے مقابلے میں ناکارہ تھا۔

پونم کو اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ مجسمہ اسے کہاں اور کیوں اٹھا کر لے جا رہا ہے؟..... اس کی زندگی ختم کر دینا تھا تو وہ ابھی اور اسی وقت بھی کر سکتا تھا..... اس کی آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئی تھیں..... کیا وہ اسے کسی ایسے گوشے میں لے جا رہا ہے جہاں وہ اس سے کسی کھلونے کی طرح کھیل سکے.....؟ اس کی عزت تار تار کر دے..... اگر ایسا اس نے کیا تو وہ اپنی عزت اس سے بچا سکے گی..... وہ ایک موم کی سی گڑیا ہے..... وہ سات فٹ کا دراز قد اور کسی پتھر کی طرح سخت ہے..... لیکن گوشت پوست کا تو ہے..... اس میں ہر قسم کی حیات موجود ہیں..... وہ ایک بھرپور اور مکمل انسان ہے..... اس کے جذبات بھی ہیں.....

پونم کو اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ قدم بہ قدم زمین کی تہہ کی طرف لے جا رہا ہے..... جیسے جیسے مجسمہ آگے بڑھتا جا رہا تھا ویسے ویسے راستہ تنگ ہوتا جا رہا تھا..... اور پھر پانی بہنے کا ایک

مدھم سا شور سنائی دیا..... شاید دریا یا سمندر ہوگا..... پونم نے سوچا..... وہ سوچ ہی رہی تھی کہ ایک طاقت ور ناراج کی روشنی نے اس گھپ اندھیرے کو منور کر دیا۔ پونم نے دیکھا۔ دودھ کھانے کے پیچھے دوڑتا ہوا آ رہا ہے..... اس کے پیچھے پیچھے شاستری ہے..... ناراج شاستری کے ہاتھ میں تھی۔
پھر پونم نے دیکھا کہ..... دودھ کھانے کو شاستری نے دبوچ لیا۔ دونوں کھٹکھٹا ہو گئے..... مجسمہ نے ان دونوں کو پلٹ کر دیکھا اور پھر ان کی بے پردا کئے بغیر چلتا رہا۔ دودھ کھانے شاستری کی گرفت سے نکل کر اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ دور جا گرا۔ پتھر ملی زمین پر گر کرنے سے اسے چوٹ آئی تو وہ بے ہوش ہو گیا۔

دودھ کھانے لپک کر مجسمہ سے آ ملا۔ وہ دونوں تیز رفتاری سے ایک کشادہ تہہ خانہ میں نکل آئے..... اس کے ایک کونے میں ایک بہت بڑی شان دار اور لمبی چوڑی مسہری تھی۔ اس پر جو بستر تھا وہ نہ صرف صاف ستھرا بلکہ بے حد نرم و گداز تھا۔ مجسمہ نے دودھ کھانے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ زبان سے ایک لفظ نہ نکالا۔

مجسمہ نے پونم کو ریوا لور کے سہارے کھڑا کر دیا۔ پونم کے سینے میں سانسوں کا تلاطم ہچکولے کھا رہا تھا جس سے ایک ہیجان پیدا ہو رہا تھا۔ دودھ کھانے اور مجسمہ تہہ خانے کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ پھر مجسمہ نے پلٹ کر پونم کی طرف دیکھا..... پونم نے اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کی آنکھوں میں درندگی دیکھی تو اسے لگا یہ وہ مجسمہ نہیں ہے جس نے اس سے پریم کا اظہار کیا..... من مانیاں کی تھیں..... اس وقت وہ اسے شیطان معلوم دیتا تھا۔

”وودو.....! پلیز.....! وودو.....!“ وہ مجسمہ سے اس قدر خوف زدہ ہو گئی تھی کہ اس نے رحم طلب نظروں سے وودو کی طرف دیکھا شاید وہ اس کی کوئی مدد کرے..... اس مجسمے سے بچالے..... آخر اس نے بھی تو وودو کو اپنی محبت سے کسی حد تک خوش کیا تھا..... شاید وہ اس کا لحاظ کرے۔ شاستری بے ہوش ہو چکا تھا۔ یہ امید کی آخری کرن تھا۔ ”اسے روکو..... بھگوان کے لئے..... وہ میری جان لینے کے درپے ہو گیا ہے..... تمہیں میری محبت کی سوا گند.....“

”موت سے مت ڈرو میری جان.....!“ وودھ کھانے نے اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ اسے دلاسا دینے لگا۔ ”تم موت کی آغوش میں جانے سے بچ نہیں سکتی ہو..... دنیا میں اس سے پیاری چیز کوئی نہیں ہے۔“

”میری زندگی ختم کرنے سے کیا حاصل ہوگا.....؟“ پونم کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔

”بلاوجہ مجھے موت سے ہم کنار نہ کرو۔“
”مر کر تم مجھے پالو گی..... ہم دونوں ابد تک کے لئے ایک ہو جائیں گے..... پھر ہماری محبت

امر ہو جائے گی.....“ دودھ نہ کہنے لگا۔ موت سے صرف بزدل..... بے وقوف اور ڈرپوک ڈرتے ہیں..... تم جتنی حسین ہو..... اتنی بہادر بھی تو ہو..... پھر یہ ڈر کیا؟“

”نہیں..... نہیں..... میں اس طرح مرنا نہیں چاہتی..... میں زندہ رہنا چاہتی ہوں..... مجھے نہ مارو.....“ وہ التجا کرنے لگی۔

”تمہارا دوسرا جنم کتنا سندر ہوگا۔ تم اس کا تصور تک نہیں کر سکتی ہو.....“ دودھ نہ کہنے لگا۔ ”تم مر کر بہت خوش ہوگی۔ کیوں کہ نہ صرف تمہارے ہاتھی..... بلکہ جگن ناتھ..... اور سنیل داس بھی ہوگا..... وہ تمہارے منتظر ہیں کہ تم کب آؤ گی..... میں تمہیں اس دنیا کے بارے میں بتاؤں..... وہ بڑی انوکھی، انمول اور اتنی خوب صورت اور پیاری سی ہے کہ وہاں صرف اور صرف خوشیاں ہیں..... وہاں دنیا کے پاپ نہیں ہوتے ہیں..... تم شاید موت سے اس لئے دہشت زدہ ہو کہ وہ بہت اذیت ناک اور تکلیف دہ ہوتی ہے..... نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں..... تمہیں مرتے وقت ذرہ برابر بھی تکلیف نہیں ہوگی..... موت اتنی آسانی سے ہوگی تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا..... اس میں ایک عجیب سی لذت، کیف اور راحت محسوس کرو گی..... یہ اس اذیت کے مقابلے میں کچھ بھی نہ ہوگی جو میں نے تین ہزار برس در بدر بھٹکتے گزارا ہے..... طاعون..... قحط..... غربت و افلاس..... وبا..... اور خوف ناک قسم کی جنگیں..... انسان..... انسان کے لہو کا پیاسا..... آدی..... آدی کا دشمن..... خون آشام بھیریا..... اس سے زیادہ کوئی عذاب نہیں ہے..... کیا ہم دانی اور پرسکون زندگی کی کوئی خواہش نہ کریں..... پونم! تم بہت خوش نصیب ہو کہ دنیا کی حسین ترین دوشیزہ ہو.....“

”نہیں..... نہیں.....“ پونم کانپ کر بولی۔ ”مجھے فلسفہ نہیں..... زندگی چاہئے۔“

دودھ نہ نے معنی خیز مسکراہٹ سے مجسمہ کی طرف دیکھا۔ ”بگارا! تم اس شہ کام میں دیر کس لئے کر رہے ہو.....؟ اسے موت کی ٹیٹھی، ابدی اور پرسکون نیند سلا دو.....“

مجسمہ کا ہاتھ پونم کے گلے کی طرف بڑھا..... پونم میں اتنی سکت ہی نہیں رہی تھی کہ وہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتی..... مزاحمت کرتی اور پیچھے ہٹ جاتی..... پھر اس نے گلے پر مجسمہ کی انگلیاں محسوس کیں..... جو برف کی طرح خنک تھیں..... ریشم کی طرح نرم تھیں، لیکن اس کے ہاتھ میں..... انگلیوں میں اس روز والی بات بالکل بھی نہیں تھی..... جب مجسمہ کا ہاتھ اس کے بدن پر رقصاں تھا تو اس پر کیسی مدھوشی سی طاری ہو گئی..... لیکن اب ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی کھن کھجور ہو..... جب مجسمہ کا ہاتھ اس کے سینے کے زانو پر آیا تو وہ نقش ثانی سے چھو گیا..... مجسمہ نے ایک دم سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

”اسے مار کیوں نہیں رہے ہو بگارا!.....“ دودھ نہ ہڈیاں لیچھے میں چیخا۔

لیکن مجسمہ ساکت کھڑا اس کی آنکھوں میں محبت سے جھانکتا رہا۔

”تم کیا بہرے ہو گئے ہو..... میں کیا کہہ رہا ہوں.....“ دودھ نہ کا لہجہ تڑپ رہا تھا۔ پھر اس نے جیب سے ایک خنجر نکالا۔ جس کی خوف ناک دھار چمک رہی تھی..... ”یہ طلسماتی خنجر لو..... اس سے کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہے مرتے وقت.....“ لیکن مجسمہ اس طرح نظر آ رہا تھا جیسے اس میں زندگی ہی نہیں ہے.....“

”بگارا!.....“ دودھ نہ غضب ناک ہو گیا۔ ”کیا تم چاہتے ہو کہ میں اپنے ہاتھوں سے مر جاؤں..... یہ مرجائے گی تو اس کا ایک حسین جنم شروع ہوگا..... تم اس کے ساتھ دائمی سندر زندگی گزارو گے۔ وہاں یہ صرف تمہاری ہوگی۔“

دودھ نہ نے جب دیکھا کہ مجسمہ پھر بھی بے حس و حرکت ہے..... اس نے اپنا خنجر والا ہاتھ فضا میں بلند کیا۔ اس سے پہلے کہ وہ پونم پر وار کرتا مجسمہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا..... پھر چشم زدن میں خنجر دودھ نہ کے سینے میں دل کی جگہ اتر گیا۔ دودھ نہ نے ایک دل خراش چیخ ماری..... جب خنجر نکالا تو خون کا فوراً اہل پڑا۔ پھر اسے گہرے پانی میں دھکیل دیا۔ سطح خون سے سرخ ہو گئی۔ لیکن اس کی لاش نہیں ابھری۔

”ہاتھی!.....“ مجسمہ سرشاری سے بولا۔ ”میں نے دو ہزار برسوں کے بعد دودھ نہ سے انتقام لے لیا..... میری آشا پوری ہو گئی..... میں بہت خوش ہوں۔“

پونم قرقر کانپ رہی تھی۔ وہ تیزی سے ایک طرف سرکنے لگی تو مجسمہ اس کی راہ میں حائل ہو گیا۔

”اب تم اپنا لباس اتار دو..... مسہری پر چلو..... میں دودھ نہ کی موت کا جشن منانا چاہتا ہوں.....“

”لیکن.....“ پونم پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ ”اس روز میں نے تمہیں بہت پیار کیا..... اب مجھے جانے دو۔“

”سنو.....! میں تم سے ہر قیمت پر اپنی آشا پوری کر کے رہوں گا..... اگر تم نے میری بات نہیں.....“

کے لئے اس کی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا..... اس نے قدرے تذبذب اور ہچکچاہٹ سے لباس اتار دیا..... مجسمہ کی ہوسناکی نظریں ناقدانہ انداز سے اس کے بدن کا جائزہ لے رہی تھیں.....

شام ستری اس وقت پہنچا تھا۔ جب اس نے پونم کے سینے کے فراز پر نقش ثانی دیکھا تو حیران ہوا..... پھر وہ چیخ کر بولا۔

”پونم!..... نقش ثانی کے درمیان جو ہیرا ہے اسے دبا دو..... یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکے

مجسمہ نے چاہا کہ نقش ثانی نکال لے..... پونم نے فوراً ہی وہ ہیرا دبا دیا۔ اس میں سے شعاعیں نکلنے لگیں۔ مجسمہ ایک دم سے ہٹا اور گدھے کے سر کے سینک کی طرح غائب ہو گیا۔ پونم نے ہیرے پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔

پونم..... شاستری کو دیکھ کر بھول گئی کہ وہ کس حالت میں ہے۔ وہ دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ دونوں تھوڑی دیر تک جذباتی کیفیت میں رہے..... پھر اس نے پونم کو الگ کر کے کہا۔ ”کپڑے پہن لو.....“

جب وہ کپڑے پہن چکی تو شاستری نے پوچھا۔ ”یہ نقش ثانی کہاں سے ملا تمہیں.....؟“

”وہ دھنڈھنے دیا تھا۔“ وہ بولی۔ ”تھوڑی دیر پہلے.....“

”جب تک یہ ہمارے پاس ہے مجسمہ نقصان نہیں پہنچا سکتا.....“ شاستری نے کہا۔ ”اس کی بڑی حفاظت کرنا ہے..... مجسمہ اسے ہر قیمت پر حاصل کرنے کی کوشش کرے گا..... ویسے اب وہ بڑی تباہی و بربادی پھیلانے گا۔“

”تمہیں اس بات کا علم کیسے ہوا تھا کہ نقش ثانی میں جو جزاؤں ہیرا ہے اسے دبانے سے چنگاریاں نکلتی ہیں۔“ پونم نے پوچھا۔

”پہلے یہاں سے نکلے پھر تمہیں بتاتا ہوں۔“ شاستری نے کہا۔ ”ایسا نہ ہو کہ مجسمہ سادھی میں ہمیں بند کر دے اور ہم گھٹ کر مر جائیں۔“

دونوں فوراً ہی نکل آئے۔ جب سادھی سے خاصی دور آ گئے تب شاستری نے کہا۔

”مجھے آخری وقت میں علم ہوا تھا کہ اس نقش ثانی کی خصوصیت کیا ہے۔ یہ بڑی خوف ناک قسم کی شعاعیں ہیں..... یہ نہ صرف ہر قسم کے بڑے سے بڑے جادو کو بے اثر کر دیتی ہے بلکہ نہ صرف آدمی بلکہ آتما کو بھی جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ وہ دھنڈھنے نے معلوم نہیں کیوں اسے تمہارے گلے میں ڈال دیا تھا۔ چونکہ مجسمہ اس کی خصوصیت سے آگاہ تھا۔ اس لئے اس میں سے شعاعیں نکلنے ہی غائب ہو گیا۔“

سریش کمار نے سانس لینے کے لئے توقف کیا تو چندرادپوی بولی۔

”تم نے ایک طویل ترین داستان سنا دی..... کیا یہ ختم ہوئی کہ نہیں.....؟“

”اصل کہانی تو اب شروع ہوتی ہے۔“ سریش کمار کہنے لگا۔ ”پونم اور شاستری سری لنکا میں موجود ہیں تاکہ وہ خونی مجسمہ سے بدلہ لیں۔ ادھر خونی مجسمہ ان کا بدترین دشمن بنا ہوا ہے۔ چونکہ نقش ثانی پونم کے پاس ہے اس لئے اب تک وہ ان کا بال بیکا نہیں کر سکا اس کی ساری کوشش اور

جدوجہد یہ ہے کہ کسی طرح نقش ثانی حاصل کر کے انہیں موت کی بھیجٹ چڑھا دے..... اور مجسمہ انتقام کے اندھے جنوں میں غریب لوگوں کا دشمن بن گیا ہے..... وہ ہر حسین ترین عورتوں کی عزت کا دشمن بنا ہوا ہے۔ اس نے کئی جوان لڑکوں کا خون بھی کیا ہے..... اس کے سامنے قانون اور بڑے بڑے جادوگر بھی بے بس ہیں۔ اب آپ کا دہاں جلد سے جلد پہنچنا ضروری ہے..... وہ ایک عفریت بنا ہوا ہے۔“

”ٹھیک ہے..... میں آج ہی جاری ہوں۔“ چندرادپوی بولی۔ ”خونی مجسمہ کا خاتمہ کر کے آتی ہوں۔“

☆.....☆.....☆

رات سوتے وقت پونم نقش ثانی گردن سے نکال کر سرہانے والی میز پر رکھ دیتی تھی یا نہانے جاتے وقت..... پونم اور شاستری نے شادی کر لی تھی۔ ایک روز پونم نے نہا کر آنے کے بعد دیکھا تو سرہانے کی میز پر نقش ثانی نہیں تھا۔ کمرے میں شاستری بھی نہیں تھا۔ وہ کچن میں ناشتا تیار کر رہا تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ نقش ثانی میز پر رکھ کر گئی تھی۔ اس نے بچنے کے نیچے فرش پر اور پلنگ کے نیچے بھی جھانک کر دیکھا۔ کہیں بھی نقش ثانی نظر نہ آیا تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

”شاستری..... شاستری.....!“ وہ ہڈیانی لہجے میں چیخنے لگی۔ ”جلدی سے آؤ..... کہاں ہو تم.....؟“

شاستری خوف زدہ ہو کر بھاگا ہوا آیا کہ کہیں خونی مجسمہ تو نہیں آ گیا..... اس نے کمرے میں آ کر دیکھا۔ پونم کی حالت بڑی غیر ہو رہی ہے۔ اس کی سانس سینے میں بے ترتیب ہو رہی ہے اور پسینے میں نہا رہی ہے۔ اس کا چہرہ سفید پڑا ہوا ہے۔

”کیا بات ہے.....؟“ شاستری نے اس کے پاس جا کر پوچھا۔

”نقش..... ثانی..... غائب ہے.....“ وہ گھبرا کر بولی۔ ”کیا تم نے اسے دیکھا.....؟“

”نہیں تو.....“ شاستری نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”تم نے اسے کہاں رکھا تھا.....؟“

”میں نے غسل خانے میں نہانے جاتے سے اسے میز پر رکھا اور نہانے چلی گئی.....“ وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔ ”آ کر دیکھا تو غائب ہے۔“

”یہ نقش ثانی.....!“ ان دونوں نے جواوازی تو تیزی سے گھوم کر دیکھ لیا۔

کمرے میں مجسمہ کھڑا استہزائیہ انداز سے ان سے مخاطب تھا۔ اس کے ہاتھ میں نقش ثانی تھا جس کی زنجیر پکڑ کر اسے ہلارہا تھا اور اس کے چہرے پر غرور و تکبر تھا اور آنکھوں میں شیطیت ناچ رہی تھی۔

”آخر میں نے اسے حاصل کر لیا۔“ وہ قہقہہ مار کر بڑے زور سے ہنسا۔

اس کے ہاتھ میں نقش ثانی دیکھ کر ان کی حالت مردوں سے بھی بدتر ہو رہی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے مجسمہ کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر دہشت چمکی ہوئی تھی۔ وہ قوت گویائی سے جیسے محروم ہو گئے تھے۔

”آخر تم ہمارے جانی دشمن کیوں بن گئے ہو.....؟“ شاستری نے ہمت کر کے سکوت کو توڑا۔

”ہم نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا.....؟“

”اس لئے کہ میں اپنی سادھی میں سکون کی ابدی نیند سو رہا تھا۔ میری آتما بھی شانت تھی..... میری سادھی کھود کر تم لوگوں نے میرا سکون برباد کر دیا..... بہت بڑا پاپ کیا..... میں اس کی سزا دینا چاہتا ہوں۔“

”ہم نے اس عمارت میں اس لئے کھدائی کی تھی کہ اس میں نوادرات ہوں گے لیکن تمہاری سادھی نکل آئی۔“ شاستری نے صفائی پیش کی۔

”تم کچھ بھی کہہ لو..... تمہاری کسی بات کا یقین نہیں.....“ مجسمہ بولا۔ ”میں اس نقش ثانی کی شعاعوں سے تم دونوں کو جلا کر بھسم کر دوں گا..... اب تمہیں دنیا کی کوئی طاقت بھسم ہونے سے بچا نہیں سکتی..... میں اس سے دشمنوں اور پورے ملک کو جلا دوں گا۔“

”لیکن ایک طاقت ایسی ہے جو انہیں اور اس ملک کو جلنے سے بچا سکتی ہے۔“

ایک نسوانی آواز کہہ رہی تھی تو ان تینوں نے تیزی سے پلٹ کر آواز کی سمت دیکھا۔

دلہیز پر چندرا دیوی کھڑی ہوئی۔ اسے دیکھ کر ان تینوں کو حیرت ہوئی۔

”کون ہو تم.....؟“ مجسمہ غرایا۔

”میں ان دونوں کی دوست اور ہم درد ہوں۔“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔ ”میں نہ صرف ان دونوں کو بلکہ پورے ملک کو تم سے نجات دلانے آئی ہوں..... تم نے ظلم و بربریت کی انتہا کر دی ہے۔“

”اچھا.....“ وہ زہر خند بولا۔ ”تم گویا نجات دہندہ بن کر آئی ہو..... کیوں نہ میں پہلے تمہیں جلا کر خاکستر کر دوں؟ تاکہ یہ تمہارے دوست تمہارا تماشا دیکھ لیں گے کہ تم نقش ثانی کی شعاعوں سے کیسے جل کر مرتی ہو.....“

”لیکن اب یہ نقش ثانی ناکارہ ہو چکا ہے۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”اس میں سے شعاع تو کیا روشنی بھی خارج نہیں ہوگی۔ میری بات کا یقین نہیں ہے تو آ کر دیکھ لو۔“

چندرا دیوی اس کے رو بہ رو آ کھڑی ہوئی..... مجسمہ نے اس کا رخ چندرا دیوی کی طرف

کیا..... ہیرے کو دہرایا..... ایک نہیں کئی بار زور زور سے دہرایا..... اس میں سے شعاع نہیں نکلی..... مجسمہ حیران اور پریشان ہو گیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟“ وہ سچ دبا دبا کر دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”یہ ہزاروں سال سے جلاتا اور بھسم کرتا آ رہا ہے۔“

”اسے میں نے اپنے جادو کے زور سے ناکارہ کر دیا ہے۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”اب یہ کھلونا ہو کر رہ گیا ہے۔“

اس نے غصے میں آ کر نقش ثانی چندرا دیوی پر کھینچ کر دے مارا۔ وہ چندرا دیوی کے پیروں کے پاس فرش پر جا کر اتنا چندرا دیوی نے اسے اٹھالیا۔

”میں پونم کو لے جا رہا ہوں.....“ وہ پونم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”تاکہ اپنے باپ کی سادھی پر اسے قربان کر دوں۔“

”خبردار.....!“ چندرا دیوی نے دمکی آ میز لہجے میں کہا۔ ”اسے جو ہاتھ لگایا۔ تو میں تمہیں بھسم کر دوں گی۔“

مجسمہ نے چندرا دیوی کی دمکی کی پروا نہیں کی۔ وہ آگے بڑھتا گیا۔ چندرا دیوی نے نقش ثانی کا ہیرا دہرایا..... اس میں سے شعاعیں خارج ہونے لگیں تو مجسمہ نے بھونچکا ہو کر دیکھا اور بولا۔

”یہ تو ناکارہ ہو گیا تھا۔ اب..... اب کیسے کارآمد ہو گیا۔“

”ایک منٹ.....“ چندرا دیوی بولی۔ ”تمہیں بتاتی ہوں۔“

”میں نے اسے اپنی پراسرار قوت سے ناکارہ اور بے اثر کر دیا تھا تاکہ تم اسے ایک فضول سی چیز سمجھ کر پھینک دو۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”دوسری طرف ایک نفسیاتی حربہ بھی جو بڑا کارگر ثابت ہوا جس کی مجھے توقع نہیں تھی..... کیوں کہ یہ تمہیں بہت عزیز تھا

اسے میرے ہاتھوں میں جادو سے بیکار ہونے پر تم بری طرح جھمن جھلا گیا۔ تم نے غصے کی حالت میں یہ سمجھ کر پھینک دیا کہ اب یہ کسی کام کا نہ رہا..... دراصل تمہیں غصے میں کچھ بھائی نہیں دیا تھا۔“ چندرا دیوی نے بڑی وضاحت سے بتایا۔

”تو..... تو کیا آپ کوئی مہمان جادوگر بنی ہیں جس کے آگے مجسمہ بے بس ہو گیا.....؟“ پونم نے ہلکی جھپکاتے ہوئے تحیر زدہ لہجے میں کہا..... وہ دل میں عیش عیش کر اٹھی۔ اسے ایسا لگا جیسے اس نے کوئی بھیا نک خواب دیکھا ہو۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی ایک اجنبی عورت جس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتی کہ وہ کون ہے.....؟ کیا ہے.....؟ اس کے لئے مسیحا بن کر آئی اور اس نے اس خونی مجسمہ سے نجات دلادی۔

اس خونی مجسمہ سے نجات دلادی۔

ثانی میرے پاس نہیں تھا اس لئے اس پر قابو ممکن نہ رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ اس لئے فرار ہو گیا کہ اس میں آپ سے مقابلہ کی ہمت نہیں رہی تھی۔“ پونم بولی۔

”جی ہاں۔“ چندرا دیوی نے اثباتی اعزاز میں سر ہلایا۔ ”جب اس نے دیکھا کہ نقش ثانی ناکارہ اور بے اثر ہو گیا ہے تو اسے اعزازہ ہو گیا اس کا پالا کسی عام ہستی سے نہیں بلکہ کسی غیر معمولی جادوگر نے پڑا ہے۔۔۔۔۔ اس لئے نقش ثانی کو اس ہستی نے ناکارہ بنا دیا ہے۔۔۔۔۔ وہ اس بات سے ڈر گیا تھا کہ مقابلہ کرنے سے کہیں وہ فائدہ ہو جائے۔۔۔۔۔؟“

”یہ بات آپ کے علم میں کیسے اور کیوں کر آئی کہ مجسمہ یہاں ہے اور ہم مصیبت میں گھرے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔؟“ پونم نے سوال کیا۔ ”اور پھر کیا نقش ثانی کے متعلق جانتی تھیں جو آپ نے اسے ناکارہ کر کے رکھ دیا۔۔۔۔۔؟“

”مجھے میرے ایک صحابی دوست نے جو کلہو میں ایک سیمینار میں شرکت کرنے آئے تھے انہیں ایک سری لنگن صحابی نے اس خونی مجسمہ کے بارے میں بتایا۔۔۔۔۔ بڑی تفصیل سے ساری کہانی سنائی۔۔۔۔۔ تمام واقعات اور ایک ایک بات بتائی۔۔۔۔۔ شاید شاستری نے بتائی ہوگی اس صحابی کو۔۔۔۔۔ جب سریش سری لنگا سے ممئی آئے تو انہوں نے بتایا کہ سری لنگا میں خونی مجسمہ نے موت اور دہشت گردی کا راج قائم کر رکھا ہے وہ مصوم اور بے گناہ لوگوں کی زندگیوں سے کھیل رہا ہے۔۔۔۔۔ سری لنگا کے بڑے بڑے جادوگروں نے اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے بڑے جتن کئے۔۔۔۔۔ لیکن وہ ناکام رہے۔۔۔۔۔ اس وقت سخت ضرورت ہے ان لوگوں کو خونی مجسمہ سے نجات دلانے کے لئے۔۔۔۔۔ یہ بات کل ہی میرے علم میں آئی اور میں یہاں آگئی مدد کے لئے۔۔۔۔۔ میں آپ لوگوں سے ملنے آئی تھی۔ اتفاق سے میں بروقت پہنچی اور خونی مجسمہ نامراد لوٹ گیا۔۔۔۔۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ کی زندگی اور عزت پر آنحضور نہیں آئی۔ میں اس شیطان سے نجات دلا کر ہی واپس جاؤں گی۔“

”ہم آپ کا یہ احسان ساری زندگی فراموش نہیں کر سکیں گے۔“ شاستری نے بڑی ممنونیت سے کہا۔

”اس میں احسان کی کوئی بات نہیں بلکہ ایک انسان کا کام ہوتا ہے کہ وہ مصیبت زدہ انسان کے کام آئے۔۔۔۔۔“ چندرا دیوی نے کہا۔

”اب تو خونی مجسمہ آپ کا بدترین دشمن ہو گیا ہوگا۔۔۔۔۔؟“ شاستری نے کہا۔ ”آپ کو اس سے ہوشیار رہنا ہوگا۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ چندرا دیوی بولی۔ ”لیکن مجھے اس سے کوئی ڈر اور خوف نہیں ہے۔۔۔۔۔ وہ میرا بال تک بکا نہیں کر سکتا۔ آپ بے فکر رہیں۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ یہ جادوگر نے ہی نہیں ہیں۔۔۔۔۔ بلکہ کچھ اور بھی بہت کچھ معلوم ہوتی ہیں۔“ چندرا دیوی کے جواب دینے سے پہلے شاستری بول اٹھا۔ ”ایک ایسی عظیم ہستی جس نے بروقت آ کر تمہیں موت کے منہ سے اور بے عزت ہونے سے بچالیا۔ خونی مجسمہ کہیں بھی کبھی بھی ناکام اور نامراد نہیں ہوا۔ اپنا گھناؤنا مقصد ہر صورت میں پیدا کر کے رہتا ہے۔“

”کیا تم ان سے پہلے سے واقف ہو۔۔۔۔۔؟“ پونم نے متوجہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے کبھی ان کا ذکر نہیں کیا۔۔۔۔۔ اگر تم نے بتا دیا ہوتا تو ہم ان کی خدمات حاصل کر کے اس خونی مجسمہ سے کب کا نجات حاصل کر چکے ہوتے۔۔۔۔۔؟“

”نہیں۔۔۔۔۔ میں ان سے پہلے سے بالکل بھی واقف نہیں ہوں۔“ شاستری نے جواب دیا۔ ”میں انہیں آج اور اسی وقت دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔۔ اگر ان سے واقف ہوتا تو کیا میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوتا۔۔۔۔۔؟“

”تمہیں ان کے بارے میں کیسے اعزازہ ہوا کہ یہ ایک غیر معمولی ہستی ہیں۔۔۔۔۔؟“ پونم بولی۔ ”جو تم نے اتنا کچھ بتا دیا۔“

”ان کا کمال دیکھ کر۔۔۔۔۔؟ کیا تمہیں اس سے ان کے متعلق یہ اعزازہ نہیں ہوا۔۔۔۔۔؟“ شاستری کہنے لگا۔ ”نقش ثانی کو بے اثر اور ناکارہ کر دینا۔۔۔۔۔ خونی مجسمہ ان سے اس قدر مرعوب اور خوف زدہ ہوا کہ وہ ایک دم سے غائب ہو گیا۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اس نے یہ اعزازہ کر لیا تھا کہ ان سے مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے۔۔۔۔۔ یہ کوئی مہان ہستی ہیں۔ اس لئے میدان چھوڑ گیا۔۔۔۔۔ جب کہ میرا خیال تھا کہ شاید وہ ان سے مقابلہ کرے۔۔۔۔۔ تمہارے ساتھ ساتھ انہیں بھی لے جائے۔ کیوں کہ وہ حسین۔۔۔۔۔ اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”اوہ بھگوان۔۔۔۔۔“ پونم نے گہرا سانس لیا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس شیطان کے ہاتھوں محفوظ رہی۔۔۔۔۔“

”اگر آپ بروقت نہ پہنچتیں تو بھگوان جانے کیا ہوتا۔۔۔۔۔؟“ شاستری نے قدرے سہم کر چندرا دیوی سے کہا۔ ”اس کے سارے بدن پر ایک انجانے خوف اور اندیشے سے جھرجھری سی آگئی۔“ وہ پونم کو لے جانے کے لئے موقع کی تاک میں تھا۔ پونم نے تھوڑی دیر کے لئے نقش ثانی نکال کر رکھا اور نہانے کے لئے گئی تو معلوم نہیں کیسے خبر ہو گئی۔۔۔۔۔ باپھر گھر میں چھپا ہوا ہوگا؟ وہ پونم کو لے جانے پر تڑپا ہوا تھا۔۔۔۔۔ وہ پونم کو لے جائے گا تو پھر مجھے جانے کتنے دنوں بعد اس کی لاش ملتی۔۔۔۔۔ وہ اس سے جی بھرنے تک ساتھ رکھتا۔۔۔۔۔ میری زندگی اندھیر ہو جاتی۔۔۔۔۔“

”مجھے اس بات کا یقین تھا کہ مجسمہ مجھے اٹھا کر لے جائے بغیر نہیں رہے گا۔۔۔۔۔ چوں کہ نقش

”مجھے ایک بات کا یقین نہیں آیا.....؟“ پونم حیرت اور تحس سے بولی۔
 ”کس بات کا.....؟“ چند رادیوی بات کی تہہ میں پہنچ کر مسکرا دی۔

”ایک نہایت حسین و جمیل اور جوان عورت اتنی بڑی جادوگر تھی.....؟ پونم بولی۔“ لیکن میرے دل میں ایک انجانا ڈر اور خوف جنم لے رہا ہے کہ خونی مجسمہ جو آپ کی زندگی، عزت اور جان کا دشمن ہو گیا ہوگا اس کے کارن آپ کی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔“

”دراصل بھگوان نے مجھے جو صلاحیت دی ہے وہ ماضی میں ہندوستان کے کسی جادوگر میں نہیں تھی..... نہ ہی بنگال کے جادوگروں میں..... میں نے بتایا کہ خونی مجسمہ میرا ہال تک بیٹھا نہیں کر سکتا..... اسے اپنی خیر منائی چاہئے..... بہر حال میرا واسطہ ایک بہت خطرناک اور شیطان صفت سے پڑا ہے..... میں نے اپنے پراسرار علوم سے دو ہزار برس قبل کے حالات معلوم کر لئے ہیں..... تنکا رام..... دودھکنہ..... اور ان کے پتا جی مہاراجا دلشان کے بارے میں..... آپ پریشان اور ہراساں نہ ہوں۔“

”آخر یہ نقش ثانی ہے کیا بلا جس کے حصول کے لئے وہ پاگل ہو رہا ہے؟“ پونم کہنے لگی۔
 ”اسے پانے کے لئے دودھکنہ نے شاستری کے سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کر دیا..... شاستری کو حملہ آور کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا کہ یہ کس کی حرکت ہے..... اس کا شبہ سنیل داس پر ہوا..... دودھکنہ کے پاس یہ تھا..... اس نے میرے گلے میں ڈال دیا تھا..... اسے مجسمہ نے حاصل کرنے کی کوشش کی..... آج وہ اس مقصد میں کامیاب آپ کی وجہ سے وہ اس سے محروم رہا..... میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ چکر کیا ہے؟“

”یہ نقش ثانی سادھی میں نوادرات میں ملا تھا۔ اس پر جو زبان لکھی ہوئی تھی وہ ناقابل فہم تھی..... لیکن ناتھ نے اس کی زبان کچھ سمجھ لی تھی..... شاستری اس کے بہت قریب پہنچ گیا تھا کہ یہ نقش ثانی کیا ہے..... دودھکنہ نے اپنے جادو کے زور سے بہت کچھ بھانپ لیا تھا اس لئے وہ لے اڑا..... لیکن اسے اس نقش ثانی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اسے صرف یہ معلوم تھا کہ یہ نوادرات میں سے ایک ہے۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ تنکا رام..... یعنی خونی مجسمہ اور اس کے بھائی کی ملکیت تھا۔ اس کی خصوصیت کے بارے میں صرف باپ اور بیٹا جانتے تھے۔ اس لئے اسے سادھی میں نوادرات کے ساتھ رکھ دیا گیا.....“

”کیا یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ نقش ثانی کا پس منظر کیا ہے.....؟ یہ نقش ثانی تنکا رام کو کہاں سے اور کیسے ملا؟ کس نے دیا!“ شاستری نے کہا۔

”اوہ معاف کیجئے.....“ پونم کے چہرے پر عداوت کی سرخی دوڑ گئی۔ ”ہم اتنی دیر سے کھڑے

کھڑے ہاتھ کر رہے ہیں..... آپ کو بیٹھنے کے لئے نہیں کہا..... آپ تشریف رکھیں..... میں چائے لے آتی ہوں..... آپ رات کا کھانا کھا کر جائیں گی۔“

تھوڑی دیر بعد پونم تین کپ بھاپ اڑاتی چائے اور ایک پلیٹ میں نمکین کاجو لے آئی..... یوں تو ہندوستان میں کاجو ملتا تھا۔ لیکن سری لنکا کے کاجو میں جو ذائقہ اور مزاج تھا وہ ہندوستان کے کاجو میں نہیں۔

پھر چند رادیوی نقش ثانی کا پس منظر بتانے لگی۔

آج سے دو ہزار برس پہلے تنکا رام ایک انسان دوست تھا جس کے کارن وہ رعایا میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا۔ اس کی انسانیت کی وجہ سے نہ صرف شہرت تھی بلکہ مقبولیت بھی تھی۔ وہ دلوں میں بسا ہوا تھا۔ خالوں کہ وہ صرف راج کمار تھا۔ چوں کہ باپ زندہ تھا اس لئے اس نے حکومت کی باگ دوڑ سنبھالی ہوئی تھی۔ وہ ابھی اپنے بڑے بیٹے کو اس لئے گدی پر بٹھانا نہیں چاہتا تھا کہ اس کا چھوٹا بیٹا دودھکنہ نہ صرف ادب و باش تھا بلکہ جرم پیشہ بنا ہوا تھا۔ باپ کو یہ ڈر اور اندیشہ تھا کہ کہیں وہ بھائی کے تحت پر بیٹھے ہی اسے قتل نہ کر دے۔ باپ کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ بڑے بیٹے کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور عزت سے دودھکنہ حسد کرتا ہے..... بات یہاں تک محدود ہوئی تو وہ نظر انداز کر جاتا..... لیکن اس نے یہ محسوس کیا تھا کہ دودھکنہ کی نظروں میں بڑا بھائی کھلک رہا ہے۔ وہ اس کے قتل کے درپے ہے۔ اس لئے بھی کہ رعایا تنکا رام پر جان و جھڑکتی ہے۔ وہ عورتوں کی عزت و آبرو کا محافظ اور ظلم و ستم سے انسان کو بچاتا ہے۔

دودھکنہ ایک ظالم و جابر اور خون آشام بھیڑیا صفت تھا..... وہ نہ صرف کنوار یوں بلکہ حسین اور پرکشش شادی شدہ عورتوں کا بھی رسیا تھا۔ انہیں جبر و زیادتی سے ان کی عزت کو نشانہ بناتا تھا..... اسے اس کے علاوہ کوئی شوق نہیں تھا۔ اس کی راہ میں اس کا بڑا بھائی تنکا رام سب سے بڑی رکاوٹ تھا..... اس نے اپنی جان پر کھیل کر نہ صرف لڑکیوں اور عورتوں کی عزت و آبرو اور ظلم و ستم سے بچایا تھا بلکہ ان لوگوں کو بھی جو اسے لگان نہیں دیتے تھے..... وہ ان کا اناج لوٹ کر لے جاتا تھا۔ تنکا رام مزاحمت کرتا تھا۔ دونوں بھائیوں کے درمیان جنگ اور خون ریزی ہوتے ہوتے کئی بار رہ گئی تھی۔ کیوں کہ وزیر اعظم نے بچہ پچاؤ کر لیا تھا اور قوتوں نے تنکا رام کا ساتھ دیا تھا اور پھر تنکا رام غریبوں کی مشکلات کے بارے میں بتا کر اس کا سد باب کرنا تھا۔

دودھکنہ کے ساتھیوں نے اسے مشورہ دیا کہ تنکا رام جو اس کا سب سے بڑا دشمن اور اس کی راہ میں رکاوٹ ہے اسے اس طرح سے قتل کر دیا جائے گا مہاراجا دلشان اور کسی کو بھی اس پر قتل کا شبہ نہ ہو۔ اس کا قتل ایک حادثاتی موت لگے..... ایک ساتھی نے اسے مشورہ دیا کہ تنکا رام کو ایک

کھنڈ کو لیفر کردار تک پہنچائے بغیر چلن نہیں لے گا۔ وودو کھنڈ کے کانوں میں یہ بھبک پڑ گئی کہ اس کا ہائی اس کی جان کے درپے ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھی نے وودو کھنڈ سے کہا کہ اگر وہ تنگ رام کو قتل کر دے گا تو اسے کیا انعام و اکرام دے گا۔ اس نے جواب دیا کہ وہ نہ صرف منہ مانگا بلکہ وہ سے اپنا وزیر بنائے گا۔ وہ گدی پر بیٹھنے والا ہے کیوں کہ اس کا باپ کچھ دنوں کا مہمان ہے۔ اس شخص نے ایک قرعہ جیستی میں پہنچ کر تنگ رام اور اس کے ساتھیوں کا سواگت کیا اور انہیں ایک مکان میں ٹھہرایا۔ اسے شراب میں بے ہوشی کی دوا ملا کر پلا دی۔ اتفاق سے اس رات تنگ رام نے نقش ثانی نکال کر اپنے اتارے ہوئے لباس میں کسی وجہ سے رکھ لیا تھا..... رات کے وقت قاتل نے اس کا بایاں بازو کاٹ لیا۔ جس کی کلائی پر خاندانی سونے کا کڑا تھا۔ وہ بطور نشانی اور ثبوت کے طور پر لے گیا۔ اس کی لاش بے سرو سامانی کی حالت میں ایک گڑھے میں ڈال دی گئی..... اس کے باپ نے اپنے محبوب بیٹے کی لاش مرنے سے پہلے منگوالی۔ اس کی چتا کی راگھ نسا میں کھیر دی۔ پھر اس کی شاہانہ سامدی میں بیٹے کا مجسمہ بنا کر دفن کر دیا۔ کچھ نوادرات بھی..... اس میں وہ نقش ثانی بھی تھا..... وودو کھنڈ کو اس نقش ثانی کے خصوصیت کے بارے میں کچھ علم نہ

پھر ایک روز ایک نہایت حسین لڑکی کو شادی کے وقت وودو دکنہ نے منڈپ سے ٹھوکیا..... اس لڑکی کو علم تھا کہ وودو دکنہ ایسی حرکت کرے گا..... لیکن کیوں کہ وہ ہر دہن کے ساتھ یہاں کرتا تھا۔ وہ اس کے لئے دہنی طور پر تیار تھی۔ وہ اس کی بہن کے ساتھ ہی آیا کر چکا تھا۔ وہ اپنی بہن کا بھی انتقام لینا چاہتی تھی..... وہ ایسی گرم جوش، وارثی اور والدہانہ پن اور خود سپردگی سے وودو کے ساتھ پیش آئی کہ وہ حیران اور خوش ہو گیا۔ کیوں کہ آج تک کوئی بھی نئی نو بلی دہن اس طرح پیش نہیں آئی تھی۔ وہ حراحت کرتی..... روتی اور بھاگنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس لڑکی نے اپنے کپڑوں میں ایک خنجر چھپایا ہوا تھا جس کی دھار ہر میں بھی ہوئی تھی۔ اس نے موقع پا کر پوری قوت سے خنجر وودو دکنہ کے سینے میں دل کی جگہ گھونپ دیا۔ وہ لمحہ بھر میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔ پھر وڈو کی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئی۔ اس طرح وودو دکنہ جبر تک موت مر گیا۔

و نو دکنہ نے جب دوسرا جنم لیا تو اس وقت اس کی عمر سات برس کی تھی۔ ممبئی کے ایک کروڑ پتی کا بیٹا ریش تھا۔ اس نے ریش کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس نے ریش کا بہرہ وپ بھر کر اس گھر میں رہنے لگا۔ اس نے تعلیم بھی حاصل کی۔ جب وہ تیس برس کی عمر کا ہوا تو اس نے ماں باپ کو ایک کار کے حادثے میں مار دیا۔ چوں کہ وہ ایک بدروح تھا اس لئے اسے طاغوتی طاقت تھی۔ وہ جادو وغیرہ سے بھی واقف تھا۔ وہ ممبئی میں حسن و شہاب سے جی بھلاتا رہا۔ کئی

تنگا رام نے اپنے سات و فوادار ساتھیوں کو ساتھ لے جانے کے لئے آمادہ کرایا۔ اس کے باپ نے اپنے بیٹے کو اتنی دولت دی وہ نہ صرف اپنے ساتھیوں کی بیس برس ضروریات پوری کرے بلکہ کسی کی بھلائی اور مدد کے لئے دل کھول کر بھی خرچ کرے تو اس میں ذرہ برابر بھی کمی واقع نہ ہو۔ پریشانی اور کسی بات کی محتاجی نہ ہو۔ تنگا رام ویران اور سنسان علاقوں کی طرف نکل گیا۔

ایک دور افتادہ بستی میں ایک جادوگر واسونا تھر رہتا تھا۔ وہ بڑا رحم دل تھا۔ اس کی بستی میں قحط اور خشک سالی تھی..... جب کہ اس سے دور ایک اور بستی میں غلہ اور اناج کی فراوانی تھی۔ جنگا رام نے اس بستی سے اتنا غلہ خرید کر بستی والوں کو دیا جس سے ایک برس تک گزارا ہو سکتا تھا..... اس جادوگر کو جنگا رام نے اپنی کہانی سنائی تھی کہ اسے کس لئے اپنا دیس چھوڑنا پڑا۔ وہ اپنے بھائی کی سرکوبی کرنا چاہتا ہے جس نے رعایا کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ پھر جادوگر نے اسے نقش ثانی بنا کر دیا اور اس کی خصوصیت کے بارے میں بتایا اس کے پہننے رہنے سے اس پر کوئی ہتھیار اثر نہیں کرے گا..... اس نقش کے درمیان جو جڑاؤ ہیرا ہے اسے دبانے سے ایسی شعاعیں خارج ہوں گی جو جلا کر بھسم کر دیں گی۔ اسے تم نے لمحے کے لئے بھی اپنے سے جدا نہ کرنا..... اور ہاں تم پر کوئی جادو اثر نہیں کر سکے گا۔

ہنگام کے کانوں تک صرف یہ خبر پہنچی کہ وہاں برائی عروج پر ہے۔ کسی کی عزت اور جان و مال و نوکھنہ اور اس کے سہیلیوں کے باعث محفوظ نہیں ہے..... پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ دودو

مورتوں کی روحوں کو اس میں قید کر رکھا ہے۔ اتنی حسین مورتیں دنیا میں نہیں ہیں۔۔۔۔۔ وہ ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔۔۔۔۔ اس میں دس نوجوان لڑکیاں اور مورتیں موجود ہیں۔۔۔۔۔ انہیں صرف اس بات کی اجازت ہے کہ وہ سمندر کے کنارے کسی شکار کی تلاش میں جاسکتی ہیں اور اپنی پیاس بجھا سکتی ہیں۔۔۔۔۔ وہ بے لہاس رہتی ہیں۔ پرکاش مہرہ کو جب مجسمہ نے نماش گاہ سے اٹھا کر پیچھا کیا تو وہ اس محل میں پہنچا تھا۔۔۔۔۔ پرکاش مہرہ وہاں تین دن رہا۔ اس نے خوب جی بھلایا۔ وہاں ایک کمرے میں تین چار مجسمے ہیں جو صرف بات کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ وہاں ایسے اور اتنے بڑے بڑے گلابی ہیرے الماری میں سجے ہوئے ہیں کہ انہیں کوئی ہاتھ لگائے تو ہاتھ مجلس جاتا ہے۔۔۔۔۔ پرکاش مہرہ کو تیسرے دن مجسمے نے سمندر کے کنارے لاڈالا تو پرکاش مہرہ کے خیال میں وہ ایک پتہ تھا۔

یہ تنگ رام چوں کہ جانتا ہے کہ یہ نقش ثانی کن خصوصیت کا حامل ہے۔۔۔۔۔ وہ اس کے حصول کے لئے جان توڑ کوشش کرے گا۔ لہذا ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔۔۔۔۔ اس کے خیال میں یہ ناکارہ اور بے اثر نہیں ہوا ہوگا۔۔۔۔۔؟ وہ کالی ماتا سے مطوم کرے گا۔ کالی ماتا بھی اس نقش ثانی کو گلے سے نکال کر اس کے حوالے نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ اسے کسی بھی لمحے جدا نہیں کر سکتی۔۔۔۔۔ میں اس وقت تک یہاں سے یعنی سری لنکا سے نہیں جاؤں گی تا وقتیکہ وہ فنا ہو جائے اور کوئی جنم لے سکے۔۔۔۔۔ ہاں اس سمندر کے محل میں جگن ناتھ کا دوسرا جنم ہوا ہے۔۔۔۔۔ وہ وہاں ان بیس لڑکیوں اور مورتوں کی معیت میں خواب ناک اور پریشانی زندگی گزار رہے ہیں وہ بیس برس کے جوان بنے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ میرے خیال میں اب مجھے مزید کہنے کی ضرورت نہیں رہی۔“

”میں ایک سوال اس سمندری محل کے بارے میں کرنا چاہوں گا۔“ شاستری نے کہا۔ ”وہ محل صدیوں سے سمندر میں واقع ہے۔ کیا ابھی تک کسی کو بھی۔۔۔۔۔ نیول والوں کو بھی اس کی موجودگی کا علم نہ ہوسکا۔۔۔۔۔؟“

”بات یہ ہے کہ وہ محل ہر کسی کو نظر نہیں آتا ہے۔۔۔۔۔ کیوں کہ وہ طلسماتی محل ہے۔“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔

”ہم آپ کی طرف سے سخت فکر مند اور پریشان ہیں۔“ شاستری نے کہا۔ ”اس لئے کہ نقش ثانی دوبارہ مل جانے کے بعد وہ نہ صرف ہمارا بلکہ آپ کا بھی بدترین دشمن بن گیا ہے۔۔۔۔۔ آپ کی جان کو خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ وہ آپ کو نقصان نہ پہنچائے۔“

”مجھے اس سے کیوں اور کس لئے نقصان پہنچے گا۔۔۔۔۔؟“ چندرا دیوی مسکرا دی۔

”آپ تنگ رام۔۔۔۔۔ یعنی اس خونی مجسمے سے کب اس ملک کو نجات دلائیں گی؟“ پونم بولی۔

ادا کاراؤں نے اس کے ساتھ راتیں کالی کیں۔ اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ کیوں کہ ایک طوائف اور اداکارہ میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ پرکاش مہرہ سری لنکا میں کھدائی کے لئے اپنی کمپنی کے ماہرین کو لے جا رہا ہے جو وہاں خزانہ تلاش کریں گے۔ وہ بھی اس خیال سے سری لنکا پہنچ گیا کہ کہیں کھدائی میں اس کے بھائی کی سادھی نہ نکل آئے۔ آخر وہی جس کا اسے اندیشہ تھا وہ پورا ہو گیا۔

پرکاش مہرہ نے دنیا کا سب سے بڑا دولت مند بننے کے لئے سری لنکا کی حکومت سے ایک معاہدہ کیا۔۔۔۔۔ معاہدہ کے مطابق ایک بڑی رقم کروڑوں میں ادا کی کہ کھدائی کی اجازت دے۔ جو بھی نوادرات اور خزانہ کھدائی سے نکلے گا وہ اس کی اپنی ملکیت ہوگا۔۔۔۔۔ سری لنکا حکومت نے اس لئے اجازت دے دی کہ اسے دولت کی اشد ضرورت تھی۔ خزانہ خالی ہو رہا تھا۔ اس رقم سے اس کے بہت سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔۔۔۔۔ حکومت یہ بھی جانتی تھی کہ برسوں سے بہت سے اداروں نے خزانے کی تلاش میں کھدائی کی لیکن ڈھاک کے تین پات ملے۔۔۔۔۔ انہیں ایک تولہ بھی سونا نہیں ملا۔۔۔۔۔ ایک کہانی جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھی وہ یہ تھی کہ دو ہزار برس قبل مہاراجا میں بھا خزانہ اور نوادرات چھوڑ گیا راجا اس کے بیٹے کی سادھی میں محفوظ رہے۔ قسمت نے پرکاش مہرہ کا ساتھ دیا۔۔۔۔۔ یہ آپ کے ہاتھی کے کارن سادھی دریافت ہوئی۔۔۔۔۔ و نو دھنہ کو سونے کے مجسمہ اور نوادرات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تنگ رام کی آتما نے اس کی آتما کو بتایا تھا کہ میں سادھی سے باہر آتے ہی جنم لے لوں گا اور تم سے بدلہ لوں گا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ تابوت سادھی سے باہر آئے۔۔۔۔۔ اس لئے اس نے آپ کے ہاتھی کو کرائے کے بد معاشوں کی مدد سے قتل کروا دیا تھا کہ آپ لوگ دہشت زدہ ہو کر فرار ہو جائیں۔ کام اور یہ ملک چھوڑ دیں۔ لیکن آپ لوگ باز نہیں آئے ۹

جب مجسمہ ممی لایا گیا تب تنگ رام نے دوسرا جنم لیا۔ اس بات کا علم و نو دھنہ کو ہو گیا تھا۔ لیکن یہ مجسمہ وہ تنگ رام نہیں رہا جو مائے میں تھا۔۔۔۔۔ اس مجسمہ کی آتما پر کالی ماتا کا سایہ پڑ گیا جو شر کی دیوی ہے۔۔۔۔۔ سری لنکا میں یہ وہی حرکتیں کر رہا ہے جو ماضی میں وجود رکھ کر رہا تھا۔۔۔۔۔ اور پھر کالی ماتا نے اسے ایک اور صلاحیت دی ہے۔ وہ یہ کہ جب، جس وقت، جس گڑی بھی چاہے جو روپ بہروپ چاہے بھر سکتا ہے۔ لڑکی، عورت، جانور، درندہ اور پرندہ چرند۔۔۔۔۔ چڑیل، بھوت۔۔۔۔۔ ہاتھی بھی۔۔۔۔۔

ممی میں سمندر کے اندر۔۔۔۔۔ شہر سے سو میل دور ایک شان دار محل بنا ہوا ہے۔۔۔۔۔ اسے ایک بنگال کے جادوگر نے دو ہزار تین برس قبل اپنے جادو کے زور سے بنایا تھا۔ اس دور کی میں

”میرے لئے یہ بڑا اچھا موقع تھا کہ میں اسی وقت اسے ختم کر دیتی.....“ چندراد یوی بولی۔ ”اسے تلاش کرنا ہوگا..... کیوں کہ وہ روپ بدلتا رہے گا..... کبھی انسان کے تو..... کبھی جانور..... کبھی..... پرند..... کسی بھی روپ میں کیوں نہ ہو بس اس سے سامنا ہونا شرط ہے..... میں اسے فوراً ہی تلاش کر لوں گی..... تاہم اس کی گھات میں ہوں.....“

”آپ کسی بات کی چٹانہ کریں۔“ چندراد یوی نے دلا سادیا۔ ”وہ یقیناً اپنے موٹلوں سے ہراساں، دہشت زدہ اور پریشان کرے؟“ چندراد یوی نے توقف کر کے اپنے پرس سے دو گلابی رنگ بہت ہی مضبوط وھاگے نکالے جو راکھی کے بندھن کے سائز کے تھے۔ اس نے ان کی کلائیوں پر باندھ دیئے..... اور پھر بولی۔ ”کوئی بھی آجائے تو وہ آپ دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے گا..... لیکن وہ خونی مجسمہ شاید آجائے..... خونی مجسمہ نقش ثانی مانگے تو اسے دیدیں..... لیکن.....؟ وہ جیسے ہی اسے تھاے گا اس کا ہاتھ اس بری طرح جھلس جائے گا کہ وہ جھپیں مارتا ہوا غائب ہو جائے گا..... اچھا..... اب میں چلتی ہوں۔ کل رات آ کر کھانا کھاؤں گی..... ویسے آپ دونوں سے وقتاً فوقتاً ملتی رہوں گی۔ نیچے پہلی فرصت میں مجسمہ کو تلاش کرنا ہے۔“

چندراد یوی پال کیلے کی سیر کے لئے صبح مسافر بس میں سوار ہوئی۔ وہ کولمبو شہر کی طرف جاری تھی۔ کولمبو زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ سری لنکا بہت ہی خوب صورت اور سرسبز و شاداب ملک ہے۔ یہاں سپاری، ناریل اور انناس کے درختوں کی بہتات ہے۔ کاجو کے علاوہ چائے اور کافی کی کاشت بھی کی جاتی ہے۔ یہ ایک زرعی ملک ہے۔ حکومت چائے، کافی، پان، کاجو، ناریل، کاتیل اور بھی بہت ساری اشیاء ایکسپورٹ کرتی ہے..... اس کی آمدنی کا ایک اور ذریعہ غیر ملکی سیاحوں سے بھی ہے۔ حکومت ہر صورت میں غیر ملکی کرنسی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے سیاحوں کو ہر قسم کی سہولتیں اور مراعات حاصل تھیں۔ سیاحوں کی سری لنکا کی سیر و سیاحت میں دلچسپی اس لئے زیادہ تھی کہ اس ملک کی کرنسی بہت ہی کم تھی۔ شراب، شاب، جوئے اور ہوٹل کے کرایوں میں ان کے لئے خصوصی رعایت ہوتی تھی..... ہر سال موسم گرما میں یورپ امریکہ سے گوری چمڑی کی لڑکیاں، عورتیں اور مرد اپنی گوری رنگت کو سانولی کرنے آتے تھے۔ عورتیں دھوپ میں سمندر کے کنارے روزانہ سن باتھ لیتی تھیں..... سمندر میں نہاتی اور تیرتی تھیں۔ وہ پیرا کی کے مختصر لباس میں ہوتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ ساحل سمندر کسی یورپی ملک کا ہے۔ ان دنوں ہوٹلوں میں مردوں سے زیادہ لڑکیاں اور عورتیں ٹھہرتی تھیں۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ ایک پس ماندہ ملک تھا جو جزیروں کا تھا۔ تنگ دہلی، غربت و افلاس اور احساس محرومیاں بہت زیادہ تھیں، لڑکیاں اور عورتیں فیکٹریوں، کارخانوں، ہوٹلوں میں

کام کرتی تھیں۔ دکانوں میں سائز گرل تھیں۔ یہ بدھت تھے۔ مسلمانوں کی بھی بڑی اکثریت تھی۔ سری لنکا نے کرکٹ میں بڑا نام پیدا کیا ہوا تھا۔

بس میں اس کی برابر سیٹ پر ایک عورت جو بیالیس برس کی عمر کی تھی بیٹھی تھی۔ وہ مناسب اور چھپرے بدن کی عورت تھی..... بے حد پرکشش تھی۔ وہ عام عورتوں کے مقابلے میں دراز قد تھی۔ چندراد یوی نے بہت کم عورتوں کو اس قامت کی پایا تھا۔ اس کی قامت نے اس کے جسم کی دل کشی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا..... سرخ کناروں والی سفید ساڑھی اور سرخ بلاؤز میں وہ قیامت خیز ہو گئی تھی۔ گو کہ اس کی رنگت سانولی سی تھی لیکن اس میں نمک تھا۔ اس نے فیشن کے مطابق انتہائی مختصر سا بلاؤز جو بغیر آستینوں کا تھا پہن رکھا تھا۔ اس کی سڈول ہانہیں اور کھلا گریبان قیامت ڈھار ہی تھیں۔

چندراد یوی نے اس کے بشرے سے محسوس کیا کہ وہ بہت پریشان اور افسردہ سی ہے۔ جب بس چل پڑی تو اس نے اپنے چرمی پرس سے ایک جیبی سائز کا کلکویٹر نکالا۔ وہ اپنی تنخواہ میں سے منہا کی جانے والی رقم کا حساب لگا رہی تھی۔ آج جولائی کی سات تاریخ تھی۔ وہ کولمبو اس لئے جاری تھی کہ پانچ برسوں سے اس کی ترقی التوا میں پڑی ہوئی تھی۔ اسے وزارت تعلیم کے محکمے میں کام کرتے ہوئے بیس برس کا عرصہ بیت چکا تھا۔ گزشتہ پانچ برسوں میں مہنگائی میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اس مہنگائی نے ملازمت پیشہ لوگوں کی کمزور رکھی تھی۔ اس کے علاوہ اس عورت درگاہ کو اپنے گھر کے سامان مکان اور زیورات کے رہن کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ تین برس قبل اس کے شوہر کی بیماری کے باعث اسے مکان، زیورات اور قیمتی اشیاء ایک سودخور کے پاس رہن رکھوانا پڑا تھا۔ دس فیصد ہر ماہ اسے ادا کرنا پڑتا تھا۔ وہ ہر ماہ سود ادا کرتے کرتے عاجز آ چکی تھی۔ اگر وہ یہ رہن رکھ کر قرض نہ لیتی تو بیوہ ہو جاتی..... اس کا خیال تھا کہ شوہر صحت یابی کے بعد ملازمت کر کے اصل رقم واپس کر دے گا..... لیکن جو سوچا تھا وہ نہ ہوسکا۔ اس کا شوہر بے حد کمزوری کے باعث ملازمت کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی کالج میں داخل ہو جائے تو چھ ماہ بعد اسے کہیں بھی جزدقی ملازمت مل جائے گی۔ اس کی ترقی سے تنخواہ اتنی ہو جائے گی کہ بیٹے کے تعلیمی اخراجات اور سود کی ادائیگی میں بڑی سہولت ہو جائے گی..... اس سودخور نے درگاہ کو ٹوٹ دیا ہوا تھا کہ وہ باقاعدگی سے سود ادا نہیں کر رہی ہے۔ سودور سودے قرض کی رقم میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے..... اگر دو ماہ میں تمام سود ادا نہ کیا گیا تو اسے رہن رکھی ہوئی چیزوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا..... اور وہ مکان خالی کرا لے گا۔

عمومی کنوینیاں واضح تھیں۔ مگر پھر بھی تین سو روپے کم تھے۔ پھر اسے وہ سو روپے یاد آئے

جو اس نے دفتر کے کیشیئر سے ادھار لئے تھے۔ کیوں کہ پچھلے ماہ وزیر خارجہ دفتر کے دورے اور معائنہ پر تشریف لائے تھے۔ ان کی سواگت دفتر کی یونین نے کیا تھا۔ اس کے لئے بھی ڈیڑھ سو روپے کا چندہ دینا پڑا۔ دفتر میں سبھی نے دیا تھا۔ وزیر صاحب اپنے ہمراہ ایک بڑا وفد جس میں زیادہ تر حفاظتی افسر تھے لائے تھے جس میں ان کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو وہ شان دار ناشائز اور سرباغ دکھا کر دفع ہوئے تھے۔

”کیا بات ہے آپ بہت پریشان اور خوف زدہ دکھائی دے رہی ہیں۔“ چندرا دیوی نے بڑی شائستگی سے کہا۔ ”معاف کیجئے گا..... میں نے آپ سے ایک ذاتی سوال کیا ہے.....؟ اس بات کا کچھ خیال مت کریں۔“

یہ سری لنکن عورت تھی۔ اس لئے چندرا دیوی نے اسے انگریزی میں مخاطب کیا تھا۔ یہاں مرد اور عورتیں انگریزی زبان میں گفتگو کرتے تھے یا پھر اپنی مقامی زبان میں..... یوں تو وہ ہندوستانی زبان اور مدراسی زبان سے بھی آشنا تھے۔

”جی ہاں.....“ اس عورت نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا تو اس کے لہجے میں افسردگی نمایاں تھی۔ ”میں نے آپ کی بات کا برا نہیں منایا ہے۔ بلکہ مجھے خوشی ہوئی کہ آپ نے میری پریشانی کو بھانپ کر ہمدردانہ لہجے میں سوال کیا..... اس نفسا نفسی کے دور میں خون اور رشتے بھی محبت کے دو لفظ بھی نہیں بولتے ہیں..... واقعی میں بہت پریشان ہوں..... مجھے بچے کے داخلے کی فکر ہے..... دوسری طرف میں نے شوہر کے علاج کے لئے جو مکان، زیورات اور قیمتی اشیاء رہن رکھ کر قرض لیا سو دہ..... وہ تین برس سے بھر رہی ہوں..... اس گراں فردشی کے باعث درمیان میں کچھ مہینے بھر نہ سکی..... سود و سود ایک عذاب اور عفریت ہے..... اس سود خور نے مجھے نوٹس دیا ہے کہ اگر میں نے دو ماہ کے اندر سود نہیں بھرا تو رہن رکھا ہوا سب کچھ ضبط کر لوں گا..... میرے پاس جو کاغذات اور معاہدہ ہے عدالت اس کی رو سے صرف ایک ماہ کے نوٹس پر مکان خالی کروادے گی۔ پھر وہ زیورات اور قیمتی اشیاء بھی ضبط کر لے گا..... میں نے اس سے کہا کہ زیورات دے دو تا کہ میں انہیں فروخت کر کے تمام قرض اور سود ادا کروں..... جب سے سونے کے دام آسمان سے باتیں کرنے لگے ہیں۔ اس خبیث کی نیت میں فرق آ گیا ہے..... میں نے رشتہ داروں سے بھی کہا کہ..... وہ قرض اور سود ادا کر دیں۔ میں زیورات فروخت کر کے ان کی رقم دے دوں گی..... لیکن اس کے لئے کوئی تیار نہیں ہوا..... دوسری طرف میری ترقی پانچ برس پہلے ہوئی تھی۔ لیکن اس پر اب تک عملدرآمد نہیں ہوا۔ سری التوا میں پڑی ہوئی ہے۔ ترقی ہو جانے کی صورت میں میرے پاس اتنی رقم آ جائے گی کہ تمام سود اور ادھا قرض بھی ادا

ہو جائے گا..... اور پھر لڑکے کو کالج میں داخلہ دلوا دوں گی۔ چھ ماہ بعد اسے جزوقتی ملازمت مل جائے گی تو سال بھر میں قرض اور سود بھی ادا ہو جائے گا۔ اب میرے پاس دو سو ساٹھ روپے بچے ہیں۔“ نصف گھنٹے کے اس سفر میں ان کے درمیان محبت کا ایک رشتہ قائم ہو گیا جیسے وہ جنم جنم کی دوست، غم گسار ہوں..... چندرا دیوی بس اسٹاپ پر اس کے ساتھ اتر گئی اور اس سے بولی۔ ”اگر میں بھی آپ کے ساتھ ساتھ چلوں تو آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں.....“

”اعتراض.....؟“ وہ خوش ہو کر بولی۔ ”میرے دل کو بڑی ڈھارس ہوگی۔ آپ ضرور ساتھ چلیں.....“ وہ عورت بس اسٹاپ سے چند قدم پر تھی۔ وہ راہ داری میں آ کر بڑے کمرے کے آخری حصے کی طرف بڑھی، ایئر کنڈیشنڈ دفتر تھا۔ وہاں کھڑا استقبال تھا۔ ریسپشن کے کاؤنٹر پر کوئی نہ تھا۔ جو لڑکی تھی وہ کسی کام سے اندر گئی ہوئی تھی۔ چندرا دیوی نے کہا وہ نشست گاہ میں بیٹھ کر انتظار کرے گی۔ کیوں کہ اس کے ساتھ اندر جانا مناسب نہیں ہوگا۔ درگا اندر کی طرف بڑھ گئی۔ پھر چندرا دیوی ایک دم سے غائب ہو کر اس کے ساتھ ہوئی۔ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا لیکن وہ ہر کسی کو دیکھ سکتی تھی۔ اور دیکھ رہی تھی۔

دفتر میں میزوں پر موجود لڑکیاں خاموشی سے کام کر رہی تھیں۔ درگانے سوچا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چیف اندر موجود ہے۔

وہ اس کمرے میں جہاں چیف کی لیڈی پرائیویٹ سیکریٹری بیٹھتی تھی۔ درگانے اسے اپنا شناختی کارڈ دکھایا تو اسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ چندرا دیوی بھی اس کے ہمراہ اندر پہنچ گئی۔ چیف ایک فحش با تصویر امریکی رسالہ دیکھ رہا تھا جس کے کنارے کثرت مطالعہ کی وجہ سے مڑ چکے تھے۔ اس کے سرورق پر ایک امریکی اداکارہ کی نامناسب حالت کی رنگین تصویر چھپی ہوئی تھیں۔ درگا چیف کے سامنے بت بنی کھڑی تھی وہ اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ چیف اس کی طرف متوجہ ہو۔ چیف کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی اور وہ پورا نگہا ہو چکا تھا۔

”اچھا تو تم کل صبح جا رہی ہو درگا.....!“ اس نے اپنے آگے کے نکلے ہوئے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

”بس سر.....!“ درگانے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

”میں تمہیں تیاری کے لئے آج سہ پہر کی چھٹی کرنے کی اجازت دیتا ہوں..... کو لمبو میں تمہارے پاس تین دن ہوں گے.....؟ کیا تمہارے یہ تین دن کافی ہوں گے.....؟ تم کیا کہتی ہو.....؟“

”سر.....! میں اس صورت میں مزید تین دن کی معافی چاہوں گی کہ اگر کام نہ ہو سکا؟“
 ”کوئی مسئلہ نہیں ہے درگا.....!“ چیف نے کہا۔ ”اور ہاں یاد آیا..... کیا تم کولبو سے میرے لئے جدید ترین گبر ڈین کا کپڑا خرید کر لاسکتی ہو..... میں تمہاری واپسی پر ادائیگی کروں گا۔“
 ”ضرور سر.....! شکریہ۔“ درگا بولی۔

درگا نے سوچا کہ گبر ڈین کا کپڑا دو سو روپے میں آسانی سے مل جائے گا۔ کیوں کہ اب اس کا رواج نہیں رہا ہے۔ پچھلی مرتبہ چیف نے اس سے چین کی چٹون منگوائی تھی۔ جو اسے ایک سو دس روپے پرانے مال کی دکان پر ملی تھی۔ اس کی واپسی پر چیف نے اس کی رقم دینے پر اصرار کیا مگر اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے بھی چیف اس کے ساتھ عزت سے پیش آتا تھا۔ مثال کے طور پر آج سہ پہر کی چھٹی اور تنخواہ کے ساتھ رخصت..... سب سے بڑھ کر اس نے دوسری خاتون کلرکوں کی طرح درگا کی طرف جسمانی پیش رفت نہیں کی تھی۔

وہ ذیلی دفتر میں کام کرتی تھی۔ یہ دفتر صدر دفتر تھا۔ کیشمر نے اسے تین دن کی تنخواہ کی ادائیگی کی۔ وہ باہرنگی تو چندرا دیوی اس کے انتظار میں تھی۔ اس نے چندرا دیوی کو بتایا کہ وہ کل صبح چھ بجے والی بس سے کولبو جائے گی۔ اس وقت بسوں میں بہت رش ہوتا ہے۔ چندرا دیوی نے اسے یہ بتایا تھا کہ وہ سری لنکا تفریح، سیروسیاحت اور یہاں کے معاشرے کے بارے میں جانکاری کے لئے آئی ہوئی ہے۔ وہ ایک اخبار کی رپورٹر بھی ہے۔ اس لئے وہ بھی اس کے ساتھ کولبو چلے گی۔ تفریح اور ساتھ رہے گا..... اور پھر اسے یہاں کے دفاتروں کی جانکاری بھی ہوگی..... درگا یہ سن کر خوش ہو گئی۔ چندرا دیوی نے اس سے کہہ دیا کہ وہ اس پر بوجھ نہیں بنے گی۔

صبح چھ بجے سے پہلے وہ بس اسٹاپ پر پہنچی تو چندرا دیوی اس کی منتظر تھی۔ اس پہلی بس کی روانگی میں بہت رش ہوتا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر درگا حیران ہوئی کہ آج بس میں اتفاق سے کوئی رش نہیں تھا اور اس دن مسافروں کی تعداد حیرت انگیز طور پر خاصی کم تھی۔ درگا..... چندرا دیوی کو ساتھ لے کر کھڑکی کے پاس والی نشست پر بیٹھ گئی۔ سورج کی روشنی کے سیلاب میں دیہاتی علاقہ چاول کے تازہ لگے ہوئے پودوں سے زردی بہز دکھائی دیتا تھا۔ ندی نالے پانی سے بھرے ہوئے تھے..... پوری وادی حتیٰ کہ جہاں جہاں سرسبز پہاڑیاں تھیں افراتفری سی پھیلی ہوئی تھی..... بس تو تعمیر شدہ سڑکوں اور پلوں پر سے ہنسی گاتی گزرتی جا رہی تھی۔

درگا نے بڑی خوشی اور فخر یہ انداز میں بتایا کہ یہ ساری ترقی سابقہ حکومت کے دور میں ہوئی تھی۔ درگا سابقہ حکومت کی بڑی فرارخ دلی سے تعریف کر رہی تھی..... نئی سڑکوں اور پلوں نے کولبو جانا بہت آسان بنا دیا تھا۔ جہاں پہلے پورا دن درکار ہوتا تھا۔ اب صرف سات گھنٹے لگتے ہیں۔

شہر کی بھاگ دوڑ اور نفسا نفسی کی زندگی عجیب طرح کی تھی۔ درگا اور اس کے خاندان نے پال کیلے میں آخر کار کسی نہ کسی طرح اپنا گھر بنالیا تھا..... اس کے تین بچے تھے جن میں ایک کی شادی ہو چکی تھی اور وہ امریکہ نقل مکانی کرنے والا تھا۔ اس کا ویزا آ گیا تھا۔ دوسرا کالج میں پڑھتا تھا اور اب وہ فائل ایئر میں تھا۔ سب سے چھوٹے نے میٹرک پاس کر لیا تھا۔ درگا اور اس کے شوہر تنخواہ دار تھے اور وہ کسی طرح بھی کم خرچ کرتی..... رقم پس انداز کرتی لیکن ان کی بچت ہر چیز کی بڑھی ہوئی قیمتوں کی نذر ہو جاتی۔ مٹی کے تیل کے چولہے میں کھانا پکانا اس نے چھوڑ دیا تھا اور قارم سے آئی ہوئی لکڑیوں کو جلا کر پکارتی تھی اور یہ لکڑیاں ہمیشہ خشک نہیں ہوتی تھیں۔

اس نے پانچ برس پہلے ترقی کی درخواست دی تھی۔ یہ اس کا حق تھا۔ اس سلسلے میں وہ کوئی دو مرتبہ کولبو جا چکی تھی۔ آخر کار خط و کتابت کے بعد اسے یہ اطلاع ملی تھی کہ اس کی درخواست منظور کی جا چکی ہے..... اس نے یہ ساری باتیں چندرا دیوی کو بتائی تھیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ بڑا بیٹا امریکہ جا کر ایک ڈالر بھی دو برس تک نہیں بھیج سکے گا۔ اس لئے کہ امریکی ویزا کے حصول کے لئے وہ بہت بڑی رقم کا مقروض ہو گیا ہے۔

سہ پہر کے وقت وہ کولبو پہنچے۔ بس سے اترنے کے بعد چندرا دیوی اسے لُچ کے لئے قریبی ریستورنٹ میں لے گئی۔ درگا نے پلاسٹک کالُچ بکس نکالا جو اس کی بیٹی نے تیار کر کے دیا تھا۔ راستے میں بس دو ہوٹلوں پر رکی تھی۔ چندرا دیوی نے اسے سینڈویچز اور سمو سے کھلائے اور چائے پلائی تھی۔ اس کے لُچ بکس میں ابلے ہوئے انڈے..... مکھن سلائس، چاول اور ابلے ہوئی مرغی تھی..... چندرا دیوی نے ہوٹل میں اپنے لئے چکن بروسٹ منگوا لیا تھا۔ درگا کے لئے بھی منگوانا چاہتی تھی لیکن درگا نے منع کر دیا۔ اس لئے کہ کھانا وافر مقدار میں تھا۔

جب وہ دونوں ہوٹل سے نکلیں تو شام کے دھندلے پھیل رہے تھے۔ اس کے ہمراہ چندرا دیوی نہ ہوتی تو اسے ہجوم میں تھیلے اٹھا کر چلنے میں بڑی دشواری ہوتی اور اس وقت ٹیکسی کا ملنا بھی دشوار لگ رہا تھا۔ وہ جب بھی کولبو آئی تھی تو اس نے اپنی کزن کے ہاں قیام کیا تھا۔ اس کی کزن کالج میں ہم جماعت رہ چکی تھی۔ اب اس کی کزن کے چار بچے تھے۔ گزشتہ مرتبہ اسے برآمدے میں سونا پڑا۔ لیکن اب وہ وہاں جانا نہیں چاہتی تھی۔ گزشتہ مرتبہ جب وہ برآمدے میں پڑے صوفے پر سو رہی تھی تو اس نے اپنے چہرے پر گرم گرم سانس اور بدن پر ایک ہاتھ کو کسی سانپ کی طرح رینگنا محسوس کیا تھا..... وہ ہڑبڑا کر بیدار نہ ہوئی تو وہ کزن کے پتی کے بازوؤں کی گرفت میں بے بس ہو جاتی۔ وہ ایک قد آور اور مضبوط بازوؤں کا شخص تھا۔ صبح کے ناشتے میں وہ اسے ہوسنا کی نظروں سے گھورتا رہا اور اس سے کہا تھا کہ ایک رات اور رک کر صبح چلی جائے۔

شام کو کسی اچھے ریستورنٹ میں کھانا کھائیں گے۔ آخری شودیکھیں گے۔ وہ اسے خریداری بھی کرائے گا۔۔۔۔۔ وہ ان باتوں کا مطلب سمجھتی تھی۔ ان کی تہ میں کون سا جذبہ کارفرما تھا۔۔۔۔۔ اس کی کزن رات میں سونے کے لئے بستر پر دراز ہوتی تو بے ہوشی کی سی نیند سوتی تھی۔ کہیں دھماکا بھی ہو جائے تو بیدار نہ ہو۔۔۔۔۔ رات رکنے کا مطلب یہ تھا کہ وہ نوازشات کا صلہ وصول کرے۔۔۔۔۔ اس نے اس پیشکش کو بڑی خوش دلی سے اور شکریے کے ساتھ رد کر دیا تھا۔

کولمبو۔۔۔۔۔ سری لنکا کے تمام شہروں کے مقابلے میں بہت مہنگا تھا۔ یہاں ہر چیز مہنگی تھی۔ صرف ایک عورت سستی تھی۔ ہوٹل تو ہر درجے کے تھے۔ ان میں جو گلیاں قسم کے ہوٹل تھے ان کا بھی کرایہ ایک دن کا ڈیڑھ سو روپے سے کم نہ تھا۔ ایک مرتبہ اسے ایک رات ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ وہ کسی کام سے آئی تھی۔ چوں کہ اس کی کزن گھر پر نہیں تھی اس لئے وہ ہوٹل میں کرا کر ایہ پر لینے پر مجبور تھی۔ اس ہوٹل کا ماحول بہت خراب تھا۔ یہاں عیاش قسم کے لوگ ٹھہرے ہوئے تھے۔ جوڑکیوں اور عورتوں کو کمروں میں لے جا رہے تھے۔ جب وہ گہری نیند میں تھی تب اس نے دروازے پر دستک سنی۔ اس نے روشنی کر کے دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔۔۔۔۔ کون ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ اس نے سوچا۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ پھر اس نے ایک نسوانی آواز سنی۔۔۔۔۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے ایک عورت گھڑی تھی۔ اس کے پیچھے دو مرد تھے۔ عورت اس لئے بولی کہ یہ میرے دوست کے دوست ہیں۔ میں اپنی دوست کی پارٹنر ہوں۔۔۔۔۔ ان کے دوست کو رات بھر ایک پارٹنر کی ضرورت ہے۔ انہوں نے ڈبل بیڈ لیا ہوا ہے۔ وہ نہ صرف آپ کے کمرے کا کرایہ بلکہ دوسروں پر بھی پیشگی ادا کریں گے۔ صبح کا ناشتا بھی کرائیں گے۔۔۔۔۔ ان کے پاس ولایتی بیئر بھی ہے۔۔۔۔۔ وہ سکی بھی۔۔۔۔۔ اس نے دھڑ سے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹھی لگائی۔ اس کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ جلد صبح ہونے کی پڑا تھا کرتی اور جاگتی رہی تھی۔ تب سے اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس قسم کے کسی ہوٹل میں نہیں ٹھہرے گی۔۔۔۔۔ اب وہ ہوٹل میں ٹھہرنا چاہتی تھی۔ کسی اچھے سے ہوٹل میں جس کا ماحول اچھا ہو۔ لیکن کیا اس کا کرایہ وہ ادا کر سکے گی۔۔۔۔۔؟ چند رادپوی بھی ساتھ اور رات میں رکنے والی تھی۔ پھر چند رادپوی اس کی دلی کیفیت بھانپ کر ایک فور اسٹار ہوٹل پر لے آئی جو سامنے تھا۔ اس نے کہا کہ وہ کرائے کی فکر نہ کرے۔ وہ ادا کر دے گی۔ چند رادپوی نے ایک ڈبل بیڈ کرائے پر لیا۔ اس ہوٹل کے تمام کمرے ایئر کنڈیشنڈ تھے۔ ماحول بڑا خواب ناک تھا۔ اس میں نہ صرف غیر ملکی سیاح مرد اور عورتیں ٹھہری ہوئی تھیں بلکہ مقامی لوگ بھی تھے۔ اس کا پومیہ کرایہ پندرہ سو روپے تھا۔ چند رادپوی نے اسے جو ڈنر کھلایا تھا اس کا بل سات سو روپے بنا تھا۔

اسے گزشتہ سال کی بات یاد آئی تھی۔ یہ اس دن کی بات تھی جب اس کی کزن کے شوہر نے رات کے وقت اس کی گہری نیند سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ وہ شاید یہ سمجھا تھا کہ اس کی کزن کی طرح وہ بھی بے ہوشی کی نیند سوتی ہوگی۔ جب وہ کزن کے ہاں پہنچی تھی تو وہ لوگ رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ ایک اچھے رشتے دار کی طرح وہ ان کے لئے کھانے کی بہت ساری چیزیں لے کر آئی تھی۔ اس کے بھانجے اور بھانجیوں کا کیسٹ پوری آواز میں لگا ہوا تھا۔ اس کی کزن اور اس کا شوہر اسے دیکھ کر بہت خوش نظر آئے تھے۔ اس کا شوہر تو کچھ زیادہ ہی خوش نظر آیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ کزن کے شوہر کے دل اور آنکھوں میں میل ہے۔ لیکن اپنی کزن کے اس سوال میں اسے ہلکا سا طعنے محسوس ہوا تھا۔ ”تم کب واپس جاؤ گی۔۔۔۔۔؟ کتنے دنوں کے لئے آئی ہو۔“

”میں یہاں ایک ہفتے سے زیادہ نہیں رکوں گی۔“ اس نے جواب میں کہا تھا۔ ”اور میں زیادہ تر وقت باہر رہوں گی۔ میں دوپہر اور رات کا کھانا بھی باہر ہی کھاؤں گی۔ کیوں کہ میرا زیادہ تر وقت کانگنات کے پیچھے بھاگ دوڑ کرنے میں وزارت کے دفتر کا چکر لگانے میں گزرے گا۔۔۔۔۔ جانتی ہو جس فائل پر سرخ فیتہ لگا ہوا وہ ناک چنے چوڑا ہوتی ہے۔“

اگلے دن اس نے ان کے ساتھ ہی ناشتا کیا تھا۔ وہ چھ بجے بیدار ہو گئی تھی۔ اس وقت بچے اسکول جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ ان کے کیسٹ ریکارڈر نے اسے رات بھر جگائے رکھا تھا۔ اس نے دانست بہت ہی مختصر سا ناشتا کیا۔ کافی کے ایک کپ کے ساتھ اس نے صرف ایک نمکین سلاٹس لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے مصروف دن گزارنا ہے اور یہ ناشتا ناکافی ہے۔۔۔۔۔ اور پھر اس کی کزن نے اصرار بھی نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی کزن پر بوجھ بنانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کس قدر مہنگائی ہے۔ بڑا ناپ تول کر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ قناعت اور کفایت شعاری کا ہنر نہ ہو تو پھر گزارہ مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ غریب بھی کیا کرے۔ تین بچے ہیں جو ایک اچھے اسکول میں زیر تعلیم ہیں۔ گھر سے باہر آ کر ایک مدراسی ہوٹل میں جا کر اس نے سالہ دو سا کھایا اور وقت ضائع کئے بغیر وہ متعلقہ افراد کے پاس گئی۔ کسی بھی دفتر میں واقف کار کا رہنا بڑا سودمند ہوتا تھا۔ اسے اپنے ایک پرانے رفیق کار حیش صاحب کا خیال آیا تھا۔ جو ایک زمانے میں چیف سلیکشن تھے۔ خوش گپیوں میں مصروف لکڑوں میں اسے ایک ایسا کلرک نظر آیا جو اس کی مدد کر سکتا تھا۔ حیش صاحب ریٹائر ہو چکے تھے۔۔۔۔۔ یہ تمام واقعات اسے اب یاد آ گئے تھے۔

صبح کے پر تکلف ناشتے کے بعد وہ نکلی تو چند رادپوی بھی ساتھ تھی۔ چند رادپوی سے اس کی ملاقات سپنے کی طرح لگ رہی تھی۔ وہ بڑی ظلم اور بے غرض عورت ثابت ہوئی تھی۔ اس پر دل

”اس لئے کہ میرے پاس وہ خط موجود ہے جو آپ نے پچھلے مہینے بھیجا تھا۔“ اس نے تیزی سے اپنے پرس کی زپ کھول کر اندر ہاتھ ڈالا۔ پھر خط باہر نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔ ”یہ دیکھئے۔۔۔۔۔ اور اس پر فائل نمبر بھی ہے۔۔۔۔۔“

وہ عورت اپنی بات پر اڑی رہی۔ اس نے اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے سر کو جنبش دی۔

”مز درگا جوشی!“ اس نے شرمیلے لہجے میں کہا۔ ”آپ کے کام کے لئے مجھے ڈیڑھ روٹ فائلیں دیکھنا پڑیں گی۔۔۔۔۔ میں بہت معروف ہوں۔۔۔۔۔ مجھے اس کام کے لئے کسی اور کو لگانا پڑے گا۔“ اس نے درگا کے پاس والا دراز کھولتے ہوئے کہا۔ ”آپ اس دراز میں صرف دو سو روپے کیوں نہیں ڈال دیتی ہیں۔۔۔۔۔؟“

ایک لمحے کے لئے درگا کو ایک دھچکا سا لگا۔ اسے یقین نہیں آیا تھا کہ یہ سب صرف اس کے ساتھ ہو رہا ہے جو خود بھی اسی وزارت میں کام کرتی ہے۔ پھر اسے یاد آیا کہ کس طرح اس کے دفتر میں مز سبکدوش بھی یہی کرتی ہے۔ اس نے پرس کھولا تو اس عورت نے دراز اور کھولی دی۔ درگا نے سوسو کے دونوں ڈالتے ہوئے دراز میں جھانکا۔ اس میں سو سو اور پچاس کے نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ اس کے اندازے کے مطابق دو ہزار سے زیادہ رقم تھی۔

”کیا میں اپنے کام کے لئے سہ پہر کے وقت حاضر ہو جاؤں۔۔۔۔۔؟“

”مز درگا جوشی!“ اس عورت نے بڑے بیٹھے اور ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ ”آپ جانتی ہیں کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔۔۔۔۔ آپ کل کیوں نہیں آ جاتیں۔۔۔۔۔ آپ کی مدد کے لئے مجھ سے جو کچھ بھی بن پڑا وہ کروں گی۔۔۔۔۔“

وہ جانتی تھی کہ بحث و تکرار سے کچھ حاصل نہیں۔۔۔۔۔ سرکاری دفاتر کے امور ایسے ہی ہوتے ہیں۔ لہذا وہ خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔

چندرا دیوی جو ایک طرف کھڑی یہ سب کچھ غائب حالت میں دیکھ رہی تھی۔ اس نے تمام نوٹ اٹھا کر اپنے پرس میں رکھ لئے۔۔۔۔۔ اس نے سوچا کہ درگا کی فائل مل جانے کے بعد اس عورت کو سبق دے گی۔ یوں تو وہ بھی درگا کی فائل الماری سے نکال سکتی تھی۔ لیکن اس نے سوچا۔ یہ مناسب نہیں ہوگا۔

درگا نشست گاہ میں آئی اور اس سے بولی۔ ”اس عورت نے دوسو روپے بھی لئے اور کام کل پر ڈال دیا۔ اس کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔۔۔۔۔ ایک دن اور رکنا ہوگا۔۔۔۔۔ اور میں۔۔۔۔۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور نخل سی ہو گئی۔

کھول کر خرچ کر کے اس کی رقم بچائی تھی۔ رات جس ہوٹل میں گزاری تھی وہ کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ کیا دنیا میں چندرا دیوی جیسی ہستیاں بھی ہیں۔۔۔۔۔؟ آخر اس کا کیا رشتہ ہے۔۔۔۔۔؟ وہ نہ اس کی بہن ہے۔۔۔۔۔ کزن ہے۔۔۔۔۔ ماں یا بھائی ہے۔۔۔۔۔؟ اس نے کیسے انمول اور انوکھے اور محبت بھرے رشتے میں باندھ لیا۔۔۔۔۔ وہ سچ سچ کی کوئی دیوی ہے۔ جو آکاش سے اترتی ہو۔۔۔۔۔ اور بنگوان نے اس کی مدد کے لئے بھیجا ہو۔

درگانے سوچا تھا کہ اسے سیدھا وزیر کے پاس جانا چاہئے۔۔۔۔۔ کیوں کہ دورے کے موقع پر اس نے کسی پریشانی اور مسئلے کی صورت میں اسے اپنے پاس آنے کی دعوت دی تھی۔۔۔۔۔ وہ جانتی تھی کہ اس شخص نے یہ رسما کہا تھا۔ یہ بڑے لوگ چھوٹے لوگوں کو ایسا ہی بے وقوف بناتے ہیں۔۔۔۔۔ جھوٹ بولتے اور فریب دیتے ہیں۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ وہ شخص سراب کے نشے میں دھت تھا۔ وہ اس سے دفتر کے کچھ کاغذات پر دستخط کروانے گئی تھی۔۔۔۔۔ وزیر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا کہ۔۔۔۔۔ تم کتنی حسین ہو۔۔۔۔۔ ہندوستانی اداکارہ مدھو بالا لگ رہی ہو۔۔۔۔۔ اس کی آنکھوں میں دل کا میل جمنا تک رہا تھا۔ وہ غیر محسوس انداز سے ہاتھ چھڑا کر ابھی آنے کا کہہ کر چلی آئی تھی۔۔۔۔۔ درگا کو اندازہ تھا کہ اسے وہ باتیں یاد نہیں رہی ہوں گی جن کا اس نے وعدہ کیا تھا۔۔۔۔۔ اور پھر اسے یہ بھی احساس ہوا تھا کہ اس ترقی کا مسئلہ معمولی نوعیت کا ہے۔ جسے وزیر جیسے اہمیت کے حامل کے سامنے پیش کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔۔۔۔۔“

چندرا دیوی کو دفتر کے استقبالیہ کمرے میں چھوڑ کر وہ اندر گئی تھی۔ اس نے دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے ایک کلرک سے اس افسر کے متعلق پوچھا جو عملے کے ارکان کی ترقی کے معاملات نمٹاتا تھا۔ اسے دفتر کے دوسرے حصے کی طرف بھیج دیا گیا۔

وہ افسر ایک تیس بیس برس کی جسم اور فریب عورت تھی۔ جس کے دانت گندے۔۔۔۔۔ بال ژولیدہ۔۔۔۔۔ اور لبوں پر انتہائی شوخ رنگ کی لب اسٹک لگی ہوئی تھی۔ اس نے میز کی دراز سے ایک فہرست نکالی اور بڑی مستعدی سے اس کا مطالعہ کیا۔ اس نے کاغذات کو الٹ پلٹ کر لے کے بعد اپنے منہ سے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے درگا کی طرف دیکھا۔

”مجھے افسوس ہے مز درگا جوشی۔۔۔۔۔! فہرست میں آپ کا نام نہیں ہے۔ شاید فارم ادھر

ادھر ہو گئے ہوں۔۔۔۔۔“

”لیکن ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔؟“ درگا نے اونچی آواز میں کہا تو وہ فضا میں گونج گئی۔

”کیوں نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔؟“ اس عورت نے تکرار کی۔ ایک دو نہیں سینکڑوں فارم ہوتے

اس کی بات سن کر چندرا دیوی بولی۔ ”آپ اخراجات کے لئے پریشان ہو رہی ہیں۔۔۔۔۔ آپ کسی بات کی چٹان نہ کریں۔ میں نے آپ کو بتایا کہ میں بڑے باپ کی بیٹی ہوں۔ سیرو سیاحت پر آئی ہوں تو بڑی رقم لائی ہوں۔ ایک دن کیا۔۔۔۔۔ کام ہونے تک ہفتہ بھی لگ جائے تو فرق نہیں پڑتا۔۔۔۔۔ چلیے۔۔۔۔۔ ہمارے پاس وقت ہے۔ وقت گزاری کرتے ہیں۔“

”چندرا دیوی جی۔۔۔۔۔“ اس کے غلوں اور ہمدردی کے جذبے پر درگا کا دل اور آنکھیں بھر آئیں۔

اس وقت تقریباً دس بج چکے تھے۔ کولہو کے مرکزی بازار جانے کے لئے چندرا دیوی نے ٹیکسی کر لی۔ درگانے اس سے کہا تھا کہ کچھ خریداری کرنی ہے۔ وہاں ایک ایسی مارکیٹ تھی جہاں کپڑوں کی چھوٹی اور عام قسم کی دکانیں تھیں۔ ان دکانوں پر ہر قسم کے نئے پرانے کپڑے مناسب داموں پر دستیاب تھے۔ اس نے دکان داروں سے گبر ڈین اور اس کے سب سے عمدہ اور اعلیٰ قسم کی کوالٹی کے بارے میں دریافت کیا۔ آج کی صبح خاصی مرغوب تھی۔ بسوں، گاڑیوں اور ٹیکسیوں کے دھوئیں نے اس کے لئے سانس لینا دشوار کر دیا اور اسے سینے میں گھٹن محسوس ہونے لگی۔ آخر اس نے ایک دکان پر کپڑا پسند کر کے بھاؤ بناؤ کیا۔ تین سو چالیس روپے میں کپڑا خرید لیا۔ وہ دونوں اسٹور سے نکل کر ایک بازار میں آئیں۔ درگانے اشیاء خورد و نوش کی قیمتوں کا موازنہ کی۔ یہاں قیمتیں اس کے علاقے کے بازاروں سے بہت زیادہ تھیں۔

دوپہر کے وقت لچ پر اس نے چندرا دیوی کو مدعو کیا۔۔۔۔۔ اسے ایک معمولی سے ہوٹل میں لے گئی۔ کیوں کہ اچھی حالت کے ہوٹلوں میں کھانے بہت مہنگے تھے۔ چندرا جانتی تھی کہ درگا اسے کسی اچھے ہوٹل میں کھانا کیا۔۔۔۔۔ کوئی مشروب پلانے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ لہذا اس نے کہا۔

”درگا۔۔۔۔۔! جب تک ہم کولہو میں ہیں۔ تمام اخراجات میرے ذمے۔۔۔۔۔ آج لچ بھی میری طرف سے۔۔۔۔۔“

پھر وہ درگا کو لے کر ایک مدراسی ہوٹل میں گئی۔ جہاں دال، چاول، دہی، دو قسم کی سبزی ترکاری اور پاپڑ کی تھالی تھی۔ یہ نہ صرف سستا بلکہ ذائقہ دار اور مزے دار تھا۔ مدراسی کھانے بہت اچھے اور لذیذ ہوتے تھے۔ اسی لئے پورے سری لنکا میں مقبول تھے۔

ہوٹل سے باہر آنے کے بعد وہ پھر مرکزی بازار میں آئیں جہاں غیر معمولی رش تھا۔ پھر اسے ایک دم سے خیال آیا کہ اس بازار میں رہزنی کی بڑی وارداتیں ہوتی ہیں۔ خصوصاً لڑکیوں اور عورتوں کے پرس جو ان کے اوپر مرد چھین کر بھاگ جاتے ہیں۔ ہجوم میں ایسے کم ہو جاتے

ہیں کہ انہیں پکڑنا بہت دشوار ہوتا ہے۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ بھی ایک بار ایسا واقعہ پیش آ چکا تھا۔ مگر اتفاق سے وہ رہزن چند قدموں کے بعد ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ پھر اس بد معاش کی شامت آ گئی۔ لوگوں نے لاقوں، جوتوں اور گھونٹوں کی بارش سے اس کی ایسی خاطر تواضع کی کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ اگر پولیس مین نہ آتا تو وہ راہ گیروں کے ہاتھوں بے موت مارا جاتا۔ پھر اس نے اور چندرا دیوی نے کولہو میں مرکزی بازار کے قریب بنا ہوا نیا اور جدید ترین قسم کا بازار دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس بازار کی دکانوں میں ایک عام آدمی کا خریداری کرنا تو درکنار قدم رکھنا بھی مشکل تھا۔ وہ ایک ڈیڑھ برس بعد کولہو آئی تھی۔ ایک دوسرے کو دھکے دیتا ہوا ہجوم۔۔۔۔۔ لوگوں کے پسینے میں تر چہرے۔۔۔۔۔ گلیوں سے آنے والی بدبو۔۔۔۔۔ اور چھوٹے چھوٹے کوارٹروں والی عمارتیں۔۔۔۔۔ اس کی وادی میں زندگی کتنی مختلف تھی۔ صرف ایک برس میں کولہو ایک سر بدل گیا تھا۔ جس کا اسے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔

وہ دونوں ایک بنگلہ گلی میں داخل ہوئیں تو وہاں سناٹا تھا اور وہ خالی پڑی تھی۔ وہ دکانوں کی عقبی گلی تھی۔ اچانک تین نوجوان بد معاش جو چاقوؤں سے مسلح تھے ان کے سامنے آ گئے۔ ان میں سے ایک نے بڑے استہزاء سے لہجے میں دونوں سے کہا۔

”تم دونوں اپنا اپنا پرس ہمارے حوالے کر دو۔۔۔۔۔ مدد کے لئے شور نہ مچانا۔۔۔۔۔“

”ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔ ”ہم دونوں کے پرس بالکل خالی پڑے ہیں۔۔۔۔۔ اس لئے کہ صبح دس بجے تم جیسے دو بہادر سپوتوں نے پرس چھین کر اسے خالی کر کے لوٹا دیئے تھے۔“

”تم جھوٹ بول رہی ہو۔۔۔۔۔“ دوسرا بد معاش غرایا۔ ”ہمیں بے وقوف نہ بناؤ۔“

چندرا دیوی نے اپنا پرس اس بد معاش کی طرف اچھال دیا۔ ”لو۔۔۔۔۔ اچھی طرح سے دیکھ لو اور اپنی تسلی کر لو۔“

اس بد معاش نے پرس کی زپ کھول کر پرس کے اندر جھانکا۔۔۔۔۔ اس کے خانے دیکھے۔۔۔۔۔ پھر اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

”یہ سچ کہہ رہی ہے۔۔۔۔۔ واقعی اس میں ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔“ اس نے خالی پرس الٹ کر دکھایا اور ایک طرف پھینک دیا۔

ادھر درگا بھونچکی سی ہو گئی کہ۔۔۔۔۔ چندرا دیوی کی رقم کہاں گئی۔۔۔۔۔؟ اسے یاد آیا۔ چندرا دیوی نے جب کبھی بھی مل اور ٹیکسی کا کرایہ دینے کے لئے پرس کھولا تھا وہ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں امریکی ڈالر اور مقامی کرنسی اور جانے کیا کیا تھا۔۔۔۔۔؟

”یہ شاپنگ بیگ اور پرس ہمارے حوالے کر دو۔۔۔۔۔ تیسرے نے غرا کر ہاتھ بڑھایا۔
”دیکھو۔۔۔۔۔ اس میں بھی کچھ نہیں ہے۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”اس شاپنگ بیگ میں پرانے
اخبار اور رسالے ہیں۔۔۔۔۔ اس کا پرس بھی خالی ہے۔۔۔۔۔ تم لوگ خواخوہ اپنا قیمتی وقت ضائع
کر رہے ہو۔۔۔۔۔“

تیسرا درگا کی طرف چاقو لہراتا ہوا بڑھا اور اس کے ہاتھ سے شاپنگ بیگ چھین لیا۔ اس
میں دیکھا تو واقعی اخبار اور رسالے بھرے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ خالی پرس منہ چڑا رہا تھا۔۔۔۔۔ درگا نے
لمحے کے لئے سوچا۔۔۔۔۔ کیا وہ جاگتے میں بھی تاک خواب دیکھ رہی ہے؟
اس تیسرے نے غصے سے جھن جھلا کر خالی پرس درگا کے منہ پر دے مارا۔ وہ جھکاؤ نہیں
دیتی تو پرس سے اس کا منہ ڈٹی ہو جاتا۔

جب وہ تینوں جانے کے لئے مڑے تو چندرا دیوی بولی۔ ”غصہ۔۔۔۔۔ جا کہاں رہے
ہو۔۔۔۔۔ آج تم تینوں نے جو لوٹ مار کی ہے وہ مال دیتے جاؤ۔ یہ ایک جرم مانہ ہے۔۔۔۔۔ اس جرم
کا کہ تم نے پرس اس عورت کے منہ پر دے مارا۔۔۔۔۔“

”کیا تمہارے باپ کا مال ہے۔۔۔۔۔؟“ پہلے نے دھاڑتے ہوئے کہا۔
”نہیں۔۔۔۔۔ یہ مال نہ تمہارا ہے اور نہ میرے باپ کا۔۔۔۔۔ کسی اور کا ہے۔۔۔۔۔“ وہ ان کی
طرف بڑھی۔ ”اپنی تلاشی دو۔۔۔۔۔“

”قریب نہ آنا۔۔۔۔۔ ورنہ یہ چاقو تمہارے سینے میں اتار دوں گا۔۔۔۔۔“ دوسرے نے دھمکی
آمیز لہجے میں کہا۔

چندرا دیوی نے اس کی دھمکی کی پرواہ نہیں کی۔۔۔۔۔ دوسرے بد معاش نے اپنا ہاتھ فضا میں
حملہ کرنے کے لئے اٹھایا۔ لیکن وہ ساکت ہو گیا۔۔۔۔۔ دونوں بد معاش بھی جہاں کھڑے تھے اور
جس حالت میں تھے ساکت ہو گئے تھے۔ ان تینوں پر مجسموں کا گمان ہو رہا تھا۔ ان میں ہلنے
چلنے کی حرکت کی اور جنبش تک کی سکت نہیں رہی تھی۔

”یہ۔۔۔۔۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔؟ پہلے والے نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ”ایسا
لگ رہا ہے کہ میں پتھر کا ہو گیا ہوں۔“

”ہم دونوں بھی ایسا ہی محسوس کر رہے ہیں۔۔۔۔۔“ دوسرے اور تیسرے نے کہا۔
”ہاں۔۔۔۔۔“ چندرا دیوی بولی۔ اس نے پہلے بد معاش کے ہاتھ سے چاقو نکال لیا۔ ”کیا

خیال ہے۔۔۔۔۔؟ میں یہ چاقو تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے سینوں میں اتار دوں۔۔۔۔۔؟ خون
کروں۔۔۔۔۔؟ میں چاہوں تو ایسا کر سکتی ہوں۔ لیکن ایسا نہیں کروں گی۔۔۔۔۔“

چندرا دیوی نے دونوں بد معاشوں کے ہاتھوں سے چاقو لے کر انہیں غیر مسلح کر دیا۔ اس
نے تینوں چاقو کٹر میں ڈال دیئے۔۔۔۔۔ پھر اس نے اپنا پرس اٹھا کر تینوں بد معاشوں کو باری باری
دیکھایا۔ انہوں نے دیکھا تو ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ وہ ملکی
اور غیر ملکی کرنسی سے بھرا ہوا تھا۔

چندرا دیوی نے پہلے بد معاش کی تلاشی لی۔ اس کی جیبوں سے نوٹ، اور ایک سونے کا لاکٹ
برآمد ہوا۔۔۔۔۔ وہ چیخا چلایا اور اس نے دھمکی بھی دی۔۔۔۔۔ میرا مال نہیں نکالو۔۔۔۔۔ زندہ نہیں چھوڑوں
گا۔۔۔۔۔ اس نے بڑی کوشش اور جتن کئے۔ وہ نہ تو مزاحمت کے قابل تھا اور نہ حرکت کے۔۔۔۔۔ چندرا
دیوی نے بڑے اطمینان سے اپنا کام کیا۔۔۔۔۔ دونوں بد معاشوں کی جیبوں سے بھی رقم، اور دستی
گنریاں برآمد ہوئیں۔۔۔۔۔ درگا نے اپنا شاپنگ بیگ دیکھا تو اس میں ردی اور رسالے نہ تھے بلکہ اس
نے جو کپڑا خریدی تھی۔ اس کے پرس میں بھی اس کی ساری رقم موجود تھی۔ اس کی عقل دنگ تھی۔
کچھ کام نہیں کر رہی تھی۔

”مجھے یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ تم تینوں کی جیبوں سے دس بارہ ہزار سے زائد رقم نکلی ہے۔۔۔۔۔“
چندرا دیوی بولی۔ ”میں نے کتنا اونچا اور شاندار ہاتھ مارا ہے۔۔۔۔۔ اس رقم سے ہم عیش کریں گی۔
پر تکلف کھانے کھائیں گی۔۔۔۔۔ اچھا ہم جاری ہیں۔۔۔۔۔ تم تینوں بارہ گھنٹے تک اسی حالت میں رہو
گے۔۔۔۔۔ اگر تم لوگوں نے بد معاشی نہیں چھوڑی تو پھر میں تم تینوں کو ساکت کر کے قتل کر دوں گی۔۔۔۔۔
میں تمہیں ابھی اور اسی وقت قتل کر دیتی۔ لیکن تم لوگوں کی جوانی پر ترس آ گیا۔۔۔۔۔ ویسے میں تم
تینوں کے ہاتھ مفلوج کر کے جاری ہوں تاکہ تم لوگ پھر سے رہ زنی کی وارداتیں نہ کرو۔۔۔۔۔ گڈ
بائی۔۔۔۔۔“

پھر چندرا دیوی بڑے سکون و اطمینان اور حکمت سے مین روڈ کی طرف بڑھی۔ وہ تینوں
بد معاش بیچ و تاب کھاتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔ ایک طرف انہیں غصہ آ رہا تھا تو دوسری طرف
وہ خوف زدہ بھی تھے کہ ان کا واسطہ ایک جادوگر کی سے پڑ گیا ہے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں
تھا۔۔۔۔۔ گو کہ انہوں نے سنا ہوا تو تھا کہ اس ملک میں جادوگر اور جادوگریاں ہیں۔ لیکن وہ انتہائی
دور افتادہ علاقوں میں تھیں۔۔۔۔۔ کبھی کسی جادوگر اور جادوگر کی نے ایسی حرکت نہیں کی تھی۔

”وہ کیسی۔۔۔۔۔ ہم تینوں کو لوٹ کر دو دن کی کمائی لے گئی۔۔۔۔۔؟“ ایک نے کہا۔
”اس نے ہمیں جادو کے زور پر بے حس و حرکت کر دیا ہے۔۔۔۔۔“ دوسرا بولا۔ ”پورے بارہ
گھنٹے کے لئے۔۔۔۔۔“

”میں پورا زور لگا رہا ہوں لیکن میری طاقت جو سلب ہو گئی ہے وہ کام نہیں کر رہی ہے۔“

تیسرے نے کہا۔

”یہ کیا جادو تھا.....؟“ پہلے والے نے کہا۔ ”جانتے وقت اس نے جو پرس دکھایا وہ نوٹوں سے بھرا ہوا تھا..... جب کہ میں نے اچھی طرح دونوں پرس دیکھے تھے..... ان میں کچھ نظر نہیں آیا..... اب وہ مستقل ہمیں اور ہمارے ساتھیوں کو لوٹتی رہے گی.....“

درگا جو ابھی تک سحر زدہ سی تھی وہ بار بار پلٹ کر ان بد معاشوں کی طرف دیکھ رہی تھی کہ شاید وہ ان کے تعاقب میں آئیں۔

”درگا بہن.....!“ چندرادپوی بولی۔ ”پریشان اور خوف زدہ نہ ہو..... یہ بد معاش ہمارے گھنٹوں تک حرکت تو درکنار جنس تک نہیں کر سکتے اور نہ ہی تعاقب میں آ سکتے ہیں..... تم اطمینان رکھو.....“

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا آخر یہ سب کچھ کیا تھا.....؟ وہ تیر زدہ لہجے میں بولی۔ ”کیا آپ کوئی جادو کرتی ہیں.....؟“

”دراصل میں نے انہیں پھانسا کر دیا تھا.....“ چندرادپوی بولی۔ ”میں نے نہ صرف پھانسا کر کا مکمل کورس کیا ہوا ہے بلکہ جوڑو کرائے کی تربیت بھی حاصل کی ہے..... پھانسا کر نہ صرف ایک فن ہے بلکہ ایک طرح جادو کی قسم بھی ہے۔“

”آج آپ کا یہ فن بڑا کام آیا.....“ درگا نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم اور جان بھی بچ گئی..... ان بد معاشوں کا کوئی بھروسہ نہیں تھا۔ وہ پرس چھین کر شور مچانے پر جان بھی لے سکتے تھے..... بلکوان نے بڑی کرپا کی.....“

وہ باتیں کرتی ہوئی گلی سے نکل کر مین روڈ کے بس اسٹاپ پر پہنچی..... اس وقت ایک لمبی، بڑی خوب صورت نئی ٹوبلی دہن جیسی ٹورسٹ بس آ کر رکی جو سیاحوں کو پورے شہر کی سیر کرائی تھی۔ اس نے نئی بس کے بائیں اخبار میں پڑھا تھا۔ یہ ایئر کنڈیشنڈ تھی۔ اس نے چندرادپوی کو بتایا تو چندرادپوی اس کا ہاتھ پکڑ کر بس میں سوار ہو گئی۔

کلبو ایک ڈیڑھ برس میں واقعی یکسر بدل گیا تھا۔ بڑا ہی خوب صورت اور شان دار شہر لگتا تھا..... وہ پہلے کی نسبت کافی سترھا ہو گیا تھا۔ اس شہر کی صفائی کے کیا کہنے..... لوگ کہتے ہیں کہ یہ امریکہ جیسا ہے۔ اس نے یہ بات چندرادپوی سے کہی اور کہنے لگی۔

”محکمہ غذارت ٹورسٹ کے ایک اسسٹنٹ میکرینٹری نے ایک مرتبہ شہر کی ترقی کے مسائل پر لیکچر دیتے ہوئے کہا تھا..... اس ملک میں بے پناہ دولت ہے.....“ درگا نے سوچا۔ ان میں سے کون سی عمارت وزیر کی ملکیت ہے..... کیوں ایک افواہ تھی کہ وہ ایک پلازہ کا مالک ہے..... کوئی اتنی جلدی کسی عمارت کا مالک کیسے بن سکتا تھا..... اس کا جواب وزیر نے یہ دیا تھا کہ وہ ذاتی گاڑی اور

ٹیکسی میں سفر کرنے کے بجائے بس کو ترجیح دیتا ہے۔ اور پھر اس نے کبھی فضول خرچی نہیں کی اور نہ ہی شامیں ہوٹلوں کی نذر کرتا رہا ہے۔ اس شہر کا موازنہ امریکہ کے کسی بھی شہر سے کیا جاسکتا ہے۔

درگا نے چندرادپوی سے کہا۔ ”اگر امریکہ ایسا ہے تو اس کا بڑا بیٹا یقیناً ایسی زندگی گزارے گا..... اور بلا خرام کی شہری بننے کے بعد مجھے اور میرے شوہر کو بھی بلا لے گا تا کہ وہ بھی اس نوابوں کی عمری کے حرے لوٹ سکیں..... لیکن میں یہ سوچتی ہوں کہ مستقبل تو یہاں بھی ہے..... کیا ہزاروں..... اور لاکھوں نے اپنا مستقبل نہیں بنایا..... پھر ترک وطن کرنے کی ضرورت کیا ہے؟“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں.....“ چندرادپوی نے تائیدی لہجے میں کہا۔

اگلی صبح جب وہ دفتر پہنچی تو اس عورت نے بتایا کہ بلا خرام نے کاغذات ڈھونڈ لئے ہیں۔ ایک سو روپے دراز میں ڈال دو۔

”وہ کس لئے.....!“ درگا حیرت اور غصے سے بولی۔ ”کل میں نے دو سو روپے..... دراز میں ڈال دیئے تھے.....“

”اس لئے کہ کاغذات مل گئے..... کیا اس خوشی میں منہ میٹھا نہیں کراؤ گی.....؟ مٹھائی جو کھاؤ گی.....؟“

اس نے دراز میں رقم ڈالتے ہوئے دیکھا۔ دراز نوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ شاید اس میں کل کی رشوت کی رقم تھی۔ جو عورت کسی وجہ سے لے جانہ سکتی تھی..... درگا کا خون اس وقت کھول کر رہ گیا جب اس میں ایک فارم کم تھا..... یہ فارم آئی 15 کے انتظامی شعبے سے ملتا تھا..... اس فارم کو پر کر کے اس کی تصدیق کروانی تھی اور واپس انتظامی شعبے میں جمع کروانا تھا..... یہ شعبہ پانچویں منزل پر تھا۔ وہ کمرے سے نکلنے والی تھی کہ ایک عورت جو اس سے عمر میں تین چار برس بڑی ہوگی کمرے میں داخل ہوئی۔ پھر اس عورت سے بولی۔

”میری ترقی کا کیا ہوتا.....؟ میں چھ برس سے خوار ہو رہی ہوں۔ میرے کاغذات آ خر کب لیں گے؟“

”کاغذات اس صورت میں ملیں گے کہ تم پانچ سو روپے دراز میں ڈال دو..... اور پھر تمہیں نین دن انتظار کرنا ہوں گے.....؟“

”کیا.....؟“ عورت کو جیسے بجلی کا سنسنا دینے والا جھٹکا لگا۔ ”کس بات کے اور کس منہ سے تم پانچ سو روپے مانگ رہی ہو.....؟“ میں نوریلیا سے دو دراز کا سفر کر کے آئی ہوں..... ایک بار تین دو روپے خرچ ہو جاتے ہیں..... میں جب بھی آئی تم نے منہ کھول دیا..... میں اب تک چار ہزار روپے دے چکی ہوں..... آخر تم لوگ خط لکھ دیتے ہو..... جب آتی ہوں تو رخا دیتی ہو..... میں

”یہ افسر بہت بڑی رشوت خور ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسی خبیث اور لالچی عورت نہیں دیکھی۔“ وہ عورت تلخی سے کہنے لگی۔ ”میں بتا نہیں سکتی کہ اس چڑیل کو دولت کی کتنی ہوس ہے۔ وہ دولت کے لئے نہ صرف اپنا دھرم بلکہ اپنی جوان بیٹیوں کو بھی فروخت کر دے گی۔ آپ نے کس طرح سے یہ رقم اس چڑیل سے وصول کر لی؟“

”بات یہ ہے کہ میں اسٹی کرپشن کی انسپکٹر ہوں۔ میں یہاں اس سے پوچھ چکے کے لئے آئی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ تم اپنی خیر چاہتی ہو تو اس عورت کی فائل دے دو۔ اس فائل میں تمام فارم ہونے چاہئیں۔ اگر ایک فارم بھی کم ہوا تو تمہاری خیر نہ ہوگی۔ تم مجھے بیس ہزار روپے دے دو۔ ورنہ ابھی گرفتار کروادوں گی۔ اس نے فوراً ہی بیس ہزار کی رقم دے دی۔“ چندرادپوی نے کہا۔

”لیکن کمرے میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔؟ نہ میں نے آپ کو دیکھا تھا۔؟ آپ نے گفتگو کیسے سن لی۔؟“

”میں نے اس وقت دروازہ تھوڑا سا کھولا تھا۔ آپ دونوں کی گفتگو سن کر دہلے پرک گئی۔ آپ دونوں کی پشت میری طرف تھی۔ اس لئے آپ دیکھ نہ سکیں۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ آپ اندر جائیں۔ رقم دے کر فائل لے لیں۔“ چندرادپوی بولی۔

جب وہ عورت اندر داخل ہوئی تو اس افسر عورت نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ ”تم کیوں آئی۔؟“

”یہ لو تین سو روپے۔ لیکن فائل مجھے ابھی اور اسی وقت چاہئے۔ ابھی فائل مل گئی تو تمہیں مضائقہ کے دو سو روپے اور دوں گی۔؟“

”تم نے چند تھوڑے میں رقم کا کیسے بندوبست کر لیا۔؟“ وہ تھیر زدہ ہو کر اٹھی۔ اس نے عورت سے رقم دراز میں ڈالنے کے لئے کہا۔ پھر اس نے الماری کھولی۔ اس کے تمام خانوں میں فائلیں بڑے سلیقے اور قرینے سے رکھی ہوئی تھیں پھر اس نے دس فائلوں کا بٹل نکالا۔ اس میں سب سے اوپر اس عورت کی فائل رکھی تھی۔ اس نے وہ فائل نکالی۔ بٹل الماری میں رکھ کر بند کر دی۔

”تمہاری قسمت اچھی تھی جو تمہاری فائل سب سے اوپر رکھی تھی۔“ اس کینی عورت نے اس عورت کی طرف فائل بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اسے چیک کر لو۔ اس میں کوئی کاغذ یا فارم تو غائب نہیں ہے۔؟“

اس عورت نے فائل کھول کر اس کا مطالعہ کیا۔ اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور بولی۔

”میری قسمت کی بات نہیں بلکہ رشوت کے جادو کے باعث یہ فائل مل گئی۔ تم نے مجھے

یہاں کہاں ٹھہرتی۔۔۔ یہاں میرا کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔۔۔ میں ہوٹل میں نہیں ٹھہر سکتی۔۔۔ میرے پاس صرف تین سو روپے ہیں۔ ہاں۔۔۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے ہاں ٹھہر جاؤں۔۔۔ بیس برس سے تم رشوت کھا رہی ہو۔۔۔ تمہارے پاس بڑی دولت اور بڑا گھر ہے۔۔۔“

”شٹ اپ۔۔۔“ وہ عورت بگڑ گئی۔ ”اصل بات یہ ہے کہ تمہارے کاغذات دفتر کے ایک شخص نے دبا رکھے ہیں۔ وہ پانچ سو روپے مانگ رہا ہے۔ تم پانچ سو دے دو۔ اس میں تمہارا فائدہ ہے۔ ترقی کے ساتھ ساتھ چالیس ہزار کی رقم بھی مل جائے گی۔ تمہارے سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔۔۔“

درگا کمرے سے نکلی۔ یہ شعبہ پانچ ویں منزل پر تھا۔ لفٹ کام نہیں کر رہی تھی۔ لہذا اسے سیڑھیوں کے راستے جانا پڑا۔ جہاں سگریٹ کے ٹوٹے۔ پان کی پیک اور گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ دیواروں پر انگش فلوں کے نامناسب پوسٹرز جس میں اداکارائیں عریاں حالت اور جذباتی انداز میں تھیں۔

جس وقت درگا سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھی تب چندرادپوی نے دراز سے رقم نکال لی اور گئی۔ وہ بیس ہزار روپے تھے۔ نوریلیا سے آئی ہوئی عورت رو رہی تھی۔ چندرادپوی نے ظاہر ہو کر کہا۔

”بہن یہ لو بیس ہزار کی رقم ہے۔ ابھی اور اسی وقت جا کر اس عورت کے منہ پر دے مارو اور کہو کہ کاغذات دو۔۔۔ میں تو تمہیں مزید دو سو روپے اور دوں گی۔۔۔ وہ پوچھے گی کہ یہ رقم کہاں سے آئی۔۔۔ کہنا کہ میری بہن نے کرائی ہے۔۔۔“

”یہ رقم۔؟“ اس کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ”آپ کس لئے مجھے دے رہی ہیں۔؟“

میں تو آپ کو جانتی ہی نہیں ہوں۔۔۔ یہ بہت بڑی رقم ہے۔ اگر یہ فرض ہے تو میں نہیں لوں گی۔۔۔“

”یہ قرض نہیں ہے آپ کی رقم ہے۔“ چندرادپوی بولی۔

”میری رقم۔؟“ اس کا چہرہ سوالیہ نشان بن گیا اور آنکھوں میں حیرت بھر گئی۔ ”یہ کہاں سے آئی۔؟“

”آپ نے اب تک ترقی کے خط کے لئے جو چکر لگائے اور خرچ کیا۔۔۔ یہ اس رقم کو معہ سود میں نے اس سے وصول کیا ہے۔“ چندرادپوی بولی۔ ”اس دفتر میں رشوت کا کاروبار دوڑوں پر ہے۔ ساری رشوت اس عورت کی میز کی دراز میں جمع ہوتی ہے اور شام کے وقت عملہ آپس میں بانٹ لیتا ہے۔۔۔ جو بھی رشوت لے کر کام کرتا ہے۔ ایک چٹ کے ساتھ اس عورت کے کمرے میں بھیج دیتا ہے۔ تاکہ وہ اس کے پاس رقم جمع کرا دے۔“

بہت ڈرایا اور خار کیا..... خرچ کروایا..... جو جتنی اذیت پہنچائی میں اسے کبھی بھول نہیں سکتی..... میں زندگی کی آخری سانس تک بددعا دیتی رہوں گی۔“

انتاکہ کہہ کر وہ باہر آئی..... تاکہ چندرا دیوی کا شکریہ ادا کر سکے۔ لیکن چندرا دیوی وہاں نہیں تھی..... اس نے بہت تلاش کیا۔ وہ اس کی محسن اور دیالوتھی۔ اس کے کارن اس نے آخر اپنی منزل پائی تھی۔ وہ اسے دل میں دعا کیں دیتی اور روتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی۔

درگا اس شخص کے پاس پہنچی جس سے اسے فارم لینا تھا۔ وہ خاصا فکر مند تھا۔ اس نے بڑی شائستگی سے کہا۔

”شریمتی جی..... آپ پھر کل سہ پہر کے وقت زحمت کریں..... کیوں کہ ہمارے پاس فارم ختم ہو گئے ہیں۔ کل تک نئے فارم چھپ کر آجائیں گے۔“ میں صرف اس کام کے لئے پال کیلے سے آئی ہوں.....“ اس نے احتجاج کیا۔

معاں اس کی نگاہ میز پر پڑی۔ وہی پرانا حربہ..... اس شخص کی میز کی دراز قدرے کھلی ہوئی تھی۔ اس میں سے نوٹ جھانک رہے تھے۔ اس کے پرس میں سواور پچاس کے نوٹ تھے۔ اگر اسے چندرا دیوی نہ ملتی تو بھگوان جانے کتنی رقم خرچ ہوتی..... اور اسے کتنی تکلیف ہوتی..... اس نے پچاس کا نوٹ نکال کر خود کو نصیحت کی اور سمجھایا کہ رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا ہے۔ اس نے پچاس کا نوٹ دراز میں ڈال دیا۔

پلیز!..... میری خاطر زحمت کر کے فارم ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔ ایک فارم کی تو بات ہے شاید ادھر ادھر پڑا ہوا مل جائے..... مجھے بہت جلدی ہے..... میں نے آپ کا خیال کیا..... آپ ذرا میرا بھی خیال کر لیں۔“

اس شخص نے مسکراتے ہوئے دراز بند کی..... میز کے پیچھے ایک زنگ آلود الماری جو تھی اس کے پاس گیا۔ اسے فارم کی تلاش میں لحد بھر لگا۔ پھر اس نے فارم نکال کر بڑھا دیا۔

درگانے فارم کے مندرجات کا مطالعہ کیا۔ جو ایک شائستگی سوال نامہ تھا..... شاید خفیہ ایجنسیوں کے کچھ لوگ دوبارہ سرکاری ملازمین کی سیاسی سابقہ وابستگیوں کی جانچ پڑتال کر رہے تھے۔ حالاں کہ ہر دفتر میں پہلے ہی حکومت کا ایک خفیہ ایجنٹ یا مخبر ان کے نئے ٹائپسٹ کی طرح تھے۔ حکومت نائل ناڈو کی تنظیم کے کسی فرد کو پسند نہیں کرتی تھی۔

اس نے جلدی جلدی فارم پر کیا۔ بیرون ملک سفر کے خانے کو دیکھ کر وہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی۔ کتنے سرکاری ملازمین اپنی زندگی میں بیرون ملک گئے ہوں گے..... وہ تو کبھی سری لنکا کے جزیروں پر بھی نہیں گئی ہوگی۔ وہ لوگ شاید اس فارم میں مہیا کردہ معلومات کو کمپیوٹر میں محفوظ کر لیں گے.....

بھگوان جانے اس کے بعد کیا ہوگا۔

اپنے تعلیمی کوائف..... ملازمت شروع کرنے کی اور اس قسم کی دوسری دستاویزات پر نظر دوڑاتے درگانے اس حقیقت پر غور کیا کہ اس نے اپنے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود کسی بڑے عہدے کی خواہش نہیں کی تھی..... حالاں کہ خواتین نہ صرف بیدرداؤں کیئر بلکہ نائب وزیر تک کے عہدوں پر فائز تھیں۔ وہ اپنی حالت پر افسوس کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہ اور اس کا شوہر اپنے حدود سے آگاہ تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ انہیں اپنی حالت سنوارنے کے لئے کیا کیا قربانیاں دینی پڑیں گی۔ ان کے لئے یہی کافی تھا کہ ان کے پاس اپنا گھر تھا اور وہ پرسکون نیند سو سکتے تھے۔ انہیں ایسے ڈراؤنے خواب بھی تنگ نہیں کرتے تھے۔ جنہیں وہ غلط کاریاں جنم دیتی ہیں جو انہیں اپنی حالت بہتر بنانے کے لئے کرنا پڑتیں۔

وہ انتظامی شعبے کے چیف کے پاس گئی۔ اسے پوری طرح یقین نہیں تھا کہ اس نے فارم صحیح طور پر کیا ہے..... مگر اسے اس کی کیا پڑی تھی۔ فارم میں کوئی غلطی پکڑنے میں انہیں کچھ وقت لگتا اور اس کے پاس جواب یہ تھا کہ وہ اپنی ترقی کے سلسلے میں دو دن سے ماری ماری پھر رہی تھی اور اسے ابھی تک ایک بھی تصدیق شدہ تحریر نہیں ملی تھی۔ خوش قسمتی انتظامی شعبے کا چیف زیندا اپنے دفتر میں موجود تھا۔ وہ تقریباً آٹھ برس قبل ایک تعلیمی سیمینار میں مل چکے تھے اور درگا کو اس کا گنجائش سروسٹو جیسی ناک اور پٹے ہونٹ یاد تھے۔ زیندا ایک ایمان دار ماہر کی حیثیت سے مشہور تھا اور اب درگا کو اس بات کی صداقت کا پتا لگنا تھا۔

اس کی باری آئی وہ باہر پڑی ہوئی بیچ سے اٹھ کر اندر گئی۔ زیندا کی میز کے قریب گئی۔ اس کے صوب میں دیوار میں ملک کے صدر اور اس کی بیوی کی تصویروں آویزاں تھی۔

”جی آپ کا کیا مسئلہ ہے.....؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے درگا کو دیکھا۔

”میری ترقی سر.....!“ درگانے جواب دیا۔ ”یہ پانچ برس زیر التوا ہے۔“ درگانے کا غذات اس کے سامنے رکھ دیئے۔ چیف زیندا نے تجربہ نگاہوں سے اس فارم کا معائنہ کیا۔

”سسر درگا جوشی.....! یہاں تو سب کچھ ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو طریقہ کار معلوم ہے۔ میری تصدیق کے بعد شعبہ مالیات میں یہ پتا کرنا کیا فنڈ دستیاب ہیں.....؟ اگر فنڈ فنڈ دستیاب ہیں پھر وزیر اس پر دستخط کر دے گا اور آپ کی تنخواہ میں سال کے پہلے مہینے سے تین ہزار کا اضافہ ہو جائے گا.....“ وہ دوبارہ فارم کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے دوسرے صفحے پر بگلت سے لکھا تھا۔ ”میں جانتا ہوں کہ آپ بہت عرصے سے ملازمت کر رہی ہیں اور مجھے آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ افسر شاہی کو ایک انچ بھی ہلانے میں ان کے ساتھ ممبر محل سے پیش آنا چاہئے۔“

اب وہ کمرے میں اکیلے تھے۔ ”کیا یہ کافی ہے سر؟“
”کیوں کیا کچھ اور بھی جو میں بھول گیا ہوں۔“

اپنی بدحواسی میں درگا اس کا شکریہ ادا کرنا بھی بھول گئی۔ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا چیف زیندرا اچھا آدمی ہے۔ اور سوچا کہ وہ اسے گیمبر ڈین کا دوسرا بیس دیدیے جو اس نے اپنے پتی کے لئے خریدا تھا تو وہ کیا محسوس کرے گا۔۔۔۔۔؟ آخر اس نے اس کی پانچ برس کے پہلے مہینے نے اضافہ کیا تھا اور اس کے احکامات جاری کر دیئے تھے۔

باہر چندرا دیوی اس کے انتظار میں تھی۔ ان دونوں نے دوپہر کا کھانا وزارت کی کینٹین میں کھایا تھا۔ اس نے چندرا دیوی چیف سے ملاقات کا احوال بتایا۔ ڈیڑھ بجے وہ دونوں شعبہ مالیات میں تھیں۔ لیکن چندرا دیوی باہر ہی رہی تھی۔ بہت سی لڑکیاں میزوں پر خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔۔۔۔۔ کچھ اخبار پڑھ رہی تھیں۔۔۔۔۔ کچھ خلا میں فکری مندی سے گھور رہی تھیں۔ یہ بڑا ہی مانوس منظر تھا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ واپس اپنے دفتر کے ماحول میں آگئی ہو۔ چیف کے دفتر سے معلوم ہوا کہ وہ واپس نہیں آ رہا ہے۔ وہ وزیر کے ساتھ بحث پر ہونے والی میٹنگ میں شرکت کے لئے وزیراعظم ہاؤس گیا ہوا ہے۔

اسے ٹھہرنے اور انتظار کرنے میں کوئی تکلیف نظر نہ آئی۔ چندرا دیوی نے اس کو فلم گاٹی ٹیک یہ انگریزی فلم بڑی مقبول تھی۔ شہر کے سب سے مہنگے ترین سینما ہال میں چل رہی تھی۔ جس کا کم از کم ٹکٹ دوسروں کے لئے تھا۔ چندرا دیوی نے سب سے مہنگے ترین درجے کا ٹکٹ لیا۔ اس سینما ہاؤس میں اس کی فلم دیکھنے کی بڑی تمنا تھی۔ اتنا خوب صورت اور شاندار سینما ہال پورے ملک میں ایک ہی تھا۔ پانچ برس کے بعد اس نے یہ فلم دیکھی تھی۔ جو بڑا المیہ تھی۔

اگلی صبح نو بج کے دس منٹ کے بعد درگا شعبہ مالیات میں موجود تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ بہت ہی خوب صورت اور نوجوان لڑکیاں ملازم ہیں۔ بھڑکیلے اور نیچی تراش کے لباس جو بہ ظاہر کچھ بھی نہیں کرتیں۔۔۔۔۔ ساڑھے نو بجے چیف دشوانا تھ آ گیا۔ وہ بادامی رنگ کے گیمبر ڈین سوٹ میں لمبوس تھا۔ اس کا شمار باثر ترین افراد میں ہوتا تھا۔ درگانے شیشے کی کھڑکی سے دیکھا۔ وہ اپنی میز پر بیٹھ چکا ہے۔ اندر چلی گئی۔ شعبہ مالیات کا چیف دشوانا تھ فائلیں دیکھ رہا تھا۔ اور پاکٹ سائزر کلکولیٹر پر حساب کتاب دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس نے درگا کو دیکھا اس کی آنکھیں باہر کو مائل پڑیں اس کے مونے اور بعد ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ آئی۔ ”جی۔۔۔۔۔“

درگانے کم سے کم الفاظ میں اہلادعا بیان کیا لیکن وہ یہ بتانا نہیں بھولی کہ وہ صرف اس کام کے لئے پال کیلے سے چھٹی لے کر آئی ہے۔

”آپ اپنے کاغذات چھوڑ جائیں۔“ اس نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں ذرا جلدی میں ہوں۔۔۔۔۔ آج سیکریٹریٹ میں میٹنگ ہے سارا دن میں نہیں آؤں گا۔ آپ شام کو پانچ بجے دوبارہ آ کر مل سکتی ہیں۔“ اس نے دوسرے سرکوزیشن دی جو اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ جاسکتی ہے۔

درگا کے پاس پورا دن فارغ تھا۔۔۔۔۔ اب وہ نئی ہندوستانی فلم دیکھنا چاہتی تھی۔ ہندوستانی فلمیں ذہنی سکون بخشتی تھیں۔ اس میں بولڈ مناظر تھے۔ بہر حال وہ اپنے کچھ دوسرے ساتھی ملازمین سے خوش قسمت تھی جو ایک ہفتے تک انتظامی شعبے سے کاغذات کی تصدیق بھی نہ کرا سکے۔ اس کے علاوہ دوسری وزارتوں میں اس سے بھی برا حال تھا۔ مثال کے طور پر اس کی ایک شناسا انسان کو صرف اپنا تبادلہ کرانے کے لئے دو ہزار روپے دینے پڑے تھے۔۔۔۔۔ اور چندرا دیوی میساج تھی۔

وہ ابھی عمارت کے بیرونی دروازے تک پہنچی تھی کہ بوندا باندی شروع ہو گئی۔ اس نے وزارت منصوبہ بندی و تعلیم۔۔۔۔۔ جہاں اس کے کچھ دوست ملازم تھے فلم دیکھنے جانے کے بجائے عمارت ہی میں ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔

تین بجے درگا دفتر سے ملحقہ انتظار میں چندرا دیوی کے ساتھ جا بیٹھی۔ اس کے اپنے دفتر میں پرانی وضع کے ٹائپ رائٹر تھے۔ پونے پانچ بجے چیف دشوانا تھ واپس آ گیا۔ اس کا قیمتی جری بریف کیس کاغذات سے بھرا ہوا تھا۔ چیف نے اس سے کہا کہ آج رات چائینیز ریسٹورنٹ میں اسے ڈنر کھلائے۔ وہاں صرف پانچ سو خرچ آئے گا۔

وہ رات آٹھ بجے چندرا دیوی کے ساتھ اس ریسٹورنٹ پر پہنچی۔ اس سے کہا کہ وہ اکیلی چلی جائے۔ ڈنر کے بعد چیف نے اس سے کہا۔

”آج کی رات ہم دونوں ایک کمرے میں بند ہو جائیں گے۔۔۔۔۔ صرف ہزار روپے کی بات ہے۔“

”سر! آپ جانتے ہیں کہ میں ایک غریب کلرک ہوں۔۔۔۔۔ میرے پاس اب صرف پانچ سو روپے بچے ہیں۔“

چیف نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر دبا یا۔ ”تم چھتا نہ کرو۔ کسی ہوٹل میں چلیں گے۔۔۔۔۔ وہاں کرایہ صرف پانچ سو ہوگا۔“

درگانے جو کچھ سنا ہوا تھا وہ اس پر یقین کرنا نہیں چاہتی تھی۔ پھر اسے یاد آیا۔۔۔۔۔ مشہور تھا کہ شعبہ مالیات کا چیف عورتوں کا رسیا ہے اور اکثر اس صورت میں رشوت وصول کرتا ہے۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔ میرا انکار ضروری ہے۔۔۔۔۔ اس نے خود سے کہا۔ بے چینی اور خوف سے اس کا دل گھٹ رہا تھا۔ اس نے اپنے لئے صرف نیوڈلز منگوائیں جو سب سے سستی چیز تھی۔

”سر.....! میرے تین بچے ہیں۔“ درگا قریب قریب رودی۔“ میرا سب سے بڑا بچہ شادی شدہ ہے اور میرا ایک پوتا بھی ہے۔

”یہ تو حیرت انگیز بات ہے کہ تم اتنی عمر کی نہیں لگتیں..... دوشیزہ معلوم ہوتی ہو جس کی ابھی شادی نہیں ہوئی۔“ اس نے بھوک نظروں سے اس کے جسمانی نشیب و فراز کو دیکھا۔

چیف نے وہ سکی منگوائی درگا کا گلا خشک ہو چکا تھا۔ اس کا مستقبل داؤ پر تھا۔ ہر حال میں اس شیطان کو خوش کرنا تھا۔ کوئی حربہ عزت بچانے کا نہیں رہا تھا۔ نہ ہی فرار کی کوئی راہ رہی تھی۔ اس کے آگے مزاحمت بیکار تھی۔

اس نے دو گلاسوں میں وہ سکی بھری اور ایک گلاس درگا کی طرف بڑھایا۔ ”لو پی لو.....“

”میں نے کبھی وہ سکی نہیں پی سرائے۔“ وہ بولی۔

چیف نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ پھر اس سے بولا۔ ”واش روم میں جا کر.....

نہا کر آ جاؤ۔“

وہ تھوڑی دیر بعد باہر آئی تو اس نے ایک عجیب سا منظر دیکھا۔ چیف بستر پر بے لباس پڑا تھا۔ اس کا جسم چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ خراٹے لے رہا تھا۔ گہری نیند میں غرق تھا۔ درگا واش روم میں گئی۔ کپڑے پہن کر آئی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

چیف کوئی دو گھنٹے بعد بیدار ہوا..... پھر اس نے کہا۔ ”درگا.....! تم نے مجھے جس فیاضی سے خوش کیا..... میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتا..... تم نے اتنی جلدی لباس بھی پہن لیا..... کوئی بات نہیں..... چلو..... اب چلتے ہیں.....“ وہ بستر سے اتر کر کپڑے پہنے لگا۔ ”میں نے اب تک ایسا بدن کسی عورت اور لڑکی کا نہیں دیکھا.....“

درگا سمجھ گئی کہ وہ سکی نے اس پر اثر کیا..... نشے کی حالت میں اس نے جو پسند دیکھا وہ اسے حقیقت سمجھ بیٹھا..... وہ دل میں خوش تھی کہ اس سپنے کے کارن اس کی عزت ایک بھیڑیے کے ہاتھوں بچ گئی۔ اس کا مستقبل بھی داؤ پر نہیں لگا۔

چیف نے اسے ہوٹل سے نصف فرلانگ کے فاصلے پر اتارا تو وہ پیدل پہنچی۔ اس نے کمرے کے دروازے کا پینڈل گھمایا تو دروازہ کھل گیا۔ چندرا دیوی نے اندر سے بند نہیں کیا ہوا تھا۔ وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا چندرا دیوی کو اعتماد میں لے کر بتا دے کہ اس کی عزت کیسے بچ گئی۔ اس نے واقعہ کے بارے میں بتانے سے خاموش رہنا۔ چندرا دیوی اس کے بارے میں کیا رائے قائم کرے گی.....؟

صبح نو بجے وہ چندرا دیوی کے ساتھ دفتر پہنچی۔ رسی کارروائی کے بعد اسے ساٹھ ہزار کی رقم

بڑے نوٹوں کی شکل میں مل گئی۔ اس نے نوٹ اپنے بڑے تھیلے میں رکھ لئے۔ شام چھ بجے وہ دونوں بس سے اتریں۔ درگانے چندرا دیوی کو اس کے ہاں دو تین دن رکنے کی دعوت دی گئی۔ وہ پال کیلے کے نواح میں رہتی تھی۔ اس کا گھر دس منٹ کی مسافت پر تھا۔ اس نے تین مشکوک آدمیوں کو بس سے اترتے دیکھا تھا۔ انہوں نے کچھ راستہ طے کیا تھا کہ ان تینوں بد معاشوں نے جو پستول اور ریواوروں سے مسلح تھے ان دونوں کو زخمی میں لے لیا۔

”لاؤ یہ بیک ہمارے حوالے کر دو.....“ ایک غرایا۔ ”ورنہ تم دونوں کو شوٹ کر دوں گا۔“

”اس بیک میں ضروری کاغذات ہیں۔“ درگانے کہا۔ ”صرف سو روپے پڑے ہیں۔“

”جھوٹ مت بولو۔“ دوسرے نے چاقو لہرایا۔ ”رقم میں نے خود گمن کر نہیں دی تھی.....“

درگانے اسے پہچان لیا..... چندرا دیوی اس سے بولی۔ ”تم بیک اسے دے دو..... یہ زندگی اور مستقبل سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔“

”لیکن..... لیکن.....“ وہ کھلائی۔

”تم میری بات مانو..... ذرا تماشا دیکھو.....“ چندرا دیوی نے سرگوشی کی۔

”قدرے تذبذب سے اس نے رقم والا بیک پستول والے بد معاش کی طرف اچھال دیا۔ اس نے بیک لے کر اس کی زپ کھولی۔ اس میں نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر باچیس کھل گئیں۔ اس نے بیک میں ہاتھ ڈالا تا کہ گڈیاں نکالیں۔ اسے ایسا لگا جیسے پھوؤں نے ڈک مارا ہو۔ اس نے ایک چیخ مار کر ہاتھ باہر نکالا۔ اس کے ہاتھ سے خون رس رہا تھا۔ اس نے پرس زمین پر پھینک دیا تو اس میں سے بہت سارے پھو اور سانپ نکل آئے۔ وہ تینوں بد معاشوں کی طرف بڑھے۔ پستول والے نے انہیں نشانہ بنانا چاہا تو اس کے ہاتھ میں پستول کی جگہ ایک سانپ تھا۔ وہ ہاتھ جھٹک کر بھاگا تو اس کے ساتھی بھی بھاگ لیے۔

ان کی نظروں سے بد معاشوں کے اوجھل ہوتے ہی سانپ اور پھو نوٹوں کی گڈیوں میں تبدیل ہو گئے۔ چندرا دیوی نے اس کے پرس میں نوٹوں کی گڈیاں اٹھا کر ڈال دیں اور اس کا منہ بند کر کے اسے لوٹا دیا۔

پھر وہ چندرا دیوی کے سینے پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ کچھ دیر بعد بولی۔

”آپ کی وجہ سے میں دوسرے بد معاشوں سے بچ گئی..... آپ نہ ملتیں تو بھگوان جانے کیا ہوتا.....؟“

اس نے اپنے آنسو ساڑی کے پلو میں جذب کئے۔ پھر وہ جب کہ اس کے چرن چھونے لگی تو

چندرا دیوی نے جھک کر شانے پکڑ کر اسے اٹھایا۔

”یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟“

”میں اپنی دیوی کے قدم چھونا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔۔ رات میں آپ کے کارن ہوٹل میں میری عزت بچ گئی۔“

”وہ کیسے؟“ چندرا دیوی نے انجان ہو کر کہا۔

”آپ بھی ہوٹل کے اس کمرے میں آگئی تھیں جس میں مجھے چیف میری عزت سے کھیلنے کے لئے گیا تھا۔۔۔۔۔۔ آپ غائب حالت میں موجود تھیں۔۔۔۔۔۔ آپ نے اس پر جادو کیا تو وہ گہری نیند میں سو گیا۔ سنے میں اس نے میرے ساتھ وقت گزاری کی۔۔۔۔۔۔ بیدار ہوا تو وہ یہ سمجھا کہ یہ پہنا نہیں حقیقت تھی۔۔۔۔۔۔ اب میں نے جان لیا کہ آپ جادو کرنی ہیں۔ کیا آپ کو اس سے انکار ہے؟“

”درگا۔۔۔۔۔۔! آپ بہت ذہین اور ہوشیار ہیں۔۔۔۔۔۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”لیکن یہ بات کسی کو نہ بتائیں۔۔۔۔۔۔“

”آپ نے کولیو میں اور یہاں بد معاشوں کو جو سبق دیا وہ بھی آپ کے جادو کا ہی کمال تھا۔“ درگانے کہا۔

”چلو۔۔۔۔۔۔ گھر چلو۔۔۔۔۔۔ بچے اور تمہارا شو ہر بے چینی سے تمہارے مختل ہیں۔۔۔۔۔۔“

جب درگا گھر پہنچی تو اس کے شو ہر اور بچوں نے اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ چندرا دیوی کو حیرت سے دیکھا۔

”یہ میری محسن ہیں۔۔۔۔۔۔“ درگانے شو ہر اور بچوں کو بتایا۔ ”میں بعد میں بتاؤں گی کہ انہوں نے مجھ پر کیا احسانات کئے ہیں۔“

دوسرے دن صبح دس بجے چندرا دیوی۔۔۔۔۔۔ درگا اور اس کا شو ہر چالیس ہزار کی رقم لے کر سود خور رٹگا سوامی کے ہاں پہنچے تاکہ رہن رکھی ہوئی چیزیں اور جائیداد کے کاغذات واپس لے لیں۔ چالیس ہزار کی رقم کی ادا ہوئی کر کے۔۔۔۔۔۔

رٹگا سوامی صاف کر گیا۔ ”اب میں کوئی چیز نہیں دے سکتا۔۔۔۔۔۔ اس لئے کہ مدت گزر چکی ہے۔“

”کیا کہا۔۔۔۔۔۔؟“ جوشی کو غصہ آ گیا۔۔۔۔۔۔ ”جائیداد تین لاکھ۔۔۔۔۔۔ زیورات دو لاکھ۔۔۔۔۔۔ قیمتی اشیاء ایک لاکھ کی ہیں۔۔۔۔۔۔ تم چالیس ہزار میں ہڑپ کرنا چاہتے ہو۔ یہ تمہارے باپ کا مال نہیں ہے۔۔۔۔۔۔“

”ہاں میرے باپ کا مال ہے۔۔۔۔۔۔ جو کر سکتے ہو کر لو۔۔۔۔۔۔ نکل جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔۔“ رٹگا سوامی اڑ گیا۔

”چلئے۔۔۔۔۔۔ ہم اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں گے۔“ چندرا دیوی بولی۔

پھر وہ میاں بیوی کو سمجھا بجا کر بولی۔ ”ہمارے پاس قانونی راستہ ہے۔۔۔۔۔۔“

”رٹگا سوامی۔۔۔۔۔۔ ایک حرام زادہ ہے۔۔۔۔۔۔ وہ اب تک سینکڑوں لوگوں کا مال بغیر ڈکار لئے ہضم کر چکا ہے۔ ہر کسی کی آہ لیتا رہتا ہے۔۔۔۔۔۔ کسی دن یہ آہ تمہیں لگ جائے گی۔۔۔۔۔۔“ درگا بولی۔

”یہ ڈکیتی کے خوف سے ارہن کا مال اور کاغذات بینک لاکرز میں رکھتا ہے۔“ واپسی میں جوشی نے بتایا۔ ”اس نے تین الگ الگ بینکوں میں لاکرز لے رکھے ہیں۔ ایک بینک کے لاکرز میں نوٹوں کی گڈیاں ہیں۔۔۔۔۔۔ اور گھر میں جو تجوری ہے وہ بھی نوٹوں اور رہن رکھے زیورات سے بھری ہوئی ہے۔ یہ بیس برس سے یہاں کے لوگوں کا مصل کی طرح خون چوس رہا ہے۔“

رات دس بجے چندرا دیوی نے درگا اور اس کے شو ہر کو اپنے کمرے میں بلایا۔ یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں کہ۔۔۔۔۔۔ بستر پر نوٹوں کا ڈھیر کاغذات۔۔۔۔۔۔ زیورات اور بہت ساری چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔

”یہ کیا ہے۔۔۔۔۔۔؟“ جوشی نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ سب ان لوگوں کا مال ہے جو کسی مجبوری کی بنا پر رٹگا سوامی کے پاس سود پر قرض لیتے رہے۔۔۔۔۔۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”آپ اس میں سے اپنے کاغذات، زیورات اور قیمتی اشیاء نکال لیں۔۔۔۔۔۔ اور وہ رقم بھی جو اب تک سود کی مد میں ادا کی گئی۔۔۔۔۔۔ پھر آپ متاثرہ لوگوں کو ان کی امانتیں اور کاغذات لوٹا دیں۔۔۔۔۔۔ اور ان سے کہنا کہ اپنی زبانیں بند رکھیں۔۔۔۔۔۔“

”اگر یہ بات چھپی نہ رہے تو کیا تجوری کا الزام نہیں آئے گا۔۔۔۔۔۔؟“ جوشی نے کہا۔

”نہیں۔۔۔۔۔۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”اس لئے کہ یہ سارا مال بینکوں کے لاکرز میں تھا۔۔۔۔۔۔ اس کی تجوری میں بھی۔۔۔۔۔۔ بینک یہی کہے گی کہ ہم کو کیا معلوم۔۔۔۔۔۔ لاکرز تو صحیح سلامت ہیں۔۔۔۔۔۔ متاثرہ لوگوں کے خلاف اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔۔۔۔۔۔“

”لیکن۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہوا۔۔۔۔۔۔؟“ جوشی نے حیرت سے کہا۔

”جادو سے۔۔۔۔۔۔“ درگا بولی۔ ”آپ ہندوستان کی بہت بڑی جادوگرانی ہیں۔۔۔۔۔۔ سری لنکا کے دورے اور سیاحت پر آئی ہوئی ہیں۔“

”آپ کے اس جادو نے ہم سب اور متاثرہ لوگوں پر جو احسان کیا ہم کبھی بھول نہ سکیں گے۔۔۔۔۔۔“ جوشی نے ممنونیت سے کہا۔

”پتا جی..... پتا جی.....“ کمرے کے باہر سے اس کے لڑکے نے کہا۔ ”رنگا سوامی کے مکان میں آگ لگی ہے.....“

ان لوگوں نے باہر آ کر دیکھا۔ اس کا مکان شعلوں کی نذر ہو رہا تھا۔ رنگا سوامی باہر کھڑا مدد کے لئے چیخ رہا تھا۔ کوئی بھی اس کی مدد کو نہیں بڑھا۔

کل پیا لیس متاثرہ لوگ تھے۔ دوسرے دن ان سب کو ان کے سود کی رقم، کاغذات، اور رہن کی چیزیں دے دی گئیں۔ وہ خوش خوش ہنستے ہوئے گئے تھے..... رنگا سوامی وحوش کو بے بیٹھا تھا۔

دوسرے دن درگا..... چندرا دیوی کے کمرے میں ناشتے کے لئے بلانے گئی تو وہ موجود نہیں تھی۔

☆.....☆.....☆

چندرا دیوی خونی مجسمے کی تلاش میں تھی۔ وہ اس قدر خوف زدہ اور دہشت زدہ ہو گیا تھا کہ چندرا دیوی سے سامنا کرنے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے اور چندرا دیوی کو ختم کرنے کے لئے روپ بہروپ بدلنے پر مجبور تھا۔ اس لئے مجسمہ کو تلاش کرنے اور اس کی شناخت میں اس لئے بھی سخت دشواری اور دقت پیش آرہی تھی کہ وہ کسی ایک شہر اور علاقے میں نہیں ہوتا تھا۔ چندرا دیوی ناقابلِ تسخیر تھی۔ اس کا بال تک پیکا نہیں ہو سکتا تھا۔

کینڈی کے علاقے کی سب سے حسین لڑکی نروپا کی شادی تھی۔ اس کے حسن اور مصویت کا چرچا دور دور تک تھا۔ اس سے شادی کرنے کے لئے بہت سارے امیدوار تھے۔ قرعہ فال ایک لڑکے کو پال بندر ایکے کے نام نکلا جو ایک شریف لڑکا تھا۔ پانچ بہنوں کا بھائی تھا۔ اجمرتا ہوا کرکٹ کا کھلاڑی تھا۔ آل راؤنڈر تھا۔ فرسٹ کلاس میچز میں اس کی اعلیٰ کارکردگی نمایاں رہی تھی اور اسے جلد ہی ٹیسٹ کیپ ملنے والی تھی۔ وہ وزارت ڈاک و تار میں کلرک تھا۔ اس کی قیمت کیسے جاگی.....؟ نروپا سے شادی کرنے والے امیدواروں میں بڑے گھرانوں کے لڑکے تھے..... وہ اسے بھورانی بنا کر رکھنا چاہتے تھے۔ نروپا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ والدین کا عام گھرانے سے تعلق تھا۔ والدین نے بیٹی کو اس بات کا اختیار دے دیا تھا کہ جیون ساتھی کا انتخاب وہ اپنی مرضی اور خوشی سے کرے۔

ہر سال..... سری لنکا کرکٹ ٹورنامنٹ ہوتا تھا۔ اس میں سری لنکا کے نامور، تجربہ کار اور ٹیسٹ کھلاڑی بھی حصہ لیتے تھے۔ اس سال بھی یہ ٹورنامنٹ حسب دستور پال کیلے اسٹیڈیم میں ہوا۔ کینڈی کی ٹیم فائنل میں پہنچ گئی۔ یہ دن ڈے میچز ہوتے تھے۔ گوپال بندر ایکے نے مرن چند کے ایک اور میں مسلسل سات چھکے مارے۔ سات چھکے اس لئے کہ اس میں ایک تو بال بھی تھی.....

اس نے اپنے ایک اور میں ہیڈ ٹرک بھی کی تھی۔ اس ہیڈ ٹرک میں اس نے بڑے بڑے کھلاڑیوں کو کلین بولڈ کیا تھا..... اس نے ایک سو دس رن بھی بنائے تھے۔ اس کی اعلیٰ پرفارمنس نے تہلکہ مچا کر رکھ دیا تھا۔ گوپال نہ صرف مین آف دی میچ قرار دیا گیا بلکہ اس پر انعامات کی بوچھاڑ ہو گئی۔ اس کے علاوہ اسے کئی نجی کمپنیوں کی طرف سے ملازمت کی پیشکش کی گئی۔ وہ اپنی قومی ایئر لائن میں ملازم ہو گیا۔

گوپال خوب صورت تو نہ تھا لیکن وجیہ تھا۔ اس کے خوب صورت کھیل پر لڑکیاں مرثی تھیں۔ ان میں نروپا رائے بھی تھی۔ گوپال کے والدین اپنے بیٹے کا رشتہ نروپا کے لئے لے گئے تو نروپا نے ہاں کر دی..... اس کی شادی بڑے روایتی انداز اور دھوم دھام سے ہو گئی۔ جب وہ رخصت ہو کر پالکی میں جا رہی تھی۔ گوپال گھوڑے پر سوار تھا۔ چندرا دیوی نے بھی اس شادی میں شرکت کی تھی..... نروپا کو ایک سونے کا لاکٹ تحفہ میں دیا تھا۔ نروپا کے والدین کو جب بتایا کہ وہ ہندوستان سے سری لنکا سیر و سیاحت کے لئے آئی ہوئی ہے۔ اس نے شادی کی تقریب اور دلہن کو دیکھا تو وہ بن بلائے آ گئی۔ نروپا اور اس کے والدین بہت خوش ہوئے۔ چندرا دیوی کو نروپا کے حسن اور مصویت نے بڑا متاثر کیا تھا۔ رخصتی کے بعد وہ وہاں سے چلی آئی تھی۔

براتیوں نے نصف راستہ طے کیا ہو گا کہ اس نے برات اور دلہن کو دیکھا۔ دلہن کے دیکھتے ہی اس کی نیت میں فتور آ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ گوپال کے روپ بہروپ میں دلہا بنا گھوڑے پر سوار تھا۔ گوپال ایک ویرانے میں بے ہوش پڑا تھا۔

مجسمہ نروپا کو اغوا کر کے لے جانا نہیں چاہتا تھا وہ گوپال بن کر تین دن تک عیش کرنا چاہتا تھا..... بہت دیر تک ملاقاتی رکھیں ہوتی رہیں..... والدین اور بہنوں نے نروپا کو سینے سے لگا کر خوب پیار کیا۔

جب رسومات سے فارغ ہو کر مجسمہ جگہ عروسی میں داخل ہوا تو نروپا مسہری پر دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اس وقت وہ بلا کی حسین لگ رہی تھی۔ سرخ جوڑے میں..... اسے خوشی اور لباس نے اور نکھار دیا تھا۔ اس نے کمرے کے باہر چائیں سن کر لہسا سا گھونگٹ نکال لیا اور اس کا دل ان جانے خیالات اور سہنوں سے دھڑکنے لگا تھا۔ مجسمہ نے اندر داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کیا اور فاتحانہ انداز سے مسہری کی طرف بڑھا۔

”میری جان نروپا.....!“ وہ اس کے سامنے جا بیٹھا تو نروپا اور سکر کر سمٹ گئی تھی۔

”اپنا گھونگٹ الٹ کر یہ چاند سا کھڑا تو دکھا دو.....“ وہ بولا۔

”پہلے منہ دکھائی دو.....“ نروپا کسمائی۔ اس کے خوب صورت مہندی لگے ہاتھ ساڑی کی

دیکھ رہا تھا..... چندرا دیوی نے اس کے منہ پر جو تھپڑ رسید کیا اس کی جلن ایسی لگ رہی تھی جیسے دھکتا ہوا انگارہ ہو اور اس نے اس کا گال جھلسا دیا ہو..... اسے خوف سے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ اس پر کسی انسانی طاقت کا کوئی اثر ہوتا تھا نہ کسی مہلک سے مہلک ہتھیار سے نقصان پہنچایا جاسکتا تھا کیوں کہ وہ سونے کا بنا ہوا تھا۔ انسانی روپ دھار کر وہ عام انسانوں کو نقصان پہنچا رہا تھا۔ انسانی روپ دھارنے سے گو وہ ایک گوشت پوست کا آدمی بن گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے نہ تو زخمی کیا جاسکتا تھا۔ نہ جان سے مارا جاسکتا تھا۔ نہ ہی اسے دکھ، درد اور کسی بھی قسم کی تکلیف ہو سکتی تھی۔ لیکن معاملہ برعکس تھا۔ اس کے ایک تھپڑ نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے۔

”تھکارام جی.....!“ چندرا دیوی نے طفریہ لہجے میں کہا۔ ”یہ سہاگ رات کیسی ہے جس کا تم نے سہنا دیکھا تھا..... یہ کیسی بے رخی اور بے دردی ہے..... کیا دلہن سے اتنی ناراضگی..... آؤ..... میرے پاس آؤ..... میں بے قرار ہو رہی ہوں..... تمہارے قرب کے لئے.....“

مجسمہ کیا کہتا..... اس کے حواس محفل تھے۔ وہ تو مجسمہ بنا چندرا دیوی کو دیکھے جا رہا تھا۔ پھٹی پھٹی نظروں سے.....

”اے کھنڈ تو نہ بنو.....؟ کیا میں کوئی بد صورت لہوں.....؟ مجھ میں دلکشی اور کشش نہیں ہے..... میرا حسن اور پر شباب گداز بدن بہار نہیں دے رہا ہے.....؟ میں تڑپ رہی ہوں تمہارے بازوؤں کے حصار اور محبت بھرے الفاظ کے لئے..... آؤ..... میرے سنے کو کسی پھول کی طرح پھینک دو..... اس لئے کہ سہاگ کی پہلی رات عورت کو پہنایا نہیں سرمایہ بھی ہوتا ہے۔“

وہ چندرا کی باتیں سن رہا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے..... چندرا دیوی سے مقابلہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس نے عائب ہونے اور فرار ہونے کی کوشش کی..... لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ اس صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے۔ وہ سب کچھ بھول چکا ہے۔ چندرا دیوی نے اس کی ساری پوشیدہ قوتوں کو سلب کر کے اسے ایک عام سا آدمی بنا دیا ہے۔

چندرا اسے یوں آسانی سے نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ آج اسے ہر قیمت پر کیفر کردار تک پہنچا کر دے گی۔ وہ آج بڑی مشکل سے اس کے ہاتھ آیا تھا۔ وہ اسے چمکے دیتا پھر رہا تھا۔ پرعدوں اور جانوروں تک بہرہ ور رہا تھا کہ چندرا دیوی کے ہتھے نہ چڑھے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ چندرا دیوی سے مقابلہ کرنا اور جیتنا اس کے بس کی بات نہیں..... اس لئے پختا پختا پھر رہا تھا۔

چندرا دیوی نے اس کی یادداشت کو ایک دم سے دھندلا دیا تھا۔ چند منٹ پہلے اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔ اسے اب تھپڑ کی جلن اور تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ واقعہ بھول کر پلنگ کی

سلوٹوں میں گم تھے۔

”میری جان.....! منہ دکھائی تو میں خود ہوں.....“ مجسمہ بولا۔

”دنیا میں مجھے تم سے زیادہ عزیز کوئی نہیں ہے۔“ زروپا نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا۔ ”یہ ایک دستور ہے..... دلہن کو منہ دکھائی میں کچھ نہ کچھ دیا جاتا ہے..... وہ کتنی ہی معمولی چیز ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ وہ چیز زندگی کی یادگار ہوتی ہے۔“

”سنو..... رات گزارنے کے بعد میں صبح تمہیں ایک ہیرو کے جڑاؤ انگوشی دوں گا..... یہ میرا وطن ہے..... دراصل میں تمہیں پا کر اتنا خوش ہوا تھا کہ مجھے منہ دکھائی کا تھو دینے کا خیال نہیں رہا.....“

”تم جب تک منہ دکھائی نہ دو گے اس وقت تک نہ تو گھونگٹ الٹوں گی اور نہ ہی قریب آنے دوں گی۔“

مجسمہ کو خیال آیا کہ شاید منہ دکھائی کی انگوشی گوپال کی جیب میں ہوگی..... اس نے کہا۔

”اچھی بات ہے۔ میری جان..... بس..... دس منٹ میں انگوشی لے کر آتا ہوں۔“ وہ عائب ہو کر اس جگہ پہنچا جہاں گوپال بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی جیب میں انگوشی کی ڈبیا موجود تھی۔ وہ انگوشی لے کر جگہ عروسی میں آ گیا۔ زروپا بدستور سسکی مٹنی نگین گھڑی بنی بیٹھی تھی۔

”اچھا اپنا ہاتھ بڑھاؤ.....“ وہ بولا۔ ”میں انگوشی لے آیا ہوں۔“ زروپا نے اپنا خوب صورت، مرمریں اور سڈول ہاتھ بڑھایا۔ اس نے ایک خردلی انگلی میں انگوشی پہنا دی۔

”اچھا..... اب تو اپنا گھونگٹ الٹ دو.....“ اس نے کہا۔

”آپ انہیں گے.....“ وہ شرما اور لجا کر بولی۔

مجسمہ نے جیسے ہی اس کا رنگین گھونگٹ الٹا اس کے منہ پر اتنے زور کا تھپڑ پڑا کہ اسے دو ہزار سال قبل کا چمٹی کا دودھ یاد آ گیا۔ وہ فرش پر گر پڑا..... چائے کی جلن نے اس کے رخسار کو جھلسا دیا۔ اس نے دیکھا۔

”وہ زروپا نہیں تھی..... چندرا دیوی تھی.....“

زروپا کی جگہ چندرا دیوی کو دیکھ کر مجسمہ کی ٹہنی گم ہو گئی۔

وہ بھونچکا سا ہو گیا..... اسے یقین نہیں آیا اور نہ ہی اس کے وہم و گمان میں تھا کہ زروپا کی جگہ چندرا دیوی ہوگی۔

وہ ساکت و جامد سکتے کی سی حالت میں بڑی حیران اور خوف زدہ نظروں سے چندرا دیوی کو

طرف دیکھ رہا تھا۔ وہاں چندرا دیوی نہیں رو پا کھڑی تھی۔ سرخ جوڑے میں بلا کی حسین دکھائی دے رہی تھی۔

”جسمہ کو یاد ہی نہیں آیا کہ وہ پلنگ سے اتنی دور فرش پر کیسے گرہا ہوا ہے۔ صرف اسے اتنا یاد تھا کہ اس نے گھونگھٹ اٹھا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ شاید دروازہ بند کرنے بڑھا تو لڑکھڑایا اور اپنا توازن قائم نہ کر سکا۔ گر پڑا تھا۔“

وہ دلہن کو اس ہوش رہا حالت میں دیکھ کر اٹھا۔ چندرا دیوی کی جگہ زرد پاتھی۔ وہ گوپال کے بہرہ میں تھا۔ چندرا دیوی ان کی نظروں سے غائب ایک کونے میں کھڑی تھی۔ اس نے زرد پا کو اپنے زیر اثر لیا ہوا تھا تا کہ وہ گوپال کا بدلہ جسمہ سے لے۔ جسمہ نے گوپال کو بے ہوش کر کے ایک دیرانے میں پھینک دیا تھا۔ گوپال کا بہرہ پھر زرد پا کے ساتھ عیش کرنے آ گیا تھا۔

زرد پانے اسے گوپال ہی سمجھا ہوا تھا۔ جب جسمہ اس کے پاس پہنچا تو زرد پا اس طرح سے چونکی جیسے اسے ہوش آیا ہو جسمہ کو دیکھ کر.....

”تم..... تم..... گوپال نہیں ہو.....؟“ زرد پا ایک قدم پیچھے ہٹ کر ہذیانی لہجے میں بولی اور اسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا۔

”میں گوپال نہیں ہوں.....؟“ وہ انجان سامن کر حیرت سے بولا۔ ”پھر میں کون ہوں میری

جان.....!“

”تم کوئی اور ہو.....“ زرد پانے حیر لہجے میں کہا۔ ”تم نے میرے گوپال کا بہرہ پھر اہوا

ہے.....“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں گوپال کا بہرہ پھر لوں.....؟“ جسمہ نے کہا۔ ”یہ تم کس بنا پر کہہ رہی ہو کہ میں گوپال نہیں ہوں۔ یقین نہیں آ رہا ہے تو اپنے ہونٹوں سے اندازہ کر لو..... تمہارے ہونٹ میرے ہونٹوں کے قرب سے آٹا ہیں۔“

”تمہارے جسم سے سلفر کی بو آ رہی ہے۔“ زرد پا بولی۔ ”یہ یو کسی بدروح یا شیطان کے جسم سے پھوٹتی ہے۔“

”گوپال میں کوئی بدروح ہوں میری جان زرد پا.....!“ جسمہ ایک زوردار قہقہہ مار کر ہنسا۔ لیکن وہ دل میں حیران تھا کہ زرد پانے یہ بات کیسے جان لی۔ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ حقیقت تھی۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا۔

”تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے اور تمہارا وہاں ہی ہے۔“ وہ زرد پا کے قریب ہونے لگا۔ ”ان فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کرو..... یہ حسین اور رنگین رات تیزی سے بیت رہی ہے۔ میری آغوش

میں آ جاؤ..... یہ لمن کی رات ہے۔ ارماتوں بھری رات ہے.....“

”میرے قریب نہ آنا..... مجھے چھونا نہیں.....“ زرد پانے ایک قدم پیچھے ہٹ کر تیزی سے کہا اور پوچھا۔ ”یہ بتاؤ کہ میرا گوپال کہاں ہے؟“

”ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تمہارا گوپال نہیں ہوں..... ہم دونوں نے سات پھیرے کئے ہیں..... ایک دوسرے کو سو بیکار کیا ہے۔ ہماری یہ شادی محبت کی شادی ہے..... شادی سے پہلے کیا ہم دونوں خوب جی بھر کے من مانیاں نہیں کرتے تھے.....؟“

”میں کہتی ہوں تم میری نظروں کے سامنے سے دفع ہو جاؤ.....“ وہ بکڑ کر بولی۔ ”ورنہ.....“

اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ورنہ کیا.....؟“ اس نے زرد پا کے اور قریب ہو کر مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”تمہاری ہڈیاں پسلیاں توڑ کر رکھ دوں گی.....؟“ زرد پا غرائی.....

اس پر ہنسی کا جیسے دورہ پڑ گیا۔ پھر اس نے اپنی ہنسی روک کر زرد پا کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر استہزائیہ انداز سے بولا۔

”یہ پھول سے نازک ہاتھ جو چومنے کے لائق ہیں..... وہ کیا میری ہڈی پسلیاں توڑ دیں گے.....؟“

”یہ اتنے نازک اور کمزور نہیں ہیں جو تم سمجھ رہے ہو.....؟“ وہ جسمہ سے اپنے ہاتھ چھڑا کر بولی۔

”اچھا.....“ اس کے لہجے میں طنز بھر گیا۔ ”میں دیکھتا ہوں کہ ان خوب صورت مرمریں ہاتھوں میں کتنی شکست ہے؟“

اس نے زرد پا کی کمر میں ہاتھ ڈال کر قریب کرنا اور آغوش میں لینا چاہا تو زرد پانے اسے اتنے زور سے دھکادیا کہ وہ اس طرح سے لڑکھڑاتا ہوا گیا جیسے کوئی بے وزن سی شے ہو۔ سامنے والی دیوار سے بری طرح ٹکرایا۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر وہ مسکراتا ہوا زرد پا کی طرف کسی آندھی طوفان کی طرح بڑھا تا کہ اسے دیو بوج کر ناخت و تاراج کر دے کسی مفتوحہ علاقے کی طرح..... چندرا دیوی نے اس کی ساری پوشیدہ قوتوں کو بے اثر کر دیا۔ پھر زرد پا کو شکست کی صلاحیت دے دی۔

وہ جیسے ہی زرد پا کو آغوش میں لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتا تو زرد پانے اسے دونوں ہاتھوں سے کسی پہلوان کی طرح اٹھالیا۔ اس سے زرد پا کو ایسا لگا کہ یہ کوئی پلاسٹک کا گڑا ہے۔ اتنا ہلکا پھلکا کہ اسے یقین نہ آیا۔ پھر بھی اس نے فضا میں گھما کر پوری قوت سے فرش پر دے مارا۔

مجسمہ کی کھوپڑی فرش پر پڑ گئی۔ اس کے سہم کے انجر بنجر ڈھیلے پڑ گئے۔ ہڈیاں جھنجھٹیں۔ درد و تکلیف کی شدت نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اسے خوف سے زیادہ حیرت اس بات کی ہوئی تھی اس لڑکی میں اتنی شگفتگی کہاں سے آگئی جس نے اسے کسی نوزائیدہ بچے کی طرح فرش پر دے مارا تھا۔ وہ چھ من وزن کا تھا۔ اور پھر اسے چوٹ کیسے آگئی؟ اس کے دماغ کی چولیس کیسے مل گئیں۔ دھان پان اور نازک اندام سی لڑکی۔ یہ کیا اسرار ہے کہ اس میں ناقابل یقین تک کی شگفتگی موجود ہے۔

اس نے کوشش کی اپنی پراسرار اور خفیہ صلاحیتوں اور طاقت سے کام لے۔ لیکن اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ ان سے محروم ہو گیا ہے۔ اس لمحے چندراد یوی ظاہر ہوئی۔ چندراد یوی کو دیکھتے ہی اس کے اوسان خطا ہوئے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ سارا کھیل چندراد یوی کا ہے۔ اس نے غائب ہونے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

”آپ چندراد یوی۔۔۔۔۔!“ نروپا اسے دیکھ کر حیرت اور خوشی سے بولی۔ ”آپ یہاں اندر کیسے آئیں۔۔۔۔۔؟“

”یہ تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔“ چندراد یوی نے کہا۔ ”تم نے اس مرد کو خوب پہچان لیا کہ یہ گوپال نہیں ہے۔ تمہارا شوہر نہیں ہے۔ گوپال کا ہم شکل بن کر عیش کرنے آیا تھا۔ تمہاری بچی محبت دھوکا نہ کھا سکی۔ تمہاری محبت اور عزت بچ گئی۔ آج آنے سے بال بال بچ گئیں۔ اس سے یہ پوچھو کہ تمہارا بچہ گوپال کہاں ہے؟ جب تک یہ نامتا ہے اس وقت تک اسے اٹھا کر فرش پر بٹختے رہو۔“

”لیکن یہ تو بہت بھاری ہے۔۔۔۔۔“ نروپا حیرت سے بولی۔ ”معلوم نہیں نفرت اور غصے سے میں نے اسے کیسے اٹھایا؟“

”یہ اس عورت کے کارن۔۔۔۔۔“ مجسمہ تھوک نکلنے ہوئے بولا۔ ”یہ جادو کرنی ہے۔۔۔۔۔ اس نے تمہیں شگفتگی دے دی ہے جس سے تم نے مجھے اٹھا کر کسی پہلوان کی طرح بٹخ دیا۔“ پھر وہ چندراد یوی سے بولا۔ ”مجھے جانے دو۔۔۔۔۔ میرا جادو مجھے دے دو۔۔۔۔۔ میری شگفتگی۔۔۔۔۔ پھر میں اپنی دنیا میں چلا جاؤں گا۔۔۔۔۔ مجھے شکا کر دو۔“

”نہیں۔۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔۔۔“ چندراد یوی نے سخت لہجے میں کہا۔ ”تم اس قابل نہیں ہو کہ تم اس سنسار میں رہو۔ تمہارے اندر جو بدروح ہے۔۔۔۔۔ خبیثیت ہے۔ وہ تمہیں کسی راہ راست پر قائم نہیں رکھے گی۔ تم نے بڑا خون خرابا اور بدکاریاں کی ہیں۔ تم ایک ظالم اور بے رحم ہی نہیں بلکہ خون آشام بیٹھریے ہو۔ تم نے دلہا دلہن پر ذرہ برابر رحم اور ترس نہیں کھایا۔ جو ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ پیار کے انوث بندھن میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کی زندگی میں ملن

کی رات آئی تھی۔ ارماتوں سے بھری رات۔۔۔۔۔ تم نے کیا کیا۔۔۔۔۔ ان کی راہ میں پتھر بن گئے۔ انہیں ملنے اور ایک نئی زندگی کے سفر کا آغاز کرنے نہیں دیا۔ اپنے جادو کے زور سے گوپال کو جدا کر کے اسے دیرانے میں پھینک آئے اور گوپال کے ہم شکل بن گئے۔ ایک اتفاق تھا جو میں اس شادی میں شریک تھی۔۔۔۔۔ اگر میں نہ ہوتی تو تم گوپال بن کر جانے کتنے دنوں تک اس سے کھلونے کی طرح کھیلے رہتے۔ پھر گوپال کو موت کی بھیٹ چڑھا دیتے تاکہ بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔۔۔۔۔“

مجسمہ اس سے پہلے کچھ کہتا نروپا تڑپ کر بولی۔ ”میرا گوپال کہاں ہے دیدی۔۔۔۔۔؟“ اس خبیثیت سے پوچھو۔۔۔۔۔“ چندراد یوی بولی۔ ”یہ بتائے گا کہ گوپال کہاں اور کس حالت میں ہے۔۔۔۔۔؟“

”کہاں ہے میرا بچہ۔۔۔۔۔؟“ نروپا نے تیز لہجے میں مجسمہ سے پوچھا۔ ”میں نہیں جانتا۔۔۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔“ اس نے مردہ لہجے میں جواب دیا۔

”تم اسے اٹھا کر فرش پر بٹخ دو۔۔۔۔۔ اس وقت تک اٹھا اٹھا کر فرش پر بٹختے رہو جب تک گوپال کے بارے میں نہ بتا دے۔“ چندراد یوی بولی۔ ”یہ کمینہ بن رہا ہے۔ ضد میں آ گیا ہے۔۔۔۔۔ ہٹ دھری دکھا رہا ہے۔“

”کیا میں اسے پھر سے اٹھا کر بٹخ سکوں گی۔۔۔۔۔؟“ نروپا بولی۔ ”میرا دل کر رہا ہے کہ اسے فرش پر بٹخ کر جان سے مار دوں۔۔۔۔۔“

”کیوں نہیں۔۔۔۔۔“ چندراد یوی بولی۔ ”میں نے تمہیں عارضی طور پر شگفتگی دی ہوئی ہے۔ اس سے کام لو۔۔۔۔۔“

نروپا نے مجسمہ کو اٹھایا اور فرش پر دے مارا۔ پھر اس سے پوچھا۔ ”بتاؤ۔۔۔۔۔ میرا بچہ کہاں ہے؟“

مجسمہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ کراہ کر رہ گیا۔ نروپا نے اور غصے سے اٹھا کر فرش پر دے مارا اور سابقہ سوال دہرایا۔

”یہ چندراد یوی بھی جانتی ہے۔۔۔۔۔“ وہ مردہ لہجے میں بولا۔ ”اس سے پوچھ لو۔“ ”میں تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں۔۔۔۔۔“ نروپا کے سینے میں سانسوں کا تلاطم جھکولنے لگا۔

مجسمہ نے نہیں بتایا۔ وہ جیسے ضد میں آ گیا تھا۔ پھر اس نے بڑبڑاتے ہوئے کوئی منتر پڑھا جو اسے نہ جانے کیسے یاد آ گیا تھا۔ پھر دوسرے لمحے کمرے میں دو جگہ سے سفید سا دھواں اٹھا۔

پھر وہ انسانی ہیولے میں ظاہر ہو گئے..... ان دونوں کی رنگت جھبھوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ گہری تھی..... یہ چھ چھوٹے قد کے تھے۔ نیم برہنہ..... ان کے سیاہ جسم چمک رہے تھے..... چہرے اس قدر خوف ناک، مکروہ اور گھٹاؤ نے تھے کہ انکی شکلیں دیکھتے ہی نزو پا خوف و دہشت سے بے ہوش ہو گئی۔

ان میں سے ایک نے غراتے ہوئے کہا۔ ”ہم تنگوارام کو لے جانے آئے ہیں۔ تم نے اس کا یہ حشر نشر کر کے اچھا نہیں کیا.....“

”سنو.....“ چندرا دیوی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں..... تم اسے لے جانا چاہتے ہو اور لے جاسکتے ہو تو لے جاؤ..... لیکن ایک بات یاد رکھو..... دنیا کی کوئی طاقت اسے یہاں سے لے جانی نہیں سکتی..... ہاں..... اس کی راکھ لے جاسکتے ہو..... کیوں کہ میں اسے بھسم کر رہی ہوں۔“

ان دونوں بدروحوں کے پارے چڑھ گئے۔ وہ مجسمہ کی طرف بڑھے تاکہ اسے اٹھا کر لے جائیں۔ غائب ہو جائیں..... وہ جیسے ہی اس کے پاس پہنچے اور انہوں نے اس کے بازو تھامے اس کے جسم سے شعلے خارج ہونے لگے۔ وہ دونوں خوف ناک چیخ مار کر پیچھے ہٹے۔ ان شعاعوں نے انہیں بری طرح جھلسا دیا تھا۔ وہ ششدر تھے کہ ان پر کسی بھی بھیاں تک ہتھیار اور آگ کا اثر نہیں ہوتا تھا..... شعاعیں بھی بے اثر ہو جاتی تھیں..... ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیسی شعاعیں تھیں۔

”کیا ہوا.....؟ کتو.....!“ چندرا دیوی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”کیا ہوا..... اسے لے جا کیوں نہیں رہے ہو.....“

”تم نے ہماری راہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش کی ہے.....“ ان میں ایک کسی اڑدھ کی طرح پھنکارا۔ پھر اس نے کوئی منتر پڑھ کر چندرا دیوی پر پھونکا..... چندرا دیوی پر تیروں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ اس وقت نزو پا ہوش میں آ چکی تھی۔ وہ ایک مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی لیکن دہشت زدہ سی ہو کر یہ خوف ناک منظر دیکھنے لگی۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ چندرا دیوی جتنی نہیں سکتی۔ کیوں کہ یہ لاتعداد تیر تھے۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر بھونچکی ہو گئی..... دوسرے لمحے خوش بھی..... چندرا دیوی کا کوئل بدن یہ تیر چھلنی نہ کر سکے۔ ہر تیر چندرا دیوی کے بدن سے لگتا تو وہ پھول بن جاتا تھا۔ گویا اس پر پھولوں کی بارش ہو رہی تھی۔

دوسری بدروح نے جو یہ دیکھا تو وہ فرش پر لوٹ پوٹ کر ایک سیاہ ناگ بن گیا۔ بہت ہی موٹا اور دس بارہ فٹ لمبا..... اس کے منہ سے آگ نکل رہی تھی۔ اس کی موٹائی تین فٹ سے کم نہ ہوگی۔ وہ اڑدھا لگ رہا تھا۔ نزو پا کی چیخیں نکل گئیں۔ لیکن چندرا دیوی بڑے سکون و اطمینان سے کھڑی

رہی۔ جب وہ قریب آیا تو چندرا دیوی نے بڑی مستعدی سے اس کی دم پکڑ لی اور اسے اس طرح گھمایا جیسے وہ کوئی رسی کا ٹکڑا ہو۔ پھر اسے جیسے پوری قوت سے فرش پر دے مارا۔ دوسرے لمحے وہ بے دم سا ہو گیا..... پھر وہ دونوں گدھے کے سر کے سینک کی طرح نظروں سے غائب ہو گئے۔ مجسمہ یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور نزو پا انگشت بدنداں تھی۔ اس کے ہوش و ہواس اڑ گئے تھے۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی ایسا خوف ناک..... ناگ نہیں دیکھا تھا اور نہ فلموں میں..... اس کے دلیں میں سانپ، ناگئیں، ناگ اور اڑدھ بھی ہوتے تھے جو جنگلوں میں بسیرا کئے ہوتے تھے..... جو معین اوقات شدید ترین گرمی میں جنگل سے قریب شاہراؤں پر نکل آتے تھے۔

وہ تھیر زدہ سی چندرا دیوی کو دیکھ رہی تھی..... یہ عورت جتنی حسین تھی اتنی بہادر، نڈر اور دلیر تھی۔ سب سے بڑھ کر ایک عظیم ترین جادوگر تھی..... بچپن میں اس نے بھوتوں، چڑیلوں، بدروحوں اور جادوگروں کی کہانیاں سنی تھیں۔ اس کے دلیں میں جادوگروں اور جادوگریوں کی کوئی کمی نہیں تھی.....

لیکن اس نے جو کچھ دیکھا وہ یہ تھا کہ موکل ذلیل و خوار ہو کر شکست کھا کر فرار ہو گئے تھے۔ وہ مجسمہ کو لے جانے میں ناکام رہے تھے۔ چندرا دیوی کے جادو کے سامنے ان کا کوئی زور نہیں چلا تھا۔ وہ بے بس اور ناکارہ ہو کر رہ گئے تھے۔

پھر ایک اور بدروح ظاہر ہوئی۔ جو سابقہ بدروحوں کے مقابلے میں کہیں خوف ناک، گھٹاؤنی اور مکروہ تھی..... جسے دیکھ کر نزو پا بے ہوش ہوتے ہوئے رہ گئی۔ اس کی آنکھیں ٹینس کی گیند سے بھی بڑی تھیں اور شعلوں کی طرح سرخ تھیں اور انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں۔ اس کی پیشانی پر بھی دو آنکھیں تھیں جو مرغی کے انڈوں کی طرح اور اسی سائز کی تھیں۔ اس بدروح کی قامت دس فٹ سے زیادہ تھی۔ وہ جسامت میں کسی دیو سے کم نہ تھی۔ اس کے ہاتھ دو دو گز لمبے اور موٹے تھے۔ اس کے چہرے کا طول و عرض بہت بڑا تھا اور اس کی بڑی خوف ناک، موٹی اور بے ہنگم ناگ تھی۔ اس کے تنھے اتنے بڑے تھے کہ ٹینس کی گیند کے سائز کی کوئی بھی چیز با آسانی اندر جاسکتی تھی۔ دہانہ بہت بڑا تھا۔ درخت دو دو تھے۔ نیچے دو..... اوپر دو..... ہونٹ بھی موٹے اور کراہت انگیز تھے۔

”میں نہ صرف تنگوارام بلکہ تمہیں بھی لے جانے آیا ہوں۔“ وہ ترختے لہجے میں بولا۔ ”تم نے میرے دوستاؤ کو بھی نکلنے نہیں دیا..... ان کا کہا نہیں مانا اور ان کا جادو بے اثر کر دیا..... لیکن میرے ساتھ ایسا نہ ہوگا۔“

”تمہارے دل میں جو حسرت ہے وہ پوری کرلو.....“ چندرا دیوی نے ننگ کر کہا۔
 ”کیا اس کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ جب میدان میں مقابلہ کرنے آئے ہو تو مقابلہ کرو۔“
 گیدڑ بھکیاں مت دو۔“

”وہ جانے کیا کیا پڑھ کر چندرا دیوی پر دس منٹ تک پھونکتا رہا..... نہ تو مجسمہ غائب ہوا نہ چندرا دیوی..... مجسمہ نے بے بسی سے کہا۔“

”کمال ہے..... ایک معمولی جادوگر نے کو تم قابو میں نہ کر سکے..... اس نے دیکھو میرا کیا بھر کس نکال دیا ہے..... میری ہمتی اور جادو سب کو اس نے ختم کر دیا ہے..... میں سارے متر بھول چکا ہوں..... جلدی سے کچھ کرو..... یہاں سے لے جاؤ۔ یہ میرا جنم ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے..... میں ابھی پانچ سو برس رہوں گا..... یہ میرے جنم کو ختم اور سدا کے لئے مجسمہ کر دینا چاہتی ہے..... تم مجھے یہاں سے لے چلو.....“

”میں تمہیں لے جانے کے لئے ہی تو آیا ہوں.....“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نہ صرف تمہیں بلکہ اسے بھی ساتھ لے جاؤں گا تاکہ تم اس کے ساتھ جی بھر کے جشن مناسکو..... تم چتانا کرو..... پریشان نہ ہو۔ میں ابھی اسے بے ہوش کئے دیتا ہوں۔“
 ”اسے بھی ساتھ لے چلو.....“ مجسمہ نے زد پا کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بھی کیا حسین ہے۔“

اس نے مرکز زد پا کی طرف دیکھا۔ زد پا مجسمہ کی بات سن کر تھر تھکا پھٹنے لگی تو چندرا دیوی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہ مجسمہ سے بولی۔ ”تم بڑے سہانے خواب دیکھ رہے ہو.....؟“
 ”ہاں..... اب میرا ہر خواب پورا ہوگا..... میں تم دونوں کے ساتھ جی بھر کے جشن مناتا رہوں گا۔“

”تم بھول رہے ہو.....“ چندرا دیوی بولی..... ”خواب، خواب ہوتے ہیں۔“
 اس بدروح نے چندرا دیوی کی طرف اپنا ہاتھ کیا..... اس کی انگلیوں سے آگ برسنے لگی۔ فرش پر چنگاریاں گرنے لگیں..... وہ چنگاریاں پھوؤں اور چھوٹے چھوٹے سانپوں میں بدل گئیں۔ فرش پر درجنوں کی تعداد میں پھجوا اور سنپو لئے تھے۔ وہ چندرا دیوی کی طرف ریگلتے ہوئے بڑھنے لگے۔ زد پا یہ دیکھ کر دہشت سے لرزنے لگی۔ اس کا حوصلہ جواب دینے لگا۔
 ”یہ کیا کر رہے ہو.....؟“ مجسمہ بولا۔ ”اس طرح تو یہ مر جائے گی۔ میرے سارے ارمان بھی مر جائیں گے۔“

”نہیں..... بدروح بولی۔“ ”یہ پھجوا اور سنپو لئے ڈنک ماریں گے تو بے ہوش ہو جائے گی زخمی ہو کر..... پھر میں اسے لے جا سکوں گا..... یہ دلہن تو صرف آنکھیں دکھانے کی دیر ہے..... بے ہوش ہو جائے گی۔ اسے بے ہوش کرنا کچھ مشکل نہیں.....“

چند لکھوں کے بعد پھجوا اور سنپو لئے اس کے کپڑوں پر چڑھ گئے۔ پھر اس کے بدن کے ان حصوں پر ڈنک مارنے لگے جو لباس میں چھپے نہیں تھے۔ اس کی کمر..... بانیں اور چہرے اور گلے سے نیچے..... جو بھی ڈنک مارتا تھا وہ فرش پر گر کر مر رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد تمام پھجوا اور سنپو لئے کیڑے مکوڑوں کی طرح فرش پر ڈھیر بنے پڑے تھے۔ چند لکھوں کے بعد وہ سب نظروں سے غائب ہو گئے۔

”تمہارا جادو بھی اس پر چل نہیں سکا.....“ مجسمہ بولا۔ ”اب کرو گے کیا.....؟ جا کر کسی اور بڑے جادوگر کو بھیجو جلدی سے.....“

”اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ اس کا تمام جادو ختم کر دیا جائے..... نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری.....“ بدروح سچ دتا بکھاتی ہوئی بولی۔ ”اس کے سوا کوئی چارہ نہیں.....“
 بدروح کے جسم میں آگ لگ گئی۔ اس کا سارا جسم شعلوں میں لپٹا ہوا تھا۔ مجسمہ نے گھبرا کر کہا۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو.....؟“

”میں اسے اپنی آغوش میں لے لوں گا.....“ اس نے جواب دیا۔ ”اس طرح یہ جل کر مجسمہ ہو جائے گی اور اس کا جادو بھی..... پھر ہم اس کے جادو کے اثر سے نکل جائیں گے..... نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری.....“

”یہ جل کر مر جائے گی تو میں اس سے محروم ہو جاؤں گا.....“ مجسمہ نے کہا۔ ”میرے ارمان اور حسرتیں دل میں رہ جائیں گی۔ میں دنیا کی حسین ترین عورت کے قرب اور اس کے کیف سرور سے محروم ہو جاؤں گا..... کوئی اور صورت کرو۔ میرے جذبات کا خیال کرو..... میں اس سے کھلونے کی طرح کھیل کر اس سے انتقام لینا چاہتا ہوں..... اس نے میرا جو حشر نشر کیا ہے۔ وہ قابل معافی نہیں ہے۔“

”لگتا ہے کہ تمہاری موت ماری گئی ہے اسحق.....“ بدروح نے گہر کر برہمی سے کہا۔ ”تم دیکھ رہے کہ اس پر کوئی جادو نہیں چل رہا ہے..... اس پر کوئی منتر کارگر نہیں ہو رہا ہے..... آخر تمہیں اتنی ہوس کیوں ہے.....“ اب تمہیں دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا..... موت یا جنم.....؟ اور پھر یہ دلہن بھی کم حسین نہیں ہے.....؟ بولو..... کیا چاہتے ہو؟“

اس نے جواب دینے سے پہلے بڑی بے چارگی سے چندرا دیوی کی طرف، اور دلہن کی

طرف دیکھا اور بولا۔ ”جہنم.....؟“

وہ بدروح چندرا دیوی کی طرف لپکی۔ جیسے ہی وہ چندرا دیوی کے قریب پہنچی۔ چندرا دیوی نے اسے بڑے زور سے مجسمہ کی طرف دھکا دیا۔ وہ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ مجسمہ کے اوپر جا گرا..... مجسمہ پر گرتے ہی اس میں آگ لگ گئی۔ مجسمہ کی چٹخیں نکل گئیں۔ بدروح نے اس سے الگ ہو کر آگ کو بجھانا چاہا..... لیکن وہ الگ نہ ہو سکے۔ دونوں اس طرح جل رہے تھے جیسے جتا جل رہی ہو..... تھوڑی دیر کے بعد فرش پر راکھ کے سوا کچھ نہیں رہا۔ ان کا وجود اور نام و نشان تک نہیں رہا۔

لیکن آج اس کے سہاگ رات میں جو خوف ناک، پر اسرار اور دہشت ناک واقعہ پیش آیا تھا جس نے دل اور وجود کو ہلا کر دیا تھا اس نے کسی فلم میں نہیں دیکھا تھا۔ یہ واقعہ خود اس کی زندگی سے متعلق تھا۔ اس نے جو بدروحوں اور مجسمہ کو دیکھا تھا۔ ایسی فلموں میں نظر نہیں آیا تھا..... مجسمہ جو گوپال بن گیا تھا..... چندرا دیوی مسیحا بن کر نہ آتی تو جانے کیا ہوتا..... وہ مجسمہ جس نے گوپال کا ہشکل بنالیا تھا وہ ایک درندہ صفت تھا..... خون آشام بھیڑیا..... جو اس کی عزت سے کھینٹا چاہتا تھا..... کھلونا بنانا چاہتا تھا..... وہ یہ سوچ کر کانپ گئی تھی کہ اس کی عزت پر آنچ آتی تو اور جب یہ راز کھلتا کہ نقلی گوپال اس کا پتی نہیں بلکہ بدروح تھی تو اس کا رد عمل کیا ہوگا..... اور پھر گوپال کیا سوچتا.....؟ کیا اس کی بات کو سچ مان لیتا؟

جب دونوں روحیں جل کر خاک ہو گئیں تو چندرا دیوی نے اس کے پاس جا کر دلا سادیا۔ ”نروپا گھبراؤ نہیں..... میں نے مجسمہ اور اس بدروح کا خاتمہ کر دیا..... اب تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“

وہ چندرا دیوی کے گلے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں سے آنسوؤں سے کی جھری لگ گئی۔

چندرا دیوی نے جب اسے ایک گلاس پانی پلایا تو اس کے اعصاب بحال ہوئے اور آنسو ختم۔ پھر اس نے پوچھا۔

”دیوی.....! میرا گوپال کہاں ہے.....؟ کس حالت میں ہے! کیا وہ زندہ ہے.....؟“

”چلو..... میں تمہیں اس کے پاس لے چلتی ہوں۔“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔ ”وہ بے ہوش اور زخمی حالت میں ہے..... لیکن زندہ ہے۔ تمہیں دھیرج رکھنا ہے..... میں نہیں چاہتی کہ اس کے گھر والوں کو اس واقعے کا علم ہو۔“

”کیا اس کے گھر والوں کو اس واقعے کی خبر نہیں ہوئی ہوگی.....؟“ وہ متعجب لہجے میں

بولی۔ ”کیا یہ حیرت اور دکھ کی بات نہیں ہے کہ اس قدر شور مچا رہا اور ہنگامہ ہوا..... گھر میں سے کوئی بھی نہیں آیا..... سب سوتے رہے؟“

”اس لئے کہ میں نے اس مکان اور پڑوسیوں کے لوگوں کی سماعت بندی کر دی تھی۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”تاکہ گھر اور پڑوسیوں کا کوئی فرد کمرے میں موجود کی کوئی آواز سن نہ سکے..... اگر میں ایسا نہ کرتی تو ایک طوفان آ جاتا اور ہنگامہ مچا رہا ہوتا..... میں نے جان لیا تھا کہ کیا کچھ ہونے والا ہے۔ اس لئے ضروری ہو گیا تھا کہ آواز کوئی بھی سن نہ سکے۔“

نروپا کی نگاہ معاسیہ اور سنہری راکھ پر جو فرش پر اس جگہ تھی جہاں وہ دونوں روحیں جل کر خاکسٹر ہوئی تھیں۔ سنہری راکھ ایک طرف تھی۔ سنہری راکھ سے قدرے ہٹ کر سیاہ راکھ تھی..... وہ دونوں الگ الگ جلتے تھے۔ انکے درمیان دو تین فٹ کا فاصلہ تھا۔ نروپا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ حیران تھی کہ ایک طرف سنہری اور دوسری طرف سیاہ راکھ کیوں ہے۔ یہ کیا اسرار ہے؟ اس نے چندرا دیوی سے پوچھا۔

”سیاہ راکھ تو اس کالی بدروح کی ہے جو مجھے اور تمہیں لے جانے آیا تھا۔“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”سنہری راکھ اس بدروح کی ہے جو گوپال کا بہروپ بھر کر تم سے دل بہلانا چاہتا تھا..... یہ ایک مجسمہ تھا جس میں بدروح سا گئی تھی..... میں یہ کہانی تمہیں بعد میں سناؤں گی۔ تم ایسا کرو کہ جلدی سے اس سنہری راکھ کو کسی کپڑے میں باندھ لو۔ میں سیاہ راکھ کو یہاں سے اس طرح صاف کئے دیتی ہوں کہ اس کا نام و نشان تک نہیں رہے گا۔“

”یہ سنہری راکھ ہے کیا.....؟“ نروپا نے تھیر زده لہجے میں پوچھا۔ ”ایسا لگ رہا ہے کہ سونے کو پیس کر پوڑ بنادیا گیا ہو۔“

”یہ سنہری راکھ پوڑ ہے..... سونے کا..... اس کا جو گوپال کا ہم شکل بنا تھا۔“ چندرا دیوی بولی۔ ”یہ سونا تم لوگوں کے بہت کام آئے گا..... یہ ایک لمبی کہانی ہے جو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی..... جلدی سے اسے کسی کپڑے میں باندھ کر چھپا دو..... پھر تم گوپال کو اعتماد میں لے کر بتا دینا..... یہ واقعہ کسی اور کو نہ سنانا..... کوئی اس واقعہ کا یقین بھی کرنے کا نہیں.....“

سونے کی راکھ ایک کپڑے میں باندھ کر رکھنے میں چندرا دیوی نے اس کی مدد کی..... پھر وہ عقی دروازے سے باہر آئیں۔ گوپال کو تلاش کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ گوپال ابھی تک بے ہوش پڑا تھا۔ وہ دونوں اسے لے آئیں۔ پھر اس کے کپڑے صاف کئے۔ پھر بستر پر لٹا دیا۔ چندرا دیوی نے کہا وہ اس وقت جا رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد گوپال ہوش میں آ جائے گا۔ گوپال کی تلاش میں جاتے سے چندرا دیوی نے مختصر الفاظ میں اسے نکارام مجسمہ کے بارے میں بتا دیا

تھا۔ اب تنگ راکھ کا وجود نہیں رہا تھا۔ اس دیس کے لوگوں نے اس سے سدا کے لئے نجات پالی تھی۔ نزدِ پاس کے متعلق معلوم کرنا چاہتی تھی۔ لیکن چندرا دیوی ٹال کر نکل گئی۔

چندرا دیوی ہندوستان آگئی تھی۔ خونی مجسمہ کیفر کردار کو پہنچ چکا تھا۔ تنگ راکھ کا جنم ختم ہو چکا تھا۔

رندھیر سوامی کو بنگور سے ممبئی آنے کے بعد بڑی مایوسی اور دل شکستگی ہوئی تھی۔ وہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوا تھا۔ ایک عجیب و غریب اتفاق تھا کہ اسے آج تک ممبئی آنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ جب کہ وہ دہلی، ناگ پور، کولکتہ، مدراس، اور ملبار کئی مرتبہ ہو کر آچکا تھا۔ یوں تو وہ ممبئی شہر کے بارے میں طرح طرح کی باتیں سن چکا تھا۔ یہ شہر کی توقع کے برخلاف کہیں زیادہ غیر مہذب ثابت ہوا تھا۔ اسے ایسا لگا تھا کہ اس شہر میں آدمی نہیں جانور بستے ہیں۔ یوں لگتا تھا کہ تہذیب انہیں چھو کر بھی نہیں مٹتی تھی۔ مرد تو مرد لڑکیاں اور عورتیں بھی آزاد خیالی میں بہت خطرناک اور تیز تھیں۔ وہ مردوں کے لئے شکاری ہوتی تھیں۔ اس نے ایک سترہ برس کی لڑکی سے سرعام پوچھا۔

”مس.....! کیا آپ مجھے بتا سکتی ہیں کہ..... شام کمار نوادرات سینٹر کہاں پر واقع ہے.....! میں بنگور سے آیا ہوا ہوں..... بڑی دیر سے اس کی تلاش میں بھٹک رہا ہوں۔ اس کا کوئی صحیح پتہ بتا نہیں پا رہا ہے۔ میں نے سنا تھا کہ یہ بہت مشہور اور بڑی دکان ہے..... یہاں کا بچہ بچہ جانتا ہے..... بچہ تو کیا بڑے لوگ بھی نہیں جانتے ہیں۔“

”کیا آپ نوادرات خریدنے اتنی دور سے آئے ہیں؟“ لڑکی نے جواب میں اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”جی ہاں.....“ اس نے سر ہلادیا۔ ”میں نوادرات خریدنے اور جمع کرنے کا بہت شوقین بلکہ دل دادہ ہوں..... یہ میری کمزوری ہے۔ اس دکان کا ایک اشتہار چھپا تھا کہ ممی برائے فروخت..... میں وہ ممی خریدنے آیا ہوں۔“

”کوئی ضروری ہے کہ آپ اس کی دکان پر خریدنے والی ممی خریدیں.....؟“ وہ بولی۔

”آپ کیا صرف ایک ممی میں دلچسپی رکھتے ہیں..... اگر آپ کو میں کوئی اور ممی دکھاؤں تو اسے آپ خریدنا پسند کریں گے؟“

”اس دکان کا مالک مصر سے ایک ممی لایا ہے..... جو سینکڑوں کی بلکہ ہزار برس پرانی ہے.....“ اس نے کہا۔ ”آپ جس ممی کا ذکر کر رہی ہیں کیا وہ مصر سے ممی فروخت کے لئے آئی ہوئی ہے؟“

”جی نہیں.....“ لڑکی نے سر ہلایا۔ ”یہ ہندوستانی ممی ہے جو ایک ہزار سال قبل جو مصر سے آئے ہوئے ایک جادوگر نے یہاں شادی کی تھی۔ بیوی کے مرنے کے بعد اس کی چتا نہیں جلائی بلکہ اسے ممی بنالیا اور مرتے دم تک اسے ساتھ رکھا۔ اس آبادی کے لوگوں نے اس کی ممی تو دفن کر دی لیکن اس جادوگر کی لاش کو ایک پہاڑی پر رکھ دیا۔ گدھوں نے اس کی لاش کھالی۔ دس برس قبل ایک مکان کی زمین کے نیچے تہ خانہ بنانے کے لئے کھودا گیا تو یہ ممی برآمد ہوئی۔ جسے جگدیش آنند نے خرید لیا..... وہ حادثوں میں لاوارث مرنے والوں کی ممی بناتا ہے اور کچھ عرصہ بعد اسے غیر ملکیوں یا آپ جیسے لوگوں کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے۔“

”یہ جگدیش آنند کون ہے.....؟“ اس نے حیرت آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”نہ میں نے کبھی اس کے متعلق سنا اور نہ ہی ممی کے بارے میں.....“

”حیرت کی بات ہے۔“ لڑکی نے ہلکی سی جھپکائیں۔ ”ہندوستان ٹائمر میں دو برس قبل اس کا انٹرویو شائع ہوا تھا اس ممی کے بارے میں..... میں اس کی سکرینری ہوں۔ آپ پہلے جگدیش آنند کے ہاں چلیں پھر شام کمار کے سینٹر سے.....“

رندھیر سوامی اس کے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ پہلے وہ جگدیش آنند کی ممی دیکھے گا..... بعد میں شام کمار کی..... ان میں جو بہتر حالت اور ارزاں قیمت کی ہوگی خرید لے گا۔ وہ لڑکی اسے لے کر ایک عمارت میں پہنچی۔ اسے زینے پر بٹھرنے کے لئے کہا کہ وہ دیکھ کر آتی ہے کہ وہ اپنے فلیٹ میں ہے یا نہیں..... کیوں کہ تھوڑی دیر پہلے وہ ڈیوٹی انجام دے کر نکلی ہے۔ شاید اس کا باس نوادرات کی طرح خریداری کے لئے گیا ہو نہ ہو..... لڑکی اوپر چلی گئی۔ دفتر دوسری منزل پر تھا۔ رندھیر سوامی اس لڑکی کے متعلق سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ لڑکی نہایت حسین اور جاذبیت سے بھرپور تھی..... پھر وہ ممی کے بارے میں سوچنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ آئی اور اسے دوسری منزل کے فلیٹ پر لے گئی۔ اس نے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ اندر داخل ہونے کے بعد لڑکی نے دروازہ بند کیا۔ پھر اسے کمرے میں رکھے ہوئے صوفے کی طرف اشارہ کیا اور بیٹھنے کے لئے کہا۔ پھر وہ اس سے بولی۔

”جگدیش آنند صاحب معروف ہیں۔ میں انہیں اطلاع کرتی ہوں۔ آپ انتظار فرمائیں۔“

وہ سامنے والے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ رندھیر سوامی کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ یہ نشست گاہ تھی۔ اس میں ایک صوفہ سیٹ، ایک تپائی اور چار کرسیاں رکھی تھیں..... ایک دیوار پر مشہور فلمی اداکارہ کی پینٹنگ تھی جس میں وہ نیم عریاں حالت میں تھی۔

جودل کو برمانے لگی تھی۔ یہ اداکارہ فلموں میں بولڈ کردار ادا کرنے میں مشہور تھی۔ رسوا بھی تھی..... چند لکھوں کے بعد سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا۔ جو لڑکی اسے یہاں لائی تھی۔ وہ باہر آئی۔ اسے دیکھ کر وہ حیرت سے اچھل پڑا۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ وہ بے لباس حالت میں اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ رند میرسوا می کھڑا ہو گیا۔
 ”یہ کیا.....؟“ جگدیش آنند کہاں ہیں..... مئی کہاں ہے.....“
 ”مرہ مئی میں کیا رکھا ہے.....“ لڑکی نے شوفی سے کہا۔ ”اس زندہ مئی کے بارے میں کیا خیال ہے.....؟ یہ بھی ایک نوادر ہے۔“

اس نے ایک لمحہ کے لئے لڑکی کو غور سے دیکھا..... اس کے چہرے اور سر پر پرتھوی نگاہ ڈالی..... واقعی لڑکی نہایت غضب کی تھی اور کسی نوادر سے کم نہیں تھی۔ اس کی جوانی کی کرشمہ سازیوں نے اس کے سارے بدن میں مستی دوڑادی۔ جو بن کی گردش تیز ہو گئی۔ یہ کوئی ایسی نو جوان لڑکی نہیں تھی جو اس کی زندگی میں پہلی بار آئی۔ ایسے کئی نوادر آئے تھے۔ وہ یہاں کسی لڑکی یا عورت کے ساتھ وقت گزاری کے لئے نہیں آیا تھا۔ بنگلور شہر میں ایسے نوادرات کی کوئی کمی نہیں..... وہ سمجھ گیا تھا یہ لڑکی اسے پھانس کر لائی ہے..... جب وہ غلاغت کے دلدل میں دھنستا جا رہا ہو تب اس کا کوئی ساتھی بد معاش آ کر اسے بلیک میل کرے اور بیوہ چھین کر لاتوں اور گھونٹوں سے تواضع کر کے دھکے دے کر نکال دے۔

اس سے پہلے لڑکی اس کے قریب آ کر اس کے گلے میں اپنی عریاں مرمریں اور سڈول بائیں جمائل کر کے اس کے جذبات میں مل چل چلا کر خود سپردگی کی حالت میں بستر پر لے جائے وہ برقی سرعت سے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ باہر سے کٹڈی لگائی اور تیزی سے سیڑھیاں اترتا نیچے آ گیا۔ جس وقت وہ دروازے کی کٹڈی لگا رہا تھا اس نے لڑکی کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”سریش شکار ہاتھ سے نکل گیا..... باہر سے دروازہ بھی بند کر کے گیا ہے۔“

وہ نیچے آ کر ایک قریبی بازاری بھیڑ میں گم ہو گیا۔ اب اسے کسی بات کا کوئی ڈر اور خوف نہیں رہا تھا۔ اس لڑکی نے اسے لوٹنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ لیکن اب اسے مزید ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی۔ کسی پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔

وہ یہاں سیر و تفریح کرنے اور فلمی اداکاروں سے ملنے اور ان کے آؤ گراف لینے نہیں آیا تھا..... اسے غیر معمولی اور نادرا اشیاء جمع کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا..... یہ شوق اسے ورثہ میں ملا تھا۔ اس کا باپ بھی دولت مند تھا۔ اور وہ بھی دولت مند تھا۔ باپ نے بے پناہ دولت اور

لاکھوں کی جائیداد اور کاروبار چھوڑا تھا..... اس کے باپ نے اپنے گھر میں جو عجائب خانہ مرتے وقت چھوڑا تھا۔ وہ اسے توسیع کرتا جا رہا تھا۔ اس کے گھر کے عجائب خانے میں جو نوادرات تھیں وہ ہندوستان کے کسی عجائب گھر میں نہیں تھیں۔ اس لئے کہ اس نے بڑی محنت کی..... دور دراز کے سفر کئے..... رقم خرچ کی تھی..... تب کہیں جا کر یہ ایک مثالی عجائب خانہ بنا تھا۔

اس کے عجائب خانہ میں تبت کی برقانی مخلوق کی دس کھوپڑیاں..... نیوگنی کے قبائلیوں کے بڑے بڑے خوفناک سر..... افریقہ کے آدم خور قبیلوں کے وہ زیورات جو انسانی ہڈیوں سے بنائے گئے تھے۔ ان کے نیزے بھالے..... تیرکمان..... ڈھول..... قدیم تحفے جو ہندوستان میں ہزاروں سال پہلے بنائے گئے تھے..... اور بھی ان گنت اور غیر معمولی اشیاء سے اس نے سجایا ہوا تھا۔

اس کا یہ عجائب گھر کاروباری مقصد کے لئے نہیں تھا۔ وہ ان اشیاء سے لاکھوں کما سکتا تھا..... یہ صرف اس کی ذاتی تسکین تھی..... اس کے عجائب گھر میں دنیا کی ہر لڑکی کے تجسس بھی تھے جو فطری حالت میں تھے..... ان پر دھوکا ہوتا تھا کہ یہ سچ سچ کی لڑکیاں ہیں۔ وہ اسے مقفل رکھتا تھا۔ یہ عجائب گھر تہ خانے میں تھا۔ چوری چکاری کا اندیشہ نہ تھا۔

وہ اکثر راتوں کو ان اشیاء کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ جو اس کے ذاتی تسکین کا باعث تھیں۔ اس کے دو ایک قریبی اور بچپن کے دوستوں نے اس کا عجائب گھر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے شادی اس لئے نہیں کی تھی کہ اس کی بیوی جائے کیسی ہو.....؟ وہ اس کے شوق اور جنون میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ جب کبھی بھی اسے عورت کی طلب ہوتی تو وہ ایک رات کے لئے آتا تھا۔

اس نے اپنے نوادرات میں کسی چیز کی جو کی محسوس کی تھی وہ مئی کی تھی..... وہ مصر کی وجہ سے جانے سکا تھا..... وہ اس غیر معمولی شے کو لا کر اپنے عجائب خانے کی زینت بنانا چاہتا تھا۔ جب اس نے اخبارات میں ایک روز اشتہار پڑھا..... مئی برائے فروخت..... وہ اسے خریدنے کی غرض سے ممبئی شہر آ گیا تھا۔

رند میر اس بازار میں آ کر بہت بری طرح جھن جھلا گیا تھا..... اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بازار میں جیب کترے گھوم رہے ہیں۔ اس لئے وہ بڑا محتاط تھا۔ سب سے زیادہ وہ تنگ اور پریشان تھا پھیری والوں سے جو ہاتھوں میں اشیاء اٹھائے فروخت کر رہے تھے اور ان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے کہ خریداری کر لی جائے..... منع کرنے کے باوجود باز نہیں آتے تھے..... دوسرے بھکاری تھے۔ ان میں نو جوان اور عورتیں..... ہر عمر کی اور ہر صوبے کی..... ساڑی بلاؤز

میں ملبوس..... جن کی گود میں بچے نہیں ہوتے تھے وہ کسی نہ کسی طرح بے حجابی کی نمائش کرتیں..... ان میں دو ایک نے پوچھا تھا..... ”صاحب جی..... ساتھ چلوں..... خوش کردوں گی۔“

ایک کونے میں بیٹھ بہت کم تھی۔ ایک بھکاری نے آگے بڑھ کر راستہ روک لیا جو چانک سامنے آ گیا تھا۔ رند میر کے رکتے ہی اس نے اپنی آنکھ کا ڈھیلا حلقے سے باہر نکال لیا..... اس کی بے جان آنکھ حلقے سے نکل کر گالوں پر لٹکنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی گندی ہتھیلی رند میر کے سامنے پھیلا دی۔

رند میر کو بھکاری کی اس حرکت پر ترس کے بجائے غصہ آ گیا۔ لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ اس نے جیب سے ایک سک نکال کر بھکاری کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ بھکاری نے سک لے کر جیب میں ڈالا اور لٹکی ہوئی آنکھ دوبارہ حلقے میں فٹ کر دی۔

رند میر نے جو ہٹا نوٹ کیا تھا وہ اس محلے میں تھا۔ ابھی بھی وہ اس محلے کے بازار میں تھا۔ وہ شیاں کمار کا رہتا پوچھنے ایک دکان کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ایک راہ گیر اس سے بری طرح ٹکرا گیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ گرنے لگا تو اس راہ گیر نے اسے سنبھال لیا۔ پھر معذرت کر کے تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ رند میر کو ایک دم سے احساس ہوا یہ شخص پاکٹ مار تھا۔ اس نے اپنی جیب خالی محسوس کی۔ وہاں ہاتھ لگایا تو بوا غائب تھا۔ اس نے فوراً ہی پلٹ کر، وہ بد معاش تیزی سے بیٹھریں سے گزر رہا تھا۔ لباس کی وجہ سے اس کی شناخت ہو رہی تھی۔ بڑے میں اس کی بڑی رقم تھی۔ وہ واپس جا بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہوٹل میں ٹھہر اور کھانا کھا سکتا تھا۔ وہ فوراً ہی چیخنے لگا۔

”اس لال قمیض والے کو پکڑو..... میرا بوا نکالا ہے..... چور..... چور.....“

وہ تیزی سے اس کے تعاقب میں دوڑا۔ لال قمیض والا بھی اسے آتا دیکھ کر اور چور چور کا شور سن کر آگے کی سمت تیزی سے لپکا۔ تیز دوڑنے لگا۔ رند میر کو بیٹھ چڑھ کر بھاگ کر اس بد معاش کو پکڑنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ بد معاش اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کسی نے بھی اس بد معاش کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی تھی..... کیوں کہ اس کے ہاتھ میں کھلا چاقو نظر آ رہا تھا۔

مخالف سمت سے چندرا دیوی آ رہی تھی۔ ایک لمحہ میں اس نے تاڑ لیا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے اس بد معاش کی راہ میں حائل ہو گئی اور ہڈیانی لہجے میں چیخ کر بولی.....

”اس کا بوا دے دو..... ورنہ اچھا نہیں ہوگا.....“

”میں کہتا ہوں میرے سامنے سے ہٹ جاؤ.....“ وہ دھاڑا۔ ”نہیں تو یہ چاقو تمہارے سینے میں اتار دوں گا.....“

”نہیں.....“ چندرا دیوی نے کہا۔ ”تم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے..... تم نے بوا نہیں دیا تو تمہارے ہوش ٹھکانے لگا دوں گی۔“

بد معاش کو غصہ سے زیادہ حیرت ہوئی۔ ایک حسین اور نوجوان عورت کتنی بے خونی اور دیدہ دلیری سے اس کا راستہ روک کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے دھمکی دے رہی تھی..... وہ اس کے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر ذرہ برابر بھی خوف زدہ نہیں تھی۔ اس نے فضا میں چاقو لہراتے ہوئے کہا۔

”یہ فلم کی شوٹنگ نہیں ہو رہی ہے..... میں کہتا ہوں..... ہٹو میرے راستے سے..... ورنہ تمہیں جان سے مار دوں گا۔“

چندرا دیوی ہٹی نہیں..... بڑے سکون و اطمینان سے کھڑی رہی..... بد معاش کسی قیمت پر بوا واپس دینا نہیں چاہتا تھا۔ یہ پھولا ہوا عام بٹوں سے قدرے بڑا تھا بے حد پھولا ہوا..... وزن سے اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس میں ہزاروں کی رقم ہے۔ اس نے فضا میں چاقو والا ہاتھ بلند کیا تاکہ اس کے سینے میں بھونک دے۔ جیسے ہی وہ چندرا دیوی پر حملہ آور ہوا چندرا دیوی نے جھکائی دے کر چاقو والے ہاتھ کی کلائی بڑی پھرتی سے پکڑ لی اور اس کا ہاتھ مروڑ کر اس کی کمرے پر لے گئی۔ بد معاش دنگ رہ گیا۔ وہ کوئی دہلا پتلا یا کمزور نہ تھا۔ جب کہ وہ عورت نازک اندام سی تھی۔ اس کے ہاتھ کی گرفت کلائی پر اس قدر مضبوط تھی کہ وہ چھڑا نہ سکا۔ چندرا دیوی نے اس کی کمر پر گھٹنے سے ایک زوردار ضرب لگائی تو اس کی چوٹ اتنی شدید تھی کہ وہ چیخنے اور کراہنے لگا۔

پھر بھی اس نے چاقو نہیں پھینکا..... چندرا دیوی نے اس سے کہا کہ ”چاقو اور بوا جیب سے نکال کر پھینک دو.....“ اس نے بوا بھی نہیں پھینکا۔ وہ اس موقع کی تاک میں تھا کہ چندرا دیوی کے چاقو گھونپ دے..... جب اس نے چاقو پھینکا نہ بوا پھینکا تو چندرا دیوی نے نہ صرف اس کی کلائی کو تڑکی گردن کی طرح مروڑ دی بلکہ کلائی توڑ کر..... اس کی کمر پر دو تین بار گھٹنے کی ضربیں لگا کر ایک طرف زور سے دھکا دے کر پھینک دیا۔ نہ صرف اس کے ہاتھ سے چاقو چھوٹ گیا بلکہ پتلون کی جیب سے بوا بھی نکل کر گر پڑا۔ رند میر نے لپک کر بوا اٹھالیا۔

وہ بد معاش دوسرے ہاتھ سے ٹوٹی کلائی پکڑ کر اور تکلیف سے زمین پر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ اس کی دل خراش کراہیں فضا میں گونجنے لگیں۔ یہ تماشا دیکھنے کے لئے ایک بیٹھریں جمع ہو گئی تھی۔ وہ لوگ حیرت سے..... بھونچکا ہو کر ایک مرد کو عورت کے ہاتھوں سے پٹا دیکھ رہے

تھے..... وہاں جوتڑیاں اور عورتیں جمع ہو گئی تھیں اس بد معاش کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں اور چندرا دیوی سے کہہ رہی تھیں.....

”اس حرام زادے کو ایسی مار مارو کہ کبھی یہ کسی عورت یا لڑکی کا پرس چھین کر بھاگ نہ سکے.....“ ایک عورت نے غصے سے کہا۔ ”یہ میرا پرس ایک مرتبہ چھین کر بھاگا تھا..... جس میں پانچ سو روپے تھے۔“ تھانے میں رپورٹ درج کرائی تو کمینہ، ذلیل، سوراں پکڑ کر کہنے لگا۔ ”ہم پرکاش پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے اور نہ تمہاری ایف آئی آر کاٹیں گے.....“

”بہن..... اسے اتنا مارو..... اتنا مارو کہ مر جائے..... ایک روز اس نے جھرا دکھا کر میرے دو کڑے اتار لئے تھے۔ پولیس اس سے بہت لیتی ہے۔ اس لئے اس کے خلاف کوئی شکایت درج نہیں کی جاتی ہے۔“ دوسری عورت نے کہا۔

”میرا بڑا بھی اس نے جیب سے نکالا جس میں میری تنخواہ تھی۔“ اس شخص نے آگے بڑھ کر اس بد معاش کی پہلی پر ایک زوردار لٹ رسید کی تو وہ بلبلاتا اٹھا..... میں بھی رپورٹ کرنے گیا تو تھانے دار بولا۔ ”جانتے نہیں ہو یہ کون ہے..... یہ تمہارا باپ ہے۔“

ایک چالیس برس کا شخص بیٹھ میں سے نکل کر آیا۔ بد معاش کے منہ پر تھوکتے ہوئے بولا۔ ”یہ بس میں میری جیب کاٹ رہا تھا تو میں نے اسے پکڑ لیا۔ ہم دونوں ستم کھتا ہو گئے۔“ زخمی بھی ہو گئے..... اس نے مجھے بری طرح زخمی کیا تھا اور میرے دودانت بھی توڑ دیئے تھے..... جب ہم تھانے پہنچے تو الٹا چور کو تال کوڈاٹے..... اس نے تھانے دار سے میری شکایت کی تھی میں نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا..... میں مرتے مرتے بچا..... پھر مجھے حوالات میں بند کر لیا گیا اور دس ہزار روپے رشوت دینے پر رہائی ملی تھی۔“

پھر اس بد معاش پر لاتوں اور کونوں کی بارش کر دی..... چندرا دیوی نے کوئی مداخلت نہیں کی۔ صرف اتنا کہا۔

”میں نے اس کی کلائی توڑ دی ہے..... اب یہ نہ تو کسی کی جیب کاٹ سکتا ہے اور نہ ہی پرس چھین کر بھاگ سکتا ہے..... چندرا دیوی نے کہا۔ ”اب یہ کسی سرکاری اسپتال میں چار پانچ مہینے سے پہلے ڈسچارج نہیں ہوگا.....“

”اب سب یہاں سے چل دو.....“ ایک شخص نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کوئی سپاہی یا پولیس کی شمشیری گاڑی آگئی تو مصیبت کمڑی ہو جائے گی..... اسے اچھی سزا مل گئی ہے..... شرمیلی جی آپ نے جو کام دکھایا ہم دل میں عشق عشق کر رہے ہیں..... آپ تو بڑی بہادر اور دلیر نکلیں.....“

اس شخص کی بات سن کر مجمع بادلوں کی طرح چھٹ گیا..... رند میر..... چندرا دیوی کے ساتھ ہولیا..... وہ تھوڑی دور جا کر بولا..... ”آپ نے بڑا زبردست کارنامہ انجام دیا..... اور آپ کے کارن مجھے بڑا مل گیا۔ ورنہ میں تو کہیں کا نہیں رہتا..... یہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں جو مجھے دس روپے بھی قرض دے سکے..... میں ایک مسافر ہوں؟“ پھر اس نے رک کر کہا۔ ”آپ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھول سکتا۔“

”آپ کہاں سے آئے ہیں.....؟“ چندرا دیوی نے پوچھا۔ ”کیا فلمی دنیا میں قسمت آزمائی کرنے آئے ہیں.....؟“

”بنگلور سے آیا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ ”پھر آپ کس لئے ممبئی آئے.....؟“ چندرا دیوی نے سوال کیا۔ ”کیا سیر و تفریح کی غرض سے.....؟“

”میں نوادرات کی خریداری کرنے آیا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میں نوادرات جمع کرنے کا شوقین ہوں۔“

”بنگلور اور میسور شہر میں نوادرات کی کیا کمی ہے جو اس کی خریداری کے لئے یہاں آئے..... کیا خاص نوادرات ہیں؟“

”جی ہاں.....“ رند میر نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”شیام کمار کے پاس ایک فراعنہ مصر کی مٹی ہے جو وہ مصر سے لایا ہے اور اسے فروخت کرنا چاہتا ہے..... اس نے اخبارات میں مٹی برائے فروخت کا اشتہار ہندوستان ٹائمز میں دیا تھا۔ اس کی نوادرات کی دکان ہے۔ اس کا پتا میں کوئی ایک گھنٹے سے تلاش کر رہا ہوں۔ کوئی صحیح پتا بتا نہیں پارہا ہے..... کیا آپ میری رہنمائی کر سکتی ہیں.....“

رند میر نے جیب سے کاغذ کی ایک چٹ نکال کر چندرا دیوی کی طرف بڑھائی جس پر شیام کمار کا پتا لکھا ہوا تھا۔

”دیکھئے مسٹر.....!“ چندرا دیوی نے اس کے ہاتھ سے چٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”یہ ممبئی شہر ہے۔ یہاں ایک سے ایک ٹھگ، جعل ساز، دھوکے باز اور لٹیرے بیٹھے ہیں۔ کوئی بھروسے کے قابل نہیں۔ اس کے علاوہ بد معاش اور پاکٹ مار اور غنڈے بھی ہیں..... ابھی آپ لوگوں کی زبانی اس بد معاش کے متعلق مرد اور عورتوں کی گفتگو سن چکے ہیں۔ میں آپ کو پتا بتائے دیتی ہوں۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ پھونک پھونک کر قدم رکھیں..... یہ ایک اتفاق تھا جو میں ادھر آنکلی۔ اگر میں جوڈو کرانے کی ماہر نہ ہوتی تو آپ کا بڑا گیا تھا۔“

”آپ تو میرے لئے فرشتہ بن کر آئیں..... میں ساری زندگی آپ کے لئے پرارتھا کرتا رہوں گا اور آپ کے مشورے پر عمل کروں گا.....“ وہ منوعیت سے بولا۔ ”کاش! میں آپ کی اس دیا کا کوئی صلہ دے سکتا۔“

”اچھا آئیے.....“ چندرا دیوی بولی۔ ”میں نے آپ کو انسانیت کے لئے بچایا۔ آپ کی پرارتھا میرے لئے بڑی دیا ہوگی۔“

چندرا دیوی نے گلی کے ایک ٹکڑ پر کھڑے ہو کر ایک گلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
”کوئی سو قدم چلنے کے بعد ایک بنگلہ نما لال رنگ کا مکان ہے۔ اس کے دروازے کی پیشانی پر ایک تختی لگی ہوئی ہے۔ جس پر جلی حروف سے لکھا ہوا ہے..... شام کمار نوادرات سینٹر..... اچھا اب اجازت دیں۔“

رندھیر، چندرا دیوی کا شکریہ ادا کر کے اس گلی کی طرف بڑھ گیا۔ گلی تاریک تھی اور دونوں طرف کئی منزلہ قدیم عمارتیں تھیں جن کے رنگ و روغن بارشوں کی نذر ہو گئے تھے اور اب وہ برہنہ حالت میں تھیں۔ ان کے مہیب سایوں نے گلی کو وحشت ناک بنا دیا تھا اور اسے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ عمارتیں بھوکی عفریت ہیں جو اس کو نکلنے کے لئے منہ پھاڑے گھور رہی ہیں..... اسے ایک انجانا خوف سا محسوس ہونے لگا..... وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں غنڈے بد معاش اسے گھیر نہ لیں اور چاقو کے زور پر اس کا بٹوالے کر بھاگ جائیں..... ایک بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ شام کمار نے اپنی نوادرات کی دکان اس گلی میں کیوں کھولی ہے..... اس کی دکان کو کسی بازار یا ہوٹل کی دکان ہونا چاہئے تھا تا کہ غیر ملکی دہلی سیاح خریداری کے لئے آ سکیں۔ یہ تو بھوت گلی لگتی تھی۔ اس سے جیسے کوئی نادیدہ آواز کہہ رہی تھی..... لوٹ جاؤ..... بھاگ جاؤ..... ورنہ تمہیں موت کی نیند سلا دیا جائے گا..... پھر اس کے کانوں میں بے ہنگ، بھونڈے اور خوفناک قہقہے گونجنے لگے..... پھر وہ استہزائے ہنسی بن گئے..... لیکن وہ می کے حصول کے لئے اتنا بے قرار تھا کہ دہشت زدہ ہونے کے باوجود آگے بڑھتا گیا۔

چند قدموں کی مسافت طے کرنے کے بعد وہ مکان آ گیا جس کے دروازے کی پیشانی پر شام کمار سینٹر کی تختی لگی تھی۔ دروازے پر پہنچ کر اس یک دل میں جو ڈر اور خوف دامن گیر تھا وہ دم توڑ گیا۔ دروازے پر اوپن کی تختی جھول رہی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر گھسا تو ایک عجیب سی رچی بسی بونے اس کا سوا گت کیا۔ وہ نوادرات کی دکان نہیں بلکہ کسی پسناری کی دکان دکھائی دی۔ کیوں کہ اس میں مرتبان اور ٹاٹ کی بوریاں رکھی تھیں۔ ان میں سے جڑی بوٹیاں جھاٹک رہی تھیں۔

وہ صحن میں کھڑا ہوا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا کرے..... کیوں اسے کوئی دکھائی نہیں دیا..... دوسرے لمحے سامنے والے کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس میں سے ایک دراز قد شخص باہر آیا۔ اس کی جسامت گینڈا نما تھی۔ وضع قطع اور چہرے مہرے سے وہ دکان دار نہیں بد معاش قسم کا لگا۔ لیکن جب اس نے رندھیر کو مخاطب کیا تو اس کے لہجے میں بڑی نرمی اور شائستگی تھی۔ اس شخص نے رندھیر کو دیکھ کر اندازہ کر لیا تھا کہ وہ مقامی نہیں بلکہ جنوبی ہند کا باشندہ ہے۔ اس نے رندھیر کو نمستے کرنے کے بعد بڑے مہذب اور مودبانہ لہجے میں کہا۔

”خوش آمدید جناب.....! میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں؟“

”میں نے فراغ مصر کی می برائے فروخت کا اشتہار اخبار میں دیکھا تھا.....“ رندھیر نے کہا۔ ”میں اسے خریدنے کے لئے بنگلور سے یہاں آیا ہوں..... کیا میں اسے خرید سکتا ہوں.....؟“

”کیوں نہیں..... کیوں نہیں.....“ وہ خالص کاروباری لہجے میں کہنے لگا۔ ”کچھ بات تو یہ ہے کہ جب میں رقم ہو تو دنیا کی ہر شے خریدی جاسکتی ہے۔ پیسے میں بڑی طاقت اور جادو ہے..... کسی کی بیوی بھی خرید سکتے ہیں.....“ وہ بولا۔

”میں می خریدنے آیا ہوں..... می موجود ہے یا فروخت ہو گئی ہے؟“ رندھیر نے پوچھا۔
”تم کس لئے می خریدنا چاہتے ہو.....؟“ اس نے سوال کیا۔ ”کیا تم بنگلور کے عجائب گھر سے تعلق تو نہیں رکھتے جو می خریدنے آئے ہو؟“

”دراصل بات یہ ہے کہ مجھے اپنے عجائب گھر کے لئے می چاہئے۔“ رندھیر نے اس انداز میں سرگوشی کی جیسے وہ منشیات کا سودا کر رہا ہو۔

”ہاں مل جائے گی.....“ اس نے کہا۔ ”لیکن میں اس کی قیمت ڈالر، پونڈ یا یورو میں لوں گا۔ ہندوستانی کرنسی میں نہیں۔“

”میں امریکی ڈالر بھی لایا ہوں..... آپ جس ملک کی کرنسی میں کہیں اس کی قیمت دوں گا۔“

”قیمت کے بارے میں کیا خیال ہے.....؟“ شام کمار نے کہا۔ ”آپ کو کچھ اندازہ ہے.....؟“

”جی نہیں..... مجھے قیمت کے بارے میں اس لئے کوئی اندازہ نہیں ہے کیوں کہ میں پہلی بار کوئی می خرید رہا ہوں۔“ رندھیر بولا۔ ”بہر حال اس کی کوئی مناسب قیمت ہونا چاہئے..... لیکن آپ ایک بات یاد رکھیں..... مجھ سے کوئی دھوکا بازی نہیں چلے گی۔ کیوں کہ مصر میں جو

میاں فروخت ہوتی ہیں۔ ان کے متعلق مجھے خاصا علم ہے..... دوسری بات یہ ہے کہ میں نوادرات خریدتا رہتا ہوں۔ اس لئے اس بات کو آپ پیش نظر رکھیں۔ میری دلچسپی کو کمزوری نہ سمجھیں۔“

”دھوکے بازی اور کسی قسم کے فراڈ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔“ شyam کمار نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”لیکن آپ یہ بات جانتے ہوں گے کہ آج کے دور میں می ایک نایاب چیز ہے..... میں نے خود مصر جا کر اسے خریدا ہے..... اکثر فرعون کے مقبروں سے میاں خرابی گئی ہیں۔ میں اسے کس مشکل سے لایا ہوں۔ کیا کیا پاؤں پیلے ہیں یہ آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔“

”کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ می فروخت ہوگئی ہو؟“ رندھیر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

”نہیں.....“ شyam کمار نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”میرے پاس رکھی ہوئی ہے۔“

”حیرت کی بات ہے کہ اس قدر نایاب می فروخت نہیں ہوئی اب تک..... جب کہ اس کی اشتہار بازی بھی کر چکے ہیں۔“

”یوں تو اس کے بہت سارے خریدار آئے تھے ان سے سودا طے نہ ہو سکا۔“ شyam کمار نے جواب دیا۔

”وہ کس لئے.....؟“ رندھیر بولا۔ ”کیا آپ نے اس کی بہت زیادہ قیمت لگائی تھی.....؟“

”اس لئے کہ وہ اسے کوڑیوں کے مول خریدنا چاہتے تھے۔“ شyam کمار نے کہا۔ ”یوں بھی میں نے اس کی بڑی مناسب قیمت رکھی ہے۔“

”میں سودا کرنے سے پہلے ایک نظری کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ رندھیر نے کہا۔ ”آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں.....؟“

”اس میں اعتراض کی کیا بات ہے؟“ شyam کمار کہنے لگا۔ ”یہ ایک اصولی اور کاروباری طریقہ ہے..... مال دیکھے بغیر سودا کیسے ہو سکتا ہے۔ میں خود بھی چاہتا ہوں کہ اسے آپ ایک نظر دیکھ لیں۔“

شyam کمار نے اپنی بات ختم کر کے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا..... اور پھر وہ عقبنی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ اس دروازے پر ایک دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک تنگ سی راہ داری سے ہوتے ہوئے ایک بڑے سے کمرے میں پہنچ گئے۔ اس میں دیوار کے سہارے چھ تابوت رکھے تھے۔ رندھیر نے حیرت سے کہا۔

”یہاں تو چھ تابوت رکھے ہیں..... کیا ان میں میاں رکھی ہوئی ہیں؟“ آپ نے تو صرف

ایک می کا بتایا تھا۔

”میں تابوت بھی فروخت کرتا ہوں۔“ شیار کمار نے جواب دیا۔ ”صرف ایک تابوت میں می موجود ہے۔“

پھر وہ ایک تابوت کی طرف بڑھا۔ اس نے سب سے پہلے رکھے تابوت کا ڈھکن اٹھایا اور پلٹ کر رندھیر سے بولا۔

”اس می کو اچھی طرح سے دیکھ لیں..... لیکن اسے ہاتھ مت لگانا۔ یہ بے حد نرم و نازک ہے۔ اسے بڑی احتیاط سے دیکھنا ہے۔“

رندھیر دھڑکتے دل سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ جیسے ہی اس کی نگاہ می پر پڑی تو اس کے دل کی دھڑکن اور تیز ہوگئی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ دل سینہ شق کر کے نکل آئے گا۔ وہ بے حد جذباتی سا ہو گیا تھا۔ وہ مبہوت سا ہو کر خواب ناک نظروں سے می کو دیکھنے لگا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ وہ کوئی می دیکھ رہا ہے..... وہ صرف سنسنوں میں می دیکھتا تھا۔ لیکن آج اس کا اپنا حقیقت بن گیا تھا۔ وہ خود پر بدقت تمام قابو پاتے ہوئے تابوت کے اور قریب ہو گیا..... کپڑوں کی دھبیوں میں لپٹی ہوئی می کا جائزہ لینے لگا..... می جس کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی جگہ جگہ سے پیلا پڑ چکا تھا..... بعض جگہ تو کپڑے کارنگ سیاہ دکھائی دے رہا تھا۔

اگر اسے یوں ہی کھلا چھوڑ دیا جائے تو ہوا سے یہ سب کچھ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔“

شyam کمار نے اس کی پشت پر کھڑے ہو کر کہا اور پھر اسے جیسے مشورہ دیا۔ ”اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ اسے کسی کیس میں بند رکھا جائے..... ہلانے یا جھلانے سے پرہیز کیا جائے۔ کیوں کہ یہ صدیوں پرانی ہے۔ مجھے بڑی احتیاط سے اسے لانا پڑا..... میں اگر احتیاط نہ کرتا تو یہ راکھ کا ڈھیر ہوتی۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں.....“ رندھیر نے سر ہلا دیا۔ لیکن اس کی ساری توجہ می پر مرکوز تھی۔ اس کی آنکھوں میں تجسس کی چمک پیدا ہوئی۔ وہ سر سے پیر تک می کا پر شوق نظروں سے جائزہ لیتا جا رہا تھا..... پھر اس نے چشم تصور میں می کو اپنے عجائب گھر میں دیکھا۔ جہاں اس کے عجائب گھر میں ایک نمول، نایاب اور بے حد قیمتی نوادرات کا اضافہ ہو گیا تھا..... اب اس کے عجائب گھر میں کسی نوادر کی کمی نہیں رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ اب وہ اکثر راتوں کو تنہائی میں اس کا نظارہ کرے گا۔ وہ می کو اس طرح دور سے دیکھا کرے گا جیسے اس وقت دیکھ رہا تھا۔ اس نے خود کو مصر کے ماضی میں محسوس کیا۔ وہ کھوسا لیا تھا۔

لیکن یہ کیا.....؟ رندھیر نے چونک کر سوچا..... اس کی نگاہ می کے بائیں ہاتھ پر جم کر رہ گئی..... می کے دونوں ہاتھ سینے پر بندھے ہوئے تھے۔ بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ کے اوپر تھا.....

بائیں ہاتھ کا کپڑا ہتھیلی کے مقام پر سے ہٹا ہوا تھا اور انگشتی والی انگلی کے مقام پر ہلکا سا ابھار دکھائی دے رہا تھا۔۔۔۔۔ رند میر نے پلٹ کر شام کمار کی جانب دیکھا۔ وہ پرسکون انداز میں اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ پھر رند میر کے چہرے پر چھائی پریشانی کو بھانپتے ہوئے بولا۔

”تم شاید تنہائی کے خواہش مند ہوتا کہ اسے غور سے دیکھو۔“

”جی ہاں۔۔۔۔۔ جی ہاں۔۔۔۔۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو۔۔۔۔۔“ رند میر نے جواب دیا۔

”بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔“ شام کمار نے جواب دیا۔ ”میں اپنے گاہک کو اچھی طرح سے اطمینان کر لینے کا موقع دیتا ہوں۔ آپ جتنا وقت چاہیں لے لیں۔۔۔۔۔؟“ اتنا کہہ کر وہ تیزی سے دروازے کی جانب چل دیا۔

جب رند میر تنہا رہ گیا تو وہ سوچنے لگا کہ۔۔۔۔۔ یقیناً اس پر قسمت کی دیوی مہربان ہو رہی ہے۔۔۔۔۔ وہ ابھار یقیناً کسی انگوٹھا کا تھا۔۔۔۔۔ وہ انگوٹھی سونے کی اور جواہرات سے مزین بھی ہو سکتی ہے اور صدیوں قبل کی انگوٹھی خود اپنی جگہ ایک نادر شے کی حیثیت رکھتی ہے۔۔۔۔۔ اگر اس دکان کے مالک کو ممی کی انگلی میں موجود انگوٹھی کا علم ہو گیا تو وہ اس کی قیمت کہیں سے کہیں لگا دے گا۔۔۔۔۔ لیکن اگر وہ دکان کے مالک کے علم میں لائے بغیر یہ می خرید لے تو سودا مہنگا نہیں پڑے گا۔۔۔۔۔ اسے انگوٹھی بازار میں فروخت سے لاکھ دو لاکھ مل سکتے ہیں۔۔۔۔۔ لیکن اسے اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔۔۔۔۔؟ وہ اس انگوٹھی اور ممی کو عجائب گھر کی زینت بنادے گا جو اس کی آتما کی شافی کا سبب بنے گی۔

اس نے دروازے کی طرف گھوم کر مالک دکان نے دروازہ ٹھیک سے بند کیا ہے یا نہیں۔۔۔۔۔؟ جھری میں سے اس کی حرکات و سکنات نہ دیکھ رہا ہو۔ لیکن نہ صرف دروازہ ٹھیک سے بند تھا بلکہ کھڑکیاں بھی۔۔۔۔۔ کھڑکیوں پر گہرے رنگ کے پردے پڑے تھے لہذا کمرے کا منظر آنے سے رہا تھا۔ اس نے اچھی طرح سے اپنا اطمینان کرنے کے بعد اس جگہ کو چھوا۔ جہاں ابھار دکھائی دے رہا تھا۔ ابھار خاصا سخت تھا۔۔۔۔۔ البتہ اس مقام پر جہاں کپڑا ہٹا ہوا تھا، ہلکی سی چمک بدستور دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن اس کا دل مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے محتاط انداز میں انگلی کے مقام پر سے کپڑے کو کھرچنا شروع کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد انگوٹھی اس کی نظروں کے سامنے تھی اور اپنی آب و تاب دکھا رہی تھی۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ انگوٹھی کا جائزہ لینے کے لئے مزید آگے کی جانب جھکا۔

”لیکن یہ کیا۔۔۔۔۔؟“ وہ چونک پڑا۔ ”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔۔۔۔۔؟“ وہ بڑبڑایا۔ ”لیکن حقیقت اس کے سامنے تھی۔۔۔۔۔ وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ انگوٹھی ہی تھی۔ لیکن رند میر کی نگاہیں ان الفاظ پر جمی ہوئی تھیں جو انگوٹھی کی چوڑی سطح پر جمی ہوئی تھی جس پر کندہ تھے۔ سرو پامدراس یونیورسٹی۔۔۔۔۔“

رند میر آنکھیں پھاڑے حیرت سے ان الفاظ کو گھورتا رہا۔ پھر اچانک اسے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے پلٹا۔۔۔۔۔ اس کی نگاہوں نے شام کمار کا ہاتھ بلند ہوتے اور چھوٹے دستے کی کلبھاری برق رفتاری سے آتے دیکھا۔ لیکن اچانک شام کمار کا کلبھاری والا ہاتھ فضا میں معلق ہو کر ٹخمد ہو گیا۔۔۔۔۔ اس نے پوری طاقت صرف کر دی کہ اس کلبھاری سے رند میر کا سر پھاڑ دے۔ لیکن صرف اس کا ہاتھ ہی نہیں بلکہ اس کا سارا جسم ساکت و جامد ہو گیا۔ اس میں ہلنا تو درکنار حرکت کرنے کی جھنجھٹ تک نہ رہی۔

”شام کمار۔۔۔۔۔ اب تمہارا کھیل ختم۔۔۔۔۔“ ایک شیریں نسوانی آواز فضا میں گونجی۔

رند میر نے چونک کر چند رادیوی کی طرف دیکھا۔ اس کی حیرت دو چند ہو گئی۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ اس کی محنت کھڑی تھی۔ جس نے کچھ دیر پہلے اس کا پرس غنڈے کی مرمت کر کے اس سے لے کر دیا تھا۔ اب اس کی جان بچائی تھی۔ وہ نہ آتی تو موت کی بھینٹ چڑھ چکا ہوتا۔

شام کمار خوف اور دہشت بھری نظروں سے اس عورت کو دیکھ رہا تھا جس نے اسے ساکت و جامد کر دیا تھا۔ رند میر نے سوچا۔ کیا یہ عورت پھناٹا نر کی ماہر ہے۔۔۔۔۔“ پھر رند میر نے بڑی مہوشیت سے کہا۔

”آپ دیوی ہیں۔۔۔۔۔ دیوی ہیں۔۔۔۔۔ یہ آپ کا دوسرا احسان ہے جو آپ نے مجھ پر کیا۔۔۔۔۔ آپ کو کیوں کر علم ہوا کہ یہ مجھے قتل کرے گا۔۔۔۔۔ جو بروقت پہنچ گئیں۔۔۔۔۔ مجھے ایک نئی زندگی دی۔۔۔۔۔؟“

”یہ شام کمار شیطان کے نام سے مشہور ہے۔۔۔۔۔ اس شہر کے نامی گرامی غنڈوں میں شمار کیا جاتا ہے۔۔۔۔۔ رہ زن ہے۔۔۔۔۔ لٹیرا ہے۔ ممی کے بہانے لوگوں کو لوٹنے کا پروگرام بنایا۔۔۔۔۔ آپ پہلا شکار تھے۔ جب آپ نے شام کمار کا پتا پوچھا تو مجھے شک ہو گیا۔۔۔۔۔ میں آپ کے پیچھے چلی آئی تاکہ ممکنہ خطرے سے بچاؤں۔۔۔۔۔ میرا خیال تو یہ تھا کہ یہ کسی بہانے آپ سے رقم چھین لے گا۔۔۔۔۔ لیکن یہاں آ کر معلوم ہوا کہ اس کا کیا منصوبہ ہے۔۔۔۔۔ یہ آپ کو قتل کر کے دوسری ممی بنانا چاہتا تھا۔۔۔۔۔ یہ جو ممی ہے یہ ایک عورت کی ہے۔ لاوارث عورت۔۔۔۔۔ مردہ خانہ سے لے آیا تھا۔۔۔۔۔ دوسرے کمرے میں ایک حوض بنا ہوا ہے۔ آپ کو قتل کرنے کے بعد کیمیائی محلولوں کی بھاپ سے آپ کو غسل دیا جاتا تھا۔ جب غسل کا مرحلہ مکمل ہو جاتا تو اس کا آدی جوا اندر موجود ہے وہ آگے بڑھ کر ایک بڑے سے بک کی مدد سے آپ کی لاش کو حوض سے گھسیٹ کر ایک بڑے سے صلیب پر لٹا دیتا۔۔۔۔۔ اس کا ساسی جو لنگڑا ہے ایسے کانوں میں ماہر ہے۔۔۔۔۔ اس نے یہ مہارت سائنس کے

پروفیسر کی لیبارٹری میں حاصل کی جو جانوروں پر تجربات کرتا تھا..... پھر وہ الماری میں سے دھجیوں کا گولہ نکالتا..... اور لاش کی گرد لپیٹنے کے لئے صلیب کے نزدیک پہنچ جاتا..... وہ دھجیوں کو لپیٹنے کا آغاز ہی کرتا شام کمار کمرے میں داخل ہوتا..... لنگڑا فوراً اپنے ہاتھ روک لیتا جو تذبذب کا شکار رہا تھا۔

شیام کمار سے کہتا..... ”مجھے امید ہے کہ تم نے اس کا اچھی طرح سے معائنہ کر لیا ہوگا.....؟“ وہ لاش کی طرف اشارہ کرتا۔ ”کوئی انگوٹھی یا گھڑی وغیرہ باقی رہنا نہیں چاہئے..... مجھے امید ہے کہ تم ہر کام اچھی طرح سے آنکھیں کھول کر کیا کرو گے..... تمہیں یاد ہے جب میں ایک شخص کو اغوا کر کے لایا تھا اس کی گھڑی کلائی سے اتارنا بھول گئے تھے۔ اس لئے تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ کمی کا یہ نیا کاروبار ہے..... اسے کامیابی سے جاری رکھنا ہے تو ہر طریقے سے محتاط رہنا ہوگا..... اگر ہم نے احقانہ قسم کی غلطیاں کیں اور جاری رہیں تو پھر سارا بھانڈا پھوٹ جائے گا..... کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں اور پھر یہ کاروبار بند کرنا پڑے گا۔“ گلاب آنا بند ہو جائیں گے.....“ اس کا نوکر پوچھتا کہ ہم میاں کئی لوگوں کی بنائیں گے.....؟ اگر اس شخص پر میں کڑی نگاہ نہ رکھتا تو میری توجہ بھی اس ابھارا اور انگوٹھی پر نہیں پڑتی..... اگر میں اسے بروقت اس شخص سے نہ نمٹتا تو معاملہ پولیس تک چلا جاتا..... مردہ خانوں سے حاصل کی ہوئیں لاوارث لاشوں کی میاں بنانا اتنا سنگین جرم نہیں جتنا کہ اپنے گاہکوں کی میاں بنانا..... تم میری بات سمجھ رہے ہونا.....“

”بد قسمتی سے شیام کمار کو یہ سب کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا۔“ چندرا دیوی نے قدرے توقف کے بعد کہا۔

چندرا دیوی مزید کچھ کہنے والی تھی کہ اندر سے شیام کمار کا لنگڑا ملازم جو دوسرے کمرے میں کھڑا ان کی گفتگو سن رہا تھا۔ ایک چھرا لے کر آیا..... تاکہ چندرا دیوی کے سینے میں اتار دے..... چندرا دیوی نے اسے بھی ساکت و جامد کر دیا۔

”یہ جو می ہے کیا یہ اس طرح بنائی گئی ہے جس طرح آپ نے بتائی ہے.....؟“ رند میر نے پوچھا۔

”ہاں.....“ چندرا دیوی نے جواب دیا۔ ”وہ غریب اسی طرح سے نشانہ بنا ہے جس طرح میں نے بتایا ہے۔“

”لیکن آپ نے یہ سب کچھ کیسے اور کیوں کر معلوم کر لیا.....“ رند میر نے ششدر ہو کر پوچھا۔

”میں ٹیلی بیٹھی جانتی ہوں..... میں نے شیام کمار کا ذہن پڑھ لیا تھا۔“ چندرا دیوی نے

جواب دیا۔

”اب آپ ان دونوں کے خلاف کیا کارروائی کریں گی.....؟“ رند میر بولا۔

”میں پولیس کو باخبر کر دوں گی.....“ چندرا دیوی بولی۔ ”وہ ایک گھنٹے کے اندر آ کر چھاپہ مارے گی..... قانون انہیں کیفر کردار تک پہنچا دے گا۔“

☆.....☆.....☆

چندرا دیوی نے آج پروگرام بتایا تھا کہ وہ سہ پہر کے وقت اپنی سہیلی اوشا کے ہاں جا کر وہاں سے اس کے ساتھ جو ہو کے ساحل پر جائے گی۔ جون کا مہینہ تھا۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ تفریح بھی ہو جائے گی۔ اوشا اسے بہت دنوں سے یاد کر رہی تھی۔ اس وقت وہ ریلوے اسٹیشن پر اپنی ایک سہیلی کرن کو رخصت کرنے آئی تھی جو اپنے میکے جا رہی تھی۔ گاڑی کی روانگی کے بعد جب وہ باہر جانے کے لئے بڑھی تو اسے ایک نسوانی آواز نے مخاطب کیا۔

”شریتمی جی.....! کیا آپ میری بات سننا پسند کریں گی.....؟“

اس آواز میں اپنائیت اور شناسائی کا انداز تھا لیکن چندرا دیوی کے لئے اس کی آواز میں نامانویت تھی۔

چندرا دیوی نے پلٹ کر دیکھا۔ جس عورت نے اسے مخاطب کیا تھا وہ اس کے لئے اجنبی تھی۔ پہلی بار وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ عورت اپنی وضع قطع اور چہرے مہرے سے کسی اچھے گھرانے کی لگ رہی تھی۔ وہ شادی شدہ لگ رہی تھی۔ اس کے گلے میں منگل سوتر پڑا ہوا تھا۔ نہایت حسین، دلکش..... تناسب چہرے بدن کی تھی۔ چہرے کے نقوش میں جو ٹیکہ پان تھا وہ دل کو چھو لینے والا تھا۔ آنکھیں بہت بڑی بڑی بھونرا جیسی کالی کالی تھیں اس کی گہرائیاں اتھاہ سمندر کی مانند تھیں۔

چندرا دیوی اس سے مسحور ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ چندرا دیوی نے محسوس کیا کہ وہ ہراساں اور پریشان سی ہے۔ لمبے سفر کی تھکاوٹ اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ اس نے بانیں ہاتھ میں چھوٹا سا لٹچی اٹھا رکھا تھا۔ جس میں چند جوڑے آ سکتے تھے۔ چندرا دیوی نے اس سے پوچھا۔

”فرمائیے..... میں آپ کی کیا سیوا کر سکتی ہوں..... معاف کیجئے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔“

”اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ یقیناً چندرا دیوی ہیں۔“ وہ سہیلی آواز میں بولی۔ ”کیا میں نے ٹھیک پہچانا؟“

”ہاں..... میں چندرا دیوی ہوں.....“ چندرا دیوی نے حیرت سے کہا۔ ”آپ نے مجھے کیسے

میں کیا بتایا.....؟“ چندرا دیوی نے دلا سادیتے ہوئے پوچھا۔
 ”شانتی دیدی نے مجھ سے آپ کے متعلق اتنا کہا تھا کہ چندرا دیوی اس دنیا میں ایک ایسی
 واحد ہستی ہے جو پراسرار اور طاغوتی قوتوں کا توڑ اور سد باب کر سکتی ہے..... کالا جادو ہو..... آسیب
 ہو..... کوئی بلا ہو..... اس کا اثر اس پر نہیں ہوتا ہے۔“
 ”شانتی نے غلط نہیں کہا ہے.....“ چندرا دیوی بولی۔ ”یہ ایک حقیقت ہے۔ لہذا تم سیر ہو کر
 کھانا کھاؤ۔“

چندرا دیوی کے دلاسہ نے نہ صرف اس کا دل خوش کر دیا تھا بلکہ اس کی بھوک بھی کھل اٹھی
 تھی۔ اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فراغت پانے کے بعد ٹھنڈا پانی کا ہاتھ بٹایا اور یہ
 کہہ کر چائے بنائی تھی کہ وہ بہت عمدہ چائے بناتی ہے۔ ٹھنڈا پانی چائے بنائی اور دونوں نشست گاہ
 میں آ بیٹھیں۔ چائے پیتے ہوئے چندرا دیوی نے اس سے کہا۔
 ”اب تم اپنی دکھ بھری پٹنا سناؤ..... لیکن مجھے تم ایک دوست..... سہیلی..... ہم درداور قلمس سمجھ
 کر من و عن سناؤ گی..... مجھ پر بھروسہ کر دو..... تمہارا راز میرا راز ہے..... وہ کسی بھی صورت میں اخفا
 نہ ہوگا۔“

”میں آپ سے کوئی بھی بات نہیں چھپاؤں گی..... اب آپ میری داستان غم سنیں۔“ پھر وہ
 کہانی سنانے لگی۔

”یہ تو آپ کے علم میں آ چکا ہے کہ میرا نام ٹھنڈا ہے اور آپ کے علم میں یہ بات بھی آئی ہے
 کہ میں جزیرہ مالدیپ سے آئی ہوں اور وہاں کی رہائشی ہوں..... میرے پتی کے والدین اس
 سنسار میں نہیں ہیں۔ ان کا کوئی بھائی نہیں..... البتہ ان کی تین بہنیں ہیں جو ماں باپ کی زندگی میں
 ہی بیابانی چاہتی ہیں۔ اور وہ آسام میں رہ رہی ہیں..... دو برس قبل میری شادی مالدیپ جزیرے ہی
 میں ہوئی تھی۔ میرے سر ایک چھوٹے سے زمیندار تھے۔ لیکن میرے پتاجی ایک بڑے زمیندار
 ہیں۔ ان کی خواہش سے میری شادی بڑی دھوم دھام اور روایتی انداز سے ہوئی..... میں مالدیپ
 جزیرہ کی سب سے حسین لڑکی تھی اور آج بھی کوئی عورت میری طرح حسین اور جاذبیت سے بھرپور
 نہیں ہے۔ میری خوب صورتی کی تعریف اور چہ چاسن کر میرے پتی پرکاش آئندہ نے اپنا رشتہ
 بھیجا..... یوں تو میرے لئے رشتوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ بڑے بڑے دولت مند گھرانوں سے رشتے
 آ رہے تھے۔ کیوں کہ ان کے چال چلن اچھے نہ تھے۔ دولت نے انہیں شرابی، کبابی اور آوارہ بنا دیا
 تھا۔ جو، عورت اور شراب سے دل بہلاتے تھے۔ میرے پتاجی نے اس لئے پرکاش کا رشتہ قبول
 کر لیا تھا کہ وہ نیک، مخلص اور سلجھے ہوئے نوجوان تھے۔ کسی برائی میں نہ تھے۔ مالدیپ جزیرہ میں وہ

پہچان لیا.....؟“
 ”مجھے آپ کے متعلق شانتی کانت نے بتایا تھا..... اس نے آپ کے حسن کی جو تعریف کی
 تھی۔ اس کے ناتے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا..... آپ کے حسن کی تعریف کے لئے میرے پاس
 الفاظ نہیں ہیں..... واقعی آپ جیسی حسین عورت اس سرزمین پر نہ ہوگی۔“
 شانتی اس کی بچپن کی سہیلی تھی۔ شادی کے بعد وہ شانتی کانت ہو گئی تھی۔ اس کا پتی سرکاری
 ملازم تھا۔ شادی کے بعد اس کے پتی کا مالدیپ جزیرہ تبادلہ ہو گیا تھا۔ شانتی کا ذکر ہوتے ہی اس کی
 یاد بے اختیار آتی تھی۔

”شانتی کیسی ہے.....؟ کانت بھیا کیسے ہیں.....؟ وہ مجھے بہت یاد آتی ہے.....؟“ چندرا
 دیوی بولی۔

”اچھی طرح..... جب بھی ان سے ملاقات ہوتی ہے صرف آپ کی باتیں اور آپ کی
 تعریف ہی کرتی رہتی ہیں۔ انہوں نے آپ کے نام ایک چٹھی لکھی ہے۔“ اس نے پرس سے لفافہ
 نکال کر چندرا دیوی کی طرف بڑھایا۔ ”آپ پڑھ لیں.....“
 چندرا دیوی نے لفافہ لے کر چاک کیا۔ اندر سے چٹھی نکال کر پڑھنا شروع کیا۔

میری جان شانتی.....!
 تو مجھے کتنا یاد آتی ہے ٹھنڈا سے پوچھ لینا۔ اب جون کے مہینے میں کانت کو ایک ماہ کی چٹھی
 ملے گی۔ تب میں آؤں گی..... میں ٹھنڈا کو ایک ضروری کام سے تیرے پاس بھیج رہی ہوں۔ یہ
 میری بڑی پیاری سہیلی ہے..... اس پر ایک افتاد نازل ہو گئی ہے..... جس نے اس کی اور اس کے پتی
 کی زندگی اجیرن کر دی ہے۔ رات کی نیندیں حرام کر دی ہیں۔ اس کی بچا بڑی دردناک ہے۔ اس کی
 پریشانی..... خوف و دہشت تو ہی دور کر سکتی ہے..... تو سن لے..... پر تجھے یہاں آنا پڑا ہے تو..... تو
 ضرور آنا..... تیری اپنی شانتی کانت

چندرا دیوی اسے اپنے فلیٹ پر لے آئی۔ وہ دور دراز کے سفر سے آئی تھی اس لئے چندرا نے
 اس سے کہا کہ وہ نہہا کر تازہ دم ہو جائے۔ جب وہ نہہانے کے لئے چلی گئی تو چندرا دیوی نے کھانا تیار
 کر کے میز پر چن دیا۔ وہ نہہا کر آئی تو اس کا حسن اور نکھر گیا تھا۔ کھانے کی میز پر چندرا دیوی نے
 محسوس کیا کہ وہ کھانا ٹھیک نہیں کھا رہی ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ پریشانی اور ہراساں ہونے کے باوجود کھانا
 نہیں کھا رہی ہے۔

”سنو بہن ٹھنڈا.....! تم کسی بات کی چٹا نہ کرو..... تمہارا مسئلہ کتنا ہی گھمبیر، خوف ناک اور
 ناممکن کیوں نہ ہو میں اسے حل کر دوں گی..... تم صبح جگہ آئی ہو..... شانتی نے تمہیں میرے بارے

ایک مثالی نوجوان سمجھے جاتے تھے۔ وہ خوب صورت، وجہہ اور دراز قد بھی تھے۔ میں اس بات پر خوش اور نازاں تھی کہ مجھے ایک اچھا پتی مل گیا ہے۔ ان کے اخلاق کی سبھی تعریف کرتے تھے۔ ایک دن ان کی ایک رشتہ دار میرے ہاں آئی تو اس نے میرے پتی سے دریافت کیا کہ.....

”تم کیا شکنتلا سے خوش ہو؟“

انہوں نے جواب دیا تھا کہ ”میری بیوی نہایت خوبرو ہے، یہ سارا مال دیپ جزیرہ جانتا ہے..... میرے اندازے سے کہیں زیادہ سکھڑ، سلیقہ شعار اور اچھی سیرت کی مالک بھی ہے۔ میں اپنی قسمت پر نازاں ہوں..... ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ایک عورت میں بہت ساری خصوصیات جمع ہو جائیں۔“ اپنے پتی کے منہ سے اپنی تعریف سن کر مجھے کتنی خوشی ہوئی بیان نہیں کر سکتی۔ اس تعریف نے ہماری محبت کے رشتے کو لازوال بنا دیا تھا۔

شادی کے بعد میرے پتی نے محسوس کیا کہ میں اپنے میکے جانا پسند نہیں کرتی ہوں۔ کبھی میرے پتا جی مجھے لینے آئے اور بہت زیادہ اصرار کیا تو صبح جا کر شام کو آ گئی۔ ایک دن سے زیادہ ٹھہری نہیں۔ حالاں کہ لڑکیاں شادی کے بعد میکے جانے کے لئے بے چین رہتی ہیں۔ جب وہ اپنے میکے جاتی ہیں تو اس طرح خوش ہو جاتی ہیں کہ قید سے رہائی پا کر جاری ہوں۔ میرے پتی یہ کہتے تھے کہ مجھے ان سے چوں کہ بہت محبت ہو گئی ہے اور ان کی جدائی میرے لئے سوہان روح بن جاتی ہے۔ اس لئے میں میکے جانا نہیں چاہتی ہوں۔ حالاں کہ میکے مال دیپ ہی میں اور دس بارہ میل کی دوری پر تھا لیکن اس کے باوجود میں نہیں جاتی تھی۔ میرے پتی کہتے کہ..... ”آخر تم جاتی کیوں نہیں ہو؟..... شادی کے بعد سے تم ان دو برسوں میں پورے دو دن کبھی نہیں رہیں۔ جب کہ تمہارے ماں باپ چاہتے ہیں کہ دو ایک دن تو رہ جاؤ.....“ میں جواب دیتی کہ آپ نے مجھ پر اپنی محبت کا جو جادو کیا ہے وہ دنیا کے ہر بڑے سے بڑے جادو سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اب یہ میرا گھر ہے۔ مجھے نہ صرف اس گھر سے بلکہ آپ سے اتنی شدید محبت ہو گئی ہے کہ میرا دل نہیں چاہتا کہ ایک دن کیا ایک لمحہ کے لئے بھی آپ سے جدا اور قرب سے دور رہوں.....

میں آپ کو بتا دوں کہ ہمارا مکان دو منزلہ ہے۔ دوسری منزل پر ہماری رہائش ہے۔ پہلی منزل پر میرے پتی نے اناج کا گودام بنا رکھا ہے۔ سب سے نیچے نو کمریاں بیوی رہتے ہیں۔ جب بارش شروع ہوئی تھی تب ہم میاں بیوی طوفان کی زد میں آ گئے تھے۔ وہ کسی تھکے ماندے مسافر کی طرح گہری نیند سو رہے تھے۔ میں بھی بے حال اور تھکن سے چور چور تھی۔ جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔ گرمی اور جس کی وجہ سے میری نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد میرے پتی کی میری دلخراش چیخ کی آواز کے ساتھ ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ

بڑبڑا کر اٹھ بیٹھے..... میرے منہ سے ایک اور چیخ نکل گئی۔ انہوں نے حیران ہو کر مجھ سے پوچھا کہ یہ کس کی چیخ تھی.....؟ پھر انہیں احساس ہو گیا کہ یہ میری چیخ تھی۔ انہوں نے گھبرا کر میری طرف دیکھا اور بولے۔ ”کیا بات ہے شکنتلا تمہارا چہرہ سفید کیوں پڑتا جا رہا ہے..... تمہارے چہرے پر لہو کی ایک بوہ بھی نظر نہیں آ رہی ہے.....؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نا.....؟“

میری آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں اور میرا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ میں ان سے لپٹ گئی۔

”ہاتھ..... ہاتھ..... وہ ہاتھ پھر آ گیا ہے.....؟“ میں نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

”کون سا ہاتھ.....؟ کس کا ہاتھ.....؟“ انہوں نے میرا شانہ تھپ تھپاتے ہوئے دریافت کیا۔

”اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا لیکن کھڑکی کی طرف دیکھا نہیں..... نہ مجھ میں اتنی ہمت تھی کہ کھڑکی کی طرف دیکھوں..... میں نے ان کے چوڑے چٹکے سینے میں اپنا چہرہ چھپا کر دیکھا۔ میں خزاں رسید پتے کی طرح کا مٹنے لگی۔ انہوں نے فوراً ہی مجھے اپنی آغوش سے نکال کر ایک طرف ہٹایا تا کہ کھڑکی کے پاس جا کر دیکھیں۔ میں نے فوراً ہی ان کا ہاتھ تھام لیا۔“ نہیں..... نہیں..... آپ نہ جائیں۔“ میں نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

”تم ڈر کیوں رہی ہو.....؟ میں کھڑکی کے پاس جا کر دیکھتا ہوں..... شاید کوئی چور ہوگا جو کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھ کر اوپر آنے کی کوشش کر رہا ہوگا۔“

جب وہ بستر سے اترنے لگے تو میں نے ان کا بازو تھام لیا اور گڑ گڑانے لگی کہ..... ”بھگوان کے لئے آپ نہ جائیں..... وہ ہاتھ کہیں آپ کا گلہ نہ بادے.....“ میں خوف کی وجہ سے اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ میرے پتی نے اس بات کا احساس کرنے کے باوجود اپنا بازو چھڑایا اور کھڑکی کے پاس جا کر باہر جھانکا اور چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ اس کھڑکی سے انہیں کچھ نظر نہ آیا تو انہوں نے دوسری کھڑکیوں کے پاس جا کر چند لمحوں تک جھانکا پھر میرے پاس آ کر بولے۔ ”دور دور تک کسی ہاتھ یا کسی چیز اور آدنی کا نام و نشان تک نہیں ہے۔“

پھر انہوں نے بستر پر آ کر مجھے اپنی آغوش میں لے کر تسلی دی کہ..... ”کوئی ہاتھ وغیرہ نہیں ہے..... تم نے شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے..... جیسے ہی تمہاری آنکھ کھلی تمہیں وہم ہو گیا کہ کوئی چور چوٹ پر ہاتھ رکھ کر کمرے میں داخل ہونے کے لئے چڑھ رہا ہے.....“

ان کے دلا سے میرا خوف کسی حد تک کم ہو گیا..... لیکن میں نے اصرار کیا کہ میں تمام کھڑکیوں کے پٹ بند کر دوں.....

پھر انہوں نے مجھے سمجھایا کہ..... اس طرح تو کمرے میں گھٹن ہو جائے گی۔ اس لئے کہ پہلے ہی ہوا بند ہے۔ کمرے میں گھٹن ہو جائے گی..... اور جس بھی ہوا ہے۔ ان کی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ تب میں نے منہ پر چادر رکھ لیا اور بستر پر دراز ہو گئی تاکہ میں اس ہاتھ کو دوبارہ نظر آنے کی صورت میں نہ دیکھ سکوں۔ تیرے چہرے پر خوف جو چھایا ہوا تھا۔ اسے بھانپ کر انہوں نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ میرا خوف کم اور دور کرنے کے لئے ان کے ہونٹوں نے میرے چہرے اور ہونٹوں پر بوجھ کر دی..... میں گرم جوشی اور خود سپردگی سے اس لئے پیش نہ آ سکی کہ مجھے نیند کی دیوی لوریاں دینے لگی تھی۔ میں جلد ہی سو گئی..... صبح بیدار ہوئی تو نیند کی حالت میں، میں نے جو ڈراؤنے خواب دیکھے تھے وہ ذہن پر بوجھ بنے ہوئے اور سینے میں وحشت سی ہو گئی تھی۔ میرے پتی نے بتایا کہ..... ”تم سو تو گئی تھی لیکن نیند کی حالت میں بڑبڑاتی رہی تھی۔ ہاتھ..... شیطانی ہاتھ..... مجھے بچاؤ..... بچاؤ.....“

میرے پتی نے کہا کہ ”میں سمجھ گیا ہوں کہ تم نے بہت زیادہ جذباتی اثر لے لیا ہے..... ہاتھ تمہارے اعصاب پر کسی آسب کی طرح سوار ہو گیا ہے..... بعض اوقات ڈراؤنے خواب انسانی ذہن پر بہت زیادہ انداز ہوتے ہیں۔ لہذا اس خواب کو بھول جانے کی کوشش کرو۔“ جب صبح میں بیدار ہوئی تھی تو سہمی ہوئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ میری طبیعت نارمل ہو گئی تھی۔ دو راتیں خیریت، سکون اور اطمینان سے گزر گئیں۔ میرے سینے میں وحشت جو تھی وہ ختم ہو گئی تھی۔ جو ہاتھ میں نے دیکھا تھا وہ نظر نہ آیا۔ تیسرے دن رات کے وقت بارہ بجے تک ہم دونوں جاگتے، پیار و محبت کی دنیا میں بہت دیر تک بیٹکتے اور سرشار ہوتے رہے۔ اس لئے بھی کہ چاندنی رات تھی چاندنی راتیں عورت کو بہت زیادہ جذباتی بنا دیتی ہیں۔ سفر سے واپس پر وہ اتنے تھکن سے دوچار تھے کہ نیند نے انہیں جلد ہی آغوش میں لے لیا..... یوں تو میں بھی بڑے حال سی تھی کہ لیکن مجھ پر جو سرشاری تھی اس نے سوئے نہیں دیا۔ جیسے یہ سہاگ رات تھی۔

رات کے وقت ایک بجے کا عمل ہو گا۔ میں نے اپنے پتی کا شانہ بری طرح جھنجھوڑ کر نیند سے بیدار کر دیا۔ میرے پتی نے چونک کر میری شکل حیرت سے دیکھی۔ اس وقت میری حالت مردے سے بھی بدتر ہو رہی تھی۔ میرا سارا بدن تھر تھرا کانپ رہا تھا۔ میں نے پھر اسی کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہنا چاہا تو میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ چند لمحوں کے بعد میں بدقت اتنا کہہ سکی۔

”ہاتھ.....؟“

میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے کہیں گے کہ تم نے پھر کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ لیا ہے..... یہ تمہارا

واہمہ ہے..... لیکن یہ کہنے کے بجائے وہ بڑی سرعت سے کھڑکی کی طرف لپکے۔ انہوں نے کھڑکی کے پاس پہنچ کر باہر جھانکا..... پھر وہ سر اور جسم کمر تک نکال کر جھانکنے لگے۔ تھوڑی دیر تک جھانکنے کے بعد میرے پاس آ کر بولے۔

”میں نے چاروں سمتوں میں دیکھا.....“ حدنگاہ تک کسی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ البتہ میں نے اس کا لی بلی کو جو گھر کے باہر روت نظر آتی ہے۔ عقی دروازے کے پاس بیٹھا ہوا پایا ہے۔ تم نے جو ہاتھ دیکھا ہے میرے خیال میں وہ تمہارے اعصاب پر مسلط ہو کر رہ گیا ہے۔“

میں انہیں کیا بتاتی اور کیا کہتی..... بتانے کی بات نہیں تھی۔ کیوں کہ وہ پتی تھے۔ میرا سینہ بری طرح دھڑک رہا تھا۔ سانسوں کا زبردیم قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ اس روز آسمان صاف تھا اور چاندنی رات بھی تھی۔ انہوں نے مجھے ایک گلاس پانی پلایا تو میرے حواس قدرے بحال ہوئے۔ میں نے انہیں ان کے پوچھنے پر مختصر طور پر صرف اتنا بتایا کہ ”ایک خوفناک قسم کا کالا ہاتھ کھڑکی کی چوٹ پر ابھرا تھا جسے دیکھتے ہی میں چیخ پڑی تھی.....“ اصل بات یہ تھی کہ طوفان کے گزرنے کے بعد تو میرے پتی کپڑے پہن کر بستر پر دراز ہوئے تو ان کی آنکھ فوراً لگ گئی تھی۔ لیکن مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ میں شب خوابی کا لباس جو سرہانے کی میز پر ہاتھ اسے پہن لوں اور کمرے میں جو روشنیاں ہو رہی ہیں انہیں گل کر دوں..... معامیری نگاہ کھڑکی کی طرف اٹھی تو ایک مرد کا چہرہ دیکھا۔ میں نے اسے اپنی طرف بڑی محویت اور ہوس بھری نگاہوں سے دیکھ پایا۔ معلوم نہیں وہ کب سے دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ایک دم سے خوف ناک ہاتھ میں تبدیل ہو گیا۔ میرے سارے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اس ہاتھ کو دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ میں ایک چیخ مار کر پتی سے لپٹ گئی۔ اگر میں اپنے پتی کو بتاتی ایک انسانی چہرہ کھڑکی کی چوٹ سے مجھے گھور رہا تھا..... میرے بیدار ہوتے ہی وہ خوف ناک، مکرور اور سیاہ ہاتھ میں بدل گیا..... میری اس بات کا انہیں یقین نہیں آتا..... یہ کیسے ہو سکتا ہے..... وہ اس لئے شک میں مبتلا ہو جاتے کہ میں فطری حالت میں تھی۔ میں یہ بات دانستہ گول کر گئی تھی۔

میں اس ہاتھ کو دو ایک مرتبہ دیکھ چکی تھی..... اور پھر وہ چہرہ جس نے مجھے بے حجابی کی حالت میں دیکھا تھا اور پھر خوفناک سیاہ ہاتھ میں تبدیل ہو گیا تھا..... یہ واہمہ نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ میں اسے کسی صورت سے جھٹلا نہیں سکتی تھی۔ میں نے اپنے پتی کی بات رکھنے کے لئے کہہ دیا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں..... میں نے اپنا واہمہ جھٹک دیا ہے۔ آپ فکر مند، پریشان اور اذیت میں مبتلا نہ ہوں۔“

میری بات سن کر میرے پتی بہت خوش ہوئے۔ وہ اس لئے بھی خوش ہوئے تھے کہ میں ایک

دم مارل سی ہوگئی تھی..... لیکن ہم دونوں کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی تھی..... وہ اس لئے بھی بہت زیادہ خوش تھے کہ ایک اذیت سے نجات ملی۔ لیکن میں جانتی تھی یہ خوشی دیر پا ثابت نہیں ہوگی۔ یہ خود فریبی ہے۔ لیکن یہ بات اپنے بچے کو سمجھانے سے رہی تھی۔

چوتھے روز میں نے کہا کہ اپنا ایک بہترین جوڑا پہنا جو میرے بچے نے شادی کی پہلی سالگرہ پر تحفہ میں دیا تھا۔ پھر میں اپنی خالہ سے ملنے ملازمہ کے ساتھ چلی گئی۔ وہ میرے والدین کے گھر کے پاس ہی رہتی تھیں۔ میں نے اپنا وقت ان کے ہاں اور ماں باپ کے ہاں بھی گزارا تھا۔ میں سرشام گھر آئی بہت خوش تھی۔ اس رات ہم دونوں نے خوشی منا کر سوئے بارہ بج چکے تھے۔ ہم دونوں محکم کے باعث گہری نیند میں سو گئے۔

اس رات بھی کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ آسان گہرے سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ مغرب کے بعد وہاں اچانک چاروں سمتوں سے بادل اُٹ اُٹے تھے۔ تھوڑی دیر تک موسلا دھار بارش بھی ہوئی تھی۔ اس کے بعد بارش کا سلسلہ ختم کیا۔ گرمی اور جس کا وہی عالم تھا جو کئی دنوں سے چلا آ رہا تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں میرے بچے نے بتایا کہ..... میں اچانک نیند سے بیدار ہو گیا..... گہری نیند سے اس طرح بیدار ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی..... جس تو تھا لیکن چمت کا پکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا..... میں نے پھر سونے کی کوشش کی تو لگا میری نیند آنکھوں سے کوسوں دور ہے..... پھر میں نے تمہاری طرف کر دئی۔ اور پھر محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ تم گہری نیند میں غرق تھیں..... تمہارے لمبے ریشمی سیاہ بال نیچے پر بکھرے ہوئے تھے..... تمہارے حسین چہرے پر ایک معصوم مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ لیکن تم سو رہی تھیں۔ لیکن تمہارا حسن جاگ رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا اور گہرا ہو گیا..... اتنا گہرا کہ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دے رہے تھا۔ حتیٰ کہ تمہارا چہرہ بھی جو سرخ و سفید ہے۔ اندھیرے کی آغوش میں سا گیا تھا۔ آسان پر مشرقی افق سے اور گہرے بادل بھی آئے اور چائے تھے۔ دوسرے لمحے زوردار بارش شروع ہوگئی تھی۔ اس بارش نے میرے جذبات میں مل چلی سی مچادی تھی۔ میں کھڑکی کے پاس سے جھٹ کر بستر پر آیا اور تمہارے پاس دراز ہو گیا۔

بہ شکل چھ سات منٹ گزرے ہوں گے میں نے اپنے ہاتھ کی پشت پر ہاتھ کا لمس محسوس کیا..... میں سمجھا کہ یہ تمہارا ہاتھ ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے محسوس کیا کہ اس ہاتھ میں تمہارے ہاتھ کی وہ پھولوں جیسی نرمی..... محبت کی گرمی اور گداز پن نہیں ہے..... انگلیاں بھی پتلی، لمبی اور نازک سی نہیں ہیں..... یہ کوئی اور ہی ہاتھ ہے بے حد سرد..... جیسے برف کا تو وہ..... اس میں کھر دراپن ہے..... فولا جیسی سختی ہے..... انگلیاں موٹی اور سلاخوں جیسی ہیں..... پھر وہ ہاتھ میرے

ہاتھ پر کسی کن کھجورے کی طرح رینگنے لگا۔ میرے سارے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ ہوگئی اور رگوں میں لہو ٹنجد ہونے لگا۔ اس لمحے سب سے پہلے جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ کہیں وہ پراسرار..... خوف ناک، سیاہ اور سرگرد ہاتھ تو نہیں ہے جو تم دو تین بار دیکھ چکی ہو..... شاید یہ کسی بد معاش کا ہو جو تمہارا ہاتھ سمجھ کر اس پر رینگ رہا ہو۔

یہ خیال آتے ہی میں نے اپنے حواس اور اپنی ساری قوت مجتمع کی اور اپنی پوری قوت سے اپنے ہاتھ کو کھینچ کر ایک دم سے جھٹکا۔ پھر میں نے فرش پر دھپ سے کسی چیز کی آواز سنی..... پھر میں بجلی کی سی تیزی سے پٹنگ سے کود کر نیچے آیا اور سوکچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ فوراً سوکچ آن کیا..... کمر ایک دم سے روشنی میں نہا گیا۔ میں نے دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہیں ہے۔ میں نے فوراً ہی فرش کی طرف اور پٹنگ کے نیچے جھانک کر دیکھا..... شاید وہ بد معاش پٹنگ کے نیچے نہ چھپا ہو۔ معامیری نظر سامنے والی کھڑکی پر پڑی تو میں دم بخود کھڑا رہ گیا۔ میرا دل دھڑکنے لگا بھول گیا۔ میں نے جو منظر دیکھا وہ ناقابل یقین تھا.....

میں نے کھڑکی کی چوکت پر ایک سیاہ رنگ کا انتہائی بد صورت اور سرگرد ہاتھ دیکھا..... یہ ہاتھ کلائی تک کٹا ہوا تھا۔ میرے سارے بدن پر جھرجھری بجلی کی رو کی طرح دوڑ گئی۔ مگر میں مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو یقیناً بے ہوش ہو جاتا اور فرش پر گر جاتا..... جتنی دیر میں میں نے ہندوق اشائی اتنی دیر میں وہ منہوس ہاتھ نظروں سے گدھے کے سر کے سینک کی طرح غائب ہو گیا۔ کمرے میں روشنی ہونے کے باعث تمہاری آنکھ کھل گئی۔ تم نے گہرا کر پوچھا کہ کیا بات ہے۔ جب میں نے تمہیں اس کئے ہاتھ کا واقعہ سنایا تو تمہارا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ تم رونے لگیں۔ تمہارے آنسوؤں نے میرا سینہ بھگودیا اور میں نے تمہیں سمجھایا کہ رونے دھونے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا..... میرے پوچھنے پر وہ بولے کہ ہمارا کوئی دشمن ہے۔ جو سغلی علم سے ہماری جان لینے کی کوشش کر رہا ہے۔ تم پریشان اور فکر مند نہ ہو میں کل ہی کسی پنڈت یا سادھو مہاراج سے مل کر اس ہاتھ کے بارے میں دشمن کے جادو کا توڑ کرتا ہوں۔

میرے بچے ناشتا کرنے کے بعد کسی پنڈت کی تلاش میں چلے گئے۔ جب وہ دن ڈوبنے سے پہلے گھر آئے تو انہوں نے مجھے دیکھا۔ میں اس وقت بے ہوشی کی حالت میں پڑی تھی۔ بستر پر دراز تھی۔ میرے پاس میری خالہ پریشان اور ہراساں سی بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے..... میں تھوڑی دیر پہلے ہی بے ہوش ہوئی تھی۔ ایک ملازم ڈاکٹر کو لینے گیا ہوا تھا۔ وہ پنڈت جی کو کمرے میں لے کر آئے۔ انہوں نے ایک گلاس پانی منگو کر اس پر کوئی منتر پڑھ کر پھونکا۔ پھر اس پانی کے کچھ چھینٹے میرے منہ پر مارے۔ چند لمحوں کے

بعد مجھے ہوش آنے لگا۔

جب میں پوری طرح ہوش میں آگئی اور چاروں طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔ جب میں نے اپنے پتی اور ملازموں کو دیکھا تو میرا خوف و ڈر بڑی حد تک کم ہو گیا۔ مجھے ہوش میں دیکھ کر میرے پتی پنڈت جی کو نشست گاہ میں لے گئے۔ پھر انہوں نے نوکروں سے کہا کہ رات کا کھانا تیار کریں۔ جب نوکر کمرے سے نکل گئے تو میں اور خالہ کمرے میں رہ گئیں۔ تب انہوں نے آکر مجھ سے دریافت کیا کہ کیا واقعہ پیش آیا تھا؟

میں نے اپنے پتی کو بتایا دوپہر کے کھانے سے فراغت پانے کے بعد میں کچھ دیر تک بیٹھی اخبار پڑھتی رہی۔ جب مجھے جمائیاں آنے لگیں تو میں نے دروازہ بند کیا اور سونے کے لئے بستر پر دراز ہو گئی۔ گہری نیند سونگئی۔ سونے سے پہلے میں نے تمام کھڑکیاں بند کر لی تھیں۔ میری آنکھ کھلی تو میں نے دروازے پر دستک کی آواز سنی۔ اسی دستک سے میری نیند ٹوٹی تھی۔ میں سمجھی کہ آپ آگئے ہیں۔ میں نے بستر سے نکل کر لباس اور بالوں کو درست کیا۔ میں نے دروازہ بھی نہیں کھولا تھا کہ دوبارہ دستک ہوئی۔ میں نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ پھر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ باہر کوئی بھی نہیں ہے۔ راہ داری خالی پڑی ہے۔ کمروں کے دروازے بند تھے اور ان کی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔

معا میری نگاہ فرش پر پڑی تو میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ایک خوفناک بد صورت اور کٹا ہوا ہاتھ میرے پیروں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ اس ہاتھ کو دیکھ کر میری روح فنا ہو گئی۔ معلوم نہیں اس وقت میرے اندر اتنی طاقت کہاں سے آگئی کہ میں نے اس ہاتھ کو پوری قوت سے لات رسید کی۔ وہ راہداری میں قدرے دور جاگرا۔ میں نے جھٹ سے دروازہ بند کر کے اندر سے چٹنی لگا دی۔ پھر دروازے سے ٹیک لگا کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔ چند لمحوں کے بعد میری سانسیں اور دل قابو میں آیا تو کھڑکی کی طرف سرعت سے بڑھی تاکہ پٹ کھول کر نوکروں کو آواز دے کر بلاؤں۔ کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے قدم یک لخت رک گئے اور میرے جسم کا سارا خون خشک ہو کر رہ گیا۔ دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ کٹا ہوا بد صورت اور مکروہ ہاتھ قالین پر کھڑا ہوا تھا۔ اور میری طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے ایک زوردار دل خراش چیخ ماری اور پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ لیکن اس ہاتھ نے میرے دائیں پیروں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ اس ہاتھ کی گرفت اتنی سخت تھی کہ مجھے اپنے پیروں کی ہڈی چٹنی محسوس ہونے لگی۔ میں زور زور سے چیختی لگی۔ پھر میں دہشت سے بے ہوش ہو گئی۔ پھر کیا ہوا مجھے معلوم نہیں۔

پنڈت جی نے کمرے میں جانے سے پہلے ہم سے ایک لوہے یا لکڑی کا صندوقچہ منگوایا

تھا۔ ہم نے ایک لوہے کا صندوقچہ فراہم کر دیا۔ ساری رات ہم میاں بیوی نے آنکھوں پر کاٹی۔ رات کے دو بجے ہم نے اوپر والے کمرے سے پنڈت جی کی گرج دار آوازیں سنیں۔ بھونڈے۔ بھیا نک اور بے ہنگم قہقہوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی رہیں۔ پو پھونٹنے کے بعد پنڈت جی نیچے آئے تو ان کے ہاتھ میں وہ صندوقچہ تھا جو ہم نے ان کے طلب کرنے پر دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ اس ہاتھ کو انہوں نے اس صندوقچے میں قید کر دیا ہے۔ لہذا اسے دریا میں بہت دور جا کر پھینک دیا جائے۔ ناشتہ کرنے کے بعد میرے پتی اس صندوقچے کو دریا میں پھینکنے کے لئے لالچ بوٹ میں روانہ ہوئے۔ میرے پتی نے ان سے پوچھا کہ۔۔۔۔۔ یہ ہاتھ کیا بلا ہے۔۔۔۔۔؟ یہ عفریت بن کر تنگ کرتا رہا ہے۔۔۔۔۔؟

پنڈت جی نے میرے پتی کو یہ جواب دیا کہ یہ کٹا ہوا ہاتھ بلا نہیں بلکہ ایک انسانی ہاتھ ہے۔۔۔۔۔ یہ تمہاری بیوی کا بدترین دشمن ہے۔۔۔۔۔ چوں کہ تمہاری حسین و جمیل بیوی نے اس کی محبت کا جواب نفرت، غصے اور حقارت سے دیا اور اس کی کوئی بات نہیں مانی۔ اس سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ تمہاری پتی کی عزت کا دشمن بن گیا تھا۔ تمہاری پتی نے اپنی عزت پر آج آنے نہیں دی۔۔۔۔۔ یہ اس علاقے میں چھپا ہوا تھا تا کہ انسان کے روپ میں آکر تمہاری پتی کی عزت سے جی بھر کے کھیل سکے۔۔۔۔۔ چوں کہ تمہاری پتی ایک نیک ہستی اور پاک دامن ہے اس لئے بھگوان نے اس کی رکھشا کی۔ اسے اس بات کا دکھ، غصہ اور نفرت تھی کہ تمہاری بیوی نے اس سے نہ صرف شادی سے انکار کیا اور اپنی عزت بھی محفوظ رکھی۔۔۔۔۔

میرے پتی نے یہ لالچ بوٹ جو کرائے پر لی تھی اس سے دو کام لئے۔ ایک تو بہت دور جا کر صندوقچے کو دریا برد کر دیا۔ پھر پنڈت جی کو بھی چھوڑ آئے۔ پنڈت جی نے میرے پتی کو اس کٹے ہوئے ہاتھ کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا کوئی مبالغہ نہیں تھا۔ پنڈت جی کی ایک ایک بات بالکل سچ تھی۔۔۔۔۔ میں دل میں سخت حیران تھی انہیں ان تمام باتوں کا کیسے پتا چل گیا؟۔۔۔۔۔ یہ باتیں میرے پتی کے علم میں نہیں تھیں اور نہ ہی انہیں اعتماد میں لیا تھا۔ اس لئے کہ یہ سب باتیں بتانے کی نہیں تھیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری زندگی میں ایک دل دہلا دینے والا واقعہ پیش آئے گا۔ میں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میرے پتی میرے کردار اور اس کٹے ہاتھ کے متعلق جان کر بدظن نہ ہو جائیں۔ از دو اجی زندگی میں کتنی اور بدگمانی کا زہر سہايت کر کے بسا بسایا گھر اجاڑ دے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جس بات سے میں ڈر رہی تھی۔۔۔۔۔ میرے پتی نہ صرف وسیع الخیال ہیں بلکہ ٹھنڈے مزاج کے بھی ہیں۔ انہوں نے نہ تو اس موضوع پر کوئی بات کی اور نہ ہی میرے ماضی کے متعلق کریدا۔

اس بد صورت..... خوف ناک اور شیطانی ہاتھ سے نجات پانے کی خوشی میں دودن کے بعد میرے پتی نے دعوت عام کا اہتمام کیا۔ گاؤں والوں اور غورتوں نے اس دعوت عام کے بارے میں معلوم کیا تو ان سے یہ کہہ دیا کہ چوں کہ کاروبار میں بہت فائدہ ہوا ہے اس لئے انہیں بھی خوشیوں میں شریک کیا گیا ہے۔ یہ دعوت دوپہر سے سہ پہر تک جاری رہی تھی..... ظاہر ہے اس ہاتھ نے اس قدر دہشت زدہ کیا تھا کہ اس نے چھین سکون عارت کر دیا تھا۔ رات کی نیندیں حرام ہو کر رہ گئی تھیں۔

دو مہینے کا عرصہ خیر و عافیت سے گزر گیا..... ایک تو دل سے اس کا ڈر خوف نکل گیا تھا اور دوسرا یہ کہ ان واقعات کو ہم دونوں بھول گئے تھے۔ دو ایک مرتبہ میرے پتی کو کاروبار کے سلسلے میں سری لنگا جانا پڑا تھا..... میرے پڑوس میں ایک نوجوان لڑکی تھی۔ میں اسے ساتھ سلا لیتی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی بستر پر سوئی تھیں۔ مسہری اتنی بڑی تھی کہ چار افراد بیک وقت سو سکتے تھے۔ اب مجھے کوئی خوف اور ڈر محسوس نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے کہ میرا اعتماد لوٹ آیا تھا۔

مالدیپ جزیرہ کے بارے میں یہ بتاتی چلوں شاید آپ بھی واقف ہوں گی کہ یہ چھوٹے بڑے ساڑھے تین ہزار جزیروں پر مشتمل ہے..... اس جزیرے کی آمدنی سیاحوں سے ہوتی ہے..... اس جزیرے کا پانی اس قدر صاف شفاف ہے کہ کوئی پانی میں کتنی ہی گہرائی میں کیوں نہ جائے اس طرح دکھائی دیتا ہے جس طرح ایک آدمی بے لباس..... دنیا میں کہیں بھی دریا کا پانی صاف و شفاف اور خوب صورت نہیں..... سیاح تفریح و طبع کے لئے آتے ہیں..... خصوصاً وہ غیر ملکی سیاح جو جلدی امراض کا شکار ہوتے ہیں..... ان کے جسموں پر دانے ہوتے ہیں..... جنہیں خارش ہوتی ہے..... وہ نہانے کے بعد بدن خشک کر کے کریم اور لوشن لگاتے ہیں۔

جس سے تب کہیں جا کر انہیں جلدی امراض سے نجات مل جاتی ہے..... پورپی مرد عورت سیاح سن ہاتھ لینے بھی آتے ہیں تاکہ ان کی گوری رنگت سانولی ہو جائے..... انہیں سانولی رنگت میں بے حد کشش اور دل کشی نظر آتی ہے..... ان جزائر پر مکان، ہوٹل، مہمان خانے اور ہوٹل ہوتے ہیں..... اور لوگ اپنے مکانوں کو ہوٹل کی طرح بنا رکھا ہے۔ امریکی ڈالر، یورو اور پونڈ کرنسی ان کی آمدنی ہے۔ زرعی ملک بھی ہے..... یہاں جو اشیاء آتی ہیں وہ چارٹرڈ ہوائی جہازوں سے.....

ستمبر کا پہلا ہفتہ تھا۔ میرے گھر والے..... والدین، بھائی اور بہنیں تین دن رہ کر گئے تھے..... ان کا جزیرہ میرے جزیرے یعنی دارالحلافہ سے بہت دور تھا۔ اس لئے بھی میں نے انہیں تین دن روک لیا۔ میں نے ان کی روانگی کے وقت ان سے کہا کہ آئندہ ہفتے میں میکے آ کر ایک ہفتہ رہوں گی۔ انہیں یقین نہ آیا..... اور ان کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔ وہ لوگ میری زبان

سے یہ الفاظ سننے کے لئے کب سے تڑپ رہے تھے۔ میں اور میرے پتی نے دانستہ اس کئے ہوئے ہاتھ کا واقعہ انہیں نہیں سنایا تھا۔

میرے پتی مجھے خوش دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے..... آخر وہ کیوں نہ خوش ہوں۔ اس لئے کہ میں ایک ایسی عزیز ترین ہستی تھی۔ جو انہیں جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ وہ نشاط انگیز لحظات میں کہتے تھے..... تم دنیا کی سب سے حسین ترین عورت ہو..... تم میں چاند کی سی سندرتا ہے..... میں نے خواب میں بھی تم جیسی عورت نہیں دیکھی..... میں تمہیں پا کر دنیا کا خوش ترین شخص بن گیا ہوں۔ وہ ایک رات اپنے دوست کی بہن کی شادی میں شرکت کا پروگرام بنا رہے تھے..... یہ چودھویں کی رات تھی۔ چاند اپنے شباب کی آخری منزل پر تھا۔

دوسرے لمحے میں بری طرح چونک پڑی اور سینہ دھک سا ہو کر رہ گیا..... میری مسکراہٹ کا فور ہو گئی پتی کی آنکھوں میں خوف کے سائے اور چہرے پر سفیدی دیکھ کر، انہوں نے مرتش ہاتھ سے اس کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جس سے پورا چاند جھانک رہا تھا..... میں نے جو منظر دیکھا اس کا یقین نہیں آیا..... میری آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں..... دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا..... اس کھڑکی کی چوکھٹ پر وہی خوفناک قسم کا مکروہ ہاتھ کھڑا تھا اور اس کا سایہ کمرے کے فرش پر پڑ رہا تھا..... پھر ایک سرد لہر چاقو کی طرح کاٹتی ہوئی میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔

میں ششدر تھی کہ یہ ہاتھ صندوقچے سے اور اس دریا سے کیسے نکل آیا؟..... یہ باتیں سوچنے اور پتی سے سوال کرنے کا نہیں تھا..... میرے پتی نے فوراً ہی بستر سے نکل کر سوچ آج کیا..... پھر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی وہ ہاتھ کسی ڈھیٹ بچے کی طرح اپنی جگہ کھڑا تھا۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے وہ ہم پر ہنس رہا ہو اور تسخراڑا رہا ہو..... ورنہ یہ ہاتھ روشنی ہوتے ہی پھر غائب ہو جاتا تھا..... اس ہاتھ کو اس طرح کھڑا دیکھ کر میرے سارے بدن میں ایک عجیب سی سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میرے پتی نے غصے کی حالت میں بندوق اٹھا کر شست باندھی تھی کہ وہ ایک دم سے غائب ہو گیا جیسے گدھے کے سر سے سینگ..... پھر وہ کھڑکی کے پاس جا کر باہر جھانکنے لگے..... جب وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر میرے پاس آئے تو میں گھٹنوں میں سر دیئے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ انہوں نے بندوق رکھ کر مجھے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے کر بولے کہ ”دور دور تک اس شیطانی ہاتھ کا پتا نہیں ہے۔ اب وہ نہیں آئے گا۔“ وہ مجھے سینے میں جذب کر کے دلاسا دیتے رہے۔

دوسرے دن صبح آٹھ بجے ایک دردناک خبر ملی کہ امر لال کی نوجوان بیٹی جمیل پر نہانے لگی تھی..... وہ حسب معمول سورج نکلنے سے قبل جاتی تھی۔ اس وقت اس کے علاوہ کوئی اور نہیں ہوتا تھا..... اس لئے بھی سویرے آ کر نہاتی تھی کہ آزادی، سکون اور اطمینان سے نہا سکے۔ اس کا شمار

جزیرہ مالدیپ کی حسین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔۔۔۔۔ بہت سارے گھرانے اسے اپنی بہو بنانا چاہتے تھے۔ کئی لڑکے اس کی محبت میں گرفتار تھے۔۔۔۔۔ کسی ہوس پرست نے اس تنہائی سے فائدہ اٹھا کر اپنی خواہش کا نشانہ بنانے کے بعد اس کا گلا دبا کر افشائے راز کے خوف سے جان سے مار دیا۔ اس کے جسم اور چہرے پر ایذا اور تشدد کے نشانات تھے۔ لیکن جب پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آئی تو یہ عجیب سا انکشاف ہوا کہ اس کی عزت پر کوئی آغچ نہیں آئی۔۔۔۔۔ لڑکی نے مزاحمت کی گئی اس لئے وہ اپنی آبرو بچا کر مر گئی۔۔۔۔۔ یوں بھی وہ ایک باعزت لڑکی تھی۔

پورے جزیرہ مالدیپ میں خوف و ہراس پھیل گیا۔۔۔۔۔ ہر کسی کا یہ خیال تھا کہ اس کئے ہوئے خوف ناک ہاتھ نے اس لڑکی کی جان لے لی۔۔۔۔۔ جب پولیس کو اس کئے ہوئے ہاتھ کے بارے میں بتایا تو اس نے حقیقت کو تسلیم نہیں کیا۔۔۔۔۔ اس نے تین مشکوک نوجوانوں کو گرفتار کر لیا۔ پولیس نے ان سے پوچھ گچھ کے بعد رہا کر دیا۔

اس کے تیسرے دن پولیس انسپکٹر کی نہایت حسین و جمیل اور نوجوان بیوی اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی۔ اس کا لباس تار تار تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جب اس کئے ہاتھ نے اس کا لباس تار تار کرنے کے بعد جب اس پر تشدد کیا۔۔۔۔۔ ایذا پہنچائی تو وہ عورت جتنی کیوں نہیں۔۔۔۔۔ اگر جیتی تھی تو کیا گھر والوں نے اس کی آواز نہیں سنی۔۔۔۔۔ وہ اپنے گھر میں اکیلی تھی اس کا علم بعد میں ہوا۔ لیکن کیا پڑوسیوں کو بھی اس کی آواز سنائی نہیں دی۔ سب انسپکٹر کا کہنا تھا کہ شاید اس نے انسپکٹر کی بیوی کو اس ہاتھ سے گلا دبوچ کر جان سے ختم کر دیا۔۔۔۔۔ پھر لباس تار تار کر کے اس کے جسم کو ایذا دی اور تشدد کا نشانہ بنایا۔۔۔۔۔ پھر شاید اس کے جسم کا نظارہ کرنا رہا۔۔۔۔۔ اس کا شوہر ایک قاتل کی تلاش میں کولمبو گیا ہوا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آئی وہی تھی جو امر لال کی بیٹی کی تھی۔۔۔۔۔ پولیس کا کہنا تھا کہ کوئی جنونی قاتل ہے۔۔۔۔۔ نفسیاتی مریض ہے۔۔۔۔۔ اس کی کمزوری عورت کو بے لباس دیکھنا۔۔۔۔۔ جسمانی تشدد کرنا ہے۔

پھر کیا تھا۔۔۔۔۔ لڑکیوں اور عورتوں نے گھروں سے اکیلے نکلنا بند کر دیا۔۔۔۔۔ کوئی جمیل یا تالاب پر نہانے جاتی تو اکیلی نہیں جاتی تھی۔ چار پانچ لڑکیاں یا عورتیں ساتھ ہوتی تھیں۔ وہ ڈنڈوں سے مسلح ہوتی تھیں۔۔۔۔۔ پھر وہ نہاتی تھیں۔

ادھر سب سے برا حال تو میرا تھا۔ میرے بچے نے مجھ سے کہا کہ میں میکے جا کر کچھ دن رہ کر آؤں۔۔۔۔۔ وہ کوشش کریں گے کہ کسی بڑے سا دھوپیا چنٹ کی مدد سے اس بلا کو قابو کر لیں گے۔ مگر میں یہ چاہتی تھی کہ وہ بھی میرے ساتھ چلیں۔۔۔۔۔ ان کے لئے یہ مشکل امر تھا۔ کیوں کہ بارش کا موسم ختم ہوا تھا۔ کاروبار ان کی عدم موجودگی سے متاثر ہو جاتا اور پھر انہیں کولمبو بھی جانا تھا۔ انہوں نے

مجھے تسلی دی اور احتیاطی تدابیر بھی بتادی۔

میں نے دن میں بھی کمرے میں اکیلے رہنا چھوڑ دیا تھا۔۔۔۔۔ جب میں اوپر نیچے جاتی تو میرے ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا۔۔۔۔۔ کوئی چھ سات دنوں سے اس ہاتھ نے ادھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ وہ مسلسل پانچ چھ راتوں سے مسلسل جاگ رہے تھے۔۔۔۔۔ ادھر مسلمانوں نے دو ایک عاملوں کی خدمات حاصل کیں۔۔۔۔۔ ہندوؤں نے پنڈتوں کی۔۔۔۔۔ ہندو مسلمان مل جل کر بھائیوں اور گھر کے خاندان کے فرد کی طرح رہتے تھے۔۔۔۔۔ یہ افتاد بد قسمتی سے صرف ہندوؤں پر نازل ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی طرف وہ ہاتھ اس لئے نہیں گیا تھا کہ وہ لوگ نماز پڑھتے تھے اور ان کی مذہب کی مقدس کتاب جسے وہ قرآن کہتے تھے ہر گھر میں موجود تھی۔۔۔۔۔ اور پھر کوئی مسلمان لڑکی یا عورت نہانے تالاب پر نہیں جاتی تھی۔

اس ہاتھ نے ایک گرد مہاراج کی کلائی توڑ کر رکھ دی تھی۔۔۔۔۔ دو تین پنڈت جو آئے کولمبو سے وہ سادھو مہاراج کا حشر دیکھ کر واپس چلے گئے۔۔۔۔۔ ان کے جانے کے دوسرے دن ایک اور جوان عورت کھیت میں مردہ حالت میں پائی گئی۔۔۔۔۔ اس کا گلا گھونٹا گیا تھا۔ لیکن اس کی عزت تاراج کر دی گئی تھی۔۔۔۔۔ یہ سب انسپکٹر کی بیوی تھی۔

انسپکٹر ان پر اسرار اور دہشت ناک واقعات کے بارے میں میرے بچے کی بات ماننے کے بجائے۔۔۔۔۔ مشتبہ افراد کو گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ پولیس کے نزدیک یہ تو ہم پرستی تھی۔۔۔۔۔ پولیس کو عقل تو اس روز آئی تھی جب تھانے دار کی نو جوان بیٹی نے رات کے وقت کھڑکی میں ایک خوفناک، مکروہ اور سیاہ کٹا ہاتھ کھڑکی میں دیکھ کر چیخیں مارنا شروع کر دیں۔۔۔۔۔ سارا گھر بیدار ہو کر اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ خوف سے تھر تھرا کانپ رہی تھی۔۔۔۔۔ تھانے دار کی بیٹی گرجوٹ تھی۔ باپ کو اپنی بیٹی کی بات کا یقین کرنا پڑا۔ پھر مشتبہ افراد کو رہا کر دیا۔

صرف لڑکیوں اور عورتوں پر نہیں نو جوان لڑکوں اور مردوں پر بھی ایسی دہشت مسلط ہو گئی تھی کہ وہ دن ڈوبنے سے پہلے ہی گھروں میں گھس جاتے تھے۔

میرے بچے کی کسی کام سے کولمبو گئے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ میں اپنے کمرے میں بیٹھی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ بوفارش پر بیٹھی بیاز کاٹ رہی تھی۔۔۔۔۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ میں نہا کر آئی تھی۔ بالوں کو جھاڑ کر کمرے میں آئی اور مسہری پر بیٹھ کر بالوں میں کنگھی کی اور جوڑا باندھ رہی تھی تب میں نے اپنی گود میں کوئی بھاری چیز محسوس کی جو میری گود میں کلبلا رہی تھی۔ میں نے چونک کر دیکھا تو میری جان ہی نکل گئی۔ حلق میں کانٹے چھنے لگے۔۔۔۔۔ وہی خوف ناک کٹا قاتل ہاتھ میری گردن میں پڑا تھا جو اب تک کئی عورتوں کی جانیں لے چکا تھا۔۔۔۔۔ اس سے پہلے کہ میں اس قاتل ہاتھ کو جھٹکتی اس نے

”ہاتھ..... ہاتھ.....“ میری آواز حلق میں پھنسنے لگی۔ ”بچاؤ..... بچاؤ.....“
جب میرے پتی غسل خانے میں گھس آئے تو وہ غائب ہو چکا تھا..... میں ان سے لپٹ گئی۔
میرا دل اس بری طرح دھڑک رہا تھا جیسے وہ سینہ شکن کر کے باہر نکل آئے گا۔

دہشت سے میری حالت دگرگوں ہو گئی تھی..... صبح ہوتے ہی میرے پتی مجھے میکے چھوڑ گئے..... پھر
میرے پتی کوئی دس دن بعد مجھے لینے آئے تو انہوں نے مجھے بتایا کہ نہ تو وہ خونی ہاتھ وہاں آیا اور نہ
ہی کوئی واردات ہوئی..... میں نے انہیں بتایا کہ وہ منحوس ہاتھ یہاں پہنچ گیا ہے..... میں نے انہیں
بتایا کہ ایک روز میں نے کپڑوں کی لپٹی کھولی تاکہ کپڑے نکال کر انہیں لے جاؤں۔ سہیلیوں نے
دریا کنارے نہانے کا پروگرام بنایا ہوا تھا..... وہ شیطانی ہاتھ کپڑوں پر اس طرح پڑا تھا جیسے گہری
نیند سو رہا ہو..... مجھے دیکھتے ہی ایک سخت حرکت کرنے لگا..... پھر ایک دم سے اچھل کر کپڑوں پر کھڑا
ہو گیا..... اس کے تئو سے ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے اچھل کر میرا گلا دیوبچ لے گا۔ اس سے
پہلے کہ وہ لپٹی سے باہر آتا میں نے لپٹی بند کر دی اور شور مچا کر گھر والوں کو جمع کر لیا۔ میرے والد،
بھائی اور محلے کے بھائی کے دوست لڑکے اور بڑے چاقو، ڈنڈوں، اور لاشیوں سے کمرے میں گھسنے
کے بعد لپٹی کو گھیر لیا۔ پھر میرے بھائی نے لپٹی کو کھولا..... اس میں وہ خونی ہاتھ موجود نہیں تھا.....
غائب ہو چکا تھا۔ تمام کپڑے کھول کھول کر دیکھے۔

اس کے دوسرے دن اس جزیرے کی ایک عدالت کے ایک جج کی حسین و جمیل بہو کا گلا
دیوبچ لیا تھا جو کمرے میں گرمی کے باعث شب خرابی کے لباس میں سو رہی تھی، کمرے کی کھڑکیاں
کھلی تھیں۔ سائٹ بلب کی روشنی میں وہ گہری نیند سو رہی تھی اس کا سر ابا جاگ رہا تھا۔

اس کا پتی ایک نامور وکیل ہے۔ جب اس نے اپنی بیوی کی چیخیں سنیں تو وہ ملحق کمرے سے
حیران و پریشان دوڑا، اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اس کی بیوی اس بری طرح کیوں چیخ رہی ہے۔
وہ یہ سمجھا کہ کھڑکی کے راستے شاید کوئی چور گھس آیا ہوگا..... جب وہ کمرے میں آیا تو اس نے ایک
عجیب اور خوف ناک دہشت منظر دیکھا کہ ایک کٹا ہوا انسانی ہاتھ اس کی بیوی کا گلا گھونٹ رہا
ہے..... جب اس نے اپنی بیوی کو دروازہ تکلیف سے تڑپتا دیکھا تو اس سے رہانہ گیا۔ اس منظر نے تو
اس کی ساری طاقت سلب کر لی تھی۔ پھر بھی اس نے لپک کر بستر کے پاس جا کر اس منحوس ہاتھ کو
پکڑ لیا اور اس کی انگلی پکڑ کر اور پوری طاقت جمع کر کے اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ ہاتھ غائب
ہو گیا..... اس کی بیوی دہشت اور مدے سے بے ہوش ہو گئی تھی۔

وہ کوئی دو دن تک بے ہوش رہی..... اس کے ہوش میں آتے ہی اس کا پتی علاج کے لئے
اسے کولمبو لے گیا۔ سری لنکا..... والد پپ سے قریب ہے اور وہاں بڑے بڑے فریژیشن، سرجن اور

ایک دم سے اچھل کر میرا گلا پکڑ لیا اور دبائے لگا۔ میں نے چیخنے کی کوشش کی تو چیخ نہ نکل سکی۔ میری
آواز حلق میں انک گئی۔ میں نے ہمت کر کے ہاتھوں سے اس گلے کو پکڑ لیا اور اس ہاتھ کی گرفت سے
چھڑانے کی کوشش کی اور جدوجہد کرنے لگی۔ میں نے اپنا سارا زور لگادیا تھا اس لئے کہ میں لمحہ بہ لمحہ
موت سے قریب ہوتی جا رہی تھی..... پھر اس کوشش میں مسہری سے فرش پر گر پڑی۔

اس خونی ہاتھ کی گرفت رفتہ رفتہ گلے پر اور سخت ہوتی گئی۔ میرے سینے میں دم گھٹنے لگا۔ پھر
میرے کانوں میں بھیا نک قہقہے گونجنے لگے۔ وہ میری اس بے بسی کا تسخیراڑا رہا تھا..... میری
نظروں میں ایک انتہائی مکروہ اور خبیث چہرہ گھومنے لگا..... بوانے جو یہ منظر دیکھا تو اس کے اوسان
لمحے کے لئے خطا ہو گئے..... ہاتھ پیروں میں جان نہ رہی..... دوسرے لمحے جانے اس میں کہاں
سے اتنی ہمت آ گئی کہ اس نے مجھے ہر قیمت پر بچانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے اندر نفرت اور غصے کی
تیز لہر اٹھی..... اسے وہ معصوم لڑکیاں اور عورتیں ایک سخت یاد آ گئیں۔ جنہیں زیادتی کا نشانہ بنا کر
موت کے منہ میں پہنچایا تھا..... وہ کسی غضب ناک شیرنی کی طرح اپنی جگہ سے اٹھی اور پیاز کاٹنے
والی چھری لے کر میرے پاس پہنچی اور مجھ سے کہا کہ میں اپنا ہاتھ اس خونی ہاتھ پر سے ہٹا لوں۔ اس
وقت میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ میرے ہاتھ آپ ہی آپ بے جان ہو کر گر پڑے تھے۔ ایسا
لگا تھا کہ اب مجھے موت سے کوئی بچا نہیں سکتا..... میں زندگی سے مایوس ہو چکی تھی۔ جیسے ہی میرے
ہاتھ بے جان ہوئے بوانے فوراً ہی اس خونی ہاتھ کی پشت پر چھری بھونک دی۔ بوانے اپنی پوری
قوت لگا دی تھی۔ اس چھری کی نوک کا چھبنا تھا کہ وہ ایک دم سے غائب ہو گیا..... اس ہاتھ کے
غائب ہوتے ہی بوانے مجھے دیکھا..... غشی کی حالت میں..... میں گہری گہری سانسیں لے رہی
تھی۔ فوراً ہی ڈاکٹر کو بلا لیا گیا۔ بروقت طبی امداد سے میری جان بچ گئی۔

دوسرے دن بوا اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی..... اس گلے ہوئے خونی ہاتھ نے بوا سے
انتقام لے لیا تھا۔ نہ صرف اس کا گلا گھونٹا تھا بلکہ زیادتی بھی کی تھی.....

بوا کی موت کا میں نے اس لئے بہت زیادہ اثر لیا تھا کہ اس نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے اس
موذی ہاتھ سے میری جان بچائی..... پھر دوسرے دن اسے اس ایٹار اور بھادری کا جو صلہ وہ موت
کی صورت میں تھا..... میں اس قدر دہشت زدہ ہو گئی تھی کہ ایک لمحے کے لئے بھی میں اپنے پتی کو
جانے نہیں دیتی تھی..... میں دو تین دن میں قدرے نارمل ہو گئی..... ایک رات ہم دونوں دیر تک
جاگتے اور عجت کی وادی میں بیٹکتے رہے..... چون کہ بہت گرمی بھی تھی۔ اس لئے میں نے نہانے کا
فیصلہ کر لیا۔ میں شاور کے نیچے کھڑی نہا رہی تھی۔ پھر میں نے دیکھا تو وہ کٹا ہوا ہاتھ تھا۔ میں نے
ایک چیخ ماری.....

ہسپتال اور کلینک موجود ہیں۔ وہاں علاج کے بعد وہ لرزے کی مریض بن گئی۔ کسی کا ہاتھ حتیٰ کہ اپنے شوہر کا ہاتھ بھی قریب آنے نہیں دیتی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے بھی خوف زدہ تھی۔ پھر اس نے نفسیاتی علاج کرایا تب کہیں جا کر وہ ٹھیک ہوئی۔

اس واقعہ کے تیسرے روز میں نے اپنے بڑے بھائی سے بازار سے مچھلی منگوائی۔ بھائی نے تھیلا لاکر میرے ہاتھ میں تمھارے۔ جب میں نے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالا تو مچھلی کے بجائے میرے ہاتھ میں کٹا ہوا ہاتھ تھا۔ میں نے حواس باختہ ہو کر اسے پھینکا تو وہ موری میں جا گرا۔ پھر وہ موری کے راستے غائب ہو گیا۔ میں غش کھا کر گر گئی۔

اسی روز شام کے وقت دریا کنارے ایک حسین، نوجوان دوشیزہ فنی حیونت کی لاش ملی جس کا لباس تار تار تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ لڑکی نے مزاحمت کی تو ہوس کار نے تشدد کر کے اس کی بے حرمتی کی ہے اور اس کے سارے جسم پر سرخ سرخ گہرے نشانات تھے۔ تین دن بعد جو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ ملی تو اس میں بتایا گیا تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ پولیس نے حسب عادت اس حقیقت کو تسلیم نہیں کیا کہ ایک کٹے ہاتھ نے اس کی بے حرمتی کر کے جان لے لی۔ انسپکٹر نے اس لڑکے کو گرفتار کر کے جو اس سے محبت کرتا تھا۔ اسے قتل کا کیس قرار دیا۔ اس واقعہ سے اس جزیہ پر کھرام بچ گیا تھا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ وہ دونوں آپس میں محبت کرتے تھے۔ تنہائی میں ملتے تھے۔ لڑکی نے کسی وجہ سے شادی سے انکار کر دیا اور ان کے درمیان تلخ کلامی۔ نفرت کا اور غصے کا اظہار ہوا۔ جس پر لڑکے نے مشتعل ہو کر لڑکی کو اس کی بے حرمتی کر کے اسے قتل کر دیا۔ دوسرے ہی دن دریا کنارے دو پولیس افسران نے دیکھا کہ سب انسپکٹر کی بیوی کا کٹا ہاتھ بے حرمتی کر رہا ہے۔ انہیں صرف ہاتھ نظر آیا جو اس کے سارے بدن پر رینگ رہا تھا۔ پھر انہوں نے دیکھا وہ ہاتھ اس کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ وہ ہوش میں آ کر دروازہ اور تکلیف سے چیختے لگی۔ ایک افسر نے لڑکی کے پاس اس ہاتھ کو پکڑا تو وہ غائب ہو گیا۔ لڑکی نے اپنے بیان میں بتایا کہ نہانے کے بعد جب وہ کپڑے پہن کر جانے لگی تو وہ ہاتھ اس کے سینے پر آ گیا اور اس پر نشہ سا چھانے لگا۔ اس نے خود سہرہ دی سے اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی مرد کے بازوؤں میں محصور ہے۔ اسے چہرہ نظر نہیں آیا۔ اس لئے کہ اس کی پلکیں منوں بھاری تھیں اور آنکھوں کے سامنے دھند سی تھی۔ اس نے صرف ہاتھ کو محسوس کیا جس نے اس کا لباس تار تار کر کے بے حجاب کر دیا۔ وہ دونوں بہت دور نکل گئے۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ ہاتھ اس کا گلا دبا رہا تھا۔ اسے پچایا نہ جاتا تو وہ بچ نہیں سکتی تھی۔

تین دن بعد میرے پتی آئے تو میں ان کے ساتھ اپنے گھر آ گئی۔ میرے پتی کو ایک

سادھو مہاراج نے ایک کالا دھاگہ دیا اور کہا کہ میں اسے گلے میں باندھ رکھوں۔ میں نے اسے گلے میں ڈال لیا۔ لیکن اس کا لے دھاگے سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ تین روز پہلے کی بات ہے کہ رات کو ہم دونوں پیار و محبت کی باتیں کر رہے تھے کہ میں نے کھڑکی کی چوکت پر دو کٹے ہوئے ہاتھ دیکھے۔ ایک ہاتھ نے پہلے ہی کیا کم فتنہ چار کھا تھا کہ اب دوسرا ہاتھ بھی نظر آنے لگا۔ ان دونوں ہاتھوں پر میرے پتی نے بندوق اٹھائی۔ ان کا نشانہ لے کر پے در پے دو فائرنگ جھونک دیئے۔ لیکن ان پر گولیوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ دوسرے لمحے ایک انتہائی خوفناک اور استہزائیہ قہقہہ گونجا۔ پھر وہ دونوں ہاتھ جیسے ہنسنے لگے۔ یہ ہے خونی ہاتھ کی کہانی جس نے نہ صرف کئی جانیں لے لی ہیں بلکہ اس جزیہ کے لوگوں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اس قدر خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے کہ ہر شخص غم زدہ اور بیمار ہو کر رہ گیا ہے۔ حسین لڑکیوں کے ماں باپ اور عورتوں کے پتی بھی بہت پریشان ہیں۔

شانتی کانت کے علم میں سارے واقعات تھے۔ جب میں نے انہیں دو ہاتھوں کے بارے میں بتایا تو وہ پولیس کہ۔ تم پریشان اور فکر مند نہ ہو۔ ممبئی جا کر چندرا دیوی سے ملو۔ وہی ایک ایسی ہستی ہے جو ان دونوں ہاتھوں سے نجات دلا سکتی ہے۔ لہذا میں بڑی آशा میں لے کر آئی ہوں۔“

”تم باپوس، اور دل برداشتہ نہ ہو۔“ چندرا دیوی نے اسے دلاسا دیا اور اس پر ایک ناقہ انہ نظر ڈالی۔ گنگناتلا کی حسین اور بذات خود ایک جادوچی۔ اس کے بے حد لانے چکیلے سیاہ ریشمی بال۔ اس کی بڑی بڑی بھوراجیسی سیاہ آنکھیں۔ اس کے چہرے کے چمکے چمکے نقش و نگار اور نکلتا ہوا قد۔ اس کے سراپا کے جادو میں اس کا چہرہ یا بدن جگمگا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہر کوئی یہ کہہ سکتا تھا کہ بھگوان نے اسے فرصت میں بنایا ہوگا۔ چندرا دیوی نے اپنی زندگی میں بہت کم ایسی حسین لڑکیاں دیکھی تھیں۔ یہ حسینہ مالدیپ تھی۔ بلکہ کوئی بھی حسینہ عالم اس کے آگے مالدیپ۔ اس کی آواز بھی دلکش تھی۔ قدرت نے اسے ہر چیز جیسے بڑی فیاضی سے دی تھی۔ چندرا دیوی نے کہا۔ ”تم مجھے ایک دوست، سہیلی سمجھ کر اپنی کہانی سناسکتی ہو۔ تم مجھے اپنی زندگی کا وہ واقعہ سناؤ جو تم نے آج تک کسی کو نہیں سنایا۔ جتنی کہ اپنے پتی اور کسی قریبی سہیلی کو نہیں سنایا اور نہ اپنی ماں اور بہن کو اعتماد میں لیا۔“

گنگناتلا بڑے زور سے اچھل پڑی۔ اس نے اپنا جھکا ہوا خوش نما سراو پر اٹھایا۔ چندرا دیوی کی طرف حیرت سے دیکھا اور بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

”کون سا واقعہ؟ میں نے آپ کو بہت سارے واقعات سنائے ہیں۔“

”وہ واقعہ جس نے خونی ہاتھ کو جنم دیا۔ وہ خونی ہاتھ جو تمہاری جان اور عزت و آبرو کا دشمن

بنا ہوا ہے۔۔۔۔۔ اب تک تم محض اتفاقات کی وجہ سے اس سے بچتی رہی ہو۔۔۔۔۔ کل ایسا بھی ممکن ہے کہ۔۔۔۔۔ وہ ہاتھ تمہاری نظروں کے سامنے تمہارا سہاگ اجاڑ دے۔۔۔۔۔ پھر تمہارے گھر کے ایک ایک فرد کو نشانہ بنائے۔ تم مجھ پر بھروسہ رکھو۔۔۔۔۔ میں تمہاری کہانی کسی کو بھی نہیں سناؤں گی۔ میں تمہیں اس بات کی ضمانت دیتی ہوں اس خونی ہاتھ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دوں گی۔“

گھٹکتلا۔۔۔۔۔ چندرا دیوی کی یہ بات سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ چندرا دیوی اس واقعہ کی تہہ میں پہنچ جائے گی۔ اب فرار کی تمام راہیں مسدود ہو چکی تھیں۔ اسے رام کہانی سنانے کے سوا چارہ نہیں رہا تھا۔

”کیا وہ واقعہ سنانا بے حد ضروری ہے۔۔۔۔۔؟“ گھٹکتلا نے بہ مشکل اپنے آنسوؤں پر قابو پا کر پوچھا۔

”ہاں جانی۔۔۔۔۔!“ چندرا دیوی نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ”اس لئے کہ میں جانا چاہتی ہوں کہ تم کس مصیبت میں پھنسی تھیں؟“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔“ گھٹکتلا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں آپ سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گی۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ چندرا دیوی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں کافی اور سینڈوچز بیٹلاتی ہوں۔۔۔۔۔ اتنی دیر میں خود کو سنبھال لو۔“

جب چندرا دیوی ٹرائل دھکیلتی ہوئی کمرے میں آئی تو گھٹکتلا نارمل ہو چکی تھی۔ وہ اپنی کہانی سنانے لگی۔

”یہ تو آپ جانتی ہیں کہ میں خاص طور پر جزیرہ مالدیپ سے ملنے اور اس سنگین مسئلے کو حل کروانے آئی ہوں۔۔۔۔۔ میں جزیرہ مالدیپ کی حسین ترین لڑکی مانی جاتی ہوں۔۔۔۔۔ جزیرہ مالدیپ میں ہزاروں جزیرے ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ میری جیسی حسین لڑکی پیدا ہوئی نہ ہوگی۔۔۔۔۔ کاش۔۔۔۔۔! میں اس قدر حسین نہ ہوتی اور میرا حسن میرے لئے مصیبت نہ بن جاتا۔۔۔۔۔ بچپن سے ہی میرے حسن کا چرچا ہونے لگا تھا اس کی وجہ میری اٹھان تھی۔۔۔۔۔ اسکول میں لڑکیوں نے میرا نام حسن کی دیوی رکھ دیا۔۔۔۔۔ میں اس نام سے اس قدر مشہور ہوئی کہ لوگ میرا اصل نام تک بھول گئے۔ مگر گھر والے مجھے گھٹکتلا ہی کہہ کر پکارتے تھے۔۔۔۔۔ میں جوان کیا ہوئی میرا حسن۔۔۔۔۔ اور قیامت خیز ہو گیا۔ میں نے میٹرک امتیازی نمبروں سے پاک کیا اور کالج میں داخلہ لے لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کالج اور میرے علاقے کے لڑکے بھی مجھ میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔۔۔۔۔ بلکہ میرے حصول کے خواب

دیکھتے ہیں اور بہت سارے گھرانے مجھے اپنی بہو بنانے کے خواہش مند ہیں۔۔۔۔۔ کچھ لڑکوں نے مجھے محبت بھرے خط لکھنے شروع کئے۔۔۔۔۔ میں پڑھے بغیر ہی انہیں پھاڑ دیتی تھی۔۔۔۔۔ کالج میں لڑکے مجھ سے بات کرتے تو میں ان سے بڑی سادگی، نرمی اور اخلاق سے بات کرتی تھی۔ مجھ میں چندا حسن بالکل بھی نہ تھا۔۔۔۔۔ مجھے ایسے لڑکوں سے سخت نفرت تھی جو لڑکیوں کو عنیدی نظروں سے گھورتے تھے۔۔۔۔۔ میں ان لڑکوں کی بری نظروں اور ان کے بے ہودہ عشقیہ خطوط سے بہت ہی پریشان تھی۔۔۔۔۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ میں تعلیم حاصل کرنے والے ایسے لغو، بے ہودہ اور گھنیا قسم کے خط لکھ سکتے ہیں اور لکھتے ہیں۔۔۔۔۔ میں اس بات سے ڈرتی تھی کہ ان میں سے کوئی خط گھروالوں کے ہاتھ لگ گیا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔۔۔۔۔؟

اگر انہوں نے مجھے گھر میں بیٹھالیا۔۔۔۔۔ کالج سے نکال دیا۔۔۔۔۔ گھر سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی تو یہ بڑے دکھ کی بات ہوگی۔۔۔۔۔ مجھے صرف تعلیم سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ جب کہ میری کچھ ہم جماعت لڑکیاں اور سہیلیاں جو خوب صورت اور پرکشش بھی تھیں انہیں تعلیم سے زیادہ عشق و محبت سے دلچسپی تھی۔۔۔۔۔ ان کی آنکھوں میں انجانے خواب لہراتے تھے۔۔۔۔۔ وہ پیاسی سی ہوتی تھیں۔۔۔۔۔ وہ نہ صرف لڑکوں سے محبت کرتی تھیں بلکہ ان کے درمیان عشقیہ خطوط کا تبادلہ بھی ہوتا تھا۔۔۔۔۔ وہ چھپ چھپ کر کالج کے لڑکوں اور اپنے عاشقوں سے ملتی تھیں۔ ان میں کچھ لڑکیاں بہت دور تک چلی گئی تھیں۔۔۔۔۔ عزت کھو کر بچھڑا رہی تھیں۔ کیوں کہ ان لڑکوں نے ان سے جی بھر کے فائدہ اٹھانے کے بعد اور سے شادی کر لی تھی۔

لڑکیاں۔۔۔۔۔ مجھے لڑکوں کے خط دکھایا کرتی تھیں۔۔۔۔۔ اور وہ تجانیوں میں ملاقات کے احوال مزے لے لے کر بیان کرتی تھیں۔۔۔۔۔ ان کی ملاقاتیں مندروں کے قرب و جوار میں جو جھاڑیاں تھیں وہاں ہوتی تھیں۔۔۔۔۔ لیکن میرے دل میں کوئی بل چل نہیں ہوتی تھی۔۔۔۔۔ میں اس بات کو خوب جانتی اور سمجھتی تھی کہ یہ لڑکے محبت کا فریب دے کر فائدہ اٹھاتے ہیں۔۔۔۔۔ وہ بھونرے ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ یوں میں بھی دوسرے مزاج کی لڑکی تھی۔۔۔۔۔ میری سوچ بھی مختلف تھی۔ میں ان لڑکیوں کو بڑی بوڑھیوں کے انداز میں سمجھاتی رہتی تھی کہ وہ ان چکروں میں نہ پڑیں۔۔۔۔۔ عشق و محبت کے بجائے تعلیم پر توجہ دیں۔ یہ لڑکے فریبی اور دعا باز اور بھیرے صفت ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ محبت غریب لڑکیوں کو اس نہیں آتی ہے۔

مالدیپ شہر میں ایک پنڈت جی جگدیش شرماتے۔۔۔۔۔ وہ مندر میں اپنا وقت گزارتے تھے۔ وہ بڑے نیک، شریف اور خلص تھے۔ ان کی بڑی عزت تھی اور احترام بھی کیا جاتا تھا۔۔۔۔۔ ایک مرتبہ چچک کی دبا پھیلی تو ان کی پتی موت کی نذر ہو گئیں۔ ان کا بیٹا سریش بچ تو گیا لیکن اس کا چہرہ

داغوں سے بھر گیا..... جتنی کی موت کے بعد انہوں نے دوسری شادی نہیں کی..... ان کی جتنی صرف ایک لڑکا چھوڑ کر مری تھی..... انہوں نے اس خیال سے دوسری شادی نہیں کی کہ تھی ان کا کھوتا اور بد صورت بیٹا کہیں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم کا شکار نہ ہو جائے..... سریش جوان ہوا تو احساس محرومیوں کا شکار ہو گیا..... آوارہ اور بد معاش اور غنڈہ بن گیا..... لوگ کہتے تھے کہ اداکار کے ہاں شیطان نے جنم لیا ہے۔ باپ نے اسے سدھارنے کی ہر ممکن کوشش کی..... وہ راہ راست پر نہیں آیا صدے نے ان کی جان لے لی۔

مالدیپ میں ایک شخص تھا..... اس کا نام تھا مہی پال..... وہ سفلی اور پراسرار علوم کا بڑا ماہر تھا..... جادو ٹوٹے اور گنڈوں کو اس نے ذریعہ معاش بنایا ہوا تھا..... وہ نہ صرف کالے جادو کا توڑ جانتا تھا بلکہ کالا جادو اس کے بانیں ہاتھ کا کھیل تھا..... جسوت نے باپ کی موت کے بعد اس کی شاگردی کر لی تھی..... تین چار برسوں میں اس نے اپنے استاد سے بہت کچھ سیکھ لیا تھا..... وہ بھی ایک جادوگر بن گیا تھا..... وہ کسی نہ کسی موقع پر اپنے کمالات دکھا کر لوگوں کو مرعوب اور متاثر کرتا رہتا تھا..... مہی پال جب تک زندہ رہا کسی کو بلا وجہ پریشان کیا اور نہ اس نے جسوت کو اس بات کی اجازت دی کہ اس علم سے کسی کو ہراساں کرے..... اس کی موت کے بعد جسوت کو جیسے ہر بات کی جھوٹ مل گئی..... لوگ اس کی حرکتوں سے ٹالاں اور پریشان رہنے لگے۔

وہ ایک بد نیت شخص تھا..... لڑکیاں اور عورتیں اس کی کمزوری تھیں..... اس نے اپنے جادو کے زور سے کئی لڑکیوں اور عورتوں کو جاہ کیا..... اس میں ان لڑکیوں اور عورتوں کا زیادہ..... دوش تھا..... اس لئے کہ وہ اس کے پاس اپنے خوابوں اور گھریلو جھگڑوں سے نجات پانے کے لئے آتی تھیں وہ بڑا چرب زبان تھا اور سبز باغ دکھاتا تھا..... اس نے اپنے جادو کے زور سے ان سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ لڑکیاں اس کی شکل سے خوف کھاتی تھیں..... اس وقت جب کوئی لڑکی اور عورت اپنی غرض سے آتی تھیں اس پر ایسا متثر ہوجو کہ اس کا چہرہ اسے بھلا سا لگتا تھا..... اور پھر وہ پٹا پٹا کر بھی کر کے ان کی عزت سے کھیلتا تھا۔ وہ ان سے رقم بھی اینٹھتا تھا۔

جو غیر ملکی سیاح عورتیں بالدیپ آتی تھیں وہ ان کا گائیڈ بن جاتا تھا اور اپنی شکل بہت خوب صورت بنالیتا تھا۔ یہ عورتیں جنس زدہ ہوتی تھیں..... وہ اپنے جادو منتر اور پٹا پٹا سے ان عورتوں کو پھانستا تھا۔ اس کے پاس غیر ملکی کرنسی کی بہتات تھی۔ سیزن میں وہ سب سے زیادہ غیر ملکی کرنسی کماتا تھا..... ان امریکی عورتوں سے..... جو بڑی پارسا بنی تھیں۔ وہ اپنی راتیں شباب اور مرد کے بغیر نہیں گزارتی تھی وہ انہیں شراب گراں قیمت پر فروخت کرتا تھا۔ اپنے جادو منتر سے اس کی آمدنی بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ ہائی اسکول اور کالج کی لڑکیوں کا دیوانہ تھا..... اس لئے وہ لڑکیوں اور عورتوں کو چھیڑتا..... فھرے کتا..... آنکھوں ہی آنکھوں میں دعوت گنا دیتا تھا..... لڑکیاں اسے دیکھے بغیر گزر جاتی تھیں..... وہ مجھے دیکھ کر سینے پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی آجیں بھرتا اور مود پانا انداز سے نمسکار کرتا تھا۔ لیکن اس نے کوئی معیوب حرکت سراہ نہیں کی تھی۔ لیکن جب کبھی میں کسی کام سے گھر سے نکلتی تو اسے اپنے تعاقب میں ضرور دیکھتی جیسے وہ ہر لمحہ میری راہ نکلتا رہتا ہو۔

لیکن وہ مجھے روزانہ ایک خط ضرور لکھتا تھا۔ کوئی دن ایسا نہ جاتا تھا جو اس نے ناغہ کیا ہو۔ میں نے صرف اس کا ایک ہی خط پڑھا تھا..... اس نے اس میں لکھا تھا کہ..... میری رانی..... میرے دل کی رانی..... تم نہیں جانتی ہو میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں..... جب تم میری نظروں سے اوجھل رہتی ہو اس وقت میری حالت ایک بے آب مچھلی کی طرح ہوتی ہے..... لیکن نظروں سے اوجھل ہو کر میرے دل میں بسی ہوتی ہے..... رات جب میں سونے کے لئے بستر پر دراز ہوتا ہوں تو بستر پر اس طرح کروٹیں بدلتا ہوں جیسے انگاروں پر لوٹ رہا ہوں..... رات کس طرح کاٹتا ہوں..... جدائی کا ایک لمحہ کس طرح سے اذیت ناک اور سوہان روح ہوتا ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتی ہو..... میرے چشم تصور میں تم ہی تم ہوتی ہو.....

بات یہ ہے کہ ایک رات، پونم کی رات میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں دیکھنے کے لئے آیا..... اس سے پہلے دو مرتبہ اندھیری راتوں میں تمہارے صحن میں اتر اٹھا..... گرمی اور جس تھا..... تمہارے کمرے میں ٹائٹ بلب جل رہا تھا..... گرمی اور جس کے باعث تم مختصر اور نامناسب سے لباس میں مسہری پر گہری نیند سو رہی تھیں..... میں پھوپھنے تک اندھیرے میں کھڑا تمہارا توبہ شکن نظارہ کرتا رہا..... میرے جذبات تند ہونے لگے..... میں نے دل اور جذبات پر کس طرح جبر کیا یہ میرا دل اور میں جانتا ہوں.....

میں اب ہر روز راتوں کو آ کر تمہارا چہرہ اور سراپا نظروں میں جذب کرتا ہوں..... لیکن اب مجھ میں صبر اور برداشت کی تاب نہیں رہی ہے..... میری رانی.....! میرے دل کو تڑپاؤ نہ..... وہ پہلے سے زخمی ہے..... اسے مزید لہو لہان نہ کرو..... ورنہ میں مرجاؤں گا.....“ اس میں مزید ایسی بے ہودہ اور شرمناک باتیں لکھی ہوئی تھیں کہ میں بیان نہیں کر سکتی..... وہ لفظ تھا..... میں نے وہ خط پھاڑ کر پھینک دیا..... جواب نہ دینے کے باوجود وہ روزانہ خط لکھتا اور میں پھاڑ پھاڑ کر پھینکتی رہی..... دو ایک ایسے خط ملے جو کھلے لفافے میں تھے..... اس میں اس نے مرد کی عریاں تصویر بنائی ہوئی تھیں..... وہ ایک اچھا آرٹسٹ تھا..... میں نے والدین کو اس بات سے چھپایا ہوا تھا کہ یہ کمینہ..... ذلیل اور شیطان مجھے روزانہ خط لکھتا ہے۔

پھینکو..... وہ دیکھو آسمان پر چاند بھی بے نقاب ہے..... اپنا جلوہ دکھا رہا ہے..... تم بھی چاند بن جاؤ..... میری چاند.....!“

میں سحر زدہ سی ہو کر اس کی طرف بڑھی۔ میں نے اس کے حکم پر بلا جوں و چرا اور جھک کے عمل کیا۔

میں چوکت پر پہنچی..... ہم دونوں کے درمیان سلاخوں والی کھڑکی حائل تھی۔
”میری رانی.....! بات نہیں رہی ہے..... تم ایسا کرو..... دروازہ کھول کر باہر آ جاؤ.....“

پھر میں کسی معمول کی طرح دروازے کی طرف بڑھی۔ میں چوں کہ اس کے طلسم کی اسیر تھی اس لئے کسی بات کا ہوش تھا اور نہ اپنی اس حالت کا..... میں دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ پھر وہ مجھے سامنے بند کرے میں لے گیا۔

میں سحر زدہ سی ہو کر اس کی طرف بڑھنے لگی۔ وہ مجھے اپنی آغوش میں لینے کے لئے بے تاب سا ہو رہا تھا..... اس کی آنکھوں میں ہوس ناچ رہی تھی..... اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ چمکی ہوئی تھی..... چوں کہ میری نگاہ اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھی اور بستر کی طرف بڑھ رہی تھی کہ مجھے ایک دم سے شوکر لگی..... شوکر میرے پیر کے انگوٹھے میں لگی تھی..... شوکر کے کتے ہی میرے منہ سے کراہ نکلی..... میں درد کی شدت سے بلبل کر فرش پر بیٹھ گئی..... میں نے دیکھا کہ فرش پر کلباڑی پڑی ہے..... اس کے پھل کی نوک سے میرا انگوٹھا لگا تھا..... دوسرے لمحے میں اپنی تکلیف بھول کر ایک دم سے اچھل پڑی اور ششدر سی ہو گئی کہ یہاں کیسے آئی اور وہ بھی اس حالت میں.....؟ یقین نہ آیا کہ بدن پر ایک دھجی تک نہیں..... خون نکلنے سے جادو ٹوٹ گیا تھا..... اس پر نگاہ پڑتے ہی میں سارا معاملہ سمجھ گئی۔ میں نے جھٹ سے کلباڑی اٹھالی اور سیدھا ہو کر کھڑی ہو گئی..... اس نے فوراً ہی کھڑے ہو کر مجھ پر جست لگائی۔ میں چوں کہ چوکتا اور مستعد تھی اس لئے بجلی کی سی تیزی سے ایک طرف ہٹ گئی۔

ایک طرف لکڑیوں کا جو ڈھیر رکھا تھا وہ اس پر جا گرا..... معلوم نہیں اس وقت مجھ پر کیسا اندھا جنون سوار ہو گیا..... میں آج بھی سوچ کر حیران ہوتی ہوں..... نفرت، غصے اور اشتعال نے مجھے ہر قسم کی سوچ اور ہوش سے بیگانہ کر دیا..... میں نے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے کلباڑی کو تھام لیا..... پھر آنکھیں بند کر کے اس ذلیل پر پوری قوت سے وار کر دیا..... اسے اتنی مہلت بھی نہیں مل سکی تھی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ سکے۔ اپنا دفاع کر سکے اور میرے حملے سے اپنے آپ کو بچا سکے..... اس کے منہ سے ایک دل خراش چیخ نکلی..... میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو لرز کر

اس کا ایک خط جو لفافے کے فرش پر پڑا تھا وہ ہسکی آ میز تھا..... اس میں اس نے لکھا تھا کہ تم تین دن کے اندر اندر عقی دروازے کے باہر ملو..... اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو میں نہ صرف تمہاری بلکہ تمہارے گھروالوں کی زندگی اجیرن کر کے رکھ دوں گا..... میں ایسا جادو جانتا ہوں کہ تم میری بانہوں میں آ کر سا جاؤ گی۔ اپنی عزت میرے حوالے کر دو گی..... پھر میں تمہاری بہن اور بھابھی کو نشانہ بنائوں گا..... تمہاری ماں کو بھی..... وہ بھی اپنی عزت بچانہ سکے گی۔

میں نے اسے گیدڑ بھیجی تھی..... میں یہ بات جانتی تھی کہ جو گر جتے ہیں وہ برستے نہیں..... اگر اسے کچھ کرنا ہوتا تو کب کا کر چکا ہوتا۔

میں رات گیارہ بجے تک جاگ کر پڑھتی رہتی تھی۔ میرا کمراسب سے نیچے اور کونے میں تھا..... اس کا ایک دروازہ اور کھڑکی عقی راستے کی طرف تھی..... عقی دروازے کے پاس تین چار کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں..... ان میں غلہ اور لکڑیاں رکھی تھیں..... اس کے علاوہ اور بھی ضرورت کا سامان موجود تھا۔ ایک طرح سے یہ اسٹور بھی تھا۔

آسمان کے چوڑے چپکے سینے پر چودھویں رات کا چاند کسی دلہن کی طرح لگ رہا تھا..... گرمی کے باعث میں چولی اور گھاگھرے میں سوئی تھی..... میں ایسی گہری نیند سوئی تھی کہ مجھے اپنا ہوش نہ لباس کی بے ترتیبی کا..... میں نیم عریاں حالت میں تھی..... نیند میں گرمی کی وجہ سے بلاؤز کے ٹٹن کھول لئے تھے..... اگر میرے گال پر پھم کرنے کا نا نہ ہوتا تو جانے کتنی دیر تک سوئی رہتی..... آنکھ کھلتے ہی معامیری نگاہ کھڑکی پر پڑی تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا..... وہ مردود کھڑکی کے پاس کھڑا تھا۔ کھڑکی میں سلاخیں نہ ہوتی اور میں نے دروازے کی اندر سے چٹنی لگا لی نہ ہوتی تو وہ اندر آ جاتا اور پھر وہ مجھے دردنگی کا نشانہ بناتا..... اس کے ہونٹوں پر مکروہ مسکراہٹ ریک رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خباثت چھائی ہوئی تھی اس کی آنکھوں میں ہوس بھری تھی..... میرے تن بدن میں آگ لگ گئی کہ اس کہنے کی یہ مجال میرے گھر میں کھس آئے..... میں نے پوری قوت جمع کر کے چیخنا چاہا تھا کہ گھروالے بیدار ہو جائیں..... اس نے جادو کے زور سے میرا منہ بند کر دیا..... میرا چہرہ ایک دم سے سفید پڑتا چلا گیا تھا اور سامنے آ کھینے میں مجھے اپنا چہرہ دکھائی دیا..... اس میں لہو کی ایک بو تک نہ تھی..... دوسرے لمحے میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے روشنی نکل رہی ہے۔

پھر اس کی آنکھوں سے شعاںیں پھوٹنے لگیں اور میری آنکھوں میں گھسنے لگیں..... وہ آہستہ آہستہ کچھ کچھ ہٹتا جا رہا تھا..... چند لمحوں کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا سارا غصہ اور نفرت جھاگ کی طرح بجھ گئی۔ پھر اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”میری رانی.....! ادھر آؤ..... یہ لہادہ تمہارے جسم پر اچھا نہیں لگ رہا ہے..... اسے اتار

رہ گئی اور میرا سارا لہو جسم میں خشک ہو گیا..... اس کا دایاں ہاتھ کلائی تک کٹ کر فرش پر پڑا تھا اور درد سے تڑپ رہا تھا۔ تڑپتے تڑپتے وہ قہقہے ہونے لگا۔ پھر نظروں سے اوجھل ہونے لگا۔
میں کٹا ہوا خون آلود ہاتھ دیکھ کر خوف و دہشت سے بے ہوش ہو گئی۔ میں ہوش میں آئی تو اندازہ نہ ہو سکا کہ کتنی دیر تک بے ہوش رہی۔ میں فرش پر ہاتھ کے پاس بے ہوش پڑی تھی..... میں جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی..... میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کروں..... اپنے آپ کو بے لباس دیکھ کر کمرے میں آئی..... کپڑے پہن کر اس کو کھڑی میں آ گئی۔
کچھ دیر تک تذبذب اور سوچ کے دوراں پر کھڑی رہی..... پہلے تو یہ خیال آیا کہ گھر والوں کو چگا کر اس واقعہ کے بارے میں بتا دوں۔

پھر میں نے سوچا کہ..... معلوم نہیں گھر والے کیا نتیجہ اخذ کریں..... نوکروں کو بھی اس واقعہ کے بارے میں کسی نہ کسی طرح معلوم ہو ہی جائے گا۔ پھر طرح طرح کی کہانیاں اور قصے عام ہو جائیں گے..... میری اور میرے گھر والوں کی رسوائی اور بدنامی ہوگی..... مجھے کوئی اور ہی تدبیر کرنی ہوگی۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ اس ذلیل کی چیخ سن کر پڑوسی اور گھر والے بیدار نہ ہوئے۔

پھر میرے ذہن میں ایک تدبیر بجلی کی طرح آئی..... بہتر ہے کہ زبان بند رکھی جائے..... میں نے فوراً کوکھڑی کے ایک کونے سے سامان ہٹا کر وہاں کھدائی کی..... اور اس خون آلود ہاتھ کو گڑھے میں دبا کر مٹی سے فرش ہموار کر دیا۔ اس طرح کہ پتا نہیں چلے کہ یہاں کھدائی ہوئی تھی..... پھر وہاں سامان رکھ دیا..... لکڑیوں پر جو خون کے دھبے اور چھینٹے پڑے تھے انہیں مٹانا تھا..... میں نے صابن کو گیلے کپڑے میں لگا کر اس سے صاف کر دیا۔

پھر اپنے کمرے میں انگوٹھے کے زخم صاف کئے..... اور سونے کے لئے بستر پر دراز ہو گئی..... میں یہ سوچ کر کانپ گئی کہ اگر مجھے شوکر نہ لگتی تو میری عزت نہ بچتی اور میں نے اس کا ہاتھ کاٹ کر اچھا کیا..... وہ مردود اپنی آرزو پوری نہ کر سکا..... اب وہ کبھی میری عزت کے درپے نہیں ہوگا..... یہ سارا واقعہ ڈراؤنے خواب کی طرح لگ رہا تھا۔

میں نے اس ہولناک واقعہ کا کسی سے بھی ذکر نہیں کیا..... اس روز سے وہ شیطان کہیں دکھائی نہیں دیا۔ وہ اچانک اور پراسرار طور پر لاپتہ ہو گیا تھا..... میں نے سکون و اطمینان کا سانس لیا۔

اس طرح ایک برس بیت گیا..... اس واقعہ کے ایک برس بعد میری شادی ہو گئی..... پھر میں والد پچ آ گئی..... میری شادی کو دو برس کا عرصہ بھی نہیں گزرا کہ مجھ سے انتقام لینے کے لئے

وہ آ گیا۔ میں نے اس کے جس ہاتھ کو کاٹ دیا تھا اس ہاتھ سے وہ معصوم لڑکیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہا ہے..... ان کی عزت برباد کر رہا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اس مردود کو ایسی عبرت تک سزا دیں کہ وہ کہنے کی موت مرے۔“
وہ اپنی کہانی ختم کر کے سسکیاں بھرنے لگی۔

☆.....☆.....☆

تیسرے دن چندرا دیوی اور شکنتلا والد پچ میں تھیں۔

چندرا دیوی اپنی سبیلی شانتی کانت کے ہاں ٹھہری تھی..... چندرا دیوی نے یقین دلایا تھا کہ وہ دوسرے دن ہی اس ہاتھ کا خاتمہ کر دے گی..... چندرا دیوی نے اسے ایک انگوٹھی دی کہ وہ پہن لے..... کٹا ہوا ہاتھ اگر آیا تو اس سے ڈر اور خوف کی بات نہیں وہ بال بیکا کرنا تو دور کی بات ہے قریب بھی نہیں آئے گا۔

رات کے وقت شکنتلا جب اپنے پتی کو چندرا دیوی سے ملاقات کے بارے میں بتا رہی تھی اس وقت دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکت پر آئے..... انہوں نے اندر گھسنے کے لئے بڑا زور لگایا..... لیکن وہ ناکام رہے۔

دوسرے دن سہ پہر کے وقت چندرا دیوی اس شیطان کی تلاش میں نکلی..... ایک بہت ہی چھوٹا سا جزیرہ جس پر کوئی آبادی نہیں تھی..... اس لئے کہ اس میں ڈھلان تھی..... زیادہ سے زیادہ دو مکانوں کی گنجائش تھی اس لئے وہاں کوئی مکان یا آبادی نہیں تھی۔ صرف ایک کتیا تھی جسے منحوس ہاتھ نے اپنا مسکن بنایا ہوا..... ایک پندرہ برس کی لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ وہ اس وقت انسانی روپ میں تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی اسے جادو کے زور پر ایک قریبی جزیرے سے اٹھا لایا تھا..... اسے اپنی غرض پوری کرنے کے لئے بے ہوش کیا ہوا تھا۔ وہ لڑکی نہایت حسین و جمیل تھی۔ اسے چندرا دیوی کی آمد کی خبر نہ تھی۔ اس وقت اس نے لڑکی کو بے لباس کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ چندرا دیوی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”خبردار..... جو تم نے اسے ہاتھ لگایا۔“

اس شیطان نے پلٹ کر چندرا دیوی کو حیرت سے دیکھا۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا کہ..... کوئی عورت اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے.....؟ اسے جتنی حیرت ہوئی اتنی خوشی بھی کہ شکار چل کر اس کے پاس آیا تھا..... وہ پہلی بار اس قدر حسین عورت کو دیکھ رہا تھا۔

”کون ہو تم.....؟“ جسونت غرایا۔ ”بڑی پیاری چیز ہو.....“

”تمہاری موت.....“ چندرا دیوی بولی۔ ”میں تمہیں سزا دینے آئی ہوں..... تم نے

بڑے پاپ کئے ہیں..... میں تمہیں ایک لمحے میں موت کی نیند سلا سکتی ہوں..... لیکن ایسا نہیں کروں گی۔ اس لئے تم موت کے آنے تک اذیت بھری زندگی گزارو.....“

”تم میرا بال تک بچا نہیں کر سکتی۔“ وہ استہزاء سیہ لہجے میں بولا۔ ”میں تمہیں جی بھرنے تک بستر کی زینت بناتا رہوں گا۔“

چندرا دیوی نے اسے ایک معذور اور اپاہج بنا دیا..... صلاحیت سے اسے محروم کر دیا..... پھر لڑکی کو ہوش میں لا کر اس کے گھر پہنچا دیا..... وہ دس دن تک مالدیپ میں رہ کر واپس آ گئی۔

☆.....☆.....☆

ایک روز اس سے ملنے سریش کمار آیا اور بولا۔ ”تم دنیا بھر کے نیک کام کرتی رہتی ہوں۔ لیکن میرا ایک کام نہیں کر سکتی ہو۔“

”وہ کیا.....؟“ چندرا دیوی بولی۔ ”تم حکم تو کرو۔“

”میرے لئے ایک جیون ساتھی تلاش کرو..... اب میں بغیر شادی کے نہیں رہ سکتا.....“

ایک لڑکی میری نظر میں ہے کیا تم اسے رام کر سکتی ہو؟“

”کیوں نہیں.....“ چندرا دیوی بچھے ہوئے لہجے میں بولی۔ اس کے دل پر چوٹ لگی

تھی۔ اس لئے کہ وہ سریش سے محبت کرتی تھی۔ ”کون ہے وہ؟“

”تم.....“ سریش کمار نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

چندرا دیوی کو یقین نہ آیا۔ وہ سرخ ہو کر بولی۔ ”سریش.....! میری بات سنو.....“

میں.....“

سریش کے ہونٹوں نے اس کے شیریں ہونٹوں کو بولنے نہیں دیا..... اس پر مہر محبت ثبت

کر دی۔

☆☆☆